امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ

از
علامہ محمد یوسف کوکن عمری

تخریج
ابو احمد عمر دراز خاں

نعمان پبلیکیشنز

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ

امام المفسرین ترجمان السنۃ مجدد العصر شیخ الاسلام تقی الدین ابو العباس احمد بن تیمیہ الحرانی الدمشقی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷۲۸ھ) کے حالات اور انکے مجددانہ کارناموں کا تفصیلی تذکرہ

از

علامہ محمد یوسف کوکن عمری

نعمان پبلیکیشنز

کتاب ---------------------- امام ابن تیمیہ

تالیف ---------------------- علامہ محمد یوسف کوکن عمری

اشاعت ---------------------- 2014ء

قیمت ----------------------

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 37244973-042 فیکس: 37232369-042
بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 2631204, 2034256-041
E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست

مضامین	صفحہ نمبر

اعتراف

آج سے تین سال قبل مارچ ۱۹۵۶ھ میں اس کتاب کی لکھائی شروع ہوئی تھی کئی فارم پریس جا چکے تھے اور ان کی طباعت کی ابتدا ہوئی تھی کہ حکومت ہند کے وظیفے پر مجھے مارچ ۱۹۵۷ھ کے پہلے ہفتہ میں مصر جانا پڑا۔ ایک سال کے لیے لکھائی چھپائی کا کام رک گیا۔ اور جب میں مارچ ۱۹۵۸ء کے آخری ہفتے میں مدراس واپس ہوا تو یہ کام پھر سے جاری ہوا۔ کتاب طباعت اور کاغذ کی فراہمی کی گوناگوں دقتوں کی وجہ سے یہ کام حسب خواہش تیزی سے نہ ہو سکا۔ اتنے دنوں کے بعد یہ کتاب قارئین کرام کی خدمت میں پہنچنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے فللہ الحمد۔

اس موضوع پر اب تک جتنی کتابیں نکل چکی ہیں۔ ان میں یہ کتاب نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ خامیوں سے پاک ہونے کا دعویٰ نہیں اور خوبیوں سے پر ہونے کا ادعا نہیں۔ ناقدین اس کی خوبیوں اور خامیوں کا باہمی موازنہ کر کے ٹھیک فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ان کی بتائی ہوئی خامیوں پر ضرور غور کیا جائے گا۔ اور آیندہ ایڈیشن میں ان کی اصلاح کی جائے گی۔

ایک سال کے دوران قیام مصر میں مجھے فروری ۱۹۵۸ء کے پہلے ہفتے میں بیروت، دمشق اور حلب جیسے مقامات کی سیر کا موقع ملا اور میں نے امام ابن تیمیہ کی دائمی خوابگاہ کی تصویر لی۔

اس کتاب کی اشاعت سے ایک طرف بے انتہا خوشی ہو رہی ہے تو دوسری طرف اس کا قلق بھی ہے کہ ہم میں خان بہادر الحاج ساہوکار کا محمد اسماعیل صاحب بہادر کی وہ ہر دلعزیز ہستی باقی نہ رہی جس کو اس کتاب کی اشاعت کا سب سے زیادہ انتظار تھا۔ آخری ایک سو اٹھائیس صفحوں کی لکھائی چھپائی باقی رہ گئی تھی کہ ۵، ذوالقعدہ ۱۳۷۸ھ بمطابق ۱۴ مئی

۱۹۵۹ء کو خان بہادر موصوف کا انتقال ہو گیا۔ مرض الموت میں جبکہ مرحوم کے لیے گفتگو کرنی بہت دشوار تھی مجھ سے آخری بات چیت اسی کتاب کی تکمیل کے متعلق ہوئی تھی۔ وہ اورینٹل عربک کالج جامعہ دارالسلام عمر آباد ضلع شمالی آرکاٹ ریاست مدراس کے بانیوں میں سے ایک بانی اور اس جامعہ کے بانی اعظم الحاج ساہوکار کا محمد عمر صاحب مرحوم کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ جامعہ کے طلبہ اور فارغین سے انہیں انتہائی دلچسپی اور محبت تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اس جامعہ کا ہر ایک فارغ علم وعمل کے لحاظ سے نام آوار اور ممتاز ہو۔ وہ بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے بھی نڈر اور بے باک ہو کر مختلف مذہبی اور ملی مسائل سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرماتے تھے۔ ایسی علم دوست ہستی مدتوں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ خدا کرے کہ میری سعی وکاوش کا یہ ثمرہ ان کے دائمی روحانی سکون واطمینان کا ایک ذریعہ ثابت ہو۔

علم کی اشاعت زیادہ تیزی سے اور وسیع پیمانے پر نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ مال کی تائید حاصل نہ ہو، مولانا جلال الدین دوانی نے ٹھیک کہا ہے۔

مرا بہ تجربہ معلوم گشت آخر حال
کہ قدر مرد بعلم است و قدر علم بمال

محترمی الحاج ساہوکار چیری عبدالشکور صاحب پیارم پیٹی اور مکرمی الحاج ساہوکار ایم۔ آر۔ عبدالواحد صاحب آمبوری کا شکر گزار ہوں کہ ان دونوں کی حوصلہ افزائی اور ان کے ابتدائی گرانقدر عطیوں سے میں نے اس ضخیم کتاب کی چھپائی شروع کی۔ اگر ان کے جیسے اور چند فیاض میسر آجاتے تو یہ کتاب بہت پہلے منظر عام پر آجاتی۔ میں نے اپنی استطاعت کے مطابق اس کام کو آگے بڑھایا اور انجام تک پہنچایا۔ امید ہے کہ میری یہ کتاب قبول عام حاصل کرے گی۔

محمد یوسف کوکن عمری ایم۔ اے
ریڈر شعبہ عربی وفارسی واردو،
مدراس یونیورسٹی مدراس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

امام المفسرین شیخ الاسلام شیخ تقی الدین ابو العباس احمد بن شیخ شہاب الدین ابی المحاسن عبدالحلیم بن شیخ مجد الدین ابی البرکات عبدالسلام بن عبداللہ بن ابی القاسم الخضر بن محمد بن خضر بن محمد بن علی بن عبداللہ بن تیمیہ الحرانی الدمشقی (ولادت ۶۶۱ ھ، وفات ۷۲۸ ھ) کی زندگی بہت ہی ہنگامہ خیز رہی، انہوں نے اپنے زمانے کے تمام علوم متداولہ میں غیر معمولی کمال حاصل کیا، آبائی حنبلی ہونے کے باوجود تقلید کے قیود سے آزادرہ کر ہر ایک دینی مسئلے کا گہرا مطالعہ کیا اور ہر معاملے میں کتاب وسنت ہی کو اپنا رہبر قرار دیا، اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان اور ان کے قلم میں بڑی تاثیر دے رکھی تھی اس لیے ان دونوں سے کام لے کر انہوں نے عام مسلمانوں کو ان کے خواب غفلت سے جگانا شروع کیا اور اس طرح امت اسلامیہ کے مردہ جسم میں ایک تازہ روح پھونکنی شروع کی اور جب زبان وقلم سے آگے بڑھ کر تیر وسناں اور تلوار سے خدا کے راستے میں جہاد کرنے کا موقع آیا تو اس وقت بھی انہوں نے غیر معمولی سپاہیانہ جوہر دکھائے، اس زمانہ کے علوم متداولہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جو ان کے نقد و تبصرے سے بچا ہو، انہوں نے اپنے زمانے کے ہر ایک علم کو کتاب وسنت کے معیار پر جانچا اور اس میں حق و باطل کی آمیزش کو پورے طور پر واضح کیا، علمائے مقلدین نے ان کی سخت مخالفت کی، اور جب ان کے حریف زبان وقلم سے ان کا جواب دینے سے عاجز ہو گئے تو انہوں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنے ذاتی اثر اور رسوخ سے ان کو بارہا قید و بند کی مصیبتوں میں مبتلا کیا، یہاں تک کہ شیخ نے قید ہی کی حالت میں وفات پائی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیخ کی زندگی ہی میں بعض مخلص اور سنجیدہ ذی علم حضرات نے ان کی بڑی قدر اور عزت کی اور ان کو اچھے الفاظ میں سراہا مگر علما کا ایک بڑا طبقہ ان کا سخت

مخالف بنا رہا، ابتداء میں عوام عام طور پر شیخ سے بدظن رہے، مگر جب ان کی وفات ہوئی تو عوام نے بھی اپنی غیر معمولی عقیدت مندی کا مظاہرہ کیا۔

شیخ کی وفات سے ان کی اصلاحی تحریک ختم نہیں ہوگئی تھی، ان کی تصنیفات ان کے اصلاحی خیالات کا خزینہ تھیں، انہوں نے شاگردوں کی ایک ایسی پر جوش جماعت پیدا کر دی جس نے ان کی تحریک کو نہ صرف زندہ اور برقرار رکھا، بلکہ ان کی تمام تصنیفات کو جو اسلامی جوش اور ولولے سے لبریز تھیں ہر جگہ پھیلانا شروع کیا، اس جماعت کے سرگردہ شیخ شمس الدین ابن قیم تھے۔ انہوں نے اپنے استاد کے انقلاب انگیز خیالات کو نئی ترتیب وتہذیب کے ساتھ مدون کیا اور سنجیدگی کے ساتھ ان کی اشاعت کی، شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کے شاگرد رشید حافظ ابن عبدالہادی نے اپنے استاذ کا ایک بسیط تذکرہ ''العقود الدریہ'' کے نام سے مرتب کیا، حافظ ابن کثیر نے علی الخصوص اپنی کتاب ''البدایہ والنہایہ'' میں تاریخ اوران کے حالات بیان کیے، شیخ شمس الدین ذہبی، شیخ علم الدین برزالی، شیخ ابو الحجاج مزی، حافظ ابن رجب، حافظ ابن حجر عسقلانی، امام شوکانی وغیرہ نے اپنی اپنی رجال کی کتابوں میں شیخ تقی الدین کے جستہ جستہ اور منتخب حالات بیان کیے۔ شیخ تقی الدین سبکی اور شیخ تاج الدین سُبکی شافعی اور دیگر علمائے وقت نے ان کے انقلاب انگیز خیالات کا رد لکھا۔

شیخ تقی الدین کی وفات کے بعد بھی ہر زمانے میں علما کا ایک بہت بڑا گروہ ان کے خیالات کا سخت مخالف رہا، وہ ان کو بدعقیدہ، بدعتی اور گمراہ قرار دیتا تھا اور عوام کو ان کی تصنیفات کے پڑھنے سے ہمیشہ روکتا رہا، مگر ان میں کچھ ایسی کشش تھی کہ جو بھی خالی الذہن ہو کر ان کا مطالعہ کرتا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا یا کم از کم ان کا غیر معمولی اثر قبول کر لیتا تھا، یہی وجہ ہے کہ علما کی سخت ترین تنبیہ کے باوجود شیخ کی تصنیفات کا دائرہ، اثر و رسوخ اور وسیع ہوتا گیا، جب کبھی عام علما کو یہودیوں، نصرانیوں، نام نہاد فقیہوں اور متصوفوں، شیعوں، فلسفیوں، متکلموں، منجموں اور منطقیوں کے خلاف کچھ لکھنا ہوتا تھا تو وہ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ اور شیخ شمس الدین ابن قیم ہی کی کتابوں کی طرف رجوع کرتے تھے، علمائے مخالفین بھی اکثر ان کی کتابوں کو عام لوگوں کو نظروں سے چھپائے رکھتے تھے اور خود ان سے استفادہ کرتے تھے،

کیونکہ انہیں اپنی فضیلت اور بزرگی کے قائم رکھنے کے لیے انہی دونوں اصحاب کی کتابوں سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔

شیخ کی وفات کو اب چھ سو سال سے کچھ زیادہ ہوتے ہیں، اس مدت میں رہ کر رہ کر ان کے متعلق کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھتا تھا، جب کبھی شیخ کے پیش کردہ خیالات پر سخت معاندانہ تنقیدیں ہوتی تھیں، تو صالح اور غیر متعصب علما کی طرف سے ان کا جواب دیا جاتا تھا، چنانچہ جب نویں صدی ہجری کی ابتداء میں اس قسم کا فتنہ اٹھا اور بعض تنگ نظر علما نے اس شخص کو بھی کافر بنایا جس نے شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام گردانا تو شیخ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر عبداللہ بن شمس الدین ابی عبداللہ محمد المعروف بابن ناصر الدین حموی شافعی المتوفی ۸۴۲ھ نے ”الرد الوافر علی من زعم ان من سمیٰ ابن تیمیه شیخ الاسلام کافر“ کے نام سے ایک مدلل اور زوردار رسالہ لکھا، اور جب شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیتمی مکی المتوفی ۹۷۴ھ نے اپنی کتابوں میں شیخ تقی الدین ابن تیمیہ پر سخت تنقیدیں کیں تو خیر الدین ابوالبرکات نعمان بن محمود الآلوسی المتوفی ۱۳۱۷ھ نے ”جلاء العینین فی محاکمة الاحمدین“ کے نام سے ایک قابل قدر کتاب لکھی، جس میں احمد ابن تیمیہ اور احمد بن حجر ہیتمی مذکور کے مابین نزاعی مسائل کے متعلق اپنا محاکمہ پیش کیا۔

بعض اصحاب نے شیخ تقی الدین کے دوبارہ تذکرے مرتب کیے، چنانچہ شیخ مرعی بن یوسف بن ابی بکر بن احمد بن ابی بکر احمد الکرمی نابلسی مقدسی المتوفی ۱۰۳۳ھ نے ”الکواکب الدریه فی مناقب الامام ابن تیمیه“ کے نام سے ایک کتاب لکھی، اسی طرح صفی الدین حنفی بخاری نابلسی المتوفی ۱۲۰۰ھ نے ”القول الجلی فی ترجمة شیخ الاسلام ابن تیمیه الحنبلی“ کے نام سے ایک رسالہ لکھا، مگر ان لوگوں نے واقعات کے قلمبند کرنے میں سنہ وار ترتیب کا کوئی خیال نہیں رکھا۔

بڑے بڑے علما کی تصنیفات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے شیخ تقی الدین ابن تیمیہ اور شیخ شمس الدین ابن قیم کی تصنیفات سے ہر جگہ فائدہ اٹھایا ہے، بعض نے ان کا حوالہ بھی دیا ہے، اور بعض نے ان کا نام نہیں لیا ہے ان سے یہ

بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کی کتابیں نہ صرف ملک شام اور مصر میں پھیلیں بلکہ سارے عالم اسلامی میں ان کا چرچا ہوتا رہا، جنوبی ہند جیسے دور دراز خطے میں بھی ان کی کتابیں پہنچ چکی تھیں، چنانچہ سید شاہ عبدالقادر مہربان فخری میلاپوری مدراسی (المتوفی: ۱۲۰۴ھ) اور مولانا باقر آگاہ مدراسی (المتوفی: ۱۲۲۰ھ) نے اپنی کتابوں میں امام ابن تیمیہ کا نام لیا ہے، مولانا باقر آگاہ نے ابن تیمیہ کی کتاب "منهاج السنة" کی بڑی تعریف کی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ شیعیت کی تردید میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہوسکتی۔

امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی پرجوش تصنیفات ہی کا اثر تھا کہ عربستان میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور شمالی افریقہ میں شیخ سنوسی کی تحریکیں نمودار ہوئیں اور ان دونوں جگہوں کے مسلمانوں میں زندگی کی روح کارفرما ہونے لگی، مصر میں شیخ محمد عبدہٗ اور ان کے شاگرد رشید شیخ رضا نے ان دونوں کی تصنیفات سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور عربی دنیا میں ان کی تصنیفات کو پھیلانے کی کوشش کی، اس کی وجہ سے ایک طبقہ ان کی مخالفت پر کمربستہ ہوگیا، اور شیخ محمد زاہد الکوثری الحنفی اور شیخ سلامہ قضاعی عزامی شافعی جیسے علما نے امام ابن تیمیہ و حافظ ابن قیم کے خلاف بہت سے فتوے، مضامین اور رسالے لکھے، مصر میں حمایت اور مخالفت کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

ہندوستان میں غزنوی خاندان کی وجہ سے ان دونوں کی تصنیفات کا چرچا ہوا، مگر یہاں کے اردو داں طبقے کو امام ابن تیمیہ کی حقیقی عظمت و منزلت سے جس نے سب سے پہلے روشناس کرایا وہ شاید مولانا شبلی نعمانی مرحوم تھے، آپ نے جولائی ۱۹۰۸ء کے "اَلنَّدْوَة" میں علامہ ابن تیمیہ حرانی کے متعلق مجددان اسلام کے سلسلے کے تحت ایک بہت ہی دلچسپ مضمون لکھا، آپ نے انہیں سب سے بڑا مجدد اور رفارمر قرار دیا تھا، اس وقت مولانا نے مجدد اور رفارمر ہونے کی تین ضروری شرطیں قرار دی تھیں یعنی

(۱) مذہب یا علم یا سیاست (پالیٹکس) میں کوئی مفید انقلاب پیدا کرے۔

(۲) جو خیال اس کے دل میں آیا ہو وہ کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو بلکہ وہ اس کا اپنا اجتہاد ہو۔

(۳) جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں، جان پر کھیلا ہو اور سرفروشی کی ہو۔

مولانا نے اس وقت یہ بھی لکھا تھا کہ اگر تیسری شرط ضروری قرار نہ دی جائے تو امام ابو حنیفہ، امام غزالی، امام رازی، اور شاہ ولی اللہ صاحب بھی اس دائرے میں آسکتے ہیں، لیکن جو شخص رفارمر کا اصلی مصداق ہوسکتا ہے وہ علامہ ابن تیمیہ ہے۔

مولانا شبلی نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر فرمایا تھا کہ بہت سے امور میں امام غزالی وغیرہ کو ابن تیمیہ پر ترجیح حاصل ہے لیکن وہ امور مجددیت کے دائرے سے باہر ہیں۔ مجددیت کی اصلی خصوصیتیں جس قدر علامہ کی ذات میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی نظیر بہت کم مل سکتی ہے۔ [1]

مولانا شبلی کے بعد حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے تذکرے میں مقام دعوت و عزیمت کی تشریح کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ اور حافظ بن قیم کے فضائل و مناقب کچھ ایسے والہانہ انداز میں بیان کئے کہ ملک بھر میں ان دونوں کی شخصیت اور ان کی تصنیفات سے ایک طرح کی گرویدگی اور شیفتگی پیدا ہوگئی، بعض نے ان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے رسائل کے اردو ترجمے شائع کیے، ایک صاحب نے سیرت ابن تیمیہ کے نام سے ایک مختصر تذکرہ بھی چھپایا، اس کے باوجود ایک بسیط مستند تذکرے کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس میں ان کے علمی اور اصلاحی کارناموں کو نمایاں کرکے دکھایا گیا ہو۔

جنوبی ہند کے عربی مدارس میں جامعہ دارالسلام عمر آباد (ضلع شمالی آرکاٹ مدراس) کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے، یہاں عربی اور فارسی کے قدیم علم کے ساتھ ساتھ تاریخ وجغرافیہ ریاضیات اور انگریزی جیسے جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں، اس کی وجہ سے بہت سے مفید نتائج برآمد ہوئے، بانیان وکارکنان جامعہ اور خاص کر جناب خان بہادر ساہوکار الحاج کا کام محمد اسماعیل صاحب بہادر اور ان کے مرحوم بھائی ساہوکار الحاج کا کا محمد ابراہیم صاحب بہادر کی دلی تمنا یہ تھی کہ جامعہ کے طلبہ میں عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کا اعلیٰ مذاق اور تصنیف وتالیف کا ذوق وشوق پیدا ہو، اس غرض سے انہوں نے عمر آباد میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کتابوں کا ایک بہترین ذخیرہ فراہم کیا اور ''دار التصنیف'' کے نام سے ایک تحقیقاتی ادارہ بھی کھولا، مدینہ منورہ سے ''صحیح ابن حبان'' کا ایک نسخہ فراہم کرکے اس کی تصحیح اور

---

[1] مقالات شبلی: ۵/ ۶۵۔۶۶۔

حواشی لکھنے کا کام شروع کیا گیا، شیخ طنطاوی جوہری کی ''تفسیر جواہر'' کی پہلی جلد کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا، تحقیقاتی کام میں تربیت حاصل کرنے کی غرض سے خاکسار کو ''دارالمصنفین اعظم گڑھ'' بھیجا گیا، جب وہاں پہنچا تو حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے ۱۹۳۷ء میں میرے لیے ''سوانح ابن تیمیہ'' کا موضوع تجویز فرمایا، دو سال کی مسلسل محنت کے بعد میں نے ابن تیمیہ کی سوانح حیات مرتب کر لی اور ان کے علمی و اصلاحی کارناموں کے متعلق دوسری جلد شروع کی تھی کہ مجھ کو انگریزی تعلیم کی تکمیل کا شوق پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے میرا یہ کام ادھورا رہ گیا، اور جب انگریزی تعلیم سے فارغ ہوا تو فکر معاش نے اس کی طرف توجہ کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا، اس کے علاوہ اس وقت مدراس میں امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تمام تصنیفات فراہم نہیں ہو سکتی تھیں کہ ان کے متعلق کچھ مزید تحقیقات و تدقیقات جاری رکھ سکوں، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے ''سوانح ابن تیمیہ'' کے چھپوانے کی طرف بار بار توجہ دلائی، مالی دشواریاں میرے راستے میں حائل تھیں، حضرت مرحوم نے اپنی وفات سے تقریباً ایک سال پیشتر پھر توجہ دلائی، چنانچہ میں نے اپنے مسودے پر نظر ثانی شروع کی، اور اس خیال سے کہ شاید اس دوسری جلد کے مرتب کرنے اور اس کے چھپوانے کی نوبت نہ آ سکے، اس ایک جلد ہی میں سوانح حیات کو دوبارہ اس طرح مرتب کیا کہ امام ابن تیمیہ کی زندگی کے اہم واقعات کے ساتھ ساتھ ان کے اہم اختلافی مسائل کا پس منظر بھی اچھی طرح سمجھ میں آ جائے، اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکی ہے، اس کا فیصلہ کچھ قارئین کرام ہی فرما سکتے ہیں، اس وقت جیسا بھی مجھ سے ہو سکا، نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ اس کو ارباب علم و نظر کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

اب ہم سب سے پہلے شیخ کے وطن حران کے متعلق مختصر تاریخ پیش کرتے ہیں۔

حران

حران ملک شام کا ایک مشہور مقام ہے۔ یہ عراق کے صوبہ جزیرہ میں اڈیسا اور راس العین کے درمیان بلیخ کی نہر کے سرچشمہ کے قریب واقع ہے اس کا طول بلد تقریباً ۳۹ درجہ اور عرض بلد ۳۷ درجہ ہے، کہا جاتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد سب سے پہلا شہر جو زمین پر آباد کیا گیا وہ حران ہے [1]، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا ہاران نے اس شہر کو آباد کیا تھا، اسی لیے وہ ابتداء میں انہی کے نام سے مشہور ہوا اور پھر اس کو معرب کر کے حران کہا جانے لگا، [2] حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت بھی یہیں ہوئی تھی، [3] مرقیون بھی یہیں پیدا ہوا تھا، جس نے خیر و شر کے مسئلے کو ایجاد کیا، اور جس کی طرف فرقہ مرقونیہ منسوب ہے۔ [4]

حران صابیوں کا مسکن تھا

مگر حران کی اصلی شہرت صابیوں کی وجہ سے ہے جو قدیم زمانے سے یہاں آباد تھے، یہ لوگ خدا کی ہستی کے قائل تھے، لیکن خدا اور مخلوق کے درمیان کواکب اور افلاک کو وسیلہ بناتے تھے اور ان کو اپنا رب تسلیم کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ دنیا کا سارا نظام انہی کے ذریعے چل رہا ہے، انہوں نے ان کی پرستش اور عبادت کے لیے مختلف ہیکل بنائے تھے، جہاں مشہور کواکب کی خاص طریقے پر پوجا کی جاتی تھی، ان ہیکلوں کی تعداد بارہ تھی، جن کے نام یہ ہیں:۔ (۱) ہیکل العلۃ الاولیٰ (۲) ہیکل العقل (۳) ہیکل السلسلہ (۴) ہیکل الصورۃ (۵) ہیکل النفس (۶) ہیکل زحل (۷) ہیکل المشتری (۸) ہیکل المریخ (۹) ہیکل الشمس (۱۰) ہیکل العطارد (۱۱) ہیکل الزہرۃ (۱۲) ہیکل القمر۔ [5] ان کے علاوہ اور چار معبد بھی تھے، جن کے نام معلوم نہیں، مسعودی کا بیان ہے کہ حران میں باب الرقۃ کے قریب

---

[1] معجم البلدان:۳/ ۲۴۲۔ [2] مراۃ الجنان بحوالہ تاریخ طبری:۲/ ۲۱۵۔
[3] الکامل لابن اثیر، طبع یورپ:۱/ ۶۷۔
[4] ایضًا، ص:۳۳۲۔ [5] کتاب الملل و النحل للشہرستانی:۲/ ۱۵۵۔

صابیوں کا ایک ہیکل ہے جس کا نام مغلیتا ہے، ❶ اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر نے بنایا تھا، ❷ غالباً یہ ہیکل حران کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھا، جس کی صابی بہت تعظیم کرتے تھے۔ ❸

اسلامی قبضہ

جب ۱۷ھ میں جزیرہ والوں نے حمص کے مسلمانوں کے مقابلہ میں رومیوں کی مدد کرنی چاہی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو جزیرہ والوں کی سرکوبی کے لیے ایک زبردست لشکر روانہ کرنے کا حکم دیا، چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اجازت سے حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ پانچ ہزار آدمیوں کی ایک فوج لے کر اس طرف بڑھے اور مختلف جنگی مورچوں پر قبضہ کرتے ہوئے حران پہنچے، یہاں کے سرداروں نے آکر گزارش کی کہ اگر رہا والے مسلمانوں سے صلح کرلیں تو وہ بھی انہی شروط پر مسلمانوں سے صلح کرلیں گے، حضرت عیاض رضی اللہ عنہ نے اس بات کو مان لیا، اور جب رہا کے حاکم نے خفیف سی روک ٹوک کے بعد صلح کرلی تو حران کے سرداروں نے بھی مسلمانوں سے معاہدہ کرلیا اور جزیہ دینا قبول کرلیا۔

اس کے بعد سے دھیرے دھیرے سے اسلام پھیلتا گیا، اور بہت سے صابی اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے، ان کی طبیعت میں علم نجوم و ہیئت ورمل سے ایک گونہ مناسبت تھی، یہاں بہت سے محدث اور علما بھی پیدا ہوئے، جن کی تفصیل مختلف تذکروں میں ملے گی۔

خلافت بنی امیہ کے زمانے میں اس کی اہمیت

بنی امیہ کی خلافت کے زمانہ میں اموی خاندان کے بہت سے لوگ یہاں آکر آباد ہوگئے تھے، اس خاندان کے آخری خلیفہ یعنی مروان جعدی کا قصر بھی یہیں تھا، اس نے دولت عباسیہ کے بانی ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کو یہیں قید کیا تھا، اور پھر خفیہ طور

---

❶ مروج الذہب للمسعودی، مطبوعہ یورپ: ٤/ ٦٢، ٦٣۔

❷ تقویم البلدان لابی الفداء، ص: ٢٧٧۔

❸ معجم البلدان لیاقوت الحموی: ٣/ ٢٤٣۔

پر ان کو مروا دیا تھا، ان کی قبر حران ہی میں ہے، چنانچہ سدیف بن میمون شاعر ان کے متعلق کہتا ہے:

قَدْ كُنْتُ اَحْسِبُنِيْ جَلْدًا فَضَعْضَعَنِيْ
قَبْرٌ بِحَرَّانَ فِيْهِ عِصْمَةُ الدِّيْنِ

''میں بے شک اپنے آپ کو بہت ہی صبر کرنے والا سمجھتا تھا، مگر حران کی قبر نے جس میں دین کی عصمت پوشیدہ ہے، مجھ کو بے چین اور بے قرار کر دیا۔''

عباسی دور میں اس کی اہمیت

عباسیوں کے ابتدائی دور میں بہت سے مشہور فلسفی اور ماہرین نجوم و ہیئت حران ہی کی خاک سے اٹھے تھے، ثابت بن قرہ، اور اس کے لڑکے سنان اور سنان بن فتح اور ابراہیم زہرون اور محمد بن جابر یہیں پیدا ہوئے تھے، ابونصر فارابی نے حران ہی کے صابی فلسفیوں سے فلسفے، ہیئت اور نجوم کی تعلیم حاصل کی تھی، عربی فلسفہ، علم ہیئت اور نجوم میں جو مشرکانہ تصورات اور خیالات شامل ہو گئے ہیں ان کا ایک بڑا حصہ حران ہی کے صابیوں کے ذریعے آیا ہے۔ [1]

حران سرحدی شہر تھا

حران عباسی سلطنت کا اہم سرحدی شہر تھا، یہاں باقاعدہ والی رہا کرتے تھے، جن کے ساتھ ایک زبردست لشکر ہوتا تھا، شہر کے اطراف میں پتھر کی ایک زبردست فصیل بنادی گئی تھی، یہ پچاس ہاتھ اونچی تھی، حران کے قلعے کو ''قلعہ نجم'' بھی کہتے تھے اس قلعے کا دور ایک ہزار تین سو پچاس قدم تھا۔ [2]

جب بغداد علوم اسلامی کی تحصیل کا مرکز ہو گیا تو حران کے اکثر طالب علم بغداد جانے لگے اور وہاں اپنے علم کی تکمیل کرنے لگے چونکہ ابتدائی دور میں امام احمد بن حنبل کا بڑا شہرہ رہا، اس لیے بہت سے علمائے حران نے حنبلی مذہب اور عقیدے کو اختیار کر لیا تھا۔

---

[1] كتاب الرد على المنطقيين لابن تيمية قلمي۔

[2] نزهة القلوب للقزويني، ص: ۱۰۳۔

حران کی تباہی

جب عباسی خلافت کمزور ہوگئی تو اور سرحدی شہروں کی طرح حران پر بھی رومیوں کے حملے ہونے لگے جس کی وجہ سے قتل و غارت گری کے حادثات واقع ہوتے تھے، چنانچہ ۳۴۸ھ میں رومیوں نے رہا اور حران پر چڑھائی کی تھی اسی طرح انہوں نے ۴۹۷ھ میں حران پر حملہ کیا، امیر سقمان نے دس ہزار کا لشکر لے کر ان کا مقابلہ کیا اور انہیں زبردست شکست دی۔ [1]

شیعہ سنی کشمکش

اس کے علاوہ اکثر سنیوں اور شیعوں میں اور معتزلیوں اور حنبلیوں میں بحثیں ہوتی تھیں جن کی وجہ سے بسا اوقات فساد ہو جاتا تھا اور خون بہانے کی نوبت آ جاتی تھی، چنانچہ ۴۷۶ھ میں سنیوں اور شیعوں کے درمیان اسی قسم کی ایک سخت لڑائی ہوگئی تھی، اس وقت موصل میں ایک شیعہ عامل تھا، جو فاطمیین مصر کی تائید میں تھا، جب سنی اہل حران نے شہر کو سنی امیر ترکمان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تو موصل کا عامل غصے میں آ گیا، اور ایک زبردست لشکر لے کر حران کا محاصرہ کر لیا اور منجنیقوں کے ذریعہ شہر پر پتھر برسانے شروع کیے اور جب اہل حران نے دروازے کھول دیے تو اس نے قاضیٔ شہر اور اس کے تمام لڑکوں کو ذبح کر دیا کیونکہ اس نے شیعہ عامل کے خلاف اہل حران کی تائید کی تھی اور ان کو اس کے خلاف ابھارا تھا۔ [2]

ابن جبیر کا چشم دید بیان

محمد بن احمد بن جبیر اندلسی سفر کرتے ہوئے ۷ ربیع الاول ۵۸۰ھ کو حران میں داخل ہوا، وہ اپنے سفر نامہ میں اس کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے:

"اس شہر میں کوئی حسن نہیں ہے اور نہ کوئی ٹھنڈک والا سایہ ہے، اس کی ہوا اس کے نام سے مشتق ہے، [3] اس کا پانی ٹھنڈک کے ساتھ کوئی اُلفت نہیں رکھتا،

---

[1] مراۃ الجنان: ۳/ ۱۶۰۔ [2] مراۃ الجنان: ۳/ ۱۰۹۔

[3] حران: لفظ حر سے مشتق ہے جس کے معنی حرارت اور گرمی کے ہوتے ہیں۔

اس کے صحن اور کنارے دوپہر کی لو سے تپتے رہتے ہیں، اس میں آرام لینے کی جگہ کو نہیں پاؤ گے اور گرانی کے بغیر اس میں سانس نہیں لے سکو گے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک چٹیل میدان میں پھینک دیا گیا ہے اور لق و دق بیابان میں رکھ دیا گیا ہے، سرسبزی کی رونق اس سے ناپید ہے اور تر و تازگی اس سے معدوم ہے۔ لیکن اس شہر کی فضیلت اور عظمت کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ وہ بہت ہی پرانا شہر ہے جو ہمارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، اس شہر سے مغرب میں تین فرسخ کی دوری پر ایک بابرکت زیارت گاہ اور پانی کا چشمہ ہے، یہاں حضرت ابراہیم اور حضرت سارہ علیہما السلام رہا کرتے تھے اور خدا کی عبادت کیا کرتے تھے، انہی کی برکت سے خدا نے اس شہر کو نیک اور پرہیز گار لوگوں کا مستقر بنایا ہے۔

ہم نے اسی قسم کے ایک بزرگ شیخ ابوالبرکات حیان بن عبدالعزیز سے ملاقات کی، وہ اپنی مسجد سے متصل اپنی بنائی ہوئی خانقاہ میں رہتے تھے، اسی کے قریب ان کے لڑکے عمر کی خانقاہ ہے، وہ ہمیشہ اپنی خانقاہ ہی میں رہتے ہیں، اور اپنے باپ کے طریقہ پر چلتے ہیں، ہم نے ابوالبرکات سے ملاقات کی ان کی عمر اسیّ ۸۰ برس سے زیادہ تھی، انہوں نے ہمارے لیے یہ دعا کی، اور ان کے لڑکے عمر سے بھی ملنے کی خواہش کی، چنانچہ ہم ان سے بھی ملے اور انہوں نے بھی ہمارے لیے دعا کی، اس طرح ہم آخرت کے دو آدمیوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

مسجد عتیق میں بھی ایک بزرگ رہتے تھے، جن کا نام سلمہ تھا، وہ بڑے زاہد اور پرہیز گار تھے ہم ان سے ملے، انہوں نے ہمارے لیے دعا کی اور ہم وہاں سے رخصت ہوئے، اس شہر میں ایک اور بزرگ اسی نام کے تھے، جو بطور تواضع للہ اپنے سر کو کھلا رکھتے تھے، اسی لیے ان کا نام ہی ''سلمہ مکشوف الرأس'' (سر کھلا رکھنے والا سلمہ) پڑ گیا تھا، جب ہم ان سے ملنے کی غرض سے ان کے گھر پہنچے تو ہمیں اطلاع ملی کہ وہ عبادت کی غرض سے جنگل کی طرف جا چکے

ہیں۔

اس شہر میں بہت سے مخیر لوگ رہتے ہیں، یہاں کے باشندے نرم دل اور خوش مزاج واقع ہوئے ہیں، غرباء سے محبت کرتے ہیں اور فقراء پر بخشش کرتے ہیں، موصل، دیار بکر اور دیار ربیعہ سے لے کر شام کے شہروں تک میں لوگوں کی یہی حالت ہے۔ یہ سب لوگ غرباء سے محبت کرتے ہیں اور فقراء کی عزت کرتے ہیں، دیہات کے لوگوں کا بھی یہی حال ہے، تنگ دست فقراء کو اپنے ساتھ توشہ لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کی بخششیں بہت مشہور ہیں، اس حیثیت سے یہاں کے لوگ عجیب ہیں، خدا ان کو اچھا بدلہ دے گا۔

یہاں کے اکثر لوگ عبادت گزار اور پرہیز گار ہیں، بہت سے لوگ پہاڑوں میں خدا کی عبادت کرتے ہیں جن کی نیک دعاؤں کی برکت سے خدا سب کو نفع پہنچاتا ہے۔

اس شہر میں بازاروں اور دکانوں کا انتظام بہت خوب ہے، ان کو بہترین طریقے پر سجایا جاتا ہے دکانوں کی چھتیں لکڑی کی ہیں۔ شہر والے لمبے سائے میں رہتے ہیں، شاہراہیں بہت چوڑی ہیں ہر چوک پر کئی دکانیں ہیں اور ایک بلند قبہ ہے جو گارے سے بنایا ہوا ہے، یہ چوراہے کا تاج ہے اور ایک سڑک کو دوسری سے جدا کرتا ہے، انہی دکانوں کے قریب ایک بہت ہی حسین اور خوبصورت مسجد ہے، جس کا صحن بہت ہی بڑا ہے، اس میں تین قبے ہیں جو سنگ مرمر کے ستونون پر کھڑے کئے گئے ہیں، اور ہر ایک قبے کے نیچے پانی کا کنواں ہے، صحن میں ایک چھوٹا قبہ بھی ہے جو اوروں سے بہت ہی بڑا ہے یہ سنگ مرمر کے دس ستونوں پر کھڑا کیا گیا ہے، جس میں سے ہر ستون کی گولائی نو بالشت ہے۔ اس قبے کے بیچ میں سنگ مرمر کا ایک موٹا ستون ہے جس کی گولائی پندرہ بالشت ہے یہ قبہ روم کی عمارتوں کا ہے اس کا بالائی حصہ مجوف ہے، وہ ایک مضبوط برج کی طرح دکھائی دیتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس میں لڑائی کا سامان رکھا جاتا تھا، واللہ اعلم۔

اس عظیم الشان جامع مسجد کی چھت لکڑی کی ہے، اس کی شہتیریں بہت چوڑی اور لمبی

ہیں، اس کی وسعت پندرہ قدم ہے، گویا وہ پانچ شہتیروں کا مجموعہ ہے، ہم نے کسی جامع مسجد کو نہیں دیکھا جس کے ستونوں کی کمانیں اس جامع مسجد کی طرح وسیع اور کشادہ ہوں۔

صحن سے لگی ہوئی دیواریں مختلف دروازے ہیں، اس میں کل انیس دروازے ہیں، نو دائیں اور نو بائیں اور بیچ میں ایک بہت بڑا پھاٹک ہے، اس کے کمان بہت عمدہ اور شاندار ہیں، گویا وہ کسی بڑے شہر کا پھاٹک معلوم ہوتا ہے۔ ان دروازوں کے چوکھٹے لکڑی کے ہیں، ان پر عجیب وغریب نقش ونگار کیا گیا ہے، جو عموماً شاہی قصروں کے دروازوں پر پایا جاتا ہے، ہم نے جب اس جامع مسجد کی بہترین بناوٹ اور دوکانوں کی ترتیب اور سجاوٹ کو دیکھا تو ہمیں ایک پرکیف منظر نظر آیا، دوسرے شہروں میں اس جیسا انتظام بہت کم پایا جاتا ہے۔

اس شہر میں ایک مدرسہ اور دو شفا خانے ہیں، یہ بہت ہی بڑا شہر ہے، اس کی فصیل بہت ہی مضبوط اور پتھروں سے بنائی گئی ہے، ان پتھروں کو ایک دوسرے پر گارے سے جوڑا گیا ہے۔ جامع مسجد کی دیواریں بھی اسی طرح مضبوط کٹے ہوئے پتھروں سے بنائی گئی ہیں۔ شہر کے پورب میں ایک مضبوط قلعہ ہے، جو شہر کی فصیل سے الگ اور جدا فضا میں قائم ہے، دونوں کے درمیان ایک بڑی خندق ہے، جس کے کنارے تہ بہ تہ پتھروں سے باندھ دیئے گئے ہیں، یہ خندق بہت ہی مضبوط اور پائیدار ہے، اور قلعہ کی فصیل بھی بہت مضبوط ہے۔

اس شہر میں ایک چھوٹی سی نہر بہتی ہے جو شہر کے پورب میں ایک جگہ سے نکلتی ہے۔ یہ شہر بہت ہی آباد، دولتمند اور بابرکت ہے، اس میں بہت سی مسجدیں اور سرائیں ہیں۔

اس کا والی مظفر الدین بن زین الدین ہے، جو صلاح الدین ایوبی کے ماتحت ہے، اور موصل، نصیبین اور فرات تک کے یہ تمام شہر جن کو دیار ربیعہ کہا جاتا ہے اور جس کی حد نصیبین سے لے کر فرات تک ہے اور جس میں جنوبی راستہ بھی شامل ہے اور دیار بکر جن میں آمد، میافارقین وغیرہ جیسے شہر شامل ہیں، اس میں سے کوئی بادشاہ بھی ایسا نہیں ہے جو صلاح الدین کا مقابلہ کر سکے یہ اگرچہ مطلق العنان فرماں روا ہیں، مگر جب بھی وہ چاہے ان کے ہاتھوں سے ان کا ملک چھین لے سکتا ہے۔

ہم شہر سے باہر اس نہر پر اترے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے، ہم نے پیر اور منگل دو دن آرام کیا، منگل کی دو پہر کو ظہر کے بعد ہم سلمہ مکشوف الراس سے ملے جن سے پہلے دن ہماری ملاقات نہیں ہو سکی تھی، انہی کی مسجد میں ان سے ہماری ملاقات ہوئی، ہم نے ان کے چہرے پر بزرگی اور نیکی کے آثار پائے، وہ ہم سے بہت اچھی طرح ملے، اور ہمارے لیے دعا کی، پھر ہم وہاں سے رخصت ہو کر پلٹے اور ہم نے ان اولیاء صالحین اور عباد مقربین کی ملاقات پر خدا کا شکر ادا کیا، ۹ ربیع الثانی کو یعنی منگل کی رات ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ [1]

حران کی بربادی

حران کا یہ عظیم الشان شہر صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں تاراج ہوا، اور پھر تاتاریوں کے حملوں نے اس کو بالکل ہی ویران اور برباد کر ڈالا۔

ابو الفدا کا بیان

چنانچہ ابو الفدا (المتوفی: ۷۳۲ھ) لکھتے ہیں:

> ''حران ایک بہت بڑا شہر تھا، مگر آج کل ویران ہے، اس کے پورب اور دکھن میں دو فرسخ کی دوری پر بہت سے پہاڑ ہیں، یہاں کی مٹی سرخ رنگ کی ہے، اور یہاں کے باشندے قناۃ نہر کا پانی پیتے ہیں، جو شہر کے باہر چند چشموں سے نکلتی ہے۔'' [2]

حران تجارتی راستے پر واقع تھا، وہ شہد اور قبیط [3] کی تجارت کے لیے بہت مشہور تھا۔ آج کل یہ ایک چھوٹا سا قریہ ہے، یہاں مکئی، تمباکو اور گنے کی کاشت ہوتی ہے۔

اس شہر کی بزرگی اور فضیلت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی خاک سے ایک ایسا مرد مجاہد پیدا ہوا جس نے اپنی زبان و قلم سے مسلمانوں کے اندر علم و عمل کی ایک زبردست روح پھونکی اور ان کی زندگی کے ہر ایک گوشے میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ یہ مرد مجاہد کون تھا؟

---

[1] رحلة ابن جبير، مطبوعة يورپ، ص: ۲۴۴ _ ۲۴۷ _

[2] تقويم البلدان، ص: ۲۷۷_

[3] یہ ایک قسم کی مٹھائی ہے۔

یہ وہی شخص ہے جس کو دنیا آج شیخ الاسلام والا نام، بحر العلوم، سید الحفاظ، فرید العصر، علامہ الزماں، ترجمان القرآن، ناصر السنۃ وقامع البدعۃ شیخ تقی الدین ابوالعباس احمد بن شیخ شہاب الدین ابوالمحاسن عبدالحلیم بن شیخ مجد الدین ابوالبرکات عبدالسلام بن ابی محمد عبداللہ بن ابی القاسم الخضر بن محمد بن الخضر بن علی بن عبداللہ المعروف بابن تیمیہ کے نام اور القاب سے یاد کرتی ہے۔ ان کے تفصیلی حالات زندگی کو پیش کرنے سے پہلے ہم مختصر طور پر ان کے آباء و اجداد اور ان کے پورے خاندان کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

نوٹ: حران اور دیگر مشہور مقامات کا نقشہ ص 37 پر ملاحظہ ہو۔

آباء و اجداد اور خاندان

اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کا نسب نامہ لکھتے ہیں:

قونیہ
حران
موصل
دمشق
حمص
قاہرہ
تبریز
الموت
قزوین
ہمدان
بغداد
کوفہ
اصفہان
بصرہ
شیراز
مدینہ
مکہ
نجد
بحرین
شمال
جنوب
الربع الخالی
صنعاء
یمن
عدن
حضرموت
عمان
بحر عرب
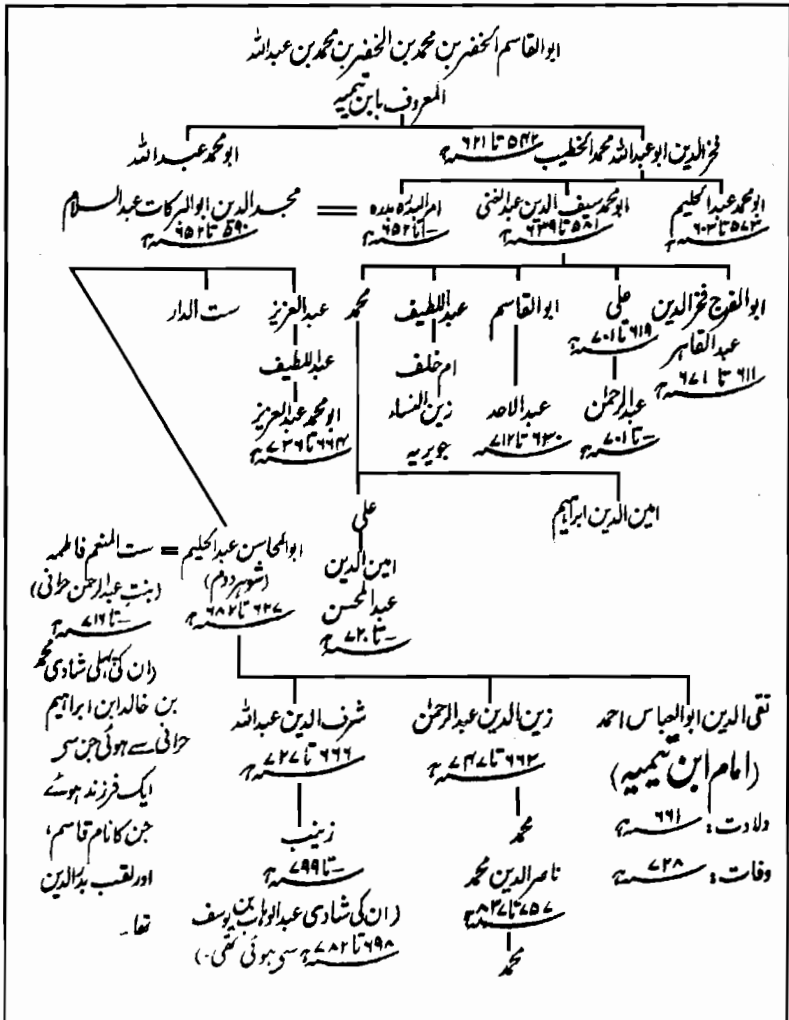
ابن تیمیہ کے عرف کی وجہ

اس خاندان کا ہر ایک فرد ''ابن تیمیہ'' کے عرف سے مشہور تھا، اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق ابن خلکان نے ابو البرکات ابن المستوفی کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ابن تیمیہ کے پردادا القاسم الخضر کے بڑے صاحبزادے فخر الدین محمد الخطیب ۶۰۴ھ میں حج کرتے ہوئے اربل کے گاؤں سے گزری ابن المستوفی نے ان سے ملاقات کی اور ابن تیمیہ کی وجہ تسمیہ پوچھی، انہوں نے جواب دیا کہ ان کے نانا نے حج کیا اس وقت ان کی نانی حاملہ تھیں، جب وہ تیاء پہنچے جو تبوک کی بیابان میں ایک چھوٹا سا قریہ ہے تو ایک چھوٹی خوبصورت لڑکی کو ایک خیمہ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا، جب حج سے اپنے وطن لوٹے تو انہیں لڑکی کی خوشخبری سنائی گئی اور وہ لڑکی ان کے سامنے پیش کی گئی، چونکہ وہ لڑکی شکل وصورت کے لحاظ سے اس لڑکی کے بالکل مشابہ تھی جس کو انہوں نے تیاء میں دیکھا تھا، اس لیے ان کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا ''یا تیمیہ یا تیمیہ''! پھر آگے چل کر اس لڑکی نے اتنی شہرت حاصل کی کہ اس کے بطن سے جتنی اولاد ہوئی وہ سب کی سب ''ابن تیمیہ'' کے عرف سے مشہور ہوئی۔

لیکن اس روایت کے ساتھ ہی ابن خلکان نے یہ شک بھی ظاہر کر دیا ہے کہ اگر تیمیہ ''تیاء'' کی طرف منسوب ہو تو نحوی قاعدے کے لحاظ سے تیاویہ ہونا چاہیے۔ [1]

حافظ ابن رجب نے محمد بن النجار کے واسطے سے جو فخر الدین محمد الخطیب کے مشہور شاگردوں میں سے تھے یہ روایت بیان کی ہے کہ ابو القاسم الخضر کی دادی کا نام تیمیہ تھا، یہ بہت قابل، عالم اور فاضل تھیں اور وعظ کہا کرتی تھیں۔ [2]

اس روایت کی تائید امام ابن تیمیہ کے شاگرد حافظ ابن کثیر (المتوفی: ۷۷۴ھ) کی کتاب ''اختصار علوم الحدیث'' سے بھی ہوتی ہے، جس میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ امام موصوف کے ایک دور کے دادا کی ماں کا نام تیمیہ تھا۔ [3]

---

[1] ابن خلکان: ۲/ ۳۴۸۔ [2] طبقات الحنابلہ لابن رجب قلمی، تذکرہ فخر الدین ابن تیمیۃ۔ [3] اختصار علوم الحدیث، ص ۸۶۔

ابو القاسم الخضر بن محمد بن الخضر بن محمد بن عبد اللہ

امام ابن تیمیہ کا سلسلۂ نسب یوں تو نویں پشت تک ملتا ہے مگر ابو القاسم الخضر ابن تیمیہ سے پہلے کے حالات معلوم نہیں ہیں، ابو القاسم الخضر کے متعلق تذکروں میں صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ وہ بہت بڑے زاہد اور عابد تھے، ابن خلکان کے الفاظ یہ ہیں: [1] ''كَانَ اَبُوْهُ اَحَدُ الْاَبْدَالِ وَالزُّهَادِ'' یعنی ان کے والد ابدال اور زہاد میں سے ایک تھے۔

ابو القاسم الخضر کی اولاد

تذکروں سے ابو القاسم الخضر کے صرف دو صاحبزادوں کا پتہ چلتا ہے ایک فخر الدین محمد اور دوسرے امام ابن تیمیہ کے پردادا عبد اللہ۔ ابو الحسن علی بن عبدوس الحرانی کے تذکرے میں فخر الدین محمد بن تیمیہ کو ماموں بتایا گیا ہے، [2] جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابو القاسم الخضر کی ایک صاحبزادی بھی تھیں، جو عمر بن عبدوس الحرانی سے بیاہی گئی تھیں۔ یہ صاحبزادی اپنے بھائی فخر الدین ابن تیمیہ سے سن کے لحاظ سے بہت بڑی تھیں، کیونکہ ان کے لڑکے ابو الحسن علی ابن عبدوس اور ان کے بھائی فخر الدین محمد کی عمر میں اکتیس برس کا فرق ہوتا ہے۔ ابو الحسن علی ابن عبدوس ۵۱۱ھ میں پیدا ہوئے تھے اور فخر الدین ابن تیمیہ کی ولادت ۵۴۲ھ میں ہوئی تھی، اس لیے یہ گمان ہوتا ہے کہ فخر الدین شاید دوسری ماں کے ہوں، فخر الدین ابھی بچے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا، ان کی والدہ اور پھوپھی نے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی۔

فخر الدین محمد ابن تیمیہ

نام و نسب اور ولادت

محمد نام، ابو عبد اللہ کنیت اور فخر الدین لقب تھا، اواخر شعبان ۵۴۲ھ کو حران میں پیدا ہوئے، زمانے کے دستور کے مطابق قرآن مجید سے ان کی تعلیم کی ابتداء ہوئی، چونکہ حافظہ اچھا تھا، اس لیے پورا قرآن مجید حفظ کر لیا، پھر اپنے والد ہی سے قراءت سیکھی، اور دس گیارہ

---

[1] وفیات الاعیان: ۲/ ۳۴۸، تذکرة فخر الدین ابن تیمیة۔

[2] طبقات الحنابلہ لابن رجب: ۱/ ۱۵۹۔۱۶۱۔

برس کی عمر میں تجوید اور قراءت سبعہ میں کافی مہارت پیدا کر لی۔ [1]

تعلیم و تربیت

اس زمانے میں ابو الکرم فتیان بن مباح بن احمد بن سلیمان بن مبارک سلمیٰ حنبلی (۵۱۳ـ۵۶۶ھ) حران کے ممتاز علمائے حدیث میں شمار ہوتے تھے، موصوف نابینا تھے، مگر تفسیر، حدیث، احکام، لغت، اعراب اور تجوید میں بڑے ماہر تھے، فخر الدین نے علم حدیث انہی سے حاصل کرنا شروع کیا، اور ایک مدت تک ان کے درس میں شریک ہوتے رہے، پھر اپنے بھانجے ابو الحسن علی بن عمر بن احمد بن عثمان بن احمد بن علی بن عبدوس الحرانی کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے رہے، موصوف تفسیر، فقہ اور معاملات کے بہت بڑے عالم تھے، حران کی جامع کے امام اور خطیب بھی تھے، خطابت اور وعظ گوئی میں ان کو کمال حاصل تھا، اخلاق اور واعظانہ اشعار سے اپنی تقریر اور خطابت میں وہ زور پیدا کر دیتے تھے جس کا سننے والوں پر بہت اچھا اثر پڑتا تھا ان کی وفات (۹ ذوالحجہ ۵۵۹ھ) تک فخر الدین انہی سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے جب ان کا انتقال ہوا تو فخر الدین نے ایک پر زور مرثیہ لکھا، [2] جس کے چند اشعار تذکروں میں منقول ہیں، ان کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

قَد زَادَ حُزْنِیْ وَاسْتَمْکَنَتْ عِلَلِیْ
لَمَّا رَحَلْتَ عَنِ الْاِخْوَانِ یَا اَمْلِیْ

اے میری مرجع امید! جب تو اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ کر کوچ کر گیا، تو میرا غم زیادہ ہو گیا، اور میری بیماریاں اور جڑ پکڑ گئیں۔

یَا عَالِمًا اَوْحَشَ الدُّنْیَا بِغِیْبَتِہٖ
لَاصُنْعَ لِیْ فِیْ قَضَاءِ اللّٰہِ وَالْاَجَلِ

اے وہ عالم! جو خود غائب ہو کر دنیا کو وحشت میں ڈال گیا، خدا کی قضا اور موت میں میرا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

---

[1] طبقات الحنابلہ تذکرہ فخر الدین ابن تیمیہ۔

[2] طبقات الحنابلہ تذکرہ ابو الحسن ابن عبدوس

يَا اَهْلَ حَرَّانَ وَالْهِفِيْ رَوَا اَسَفِيْ
عَلٰى فِرَاقِ ابْنِ عَبْدُوْسِ الْفَقِيهِ عَلِيْ

اے حران کے رہنے والو! ہائے افسوس! علی ابن عبدوس فقیہ کی جدائی پر۔

وَاحَسْرَتَاهُ عَلٰى زَيْنِ الزَّمَانِ وَمَنْ
كَانَتْ عَقِيْدَتُهُ بِالْقَوْلِ وَالْعَمَلِ

وائے حسرت ان پر جو زمانہ کے لیے زینت بنے ہوئے تھے اور جن کا عقیدہ قول اور عمل پر تھا۔

يَا قَوْمِ مَا الصُّنْعُ بَعْدَ الْفِرَاقِ لَهٗ
لَا صُنْعَ لِلْعَبْدِ فِي شَيْءٍ مِنَ الْحِيَلِ

اے میری قوم! اس کی جدائی کے بعد کیا کیا جا سکتا ہے، بندہ کسی قسم کی بھی چارہ گری نہیں کر سکتا۔

كَانَ الْفَقِيْهُ عَلِيٌّ عَالِمًا وَرَعًا
وَكَانَ مَسْلَكُهٗ فِيْ اَحْسَنِ السُّبُلِ

فقیہ علی عالم اور پرہیزگار تھے اور ان کا مسلک بہترین راہ ہدایت تھا۔

كَانَ الْفَقِيْهُ عَلِيٌّ فَوْقَ مِنْبَرِهٖ
مِثْلَ الْعَرُوْسِ تَرٰى فِي اَحْسَنِ الْحُلَلِ

فقیہ علی اپنے منبر پر بہترین پوشاک پہنے ہوئے دولہا کے مانند دکھائی دیتے تھے۔

كَانَ الْفَقِيْهُ عَلِيٌّ غَيْرَ مُبْتَدِعٍ
بَلْ كَانَ فِيْ دِيْنِهٖ كَالْفَارِسِ الْبَطَلِ

فقیہ علی بدعتی نہیں تھے بلکہ اپنے دین میں پہلوان شہسوار کی طرح تھے۔

يَقُوْلُ اِنَّ كَلَامَ اللّٰهِ ذُوْقِدَمٍ
حَرْفٌ وَّ صَوْتٌ عَلَى التَّحْقِيْقِ كَيْفَ تُلِيْ

اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام قدیم ہے وہ درحقیقت حرف وصوت ہے، چاہے وہ کسی طرح سے بھی پڑھا جائے۔

كَانَ الْفَقِيْهُ عَلِيٌّ دَائِمًا اَبَدًا
يَذْكُرُ مَوْلَاهُ ذَا خَوْفٍ وَذَا وَجَلِ

فقیہ علی ہمیشہ اپنے آقا کو یاد کرتے تھے اور اس سے ڈرتے اور خوف کرتے رہتے تھے۔

وَرُوْحُهُ قُبِضَتْ فِيْ لَيْلَةٍ شُرِفَتْ
يَحْظٰى بِهَا كُلُّ مَحْبُوْبٍ وَّ كُلُّ وَلِيْ

اُن کی روح ایک بزرگ رات میں قبض کی گئی، جس کی سعادت ہر ایک محبوب اور ہر ولی کو ملتی ہے۔

اَبْكِيْ عُيُوْنَ الْوَرٰى حُزْنًا لِفُرْقَتِهٖ
وَاَرْسِلِ الدَّمْعَ يَارُوْحِيْ مِنَ الْمُقَلِ

اے میری روح! اس کی جدائی کے غم پر تمام مخلوق کو رُلا اور اپنے حلقۂ چشم سے آنسو بہا۔

بَكَتْ عَلَيْهِ عُيُوْنُ النَّاسِ كُلُّهُمُ
وَاَوْحَشَ الْكُلَّ مِنْ سَهْلٍ وَمِنْ جَبَلِ

تمام لوگوں کی آنکھیں اُن پر روئیں اور زمین اور پہاڑ ان کی وفات کی وجہ سے وحشت ناک ہو گئے۔

بَكَتْ عَلَيْهِ الذَّوَايَا الْخَالِيَاتُ كَمَا
قَدْ كَانَ يُوْنِسُهَا مِنْ غَيْرِ مَا مَلَلِ

تمام سونی زاویے اور خانقاہیں اُن پر روئیں جس طرح بغیر کسی رنج کے ان سے پہلے انس حاصل کرتی تھیں۔

بَكَتْ دَفَاتِرُهُ حُزْنًا عَلَيْهِ وَاسِى

لِاَنَّهٗ كَانَ عَنْهَا غَيْرَ مُشْتَغِلِ

اُن کی کتابیں غم اور ہمدردی کی وجہ سے اُن پر روئیں، کیونکہ وہ اب اپنی کتابوں سے بے پروا ہو چکے تھے۔

عَلٰى عَلِيٍّ سَلَامٌ غَيْرَ مُنْفَصِلٍ
عَلٰى مَمَرِّ اللَّيَالِيْ الدَّهْرِ مُتَّصِلِ

علی پر روز وشب کے گزرنے کے باوجود زمانہ بھر غیر منفصل سلام ہو۔

بغداد کا سفر

حران میں ابتدائی تعلیم کے ختم کرنے کے بعد فخر الدین خطیب نے تکمیل علم کی غرض سے بغداد کا سفر کیا، یہ ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ کس سن میں بغداد تشریف لے گئے، تذکروں سے بظاہر ایسا پتہ چلتا ہے کہ ابوالحسن علی بن عبدوس الحرانی (المتوفی: ۵۵۹ھ) کی وفات کے بعد وہ بغداد چلے گئے، اس زمانے میں بغداد ہر فن کے بڑے بڑے صاحبِ کمال اور جید علما کا مرکز تھا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ (المتوفی: ۵۶۱ھ) اور شیخ جمال الدین ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی ابن جوزی (المتوفی: ۵۹۷ھ) اس دور کے مشہور عالم اور واعظ تھے، ارشاد و ہدایت میں شیخ عبدالقادر جیلانی اور تفسیر اور وعظ وخطابت میں ابوالفرج ابن جوزی کا نام ہر جگہ مشہور ومعروف تھا، ان کے علاوہ بہت سے اصحابِ فن موجود تھے جن کے تذکرے فن رجال کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

اب ٹھیک طور پر یہ نہیں معلوم کہ حضرت شیخ عبدالقادر رحمہ اللہ سے فخر الدین کی ملاقات ہوئی تھی یا نہیں، ان کے ساتھی شیخ موفق الدین بن قدامہ حنبلی کے حالات میں مذکور ہے کہ وہ بغداد اسی سال پہنچے جس سال کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا انتقال ہوا، انہیں صرف پچاس دن کی مبارک صحبت نصیب ہوئی تھی، غالباً فخر الدین شیخ جیلانی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد بغداد پہنچے اور مختلف علما و اصحابِ فن کی شاگردی اختیار کی، اور ابو طالب مبارک بن خضیر (المتوفی: ۵۶۳ھ) مسند العراق ابوالفتح ابن البطی محمد بن عبدالباقی بن احمد بن سلیمان (المتوفی: ۵۶۴ھ)، شیخ سعد اللہ بن نصر بن سعید المعروف بابن الدجاجی (المتوفی: ۵۶۴ھ)، شیخ علی

ابن عساکر البطائحی (المتوفی: ۵۷۲ھ)، شیخ یحییٰ بن ثابت بن بندار (المتوفی: ۵۶۶ھ)، ابوالفضل احمد بن صالح بن شافع جیلی (المتوفی: ۵۶۵ھ)، ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی الحسین احمد بن محمد المعروف بابن النقور (المتوفی: ۵۶۵ھ)، ابونصر عبدالرحیم بن عبدالخالق یوسفی (المتوفی: ۵۷۴ھ) اوران کے بھائی ابوالحسین عبدالحق (المتوفی: ۵۷۵ھ)، شیخ ابوالفتح عبید اللہ بن عبداللہ المعروف بابن شاتیل (المتوفی: ۵۸۱ھ) اور دیگر مشہور علمائے حدیث سے حدیث سنی، اور اُن سب کے فیض صحبت سے بہت مستفید ہوئے، ان کے شیوخِ حدیث میں ایک صاحب کمال خاتون بھی تھیں، جن کا نام شہدہ تھا، یہ ابونصر احمد بن الفرج بن عمر الابری کی صاحبزادی اور ابوالحسین علی بن محمد بن یحییٰ الدرینی المعروف بثقۃ الدولۃ بن الانباری کی بیوی تھیں، ان کا لقب فخر النساء تھا، بڑی عالم اور فاضل تھیں، اس کے علاوہ وہ بہت ہی خوشنویس بھی تھیں، اسی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ کاتبہ بھی لکھا جاتا تھا۔

فقہ حنبلی میں حافظ ابوالفرج ابن الجوزی کے داماد احمد بن محمد بن المبارک بن احمد بن بکروس الدینوری (المتوفی: ۵۷۳ھ) اور نصر بن فتیان بن مطر النہروانی المعروف بابن المنی (المتوفی: ۵۸۳ھ) طالب علموں کا مرجع اور مرکز تھے، ابن بکروس اپنے ہی قائم کردہ مدرسے میں فقہ کا درس دیتے تھے، ابن المنی اس زمانے کے باکمال استادوں میں تھے، ساتویں صدی ہجری کے جتنے حنبلی فقہاء گزرے ہیں وہ یا تو اُن کے شاگرد ہیں یا ان کے شاگردوں کے شاگرد۔ چنانچہ حافظ ابن رجب رحمہ اللہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:

> ''اس زمانے کے تمام حنبلی فقہاء انہی کی طرف یا ان کے شاگردوں کی طرف رجوع کرتے تھے میں کہتا ہوں کہ اس وقت کا یہی حال ہے کیونکہ اس وقت کے حنبلی فقہاء دو آدمیوں یعنی شیخ موفق الدین مقدسی اور شیخ مجد الدین ابن تیمیہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ شیخ موفق الدین شیخ ابن المنی کے شاگرد تھے اور شیخ مجد الدین ابن تیمیہ شیخ ابوبکر محمد الحلاوی (المتوفی: ۶۱۱ھ) کے شاگرد ہیں اور یہ ابوبکر ابن المنی ہی کے شاگرد کے شاگرد تھے۔'' [1]

---

[1] طبقات الحنابلہ ص: ۲٤۱، ۲٤۲۔

شیخ ابن المنی نے شادی نہیں کی تھی، خلیفۂ وقت المستضی باللہ (۵۶۶ھ تا ۵۷۵ھ) ان کا بڑا عقیدت مند تھا، اس نے ان کے لیے جامع بغداد میں ایک حلقہ قائم کر دیا تھا کہ وہ وہاں بیٹھ کر طالب علموں کو فقہ حنبلی کا درس دیا کرتے تھے، فخر الدین نے ان دونوں صاحب کمال بزرگوں سے استفادہ کیا اور فقہ اور معاملات میں مہارت پیدا کی۔

ادب اور نحو وصرف میں ابو محمد عبداللہ بن احمد المعروف بابن الخشاب (المتوفی: ۵۶۷ھ) امام مانے جاتے تھے، خود فخر الدین کا بیان ہے کہ اس وقت بغداد میں ان سے بڑھ کر فن لغت اور نحو کا کوئی صاحب کمال موجود نہیں تھا [1]، فخر الدین ان سے ادب کی تعلیم حاصل کرتے رہے یہاں تک کہ اس میں کمال پیدا کر لیا۔

لیکن فخر الدین کا وقت زیادہ تر شیخ ابو الفرج ابن جوزی کی صحبت میں گزرتا تھا، موصوف فن تفسیر اور خطابت میں بڑا کمال رکھتے تھے، فخر الدین نے ان سے تفسیر قرآن بحث وتکرار کے ساتھ پڑھی، ابن جوزی عقائد میں ذرا متشدد واقع ہوئے تھے، وہ بدعی مسائل میں مخالفینِ عقائدِ قرنِ اول کی سخت تردید کرتے تھے، ان کے مواعظ بہت ہی مؤثر ہوتے تھے، ان کے وعظ میں اکثر خلیفۂ وقت بھی شریک ہوتا تھا، فخر الدین ابن تیمیہ نے اُن کی بلیغ اور مؤثر تقریروں کے اندازِ بیان سے بے حد فائدہ اٹھایا، اور خود بھی کبھی کبھی بغداد کی رباط ابن النعال میں تقریریں کیں۔

حران کی واپسی

تکمیل تعلیم سے فارغ ہو کر فخر الدین ابن تیمیہ حران واپس آئے، ان کی واپسی کی تاریخ تذکروں میں موجود نہیں ہے، شیخ تقی الدین ابن تیمیہ نے حامد بن ابی الجبر کی تاریخ وفات: ۵۶۹ھ کی صحت پر اس بنا پر شبہ ظاہر کیا ہے کہ فخر الدین نے بغداد سے حران آنے کے بعد حامد بن ابی الجبر سے تعلیم حاصل کی۔ [2]، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فخر الدین اس تاریخ کے قریب یا اس کے بعد ہی اپنے وطن لوٹے۔

حران آنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا، بلکہ وہ حامد بن ابی الجبر کے درس

---

[1] ایضًا : ۲۱۰، ۲۱۴۔ [2] طبقات الحنابلہ تذکرہ حامد بن ابی الحجر۔

میں شریک ہوتے تھے، اور ان سے قرآن مجید کی مشکل آیتوں کا مطلب دریافت کرتے تھے، نورالدین محمود زنگی حامد بن ابی الحجر کی بڑی قدر کرتا تھا، اور اس نے ان کے لیے مدرسۂ نوریہ قائم کیا تھا، انہیں تفسیر اور خطابت میں بھی بڑا کمال حاصل تھا، خود فخر الدین کا بیان ہے کہ جب وہ تفسیر پڑھانے لگتے تھے یا وعظ کہتے تھے تو ان کا ہر ایک لفظ اتنا واضح، صاف اور پرشکوہ ہوتا تھا کہ سننے والوں کے دلوں کے پردے ان کی آواز سے مرتعش ہو جاتے تھے۔ [1]

ان کے علاوہ حران میں ایک صاحبِ کمال فقیہ تھے جن کا پورا نام فخر الدین احمد ابن ابی الوفاء تھا، یہ دراصل بغداد کے رہنے والے تھے، بغداد سے حلب گئے تھے اور وہاں سے حماۃ آئے تھے اور آخر یہیں ۵۷۶ھ میں وفات پائی تھی، فخر الدین ان سے بھی بہت استفادہ کرتے رہے۔

تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فخر الدین نے درس و تدریس، وعظ و نصیحت اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا، اپنے زورِ بیان اور لطافتِ زبان کی وجہ سے وہ بہت جلد عوام اور خواص میں مشہور ہو گئے، اور چند ہی دنوں میں حاکموں کے پاس اُن کا رُسوخ بڑھ گیا، یہاں تک کہ جامع حران کی خطابت اور مدرسۂ نوریہ کے مدرسے کے لیے اُن کا انتخاب عمل میں آیا، اور اس طرح وہ باقاعدہ سرکاری ملازم ہو گئے، اب انہوں نے ہر صبح کو حران کی جامع مسجد میں تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع کیا، ان کا یہ سلسلہ ۵۸۸ھ میں شروع ہوا تھا جو ۶۱۰ھ تک جاری رہا، اس بائیس تیئس برس کی مدت میں انہوں نے پانچ مرتبہ پورے قرآن مجید کی تفسیر کی۔

حج بیت اللہ

فخر الدین ۶۰۴ھ میں حج کے لیے نکلے، اربل کا حاکم امیر مظفر الدین ان کا بڑا معتقد تھا، جب فخر الدین اربل سے ہو کر گزرے تو امیر موصوف نے خلیفہ عباسی الناصر لدین اللہ (۵۷۵ھ۔ ۶۲۲ھ) کے نام ایک تعارفی خط لکھا، جس میں فخر الدین کی قدر و منزلت واضح کر

---

[1] ایضاً۔

کے ان کی عزت افزائی کی درخواست کی تھی، فخر الدین پہلے حرمین کی زیارت کے لیے گئے اور حج سے فارغ ہونے کے بعد محرم ۶۰۵ھ میں بغداد آئے، وہ اپنی خطابت کی وجہ سے طالب علمی کے زمانے ہی میں کافی مشہور ہو چکے تھے۔ ان دنوں جمال الدین ابوالفرج ابن الجوزی کی جگہ پر محی الدین یوسف ابن الجوزی نیابت کر رہے تھے، یہ بالکل نوجوان تھے، لوگوں نے فخر الدین سے وعظ کی درخواست کی، انہوں نے بغداد کے بابِ بدر میں ایک زوردار وعظ کہا، اس میں محی الدین یوسف ابن الجوزی بھی شریک تھے، لوگوں کا ایک کثیر مجمع تھا، اثنائے وعظ میں انہوں نے یہ چبھتا ہوا شعر پڑھا:

وَابْنُ اللَّبُوْنِ اِذَا مَا لُزَّفِي قَرْنٍ
لَمْ يَسْتَطِعْ صَولَةَ الْبُزْلِ الْقَنَاعِسِ

اور اونٹ کا تین سالہ بچہ جب اپنے ہمجوڑ سے چمٹ بھی جائے تو بوڑھے اونٹ کا سا حملہ نہیں کر سکتا۔

لوگ سمجھ گئے کہ اس میں محی الدین یوسف ابن الجوزی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہ اس وقت صرف چوبیس برس کے نوجوان تھے، اور فخر الدین باسٹھ برس کے تجربہ کار بوڑھے تھے، ظاہر ہے کہ ان کے وعظ کے سامنے محی الدین ابن الجوزی کے وعظ کا کیا رنگ جم سکتا تھا۔

تحریری مباحثہ

شیخ موفق الدین ابن قدامہ مقدسی حنبلی (المتوفی: ۶۲۰ھ) فخر الدین ابن تیمیہ کے معاصر تھے، اور فقہ میں دونوں ایک ہی استاد یعنی ابن المنی کے شاگرد تھے۔ شیخ موفق الدین ایک زبردست عالم تھے، ان کے علم کے مرتبہ کا اندازہ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ ملک شام میں امام اوزاعی کے بعد شیخ موفق الدین سے بڑھ کر کوئی فقیہ نہیں داخل ہوئے۔ [1]

شیخ موصوف عقائد کے معاملے میں بہت ہی محتاط تھے، وہ کسی ایسے شخص کو جو خلق قرآن جیسے بدعی مسئلوں کا قائل ہو، کافر نہیں سمجھتے تھے، اور نہ اس کے دوزخی ہونے کا فتویٰ دیتے

---

[1] شذرات الذهب: ۱/ ۸۹۔

تھے، جیسا کہ اس زمانے کے عام علمائے حنابلہ کا خیال تھا۔

شیخ موفق الدین نے اپنی کسی کتاب میں اس مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر کیے تھے، فخر الدین ابن تیمیہ نے انہیں لکھ بھیجا کہ یہ فقہائے حنابلہ کے عقیدے کے بالکل خلاف ہے۔ شیخ موصوف نے اس کا جواب لکھا، ان دونوں کی تحریریں نایاب ہیں، البتہ حافظ ابن رجب نے اپنے تذکرے میں شیخ موفق الدین کے جستہ جستہ اقتباسات نقل کیے ہیں، اس میں شیخ نے اپنے مخالف کا نام بہت ہی عزت کے ساتھ لیا ہے، اور ان کو جمال الاسلام اور ناصر السنۃ کے لقب سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ محض فقہاء حنابلہ کے کہہ دینے سے ایسے مہتم بالشان اختلافی مسائل اجماعی نہیں بن جاتے تاوقتیکہ کتاب وسنت اور ائمہ امت کے اقوال سے اس کا ثبوت نہ ہو، اگر فخر الدین ابو الفرج ابن الجوزی یا ابن الزاغونی [1] کی تقلید میں اہل بدعت کے ہمیشہ دوزخی ہونے کی قائل ہیں تو انہیں اس کا حق حاصل ہے مگر شیخ نے لکھا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین اور تمام ائمہ مرشدین کی اتباع میں ان اختلافی مسائل کے اندر سکوت کرنا ہی بہتر سمجھتے ہیں، کیونکہ اس قسم کے تمام مسئلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے بعد پیدا ہوئے اور ان کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اجلۂ اصحاب سے کوئی صریح اقوال منقول نہیں ہیں، ایسی حالت میں کسی مسلم کی تکفیر کرنے کی بجائے جس کے متعلق آنحضرت کی سخت وعید آئی ہے، خاموش رہنا ہی زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

پھر ابو نصر سجزی [2] کی تحریر کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ خلق قرآن کے قائلین کے متعلق ائمہ امت کا اختلاف ہے بعض ان کو اسلام سے خارج سمجھتے ہیں، اور بعض اُن کے قول کو ایسا کفر قرار دیتے ہیں، جو کسی کو ملتِ اسلامیہ سے خارج نہیں کرتا، امام احمد ابن حنبل سے بڑھ کر کون اہل بدعت کا اتنا مخالف تھا، اس کے باوجود وہ خلیفہ معتصم باللہ کو امیر المؤمنین کہا کرتے تھے، حالانکہ وہ خلق قرآن کا نہ صرف قائل تھا، بلکہ دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتا تھا، اسی

---

[1] علی ابن عبداللہ بن ناصر بن السری الزاغونی الحنبلی نے ۵۲۷ھ میں وفات پائی۔

[2] ابو نصر السجزی الوائلی (المتوفی: ۴۶۹ھ) انہوں نے عقائد کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''کتاب الابانۃ فی الاصول'' تھا۔

طرح وہ قائلین خلق قرآن خلیفوں اور حاکموں کے پیچھے جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھنے کو جائز سمجھتے تھے اور ان کی اطاعت کو واجب قرار دیتے تھے، اگر وہ واقعی کافر اور دوزخی ہوتے، تو امام احمد رحمہ اللہ ہرگز ان کے پیچھے نماز پڑھنے کو جائز نہ سمجھتے۔

آخر میں انہوں نے فخر الدین ابن تیمیہ کو خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر آپ خلق قرآن کے ماننے والوں کو کافر سمجھتے ہیں تو آپ کو چاہیے کہ اُن کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا اور اُن سے ملنا بالکل چھوڑ دیں، نہ تو ان کے احکام کو مانیں اور نہ ان کے مقرر کیے ہوئے قاضیوں اور حاکموں کے فیصلوں کو تسلیم کریں۔

وفات

فخر الدین الخطیب نے ۱۰ صفر ۶۲۲ ھ کو جمعرات کے دن وفات پائی، ابن خلکان نے ان کی وفات کی تاریخ ۱ صفر بتائی ہے اور سبط ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ انہوں نے ۵ صفر ۶۲۱ ھ کو وفات پائی۔

فخر الدین کے لڑکے عبدالغنی کا بیان ہے کہ اُن کا انتقال نماز کی حالت میں ہوا، جب عصر کی نماز کا وقت ہو گیا، تو عبدالغنی نے ان کو نماز کی طرف توجہ دلائی، فخر الدین نے اپنے لڑکے کے سینے سے ٹیک لگا کر رکعت باندھی اور آنکھ کے اشارے سے نماز پڑھنی شروع کی، ابھی نماز ختم ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

مختلف معاصرین کا بیان ہے کہ وہ بہت اچھے اخلاق والے تھے، سچے، دیانت دار اور پرہیز گار آدمی تھے، لوگوں میں ان کو قبولیتِ عام حاصل تھی، حکام اور رؤسا ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے اور ہر جگہ ان کا وقار قائم تھا۔ حافظ عبدالغنی نے ان کے حالات پر ایک مختصر رسالہ لکھا تھا، اور ان کے بعض شاگردوں نے مختلف لوگوں کے دیکھے ہوئے خواب یکجا جمع کر دیئے تھے۔ جن کی تفصیل طوالت کے مقتضی ہوتی ہے، اس لیے ہم ان باتوں کو یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔

تصنیفات

فخر الدین نے کئی تصنیفیں یادگار چھوڑیں، جن میں سب سے مشہور ان کی تفسیر قرآن ہے جو کئی جلدوں میں تیار ہوئی تھی، ابن رجب کے قول کے مطابق یہ تفسیر تیس جلدوں میں تھی، اس تفسیر کے بعض حوالے مختلف تذکروں میں پائے جاتے ہیں، یہ کتاب اب نایاب ہے، نیز امام غزالی کی فقہ کی تین کتابوں یعنی بسیط، وسیط اور وجیز کے ڈھنگ پر فقہ حنبلی کے متعلق تین کتابیں لکھی تھیں، جن کا نام (۱) تلخیص المطلب فی تلخیص المذھب (۲) ترغیب القاصد فی تقریب المقاصد" اور (۳) "بلغة التاعب و بغية الراغب" تھا، یہ کتابیں اب نایاب ہیں، فرائض پر ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام "الموضح فی الفرائض" تھا، انہوں نے ابوالخطاب محفوظ ابن احمد ابن الحسن الکلوذانی الحنبلی (المتوفی: ۵۱۰ھ) کی مشہور فقہی کتاب "الہدایہ" کی بھی ایک شرح لکھی تھی، ایک کتاب میں ترغیب وترہیب کے متعلق روایات کو جمع کیا تھا، اس کا نام "ترغیب" تھا، ان کے علاوہ شیخ موفق الدین مقدسی کے ساتھ تحریری مباحثے کے سلسلے میں کئی رسالے لکھے، ان کی یہ تمام کتابیں نایاب ہیں صرف ان کے حوالے مختلف کتابوں اور تذکروں میں ملتے ہیں۔

چونکہ وہ جامع حران کے خطیب بھی تھے، اس لیے مختلف خطبے تیار کیے تھے، اور نیز اس سلسلے میں مختلف اخلاقی اشعار لکھے تھے، جن کو وہ اکثر خطبوں اور وعظ کی مجلسوں میں پڑھا کرتے تھے، ان کے چند اشعار مختلف تذکروں میں منقول ہیں، مثال کے طور پر ان میں سے بعض کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

اَتَتْ رِحلَتِيْ وَآتَانِي الْمَسِيْرُ
وَزَادِيْ مِنَ النُّسْكِ نَذْرٌ حَقِيْرُ

میرے کوچ کرنے اور چلے جانے کا وقت آ گیا اور میرے پاس زہد وعبادت کا بہت ہی قلیل توشہ رہ گیا ہے۔

وَقَلْبِيْ عَلَى جَمَرَاتِ الْأَسٰى
مِنَ الْخَوْفِ مِنْ خَالِقِيْ مُسْتَطِيْرُ

اور میرا دل غم و الم کی چنگاریوں پر لوٹ رہا ہے اور میرے خالق کے خوف سے اُڑا جا رہا ہے۔

وَكَمْ زَلَّةٍ قَدْ تَقَحَّمْتُهَا
فَدَمْعِيْ لَهَا وَ عَلَيْهَا غَزِيْرُ

میں کتنی ہی لغزشوں کا مرتکب ہوا، پس اس کے لیے میرے آنسو کثرت کے ساتھ بہے جا رہے ہیں۔

مَضٰی عُمرِیْ قَدْ اِنْقَضَتْ مُدَّتِیْ
وَلَمْ يَبْقَ مِنْ ذَاكَ اِلَّا الْيَسِيْرُ

میری عمر گزر گئی اور میری مدت پوری ہو چکی، اور اب اس سے تھوڑا ہی حصہ باقی رہ گیا ہے۔

كَاَنِّيْ بِكُمْ حَامِلِيْنَ سَرِيْرَ
شَخْصِيْ وَنَاهِيْكَ ذَاكَ السَّرِيْرُ

گویا کہ میں تمہارے ساتھ مل کر اپنے ہی جسم کے تختۂ نعش کو اٹھائے جا رہا ہوں اور تیرے لیے یہی تختۂ نعش کافی ہے۔

اَرٰی قُوَّتِیْ فِیْ كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ
تَوَلّٰی اِلٰی نَقْصٍ وَتُفْضِیْ اِلٰی ضُعْفٍ

میں دیکھ رہا ہوں کہ میری قوت رات دن گھٹتی جا رہی ہے اور کمزوری پیدا ہوتی جاتی ہے۔

وَمَا ذَاكَ مِنْ كَرِّ اللَّيَالِیْ وَمَرِّهَا
وَلٰكِنْ صُرُوْفَ الدَّهْرِ صَرفٌ عَلٰی صَرَفٍ

اور یہ رات اور دن کے ہیر پھیر اور گزرنے ہی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ زمانے کی گردشیں ایک دوسرے کے بعد جاری ہیں۔

فِرَاقٌ وَّهِجْرٌ وَّاحْتِرَامُ مَنِيَّةٍ
وَكَيْدُ حَسُوْدٍ لِلْعَدَاوَةِ لَا يَخْفِيْ

جدائی اور ہجر ہے اور موت کا احترام ہے اور حاسد کا مکر دشمنی کی وجہ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔

وَدَاءٌ دَخِيْلٌ فِي الْفُؤَادِ مُقَلْقِلُ
الضُّلُوْعِ يَجَلُّ الْخَطْبَ فِيْهِ عَنِ الْوَصْفِ

اور دل کے اندر بیماری داخل ہوگئی جو پہلوؤں کے اندر شور کرتی ہے اور حد سے زیادہ معاملے کو اہم بنادیتی ہے۔

وَعِشْرَةُ اَبْنَاءِ الزَّمَانِ وَمَكْرُهُمْ
وَوَاحِدَةٌ مِّنْهَا لِهٰذَا الْقُوٰى تَكْفِيْ

اور اپنے وقت کے لوگوں کا سلوک اور ان کا فریب الگ ہے، اور ان میں ایک ہی چیز ان قوتوں کے لیے کافی ہے۔

بُلِيْتُ بِمَا مُنْذُ ارْتَقَيْتُ ذُرَى الْعُلٰى
كَمَا الْبَدْرُ فِي النُّقْصَانِ مِنْ لَيْلَةِ النِّصْفِ

میں اس وقت سے جب کہ میں بلندی کی چوٹیوں پر پہنچ گیا ہوں ان مصیبتوں سے اسی طرح آزمایا گیا ہوں، جس طرح پورا چاند پندرھویں شب سے گھٹنے لگتا ہے۔

وَمَا بَرِحَتْ تَتْرٰى اِلٰى اَنْ بَكَيْتَ مِنْ
تَضَاعِيْفِهَا ضُعْفًا يَزِيْدُ عَلٰى ضُعْفِ

وہ گھٹتا ہی رہا، یہاں تک کہ اس کی کمزوری سے جو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے مجھے رونا آ گیا۔

وَاَصْبَحْتُ شِبْهًا بِالْهِلَالِ صَبِيْحَةَ
الثَّلَاثِيْنَ اَخْفَاهُ الْمُحَاقُ عَنِ الطَّرْفِ

اور میں ہلال کی مانند ہو گیا جو تیسویں روز کی صبح کو آنکھوں سے چھپ جاتا ہے۔ [1]

شاگرد

فخر الدین ابن تیمیہ ایک مدت تک مدرسۂ نوریہ میں پڑھاتے رہے جس کو نور الدین زنگی نے قائم کیا تھا، اس کے علاوہ انہوں نے اپنا ایک خاص مدرسہ بھی جاری کیا تھا، جہاں بہت سے طلبہ ان سے تعلیم پاتے تھے، اُن میں بعض بہت مشہور ہوئے اور صاحب تصنیفات بنے، فخر الدین کے صاحبزادے سیف الدین عبدالغنی اور بھتیجے شیخ مجد الدین اور مشہور مورخ ابوعبداللہ محمد بن محمود بن الحسن بن ہبۃ اللہ بن محاسن المعروف بابن النجار (المتوفی: ۶۴۳ھ) مشہور محدث شیخ زین الدین احمد بن عبدالدائم (المتوفی: ۶۶۷ھ) حافظ محمد بن عبدالغنی المعروف بابی بکر ابن نقطہ حنبلی (المتوفی: ۶۲۹ھ) ابوعبداللہ بن حمدان الفقیہ، عبدالرحمٰن بن محفوظ الرسعنی اور شہاب الدین ابوالمعالی احمد بن اسحاق بن محمد المویدبن علی بن اسماعیل بن ابی طالب الابرقوہی الہمدانی ثم المصری (المتوفی: ۷۰۱ھ) وغیرہ ان کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔

فخر الدین ابن تیمیہ کی طبیعت میں حدت بہت تھی، ہمعصر علما سے بہت تیزی اور شدت کے ساتھ بحث کرتے تھے، جس کی وجہ سے بسا اوقات آپس کی چشمک اور منافرت کی نوبت پہنچ جاتی تھی، چنانچہ علی بن ثابت بن طالب البغدادی الازجی (المتوفی: ۶۱۸ھ) اور نجم الدین ابن ہبۃ اللہ سے ان کی بڑی بحثیں ہوئی ہیں جن کی وجہ سے یہ دونوں حران چھوڑ کر بغداد چلے گئے اور موخر الذکر نے تو بغداد ہی کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ [2]

اولاد

تذکروں میں صرف دو لڑکوں ''ابومحمد عبدالحلیم'' اور ''سیف الدین عبدالغنی'' اور ایک لڑکی ''ام البدرہ بدرہ'' کا نام ملتا ہے، اُن کے حالات ذیل میں دیئے جاتے ہیں:

---

[1] اشعار کے لغوی معنی نہیں دیے گئے ہیں بلکہ سہولت فہم کی خاطر اُن کا آزاد ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

[2] شذرات الذہب: ۵/ ۴۔

ابو محمد عبد الحلیم بن فخر الدین ابن تیمیہ

کنیت ابو محمد اور نام عبد الحلیم تھا، ۵۷۳ھ میں پیدا ہوئے تھے، بغداد میں عبد المنعم ابن کلیب، احمد بن سکینہ، مبارک ابن معطوس اور ابن جوزی وغیرہ سے حدیث سنی تھی، وہ ایک زمانے تک بغداد میں رہے اور مختلف عالموں سے فقہ حنبلی، خلافیات، اصول، حساب، ہندسہ، فلسفہ اور علوم قدیمہ کی تحصیل کی، وصیت اور وراثت کے مشکل مسائل بھی آسانی کے ساتھ حل کر لیا کرتے تھے، اور ذخیرہ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی، ان کے متعلق یہ کچھ نہیں معلوم ہے کہ انہوں نے شادی کی تھی یا نہیں یا ان کی کوئی اولاد تھی یا نہیں، انہوں نے اپنے والد کی زندگی ہی میں یعنی ۶ شوال ۶۰۳ھ کو اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی، حافظ ضیاء الدین محمد بن عبد الواحد المقدسی (المتوفی: ۶۴۳ھ) نے ان سے ''جزء ابن عرفہ'' پڑھا تھا۔

ابو محمد سیف الدین عبد الغنی بن فخر الدین ابن تیمیہ

عبد الغنی نام سیف الدین لقب اور ابو محمد کنیت تھی، ۲ صفر ۵۸۱ھ کو حران میں پیدا ہوئے، اور اپنے ہی والد سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور نیز عبد القادر الرھاوی، عبد الوہاب بن ابی حیہ، حماد الحرانی وغیرہ سے مختلف کتابیں پڑھیں، پھر ۶۰۳ھ میں بغداد کا سفر کیا اور وہاں عبد الوہاب ابن سکینہ، عمر بن طبرزد، عبد العزیز بن مسلنا، عبد الواحد بن سلطان، یحییٰ بن الحسین اللاوائی، ابو الفرج محمد بن ہبۃ اللہ الوکیل، عبد الرزاق بن شیخ عبد القادر سعید بن محمد بن عطاف، احمد بن الحسن العاقولی وغیرہ سے حدیث سنی اور نصر بن فتیان بن مطر المعروف بابن المنی کے غلام اسمٰعیل سے فقہ پڑھی۔

عبد الغنی کے ساتھ شیخ تقی الدین کے دادا شیخ مجد الدین عبد السلام ابن تیمیہ بھی بغداد گئے تھے، یہ دونوں چھ سال تک مختلف اساتذہ کی خدمت میں شریک ہوتے رہے اور مختلف علوم وفنون میں استفادہ کرتے رہے، اس کے بعد حران آئے اور اپنے والد کی وفات تک تعلم وتعلیم اور درس وتدریس میں اپنا وقت گزارتے رہے اور جب ۶۲۲ھ میں فخر الدین کا انتقال ہوا تو جامع حران کی خطابت عبد الغنی کے سپرد کی گئی، وہ اپنے باپ کے تمام فرائض بخوبی ادا

کرنے لگے، والد کی طرح مسجد کے منبر پر بیٹھ کر قرآن مجید کی تفسیر کیا کرتے تھے، انہوں نے اپنے والد کی تفسیر قرآن پر مزید حواشی لکھے تھے، جس کا نام ''تفسیر الزوائد علی تفسیر الوالد'' رکھا تھا، اور ''اھداء القرب الی ساکنی الترب'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ ۷ محرم ۶۳۹ھ کو حران میں وفات پائی۔

ابن حمدان کہتے ہیں کہ عبدالغنی ان کے ساتھی تھے، وہ فصیح وبلیغ تھے اور بہت ہی سنجیدہ طبیعت کے واقع ہوئے تھے، منذری کہتے ہیں کہ انہوں نے حران میں عبدالغنی سے ملاقات کی تھی، مگر اُن سے کچھ پڑھا نہیں، انہوں نے قاضی ابوالفضل سلیمان بن حمزۃ المقدسی کو اپنی مرویات اور تصنیفات کی روایت اور ان کی تدریس کی اجازت دی تھی۔

تذکروں میں عبدالغنی کے پانچ لڑکوں کا نام ملا ہے، مگر ان کے ذکر کرنے سے پہلے ہم فخر الدین کی لڑکی ''ام البدرہ بدرہ کے حالات بیان کر دینا چاہتے ہیں۔

اُم البدرہ بدرہ بنت فخر الدین ابن تیمیہ

فخر الدین کی یہ لڑکی اپنے دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھی، ضیاء ابن الخریف نے اُن کو حدیث کی روایتوں کی اجازت دی تھی، اُن کی شادی شیخ تقی الدین کے دادا شیخ مجد الدین ابن تیمیہ سے ہوئی تھی، ۶۵۲ھ میں اپنے شوہر کے انتقال کے صرف ایک دن پہلے ۳۰ رمضان کو انتقال کیا تھا۔ [1]

عبدالقاہر بن عبدالغنی بن فخر الدین ابن تیمیہ

یہ ابو محمد سیف الدین عبدالغنی ابن تیمیہ کے صاحبزادے تھے، ان کا نام عبدالقاہر اور لقب فخر الدین تھا، ان کی کنیت ابوالفرج تھی، یہ ۶۱۲ھ میں حران میں پیدا ہوئے تھے، اور اپنے دادا سے حدیث پڑھی تھی، یہ بھی اپنے والد کی طرح بہترین خطیب تھے، جامع حران میں کئی مرتبہ خطبہ دیا تھا، غالباً تاتاریوں کی یورش کی وجہ سے جب کہ عبدالحلیم ابن تیمیہ وطن چھوڑ کر چلے گئے تو یہ بھی ساتھ چلے گئے، اور باقی عمر درس وتدریس میں گزار دی، دمشق کے

---

[1] شذرات الذهب: ۵/ ۲۵۸۔

باہر ایک خانقاہ میں رہتے تھے، جو خانقاہِ قصر کے نام سے مشہور تھی اور وہیں اتوار کے دن ۱۱ شوال ۶۷۱ھ کو وفات پائی اور دوسرے دن صوفیہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

عبدالملک ابن عبدالقاہر بن عبدالغنی تیمیہ

عبدالقاہر ابن تیمیہ مذکور کے ایک صاحبزادے بھی تھے، جن کا نام ''عبدالملک'' تھا۔ یہ ربیع الاول ۶۴۶ھ میں حران میں پیدا ہوئے، پھر دمشق آ کر ابن عبدالدائم، ابن ابی الیسر، وغیرہ سے حدیث پڑھی تھی، اور اعز بن العلیق، موتمن بن القمیر وغیرہ نے ان کو حدیث کے روایت کرنے کی اجازت دی تھی، برزالی اور شیخ شمس الدین ذہبی انہی کے شاگردوں میں سے ہیں، ذوالقعدہ ۷۰۲ھ میں دمشق میں وفات پائی۔

علی ابن عبدالغنی بن فخرالدین ابن تیمیہ

یہ ابومحمد سیف الدین عبدالغنی ابن تیمیہ کے دوسرے صاحبزادے ہیں، ان کا نام ''علی'' اور لقب ''علاؤ الدین'' تھا۔ ۶۱۹ھ میں حران میں پیدا ہوئے اور مختلف اساتذہ فن سے حدیث وفقہ، تفسیر اور دوسرے علومِ متداولہ کی تحصیل کی، پھر دمشق آنے کے بعد شیخ موفق الدین عبداللطیف اور ابن روزبہ سے حدیث پڑھی تھی، شیخ شمس الدین ذہبی ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔ ۷۰۱ھ میں مصر میں وفات پائی۔

عبدالرحمٰن بن علی بن عبدالغنی ابن تیمیہ

یہ علی بن عبدالغنی بن تیمیہ مذکور کے صاحبزادے ہیں، نام عبدالرحمٰن اور لقب جمال الدین تھا، ان کی ولادت کی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں چلتا، اور نہ ان کی تعلیم وتربیت کا کچھ حال معلوم ہے، غالباً حران میں پیدا ہوئے، دمشق آنے کے بعد مختلف اساتذۂ وقت سے تعلیم حاصل کی ہوگی۔ ۷۰۱ھ میں انتقال کیا، اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید اس وقت ان کی عمر چالیس یا پینتالیس سال کی ہوگی۔

عبدالاحد بن ابی القاسم بن عبدالغنی ابن تیمیہ

''عبدالاحد'' ابوالقاسم کے لڑکے اور عبدالغنی کے پوتے ہیں، ابوالقاسم کا نام صرف سلسلۂ نسب میں آتا ہے، ان کے حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا، شاید علمی حیثیت سے کوئی شہرت نہیں پائی ہوگی، عبدالاحد کا لقب شرف الدین تھا اور کنیت ابوالبرکات تھی۔ ۶۳۰ھ میں غالباً حران میں پیدا ہوئے تھے اور اپنے وطن ہی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، پھر جب ترکِ وطن کر کے دمشق چلے آئے تو وہاں مختلف اساتذہ سے حدیث کی سماعت کی، ابن اللتی، ابن رواحہ اور مرجا ابن شقیر ان کے شیوخ حدیث میں سے ہیں، عبدالاحد تاجر تھے، اور کپڑے کی تجارت کرتے تھے، نیک، صالح اور پرہیز گار تھے، شعبان ۷۱۲ھ میں دمشق میں وفات پائی۔

جویریہ بنت عبداللطیف بن عبدالغنی ابن تیمیہ

جویریہ کا لقب زین النساء تھا اور کنیت ام خلف تھی، یہ پڑھی لکھی اور نہایت قابل تھیں، ان کی شادی ابوبکر یحییٰ بن یوسف الرحبی (المتوفی: ۷۹۴ھ) سے ہوئی تھی، ابوبکر بن الکوکب نے جویریہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔

امین الدین ابراہیم بن محمد بن سیف الدین عبدالغنی ابن تیمیہ

ان کا نام ابراہیم اور لقب امین الدین تھا، ان کی تاریخ ولادت و وفات کا کچھ پتہ نہیں چلتا، ان کے والد محمد کے حالات بھی پردۂ خفا میں ہیں، انہوں نے زین الدین ابوبکر محمد بن ابی طاہر اسماعیل المعروف بابن الانماطی سے خرائطی کی ''مکارم الاخلاق'' پڑھی تھی۔ [1]

عبدالمحسن بن علی بن محمد بن عبدالغنی ابن تیمیہ

ان کا لقب امین الدین تھا، حران میں عبدالرحمٰن بن علی خرقی سے کچھ کتابیں پڑھیں اور نجیب حرانی سے ''حلیۃ الاولیاء'' کا بعض حصہ پڑھا تھا، یہ تجارت کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ شائقین علم کو پڑھاتے بھی تھے۔ ۶ ربیع الاول ۷۳۰ھ کو وفات پائی۔ [2]

---

[1] الدررا لکامنۃ: ۱/ ۶۲   [2] الدرر الکامنۃ: ۲/ ۴۱۲، ۴۱۳۔

یہاں تک تو ہم نے اُن افراد کا سلسلۂ نسب بیان کیا ہے جو فخر الدین محمد الخطیب ابن تیمیہ کی نسل سے تھے، اب ہم اُن کے بھتیجے یعنی شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کے دادا شیخ مجد الدین ابن تیمیہ اور ان کے حقیقی اور چچا زاد بھائیوں اور ان کی اولاد کے مختصر حالات بیان کرتے ہیں۔

مجد الدین عبد السلام ابن عبد اللہ ابن تیمیہ

اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ ابوالقاسم الخضر ابن تیمیہ کے دو صاحبزادے تھے، ایک ''فخر الدین محمد الخطیب ابن تیمیہ'' اور دوسرے ''عبد اللہ'' عبد اللہ کا نام صرف مجد الدین عبد السلام ابن تیمیہ کے سلسلۂ نسب میں آتا ہے، ورنہ ان کے مزید حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

عبد السلام کا لقب مجد الدین اور کنیت ابوالبرکات تھی، ۵۹۰ھ میں حران میں پیدا ہوئے تھے، ابھی کم سن ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، یتیمی کسی بچے کی تعلیم و تربیت میں مانع نہیں ہوتی، بشرطیکہ کوئی دیکھنے بھالنے والا بھی موجود ہو، شیخ مجد الدین کے لیے گو فخر الدین محمد الخطیب چچا ہونے کی حیثیت سے اب بھی بمنزلۂ باپ کے تھے، مگر ایک حقیقی باپ کی سی سرپرستی کہاں سے نصیب ہو سکتی تھی۔

شیخ مجد الدین نے پہلے قرآن مجید حفظ کیا، اور حران ہی میں اپنے چچا فخر الدین محمد الخطیب اور عبد القادر الرہاوی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، اور جب ۶۰۳ھ میں فخر الدین الخطیب نے اپنے صاحب زادے عبد الغنی کو تکمیل تعلیم کی غرض سے بغداد بھیجا تو شیخ مجد الدین کو بھی اُن کے ساتھ روانہ کر دیا تاکہ وہ عبد الغنی کی خدمت کریں، اور اس کے ساتھ ہی کچھ پڑھ بھی لیں، وہ مسلسل چھ سال تک اپنے چچیرے بھائی کے ساتھ بغداد میں رہے، اور مختلف علما سے قرآن و حدیث اور فقہ اور دیگر علوم کا درس لیتے رہے، احمد ابن سکینہ، ابن طبرزد، ابن الاخضر، شیخ حنبل الرصافی، یوسف ابن کامل، شیخ ضیاء الدین ابن الخریف، شیخ یوسف ابن مبارک الخفاف، شیخ عبد العزی بن منینا و شیخ احمد بن الحسن العاقولی، شیخ عبد الولی بن ابی تمام بن بادو وغیرہ سے حدیث پڑھی۔

شیخ شمس الدین ذہبی ”شیخ تقی الدین ابن تیمیہ“ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیخ مجد الدین ابن تیمیہ کے چچیرے بھائی سیف الدین عبدالغنی ابن تیمیہ فخر اسماعیل سے خلافیات کا سبق لیا کرتے تھے، شیخ مجد الدین بھی رات کو سبق کا مطالعہ کیا کرتے تھے اور صبح میں عبدالغنی کے ساتھ درس میں شریک ہوتے تھے، اور صرف سن کر اس کو یاد کرلیا کرتے تھے، جب فخر اسماعیل کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے بطور تعجب کہا کہ اس عمر کے بچے کا کیا حافظہ ہوسکتا ہے۔ شیخ مجد الدین نے آگے بڑھ کر جتنا اُن سے سنا تھا، بلاکم وکاست سنا دیا، اُن کے حافظے کی تیزی اور حدت کو دیکھ کر فخر اسماعیل بہت ہی متعجب ہوئے اور سیف الدین عبدالغنی سے کہا یہ بچہ بہت ہی ہونہار معلوم ہوتا ہے، پھر شیخ مجد الدین کو علم کے حاصل کرنے کی بے حد ترغیب دی، اوران کو اپنا شاگرد بنالیا۔

شیخ مجد الدین، فخر اسماعیل سے خلافیات کا درس لیتے رہے، یہاں تک کہ تمام اختلافی مسائل پر پورا عبور حاصل کر لیا، اور جب فخر اسماعیل سے ان کی تصنیف ”جنة الناظر“ پڑھی تو اس کی سند میں فخر اسماعیل نے یہ الفاظ لکھے:

”عرض على الفقيه الامام العالم اوحد الفضلاء“

میرے سامنے فقیہ امام عالم اور فاضلوں میں سے ایک نے یہ کتاب پڑھی۔

حالانکہ اس وقت شیخ مجد الدین ابن تیمیہ کی عمر صرف ۱۶ سال کی تھی۔

چھ سال تک بغداد میں رہنے کے بعد حران میں واپس آئے، اور وہاں بھی اپنی تعلیم اور مطالعہ جاری رکھا، پھر سات سال بعد ۶۲۰ ھ میں بغداد گئے، اور ابوبکر بن غنیمۃ الحلاوی اور فخر اسماعیل سے فقہ اور ابوالبقاء العکبری سے نحو اور فرائض کی تکمیل کی، ابوالبقاء سے ”کتاب الفخری فی الجبر والمقابلہ“ پڑھا۔

جب بغداد سے پھر حران واپس آئے تو عربی ادب، تفسیر، حدیث، فقہ اصول اور نیز حساب اور جبر ومقابلہ پر ایک طرح کا عبور حاصل ہو چکا تھا، فقہ میں خاص طور پر اتنا کمال حاصل کیا کہ شیخ جمال الدین ابن مالک فرمایا کرتے تھے کہ شیخ مجد الدین کے لیے علم فقہ اسی طرح نرم ہوگیا جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم ہوگیا تھا۔

جب ۶۳۹ھ میں عبدالغنی ابن تیمیہ کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ شیخ مجدالدین ہی مقرر کیے گئے، وہ خلافیات کا درس دیتے تھے، ہر ایک مسئلے پر سینکڑوں علما کے اقوال اور اُن کے دلائل بلاتکلف بیان کرتے چلے جاتے تھے، جن کا قلم بند کرنا بھی بہت دشوار ہوتا تھا، اُن کے ایک شاگرد شیخ نجم الدین ابن حمدان مصنف ''الرعایۃ الکبریٰ'' لکھتے ہیں کہ میں رات بھر ہر ایک مسئلہ پر پوری طرح غور وفکر کرنے اور بڑی چھان بین کرنے کے بعد درس میں شریک ہوتا تھا، اور مختلف کتابوں کا مطالعہ کر کے جاتا تھا، لیکن مجدالدین ایسی نئی نئی توجیہات اور دلائل پیش کرتے تھے، جن سے میں بالکل ناواقف ہوتا تھا۔

شیخ شمس الدین ذہبی فرماتے ہیں کہ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ نے ان سے ایک دن فرمایا کہ ان کے دادا فقہ اور اصول میں یگانہ روزگار تھے، احادیث کے یاد کرنے میں عجیب و غریب واقع ہوئے تھے اور حدیثوں کو بلاتکلف زبانی سنادیا کرتے تھے۔

شیخ تقی الدین نے اپنی مشہور کتاب ''الرد علی المنطقیین'' میں لکھا ہے کہ اُن کے والد اور دادا دونوں جبر ومقابلہ میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

شیخ مجدالدین نے ۶۵۱ھ میں حج کیا اور جب بغداد پہنچے تو شیخ جمال الدین عبدالرحمٰن ابن الجوزی کے صاحبزادے شیخ محی الدین یوسف ابن الجوزی سے ملاقات کی، شیخ مجدالدین کی گفتگو سن کر محی الدین ابن الجوزی نے کہا کہ اس وقت بغداد میں اس پائے کا کوئی عالم نہیں ہے، اور جب حج سے واپس ہوئے تو بغداد کے بعض عالموں نے ان سے بغداد میں کچھ مدت قیام کرنے کی درخواست کی، شیخ نے اپنے اہل وعیال کا عذر پیش کیا اور حران واپس چلے آئے، اسی سال مشہور عابد وزاہد شیخ شمس الدین ابن ابی عمر نے بھی حج کیا، مگر دونوں میں ملاقات نہیں ہوسکی۔ [1]

شیخ شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ برھان الدین مراغی نے شیخ مجدالدین سے کوئی مسئلہ پوچھا، انہوں نے اس کا جواب ساٹھ شکلوں میں پیش کیا، پھر برھان الدین سے کہا کہ اچھا ان شکلوں کو دوبارہ دہرادو، برہان الدین بھونچکے ہوگئے اور ان سے کوئی جواب

[1] طبقات الحنابلة لا بن رجب تذكرۂ مجد الدين۔

نہیں بن پڑا۔

شیخ مجدالدین نے حجاز، دمشق، اور ملک شام کے مختلف شہروں کا سفر کیا اور مختلف علمائے وقت سے ملاقات کی تھی، ان کی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی، جب بغداد میں شیخ جمال الدین ابوزکریا یحییٰ بن یوسف بن یحییٰ منصور بن المعمر عبدالسلام الصرصری الحنبلی نے اُن سے ملاقات کی تو وہ بہت متاثر ہوئے، موصوف نابینا تھے، مگر زبردست شاعر تھے، وہ اکثر مدحیہ قصائد لکھتے تھے، آنحضرت ﷺ اور ائمہ کرام کی مدح اور ان کے مناقب میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں۔ ۶۵۶ھ میں جب تاتاریوں نے اپنی بے پناہ تلواروں سے اہل بغداد کو تہ تیغ کیا، تو یہ بھی شہید ہو گئے۔

ابوبکر الصرصری نے امام احمد ابن حنبل کی تعریف میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھا تھا، اس میں مختلف حنبلی علما کی تعریف کی تھی، اسی سلسلہ میں شیخ مجدالدین کا بھی نام لیا ہے، چنانچہ اُن کے متعلق لکھتے ہیں:

وَاِنَّ لَنَا فِيْ وَقْتِنَا وَفُتُوْرِهٖ
لَاِخْوَانُ صِدْق بُغْيَةُ الْمُتَوَصِّلِ

اور بے شک ہمارے زمانہ میں جب کہ ہر طرف پریشانی پھیلی ہوئی ہے کچھ سچے ساتھی بھی ہیں جن کے اندر پناہ لی جاسکتی ہے۔

يَذُبُّوْنَ عَنْ دِيْنِ الْهُدٰى ذَبَّ نَاصِرٍ
شَدِيْدِ الْقُوٰى لَمْ يَسْتَكِيْنُوْا لِمُبْطِلِ

ایک حقیقی مدد کرنے والے کی طرح دین ہدیٰ کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی قوت والے ہیں، جو کسی باطل والے کے سامنے نہیں جھکتے ہیں۔

فَمِنْهُمْ حَجرَّانَ الْفَقِيْهُ النَّبِيْهُ ذُوْ الْفَوَائِدِ
وَالتَّصْنِيْفِ فِي الْمَذْهَبِ الْجَلِيْ

پس حران میں ان میں سے ایک باخبر اور فائدے والے فقیہ بھی ہیں جو روشن مذہب کے متعلق مختلف تصنیفات کے مالک ہیں۔

هُوَ الْمَجْدُ ذُوالتَّقْوٰى ابْنُ تَيْمِيَّةَ الرَّضَا
اَبُو الْبَرَكَاتِ الْعَالِمُ الْحُجَّةِ الْمَلِيْ

وہ تقویٰ والے مجد الدین ابوالبرکات بن تیمیہ ہیں جو عالم ہیں اور دوسروں کے لیے بھری ہوئی حجت ہیں۔

مُحَرَّرَهٗ فِي الْفِقْهِ حَرَّرَ فِقْهَنَا
وَاَحْكَمَ بِالْاَحْكَامِ عِلْمَ الْمُبَجَّلِ

فقہ میں ان کی کتاب محرر فی الفقہ نے ہماری فقہ کو قلم بند کر دیا ہے اور منتقی من احادیث الاحکام کی کتاب کے ذریعے ہمارا روشن علم حدیث مضبوط ہو گیا۔

جَزَى اللّٰهُ خَيْرًا رَبُّهُمْ عَنْ نَبِيِّهِمْ
وَسُنَّتِهِ اٰلْوَابِهِ خَيْرُ مَوْئِلِ

خدا ان سب کو اپنے نبی کی طرف سے اچھا بدلہ دے اور نیز اس کی سنت کی طرف سے بھی جس کی میں پناہ لیتا ہوں اور وہ بہترین پناہ گاہ ہے۔

شیخ مجد الدین نے ۶۵۲ھ عید الفطر کے دن جمعہ کی نماز کے بعد حران میں وفات پائی تھی، ان کی بیوی ام البدرہ بدرہ نے اُن سے ایک دن پہلے انتقال کیا تھا، ان کے چچیرے بھتیجے حافظ ابوالفرج عبدالقاہر بن ابی محمد عبدالغنی بن تیمیہ نے اُن کے جنازے کی نماز پڑھائی، اُس روز شہر میں کوئی ایسا نہیں تھا، جو ان کے جنازے میں شریک نہ ہوا ہو۔

شیخ مجد الدین نے بہت سے تصنیفات یادگار چھوڑی تھیں، جن کے نام مختصر طور پر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

1 المنتقی من احادیث الاحکام

اس میں مسند امام احمد بن حنبل اور صحاح ستہ کی حدیثوں کو فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے اور صحابی سے نیچے کا سلسلہ رواۃ حذف کر دیا ہے، کہا جاتا ہے کہ قاضی بہاء الدین بن شداد نے حلب میں ان سے اس قسم کی ایک کتاب کی تالیف کی درخواست کی تھی۔

یہ کتاب اس قدر مشہور و معروف اور مقبول ہوئی کہ مختلف علما نے اس کی تعلیقیں اور

شرحیں لکھیں، محمد بن مفلح حنبلی (المتوفی: ۷۶۳ھ) نے اس کی ایک تعلیق لکھی تھی۔ [1]

اسی زمانے میں حمزہ ابن موسیٰ حنبلی (المتوفی: ۷۶۹ھ) نے اس کی ایک بسیط شرح لکھنی شروع کی تھی مگر یہ شرح تکمیل کو نہیں پہنچ سکی تھی۔ [2] ان کے بعد لطف اللہ الحجاف (المتوفی: ۱۲۴۳ھ) نے "کتاب المرتقیٰ" کے نام سے ایک مختصر شرح لکھی تھی۔ [3] جس میں صرف حدیث کے معانی اور مطالب سے بحث کی تھی۔ آخر میں امام شوکانی (المتوفی: ۱۲۵۰ھ) نے "نیل الاوطار من اسرار منتقی الاخبار" کے نام سے ایک بہترین اور عمدہ شرح لکھی جو آٹھ جلدوں میں مطبع بولاق مصر سے ۱۲۹۷ھ میں شائع ہوئی ہے۔

2 الاحکام الکبریٰ

یہ کتاب فقہی مسائل پر تھی، اور کئی جلدوں میں لکھی گئی تھی، ہر فقہی مسئلے کے متعلق قرآن و حدیث سے دلیلیں دی تھیں، صاحب "کشف الظنون" نے اس کا نام "ملتقی الاحکام" دیا ہے۔ [4] اور نیز اس سے یہ معلوم ہوتا ہے شیخ ابو العباس احمد بن الحسن الحنبلی (المتوفی: ۷۷۱ھ) نے جو علاقہ جیل کے قاضی تھے "قطر الغمام فی شرح احادیث الاحکام کے نام سے اس کتاب کے ابتدائی حصے کی شرح کی تھی۔ [5]

3 منتہی الغایہ فی شرح الہدایہ

یہ کتاب غالباً شیخ ابو الخطاب محفوظ ابن احمد ابن الحسن الکلوذانی الحنبلی (المتوفی: ۵۱۰ھ) کی مشہور کتاب "الہدایہ" کی شرح ہے، اس کی ایک مختصر شرح اُن کے چچا فخر الدین محمد الخطیب نے بھی لکھی تھی، لیکن اس شرح کی صرف چار جلدیں مبیضہ ہو سکیں، جس میں کتاب الحج کے اوائل تک پہنچ سکے تھے، باقی شرح کا صرف مسودہ باقی رہ گیا تھا، جس کو وہ صاف نہیں کر سکے تھے۔

4 المحرر فی الفقہ

یہ بھی فقہ حنبلی کی ایک مختصر کتاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ خدیویہ مصر میں موجود

---

[1] الدرر الکامنة: ٤/ ٤٢٦۔ [2] ایضًا: ٢/ ٧٧۔ [3] البدر الطالع: ٢/ ١٧۔
[4] کشف الظنون: ٢/ ٥١٤۔ [5] ایضًا، ص: ٥٣٧۔

ہے، یہ نسخہ محمد بن علی البستی الحنبلی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور ۹۳۱ھ میں اس کی کتابت ہوئی ہے۔ ❶

اس کی ایک شرح بھی کتب خانۂ خدیو مصر میں پائی جاتی ہے۔ ❷ یہ شرح محمد بن مفلح حنبلی (المتوفی: ۷۶۳ھ) کی ہے، اس کا نام "النکت والفوائد السنیہ علی مشکل المحرر" ہے۔ یہ شرح ۷۴۰ھ سے پہلے لکھی گئی ہے، کتب خانۂ خدیویہ میں اس کا جو نسخہ پایا جاتا ہے، وہ احمد ابن ابی بکر بن عبدالرحمٰن الشہیر بابن رزیق المقدسی الحنبلی کا لکھا ہوا ہے، تاریخ کتابت ۸۶۳ھ ہے۔

❺ کتاب فی اصول الفقہ

شیخ مجد الدین نے اصول فقہ پر ایک کتاب لکھی تھی، جس پر ان کے صاحبزادے عبدالحلیم اور پوتے شیخ تقی الدین ابن تیمیہ نے تعلقات لکھی تھیں، شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کے ایک شاگرد نے ان سب کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر دیا تھا، جس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں پایا جاتا ہے۔ ❸

❻ اطراف احادیث التفسیر

یہ ان حدیثوں کے اطراف کا مجموعہ ہے جو قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق ہیں، ان کو قرآن مجید کی سورتوں کے مطابق ترتیب دیا تھا۔ ❹

❼ رسالۃ فی الاحادیث الموضوعۃ التی یرویہا العامۃ والقصاص علی الطرقات

یہ ان موضوع حدیثوں کا مجموعہ ہے جن کو واعظین عوام کی دلچسپی کی غرض سے بیان کرتے تھے، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے۔ ❺

❽ ارجوزۃ فی القرات

اس میں فن تجوید کے مسائل قلمبند کیے تھے۔ ❻ شیخ مجد الدین ابن تیمیہ سے بہت

---

❶ دیکھو فہرست کتب خانۂ خدیویہ: ۳/ ۲۹۷۔ ❷ دیکھو فہرست کتب خانۂ خدیویہ مصر: ۳/ ۳۰۰۔
❸ ایضاً: ۲/ ۲۵۷۔ ❹ شذرات الذهب: ۵/ ۲۵۸۔
❺ فہرست کتب خانۂ خدیویہ قسم الجامیع، ص: ۶۶۴۔ ❻ نیل الاوطار: ۱/ ۴۔

لوگوں نے تعلیم پائی یہاں صرف ان اشخاص کا مختصر حال لکھا جاتا ہے جنہوں نے علمی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

(۱) شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن عبدالوہاب بن منصور الحرانی الفقیہ الحنبلی نے شیخ مجد الدین سے فقہ پڑھی تھی اور بہت زمانے تک اُن کی صحبت میں رہے، جب ۶۶۳ھ میں مصر کے اندر چاروں مذاہب کے چار مستقل قاضی مقرر کیے گئے تو سب سے پہلے حنبلی قاضی شمس الدین مقرر ہوئے، مگر چند دنوں کے بعد اس منصب کو چھوڑ دیا اور ملک شام چلے گئے، وہاں درس وتدریس اور فتویٰ دیتے رہے، یہاں تک کہ ۶۷۵ھ میں انتقال کیا۔ 1

(۲) شیخ عبداللہ کتیلہ بن ابی بکر الحربی الفقیر الصوفی الحنبلی ۶۰۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۸۱ میں وفات پائی۔ 2

(۳) نورالدین ابوطالب عبدالرحمٰن بن عمر بن ابی القاسم بن علی بن عثمان البصری الضریر الفقیہ الحنبلی، یہ مدرسۂ مستنصریہ کے مدرس تھے۔ ۶۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۸۴ھ میں وفات پائی۔ 3

(۴) شیخ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن عبدالعزیز ابن ابی عبداللہ المقری الدمیاطی نے ستر سال سے زیادہ کی عمر میں ۶۹۴ھ میں انتقال کیا۔ 4

(۵) مفیدالدین ابومحمد عبدالرحمٰن بن سلمان عبدالعزیز بن الملحلج الحربی الضریر الفقیہ الحنبلی ۷۰۰ھ میں وفات پائی۔ 5

(۶) جمال الدین ابوعبادہ عبدالغنی بن منصور بن منصور بن ابراہیم بن عبادۃ الحرانی المؤذن ۶۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۰۵ھ میں وفات پائی۔ 6

(۷) تاج الدین ابوالفضل صالح بن ثامر بن حامد الجعبری الشافعی ۷۰۶ھ میں وفات پائی۔ 7

---

1 شذرات الذہب: ۵/۳۴۸؛ البدایہ والنہایۃ: ۱۳/ ۲۷۳۔

2 شذرات الذہب: ۵/ ۳۷۳۔ 3 ایضًا، ص: ۳۸۷۔

4 شذرات الذہب: ۵/ ۲۲۴؛ نیل الاوطار: ۱/ ۴۔

5 شذرات الذہب: ۵/ ۷۵۷۔ 6 الدررالکامنہ: ۴/ ۳۸۸۔ 7 ایضًا: ۲/ ۲۰۰۔

(۸) امین الدین بن شقیر عبداللہ بن عبداالاحد بن عبداللہ بن خلیفۃ الحرانی ۶۳۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۰۸ھ میں وفات پائی۔ [1]

(۹) شرف الدین ابن بدر الدین عبدالغنی بن یحیی بن محمد بن ابی بکر بن عبداللہ بن نصر بن محمد بن ابی بکر الحرانی الحنبلی ۶۴۵ھ میں پیدا ہوئے، مجد الدین سے اپنی تعلیم کی ابتداء کی تھی، ۷۰۹ھ میں انتقال کیا۔ [2]

(۱۰) عفیف الدین ابوعبداللہ محمد بن عبدالمحسن بن ابی الحسن بن عبدالغفار الازجی الحنبلی المعروف بابن الدوالیبی وابن الخراط ۶۳۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۲۸ھ میں وفات پائی۔ [3]

(۱۱) شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن عمر بن عبدالمحمود بن زباطر الحرانی الحنبلی ۶۳۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۱۸ھ میں وفات پائی۔ [4]

(۱۲) بہاء الدین ابو الثناء محمود بن علی بن عبدالولی بن خولان البعلی الفقیہ الحنبلی الفرضی، شیخ مجد الدین سے فقہ پڑھی تھی اور شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کی بھی صحبت اختیار کی تھی۔ ۷۴۴ھ میں وفات پائی۔ [5]

ان کے علاوہ شیخ مجد الدین کے بہت سے شاگرد تھے جن کے نام مختلف تذکروں میں ملتے ہیں، طوالت کے خوف سے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔

شیخ مجد الدین کی زندگی میں ہمعصر علما سے کئی مرتبہ بحثیں اور مناظرے ہوئے ہیں، چنانچہ ایک فقہی مسئلے میں عبدالقادر بن عبدالقاہر بن عبدالمنعم بن محمد بن احمد ابن سلامہ بن ابی الفہم الحرانی (۵۶۴۔۶۳۴ھ) سے ان کی بڑی بحث ہوئی ہے۔ [6]

اب ہم شیخ مجد الدین کی اولاد کا ایک مختصر تذکرہ ذیل میں درج کرتے ہیں، شیخ مجد الدین کی کئی اولاد ہوئی، مگر ہمیں صرف ایک لڑکے عبدالحلیم ابن تیمیہ اور ایک لڑکی ست الدار اور ایک پڑپوتے عبدالعزیز بن عبداللطیف بن عبدالعزیز بن مجد الدین ابن تیمیہ کا حال معلوم

---

[1] الدررالکامنة: ٢/٢٦٥۔ [2] ایضًا: ٤/ ٣٨٩۔ [3] ایضًا: ٤/٢٧۔

[4] شذرات الذهب: ٦/ ٥٠؛ الدرر الکامنة: ٤ /١٠٨۔

[5] شذرات الذهب: ٦ /١٤٢۔ [6] طبقات الحنابله لا بن رجب: ٢ / ١٢٤۔

ہے سب سے پہلے ہم پڑپوتے کا حال لکھتے ہیں:

عبدالعزیز بن عبداللطیف بن عبدالعزیز بن مجد الدین ابن تیمیہ

عبدالعزیز کی کنیت ابومحمد تھی، یہ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ سے تین سال چھوٹے تھے، اور شعبان ۶۶۴ھ میں پیدا ہوئے تھے، جب ۶۶۷ھ میں ابن تیمیہ کا سارا خاندان دمشق منتقل ہو گیا تو چار برس کی عمر میں ابن عبدالدائم سے ان کی تعلیم کی ابتداء ہوئی، انہوں نے یحییٰ بن ابی منصور، ابوبکر ہروی، احمد بن شیبان، اسماعیل بن العسقلانی اور احمد بن عبدالسلام بن ابی عصرون وغیرہ سے حدیث سنی تھی، جب شیخ تقی الدین مصر گئے ہیں تو شاید وہ بھی ان کے ساتھ قاہرہ چلے گئے اور قاہرہ اور اسکندریہ کے علما سے مختلف کتابیں پڑھیں۔ برزالی لکھتے ہیں کہ عبدالعزیز بہت ہی نیک اور صالح آدمی تھے، ۷۳۶ھ میں وفات پائی۔ [1]

ست الدار بنت مجد الدین ابن تیمیہ

یہ غالباً لقب تھا، ان کا حقیقی نام معلوم نہیں ہے، اپنے والد اور دوسرے علما سے حدیث اور فقہ پڑھی تھی، شیخ تقی الدین ابن تیمیہ نے ۶۸۳ھ میں ان سے بانیاسی کا ایک جز پڑھا تھا، اس درس میں محمد بن حمد بن عبدالمنعم بن حمد بن منیع بن ابی الفتح الحرانی التاجر المعروف بابن البیع (المتوفی: ۷۷۲ھ) بھی شریک تھے۔ [2]

شہاب الدین ابو المحاسن عبدالحلیم ابن تیمیہ

شہاب الدین لقب اور ابو المحاسن یا ابو احمد کنیت تھی، ۱۲ شوال ۶۲۷ھ کو حران میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اپنے والد اور دوسرے اساتذہ سے حاصل کی، اس کے بعد حلب کا سفر کیا اور وہاں کے مشہور محدث ابو المنجا عبداللہ بن عمر بن علی المعروف بابن اللتی (المتوفی: ۶۳۵ھ) شمس الدین ابو الحجاج یوسف بن خلیل بن قراجا بن عبداللہ (المتوفی: ۶۴۷ھ) اور ابو البرکات محمد بن الحسین بن عبداللہ بن رواحۃ الانصاری الحموی (المتوفی: ۶۴۲ھ) سے حدیث سنی اور ابو البقاء یعیش بن علی الحلبی النحوی (المتوفی: ۶۴۳ھ) سے نحو کی تکمیل کی، ان کے علاوہ احمد بن سلامہ النجار الحرانی (المتوفی: ۶۴۶ھ) مرجا بن شقیر

---

[1] الدرر الکامنۃ: ۲/ ۳۷۶۔ [2] الدرر الکامنۃ: ۳/ ۴۳۱۔

الواسطی، ابن الامیر القزوینی، صدقہ بن طواجیلی، حلوان بن جمیع، عبدالرزاق بن احمد بن ابی الوفاء، ابراہیم بن الزیات، اسعد بن ابی الفہم، سرایا بن معالی، اور عمار بن منیع وغیرہ سے مختلف علوم کی تحصیل کی۔

ان کے علاوہ ابن الزبیدی، سہروردی، عمر بن کرم، عبداللطیف بن الطبری، عزالدین ابن الاثیر، ابن الانجب الحمامی، ابو صالح نصر بن الجیلی، موفق الدین عبداللطیف البغدادی ابن العماد الحرانی اور عیسیٰ وغیرہ نے انہیں حدیث کے روایت کرنے کی اجازت دی تھی۔

جب ۶۵۲ھ میں عبدالسلام ابن تیمیہ کا انتقال ہو گیا، تو ان کی جگہ پر عبدالحلیم مقرر ہوئے، انہوں نے درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور وعظ ونصیحت کا مشغلہ جاری رکھا لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ تاتاریوں کی خوں آشام تلواریں ہر طرف کوندرہی تھیں۔ ۶۵۶ھ میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور اس کے بعد مختلف شہروں پر ان کے حملے ہونے لگے۔ مصر اور دمشق کی سلطنتیں ابھی تک ان کے قبضے میں نہیں آئی تھیں، مصر پر سلطان الملک الظاہر بیبرس کا قبضہ تھا، اور دمشق اس کے نائب کے ہاتھ میں تھا، ایسے نازک وقت میں عبدالحلیم ابن تیمیہ نے سلطنت مصر کی تائید کی، کیونکہ یہ سنی تھے اور تاتاری شیعیت کی طرف مائل تھے، چنانچہ جب الملک الظاہر بیبرس حران آیا، تو جامع حران کے خطیب اور ایک پیشوائے دین کی حیثیت سے عبدالحلیم ابن تیمیہ نے بیبرس کی بیعت کی۔ [1] ۶۵۸ھ میں جب ہلاکو نے حلب پر چڑھائی کرنی چاہی تو راستے میں مختلف شہروں پر بھی چڑھائی کی، چنانچہ حران پر بھی حملہ کیا، وہاں کے باشندوں نے اس سے امان مانگی اور اس کی اطاعت کا وعدہ کرلیا، لیکن جب ۲۵ رمضان ۶۵۸ھ کو تاتاریوں نے مصری لشکر کے مقابلہ میں عین جالوت پر سخت شکست کھائی، تو حران بھی ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

۶۶۴ھ میں ہلاکو کا انتقال ہو گیا، اور اس کا بیٹا اباقا اس کا جانشین ہو گیا، اس نے ۶۶۴ھ سے لے کر ۶۸۱ھ تک سلطنت کی، اس کے زمانے میں کئی مرتبہ اسلامی شہروں پر حملے ہوئے، ۶۶۷ میں الملک الظاہر بیبرس بندقداری سلطان مصر کے نام ایک سخت تہدیدی حکم

---

[1] تاریخ الجبرتی: ۱/ ۲۷۔

بھیجا اور اپنی اطاعت کرنے کی طرف اس کو ترغیب دلائی، مگر الملک الظاہر نے اسی قسم کا ایک سخت جواب بھیجا، جس کی وجہ سے حران اور اطراف واکناف کے شہر اور بستیاں سخت خطرے میں پڑ گئی تھیں۔ تاتاریوں کے ڈر سے حران والوں نے پورا شہر خالی کر دیا، اور حلب، دمشق، حماۃ اور دوسرے شہروں کا رُخ کیا، عبدالحلیم ابن تیمیہ بھی اپنے خاندان کے تمام افراد کو ساتھ لے کر نکلے، گھر کا ضروری ساز و سامان بھی ساتھ نہیں لیا، صرف اپنی کتابیں ساتھ لے کر گھر سے نکل گئے اور دمشق کا رُخ کیا، رات میں سفر کرتے اور دن میں کسی جگہ چھپ رہتے، یہاں تک کہ وہ صحیح وسلامت دمشق پہنچ گئے۔

یہاں پہنچ کر وہ دارالحدیث السکریہ کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے، دارالحدیث کے پہلو میں ایک مکان تھا، وہ اس میں رہا کرتے تھے، اور ہر جمعے کو دمشق کی جامع مسجد کے منبر پر وعظ کہتے تھے، دمشق آنے کے بعد آپ کا مشغلہ دین و تدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ و نصیحت تھا۔

عبداللہ الحلیم ابن تیمیہ نے ۳۰ ذی الحجہ ۶۸۲ھ کو ہفتے کی رات انتقال کیا۔ ان کے جنازے میں تمام علما اور امرا شریک ہوئے، اور انہیں پہلی محرم ۶۸۳ھ یعنی اتوار کی صبح کو مقابر صوفیہ میں دفن کیا گیا۔

عبدالحلیم ابن تیمیہ نہایت خلیق اور متواضع تھے، حساب ہندسہ اور جبر و مقابلہ میں مہارت حاصل تھی، ان کے متعلق شیخ شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں:

كان محققا كثير الفنون وكان من انجم الهدى انما اختفى من نور القمر وضوء الشمس۔

”وہ بہت بڑے محقق تھے، بہت سے علوم پر ان کو عبور تھا، وہ ہدایت کے روشن ستاروں میں سے تھے، مگر چاند کے نور اور آفتاب کی روشنی میں اُن کی روشنی نمایاں نہیں ہو سکی۔“

چاند سے مراد عبدالحلیم ابن تیمیہ کے والد شیخ مجدالدین بن تیمیہ اور آفتاب سے مراد اُن کے صاحبزادے شیخ تقی الدین ابن تیمیہ، ان کی شہرت کی وجہ سے وہ زیادہ مشہور نہیں

ہوئے، ورنہ علمی حیثیت سے ان کا پایہ بھی اپنے والد اور فرزند کی طرح بہت بڑھا ہوا تھا۔

عبدالحلیم ابن تیمیہ نے اپنے بعد بہت سی تصنیفیں یادگار چھوڑی تھیں، لیکن اصول فقہ کی ایک تعلیق کے سوا ان کی تمام کتابیں نایاب ہیں، اس تعلق کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے۔ [1]

عبدالحلیم ابن تیمیہ کی شادی ست المنعم فاطمہ بنت عبدالرحمٰن بن علی بن عبدوس الحرانیہ سے ہوئی تھی، یہ درحقیقت فخر الدین ابن تیمیہ کے بھانجے علی بن عبدوس الحرانی کی پوتی تھیں، ان کی پہلی شادی محمد بن خالد بن ابراہیم الحرانی سے ہوئی تھی، جن سے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، جن کا نام قاسم محمد تھا اور لقب بدرالدین تھا۔ ۶۵۰ھ یا ۶۵۱ھ میں حران میں پیدا ہوئے تھے اور جب والد کا انتقال ہو گیا، اور عبدالحلیم ابن تیمیہ نے ان کی ماں سے شادی کر لی تو وہ عبدالحلیم ابن تیمیہ ہی کے ساتھ رہنے لگے، اور جب سارا خاندان حران چھوڑ کر دمشق ہجرت کر گیا، تو وہ بھی دمشق چلے آئے، اور یہاں ابن عبدالدائم، ابن ابی الیسر ابن الصیرفی اور ابن ابی عمرو غیرہ سے قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی، اور مختلف اساتذہ کی صحبت اختیار کی اور اس طرح علومِ متداولہ میں کمال حاصل کیا، مدرسۂ جوزیہ میں پڑھاتے تھے اور چقمق کے بازار کی مسجدِ ریاحین کے امام تھے، مدرسۂ حنبلیہ میں بھی پڑھاتے تھے، درس وتدریس کے ساتھ تجارت بھی کرتے تھے، برزالی لکھتے تھے کہ بدرالدین فقیہ، خیر وبرکت والے، مرنج و مرنجاں، اور خوش خلق تھے، لوگوں سے الگ تھلک رہتے تھے اور اپنی اولاد کے لیے کچھ دولت بھی چھوڑی تھی، شیخ شمس الدین ذہبی کہتے ہیں کہ انہوں نے آٹھ سال تک مدرسۂ حنبلیہ میں درس دیا، اپنی والدہ کی وفات کے ایک سال بعد ۱۸ جمادی الآخر ۷۱۷ھ کو بدھ کے دن انتقال کیا، مقابر صوفیہ میں اپنی والدہ کے بغل میں مدفون ہوئے۔

اب یہ پتہ نہیں چلتا کہ عبدالحلیم ابن تیمیہ نے فاطمہ بنت عبدالرحمٰن بن علی بن عبدوس الحرانیہ سے پہلے کسی اور سے شادی کی تھی یا نہیں، بہت ممکن ہے کہ یہ ان کی پہلی شادی ہی ہو، عبدالحلیم ابن تیمیہ کو فاطمہ سے کوئی لڑکی پیدا نہیں ہوئی، تمام لڑکے ہی پیدا ہوئے جن کی تعداد

---

[1] فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر: ۲ / ۲۵۷۔

۹ بتائی جاتی ہے۔ [1] مگر تذکرہ نگاروں نے صرف تین لڑکوں کے نام لکھے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) تقی الدین ابو العباس احمد ۶۶۱ھ تا ۷۲۸ھ (ان کا تفصیلی تذکرہ آیندہ آئے گا)

(۲) زین الدین ابو الفرج عبدالرحمٰن ۶۶۳ھ تا ۷۴۷ھ۔

(۳) شرف الدین عبداللہ ۶۶۶ھ تا ۷۲۷ھ۔

اب ہم ذیل میں ان دونوں چھوٹے بھائیوں یعنی زین الدین ابو الفرج عبدالرحمن ابن تیمیہ اور شرف الدین عبداللہ ابن تیمیہ کے مختصر حالات درج کرتے ہیں:

زین الدین عبدالرحمٰن بن عبدالحلیم بن تیمیہ

عبدالرحمٰن نام، ابو الفرج کنیت اور زین الدین لقب تھا۔ ۶۶۳ھ میں حران میں پیدا ہوئے، پانچ سال کی عمر میں تعلیم شروع کی اور دمشق میں احمد بن عبدالدائم سے جزء ابن عرفہ پڑھا اور جزء ایوب کی آٹھ حدیثیں پڑھیں، ابن ابی الیسر سے خصائری کی حدیثیں سنیں اور نسخۂ وکیع پڑھا، اور کمال ابن عبد، قاسم الاربلی، ابن ابی الخیر، جمال ابن الصیرفی، قطب ابن ابی عصرون، مجد ابن عساکر، فخر ابن شیبان، وغیرہ سے علم حدیث حاصل کیا، برزالی نے ان کے شیوخ کی ایک فہرست جمع کی تھی، جن کے کل نام ۸۶ ہوتے ہیں، درس و تدریس کے ساتھ ساتھ وہ تجارت بھی کرتے تھے، شیخ تقی الدین ابو العباس احمد ابن تیمیہ کا سفر و حضر اور قید و بند میں ساتھ دیا، وہ ہمیشہ ذکر و اذکار اور عبادت اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے تھے، دیانت، امانت اور حسنِ سیرت میں بہت مشہور تھے، ۳ ذوالقعدہ ۷۴۷ھ کو دمشق میں انتقال کیا اور مقابر صوفیہ میں مدفون ہوئے۔

سراج الدین ابو حفص عمر بن رسلان البلقینی (المتوفی: ۸۰۵ھ) اُن کے شاگردوں میں سے تھے۔ [2]

---

[1] تاریخ الطبقات جلد هفتم قلمی تذکرۂ احمد ابن تیمیة۔

[2] مجموع الدرر، ص:۶۰۔

شرف الدین عبداللہ بن عبدالحلیم بن تیمیہ

عبداللہ نام، کنیت ابو محمد اور شرف الدین لقب تھا، ۱۱ محرم ۶۶۶ھ کو حران میں پیدا ہوئے، جب اُن کے والد عبدالحلیم ابن تیمیہ ہجرت کر کے دمشق آئے ہیں، تو اس وقت اُن کی عمر تقریباً ڈیڑھ سال کی تھی۔

دمشق میں ابن ابی الیسر، ابن ابی الخیر، ابن ابی عمر، ابن الدرجی، ابن علان، ابن الصیر فی وغیرہ سے حدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کی، فرائض، حساب ہیئت، اصولِ حدیث وفقہ اور عربی ادب میں اچھی مہارت پیدا کر لی تھی، علم حدیث سے خاص طور پر شغف تھا، اکابرین، امت اور تاریخ اسلام سے بخوبی واقف تھے، انہوں نے اپنے بھائی شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کی طرح تصنیف وتالیف کا شغل نہیں رکھا، بحث ومباحثے میں بہت قوی اور زوردار تھے، اکثر اپنے اوقات مطالعۂ کتب اور تلاوت وعبادت میں گزارتے تھے، دارالحدیث الحنبلیہ میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے تھے۔

شیخ زین الدین ابوالفرج عبدالرحمٰن بن عبدالحلیم ابن تیمیہ کی طرح شرف الدین ابو محمد عبداللہ نے بھی اپنے بھائی شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کا پورا ساتھ دیا، اپنے بھائی کے ساتھ مصر گئے اور اُن کے ساتھ قید میں رہے، اور پھر ایک زمانے کے بعد ۷۱۲ھ میں دمشق آئے، ۷۱ے ھ اور ۷۱۹ھ میں دو مرتبہ حج کیا اور جب شیخ تقی الدین ابن تیمیہ آخری مرتبہ دمشق میں قید کیے گئے تو وہ بھی ان کے ساتھ قید خانہ چلے گئے، اور وہیں ۱۴ جمادی الاولیٰ ۷۲۷ھ کو بدھ کے دن وفات پائی۔ جب انہوں نے وفات پائی تو ظہر کی نماز کے بعد قلعی کے باہر جنازے کی نماز ادا کی گئی، مگر شیخ تقی الدین ابن تیمیہ اور ان کے بھائی شیخ زین الدین عبدالرحمٰن بن تیمیہ کو اس جنازے میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس لیے دونوں بھائیوں نے مجبوراً قید خانے ہی میں جنازے کی نماز ادا کی، چونکہ تکبیر کی آواز قلعے کے اندر تک سنائی دیتی تھی، اس لیے نماز کی ادائیگی میں کوئی فرق نہیں آیا، اس جنازے میں ہزاروں آدمی شریک تھے، بہت سے لوگ اس بات کو یاد کر کے آنسو بہانے لگے کہ دونوں بھائیوں کو

اس جنازے میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی گئی، لوگ دور دور سے جنازے کی نماز میں شریک ہونے کی غرض سے آئے تھے، جولوگ ذرا دیر میں پہنچے، انہوں نے دوبارہ اور سہ بارہ نماز ادا کی، اس کے بعد جنازہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ مقابر صوفیہ کی طرف روانہ ہوا، جوان کا آبائی قبرستان تھا، اور وہاں ان کو والدہ کی قبر کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

عبداللہ ابن تیمیہ بڑے ہی مخلص اور پرہیز گار تھے، مجاہد اور دلیر تھے، اپنے بھائی کی طرح بے نفس اور قناعت پسند تھے، جب تک وہ دمشق میں رہے اور پھر مصر سے دمشق واپس آئے، ان کا مشغلہ زیادہ تر درس وتدریس ہی ہوتا تھا، رات کو وہ گھر سے نکل جاتے تھے، اور شہر سے باہر ویران اور غیر آباد مسجدوں میں خدا کی عبادت کرتے تھے، اور پھر صبح کے وقت اپنے گھر لوٹتے تھے۔

بہت ہی مخیر تھے، فقر وفاقے کے باوجود فقراء اور مسکینوں کو اتنا دیتے تھے کہ لوگوں کو اس پر بڑا تعجب ہوتا تھا، اور وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ سونا اور چاندی ان کو کہاں سے ملتا ہے، حج کے زمانے میں ان کے ساتھیوں نے اُن کے سامانوں کو ٹٹول کر دیکھا مگر ان کے پاس روپیہ، پیسہ اور سونا چاندی نہیں ہوتا تھا، اس کے باوجود جب وہ فقراء اور مسکینوں کو پیسہ دینے لگتے تھے، توان کو بڑی حیرت ہوتی تھی۔ [1]

شیخ کمال الدین زملکانی کہتے ہیں کہ عبداللہ بن تیمیہ کو فقہ، ادب اور اصول میں بڑا کمال حاصل تھا، وہ ذہین اور سمجھدار تھے، بحث اور مناظرے میں طاق تھے، تقویٰ اور دیانت میں بہت پکے تھے اور بڑے مخیر تھے۔

عبداللہ بن تیمیہ نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، البتہ ان کی اولاد ہوئی تھی، جن میں سے صرف ایک لڑکے اور لڑکی کا نام ہمیں معلوم ہے، لڑکے کا نام محمد اور لقب شمس الدین تھا، اس سے زیادہ ان کے حالات نہیں ملے، محمد کے ایک صاحبزادے تھے، جن کا نام بھی محمد تھا، اور لقب ناصر الدین تھا، ۷۵۷ھ کو مصر میں پیدا ہوئے تھے، اپنے والد سے قرآن مجید پڑھا تھا اور دیگر علوم کی تحصیل کی تھی، طب سے بھی واقف تھے، کاتب السر ابن فتح اللہ اور شمس ابن

---

[1] شذرات الذهب:٦/ ٧٧۔

الصاحب کی مدد سے اسکندریہ کے قاضی ہو گئے تھے، اس کے ساتھ تجارت بھی کرتے تھے، اس کے علاوہ اور کئی منصب ان کو حاصل تھے، جو ان کے مرنے کے بعد ان کے لڑکے محمد کو حاصل ہوئے، ۷ رمضان المبارک ۸۳۸ھ کو اتوار کے دن قاہرہ میں وفات پائی۔

ناصر الدین محمد کے لڑکے کا نام بھی محمد تھا، سخاوی نے اپنی کتاب ''الضوء اللامع'' میں اس کا تذکرہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شافعی مذہب اختیار کر لیا تھا۔

زینب بنت عبداللہ بن تیمیہ

شرف الدین ابو محمد عبداللہ ابن تیمیہ کی لڑکی کا نام زینب تھا، حجار وغیرہ سے حدیث پڑھی تھی، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اُن سے حدیث کی روایت کی اجازت حاصل کی تھی۔ [1] بڑی عالم وفاضل خاتون تھیں، ۷۹۹ھ میں وفات پائی۔

زینب کی شادی امین الدین عبدالوہاب بن یوسف بن ابراہیم بن سلار بن بیرم بن سلار بن بہرام بن سلار بن محمود بن سلار بن بختیار شافعی سے ہوئی تھی، جو اس زمانے میں شیخ القراء تھے، اور فن تجوید کے امام مانے جاتے تھے، شوال ۶۹۸ھ میں پیدا ہوئے تھے، بصرہ، بغداد، معرۃ النعمان، ملک شام اور مصر کے علما سے علوم متداولہ میں کمال حاصل کیا تھا، ملک شام میں ابن بصخان، مصر میں حجار، مزی، تقی الدین صائغ، اسماء بنت صصری، زینب بنت کمال اور ایوب کمال وغیرہ سے حدیث کی روایت کی تھی، فرائض اور عربی ادب پر عبور تھا، کئی ایک تصنیفات یادگار چھوڑی تھیں، اور کئی خطبے بھی مدون کیے تھے، جو ملک شام میں مقبولِ عوام تھے، ۲۸ شعبان ۷۸۲ھ کو اس دنیائے فانی سے رحلت کی اور تربت ام صالح میں مدفون ہوئے۔ [2]

---

[1] شذرات الذهب: ٦/ ٣٨٧۔

[2] الدرر الكامنة ٢/ ٤٣١ و شذرات الذهب: ٦/ ٢٧٥ و مجموع الدر، ص: ٥٧۔

امام ابن تیمیہ

بَحرُ الْعُلُومِ وَ كَنْزُ كُلِّ فَضِيْلَةٍ
فِي الدَّهْرِ فَرْدٌ فِي الزَّمَانِ اِمَامُ
فَلَئِنْ تَاَخَّرَ فِي الْقُرُوْنِ لِثَامِنٍ
فَلَقَدْ تَقَدَّمَ فِي الْعُلُوْمِ اِمَامُ

از شیخ بدرالدین محمد ماردینی

نوٹ: شیخ بدرالدین محمد ماردینی نے ''امام تقی الدین ابن تیمیہ'' کی وفات پر ایک زوردار مرثیہ لکھا تھا، مذکورۂ بالا دونوں شعر اسی مرثیہ سے لیے گئے ہیں، اُن کا مطلب یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ علوم کا سمندر اور ہر بزرگی کا خزانہ ہیں، وہ دہر میں یکتا اور اس زمانے کے امام ہیں، اگر وہ آٹھویں صدی میں سب سے پیچھے آئے تو کیا ہوا، مگر وہ علوم میں سب سے آگے اور سب کے امام ہیں۔

امام ابن تیمیہ

شیخ تقی الدین ابو العباس احمد

تعلیم وتربیت

ولادت اور نام ونسب

امام ابن تیمیہ ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ کو پیر کے دن حران میں پیدا ہوئے، والدین نے ان کا نام احمد رکھا، آگے چل کر ان کا لقب تقی الدین اور ان کی کنیت ابو العباس رکھی گئی، ان کا سلسلۂ نسب حسب ذیل ہے:

تقی الدین ابو العباس احمد بن شہاب الدین ابی المحاسن عبدالحلیم بن مجد الدین ابی البرکات عبدالسلام بن عبداللہ بن ابی القاسم الخضر بن محمد بن الخضر بن علی بن عبداللہ المعروف بابن تیمیہ۔

دمشق کی طرف ہجرت

امام ابن تیمیہ کی عمر چھ سال کی تھی، جبکہ ان کے والد عبدالحلیم نے اپنے بچوں اور اپنے کنبے کے ساتھ ۶۶۷ھ میں دمشق کی طرف ہجرت کی۔

تعلیم وتربیت

تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ دمشق آنے سے پہلے ہی حران میں امام ابن تیمیہ کی تعلیم شروع ہو چکی تھی، انہوں نے اپنے رسالہ ''اربعون حدیثا'' میں ۶۶۶ھ کی سنی ہوئی ایک حدیث نقل کی ہے، دمشق آنے کے بعد ان کی باقاعدہ تعلیم ہونے لگی۔ ساتویں صدی ہجری میں دمشق، حلب، حماۃ وغیرہ میں مدرسوں اور علما کی کچھ کمی نہیں تھی، ہر جگہ مختلف فنون میں مہارت رکھنے والے علما موجود تھے، دمشق میں حنبلی مذہب ومسلک کے دو بڑے مشہور مدرسے تھے ایک دار الحدیث السکریہ جو قَصَّاعِین کے محلے میں تھا، اس کے شیخ الحدیث امام

ابن تیمیہ کے والد عبدالحلیم ابن تیمیہ ہی تھے، دوسرا مدرسہ ''مدرستہ الحنبلیہ'' تھا، جو سفح قاسیون دمشق میں تھا، اور جس کا دوسرا نام ''مدرسۂ ابی عمر'' بھی تھا، کیونکہ مشہور حنبلی عالم شیخ ابو عمر محمد بن قدامہ مقدسی (المتوفی: ۶۰۷ھ) نے ۵۹۸ھ میں اس مدرسے کی بنیاد رکھی تھی، امام ابن تیمیہ ان دونوں مدرسوں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔

سرعت حفظ

امام ابن تیمیہ نے غضب کا حافظہ پایا تھا، ان کے سرعتِ حفظ کی داستانیں بہت مشہور ہیں، بڑی تیزی کے ساتھ وہ عبارتوں کی عبارتیں یاد کرلیا کرتے تھے، چونکہ فن حدیث سے خاص شغف تھا، اس لیے اس فن کی تمام کتابیں انہیں زبانی یاد ہوگئیں تھیں، اور جب انہیں کوئی عبارت یاد ہوجاتی تھی تو وہ پھر اس کو بھول نہیں جاتے تھے، چونکہ انہوں نے آگے چل کر ہر فن کے متعلق بہت کچھ لکھا، اور متقدمین ومتأخرین کی کتابوں سے جابجا استدلال لیا، اور نیز تقریر و تحریر میں قرآن وحدیث کے الفاظ اور ان کی عبارتوں سے بکثرت بطور استدلال کام لیا، اس لیے قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ مختلف علوم وفنون کی بہت سی کتابیں انہیں ازبر ہوگئی تھیں، اس کا ثبوت ان کی تصنیفات سے ہوتا ہے جن میں انہوں نے جابجا ائمۂ متقدمین کی کتابوں کی مختلف عبارتیں نقل کی ہیں۔

حافظ ابن عبدالہادی نے اپنے تذکرۂ العقود الدریہ میں ایک روایت بیان کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حلب سے ایک شیخ دمشق تشریف لائے، وہاں امام ابن تیمیہ کے سرعتِ حفظ کا شہرہ سنا تو انہیں دیکھنے کا شوق پیدا ہوا، وہ درزی کی دوکان پر تشریف لے گئے اور اس سے امام ابن تیمیہ کا پتہ پوچھا، درزی نے کہا: مدرسہ کا وقت ہوگیا ہے وہ ابھی اس راستے سے گزریں گے، آپ کچھ دیر کے لیے یہیں تشریف رکھیے، امام ابن تیمیہ کی عمر بہت چھوٹی تھی، جب وہ اس راستے سے گزرے تو درزی نے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہی وہ لڑکا ہے جس کی آپ کو تلاش تھی، شیخ نے انہیں بلایا، اور ان کی تعلیم کے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں، اس وقت امام ابن تیمیہ کے ہاتھ میں ایک تختی بھی تھی۔ شیخ نے کہا کہ اس تختی کو اچھی طرح صاف کردو، پھر گیارہ یا تیرہ حدیثیں املا کروائیں، اس کے بعد کہا بیٹا! ذرا ان حدیثوں کو

دوبارہ پڑھ تو دینا، امام ابن تیمیہ نے غور سے اس پر ایک نظر ڈالی، اور اس کے بعد تختی شیخ کے حوالے کر کے کہا، ان حدیثوں کو زبانی ہی سن لیجیے، یہ کہہ کر انہوں نے تمام حدیثیں زبانی ہی سنا ڈالیں، یہ دیکھ کر شیخ بہت ہی متعجب ہوئے، انہوں نے دوبارہ حدیث کی چند سندیں لکھوائیں اور پہلے کی طرح ان کو پڑھ کر سنا دینے کے لیے کہا، امام ابن تیمیہ نے ان کو بھی ایک مرتبہ غور سے پڑھا اور پھر زبانی سنا دیا، شیخ پہلے سے بھی زیادہ متعجب ہوئے، اور بے اختیار ہو کر کہا کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہا تو یقیناً بہت بڑے مرتبے والا ہوگا، کیونکہ اس غضب کا حافظہ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ [1]

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز واقعہ امام ابوالمظفر یوسف بن محمد بن مسعود بن محمد بن علی بن ابراہیم العبادی العقیلی السرمری الدمشقی (المتوفی:۷۷٦ھ) نے اپنی کتاب امالی کی ساتویں مجلس میں نقل کیا ہے، وہ ذکر اور حفظ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> ”ہمارے زمانے کے عجیب وغریب حافظہ رکھنے والے لوگوں میں شیخ الاسلام ابو العباس احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ تھے، وہ جب کسی کتاب کا ایک مرتبہ مطالعہ کر لیا کرتے تھے تو پوری کتاب اُن کے ذہن نشین ہو جاتی تھی، اور پھر وہ کتاب کو دیکھے بغیر ہی صفحے کے صفحے نقل کرتے چلے جاتے تھے۔“

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں

> ”سب سے عجیب وغریب تو وہ واقعہ ہے جس کو اُن کے ساتھیوں نے مجھ سے بیان کیا، ایک دن شیخ عبدالحلیم ابن تیمیہ اپنے بچوں کو لے کر کسی باغ تماشے کو جانا چاہتے تھے، اس وقت احمد ابن تیمیہ بہت چھوٹے تھے، شیخ عبدالحلیم نے انہیں بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا، مگر اصرار کے باوجود وہ جانے پر راضی نہیں ہوئے، مجبوراً اُنہیں گھر ہی پر چھوڑ کر وہ دوسرے بچوں کو ساتھ لے کر چلے گئے، اور جب شام کو گھر واپس آئے تو اپنے لڑکے احمد ابن تیمیہ سے کہا آج بہت اچھی تفریح رہی، افسوس ہے کہ تم ساتھ چلے، احمد ابن تیمیہ نے اپنے ہاتھ

[1] العقود الدریة، ص:٤۔

میں ایک کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہا، اگر میں آپ کے ساتھ چلا گیا ہوتا تو میں یہ کتاب کس طرح یاد کر سکتا تھا، یہ سن کر حافظ عبدالحلیم بہت ہی متعجب ہوئے، اور حیرت کے ساتھ پوچھا کہ تم نے ساری کتاب یاد کر لی ہے؟ احمد ابن تیمیہ نے جواب دیا، جی ہاں! شیخ عبدالحلیم نے فوراً وہ کتاب اپنے ہاتھ میں لی اور ان سے سنانے کے لیے کہا، امام ابن تیمیہ نے پوری کتاب زبانی سنا دی، یہ دیکھ کر حافظ عبدالحلیم بہت خوش ہو گئے اور اُٹھ کر اپنے لڑکے کو سینے سے لگا لیا، اور کہا: بیٹا یہ واقعہ کسی سے بیان نہ کرنا ورنہ تمہیں نظر لگ جائے گی۔'' [1]

بہت ممکن ہے کہ اس قسم کے واقعات مبالغہ آمیز ہوں اور ان میں کچھ اضافہ کر کے بیان کیا گیا ہو، یہ دونوں واقعے ان کتابوں سے پیش کیے گئے ہیں جو امام ابن تیمیہ کی وفات کے فوراً بعد لکھی گئی ہیں، امام ابن تیمیہ کے حافظہ کا ثبوت خود ان کی تصنیفات سے ہوتا ہے، ان کو پڑھ کر ہر شخص اس بات کی شہادت دے سکتا ہے کہ اُن کا حافظہ یقیناً بہت ہی غیر معمولی رہا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے عبارتوں کی عبارتیں اپنی یاد سے نقل کی ہیں اور اُن میں کہیں زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔

شیوخ حدیث

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ امام ابن تیمیہ کو خاص فن حدیث سے بہت زیادہ شغف تھا، اس زمانے کے مختلف علوم متداولہ کے ساتھ وہ بکثرت شیوخ حدیث کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث کی مختلف کتابیں بحث وتکرار کے ساتھ پڑھتے رہے، حافظ ابن عبدالہادی نے لکھا ہے کہ امام ابن تیمیہ کے شیوخ حدیث کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے، ان میں سے چند کے نام گنائے ہیں، ہم نے امام ابن تیمیہ کے رسالے ''اربعون حدیثا'' سے ان کے شیوخ حدیث کی ایک مختصر فہرست مرتب کی ہے، ہر حدیث کی ساتھ انہوں نے تاریخ سماعت حدیث بھی درج کر دی ہے، اس سے ان کے زمانۂ تعلیم کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ ٦٦٢ھ سے لے کر ٦٨٤ھ تک مختلف شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے ہیں، اس سلسلے میں قابل ذکر بات

---

[1] مجموع الدرر، ص: ٧٣۔

یہ ہے کہ ان کے شیوخ حدیث میں چند عورتیں بھی ہیں، اور امام ابن تیمیہ نے یہ حدیثیں ان سے اس وقت سنی ہیں جبکہ اُن کی عمر بیس یا اس سے بھی زیادہ تھی، اس سے اس زمانے کی عورتوں کی علمی برتری کا بھی ایک اندازہ ہو جاتا ہے، ہم نے اکثر جگہ امام ابن تیمیہ کے شیوخ حدیث کی تاریخ ولادت اور تاریخِ وفات دی ہے، کیونکہ اگر ان کے تفصیلی حالات پیش کیے جائیں تو اس کتاب کے کئی صفحات ان کی نظر کرنے پڑیں گے۔

(۱) **شیخ زین الدین ابو العباس احمد بن عبد الدائم** بن نعمۃ بن احمد بن محمد بن ابراہیم بن احمد بن بکیر نابلیسی مقدسی، صفر ۵۷۵ھ میں پیدا ہوئے، حصولِ علم کی خاطر مختلف مقامات کا سفر کیا اور خاص کر فنِ حدیث میں کمال حاصل کیا، بہت ہی زود نویس تھے، ابن عساکر کی تاریخ دمشق جو کئی جلدوں میں تھی، دو مرتبہ نقل کی تھی، اس کا ایک خلاصہ بھی تیار کیا تھا، مختصر الخرقی [1] صرف ایک رات میں نقل کی تھی، اتنا تیز لکھنے کے باوجود اُن کا خط بہت ہی خوشنما اور پاکیزہ ہوتا تھا، ۸ رجب ۶۶۸ھ میں وفات پائی اور مقبرۂ قاسیون دمشق میں مدفون ہوئے۔

تذکروں سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دمشق آنے کے بعد امام ابن تیمیہ نے تبرکاً ان سے حدیث پڑھنی شروع کی تھی، ۶۶۷ھ میں قاسیون میں ان سے حدیث کا مختصر رسالہ جزء ابن عرفہ [2] پڑھا تھا۔

(۲) **قاضی القضاۃ شمس الدین ابو محمد عبداللہ** بن الشیخ شرف الدین محمد بن عطاء بن حسن بن عطاء بن جبیر بن جابر بن وہیب الاذرعی الحنفی ۵۹۵ھ میں پیدا ہوئے، حنفی فقہ میں کمال حاصل کیا، کچھ دنوں تک وہ شافعی قاضی القضاۃ کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد جب مصر میں چاروں مذاہب کے قاضیوں کا تقرر عمل میں آیا، تو شمس الدین موصوف حنفیوں کے پہلے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے، بڑے حق پرست اور حق گو آدمی تھے سلطان کے سامنے بے خوف اور نڈر ہو کر بولتے تھے اور اس پر سخت گرفت کرتے تھے، جس

---

[1] تصنیف عمر بن الحسین الخرقی (المتوفی: ۳۳۴ھ) یہ فقہ حنبلی کی ایک کتاب ہے، قاضی ابو یعلیٰ بن فراء اور شیخ موفق الدین ابن قدامہ مقدسی نے اس کی شرحیں لکھی تھیں (البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/ ۲۱۴)

[2] یہ رسالہ حسن بن عرفہ بن یزید (المتوفی: ۲۵۷ھ) کا لکھا ہوا ہے (دیکھو البدایۃ والنہایۃ: ۲۹/۱۱)

کی وجہ سے بسا اوقات سلطان ظاہر بیبرس جھلا اٹھتا تھا، مگر اس کی بھی وہ کچھ پروانہیں کرتے تھے، سلطان ان کا بہت احترام کیا کرتا تھا، ۹ جمادی الاولیٰ ۶۷۳ھ کو جمعہ کے دن انتقال کیا، اور قاسیون کی گھاٹی میں مدفون ہوئے۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۶۷ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۳) قاضی القضاۃ شیخ الاسلام شمس الدین ابو محمد عبدالرحمٰن بن الشیخ ابی عمر محمد بن احمد بن محمد بن قدامہ مقدسی حنبلی ۵۹۷ھ میں پیدا ہوئے، وہ دمشق میں حنبلیوں کے پہلے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تھے، مگر چند دن کے بعد اس عہدے سے استعفاء دے دیا اور مُدرسی اختیار کی، بہت صالح اور پرہیز گار تھے، امانت دار اور دیانت دار تھے، ۳۰ ربیع الآخر ۶۸۲ھ کو منگل کی رات وفات پائی۔

امام ابن تیمیہ نے شعبان ۶۶۷ھ میں اُن سے قاسیون میں حدیث سنی تھی۔

(۴) المسند الاصیل العدل مجد الدین ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بن عثمان بن المظفر بن ہبۃ اللہ بن عساکر الدمشقی ۵۸۷ھ میں پیدا ہوئے اور ذوالقعدہ ۶۶۹ھ میں وفات پائی۔

امام ابن تیمیہ نے شعبان ۶۶۷ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۵) الحاج ابو محمد عبدالواسع ابو بکر بن محمد بن ابی بکر بن عبدالواسع الہروی ۵۹۴ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور رجب ۶۷۳ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ ۴ ربیع الاول ۶۶۸ھ کی سنی ہوئی ایک حدیث نقل کی ہے، نیز ان سے ابن اسحاق کی کتاب المغازی بھی پڑھی تھی۔ [1]

(۶) کمال الدین ابو زکریا یحییٰ بن منصور بن ابی الفتح بن رافع بن علی ابن الصیرفی الحرانی۔

امام ابن تیمیہ نے شوال ۶۶۸ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۷) جمال الدین ابو الفرج عبدالرحمٰن بن سلیمان بن سعید بن سلیمان البغدادی، ۵۸۵ھ میں حران میں پیدا ہوئے اور ۶۷۰ھ میں دمشق میں وفات پائی۔ امام ابن تیمیہ نے ۶۶۸ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

---

[1] دیکھو الدرر الکامنہ: ۳/ ۴۳۱۔

(۸) زین الدین ابوبکر محمد بن ابی طاہر اسماعیل بن عبداللہ بن عبدالمحسن الانماطی ۶۰۹ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ذوالحجہ ۶۸۴ھ میں قاہرہ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے اُن سے رجب ۶۶۸ھ میں حدیث سنی تھی۔

(۹) جمال الدین ابو حامد محمد بن بن علی بن محمود بن احمد بن علی ابن الصابونی ۶۰۴ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ذوالقعدہ ۶۸۰ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے رمضان ۶۶۸ھ اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۱۰) کمال الدین ابو نصر عبدالعزیز بن عبد المنعم بن الخضر بن شبل بن عبدالحارثی، ۵۸۵ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور شعبان ۶۷۲ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶ شعبان ۶۶۹ھ کو جمعہ کے دن جامع دمشق میں اُن سے سنی ہوئی ایک حدیث نقل کی ہے۔

(۱۱) تقی الدین ابو محمد اسماعیل بن ابراہیم بن ابی الیسر التنوخی ۵۸۹ھ میں پیدا ہوئے تھے اور صفر ۶۷۲ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۶۹ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۱۲) سیف الدین ابوزکریا یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن نجم بن عبدالوہاب الحنبلی ۵۹۲ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور شوال ۶۷۲ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے ۱۰ شوال ۶۶۹ھ کو جمعہ کے دن ان سے سنی ہوئی ایک حدیث نقل کی ہے۔

(۱۳) زین الدین ابوالعباس المومل بن محمد بن علی بن محمد بن علی بن منصور بن المومل البالسی ۶۰۲ھ یا ۶۰۳ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور رجب ۶۶۷ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۶۹ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۱۴) رشید الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر محمد بن محمد بن سلیمان العامری ذوالحجہ ۶۸۲ھ میں وفات پائی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۶۹ھ اور ۶۷۷ھ میں سنی ہوئی دو حدیثیں نقل کی ہیں۔

(۱۵) کمال الدین ابواسحاق ابراہیم بن احمد بن اسماعیل بن فارس التیمی السعدی ۵۹۶ھ میں پیدا ہوئے تھے اور صفر ۶۷۶ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے رمضان ۶۷۴ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۱۶) شرف الدین ابوعبداللہ محمد بن عبدالمنعم بن عمر بن عبداللہ بن عزیز بن القواس الطائی ۶۰۱ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ربیع الآخر ۶۸۲ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۷۵ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۱۷) ابوعبداللہ محمد بن بدر بن محمد بن یعیش الجزری شعبان ۶۷۵ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے اسی مہینے میں اُن سے قاسیون میں حدیث سنی تھی۔

(۱۸) زین الدین ابو اسحاق ابراہیم بن احمد بن ابی الفرج بن ابی ظاہر بن محمد بن نصر المعروف بابن السدید الانصاری الحنفی ، جمادی الاولیٰ ۶۷۷ھ میں تہتر ۷۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

امام ابن تیمیہ نے رجب ۶۷۵ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۱۹) زین الدین ابو العباس احمد بن ابی الخیر سلامہ بن ابراہیم بن سلامہ بن الحداد الدمشقی، ربیع الاول ۶۰۹ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور ۱۰ محرم ۶۷۸ھ کو وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے ربیع الاول ۶۷۵ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۲۰) عماد الدین ابومحمد عبدالرحمٰن بن ابی الصعر بن السند بن الصائغ الانصاری، رمضان ۶۷۹ھ میں وفات پائی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۷۶ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۲۱) امین الدین ابومحمد القاسم بن ابی بکر بن قاسم بن غنیمۃ الاربلی ۵۹۵ھ یا اس سے کچھ پہلے اربل میں پیدا ہوئے تھے اور جمادی الاولیٰ ۶۸۰ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۷۷ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۲۲) ابوبکر عمر بن یونس المزی الحنفی ۵۹۳ھ میں پیدا ہوئے تھے اور شعبان ۶۸۰ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۷۷ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۲۳) قاضی القضاۃ نفیس الدین ابو القاسم ہبۃ اللہ بن محمد بن علی بن جریر الحارثی الشافعی، صفر ۶۸۰ھ میں تہتر برس کی عمر میں وفات پائی۔ امام ابن تیمیہ نے ۶۷۹ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۲۴) شمس الدین ابو الغنائم المسلم بن محمد بن مسلم مکی بن خلف بن غیلان القیسی الدمشقی، ۵۹۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ روساء میں شمار کیے جاتے تھے، دمشق میں مختلف دواوین کے ناظر رہے، مگر آخر میں ان سب کو چھوڑ کر محض درس و تدریس اور تلاوتِ قرآن و عبادات کو اپنا روزمرہ کا مشغلہ بنالیا تھا، مسند امام احمد تین مرتبہ سنائی، صحیح مسلم اور جامع ترمذی اور دیگر کئی صحاح کی کتابیں سنائیں، وہ صدر کبیر کے لقب سے مشہور تھے۔ شیخ علم الدین برزالی۔ شیخ ابو الحجاج یوسف المزی اور امام ابن تیمیہ ان سے حدیث پڑھتے تھے۔ ۶ ذوالحجہ ۶۸۰ھ کو وفات پائی اور قاسیون کی گھاٹی میں مدفون ہوئے۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۸۰ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۲۵) شیخ برہان الدین ابو اسحاق ابراہیم بن شیخ صفی الدین ابی الفداء اسماعیل بن ابراہیم بن یحییٰ بن علوی بن الحسین ابن الرضی الازجی القرشی الحنفی ۵۹۹ھ میں پیدا ہوئے تھے، حدیث کے حافظ تھے، شیخ برزالی، مزی اور امام ابن تیمیہ نے ان سے معجم الطبرانی الکبیر وغیرہ سنی تھی، ۷ صفر ۶۸۱ھ کو دمشق میں انتقال کیا۔

امام ابن تیمیہ نے رجب ۶۸۰ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۲۶) شیخ نجیب الدین ابو المرہف المقداد بن ابی القاسم ہبۃ اللہ بن المقداد بن علی القیسی ۶۰۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اور شعبان ۶۸۱ھ میں وفات پائی تھی۔

(۲۷) کمال الدین ابو محمد عبد الرحیم بن عبد الملک بن یوسف بن قدامۃ المقدسی ۵۹۸ھ کے قریب پیدا ہوئے تھے اور جمادی الاولیٰ ۶۸۰ھ میں انتقال کیا تھا۔

امام ابن تیمیہ نے صفر ۶۸۰ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۲۸) شیخ نجم الدین ابو الغر یوسف بن یعقوب بن محمد بن علی المجاور الشیبانی ۶۰۱ھ میں پیدا

ہوئے تھے اور ذوالقعدہ ۶۹۰ھ میں انتقال کیا تھا۔

امام ابن تیمیہ نے محرم ۶۸۰ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۲۹) جمال الدین احمد بن ابی بکر بن سلیمان الواعظ ابن الحموی ۶۰۰ھ کے قریب پیدا ہوئے تھے اور ذوالحجہ ۶۸۷ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے رجب ۶۸۰ھ اور ۶۸۱ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔ النجار ۳۰ ذوالحجہ ۵۹۵ھ یا پہلی محرم ۵۹۶ھ کو پیدا ہوئے تھے، اور ربیع الآخر ۶۹۰ھ میں وفات پائی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۸۱ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۳۱) ابو یحییٰ اسماعیل بن احمد بن عبداللہ بن حماد بن عبدالکریم العسقلانی ۵۹۹ھ میں پیدا ہوئے تھے اور رمضان ۶۸۲ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۸۱ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۳۲) شیخ علی ابن محمود بن شہاب ۵۹۵ھ میں پیدا ہوئے تھے اور رمضان ۶۸۰ھ میں انتقال کیا تھا۔

(۳۳) شمس الدین ابوالفرج عبدالرحمٰن بن احمد بن عبدالملک بن عثمان بن عبداللہ بن سعد المقدسی ۶۰۶ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ذوالقعدہ ۶۸۹ھ میں وفات پائی تھی۔

(۳۴) شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن الکمال عبدالرحیم بن عبدالواحد بن احمد بن عبدالرحمٰن المقدسی ۶۰۷ھ میں پیدا ہوئے تھے اور جمادی الاولیٰ ۶۸۸ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۸۱ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۳۵) ام الخیر ست العرب بنت یحییٰ بن قایماز بن عبداللہ التاجیۃ الکندیہ ۵۹۹ھ میں پیدا ہوئیں اور ۶۸۴ھ میں وفات پائی۔

ابن تیمیہ نے رمضان ۶۸۱ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۳۶) ام العرب فاطمہ بنت ابی القاسم علی بن ابی محمد القاسم بن ابی القاسم علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ بن عبداللہ بن الحسین بن عساکر ۵۹۸ھ میں پیدا ہوئیں اور شعبان ۶۸۳ھ میں وفات پائی۔

امام ابن تیمیہ نے رمضان ۶۸۱ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۳۸) شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن محمد بن عباس بن ابی جفوان الانصاری الدمشقی المحدث الفقیہ الشافعی، حدیث وفقہ اور نحو ولغت میں کمال پیدا کیا تھا۔ ۶۸۲ھ میں انتقال کیا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ انہوں نے امام ابن تیمیہ اور شیخ ابوالحجاج مزی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ان دونوں نے شیخ شمس الدین موصوف سے مسند امام احمد ابن حنبل سنی۔ مگر کسی جگہ انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی اور اُن کی بزرگی کے لیے ان دونوں بزرگوں کی شہادت کافی ہے۔

(۳۹) شیخ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن عامر بن ابی بکر الغسولی الحنبلی، وہ ہر اتوار کی رات کو محفل منعقد کیا کرتے تھے اور وعظ کہا کرتے تھے۔

۱۱ جمادی الاخری ۶۸۴ھ کو اسّی سال کی عمر میں وفات پائی اور شیخ عبداللہ ارمنی کی تربت کے قریب مدفون ہوئے۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۸۲ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۴۰) محی الدین ابوحفص عمر بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن ابی عصرون التیمی ۵۹۹ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۳ ذوالقعدہ ۶۸۲ھ کو وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے اسی سال یعنی ۶۸۲ھ میں ان سے حدیث سنی تھی۔

(۴۱) ست الدار بنت مجدالدین ابن تیمیہ۔ یہ امام ابن تیمیہ کی پھوپھی تھیں ۶۸۳ھ میں امام ابن تیمیہ نے اُن سے بانیاسی کا ایک جز پڑھا تھا۔

(۴۲) ابوالعباس احمد بن شیبان بن تغلب بن حیدرۃ الشیبانی ۵۹۹ھ میں پیدا ہوئے تھے اور صفر ۶۸۵ھ میں وفات پائی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۸۴ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۴۳) الشیخ الصدوق الامین شمس الدین ابوغالب المظفر بن عبدالصمد بن خلیل الانصاری، جمادی الاولیٰ ۶۸۸ھ میں بیاسی ۸۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

امام ابن تیمیہ نے جمادی الاخریٰ ۶۸۴ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

(۴۴) ام محمد زینب بنت احمد بن عمر بن کامل المقدسیہ ۶۰۱ھ میں پیدا ہوئیں، اور شوال

۶۸۷ھ میں وفات پائی۔

امام ابن تیمیہ نے ۶۸۴ھ میں اُن سے حدیث سنی تھی۔

اساتذۂ دیگر

ان شیوخ کے علاوہ امام ابن تیمیہ نے اور بہت سے شیوخ حدیث سے استفادہ کیا، ان کے نام ہمیں معلوم نہیں ہیں، انہوں نے حدیث کی مختلف کتابوں کو کئی اساتذہ سے بحث وتکرار کے ساتھ پڑھا، جس کی وجہ سے انہیں حدیث پر کامل عبور حاصل ہو گیا تھا، یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا کہ جس حدیث کو امام ابن تیمیہ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں ہے۔

اس زمانے میں شیخ سلیمان بن عبدالقوی عربی ادب کے امام مانے جاتے تھے، امام ابن تیمیہ نے ادب کی اکثر کتابیں انہیں سے پڑھیں، شیخ شمس الدین ابن ابی عمر اور شیخ زین الدین ابن المنجا سے بھی فقہ اور اُصول کی کئی کتابیں پڑھیں۔

وسعت مطالعہ

یوں تو امام ابن تیمیہ نے عربی ادب، صرف ونحو، معانی وبیان وبدیع تفسیر، حدیث، فقہ، اُصول، فرائض، حساب، جبر ومقابلہ، اقلیدس، فلسفہ، کلام اور منطق وغیرہ کی کتابیں مختلف اساتذۂ وقت سے پڑھیں مگر اُن فنون کی زیادہ تر کتابیں ذاتی مطالعہ اور غور وخوض کے ذریعے حل کیں، سیبویہ کی کتاب کو خود ہی حل کیا تھا، اس زمانے کی کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو اُن کے ہاتھ لگ گئی ہو اور جس کو انہوں نے نہ پڑھا ہو۔ مسلسل کئی سال کے مطالعے نے ان کے سامنے غور وفکر کی نئی نئی راہیں کھول دیں، انہوں نے ہر ایک علم وفن کو قرآن وحدیث کے معیار پر جانچنا اور پرکھنا شروع کر دیا، سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر پہلو سے نئے نئے نتائج مستنبط کیے، چونکہ اُن کی طبیعت میں ابتدا ہی میں تیزی اور حدت تھی، اس لیے وہ اپنے ساتھیوں سے پورے جوش وخروش کے ساتھ نزاعی مسائل میں بحث کرنے لگ جاتے تھے اور بسا اوقات اپنے پرزور دلائل سے ان کو چپ کرا دیتے تھے، جب کتابوں کے مطالعے سے بھی ان کے شکوک وشبہات دور نہیں ہوتے تھے تو وہ قرآن وحدیث کے ذریعے ان کو رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے، وہ اکثر خدا کی بارگاہ میں گڑگڑا کر عاجزانہ دُعا کرتے تھے کہ اے معلم

ابراہیم! مجھ کو فہم عطا کر۔ اُن کی عمر جیسے جیسے بڑھتی جاتی تھی اُن کے مطالعہ کتب کی پیاس بھی بڑھتی جاتی تھی، نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ آخر زمانے میں کتابوں کے مطالعہ کے سوا انہیں کسی اور چیز سے رغبت نہیں ہوتی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے متقدمین کی کتابوں کو جو علمائے وقت کے ہاتھوں متروک اور مہجور ہو چکی تھیں نئے سرے سے زندہ کیا اور اپنے زمانے کے علما کو ان کے مطالعے کی طرف توجہ دلائی۔ امام ابن تیمیہ کی تصنیفات میں ان کتابوں کے اتنے حوالے اور اقتباسات ملتے ہیں کہ اُن کو پڑھ کر اس پر حیرت ہوتی ہے کہ امامِ موصوف کو یہ تمام کتابیں کہاں سے دستیاب ہو گئیں تھیں۔

ایک چیستان اور اس کا حل

شیخ رشید الدین ابوحفص عمر بن اسماعیل بن مسعود الفارقی (المتوفی: ۶۸۹ھ) نے بیس شعر میں اہل علم سے ایک پہیلی دریافت کی تھی، انہوں نے یہ سوال کیا تھا کہ بتاؤ وہ کون سا تین حرفی اسم ہے جس کا ایک تہائی حصہ دوسرے حصے کے برابر ہے، اور تیسرا حصہ پورے اسم کا دُگنا ہے، دوسرا حصہ جوہر ہے جس میں تمام اعراض جمع ہیں، وہ ایک ایسا مثلث ہے جس کا جذر اس کے برابر ہے، وہ افلاک کا ایک جز ہے اس میں مختلف صفات ایسی جمع پڑ گئی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں وہ بیک وقت زندہ بھی ہے، جماد بھی ہے، ساکن بھی ہے، متحرک بھی ہے، اگر اس میں دو خمس (پانچواں حصہ) کا اضافہ کیا جائے، تو وہ اپنے معلول کی علت بن جاتا ہے، اور اگر ان کو گھٹا دیا جائے تو وہ اپنے موضوع کا محمول بن جاتا ہے، وہ فعل ماضی ہو کر مستقبل کے اور مطلق و عام ہو کر مقید و خاص کے معنی دیتا ہے، اس کا مفرد اس کے مجموعے سے بڑھا ہوا ہے، وہ ایک جگہ پر ٹھہرا ہوا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ کوچ بھی کر رہا ہے، وہ مستحیل بھی ہے، ممکن بھی ہے، اس کا آہستہ چلنا اس کے تیز چلنے کے برابر ہے، شریعت اور دین میں اس کے نام کی بڑی اہمیت ہے اس کے معانی کی باریکیاں فنِ عروض کے مشہور ماہر خلیل کے علم کی مناسب ہیں، مگر یہ اسم اس کی تقطیع سے باہر ہے، جب کوئی ماہر عروض اس کو حل کرنا چاہے تو وہ اس کو مفروق یا مجموع میں پاتا ہے، وہ شعار کے لحاظ سے تو اشعری ہے، مگر اس کا عقیدہ حنابلہ کا ہے اور ایک کندی شاعر کے قول کے مطابق اس کے عہد کی حفاظت کرنے والا اس کو ضائع

کرنے والے کی مانند نہیں ہوتا، وہ پیاسے کو سیراب کرتا ہے اور تاریکی میں بھٹکنے والوں کو راہِ ہدایت دکھاتا ہے۔

شیخ رشید الدین نے اپنی اس چیستان میں فلسفہ و کلام و منطق وغیرہ کی بہت سی اصطلاحات استعمال کی ہیں، جن کی وجہ سے یہ صاف پتہ نہیں چلتا کہ اس سے تین حرفی اسم مقصود ہے، تاہم امام ابن تیمیہ نے اس کا حل معلوم کرنے کی کوشش کی، اور اس کے جواب میں ایک سو شعر کہے، اس وقت اُن کی عمر انیس بیس سے زیادہ نہیں تھی، انہوں نے چیستان کی تمام اصطلاحات اور اوصاف کو لفظ ''علم'' پر منطبق کیا ہے، یہ تمام اشعار ''العقود الدریہ'' میں نقل کیے گئے ہیں، اُن کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہ نے صرف ایک رات کے اندر یہ اشعار لکھے تھے، جب شیخ رشید الدین نے اُن کے اس جواب کو پڑھا تو ان کی تیزیٔ ذہانت کی بڑی داد دی، مگر اس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ امام ابن تیمیہ نے وہ اسم نہیں پیش کیا جو اُن کا مقصودِ اصلی تھا، بلکہ اسی کے مماثل ایک دوسری توجیہ اور مستحسن توجیہہ پیش کر دی ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

اَحْسَنَ فِی حَلِّ الْمُسَمّٰی وَمَا
سَمّٰی وَلٰکِنْ جَاءَ بِالْمِثْلِ

مسمیٰ یعنی نام بردہ کے حل کرنے میں بہت اچھی توجیہہ پیش کی، انہوں نے وہ نام نہیں لیا جو اُن کا مقصود اصلی تھا، بلکہ اسی کے مماثل ایک دوسری توجیہہ کر دی ہے۔

آگے چل کر شیخ رشید الدین نے امام ابن تیمیہ کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے:

وَحَقَّ بِالْفَخْرِ فَتًی جَدُّہٗ الْمَجْدُ وَ قَدْ بُوْرِكَ فِی النَّسْلِ۔

''اور اس نوجوان (یعنی امام ابن تیمیہ) کے فخر کے لیے یہی بس ہے کہ ان کے دادا مجد (اس کے معنی بزرگی کے ہیں مگر اس سے مراد مجد الدین ابوالبرکات عبدالسلام ابن تیمیہ ہیں) تھے اور ان کی نسل میں برکت دی گئی ہے۔

جب شیخ عبدالحلیم ابن تیمیہ نے شیخ رشید الدین کے سوال اور اپنے صاحبزادے کے

جواب اور شیخ موصوف کے جواب الجواب کو پڑھا تو انہوں نے اشعار ہی میں اس چیستان کا دوسرا حل پیش کیا، یہ اشعار کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزرے، البتہ شیخ رشید الدین نے اس پر جو تعریف کی ہے، وہ العقود الدریہ میں منقول ہے، اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبدالحلیم ابن تیمیہ بھی شیخ رشید الدین کے منشاء اصلی کو نہ پا سکے، تاہم انہوں نے ان کی تعریف بھی کی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

مَا مِثْلُ لَغْزِیْ وَلَمْ یُسَمَّ بِهٖ
مَنْ لَمْ یُمَاثِلْ فِی الْفَضْلِ وَالْاَدَبِ

وہ میری پہیلی کی مانند نہیں ہے اور انہوں نے اس کا نام نہیں لیا ہے جن کا فضل اور ادب میں کوئی مماثل اور نظیر نہیں ہے۔

بِخَاطِرٍ حَاضِرٍ یَضِیُ وَلَا
یُنْكِرُ ضَوْءً لِوَاحِدِ الشُّهَبِ

ایک ایسے حاضر دل سے جو روشن ہے اور وہ یگانہ شہابِ ثاقب کی چمک کا انکار نہیں کرتا۔

شَیْخُ شُیُوْخِ الْاِسْلَامِ قَاطِبَةً
مُفْتِی الْفَرِیْقَیْنِ حُجَّةِ الْعَرَبِ

عبدالحلیم ابن تیمیہ تمام شیوخ اسلام کے شیخ اور فریقین کے مفتی اور پورے عرب کے لیے حجت ہیں۔

فَالْفَخْرُ لِلْمَجْدِ بِالشِّهَابِ وَلِشِّهَابِ مَنْ بِالْمَجْدِ ذَرْوَةُ النَّسَبِ۔

مجد الدین یعنی عبدالسلام ابن تیمیہ کے لیے فخر شہاب الدین عبدالحلیم ابن تیمیہ کی وجہ سے ہے اور شہاب الدین کے لیے فخر کا باعث وہ شخص ہے جس کے نسب کی چوٹی مجد یعنی بزرگی پر قائم ہوئی ہے۔

شاعری کا ذوق

امام ابن تیمیہ کو قدرت نے شاعری کے لیے نہیں پیدا کیا تھا، وہ ایک مصلح اور مجدد پیدا ہوئے تھے، انہوں نے اپنی ساری زندگی دین اور ملک و قوم کی بہبودی اور بھلائی کے لیے وقف کر دی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر شاعری کا فطری مادہ بھی ودیعت کر رکھا تھا، مگر چونکہ وہ اس کام کے لیے نہیں پیدا ہوئے تھے اس لیے انہوں نے اس عطیہ الٰہی سے کوئی کام نہیں لیا، تاہم جب کبھی کسی شخص سے کوئی سوال اشعار میں کیا تو انہوں نے نثر کی سی سلاست اور روانی کے ساتھ سوال کا جواب اشعار ہی میں دیا، چنانچہ آگے چل کر جب مسئلہ جبر وقدر کے متعلق کسی نے اشعار میں سوال کیا تو بہت ہی طویل نظم میں اس کا جواب دیا، ان کے ساتھیوں کا بیان ہے کہ امام ابن تیمیہ نے جب ان اشعار کا جواب لکھنا شروع کیا، تو ابتداء میں یہ خیال کیا گیا کہ وہ نثر میں جواب لکھ رہے ہیں، مگر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے دیکھا کہ امام ابن تیمیہ اشعار کا اشعار ہی میں جواب دے رہے ہیں، اور اگر اس قسم کے مواقع اور بھی ملتے تو وہ شاید اشعار ہی میں سوالات کا جواب دیتے، لیکن اتنا اندازہ تو ہوتا ہے کہ وہ اشعار بھی نثر کی سی سلاست اور روانی کے ساتھ لکھ سکتے تھے اور انہیں نثر کے ساتھ نظم پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔

ملازمت

درس وتدریس اور تفسیر قرآن

ہم حافظ عبدالحلیم ابن تیمیہ کے حالات میں بیان کر چکے ہیں کہ وہ دارالحدیث السکریہ قصاعین دمشق کے شیخ الحدیث مقرر تھے اور انہوں نے ۳۰ ذوالحجہ ۶۸۲ھ کو ہفتے کی رات وفات پائی تھی اور دوسرے دن اتوار کی صبح کو صوفیہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے تھے۔

اس زمانہ میں تمام مدارس کے اندر حکومتِ وقت ہی کی طرف سے اساتذہ کا تقرر ہوتا تھا، حافظ عبدالحلیم ابن تیمیہ کی وفات کے بعد ان کے لڑکے امام ابن تیمیہ سے بڑھ کر ان کی جگہ کا کون اتنا لائق اور موزوں حقدار ہو سکتا تھا، حکومتِ وقت نے فوراً ہی ان کو دارالحدیث السکریہ کا اُستاد مقرر کر دیا۔

فتویٰ دینے کی اجازت

اُستاد ہونے سے پہلے ہی سترہ یا انیس سال کی عمر میں امام ابن تیمیہ کو فتویٰ دینے کی اجازت مل چکی تھی، ان کی غیر معمولی لیاقت اور قابلیت کو دیکھ کر قاضی شیخ شرف الدین ابو العباس احمد المقدسی شافعی (المتوفی: ۶۹۴ھ) نے اُن کو فتویٰ دینے کی اجازت دی تھی، قاضیؒ موصوف کو اس بات پر بہت فخر تھا کہ انہوں نے سب سے پہلے امام ابن تیمیہ جیسے لائق وقابل عالم کو فتویٰ دینے کی اجازت دی تھی۔ [1]

پہلا درس

امام ابن تیمیہ نے ۲ محرم ۶۸۳ھ کو پیر کے دن دارالحدیث السکریہ میں پہلا دس دیا، اس زمانے کا دستور یہ تھا کہ نئے استاد کو پہلے درس میں قضاۃ وعلمائے وقت اور عمائدین شہر شریک ہوتے تھے چونکہ امام ابن تیمیہ اپنے علم وفضل کی وجہ سے خاصے مشہور ہو چکے تھے، اس لیے ان کے اس پہلے درس میں لوگ بکثرت شریک ہوئے، اُن میں قاضی القضاۃ بہاء الدین یوسف بن القاضی محی الدین ابی الفضل یحییٰ ابن الزکی الشافعی (المتوفی: ۶۸۵ھ)، شیخ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/ ۳۴۱۔

الاسلام تاج الدین ابو محمد عبدالرحمٰن بن ابراہیم الفزاری الشافعی (المتوفی: ۶۹۰ھ)، شیخ زین الدین ابوحفص عمر بن مکی بن عبدالصمد بن المرحل الخطیب الشافعی (المتوفی: ۶۹۱ھ) اور شیخ الحنابلہ شیخ زین الدین ابوالبرکات بن المنجی بن الصدر عزالدین ابن عمر عثمان بن اسعد بن المنجی بن برکات بن المتوکل التنوخی (المتوفی: ۶۹۵ھ) جیسے جلیل القدر قضاۃ وخطیب وعلما بھی موجود تھے، اس درس میں امام ابن تیمیہ نے صرف ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے متعلق اتنے نکات بیان کیے کہ تمام سامعین حیرت میں آ گئے، ان کا یہ درس بیش بہا معلومات سے بھرا ہوا تھا، شیخ تاج الدین فزاری نے تو ان کا یہ پورا درس حرف بحرف قلمبند کر لیا، اور اس کو دارالحدیث السکریہ کے کتب خانہ میں محفوظ کروا دیا تا کہ آئندہ بھی طلبہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

طرزِ تفہیم

امام ابن تیمیہ کی آواز بہت بلند اور تقریر بہت ہی شستہ اور فصیح وبلیغ اور معلومات سے لبریز ہوتی تھی، وہ ہر ایک موضوع پر مختلف پیرایوں سے بحث کرتے تھے اور مختلف علوم وفنون کی اہم ترین کتابوں کے حوالوں سے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے تھے، وہ نہ صرف ان باتوں کو بیان کرتے تھے جو پہلے ہی سے طلبہ کے ذہن میں ہوتی تھیں، بلکہ ایسی نئی نئی توجیہات بھی پیش کرتے تھے جن کا وہم وگمان بھی طلبہ کے دماغ میں نہ ہوتا تھا، خود ان کے شاگردوں کا بیان ہے کہ وہ رات رات بھر مختلف کتابوں کا مطالعہ کر کے سبق میں شریک ہوتے تھے اور مختلف شکوک وشبہات کے متعلق اعتراضات سوچ کر جاتے تھے، مگر جب امام ابن تیمیہ سبق کو شروع کرتے تو اس کے مختلف پہلوؤں پر اس شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالتے کہ طلبہ کے اعتراضات کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی اور وہ اُن کے علاوہ اور بہت سی ایسی باتیں بتاتے تھے جن پر کسی کتاب میں بھی اُن کی نظر نہیں گزری ہوتی تھی۔

امام ابن تیمیہ جب کسی مسئلے پر تقریر شروع کرتے تو سب سے پہلے قرآن مجید سے استدلال کرتے اور قرآنِ مجید کی تمام ہم معنی آیتوں کو یکجا کر کے پیش کرتے اور ان کے معانی مطالب پر تفصیلی بحث کرتے، آیتوں کے الفاظ کے معانی کی تعیین آیتوں ہی سے کرتے، ان کی باریکیوں کو سمجھاتے اور ان سے جو نکات اور معارف مستنبط ہوتے اُن کو بیان کرتے پھر

رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال وسنن سے استشہاد کرتے، اور حدیث کے راویوں پر جرح کرتے اور احادیث کی صحت اور ان کے ضعف کو بتاتے، پھر صرف حنبلی فقہ ہی کی فروعات کو نہیں پیش کرتے تھے، بلکہ چاروں اماموں کی فقہ اور دیگر مشہور اماموں کے اقوال وآراء اور مجتہدین صحابہ وتابعین کے آراء وآثار کو بھی پیش کرتے اور ہر ایک کی دلیل پر کتاب وسنت کی روشنی میں بحث کرتے اور ان میں سے جو رائے یا قول صحیح ہوتا، اسی کو ترجیح دیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس طریقۂ تفہیم وتدریس کو وہی شخص اختیار کرسکتا ہے جس کے دماغ میں قرآن مجید کی آیتیں، رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں، صحابہ وتابعین وتبع تابعین کے آثار اور ائمہ وعلما مجتہدین کی رائیں مستحضر ہوں اور ان کی بروقت پیش کرنے کی قوت رکھتا ہو دوسرے الفاظ میں وہ کتاب وسنت وآثار وفقہ اسلامی پر پورا پورا عبور رکھتا ہو، چونکہ امام ابن تیمیہ کا مبلغ علم بہت ہی وسیع تھا اور وہ کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کے قریب قریب حافظ ہو چکے تھے، اسی لیے انہوں نے تفہیم کا یہ طرز اختیار کیا جو کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔

ان کا یہ طریقۂ تفہیم وتدریس نہ صرف طلبہ ہی کے لیے ہوتا تھا، بلکہ تقریر وتحریر، خطبوں اور فتوؤں میں بھی ان کا یہی طریقہ تھا جب وہ کسی مسئلے پر بولنے لگتے یا کسی مبحث پر قلم اٹھاتے تھے تو مسئلے کے صرف اہم پہلوؤں کو بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ مختلف ضمنی مباحث کو بھی اپنے دامنِ تقریر وتحریر میں سمیٹ لیا کرتے تھے، اور یہی چیز ان کے زمانے کے علما کے طرز تقریر وتحریر سے انہیں ممتاز کرتی تھی۔

تفسیر قرآن

فخر الدین ابن تیمیہ الخطیب کے حالات میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ ہر جمعہ کو حران کی جامع مسجد کے منبر پر بیٹھ کر قرآن مجید کی تفسیر کیا کرتے تھے، امام ابن تیمیہ نے دمشق میں اس آبائی طریقے کو زندہ کیا، اس کی ابتداء ۱۰ صفر ۶۸۳ھ سے ہوئی، یہی جمعہ کا دن تھا، جمعہ کی نماز کے بعد جامع دمشق کے منبر پر بیٹھ کر قرآن مجید کی تفسیر شروع کی، کئی سال تک اس کا سلسلہ جاری رہا، وہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد باقاعدہ سلسلہ وار قرآن مجید کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے اُن کی تفسیر بہت ہی مبسوط ہوتی تھی، کہا جاتا ہے کہ سورۂ نوح کی تفسیر کئی برس میں تمام

ہوئی، [1] اس میں واعظوں کی طرح موضوع قصے اور جھوٹی روایتیں نہیں ہوتی تھیں، بلکہ وہ کتاب و سنت کے بیش بہا استدلالات و توضیحات اور فقہ و تاریخ کے عجیب و غریب استشہادات سے لبریز ہوتی تھی، جیسے جیسے ان کی تقریر لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی جا رہی تھی۔ سامعین کی تعداد بھی ہر ہفتہ بڑھتی جا رہی تھی، چنانچہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

كَانَ يَجْتَمِعُ عِنْدَهُ الْخَلْقُ الْكَثِيْرُ وَالْجَمُّ الْغَفِيْرُ مِنْ كَثْرَةِ مَاكَانَ يُوْرِدُ مِنَ الْعُلُوْمِ الْمُتَنَوَّعَةِ الْمُحَرَّرَةِ مَعَ الدِّيَانَةِ وَالزُّهَادَةِ وَالْعِبَادَةِ سَارَتْ بِذِكْرِهِ الرُّكْبَانُ فِيْ سَائِرِ الْاَقَالِيْمِ وَالْبُلْدَانِ وَاسْتَمَرَّ عَلٰى ذٰلِكَ مُدَّةَ سِنِيْنَ مُتَطَاوِلَةً۔ [2]

اُن کے پاس بہت زیادہ مخلوق ہوتی تھی اور ایک جم غفیر جمع ہوتا تھا، اس وجہ سے کہ وہ مختلف قسم کے لکھے ہوئے اور مدون علوم کی باتیں بیان کیا کرتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ دیانت اور زہد و عبادت میں بھی بہت مشہور تھے، تمام اقلیموں اور شہروں کے مسافروں کی زبان پر ان کا نام جاری تھا۔ تفسیر کے اس طریقہ کو انہوں نے کئی سال تک جاری رکھا۔

فلسفہ و کلام و منطق پر نقد و جرح

ابو علی ابن سینا، امام غزالی، امام رازی اور دیگر مشہور مسلمان فلسفیوں اور متکلموں نے یونانی علوم معقولات کو اتنا اچھالا اور قرآن وحدیث اور عقائد وفقہ میں اُن کی اتنی آمیزش کر دی تھی کہ قرآن وحدیث اور فقہ کو اُن کی اصلی صورت میں دیکھنے اور اُن پر غور وفکر کرنے کی عام علما میں سکت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی، ان کے دماغوں پر فلسفہ وکلام اور منطق کے خیالات پوری طرح چھا گئے تھے، وہ ہر ایک مذہبی مسئلے کو اپنے زمانے کے علوم معقولات کی روشنی ہی میں جانچنے لگے تھے، امام ابن تیمیہ نے سب سے پہلے اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ کتاب وسنت سے باہر جو کچھ بھی ہے وہ گمراہی ہے، انہوں نے تمام علما کو قرآن وحدیث کو صاف اور شفاف اور اصول کی طرف اور معقولات سے زیادہ سیرت نبوی پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی، انہوں

---

[1] مجموع الدرر، ص: ٦٥۔ [2] كتاب البداية والنهاية: ١٣/ ٣٠٣۔

نے پہلی مرتبہ فلسفہ وکلام اور منطق وتصوف کے ہر ایک مسئلے کی کتاب وسنت کی روشنی میں جانچ پڑتال کر کے بتایا کہ ان علوم میں حق و باطل کی کتنی آمیزش ہوگئی ہے، انہوں نے اپنے زمانے کی بدعات کے خلاف بھی زور وشور سے آواز اٹھائی اور ہر ایک باطل خیال اور مسئلے پر نقد و جرح شروع کردی، اُن کا لہجہ بسا اوقات بہت زیادہ سخت ہو جاتا تھا، جس کی وجہ سے اگر ایک طرف اُن کے چاہنے اور سراہنے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی، تو دوسری طرف ان کی مخالفت کرنے والے بھی روز بروز بڑھتے جارہے تھے، اس کی وجہ سے کئی ہنگامے ہوئے جن کی تفصیل آیندہ اپنی اپنی جگہ پر آئے گی۔

قاضی بننے سے انکار

امام ابن تیمیہ کے علم وفضل کا شہرہ اس قدر بڑھتا گیا کہ ۶۹۰ھ سے پہلے حکومت وقت نے انہیں قضاوت کا عہدہ پیش کیا، مگر انہوں نے اس کے قبول کرنے سے قطعاً انکار کردیا، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اس کے فرائض کی انجام دہی کی اہلیت یا صلاحیت نہیں رکھتے تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ ان شرائط کی پابندی نہیں کر سکتے تھے جو قاضی ہونے سے پہلے حکومت سے کرنی ہوتی تھیں، قاضی کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنے مذہب ومسلک ہی کے مطابق فتویٰ دے، حنبلی قاضی کو خاص طور پر نصیحت کی جاتی تھی کہ صفاتِ باری کے مسئلے میں ظاہر آیات و احادیث کے مطابق فتویٰ نہ دے۔ [1] بلکہ متاخرینِ اشاعرہ کے مسلک کے مطابق فتویٰ دے یا وہ خاموشی اختیار کرے، امام ابن تیمیہ کی غیور طبیعت اس قسم کی پابندیوں کو گوارا نہیں کرسکتی تھی، وہ خود اگرچہ آبائی حنبلی تھے، مگر انہوں نے خود اپنی فقہ کی کوئی پابندی نہیں کی، انہوں نے اسی کی پرزور حمایت کی جو اُن کی دانست میں حق ہوتا تھا۔

صفاتِ باری کے متعلق تقریر اور شورش

۶۹۰ھ میں ایک جمعہ کو امام ابن تیمیہ نے تفسیر قرآن کے ضمن میں صفاتِ باری کے مسئلے پر روشنی ڈالی، اس میں متاخرینِ اشاعرہ کے خیالات کے خلاف سخت تنقید تھی، ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ دمشق کے متعصب شافعی علما نے ان کے خلاف شورش کی، مصر اور شام

---

[1] دیکھو صبح الاعشی: ۱۱/ ۲۰۳، ۲۰۲۔

میں شافعیوں کی بڑی کثرت تھی، حکومت کے بڑے بڑے عہدے انہیں حاصل تھے، چاروں مذاہب میں شافعیوں کے قاضی القضاۃ کا درجہ پہلا تھا، یہ لوگ عقائد میں اپنے آپ کو امام ابوالحسن اشعری کے پیرو مانتے تھے، اشعری اور حنبلی ایک زمانے سے باہم دست و گریبان رہتے تھے۔ امام غزالی کے بعد امام رازی نے اشاعرہ کے مذہب کو اس قدر مضبوط بنا دیا تھا کہ حکومت نے اشاعرہ ہی کے مذہب کو صحیح مان لیا تھا، حنابلہ کو اپنے عقائد کے پیش کرنے کی اجازت نہیں تھی، اگر کوئی ان مسلمہ اشعری عقیدوں کے خلاف کچھ بول اٹھتا تھا تو اس سے سخت ترین گرفت کی جاتی تھی۔

اشاعرہ اور حنابلہ کے درمیان سب سے بڑا اختلاف جہت باری کے مسئلے پر تھا۔ حنابلہ اس کے قائل تھے کہ خدا عرش پر ہے، قرآن مجید کی آیتیں اور مختلف صحیح حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں، وہ صفات باری کے معاملے میں تاویل کو جائز نہیں سمجھتے تھے، اشاعرہ یہ کہتے تھے کہ اس طرح ماننے سے خدا کی تجسیم لازم آتی ہے، اور اگر خدا کو جسم مانا جائے تو وہ حادث ہو جاتا ہے اور چونکہ ہر حادث فانی ہے اس لیے خدا بھی فانی ٹھہرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اشاعرہ یہ ماننے لگے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے، وہ کسی ایک جگہ متعین نہیں ہے، اس کے لیے نہ توفوق ہی نہ تحت ہے غرض یہ کہ اس کے لیے خاص جہت نہیں ہے، اشاعرہ حنابلہ کو حشویہ کہا کرتے تھے۔

جب امام ابن تیمیہ نے صفاتِ باری کے متعلق کتاب وسنت کے دلائل پیش کیے تو تمام اشعری برافروختہ ہو گئے، اور ان کے خلاف شورش شروع کر دی، مگر قاضی القضاۃ شہاب الدین ابوعبداللہ محمد بن شمس الدین ابی العباس احمد بن الخلیل بن سعادۃ بن جعفر بن عیسیٰ بن محمد الشافعی المعروف بابن الخوی (المتوفی: ۶۹۳ھ) نے ان کی زبردست حمایت کی اور کھلے الفاظ میں اُن کی تائید کی انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ امام ابن تیمیہ کے عقیدے پر ہیں، کیونکہ ان کا ذہن ٹھیک ہے، اور ان کے دلائل بہت ہیں اور وہ وہی کہتے ہیں جو درست اور ٹھیک ہے۔ [1] قاضیٔ موصوف کی حمایت کی وجہ سے شافعی لوگ اور زیادہ برافروختہ ہو گئے انہوں نے اس کی کوشش کی کہ آیندہ سے امام ابن تیمیہ جامع دمشق کے منبر پر تقریر نہ کیا

---

[1] طبقات الحنابلہ لابن رجب قلمی۔

کریں، مگر ان کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی، چونکہ امام ابن تیمیہ کی حمایت میں بھی بہت سے لوگ تیار ہو گئے تھے اور فتنہ کا امکان تھا، اس لیے دانشمندوں، امیروں اور عالموں نے بیچ میں پڑ کر اس کو دبا دیا، مگر یہ فتنہ کئی مرتبہ اٹھا، اس کی وجہ سے امام ابن تیمیہ پر کئی مرتبہ گرفت ہوئی، مختلف مجلسیں منعقد کی گئیں، اور برسر عام امام ابن تیمیہ سے مباحثے اور مناظرے ہوئے اور اس سلسلے میں ان کو کئی مرتبہ قید خانے جانا پڑا، اس کی تفصیل آئندہ اپنی جگہ پر آئے گی۔

حج بیت اللہ

امام ابن تیمیہ ۶۹۱ ھ کے اواخر میں شامی قافلے کے ساتھ حج کرنے تشریف لے گئے، قافلہ کا سردار باسطی تھا، حج کے دوران میں بہت سے لوگ ان سے ملنے کے لیے آتے تھے، اور ان کے علم و فضل کو دیکھ کر حیران اور مبہوت ہو جاتے تھے، اس وقت ان کی عمر تیس سال کی تھی، اگر اس عمر میں ان کے علم و فضل کی یہ کیفیت ہو تو آگے چل کر ان کے علم و کمال میں کیا ترقی نہ ہو گی۔

یہ قافلہ صفر ۶۹۲ ھ کے اواخر میں دمشق پہنچا، مقام ''معان'' میں جو حجاز کی سرحد پر بادیۂ شام کا ایک مشہور گاؤں تھا، اس روز کا طوفان چلا کہ بہت سی جانیں ضائع ہو گئیں۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ لوگوں کی پگڑیاں سروں سے اڑ گئیں اور اونٹ اپنی جگہ سے کھسک گئے اور ہر شخص نفسی نفسی کے عالم میں مبتلا ہو گیا تھا، کسی کو دوسرے کی خبر نہیں تھی۔ [1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک نصرانی کی گستاخی اور ہنگامہ

رجب ۶۹۳ ھ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ایک زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا، مگر اس کے ساتھ ساتھ امام ابن تیمیہ کے غیر معمولی علم و فضل کا ایک نمایاں ثبوت بھی لوگوں کو مل گیا۔ دمشق میں بہت سے نصرانی رہا کرتے تھے، صلیبی لڑائیوں کی بنا پر نصرانیوں اور مسلمانوں میں ایک زمانہ سے عداوت چلی آ رہی تھی، جب صلاح الدین ایوبی نے ملک شام صلیبیوں سے واپس لے لیا تو ان نصرانیوں کا طرزِ عمل بدل گیا، وہ بظاہر مسلمانوں کے دوست تھے، مگر باطن میں اسلام اور مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے تھے، چنانچہ کبھی کبھی

---

[1] البداية والنهاية: ١٣ /٣٣٣۔

اس کا نتیجہ سبّ وتوہین رسول کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا تھا، شہاب الدین احمد بن حجی (المتوفی: ۶۸۲ھ) عربوں کا امیر تھا، وہ اپنی فوج کو لے کر سلطانِ مصر کی جانب سے تاتاریوں کے خلاف لڑنے کے لیے ۶۸۰ میں دمشق آیا تھا اس کا لڑکا عساف دمشق میں بس گیا تھا، اس کے پاس ایک نصرانی کاتب ملازم تھا، اس نے آنحضرت ﷺ کی شان میں کئی مرتبہ نازیبا الفاظ استعمال کیے تھے، اس کی یہ حرکتیں مسلمانوں کو بہت ناگوار گزریں، امام ابن تیمیہ نے شیخ الشافعیہ شیخ زین الدین ابومحمد عبداللہ بن مروان بن عبداللہ بن فہر بن الحسن الفارقی (المتوفی: ۷۰۳ھ) کو ساتھ لے کر دمشق کے نائب سلطنت امیر عزالدین ایبک الحموی (المتوفی: ۷۰۳ھ) سے ملاقات کی اور اُس نصرانی کاتب کی گستاخیوں کی اطلاع دی، امیر موصوف نے وعدہ کیا کہ وہ نصرانی کاتب کو بلا کر اس معاملے کی تحقیق کرے گا، چنانچہ یہ دونوں شیخ وہاں سے واپس ہوئے، اُن کے ساتھ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اتفاق ایسا ہوا کہ راستے ہی میں اس نصرانی سے مٹھ بھیڑ ہوگئی، اس کے ساتھ ایک عرب بدو بھی تھا اس کو دیکھ کر مسلمانوں نے کچھ برا بھلا کہنا شروع کیا، وہ عرب بدو نصرانی کی حمایت پر کمر بستہ ہوگیا اور اس نے کہا کہ یہ نصرانی تم لوگوں سے تو اچھا ہی ہے یہ سن کر سارا مجمع مشتعل ہو گیا، اور ان دونوں پر اتنے پتھر برسائے کہ دونوں زخمی ہو گئے، جب امیر عزالدین ایبک الحموی کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت ہی برافروختہ ہوگیا، اس نے خیال کیا کہ مجمع کی یہ حرکت محض امام ابن تیمیہ اور شیخ زین الدین الفارقی کے اشارے سے ہوئی ہے، اس نے فوراً ان دونوں کو بلا بھیجا، اپنے سامنے انہیں دُرے لگوائے اور پھر انہیں مدرسۂ عذراویہ میں بند کرادیا، امیر عرب عساف ابن احمد ابن حجی اور شادُّ الدواوین شمس الدین الاعسر اس نصرانی کی حمایت پر کمربستہ ہوگئے، اس کی وجہ سے خود مسلمانوں میں سخت اختلاف اور انتشار پیدا ہوگیا، نائبِ سلطنت نے اس مسئلے کے متعلق کئی مجلسیں منعقد کیں اور علمائے وقت سے بحثیں کی، امام ابن تیمیہ نے اس مسئلے پر ایک ضخیم کتاب ہی لکھ ڈالی جو ''مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن'' سے ''الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس میں اس مسئلے پر چار پہلوؤں سے بحث کی ہے، پہلا یہ کہ نبی کریم ﷺ کے گالی دینے والے کو چاہے وہ مسلمان ہو

یا کافر قتل کر دینا چاہیے، دوسرا یہ کہ اس کا قتل واجب ہے چاہے وہ ذمی ہی کیوں نہ ہو، زرِ فدیہ لے کر یا اس کے ساتھ احسان کر کے اس کو چھوڑا نہیں جا سکتا، تیسرا یہ کہ گالی دینے والے کو چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر قتل کر دینا چاہیے، اس سے توبہ نہیں کروانی چاہیے، اگر یہ معاملہ سلطان تک پہنچ جائے، اور اس پر الزام کا ثبوت ہو جائے تو توبہ کرنے پر بھی اس کی حد ساقط نہیں ہوتی، چوتھا یہ کہ نبیٔ کریم ﷺ کو گالی دینے والا کافر ہے چاہے وہ اس کو حلال سمجھے یا حلال نہ سمجھے۔

اس مسئلے کی نوعیت چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ یہ کتاب امام ابن تیمیہ کے وسعتِ علم اور ان کے اجتہادات واستنباطات کا ایک بین ثبوت ہے، قرآن مجید، احادیث رسول اور آثار صحابہ وتابعین واقوال ائمہ سلف کو جس زور وقوت کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کتاب کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے، اس ایک مسئلے پر اتنی بڑی ضخیم کتاب کا لکھ دینا ان کے غیر معمولی علم وفضل کی ایک زبردست شہادت ہے۔

امام ابن تیمیہ کی اس مدلل بحث کے فوراً بعد ہی اس نصرانی نے اسلام قبول کر لیا، اور نائب سلطنت کے سامنے اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اس نے آنحضرت ﷺ کی شان میں بے ادبی نہیں کی اور اُس پر محض جھوٹی تہمت لگائی گئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہ کی تحریر کے بعد اس نصرانی کو بچانے کے لیے ایک تدبیر نکالی گئی تھی، چنانچہ قاضی حسام الدین ابو الفضائل حسن بن تاج الدین احمد بن انوشیروان بن انوشیروان رازی رومی حنفی [1] اپنی نظم میں امیر عرب عساف بن احمد بن حجی کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

---

[1] قاضیٔ موصوف بلادِ روم کے ایک گاؤں اقسیس میں محرم ۶۳۱ھ میں پیدا ہوئے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیس سال تک مالطہ میں قاضی رہے، پھر دمشق آئے، یہاں کچھ دن تک نیابت کی، یہاں سے مصر گئے، پھر تھوڑی مدت کے بعد دمشق واپس چلے آئے، جب ربیع الاول ۶۹۹ھ میں دمشق کے قریب وادیٔ خزندار میں قازان کی فوج کے ساتھ زبردست معرکہ پیش آیا تو وہ بھی مجاہدین کی صفِ اول میں موجود تھے، پھر کچھ پتہ نہ چلا آیا مارے گئے یا کہیں گم ہو گئے۔

اِلٰی مَا فُتُوْرُ الْعَزْمِ یَا اٰلَ اَحْمَدِ
بِاِبْقَاءِ کَلْبٍ سَبَّ دِیْنَ مُحَمَّدِ

اے احمد کی اولاد! تمہارے عزم اور ارادے میں کب تک فتور رہے گا اور تم اس کتے کو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو گالیاں دیتا ہے کب تک باقی رکھو گے۔

وَکَانَ اِذَا مَا اَذَّنَ الْقَوْمُ سَبَّهُ
وَکَانَ بِذِکْرِ الْقُبْحِ فِیْهِ بِمَرْصَدِ

اور جب مسلمان قوم ہی اس کو گالیاں دینے کی اجازت دے اور وہ دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی برائیوں کے ذکر کرنے کی تاک میں لگا رہے۔

بِاِسْلَامِهٖ لَا یَدْرَأُ الْحَدُّ بَعْدَمَا
تَکَرَّرَ مِنْهُ الشَّرُّ فِیْ کُلِّ مَوْرَدِ

اس کے اسلام لے آنے سے حد اور سزا ساقط نہیں ہو جاتی، بعد اس کے کہ اس سے ہر موقع پر یہ شر بار بار صادر ہوتا رہا ہے۔

عَلٰی قَتْلِهٖ اَهْلُ الْمَذَاهِبِ اَجْمَعُوْا
فَکُنْ مُمْضِیًا فِیْ نَحْرِهٖ بِمُهَنَّدِ

اس کے قتل کر دینے پر تمام مذاہب والوں کا اجماع ہے، اس لیے تو بھی اس کے سینے میں تیز تلوار بھونک دے۔

فَاَنْتُمْ لُیُوْثُ الْحَرْبِ فِیْ کُلِّ مَعْرَكٍ
وَاَنْتُمْ سِهَامُ الدِّیْنِ فِیْ کُلِّ مَشْهَدِ [1]

بس تم ہر معرکہ میں لڑائی کے شیر ہو اور تم ہر شہادت گاہ میں دین کے تیر ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نصرانی کی گستاخیوں کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبات کو کس قدر ٹھیس لگی تھی، امیر عزالدین ایبک الحموی نے امام ابن تیمیہ اور شیخ زین الدین الفارقی کو رہا کر دیا اور ان دونوں سے معافی چاہی، عجیب اتفاق یہ کہ دوسرے ہی سال یعنی ربیع

---

[1] رفع الاصر عن قضاۃ مصر لا بن حجر عسقلانی، ترجمۃ قاضی حسام الدین۔

الاول ۶۹۴ھ کے اواخر میں امیر عساف بن احمد بن حجی بھی مارا گیا، کہا جاتا ہے کہ عساف کے بھتیجے نے اس کو مدینہ منورہ کے قریب کسی جگہ قتل کر دیا۔ [1]

شیخ الحنابلہ کی جانشینی

دارالحدیث الحنبلیہ یعنی مدرسۂ ابی عمر دمشق میں امام ابن تیمیہ نے ایک مدت تک تعلیم پائی، یہیں شیخ الحنابلہ شیخ زین الدین ابن المنجی ایک زمانۂ دراز تک درس دیتے رہے، حنبلیوں کے سب سے بڑے عالم اور مفتی شمار کیے جاتے تھے، عوام اور خواص کے نزدیک ان کی بڑی عزت تھی، دنیوی وجاہت کے لحاظ سے بھی ان کا بہت بڑا درجہ تھا، جب ۴ شعبان ۶۹۵ھ کو جمعرات کے دن ان کا انتقال ہوا اور اُن کی جگہ خالی ہوئی تو اس کے لیے امام ابن تیمیہ ہی کا تقرر عمل میں آیا، چنانچہ انہوں نے ۱۷ شعبان کو چہارشنبہ کے دن ان کی جگہ پر بیٹھ کر درس دیا اور اس کے بعد ایک مدت تک وہ مدرسۂ ابی عمر میں طلبہ کو تعلیم دیتے رہے، لیکن اپنے ان روزانہ فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ انہوں نے وقت کی سیاست میں بھی زبردست حصہ لیا اور تاتاریوں اور شیعوں کے خلاف کامیابی کے ساتھ جنگ کی، جس کی تفصیل ''تاتاریوں اور شیعوں کے خلاف جہاد'' کے عنوان کے تحت پیش کی جاتی ہے۔

---

[1] البدایة و النهایة: ۱۳/ ۳٤۰۔ نوٹ: اس نصرانی کے نام کے متعلق تذکروں میں اختلاف پایا جاتا ہے، بعض اس کا نام عساف بتاتے ہیں، ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایۃ والنہایۃ میں ۶۹۳ھ کے حالات میں اس نصرانی کا نام عساف ہی لکھا ہے، مگر ۶۹۴ھ کے حالات میں صاف طور پر عساف ابن احمد ابن حجی لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عساف حقیقت میں امیر عرب کا نام تھا، جس کے پاس وہ نصرانی ملازم تھا، اور جس کو اس نے اپنے ہاں پناہ دی تھی، ابن کثیر کی مذکورۂ بالا کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نصرانی سویدا کا رہنے والا تھا جو دمشق کے نزدیک ایک گاؤں تھا۔

تاتاریوں اور شیعوں کے خلاف جہاد

ساتویں صدی ہجری کا زمانہ وسطی ایشیاء کی اسلامی سلطنتوں کے لیے بہت ہی ہولناک زمانہ تھا، اسی زمانے میں قراقرم کی پہاڑیوں سے تاتاریوں کا ایک زبردست طوفان اٹھا جس کی وجہ سے اسلامی سلطنتوں کی بنیادیں ہل گئیں، بے شمار مسلمان تہ تیغ ہو گئے اور بہت سے آباد شہر ویران ہو گئے۔

ان تاتاریوں کو سب سے پہلے چنگیز خاں نے ایک مرکز پر جمع کیا، اس نے ۵۹۹ھ سے لے کر ۶۲۴ھ تک بڑے کروفر اور شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی، اس نے خوارزم شاہی جیسی عظیم الشان سلطنت کے پرخچے اڑا دیئے، اور تمام لوگوں کے دلوں پر اپنی دھاک بٹھادی۔

چنگیز خان کے بعد اس کا لڑکا اوکتائی خاں (۶۲۴ھ تا ۶۴۳ھ) اور پوتا کیوک خان بن اوکتائی خان (۶۴۳ھ تا ۶۴۷ھ) تخت نشین ہوا، کیونکہ خاں کے مرنے کے بعد تاتاری امیروں نے منگو خاں بن تولی بن چنگیز خان کے ہاتھ پر بیعت کر لی جس نے اپنے بھائی ہولاکو بن تولی کو ایران کا مستقل حاکم بنادیا تھا، اس زمانے میں بغداد پر عباسی فرمانروا مستعصم باللہ کی حکومت تھی، بغداد میں سنی شیعہ کشمکش بڑے زوروں پر تھی، ان دونوں فرقوں کے درمیان آئے دن جھگڑے اور فسادات ہوتے رہتے تھے، جب ۶۵۵ھ میں مستعصم باللہ نے سنیوں کی حمایت میں بغداد کے محلۂ کرخ کو، جہاں زیادہ تر شیعہ آباد تھے لٹوادیا تو اس کے شیعہ وزیر موید الدین ابو طالب محمد بن احمد بن علی بن محمد العلقمی نے ہولاکو کو بغداد آنے کی دعوت دی، اور اس طرح محرم ۶۵۶ھ میں بغداد کی پانچ سو سالہ شاندار سنی عباسی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔

عینِ جالوت میں تاتاریوں کی شکست

ہولاکو نے بغداد پر اپنا نائب مقرر کیا اور اس کے بعد ملک شام اور ملک مصر کے لینے کی تیاریاں شروع کر دیں، اس زمانے میں دمشق اور حلب پر ایوبی خاندان کے فرماں روا الملک الناصر بن العزیز اور مصر پر الملک المظفر سلطان سیف الدین قطز کی حکومت تھی، جب ان دونوں نے ہولاکو کی اطاعت قبول نہیں کی تو اس نے تاتاری سپہ سالار کتبغا نوین کی سرکردگی میں ایک زبردست فوج روانہ کی، جس نے صفر ۶۵۸ھ کے آخر میں بہت ہی آسانی کے ساتھ دمشق پر قبضہ کر لیا اور اس کو خوب لوٹا، تاتاری فوجیں لوٹ مار کرتی اور بے شمار مسلمانوں کو تہ تیغ کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئیں اور ملک شام کی جنوبی سرحد تک پہنچ گئیں۔

اس لوٹ مار میں اطراف واکناف کے شیعہ اور عیسائی بھی تاتاریوں کے ساتھ شریک ہو گئے، پے در پے مسلمانوں کی شکست وریخت کی اندوہناک خبریں پہنچنے کے باوجود سلطان مصر سیف الدین قطز نے ہمت نہیں ہاری، وہ ایک زبردست لشکر لے کر مصر سے روانہ ہوا، اور ملک شام کی جنوبی سرحد کے مقام ''عین جالوت'' پر تاتاریوں سے ملاقات کی۔ ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۸ھ کو بڑا زبردست معرکہ ہوا، سلطان سیف الدین قطز کے دوش بدوش امیر رکن الدین بیبرس بندقداری اور دوسرے امیروں نے بڑی جانبازی دکھائی، امیر جمال الدین آقوش الشمسی نے آگے بڑھ کر تاتاریوں کے سپہ سالار کتبغا نوین ہی کو قتل کر ڈالا، جس کی وجہ سے تاتاریوں کے پیر میدان جنگ سے اکھڑ گئے اور انہوں نے بہت بری طرح شکست کھائی۔ مصری فوج نے بہت دور تک ان کا پیچھا کیا اور ان کو قتل کیا، جب یہ خبر ملک شام کے مختلف شہروں میں پھیلی تو ہر جگہ مسلمانوں نے تاتاریوں کے لشکر گاہوں پر حملہ کیا اور انہیں تہ تیغ کیا۔ اور کئی جگہوں پر ان شیعوں اور نصرانیوں سے بھی دل کھول کر انتقام لیا، جنہوں نے برے وقتوں میں ان تاتاریوں کی مدد کی تھی۔

علوی خلافت قائم کرنے کی کوشش

شیعہ بغداد کی سنی خلافت کے خاتمے سے بے حد خوش تھے، اب انہوں نے اس خیال سے کہ ملک شام و ملک مصر کی سنی سلطنتوں کا خاتمہ کر کے علوی خلافت کو قائم کیا جائے،

تاتاریوں کی تائید شروع کر دی، وہ اعلانیہ تاتاری حکومت کی فضیلت کے گیت گانے لگے، اور ان کو انصاف پسند، عادل اور مسلمانوں کے لیے ایک رحمتِ الٰہی ثابت کرنے لگے، ہولاکو نے خواجہ نصیر الدین طوسی کو اپنا وزیر مقرر کر لیا تھا، جس کی وجہ سے بہت سے شیعہ عالموں اور امیروں کو تاتاری دربار میں رسائی حاصل ہو گئی، انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تاتاریوں کو ملکِ شام و ملکِ مصر کی سنی سلطنتوں کے خلاف اکسانا شروع کر دیا۔

سلطان بیبرس کی تخت نشینی

تاتاری پایۂ تخت تبریز، مراغہ اور اس کے اطراف میں مصر و شام کے لینے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ادھر مصر میں اچانک انقلاب ہو گیا سلطان سیف الدین قطز اپنی فتح مندی کے شادیانے بجانے کے لیے ابھی قاہرہ بھی نہیں پہنچا تھا کہ راستے ہی میں ذوالقعدہ ۶۵۸ھ میں اسے قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ امیر رکن بیبرس بندقداری کو الملک الظاہر کا لقب دے کر مصر کا سلطان بنا دیا گیا، بیبرس نے فوراً دمشق، بعلبک، حماۃ، حمص، حلب، سلمیہ، کرک وغیرہ پر اپنے نائب مقرر کیے، اور ان کے ذریعے ہر جگہ تاتاریوں کے مقابلے کا معقول انتظام کیا، اس کے دور حکومت میں تاتاری اپنی ان تھک کوششوں کے باوجود ملکِ شام کے کسی حصے پر بھی قابض نہیں ہو سکے۔

مستعصم باللہ کے قتل ہو جانے کے بعد کوئی خلیفہ باقی نہ رہا تھا، تین سال بعد جب خلفائے عباسیہ بغداد کی اولاد میں سے ایک شخص ابو القاسم احمد بن امیر المؤمنین الظاہر باللہ مصر آیا تو بیبرس نے ۸ رجب ۶۵۹ھ کو قاہرہ میں اس کا شاندار استقبال کیا اور پھر ۱۳ رجب کو المستنصر باللہ کے لقب سے اس کو خلیفہ بنا دیا، مگر اصل حکومت بیبرس ہی کے ہاتھ رہی، اور جب محرم ۶۶۰ھ میں مستنصر باللہ بھی مارا گیا، تو اس نے ربیع الآخر ۶۶۰ھ میں ابو العباس احمد بن ابی علی کو حاکم بامر اللہ کا لقب دے کر خلیفہ بنا دیا، جس نے ۷۰۱ھ تک یعنی چالیس سال خلافت کی۔

سلطان بیبرس کے جانشین

سلطان بیبرس نے ۶۷۶ھ میں وفات پائی اس کے بعد اس کے دولڑکے الملک السعید

برکہ خاں اور الملک العادل سلامش یکے بعد دیگرے مصر کے سلطان بنے، مگر چونکہ ان میں حکومت کرنے کی اہلیت نہیں تھی، اس لیے مصری امیروں نے امیر سیف الدین قلاوٗن کو الملک المنصور کا لقب دے کر اپنا سلطان بنالیا تھا، اس نے ۶۷۸ھ سے لے کر ۶۸۹ھ تک گیارہ سال بڑی شاندار حکومت کی، اس کے زمانۂ حکومت میں بھی تاتاریوں کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔

اس اثناء میں ہولاکو ۶۶۴ھ میں مرچکا تھا، اس کی جگہ اس کا لڑکا اباقا تخت نشین ہوا، اس کی وفات پر اس کا بھائی تکودر جو احمد کے نام سے مسلمان ہو گیا تھا ۶۸۱ھ میں تخت پر بیٹھا، اس نے مصر و شام کی حکومتوں کے ساتھ صلح جوئی شروع کردی، مگر تاتاریوں نے دو سال بعد اس کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ اباقا کے لڑکے ارغون کو تخت پر بٹھایا، جس نے ۶۸۳ھ سے لے کر ۶۹۰ھ تک حکومت کی، اس کے بعد اس کے بھائی کیخا توخاں بن اباقا نے تین سال ۶۹۰ھ تا ۶۹۳ھ حکومت کی، اس کی جگہ پر بایدو خان بن طرغائی بن ہولاکو بادشاہ بنا مگر دو سال بعد وہ مارا گیا، ارغون کے لڑکے قازان نے ۶۹۵ھ میں تاتاری سلطنت پر قبضہ کر لیا، امیر نوروز [1] کی کوششوں سے قازان مسلمان ہو گیا تھا، اور اپنا نام محمود رکھ لیا تھا، اس کے ساتھ تقریباً ایک لاکھ تاتاری بھی مسلمان ہو گئے تھے، قازان نے بڑی شان سے سلطنت شروع کی۔

ادھر مصر میں ۶۸۹ھ میں الملک المنصور سلطان سیف الدین قلاوٗن کا انتقال ہو چکا تھا، اس کے بعد اس کا لڑکا الملک الاشرف صلاح الدین خلیل سلطان بنا جس نے صرف چار سال سلطنت کی، اس کے بعد اس کا بھائی الملک الناصر محمد بن قلاوٗن تخت پر بیٹھا جس کی عمر اس وقت صرف بارہ سال کی تھی، اس لیے مصری امیروں نے ایک سال بعد ہی اس کو معزول کر دیا

---

[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نوروز قازان کے مشہور امیروں میں سے تھا، وہ عبادت گزار، سچا اور دیانت دار تھا، ہمیشہ ذکر و اذکار میں مشغول رہتا تھا، بے شمار لوگ اس کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اور اپنے ہاتھوں میں تسبیح لے لی اور جمعہ اور دوسری نمازوں میں شریک ہونے لگے، بہتوں نے قرآن بھی پڑھ لیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ تاتاریوں نے امیر نوروز کے خلاف قازان کے کان بھر دیئے تھے جس نے اس کو ۶۹۶ھ میں قتل کر ڈالا۔ (البداية والنهاية: ۱۳/ ۲۵۳)

اور اس کی جگہ الملک العادل امیر زین الدین کتبغا کو اپنا سلطان بنالیا، اس نے صرف دو سال سلطنت کی، امیروں نے اس کو بھی معزول کر کے اس کی جگہ الملک المنصور حسام الدین لاچین کو سلطان بنادیا، جس نے ۶۹۶ھ سے لے کر ۶۹۸ھ تک دو سال سلطنت کی۔

مصری حکومت کی اس پے در پے تبدیلی کی بنا پر قازان کی ہمت بہت بڑھ گئی تھی، اس نے ملک شام و ملک مصر پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں، اس وقت ملک شام پر امیر سیف الدین قبچاق منصوری کی حکومت تھی، وہ مصری سلطان کے نائب کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ قبچاق نے بھی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں دمشق میں خطابت میں امام ابن تیمیہ کا کوئی نظیر نہ تھا، ۱۷ شوال ۶۹۷ھ کو جمعہ کے دن ایک زبردست مجلس منعقد ہوئی، جس میں امام ابن تیمیہ نے جہاد پر ایک زوردار تقریر کی، اور مسلمانوں کو تاتاریوں اور ان کے ہمنوا شیعوں اور عیسائیوں کے مقابلے پر خوب ورغلایا، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ یہ مجلس بہت ہی شاندار تھی اور اس میں ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ [1]

امیروں کا اختلاف

الملک المنصور حسام الدین لاچین نے مصر میں امیر سیف الدین منکوتمر کو اپنا نائب مقرر کیا تھا، سلطان کے نزدیک اس کو بہت زیادہ رسوخ حاصل تھا، اور وہ اس کی مرضی کے مطابق احکامات جاری کرتا تھا، اس کی وجہ سے سلطنت کے بڑے بڑے امیر ہمیشہ اپنی جان کا خطرہ محسوس کرتے رہتے تھے، نائب الشام سیف قبچاق منصوری، نائب الصفد امیر فارس الدین بکی الفی، بتکتیمور سلحدار ظاہری اور امیر بولائی کو ہمیشہ اس بات کا ڈر لگا ہوا تھا کہ نہ معلوم آیندہ کیا ہو۔

سیس کی مہم

اسی اثناء میں سیس کی مہم پیش آئی، ۶۹۷ھ کے اواخر میں سیس کی فتح کے لیے ایک زبردست لشکر بھیجا گیا، جہاں ایک عیسائی فرمانروا حکومت کر رہا تھا، جب وہ اسلامی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکا تو کچھ قلعے مسلمانوں کے حوالے کر کے ان سے صلح کر لی۔ [2] مگر سلطان

---

[1] البداية والنهاية: ۱۳/ ۳۵۲۔ [2] تاريخ ابى الفداء: ٤/ ٣٦۔

حسام الدین لاچین اس صلح سے متفق نہیں ہو سکا، اس نے نائب الشام سیف الدین قبچاق کو حکم بھیجا کہ وہ ایک زبردست فوج لے کر سیس کی طرف جائے اور اُسے فتح کر کے رہے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جب وہ حمص پہنچا تو اسے اطلاع ملی کہ نائب مصر سیف الدین منکوتمر نے اس کے اور دیگر چند امیروں کے خلاف سلطان مصر کو بدظن کر دیا ہے اور نائب حلب سیف الدین بلبان الطباخی کے نام ان سب امیروں کے قتل کا حکم صادر کر دیا ہے، سیف الدین قبچاق اور دوسرے امیروں نے آپس میں مشورہ کیا، وہ جانتے تھے کہ سیف الدین منکوتمر کے خلاف کوئی فریاد سنی نہیں جائے گی، اس لیے اُن لوگوں نے یہ طے کر لیا کہ وہاں سے فرار ہو کر تا تاری بادشاہ قازان سے مل جانا چاہیے۔ چنانچہ ربیع الآخر ۶۹۸ھ میں یہ سب امیر پانچ سو سواروں کے ساتھ وہاں سے فرار ہو گئے اور آذربائیجان میں ملک قازان کے ساتھ مل گئے۔ [1] قبچاق کا باپ، بھائی اور دوسرے رشتہ دار قازان کی فوج میں ملازم تھے، [2] اس لیے اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، حلب کے سپہ سالار امیر ایدغدی شقیر نے ان لوگوں کا راستہ روکنا چاہا، مگر قبچاق اور اس کے ساتھی دوسرے راستے سے نکل گئے، [3] قبچاق کے جانے سے دمشق والوں کو بہت افسوس ہوا، کیونکہ وہ اُسے بہت چاہتے تھے۔ [4]

ملک ناصر کی دوبارہ تخت نشینی

اسی دوران میں مصر کے اندر ایک انقلاب ہوا، سلطان حسام الدین لاچین اور اس کا نائب سیف الدین منکوتمر ۱۱ ربیع الآخر ۶۹۸ھ کو مارے گئے، اور ملک ناصر کو دوبارہ تخت پر بٹھایا گیا، ہر جگہ خوشی منائی گئی، نائب الشام سیف الدین قبچاق کے نام بھی ایک پروانہ بھیجا گیا، مگر اسکے پہنچنے سے پہلے ہی وہ راس العین کے مقام پر تا تاریوں سے مل چکا تھا، اگر راستہ میں اس کو اطلاع ہو جاتی تو شاید وہ اور اس کے ساتھی واپس ہو جاتے۔

قازان کی برافروختگی

اسی زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا، جس نے قازان کو بے حد برافروختہ کر دیا، نائب

---

[1] روضۃ الصفا:۵/ ۱۳۵۔ [2] الدرر الکامنۃ:۳/ ۲۴۱۔

[3] تاریخ ابی الفداء:۴/ ۳۸۔ [4] البدایۃ والنہایۃ ۱۴/ ۲، ۳۔

حلب سیف الدین بلبان الطباخی نے ۶۹۸ھ کے اواخر میں ماردین کی فتح کے لیے جہاں سلطان نجم الدین غازی بن قرا رسلان (المتوفی: ۷۱۲ھ) حکومت کر رہا تھا، چار ہزار کا ایک دستہ روانہ کیا سلطان نجم الدین ترکی النسل اور قازان کا باجگزار تھا۔ [1] اسے اس حملے کی پہلے سے اطلاع نہیں تھی جب وہ لشکر ماردین کے قریب پہنچا تو چند دلیر سپاہی تاتاریوں کا لباس پہن کر ماردین کے پھاٹک پر پہنچے اور پہرہ داروں سے کہا کہ ہم قازان کے پاس سے آئے ہیں، اور سلطان نجم الدین کے پاس پیغام لے آئے ہیں، پہرہ داروں نے ان کی بات کو صحیح سمجھ کر پھاٹک کھول دیا، یہ سپاہی اندر گھس گئے اور پہرہ داروں کو قتل کر دیا، ان کے پیچھے ساری فوج اندر گھس گئی اور خوب لوٹ مار کر کے واپس ہوئی، سلطان نجم الدین قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہا۔ [2]

جب تبریز میں قازان کو اس کی اطلاع پہنچی تو وہ غصہ سے بے تاب ہو گیا، اس نے اپنے دربار کے امراء و علما و قضاۃ سے رائے لی، سب نے یہی کہا کہ مصری اور شامی فوج کو ضرور اس کی سزا ملنی چاہیے سیف الدین قبچاق، قتلغشاہ اور بولائی وغیرہ نے بھی اس کی تائید کی۔

قازان نے ہر جگہ ہرکارے دوڑائے کہ جہاں سے جتنے بھی سپاہی مل سکیں آذربائجان بھیج دیئے جائیں، اس نے یہ بھی حکم دیا کہ ہر ایک سپاہی چھ مہینے کے خورد و نوش کا سامان لے لے اور گھوڑوں کا چارہ اونٹوں پر لادلیا جائے، چنانچہ وہ اس وسیع ساز و سامان کے ساتھ ۲۶ صفر ۶۹۹ھ کو آذربائجان سے روانہ ہوا، راستے میں بہت سے نصرانی اور رومی امیر بھی اپنے اپنے دستوں کے ساتھ اس سے آ ملے، دریائے فرات کو پار کرنے کے بعد اس نے سپاہیوں کو حکم دیا، نوے ہزار سپاہی نکل آئے، اس نے قتلغشاہ او بولائی کو بہت بڑی فوج دے کر آگے روانہ کیا، اور خود ایک دوسری راہ سے حلب کے قریب پہنچا اور ایک سرسبز و شاداب جگہ پر قیام کیا۔ [3]

دمشق میں خوف و ہراس

سیف الدین قبچاق کی جگہ پر کچھ دنوں تک امیر سیف الدین جاغان دمشق میں نائب

---

[1] الدرر الکامنة:۳/ ۲۱٦، شذرات الذهب:٥/ ٣١، مرأة الجنان:٤/ ٢٥٢، ابو الفدا:٤/ ٦٧۔ [2] روضة الصفا: ٥/ ١٣٥۔ [3] روضة الصفا:٥/ ١٣٦۔

الشام کی حیثیت سے کام کرتا رہا، اس کے زمانے میں عقائد کا فتنہ اٹھا، جس کی تفصیل ہم فتنۂ عقائد کے عنوان کے تحت بیان کریں گے، ملک ناصر نے امیر جمال الدین آقوش الافرم کو نائب الشام بنا کر دمشق روانہ کیا، جس نے ۲۲ جمادی الاولیٰ ۶۹۸ھ کو اپنے عہد کا چارج لیا، چند مہینوں بعد ملک ناصر ایک زبردست فوج لے کر ۸ ربیع الاول ۶۹۹ھ کو دمشق داخل ہوا، وزیر دولت شمس الدین الاعسر نے فوجی تیاری کے لیے عام لوگوں یہاں تک کہ یتیموں اور یسیروں سے بھی قرض لینا شروع کیا۔ ❶ ان تیاریوں کے باوجود لوگ نہایت خوف زدہ تھے، اورادھر اُدھر سے بھاگ کر دمشق میں پناہ گزین ہورہے تھے، ہر وقت قسم قسم کی افواہیں اڑتی جارہی تھیں، اور تمام لوگ بھاگ کر دمشق میں پناہ گزیں ہورہے تھے، ہر وقت قسم قسم کی افواہیں اڑتی جارہی تھیں، اور تمام لوگوں پر خوف وہراس چھا گیا تھا۔

امام ابن تیمیہ کی پیشین گوئی

امام ابن تیمیہ کے آئینۂ دل پر آیندہ ہونے والی خوفناک جنگ کے نتائج سورج کی طرح عیاں ہورہے تھے، انہوں نے پہلے ہی سے اپنے خاص احباب کو بتادیا تھا کہ مسلمان اس مرتبہ بہت بری طرح مارے جائیں گے اور تاتاریوں کے مقابلے میں انہیں بری طرح شکست ہوگی۔ ❷

مصری فوج کا مقابلے کے لیے نکلنا

ملک ناصر ایک زبردست لشکر لے کر ۱۷ ربیع الاول ۶۹۹ھ کو اتوار کے دن دمشق سے نکلا، اس کے ساتھ رضا کار سپاہیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی، خلیفہ حاکم بامر اللہ اور قاضی القضاۃ تقی الدین ابن دقیق العید بھی ساتھ تھے، دمشق کے لوگ اس قدر خوف زدہ تھے کہ تمام لوگ مسجدوں میں بیٹھ کر خدا سے دعائیں کرنے لگے اور گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے اور فتح ونصرت کی دُعائیں مانگنے لگے۔ ❸ مصری فوج نے حمص کے قریب نصر کے ٹیلے کے پاس پڑاؤ کیا، قازان کی رائے یہ تھی کہ حلب کا محاصرہ کر کے اس کو فتح کر لینا

---

❶ البداية والنهاية: ١٤/٦۔ ❷ مدارج السالكين لا بن قيم: ٢/ ٢٥٠۔

❸ البداية والنهاية: ١٤/ ٦۔

چاہیے، مگر بعض امیروں نے یہ رائے دی کہ آگے بڑھ کر مصری فوج سے نپٹ لینا چاہیے اگر ہمیں فتح ہوگی تو سارے قلعے آسانی سے ہمارے قبضے میں آجائیں گے، جب قازان حماۃ کے قریب پہنچا، تو قتلغشاہ نے کہا کہ مصریوں اور شامیوں نے نصر کے ٹیلے سے جہاں تاتاریوں کو دو مرتبہ شکست ہو چکی ہے جو امیدیں لگائیں ہیں ان کو پورا نہیں ہونے دینا چاہیے، لڑائی کسی اور مقام پر ہونی چاہیے، قازان نے حکم دیا کہ حماۃ کے شہر سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، ہر جگہ پہرے بٹھا دیئے جائیں تا کہ حماۃ کے لوگ دمشق کی طرف فرار نہ ہو سکیں، اس کے بعد قازان نے اپنے درباری عالموں، قاضیوں، امیروں اور سپاہیوں کے ساتھ نماز ادا کی، نماز کے بعد امام اور مقتدیوں نے فتح و نصرت کے لیے دُعا کی، اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ نوے ہزار آدمیوں کا بیک وقت ہاتھ اٹھائے دعا کرنا کیا عجیب کیفیت پیدا نہ کر رہا ہوگا۔

مقابلہ اور مصریوں اور شامیوں کی شکست

قازان نے سب کو مجمع المروج کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا، سَلَمِیَّہ اور حمص کے درمیان وادیٔ خزندار نامی ایک کشادہ وادی تھی، ۲۷ ربیع الاول ۶۹۹ھ کی صبح کو تاتاری لشکر اس وادی میں داخل ہوا، قازان کا فرمان تھا کہ آج بدھ کا منحوس دن ہے اس لیے لڑائی بند رکھی جائے، مگر چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ ملک ناصر کی فوج نمودار ہوئی، اور عصر کے قریب تاتاریوں پر اس طرح ٹوٹ پڑی کہ تاتاریوں کے پیر اکھڑنے لگے اور وہ میدانِ جنگ سے فرار ہونے کی فکر کرنے لگے، قازان نے فوراً سیف الدین قبچاق کو بلایا اور کہا کہو اب کیا کہتے ہو؟ قبچاق نے قازان کے تیور پہچان لیے اور دل میں بہت خوفزدہ ہوا، مگر ظاہری اطمینان کے ساتھ کہا کہ یہ مصریوں کا خاصہ ہے کہ وہ پہلا حملہ بڑے زور و شور سے کرتے ہیں، اس کے بعد ان کا جوش ٹھنڈا ہونے لگتا ہے، اگر ان کے پہلے حملے کو ثابت قدمی کے ساتھ سنبھال لیا جائے تو پھر فتح ہماری ہے، قازان نے اپنے امیروں کو حکم دیا کہ ہر ایک اپنے اپنے دستے کو خوب ابھارے جب گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی تو مصریوں اور شامیوں کے پیر اکھڑ گئے اور میدانِ جنگ بہت جلد اُن سے خالی ہو گیا۔

قازان نے بھاگنے والوں کا پیچھا کرنا چاہا، مگر قبچاق نے کہا، مصری دھوکہ دینے کی غرض

سے بھاگتے ہیں، اور جب دشمن کی صفیں ٹوٹ جاتی ہیں تو فوراً پلٹ کر حملہ کر دیتے ہیں، چونکہ پہلی بات سچ ہوئی تھی اس لیے اس نے قبچاق کی رائے کو مان لیا اور حکم دے دیا کہ کوئی مصریوں اور شامیوں کا پیچھا نہ کرے اسی لیے وہ اکثر کہا کرتے تھا:

لَوْ لَا اَنَا مَا قُتِلَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اَحَدٌ وَلَوْ لَا اَنَا مَا نَجامِنْھُمْ اَحَدٌ [1]

اگر میں نہ ہوتا تو مسلمانوں میں سے کوئی بھی قتل نہ ہوتا اور اگر میں نہ ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا تھا۔

جب لوگ اس کی تشریح چاہتے تو وہ جنگ کی اس کیفیت کو بیان کرتا تھا، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

قیدیوں کی لوٹ مار

اِدھر لڑائی کا یہ حال تھا اور اُدھر دمشق میں باب الصغیر کے قید خانے کے دوسو قیدی ۲ ربیع الآخر ۶۹۹ھ کو اتوار کے دن قید خانے کے دروازے توڑ کر باہر نکل آئے اور سارے شہر میں لوٹ مار شروع کر دی اور شہریوں کا بہت نقصان کیا، شہر میں فوج اور پولیس نہیں تھی، جو ان کی لوٹ مار کا کچھ انسداد کرتی۔ [2]

مصری فوج اور علمائے دمشق کا فرار ہو جانا

ملک ناصر اپنی شکست خوردہ فوج کو لے کر حمص سے گزرا، وہاں سے لوگوں نے اس سے بچاؤ کی صورت پوچھی، اس نے صاف جواب دے دیا کہ ہم اس وقت تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے، تم خود اپنے بچاؤ کی فکر کرو، یہ کہہ کر وہ قاہرہ کی طرف فرار ہو گیا، اور جب دمشق والوں کو یہ معلوم ہوا تو شہر کے بڑے بڑے لوگ، جن میں علما و فقہا اور تجار بھی تھے، دمشق چھوڑ کر مصر فرار ہو گئے، ان میں قاضی القضاۃ امام الدین شافعی، قاضی نور الدین زوادی مالکی، تاج الدین شیرازی، والی بر علم الدین صوابی، والی شہر جمال الدین ابن النحاس، اور شہر کا کوتوال اور محتسب بھی شامل تھے، نائب قلعہ علم الدین ارجواش کے سوا شہر میں کوئی حاکم

---

[1] الدرر الکامنۃ: ۳/ ۲۴۲۔ [2] البدایۃ والنھایۃ: ۱۴/ ۷۔

باقی نہ رہا۔ [1]

قازان کے پاس وفد لے جانا

یہ دیکھ کر امام ابن تیمیہ نے قاضی بدرالدین بن جماعہ شافعی، شیخ زین الدین الفارقی، شیخ نجم الدین ابن صصری، شیخ عزالدین ابن ترکی، شیخ عزالدین ابن القلانسی، قاضی جلال الدین قزوینی اور ابوبکر بن قوام وغیرہ کو ساتھ لے کر بعلبک کے قریب ۳ ربیع الآخر ۶۹۹ھ کو پیر کے دن قازان سے ملاقات کی، اور بڑی بے باکی اور دلیری کے ساتھ اس سے گفتگو کی، قازان خود بہت متعجب ہوا اور اپنے امیروں سے کہا میں نے ایسا نڈر آدمی نہیں دیکھا۔ [2] امام نے اس کے سامنے عدل وانصاف کی خوبیاں بیان کی، تاتاریوں کے مظالم بیان کیے، پھر آرمینہ کے کردوں اور عیسائیوں کو لوٹ مار کرنے کی اجازت دینے پر بڑی ملامت کی، گفتگو کے جوش میں وہ بار بار کھسک کر قازان سے قریب ہو جاتے تھے اور اُن کے گھٹنے اس کے گھٹنوں سے مل جاتے تھے، امام نے کہا: تم سمجھتے ہو کہ تم مسلمان ہو اور تمہارے ساتھ قاضی، امام، مؤذن اور مشائخ بھی ہیں، تم نے ہم مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کی اور ہمارے ساتھ بدترین سلوک کیا، تمہارے باپ، دادا کافر تھے مگر انہوں نے ہمارے ساتھ ویسا سلوک نہیں کیا، جس طرح تم مسلمان ہو کر ہمارے ساتھ کر رہے ہو، تمہارے باپ دادا نے جب بھی ہم سے کوئی معاہدہ کیا اس کو باقی رکھا اور اسکی خلاف ورزی نہیں کی، لیکن تم معاہدہ کر کے اس کو توڑ دیتے ہو، تم نے اپنی کوئی بات پوری نہیں کی۔

امام کی ان تیز وتند باتوں سے سارا وفد ہراساں ہو گیا، سب کو یقین ہو چلا تھا، کہ اب وہ زندہ واپس نہیں ہو سکتے، ان کی نظریں ہر وقت جلادوں کی تلواروں کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ اب حکم ہوا اور سب کے سب قتل کر دیئے گئے۔

دستر خوان پر کھانا کھانے سے انکار

قازان کے حکم سے وفد کے لیے دستر خوان چنا گیا، امام ابن تیمیہ کے سوا سب نے کھانا کھایا، اور جب ان سے وجہ دریافت کی گئی، تو انہوں نے صاف جواب دیا میں یہ کھانا کیسے

---

[1] ایضًا۔ [2] البداية والنهاية: ١٤/ ٧۔

کھاسکتا ہوں، جب کہ اس کو لوٹ کے مال سے تیار کیا گیا ہے۔ [1]

دُعا کی درخواست

واپس ہوتے وقت قازان نے دُعا کی درخواست کی، امام نے یہ دُعا کی، یا اللہ! اگر تو یہ جانتا ہے کہ قازان تیرا کلمہ بلند کرنے کے لیے لڑ رہا ہے اور تیری راہ میں جہاد کرنے کے لیے نکلا ہے تو تو اُس کی مدد کر اور اگر یہ جانتا ہے کہ وہ مال و ولت کے حاصل کرنے کے لیے نکلا ہے تو اس کو اس کی پوری جزا عطا کر، قازان بھی اس وقت آمین کہتا جا رہا تھا۔

ابوالعباس کا بیان

قاضی القضاۃ ابوالعباس کہتے ہیں کہ ہم سب اس دعا پر کانپ رہے تھے، اور ہم کو یقین تھا کہ اب یہ قتل ہونے والے ہیں، ہم اپنے کپڑوں کو سمیٹ رہے تھے کہ اب یہ قتل ہوئے اور اُن کے خون سے ہمارے دامن آلودہ ہو گئے، جب ہم وہاں سے نکلے تو ہم لوگوں نے غصے میں آکر کہا کہ تم تو اپنے ساتھ ہم سب کو قتل کیے جا رہے تھے، جاؤ اپنا راستہ لو، ہم تمہارے ساتھ نہیں جائیں گے، اس پر امام ابن تیمیہ کو بھی غصہ آگیا، انہوں نے وفد کو چھوڑ کر اکیلے شہر کی راہ لی، ابھی کچھ دور بھی نہیں گئے تھے کہ تاتاریوں کا ایک دستہ ان کے پاس آیا اور ان سے برکت اور دُعا کی درخواست کی۔ [2]

حق گو اور دلیر آدمی کی پہچان

حق گو اور دلیر آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ جابر بادشاہوں کو بھی ٹوکنے سے نہیں ڈرتا، خود امام ابن تیمیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کے دل میں کھوٹ ہو وہی غیر اللہ سے ڈرتا ہے، پھر کہا کسی نے امام احمد بن حنبل کے سامنے کسی والی کی طرف سے اپنا خوف ظاہر کیا، امام موصوف نے فرمایا: اگر تمہارا دل درست ہوتا تو ہرگز اس والی سے نہ ڈرتے، تمہارا خوف تمہارے دل کے کھوٹ کو ظاہر کرتا ہے۔ [3]

قیدیوں کو رہا کرانے کی کوشش

اس وفد کے آنے سے پہلے ہی امیر سیف الدین قپچاق دمشق والوں کے لیے امن کا

---

[1] مجموعه الدرر، ص: ١٦٢۔ [2] ایضًا۔ [3] ایضًا۔

پروانہ حاصل کر چکا تھا، امام ابن تیمیہ نے قازان سے کہا کہ ان تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جائے جو قتلغشاہ اور بولائی کے ہاتھ میں اسیر ہیں، ابتداء میں قازان صرف مسلمان قیدیوں کے رہا کرنے پر آمادہ ہوا لیکن جب امام نے کہا کہ یہود و نصرانی بھی ہماری رعایا ہیں، اور ان کے جان و مال کی حفاظت ہم پر ضروری ہے تو اس نے ان کو بھی رہا کر دیا۔ [1]

امن کا اعلان

جمعہ (۷ ربیع الآخر: ۶۹۹ھ) کے خطبے میں خطیب نے سلطان کا نام نہیں لیا، جمعہ کی نماز کے بعد امیر اسماعیل اور دوسرے تاتاری نمائندے شہر میں داخل ہوئے، اور بوستانِ ظاہر میں قیام کیا، ۸ ربیع الآخر ۶۹۹ھ کو ہفتے کے دن جامع مسجد کے مقصورۂ خطابت میں امن کا پروانہ پڑھ کر سنایا گیا، اور سارے شہر میں گھوم پھر کر اس کا اعلان کیا گیا، دوسرے روز اتوار کو مدرسۃ القیمریہ دمشق میں دیوان استخلاص کی مجلس ہوئی، شہر کے بڑے بڑے لوگوں کو پکڑ امنگایا گیا، اور ان سب سے مطالبہ کیا گیا کہ حکومت کا جو مال و متاع اور جو گھوڑے اور ہتھیار ان کے ذمے ہیں ان سب کو لا کر حاضر کریں، اس سلسلے میں بہت سے لوگوں کو بڑی تکلیفیں دی گئیں، ۱۰ ربیع الآخر ۶۹۹ھ کو پیر کے دن امیر سیف الدین قبچاق منصوری اپنی فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، اس کی وجہ سے ہر جگہ گرانی بڑھ گئی، اور لوٹ مار شروع ہو گئی، اس نے علم الدین ارجواش منصوری کو کہلا بھیجا کہ دمشق کا قلعہ اس کے حوالے کر دے، مگر اس نے نہیں مانا، قبچاق نے اس کے پاس عمائدین شہر کا ایک وفد بھی روانہ کیا، اس پر بھی وہ نہیں مانا، امام ابن تیمیہ نے خفیہ یہ پیغام کہلا بھیجا، کہ اس قلعے کو جب تک کہ ایک پتھر بھی باقی رہ جائے تاتاریوں کے حوالے مت کرنا، اس میں ملک شام والوں کی بھلائی ہے، خدا نے یہ قلعہ مسلمانوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے، یہ وہ گھاٹی ہے جو مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ کا کام دیتی ہے یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کے وقت تک ایمان اور سنت کا گھر بنا رہے گا۔ [2]

قازان کے نام خطبہ

۱۴ ربیع الآخر ۶۹۹ھ کو جمعہ کے دن دمشق کی جامع مسجد میں قازان کے نام سے خطبہ

---

[1] الرسالة القبرصيه، ص: ۱۳، ۱۴۔ [2] البداية والنهاية: ۱۴/ ۸۔

پڑھا گیا اور نماز کے بعد مصلے پر بھی اس کے لیے دعا کی گئی، بہت سے تاتاری اس نماز میں شریک تھے۔ سیف الدین قبچاق کے نائب الشام ہونے کا فرمان بھی پڑھ کر سنایا گیا، شہر کے بڑے بڑے لوگوں نے اس کے پاس جا کر مبارکباد دی، اس نے اپنی مسرت ظاہر کی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ تاتاریوں کی موجودگی کی وجہ سے جو تکلیف ہے، اس کا اسے بھی پورا احساس ہے۔ [1]

نصرانیوں اور کردوں کی لوٹ مار

۱۵ ربیع الآخر ۶۹۹ھ کو ہفتے کے دن سیس کے نصرانی حکمران اور اس کے پیروؤں، کردوں اور تاتاریوں نے صالحیہ، مسجدِ اسدیہ، مسجد خاتون، دارالحدیث الاشرفیہ کو لوٹنا شروع کیا، جامع التوبہ میں آگ لگا دی، آرمینیہ کے کرد اور سیس کے نصرانی درحقیقت مسلمانوں سے بدلہ لینا چاہتے تھے، وہ رباط حنابلہ کی طرف گئے اور وہاں بہت سے گھروں کو لوٹا، اور بہت سی شریف زادیوں کی عزت وآبرو لی، بہت سے مردوں اور عورتوں کو قید کر لیا، تاتاریوں کے شیخ الشیوخ محمود بن علی شیبانی دمشق کے مدرستہ العادلیۃ الکبیرہ میں اترے ہوئے تھے، امام ابن تیمیہ نے ان کو ساتھ لے کر ان کردوں اور نصرانیوں کے مظالم کی روک تھام کی، اس کے باوجود بہت سے لوگ مارے گئے، قاضی القضاۃ تقی الدین کو بہت تکلیفیں دی گئیں، کہا جاتا ہے کہ صرف صالحیہ کے چار سو آدمی مارے گئے اور چار ہزار آدمی قید کر لیے گئے، رباطِ ناصری، مدرسۂ ضیائیہ اور خزانۃ ابن البزوری کی تمام کتابیں، جو وقف تھیں، لوٹ لی گئیں، صالحیہ کی طرح مزہ میں بھی اسی قسم کی لوٹ مار ہوئی، جب لوگ بھاگ کر داریا کی جامع مسجد میں پناہ گیر ہوئے تو زبردستی اس کے دروازے کھلوائے گئے، اور بہت سے مردوں، عورتوں اور بچوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ [2]

قازان سے ملنے کی ناکام کوشش

امام ابن تیمیہ چند ساتھیوں کے ساتھ ۲۰ ربیع الآخر ۶۹۹ھ کو جمعرات کے دن قازان سے ملنے گئے اور دو دن تک اس کا انتظار کیا، مگر وزیر سعد الدین محمد ساوجی اور خواجہ رشید

---

[1] البداية والنهاية:١٤/ ٨،٧۔ [2] البداية والنهاية: ١٤/ ٨۔

الدین نے اس سے ملنے نہیں دیا، یہ دونوں ہمیشہ یہی جواب دیتے ہیں کہ قازان بہت مصروف ہے، اس وقت اس سے ملاقات نہیں ہوسکتی، ان دونوں نے یہ بھی کہا کہ تاتاریوں کو جتنا ملنا چاہیے تھا وہ اب تک نہیں ملا ہے، اس کا کچھ انتظام ہونا چاہیے، جب امام ابن تیمیہ اپنے مقصد میں ناکام واپس آئے تو سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ تاتاری شہر کو لوٹنا چاہتے ہیں، یہ سن کر لوگوں پر بے انتہا خوف اور ہراس چھا گیا، لوگ بھاگنا چاہتے تھے مگر انہیں کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے بھی باہر نہیں نکل سکتے تھے، اکثر لوگ تو گھر بند کر کے بیٹھ رہے اگر کوئی باہر نکلتا بھی تو وہ تاتاریوں کے لباس میں باہر جاتا اور فوراً واپس ہوجاتا، جمعہ کے دن جامع مسجد میں ایک صف بھی پوری نہیں ہوتی تھی، تمام مسجدوں میں قازان ہی کا نام لیا جارہا تھا۔

انفرادی لوٹ مار

شہر میں انفرادی لوٹ مار کا سلسلہ برابر جاری تھا، اور لوگوں سے برابر وصول کیا جارہا تھا، شیخ علم الدین برزالی لکھتے ہیں کہ انہوں نے شیخ وجیہ الدین ابن المنجا کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ چھتیس لاکھ درہم قازان کے خزانہ میں پہنچائے گئے تھے، گھوڑے اور ہتھیار جو دیئے گئے وہ اس رقم کے علاوہ تھے، تاتاری امیروں نے اپنی اپنی جگہ بہت کچھ وصول کرلیا تھا، شیخ المشائخ محمود بن علی شیبانی کو چھ لاکھ درہم، خواجہ نصیر الدین طوسی کے لڑکے اصیل کو ایک لاکھ درہم اور صفی سخاوی کو اسی ہزار درہم دیا گیا تھا، [1] یہ تمام رقمیں امیر و غریب ہر ایک سے وصول کی گئی تھیں، پہلے درجے کے امیروں سے ستر ستر ہزار، دوسرے درجے کے امیروں سے تیس تیس ہزار اور باقی عام آدمیوں سے وصول کیا گیا تھا۔ [2]

قلعۂ دمشق کے لینے کی ناکام کوشش

تاتاریوں نے قلعۂ دمشق کو لینے کی پھر ایک مرتبہ کوشش کی، انہوں نے جامع مسجد کے صحن میں ایک بڑی منجنیق (گوپھن) نصب کی اور قلعۂ دمشق کی عمارتوں پر پتھر برسانا

---

[1] البدایة والنهایة: ١٤/ ٩۔ [2] تاریخ ابن خلدون: ٥/ ٤١٤؛ خطط الشام للمقریزی، جزء ثانی، ص: ١٤٠؛ دول الاسلام للذهبی: ٢/ ١٥٨۔

شروع کیا، اس کے باوجود علم الدین ارجواش منصوری کا ارادہ متزلزل نہیں ہوا، اس نے پہلے ہی قلعے کی فصیل کے اطراف کی تمام اونچی عمارتیں گرادی تھیں، تاکہ تاتاری ان پر چڑھ کر قلعہ کے اندر کی عمارتوں کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں اس نے قلعے کی حفاظت کا ہر ممکن بندوبست کیا، اس نے عام حکم دے رکھا تھا کہ قلعے کے اندر کا ہر ایک شخص راتوں میں فصیل کی دیوار کے نیچے آکر پڑا رہے، اور اپنے گھر میں نہ سوئے، امام ابن تیمیہ راتوں میں ہتھیار باندھ کر فصیل کے اطراف چکر لگایا کرتے تھے، اور قرآنِ مجید کی آیتوں کی تلاوت کر کے مجاہدین کی ہمتوں اور ان کے حوصلوں کو بڑھانے کی کوشش کرتے تھے اور نیز ان کو صبر کی تلقین کیا کرتے تھے۔ [1]

قازان کی واپسی

اسی اثناء میں تاتاری پائے تخت تبریز میں حالات بدلنے لگے، جس کی بنا پر قازان کو واپس ہونا پڑا، اس نے ۱۹ جمادی الاولیٰ ۶۹۹ ھ کو جمعہ کے دن اعلان کروایا کہ وہ اس سال اپنے پائے تخت کو واپس ہو رہا ہے، آیندہ سال نئے ساز و سان کے ساتھ واپس آئے گا اور مصر کو فتح کرے گا، اس وقت تک ملک شام کے تمام لوگ نائب شام امیر سیف الدین قبچاق منصوری کی فرماں برداری کریں۔

قبچاق قازان اور اس کے سپہ سالار قتلغشاہ کو رخصت کرنے تھوڑی دور اُن کے ساتھ گیا اور ۲۵ جمادی الاولیٰ ۶۹۹ ھ کو جمعرات کے دن ظہر کی نماز کے بعد دمشق واپس آیا، اس درمیان میں قلعے سے رات کے وقت ایک مختصر فوج باہر نکلی، اس نے جامع مسجد کی منجنیق کے کھمبے کتر دیئے اور شریف قمی شیخ شمس الدین محمد بن محمد بن احمد بن ابی القاسم المرتضیٰ العلوی اور ان کے ساتھیوں کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئے، کیونکہ یہ ہر موقع پر تاتاریوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔

امن کا اعلان

قبچاق نے ہر جگہ یہ اعلان کروایا کہ تمام تاتاری واپس ہو گئے ہیں اور اب پورا امن اور

---

[1] البداية والنهاية: ١٤ / ١۔

اطمینان ہو گیا ہے، لوگ آئیں اور اپنی دکانیں کھولیں اور اپنا کاروبار کریں، لیکن شہر والوں پر کچھ ایسا خوف چھایا ہوا تھا کہ کسی کو باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

قازان کے لیے بیعت

۸ رجب ۶۹۹ھ کو امیر سیف الدین قبچاق نے تمام قاضیوں، عالموں اور عمائدین شہر کو جمع کیا اور سب سے قازان کے لیے بیعت لی، اسی دن امام ابن تیمیہ تاتاری امیر بولائی کے پاس گئے اور دو دن رہ کر ان تمام مسلمانوں کو رہا کرایا جو اس کے ہاتھ میں اسیر تھے، جب شہر کے دوسرے لوگ اس کے پاس گئے تو اُن کے ساتھ بہت برا سلوک کیا اور اُن کے کپڑے اتروا لیے۔

قبچاق کا ملک ناصر سے مل جانا

۱۰ رجب ۶۹۹ھ کو جمعہ کے دن قبچاق نے مسلح فوج کے ساتھ نماز پڑھی، اس نے تمام لوگوں کو اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ اب پورا امن ہو چکا تھا، پھر بھی بعض لوگ اپنے باغوں اور کھیتوں میں کام کرنے کے لیے جاتے تھے، اور تاتاریوں کے ڈر سے سویرے گھر واپس لوٹ جاتے تھے۔ جب مصر سے یہ اطلاع آئی کہ ملک ناصر ایک زبردست فوج لے کر دمشق آ رہا ہے تو قبچاق چپکے سے وہاں سے نکل گیا، وہ درحقیقت پہلے ہی سے ملک ناصر سے خط و کتابت کر رہا تھا، اس نے غزہ اور عسقلان کے درمیان ملک ناصر سے ملاقات کی، اس کے ساتھ بکتیمور سلحدار ظاہری اور امیر فارس الدین بکی الفی بھی تھے، ملک ناصر نے ان سب کا احترام کیا اور ان کی خطائیں معاف کر دیں۔

جب دمشق کی تاتاری فوجوں کو یہ معلوم ہوا کہ قبچاق اور اس کے ساتھی ملک ناصر سے مل چکے ہیں تو وہ بھی وہاں سے فرار ہو گئیں، ۱۷ رجب ۶۹۹ھ کو جمعہ کے دن جو خطبہ دیا گیا، اس میں قازان کی بجائے ملک ناصر کا نام لیا گیا، جس سے دمشق والوں کو بڑی خوشی ہوئی، اسی دن امام ابن تیمیہ نے سارے شہر اور بازار کا چکر لگایا اور شراب کی دکانیں بند کروا دیں، تمام گھڑے اور مٹکے تڑوا دیے، اور لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اسلامی احکام کی پوری پابندی کریں، دوسرے دن یعنی ۱۸ رجب ۶۹۹ھ کو مصری لشکر باب الفرج اور باب النصر سے شہر

دمشق میں داخل ہوا، سارے شہر میں خوشیاں منائی گئیں، کچھ دن بعد امیر جمال الدین آقوش الافرم نائب الشام ہو کر اپنی فوج کے ساتھ ۱۰ شعبان ۶۹۹ھ کو دمشق داخل ہوا، اس کی وجہ سے ہر طرف خوشی اور مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ [1]

کسروان کے شیعوں کے خلاف جہاد

شوال ۶۹۹ھ کی ابتدا میں ان تمام مسلمانوں کو سزائیں دی گئیں جنھوں نے در پردہ یا اعلانیہ تاتاریوں کی تائید کی تھی اور شامی اور مصری مسلمانوں کو نقصان پہنچایا تھا، چونکہ اس جنگ سے بھاگے ہوئے مسلمان سپاہیوں اور مجاہدوں کو جرد و کسروان کی پہاڑیوں میں رہنے والے شیعوں نے بڑی بڑی تکلیفیں دی تھیں اور بہت سوں کو قتل کر کے ان کا مال واسباب اور ہتھیار اور گھوڑے چھین لیے تھے، اس لیے نائب الشام امیر جمال الدین آقوش الافرم ۲۰ شوال ۶۹۹ھ کو جمعہ کے دن ایک زبردست لشکر لے کر دمشق سے نکلا، اس کے ساتھ امام ابن تیمیہ اور دوسرے رضا کار سپاہی بھی تھے، جب یہ لشکر ان پہاڑیوں کے پاس پہنچا تو شیعوں کے سردار آئے، امام ابن تیمیہ نے ان سے گفتگو کی، اُن کی اعتقادی غلطیوں کو واضح کیا، ان میں سے بہت سے لوگ تائب ہو گئے اور وعدہ کیا کہ وہ شکست خوردہ سپاہیوں اور مجاہدین سے چھینا ہوا سارا مال واسباب واپس لوٹا دیں گے اور بہت سا مال بطور تاوان حکومت کو ادا کریں گے، ان کی بعض زمینوں کو بھی ضبط کر لیا گیا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس سے پہلے یہ لوگ نہ کسی حکومت کی فرماں برداری کرتے تھے اور نہ کسی ملت کے احکام کی پیروی کرتے تھے۔ [2]

یہ لشکر ۱۳ ذوالقعدہ ۶۹۹ھ کو اتوار کے دن دمشق واپس آیا شہر والوں نے بعلبک جا کر ان کا استقبال اور خیر مقدم کیا، شہر بھر میں خوشیاں منائی گئیں، ۱۶ ذوالقعدہ ۶۹۹ھ کو شہر بھر میں یہ اعلان کیا گیا کہ تمام لوگ اپنی دکانوں پر تلواریں لٹکا کر رکھیں، تمام مدرسوں میں تیراندازی اور تلوار چلانے کی مشق کرائیں اور تمام علما و فقہاء کو بھی دشمن کے مقابلے کے لیے تیار کرائیں۔

جہاد کی تلقین

صفر ۷۰۰ھ میں بار بار یہ افواہ اڑنے لگی کہ تاتاری اس مرتبہ بڑے زور وشور سے ملک

---

[1] البداية والنهاية: ١٤/ ١١۔ [2] البداية والنهاية: ١٤/ ١٢۔

شام پر حملہ کرنے والے ہیں، امام ابن تیمیہ نے ۲ صفر ۷۰۰ھ کو جمعہ کے دن جہاد کے متعلق جامع مسجد میں ایک زوردار تقریر کی، تمام لوگوں کو شہر چھوڑ کر بھاگنے سے منع کیا، ہر ایک کو ملک کی حفاظت کے لیے مال خرچ کرنے کی ترغیب دلائی اور بتایا کہ تاتاریوں کا مقابلہ کرنا ہر ایک پر فرض ہے، اس کے بعد بھی انہوں نے کئی مرتبہ تقریریں کیں اور ہر ایک کو جہاد کی تلقین کی، شہر بھر میں اعلان کیا کہ کوئی شخص بھی بغیر اجازت دمشق چھوڑ کر نہ جائے، اس کے باوجود اس اعلان سے پہلے ہی قاضی نجم الدین ابن صصری، ابن فضل اللہ، ابن منجا، ابن سوید، ابن الزملکانی اور ابن جماعہ کے خاندان مصر جا چکے تھے۔

ربیع الآخر ۷۰۰ھ کی ابتداء میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ تاتاری مقام بیرہ تک پہنچ چکے ہیں، امیر جمال الدین آقوش الافرم نائب الشام نے ان کے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں بہت سے رضا کار سپاہی بھی اس کی فوج میں شامل ہو گئے، جن کی کل تعداد پانچ ہزار کے قریب تھی۔

تاتاریوں پر بد دعا

پچھلے سال کی بے پناہ خونریزی کا خوف و ہراس اتنا چھایا ہوا تھا کہ اس افواہ کے سنتے ہی خطیب ابن جماعہ نے ہر نماز میں قنوت پڑھنا شروع کیا، جس میں تاتاریوں پر بد دعا کی جانے لگی۔

حماۃ اور مرج صفر میں اسلامی فوجوں کا اجتماع

جب تاتاری لشکر حلب کے قریب پہنچا تو یہاں کے لوگ شہر چھوڑ کر جنوب کی طرف فرار ہو گئے، اور خود حلب کا والی قراسنقر منصوری اپنی فوج کو لے کر حماۃ چلا آیا، یہاں کے والی زین الدین کتبغا نے ۲۲ ربیع الآخر ۷۰۰ھ کو شہر کے باہر میدان میں اپنی فوج کو آراستہ کیا، حلب کی فوج بھی اس سے آملی، قراسنقر منصوری اور زین الدین کتبغا نے دمشق اور مصر کی طرف مزید کمک اور مدد کے لیے ہرکارے دوڑائے، نائب الشام امیر افرم دمشق سے باہر مرج صفر میں اپنی فوج لیے پڑا تھا، دمشق کے بہت سے لوگ رضا کارانہ طور پر اس کی فوج میں شریک تھے۔

جہاد کی ترغیب

امام ابن تیمیہ پہلی جمادی الاولیٰ ۷۰۰ھ کو مرج صفر تشریف لے گئے اور وہاں امیروں اور سپاہیوں کے سامنے جہاد کی آیتیں تلاوت کیں اور حدیثیں سنائی اور اپنی جادو بیانی سے ان سب کو دشمن کے مقابلے پر ابھارا اور ان کے اندر جوش اور ہمت پیدا کرنے کی کوشش کی، اس مرتبہ فتح ونصرت پر ذیل کی آیت سے لطیف استدلال کیا:

﴿ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۶۰ ﴾ [1]

''یہ ہو چکا، اور جو شخص اسی قدر تکلیف پہنچائے جس قدر کہ اس کو پہنچائی گئی ہے، پھر اس پر زیادتی کی جائے تو بیشک اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا، بے شک اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔''

مصر جا کر ملک ناصر کو جنگ پر آمادہ کرنا

امام ابن تیمیہ نے یہ رات لشکر گاہ میں گزاری دوسرے دن ہفتے کو امیر افرم اور دوسرے سپہ سالاروں نے یہ رائے دی کہ وہ ڈاک میں بیٹھ کر مصر جائیں اور ملک ناصر کو جنگ پر آمادہ کریں، چنانچہ امام موصوف دمشق واپس آئے اور ۴ جمادی الاولیٰ ۷۰۰ھ کو پیر کے دن ڈاک میں بیٹھ کر مصر روانہ ہوئے، ملک ناصر اپنی فوج کے ساتھ نہر عوجا پہنچا جو رملہ کے شمال میں بارہ میل کے فاصلہ پر واقعہ ہے، بارش کی کثرت سے تمام راستے خراب ہو گئے تھے، ہر جگہ کیچڑ اتنا تھا کہ گھوڑوں کے پیر اور گاڑیوں کے پہیے اندر دھنسے جا رہے تھے، سامانِ جنگ اور رسد کا ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جانا بہت ہی دشوار تھا، مصری فوج آگے بڑھ نہیں سکتی تھی، اسی ایک چیز کو بہانہ بنا کر ملک ناصر واپس ہو گیا، اور ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷۰۰ھ کو قاہرہ میں داخل ہوا، امام ابن تیمیہ اس کے پیچھے دوسرے دن قاہرہ میں داخل ہوئے اور ملک ناصر اور دوسرے اراکین سلطنت سے ملاقات کی، سب نے بارش اور کیچڑ کا بہانہ کیا، اور امام ابن تیمیہ کی زبان بندی کے لیے حکومت کی طرف سے روزانہ ایک دینار مقرر کر دیا، امام ابن تیمیہ

---

[1] ۲۲/الحج:۶۰۔

ان کی اس چال کو اچھی طرح سمجھتے تھے، انہوں نے یہ وظیفہ قبول نہیں کیا اور سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرنے کی بجائے کاتب السر احمد بن یحییٰ بن فضل اللہ العمری کے چچا شیخ شرف الدین عبدالوہاب بن فضل اللہ العمری ۶۲۳ھ تا ۷۱۷ھ کے گھر میں قیام کیا، جو امام ابن تیمیہ کے بڑے ہمدردوں میں سے تھے، امام موصوف نے ملک ناصر کے سامنے بڑی سختی سے گفتگو کی اور قرآنِ مجید کی اس آیت:

﴿ وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ ﴾ [1]

''اور اگر وہ تم سے دین کے بارے میں مدد چاہیں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے۔''

کو تلاوت کر کے کہا: اگر تم ملک شام کے حاکم بھی نہ ہوتے اور وہاں کے لوگ تم سے امداد کے طالب ہوتے تو تمہیں اس آیتِ کریمہ کے مطابق ان کی مدد کرنا واجب ہوتا تھا، اب تو تم ہی اس کے مالک اور حاکم ہو، اور شام کے لوگ تمہاری رعایا ہیں۔ ایسی حالت میں اگر تم ان کی مدد نہ کرو گے تو خدا کے نزدیک تمہاری بڑی باز پرس ہوگی، انہوں نے یہاں تک دھمکی دے دی کہ اگر تم پیٹھ پھیرتے ہو اور لڑائی پر کمر بستہ نہیں ہوتے ہو تو ہم کسی ایسے شخص کو اپنا سلطان مقرر کریں گے، جو ہماری اور ہمارے ملک کی حمایت اور حفاظت کر سکتا ہو، پھر انہوں نے فوراً ہی برجستہ یہ آیت پڑھی:

﴿ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝۳۸ ﴾ [2]

''اور اگر تم پیٹھ پھیرو تو وہ تمہارے سوا کسی اور قوم کو تمہاری جگہ کر دے گا، پھر وہ قوم تمہاری طرح نہیں ہوگی۔''

امام ابن تیمیہ نے بھی کہا کہ اس مرتبہ مسلمان ضرور اس جنگ میں کامیاب ہوں گے اور میں فتح و نصرت کی ضمانت دیتا ہوں۔ [3]

---

[1] ۸/الانفال: ۱۰۔ [2] ۴۷/محمد: ۳۸۔

[3] البداية والنهاية: ۱۴/ ۱۵۔

علمائے مصر کے تاثرات

امام ابن تیمیہ مصر میں آٹھ دن تک رہے اور مختلف اعیان واکابر دولت اور عمائدین وعلما وفضلاء شہر سے ملاقات کرتے اور انہیں جہاد پر ورغلاتے رہے، قاضی القضاۃ شیخ تقی الدین ابن دقیق العید شافعی اور ابوحیان اندلسی جیسے علما نے اُن سے ملاقات کی اور اُن کی گفتگو سنی، اور ان سے بے حد متاثر ہوئے، قاضی القضاۃ تقی الدین ابن دقیق کی علمی ودنیوی منزلت بہت بڑی تھی، شیخ تاج الدین سبکی ان کو مجتہد مطلق سمجھتے تھے، تاہم قاضی موصوف نے کہا: میں نہیں سمجھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس جیسا شخص بھی پیدا کر سکتا ہے، جب وہ باہر آئے تو لوگوں نے قاضیٔ موصوف سے رائے پوچھی، انہوں نے کہا میں نے ایسا شخص دیکھا جس کی آنکھوں کے سامنے تمام علوم موجود ہیں، وہ جن کو چاہے لے لیتا ہے اور جن کو چاہے چھوڑ دیتا ہے۔

ابوحیان اندلسی کی تعریف

ابوحیان اندلسی تو اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے امام ابن تیمیہ کی تعریف میں ایک زور دار قصیدہ ہی لکھ ڈالا، جس کے چند اشعار ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:

لَمَّا اَتَیْنَا تَقِیَّ الدِّیْنِ لَاحَ لَنَا
دَاعٍ اِلَی اللّٰہ فَرْدٌ مَّا لَہٗ وِزَرُ

جب ہم تقی الدین (ابن تیمیہ) کے پاس آئے ہمیں ظاہر ہوا کہ وہ اللہ کی طرف تن تنہا بلانے والے ہیں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔

عَلٰی مُحَیَّاہُ مِنْ سِیْمَا الْاُوْلٰی صَحِبُوْا
خَیْرَ الْبَرِیَّۃِ نُوْرٌ دُوْنَہٗ الْقَمَرُ

ان کے چہرے پر ان لوگوں کی پیشانیوں کا نور ہے، جنہوں نے افضل مخلوق یعنی آنحضرت ﷺ کی صحبت اختیار کی تھی اور یہ نور ایسا ہے کہ چاند بھی اس کے مقابلہ میں کم حیثیت رکھتا ہے۔

حِبْرٌ تَسَرْبَلَ مِنْہُ وَھْرُہُ حِبَرٌ
بَحْرٌ تُقَاذِفُ مِنْ اَمْوَاجِہِ الدُّرَرُ

وہ ایک ایسے عالم ہیں جن کی وجہ سے ان کے زمانے نے علمیت کا جامہ پہن لیا ہے وہ ایک ایسا سمندر ہیں جس کی موجوں سے موتیاں اچھل پڑتی ہیں۔

قَامَ ابْنُ تَيْمِيَةَ فِيْ نَصْرِ شِرْعَتِنَا
مَقَامَ سَيِّدِ تَيْمٍ اِذْ عَصَتْ مُضَرُ

ابن تیمیہ ہماری شریعت کی حمایت میں اسی طرح کھڑے ہوئے جس طرح قبیلۂ تیم کے سردار (یعنی آنحضرت ﷺ) قبیلۂ مضر کی نافرمانی کے وقت کھڑے ہوئے۔

فَاَظْهَرَ الْحَقَّ اِذْ آثَارُهُ دَرَسَتْ
وَاَخْمَدَ الشَّرَّ اِذْ طَارَتْ لَهُ شَرَرُ

پس انہوں نے حق کو ظاہر کیا جبکہ اس کی نشانیاں مٹ چکی تھیں اور انہوں نے برائی کی چنگاریوں کو جبکہ اس کی نشانیاں مٹ چکی تھیں اور انہوں نے بُرائی کی چنگاریوں کو جبکہ وہ اُڑ رہی تھیں بجھایا۔

كُنَّا نُحَدِّثُ عَنْ حِبْرٍ يَجِيْءُ نَهَا
اَنْتَ الْاِمَامُ الَّذِيْ قَدْ كَانَ يُنْتَظَرُ

ہم ایک ایسے عالم کے متعلق بیان کرتے تھے جو آنے والا ہے، پس تو تم وہی امام ہو جس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

اس آخری شعر سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ابوحیان نے امام ابن تیمیہ کو مہدیٔ منتظر کا درجہ دیا تھا۔ ابوحیان نے اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے کہا کہ ان کی آنکھ نے ابن تیمیہ کا نظیر نہیں دیکھا۔

ایک نحوی بحث پر اختلاف

امام ابن تیمیہ کی ایک عادت یہ تھی کہ جس کسی چیز کو وہ صحیح تصور کرتے تھے اس کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کرتے تھے، ان کو اپنی باتوں کی صحت پر اتنا یقین ہوتا تھا کہ وہ بڑے بڑے مشہور امامِ فن کو بھی جاہل اور ناواقف کہنے سے پرہیز نہیں کرتے تھے، اور یہی بات

لوگوں کو سخت ناگوار ہوتی تھی، ابوحیان اندلسی نحو کے استاد تھے، اس لیے لامحالہ انہیں فطری طور پر سیبویہ اور دیگر امامانِ فن سے شیفتگی ہونی چاہیے تھی، ابوحیان اندلسی جو پہلے ہی مجلس میں امام ابن تیمیہ کے اتنے گرویدہ ہو گئے تھے، ایک نحوی بحث پر اختلاف ہو جانے کی وجہ سے ان سے سخت ناخوش ہو گئے اور ان کے سخت مخالف ہو گئے، سورۂ انفال کی آیت ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ حَسْبُكَ ٱللَّهُ وَمَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴾ [1]

"اے اللہ تیرے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو مومنین میں سے تیری پیروی کرتے ہیں کافی ہے۔"

اس آیت کی تشریح میں مفسرین کا ایک زبردست اختلاف ہے کہ ﴿ مَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴾ کا فقرہ کس پر عطف ہے اگر اس کو اللہ پر عطف مانا جائے تو اس آیت کا یہ مطلب ہو جاتا ہے کہ اللہ اور وہ مومنین جو تیرے پیرو ہیں تیرے لیے کافی ہے، اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ نبی کی تائید میں اللہ پیروانِ نبی کو بھی شریک کر لیتا ہے۔ عام مفسرین سیبویہ کی اتباع میں اس فقرہ کو اللہ پر عطف قرار دے کر یہی معنی مراد لیتے ہیں، جب امام ابن تیمیہ نے "ک" کی ضمیر پر عطف مانا تو ابوحیان اندلسی نے اس کی مخالفت کی اور اپنی تائید میں فوراً سیبویہ کا حوالہ دیا، امام ابن تیمیہ نے کہا کہ یہ سیبویہ کی ان اسی غلطیوں میں سے ایک ہے جو اس نے قرآن کے متعلق کی ہیں اور جن کو نہ تو سیبویہ ہی سمجھتا تھا اور نہ تم ہی ان کو جانتے ہو، وہ قرآن کے متعلق کئی جگہ فحش غلطیاں کر جاتا ہے، جب ابوحیان نے سیبویہ کی عظمت جتانی شروع کی تو کہا کہ سیبویہ کچھ نحو کا پیغمبر نہیں تھا جو غلطیوں سے پاک ہو، اس تیز و تند لہجہ کی وجہ سے ابوحیان بہت ہی برافروختہ ہو گئے اور ان کے سخت مخالف ہو گئے۔

حافظ ابن المحب کا بیان

حافظ ابوبکر المحب کہتے ہیں کہ جب ۷۳۴ھ میں ابوحیان حج کے لیے تشریف لائے تو میں ٦ ذوالحجہ کو اتوار کے دن ان سے مکے میں ملا اور ان کا دیوان پڑھنے اور نقل کرنے کی اجازت چاہی، اس دیوان میں وہ قصیدہ بھی تھا جو امام ابن تیمیہ کی شان میں کہا گیا تھا، ابوحیان

---

[1] ۸/الانفال: ٦٤۔

نے صرف اس ایک قصیدے کے نقل کرنے کی اجازت نہیں دی، جب وجہ پوچھی تو کہا: اب میں ان کو اچھے لفظوں سے یاد نہیں کرتا، اور اس کے بعد وہ واقعہ بیان کیا جس کا اوپر ذکر ہوا۔ [1]

ابوحیان نے امام ابن تیمیہ کے اس تیز وتند لہجے کو ایک ناقابل عفو گناہ قرار دے لیا تھا۔ اس لیے وہ خاص کر اپنی تفسیروں البحر المحیط اور النہر الماد من البحر میں امام ابن تیمیہ پر طعن و تشنیع کرتے ہیں اور ان کی ہر جگہ تحقیر کرتے نظر آتے ہیں۔

دمشق میں سراسیمگی

سلسلہ کلام میں ہم کہیں سے کہیں نکل آئے، امام ابن تیمیہ کے مصر جانے کے بعد جب دمشق والوں کو یہ معلوم ہوا کہ ملک ناصر راستے ہی سے واپس ہو گیا ہے تو وہ بہت پریشان ہو گئے۔ اور انہیں بالکل ہی مایوسی اور ناامیدی ہو گئی، والیٔ شہر ابن النحاس نے یہ اعلان کر دیا کہ جو لوگ بھی دمشق سے فرار ہونے کی قوت اور استطاعت رکھتے ہیں وہ فرار ہو جائیں، اس کی وجہ سے دمشق کے مرد وعورت اور بچے بالکل ہی سراسیمہ ہو گئے، عورتیں چلا چلا کر رونے لگیں، نادار اور غریب لوگ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ پا کر یقین کرنے لگے کہ اب ان کی نجات کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، ابن جماعہ، حریری، ابن صصری، ابن منجا جیسے علما وفضلا اور بہت سی عمائدین شہر مصر فرار ہو گئے، یہ دیکھ کر امام ابن تیمیہ کے چھوٹے بھائی شیخ شرف الدین عبداللہ بن تیمیہ، شیخ زین الدین الفارقی، شیخ ابراہیم رقی، شیخ ابوبکر بن قوام وغیرہ نائب الشام امیر فرم کے پاس جا کر اس کو دشمن کے مقابلے پر ابھارا، امیر عرب مہنا بن عیسیٰ سے بھی ملاقات کی اور اس کو جہاد پر آمادہ کیا، اس نے امیر افرم کی تائید کا وعدہ کیا، اور دشمن کے مقابلے کی ہر ممکن تیاری کی۔ [2]

امام ابن تیمیہ بھی ملک ناصر اور دوسرے اعیان سلطنت کو جنگ پر آمادہ کر کے ۲۷ جمادی الاولیٰ ۷۰۰ھ کو دمشق واپس آئے اور جہاد کی مزید تیاریاں کیں۔

تاتاریوں کی واپسی

اس مرتبہ تاتاری اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان بہت کم لائے تھے، انہیں امید تھی کہ ملک شام کی زرخیز زمینوں سے اتنا کچھ مل جائے گا کہ انہیں اپنے ساتھ کچھ لے جانے کی

---

[1] مجموع الدرر، ص: ٣٤۔ [2] البداية والنهاية: ١٤/ ١٦۔

ضرورت نہ ہوگی، مگر حلب کے قریب پہنچنے کے بعد انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، بارش کی کثرت کی وجہ سے تمام فصلیں برباد ہو چکی تھیں، سارے راستے دل دل ہو چکے تھے، سامانِ رسد کے کافی ذخیروں کے بغیر فوج کا آگے بڑھانا نہایت ہی خطرناک تھا، بارش کے ساتھ ساتھ شدت کی برف باری شروع ہو چکی تھی، جس کی وجہ سے تاتاری سپاہی بالکل ہی بدحواس ہو گئے، یہ دیکھ کر قازان نے ۱۱ جمادی الاولیٰ ۷۰۰ھ کو پیر کے دن اپنی فوج کو واپس چلنے کا حکم دے دیا۔ [1] اسی دن امام ابن تیمیہ مصر داخل ہوئے تھے۔

دعوتِ جہاد

مصر سے واپس آتے ہی امام ابن تیمیہ نے عام مومنین کے نام ایک طویل خط لکھا، جو ''العقود الدریہ'' میں منقول ہے، یہ خط تقریباً پچپن صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، اس خط کا ایک بڑا حصہ لکھا ہی تھا کہ انہیں خبر ملی کہ قازان واپس ہو گیا ہے۔ اور اس کی صرف ایک جماعت باقی رہ گئی ہے انہوں نے حماۃ کر وہاں کے امراء اور عوام کو جہاد پر کمر بستہ کرنا چاہا، مگر بعد میں یہ اطلاع آئی کہ تمام تاتاری واپس ہو گئے ہیں' انہوں نے رجب ۷۰۰ھ میں اس خط کو مکمل کیا۔ [2]

دعوتِ جہاد کا خلاصہ

اگر گنجائش ہوتی تو ہم اس کتاب میں اس خط کا پورا ترجمہ درج کر سکتے تھے، کیونکہ یہ امام ابن تیمیہ کی بصیرت اور ان کے اجتہادات و استنباطات کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے، ہم ذیل میں صرف اس خط کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

امام ابن تیمیہ سلام اور حمد و نعت کے بعد لکھتے ہیں:

''تاتاریوں کے ساتھ ہماری اس لڑائی کا واقعہ احزاب کی جنگ سے بہت کچھ مماثلت رکھتا ہے، ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، احزاب کی جنگ کے موقع پر دشمن بہت سی غلط باتیں مشہور کر چکے تھے اور مسلمانوں پر ان دشمنوں کا خوف اتنا چھا گیا تھا کہ ان کے کلیجے منہ تک آ گئے تھے، اور وہ ہر وقت مدد الٰہی کے منتظر رہتے تھے، اس لڑائی میں بھی مسلمانوں کا یہی حال تھا۔

---

[1] العقود الدرية، ص: ۱۷۱۔ [2] العقود الدرية، ص: ۱۷۵۔

پچھلے سال کی جنگ میں مسلمانوں کی شکست اُن کے کھلے ہوئے گناہوں اور فسادِ نیت اور ان کے ظلم و فواحش کا نتیجہ تھی، مسلمان اپنے فرائض سے بالکل غافل ہو چکے تھے، انہوں نے صوبہ جزیرہ اور روم کے مسلمانوں پر ظلم کیا تھا۔

دشمن ابتداء میں مصالحت پر آمادہ تھا، وہ ایمان لا کر پُرامن زندگی کرنے کے لیے تیار تھا، مگر مسلمانوں ہی نے اللہ کے احکام سے روگردانی کی جس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تاتاریوں کے مظالم کا شکار بنایا۔ مسلمان رعایا اور سپاہیوں میں بہت بڑا شر تھا، جس کی وجہ سے ان کے دین اور ان کی دنیا میں بہت بڑا فساد رونما ہوا۔

احزاب کی جنگ میں منافقین نے آنحضرت ﷺ اور عام مومنین و مسلمین کے خلاف زبردست کام کیا، اس جنگ میں زندیقوں، فلسفیوں، منجموں، طبیبوں، صوفیوں، فقیہوں اور شیعوں نے تاتاریوں کی تائید کی، اور ہر موقع پر مسلمانوں کو برباد کرنے کی کوشش کی، شیعوں کے خاص خاص فرقوں یعنی خرمیوں، باطنیوں، قرامطیوں، اسماعیلیوں اور نصیریوں نے کھلم کھلا تاتاریوں کی امداد کی، ان میں سے بعض لوگ تاتاریوں کو ناپسند کرتے ہیں تو وہ اُن کے دین کی خرابی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ ان کی سیرت کی وجہ سے ہے، کیونکہ تاتاری اعلانیہ خونریزی کر بیٹھتے ہیں، اور لوگوں کا مال لوٹ لیتے ہیں، اس میں وہ اپنے دوست دشمن کی کوئی تمیز نہیں کرتے۔

مسلمان جب تک عزم اور ارادے کے پکے تھے خدا بھی ان کی پوری امداد کرتا رہا اور ہر موقعے پر ان کو فتح و نصرت عطا کرتا رہا، مگر جب وہ بزدل ہو گئے اور موت سے ڈرنے لگے تو اُن کو ہر جگہ ناکامی ہونے لگی، مجاہدین کے لیے سب سے زیادہ صبر اور توکل چاہیے، جب ان میں یہ دونوں صفتیں نہیں ہوتیں تو پھر انہیں جنگ میں کامیابی نہیں ہوتی۔

احزاب کی جنگ کے موقعے پر یہودی بھی کفار مکہ کے ساتھ مل گئے، اس جنگ میں ارمینیہ کے نصرانی اور کرد تاتاریوں کے ساتھ مل گئے، تاتاریوں کا لشکر زیادہ ہونے کے باوجود وہ آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا، ایک قدم آگے بڑھتا تھا تو دوسرے قدم پیچھے ہو جاتا تھا۔

احزاب کی جنگ کے موقعے پر کفار نے تقریباً بیس دن تک مدینہ منورہ کا محاصرہ جاری

رکھا، اس جنگ میں تاتاریوں نے ۱۷ ربیع الآخر ۷۰۰ھ کو دریائے فرات پار کیا اور بیس بائیس دن کے قیام کے بعد یہ لوگ ۱۱ یا ۱۲ جمادی الاولیٰ ۷۰۰ھ کو واپس ہو گئے۔

احزاب کی جنگ کے وقت بڑی شدت کی سردی اور برف باری ہوئی تھی اور سخت ہوا چلی تھی جس کی وجہ سے کفار مکہ کے خیمے الٹ گئے اور انہیں مجبور ہو کر واپس ہونا پڑا، اس سال بھی اسی قسم کی سردی اور برف باری ہوئی اور سخت بارش ہونے لگی، مسلمانوں نے اس کو ایک عذاب الٰہی تصور کیا، مگر یہی ان کے حق میں ایک بڑی رحمت ثابت ہوا، کیونکہ اسی شدت کی سردی بارش اور برف باری کی بنا پر دشمن واپس ہونے پر مجبور ہو گیا، ہم مسلمانوں سے صاف کہتے رہے کہ تم اس سردی اور بارش کو ناپسند مت کرو، اس میں خدا کی کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہے، خدا نے اسی سردی، بارش اور برف باری کی بدولت ہمارے دشمنوں کو برباد کیا اور اس کو ملک شام سے نکلنے پر مجبور کیا، ان کے بہت سے سپاہی اور گھوڑے مر گئے اور بہت سے بھوک پیاس کی وجہ سے لب گور پہنچ چکے تھے، ملک شام کے ایک امیر نے مجھ سے کہا، خدا ہمارے چہروں کو روشن نہ کرے، ہمارا دشمن سر سے پیر تک برف میں ڈوبا ہوا تھا، اور ہم خاموش بیٹھے اس کو دیکھتے رہے، ہم نے موقع سے فائدہ اٹھا کر دشمن کو گرفتار کرنے کی کوشش نہ کی۔

احزاب کی جنگ کے وقت جب کافروں نے مدینۂ منورہ کا محاصرہ کر لیا تو مسلمانوں کے دل انتہائی خوف سے کانپ اٹھے اور وہ خدا کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے، اسی طرح جب تاتاریوں نے ملک شام کے مختلف شہروں کا محاصرہ شروع کیا تو مسلمانوں کے دل لرز اٹھے اور ان کے کلیجے منہ کو آ گئے، انہیں طرح طرح کی بدگمانیاں ہونے لگیں، بعض تو یہ کہنے لگے کہ اب مسلمان تاتاریوں کے مقابلے میں ثابت قدم نہیں رہ سکتے، تاتاری چاند کے ہالے کی طرح دمشق کو گھیر لیں گے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، ملک شام رہنے کی جگہ نہیں رہی اور تاتاری ملک شام کے بعد مصر کو بھی فتح کر لیں گے اس لیے بعض لوگ مصر سے بھی بھاگنے کی تیاریاں کر رہے تھے، کچھ لوگ یمن جانے کی فکر کر رہے تھے، مگر جو لوگ حقیقی مومن تھے اور جن کے دل میں کسی طرح کا کھوٹ نہیں تھا، انہیں خدا پر پورا اعتماد اور بھروسہ تھا، وہ غیر اللہ سے ڈرنے پر ہرگز آمادہ نہیں تھے، اسی لیے ان

کے ارادوں میں کسی قسم کا تزلزل نہیں آیا اور وہ آخر وقت تک دشمن کے مقابلے پر ڈٹے رہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی اور انہیں ان کے مقصد میں کامیابی عطا کی۔

احزاب کی جنگ کے وقت بعض لوگوں نے مسلمانوں سے کہا کہ اب محمد ﷺ کے دین پر قائم نہیں رہ سکتے اس لیے شرک کا دین اختیار کرو، اسی طرح اس جنگ میں بعض مسلمانوں نے کہا کہ صلح و امان کے بغیر اب کوئی چارہ نہیں ہے، اسی لیے تاتاریوں کی فرمانبرداری اختیار کرو۔ یہ لوگ درحقیقت موت سے ڈرتے تھے جس سے کبھی چھٹکارا نہیں مل سکتا، یہ لوگ بعض منافقین کی طرح میدان جنگ سے اپنے گھروں کو بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے، اور سمجھتے تھے کہ وہ اس طرح موت کے پنجے سے چھوٹ جائیں گے، مگر تجربے سے ظاہر ہوگیا کہ بھاگنے والے ہی زیادہ تر مارے گئے، جو لوگ دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہے، اور اپنے گھروں کو نہیں چھوڑا وہ بہت کم موت کا شکار ہوئے، یہ اللہ کی سنت ہے، جو ہمیشہ سے جاری رہی اور ہمیشہ جاری رہے گی، دنیا کی قلیل زندگی اور ساز و سامان کی خاطر موت سے ڈرنا حماقت ہے، بند برجوں میں بھی موت سے کوئی چھٹکارا نہیں مل سکتا۔

جب بعض مسلمانوں نے عزمِ راسخ ظاہر کیا تو دشمنوں کے دل رعب سے بھر گئے، اور کثیر تعداد رکھنے کے باوجود وہ واپس ہونے پر مجبور ہو گئے، جب مسلمانوں نے اپنا ثباتِ قلب دکھایا، اور خدا پر بھروسہ کیا، تو اللہ تعالیٰ نے دشمن کو بھی پھیر دیا، کیونکہ خدا خالص نیت اور سچی ہمت والوں کی ضرور مدد کرتا ہے، چاہے وہ عمل اور فعل ہی سے خالی کیوں نہ ہو۔"

دمشق میں خوشیاں

جب تاتاریوں کے واپس جانے کی مصدقہ خبر دمشق والوں کو ملی تو تمام لوگوں نے خوشیاں منائیں، مسجدوں میں خدا کا شکرادا کیا، اپنے دوستوں کے نام مبارکباد کے پیغام روانہ کیے ملک ناصر کو بھی اس خوشخبری کی اطلاع دی گئی۔

قازان کا تہدیدی خط

ناکامی و نامرادی کا جو تیر قازان کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا، اس کو نچلا بیٹھنے نہیں دیتا تھا، اس نے جنگ اور زور آزمائی کا ارادہ کرلیا، مگر اس سے پہلے یہ چاہتا تھا کہ مصری حکومت پر

حجت قائم کر لے، اس نے رمضان ۷۰۰ھ میں کردی پہاڑیوں سے ملک ناصر کے نام ایک تہدیدی خط لکھا، جس کو امیر کبیر ناصر الدین علی خواہ اور ملک القضاۃ جمال الدین موسیٰ ابن یوسف مصر لے آئے تھے، اس میں قازان نے سارے الزامات مصری حکومت کے سر تھوپے ہیں، پھر اپنی قاہرانہ قوت کے دکھانے کے بعد سخت ترین لہجہ میں مصری حکومت کو اپنی اطاعت کرنے کی تاکید کی ہے اور ساتھ ہی خراج ادا کرنے کا حکم دیا ہے، اور یہ دھمکی دی ہے کہ خراج ادا نہ ہونے کی صورت میں تاتاری مصر اور شام کو اپنے گھوڑوں کے ٹاپوں سے روند ڈالیں گے۔

ذیل میں قازان کے اس خط کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ [1]

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

بقوة اللّٰه تعالىٰ و ميامين الملة المحمديه

حكم السلطان محمود غازان

ملک ناصر کو معلوم ہوا کہ اس کی بعض مفسد فوجیں ہمارے شہروں کی حدود میں داخل ہوئیں اور خدا کی دشمنی اور نیز ہماری دشمن کی بنا پر ماردین اور اس کے قرب وجوار میں فساد مچایا اور جن جن باشندوں پر قابو حاصل ہو سکا، ان پر کھلم کھلا ظلم کیا، خدا کی نافرمانی کی اور عجیب و غریب افعال بد کی مرتکب ہوئیں، انہوں نے خدا کے خلاف جنگ کی اور ناموسِ شریعت کا پردہ چاک کیا ان کے ان حملوں کی وجہ سے ہمیں بھی غیرت وحمیت لاحق ہوئی اور ہماری اسلامی حمیت وغیرت کا تقاضا یہی تھا کہ ہم بھی ان کے شہروں میں داخل ہوں اور ان کے فساد کی روک تھام کریں، چنانچہ ہم اپنی موجودہ فوج کو لے کر نکلے اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آثار متقدمین کی پیروی میں اور نیز خدا کے اس قول

﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ [2]

”تاکہ لوگوں کو رسولوں کے بھیج دینے کے بعد اللہ پر حجت اور دلیل قائم نہ ہو جائے۔

کی اقتداء کرتے ہوئے ہم نے یعقوب سکرجی کو قاضیوں اور اماموں کی ایک جماعت کے ساتھ تمہارے پاس بھیجا اور یہ پیام کیا۔

---

[1] صبح الاعشی للقلقشندی: ۸/ ۶۹۔ [2] ٤/النساء:١٦٥۔

﴿ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ۝ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ۝ ﴾ ❶

''یہ بھی اگلے ڈر سنانے والوں میں سے ایک ڈر سنانے والا ہے، آنے والی قیامت قریب آ پہنچی، اس (قیامت) کو اللہ کے سوا کوئی ٹال نہیں سکتا۔''

لیکن اس کے برخلاف تم اپنی ضد پر اڑے رہے اور اپنی ذات کو اور تمام مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا فیصلہ کیا، تم نے حسنِ سلوک کے معاملے میں بادشاہوں کے طریقے کی خلاف ورزی کی، اس کے باوجود ہم نے تمہاری گمراہی اور سرکشی پر صبر کیا، یہاں تک کہ اللہ نے ہماری مدد کی اور اس نے تمہارے بارے اپنا فیصلہ دکھا دیا۔

﴿ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ ﴾ ❷

''کیا یہ لوگ اللہ کے مکر سے اپنے کو امن میں سمجھتے ہیں، پس اللہ کے مکر سے اپنے کو امن نہیں سمجھتے مگر وہی لوگ جو گھاٹے میں ہیں۔''

ہم یہ گمان کر رہے تھے کہ جب تم پر حقیقتِ حال ظاہر ہو جائے گی اور تم پر ہو گزرے گا جو کچھ کہ ہونا تھا، تو تم اپنی زیادتی اور بدعنوانیوں کی تلافی کرو گے جو تم نے دھوکے سے ہمارے ساتھ کی ہیں اور نیز ہماری طرف عذر اور معذرت روانہ کرو گے، ہم یہ سمجھتے تھے کہ تم مصر لوٹنے کے بعد اس معاملے کو سلجھانے کے لیے قاصد روانہ کرو گے، اسی لیے ہم چند دن دمشق میں ٹھہرے رہے، لیکن تم نے محض اپنی سستی کی بنا پر اصلاحِ حال کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور اپنے آپ کو امن میں سمجھتے رہے۔

پھر جب ہم اپنے شہروں کو لوٹے تو یہ خبر ملی کہ تم نے فوجیوں اور عام لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تم آیندہ ہم سے حلب یا فرات پر ملو گے اور تمہاری وجہ سے اسلام کو جو دھچکا لگا ہے اس کی تلافی کرو گے، یہ بھی معلوم ہوا کہ تم اپنے ارادے پر قائم ہو اور لڑائی کے سوا تمہارا کوئی اور ارادہ نہیں ہے، اس لیے ہم اپنی فوج کو لے کر تمہاری ملاقات کے لیے فرات پر پہنچے اور یہ امید کرتے رہے کہ تم اپنے دعوے کو ثابت کرو گے، مگر تمہاری جانب سے نہ کوئی تلوار

---

❶ ۵۳/النجم:۵۶-۵۸۔ ❷ ۷/الاعراف:۹۹۔

چمکی اور نہ کوئی نیزہ یا بھالا بلند ہوا۔ ہم حلب تک آئے اور تمہارے نہ آنے پر تعجب کرتے رہے، ہم یہ سوچتے تھے کہ اگر ہم اپنی شاندار زبردست اور قاہر فوجوں کو آگے بڑھائیں تو اُن کے آگے بڑھنے سے بہت سے شہر ویران ہو جائیں گے اور اگر وہ کسی شہر میں اتر پڑیں تو اس شہر کا سارا کاروبار فاسد ہو جائے گا، اور لوگوں اور شہروں کو ان سے نقصان پہنچے گا، اسی لیے ہم ان پر رحم کر کے اپنی فوجوں کو واپس لے آئے۔ اب ہم اپنی فتح مند فوجوں کو جمع کر رہے ہیں اور اپنے ارادوں کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں، ہم منجنیق (گوپھن) اور آلات حصار بھی تیار کر رہے ہیں۔ ہم نے عزم کر لیا ہے کہ تمہاری خاطر خواہ تنبیہ کر کے رہیں گے، مگر اس سے پہلے خدا کے ارشاد:

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ ﴾ [1]

''ہم کسی کو سزا نہیں دیتے، یہاں تک کہ ہم کسی قاصد کو بھیج نہیں لیتے۔''

کے مطابق ہم اپنے امیر کبیر ناصر الدین علی خواجا اور ملک القضاۃ جمال الدین موسیٰ بن یوسف کو اپنا قاصد بنا کر تمہارے پاس بھیج رہے ہیں تاکہ وہ ہمارے نمایندے بن کر تم سے گفتگو کریں، تمہیں چاہیے کہ ان دونوں کی کماحقہ عزت اور تکریم کرو اور ان دونوں کی باتوں کا اعتبار کرو، کیونکہ یہ دونوں ہمارے اعیانِ دولت سے ہیں اور ہمارے دفاتر کے معتمد علیہ ہیں، اللہ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ ﴾ [2]

''(اے پیغمبر) کہہ دو کہ پہنچنے والی حجت اللہ ہی کی ہے پس اگر وہ چاہے تو البتہ تم سب کو ہدایت دے سکتا ہے۔''

پس تمہیں چاہیے کہ ہمارے لیے تحفوں اور ہدیوں کا سامان کرو، تنبیہ کر دینے کے بعد تمہارے لیے عذر باقی نہیں رہ جاتا، اگر تم اس کی تلافی نہ کرو تو مسلمانوں کے خون اور مال سے اس کی تدبیر کی جائے گی اور تمہاری تقصیر اور کوتاہی کی بنا پر خدا کے نزدیک تم ہی سے پوچھ گچھ ہوگی۔

---

[1] ۱۷/بنی اسرائیل:۱۵۔ [2] ٦/الانعام:۱٤۹۔

پس سلطان کو چاہیے کہ اپنی رعایا کی بہبودی اور بھلائی کا خیال کرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو اس امت کے امور کا والی بناتا ہے اور وہ اپنی ہی حاجتوں اور ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی حاجتوں اور ضرورتوں اور فقر و فاقے کا محتاج بنا دیتا ہے۔ پس جس نے ایک مرتبہ تنبیہ کر دی اس کا عذر پورا ہو گیا اور جس نے پوری تنبیہ کی اس نے انصاف سے کام لیا اور سلامتی ہے اس شخص پر جس نے ہدایت کی اتباع کی۔ یہ خط کردی پہاڑیوں سے عشرہ اوسط رمضان ۷۰۰ھ کو لکھا گیا ہے۔ والحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد المصطفیٰ وآلہ وصحبہ وعترتہ الطاہرین۔

ملک ناصر کا جواب

ملک ناصر نے بڑے غور و فکر کے بعد محرم ۷۰۱ھ میں اس کا جواب دیا۔ اس میں زیادہ تر دفاعی پہلو اختیار کیا اور ان الزامات کو اٹھانے کی کوشش کی جو قازان نے مصری حکومت کے سر تھوپے ہیں، آخر میں اسلامی بھائی چارگی کو جتلا کر بے گناہ مسلمانوں پر دست درازی کرنے سے منع کیا، ذیل میں اس خط کا خلاصہ دیا جاتا ہے۔ [1]

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
بقوۃ اللّٰہ تعالیٰ

و

میامین الملۃ المحمدیۃ

اما بعد۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم کو سابقین اولین اور ہدایت پائے ہوئے ہادیوں میں سے گردانا جو قیامت کے دن تک سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرتے رہیں گے اور درود و سلام ہو ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی آل اور ساتھیوں پر جن کو اللہ نے سابقین اولین میں شمار کیا اور یہ بات پہلے ہی لوحِ محفوظ میں لکھ دی اور فرمایا:

﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ ﴾ [2]

''اور جو آگے بڑھنے والے ہیں (ان کا کیا کہنا) وہ آگے بڑھنے والے ہی ہیں،

---

[1] صبح الاعشی للقلقشندی: ۷/۲۴۳۔ [2] ۵۶/الواقعۃ: ۱۰، ۱۱

وہی خدا کے مقرب بندے ہیں۔"

باقبال دولة السلطان الملك الناصر كلام محمد بن قلاوون۔

سلطان معظم محمود غازان کو معلوم ہو کہ اس کا مراسلہ پہنچا، ہم نے اپنے جیسوں کے شایانِ شان اس مراسلے کی عزت اور قدر کی، ہم نے سلام اور سلامتی کے ساتھ اس کو اپنے ہاتھ میں لیا، ہم نے اس کو پڑھا اور اس پر غور وفکر کیا۔ اس طرح کہ کوئی اس کی باریکیوں اور حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، ہم نے اس کو ایسے امور کے مؤاخذے پر مشتمل پایا جو خود مؤاخذے کے لائق ہیں، ان کو ہم پر ظلم کرنے کے لیے بطور عذر پیش کیا گیا ہے، جو درحقیقت صرف بعض کے مظالم تھے۔ ان کے بدلے تمام سے مؤاخذہ کیا جا رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ [1]

"اور ایک گناہ کرنے والا دوسرے کے گناہ کو نہیں اٹھائے گا۔"

اب رہا یہ اعتراض کہ ہمارے شہروں کے اطراف میں بسنے والوں نے ماردین کو لوٹا اور عجیب وغریب کاموں اور بھیانک گناہوں کا ارتکاب کیا، جس کی وجہ سے تم کو غیرت وحمیت لاحق ہوئی، اور تم ہم سے مقابلہ کرنے پر آمادہ ہوئے، تم نے اس کو اپنی سرکشی اور اپنے ظلم کے لیے ایک عذر اور سبب قرار دیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ لوٹ مار طرفین سے ہوئی، ہمارے درمیان کوئی صلح یا معاہدہ نہیں تھا جس کی بنا پر ہم اپنا ہاتھ روک لیتے، تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارے آباء واجداد کفر اور شقاق پر قائم تھے، اور انہیں اسلام کے ساتھ کوئی الفت اور محبت نہیں تھی، ماردین کا بادشاہ اور اس کی رعایا شہروں کو نقصان پہنچانے اور لوگوں کو تکلیف پہنچانے میں اسی طرح حصہ لیا کرتے تھے، جس طرح تمہارے آباء واجداد حصہ لیا کرتے تھے، تمہارے آباء اجداد کے ساتھ ان لوگوں کا یارانہ تھا اور خدا کے اس قول:

﴿ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ﴾ [2]

---

[1] ١٧/بنی اسرائیل:١٥۔ [2] ٥/المائدة:٨۔

''اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا، تو وہ بھی انہیں میں سے ہوگا۔''

کے مطابق ماردین والے بھی ہمارے دشمنوں سے شمار ہوں گے۔

ماردین والوں کے اس اختلاف کو تم نے اپنی حمیت جاہلیت کی بنا پر ایک گناہ قرار دے لیا ہے، اور تم ماردین والوں کی حمایت پر کمر بستہ ہو گئے ہو، تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری ہمتیں بھری ہوئی ہیں، تم ہم لوگوں سے پورا انتقام لینا اور برائی کا بدلہ برائی سے دینا چاہتے ہو، یہ انتقام انہیں لوگوں سے لینا چاہیے جنہوں نے کوئی گناہ کیا ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تم اپنے لاؤلشکر کو لے کر اسلام ہی سے انتقام لو اور صلیب کے پرستاروں کو اپنے ساتھ لے کر پاک اور مقدس جگہوں کو روندڈالو اور بیت المقدس کی بے حرمتی کرو، جس کا درجہ بیت اللہ الحرام کے بعد اور مسجد نبوی کے برابر ہے، اگر تم یہ دلیل دیتے ہو کہ اس لوٹ مار کی باگ دوڑ ہمارے ہاتھ میں تھی اور اس قسم کا ظلم وستم ہماری سنت سے ہے تو اس کا صاف جواب یہی ہے کہ ہمارے اور ماردین والوں کے درمیان صلح اور معاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا۔

یہ جو تم نے دعویٰ کیا ہے کہ قاصدوں کے بھیجنے کے بارے میں تم نے سید المرسلین اور آثار متقدمین کی پیروی کی ہے، تو ہم نے اس کو بھی پڑھا اور اُن آیتوں کو سمجھا جن کو تم نے پیش کیا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارے قاصد اس وقت ہمارے پاس پہنچے جب کہ ڈیرے ڈیروں سے مل چکے تھے، اور تیر تیروں کے مقابل ہو چکے تھے، اور ایک قوم دوسری قوم سے قریب ہو چکی تھی، لڑائی شروع ہونے کے لیے صرف ایک دن بلکہ اس سے بھی کم وقت باقی رہ گیا تھا، اچانک دونوں جانب سے تیر چلنے لگے اور ایک دشمن دوسرے سے گتھ گیا، اگر تم صلح پر آمادہ ہوتے تو ہم بھی خدا کے اس ارشاد:

﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ [1]

''اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ۔''

پر عمل کرتے ہوئے صلح پر آمادہ ہوتے۔

تمہارے خط کے اسلوب ہی سے پتہ چلتا ہے کہ تم صلح اور معاہدے کے لیے تیار نہیں

---

[1] ٨/الانفال:٨۔

تھے، امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ٹھیک فرمایا کہ انسان اپنے دل میں کوئی بات نہیں چھپاتا، مگر اُس کے چہرے اور اس کی زبان سے وہ بات عیاں ہونے لگتی ہے، اگر تمہارے قاصد اس حالت میں پہنچتے کہ ان کی تلواریں ان کے میان میں ہوتیں اور ان کے نیزے اور تیر ترکشوں میں بند ہوتے اور ان کے گھوڑوں کی لگام آزاد نہ ہوتی تو ہم ضرور ان کی گفتگو سنتے اور ان کا جواب دیتے۔

یہ جو تم نے اپنی زبان قلم کو بے لگام دوڑایا ہے اور انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے، اور یہ لکھا ہے کہ تم نے ہماری گمراہی اور سرکشی پر صبر کیا، تو یہ صبر کہاں ہوا، جبکہ تم نے مصالحت کی خاطر اپنے قاصدوں کو بھیجنے سے پہلے اپنے گھوڑے دوڑا دیئے اور تنبیہ کرنے سے پہلے ہمارے شہروں میں گھس پڑے، اگر تم ان باتوں پر دوبارہ غور و فکر کرو اور اپنے طرز خطاب کا خیال کرو تو ہماری طرف سے تاخیر جواب کا عذر پاؤ گے، لیکن نصیحت نہیں پکڑتے، مگر عقلمند لوگ۔

یہ جو تم نے خوشی ظاہر کی ہے کہ اللہ نے ہر لڑائی میں تمہاری مدد کی اور تم کو کامیاب بنایا تو تم اگر ذرا بھی غور و فکر سے کام لیتے تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ اس میں فخر کی کوئی بات نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْۤا اِثْمًا ۚ﴾ [1]

”بے شک ہم ان کو ڈھیل دیتے ہیں تا کہ ان کے گناہ اور زیادہ ہوں۔“

تم کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اسلامی تلواروں نے تمہارے ساتھ کیا کیا، تم ہماری فوجوں کے عزم سے اچھی طرح واقف ہو، اگر ہماری تمام فوجیں وہاں جمع ہوتیں تو کسی کو تمہاری خبر تک نہیں ملتی، ہم ابتدائی تیاریوں میں لگے تھے، ہم محض لوگوں کو دیکھ بھال کے لیے ملک شام آئے تھے، اور جب ہمیں تمہارے آنے کی خبر ملی تو ہم نے مسلمانوں سے تکلیف اور نقصان کو دور کرنے کے لیے تم سے لڑائی کی، ہم نے جہاد سنت اور اپنا ایک فرض منصبی ادا کیا، اس سے ہماری غرض صرف اپنے پروردگار کی مغفرت کی تلاش تھی، ہم نے اپنی فوج کی کمی

---

[1] ۳/آل عمران:۱۷۸۔

کے باوجود خدا کے اس ارشاد:

﴿ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ﴾ [1]

''کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعت پر غالب آ گئیں۔''

پر بھروسہ کیا، ورنہ تمہارے بڑے لوگ اچھی طرح واقف ہیں کہ اسلامی فوجوں نے ان کو کس طرح روندا اور وہ کس طرح اجر کثیر کے مستحق ہوئے، جب یہ فوجیں اللہ کے راستے پر گامزن ہوئیں تو اُن پر فتح ونصرت کے دروازے کھل گئے، اگر تم ذرا بھی غور کرتے تو تمہیں اس قسم کا کوئی التباس نہ ہوتا اور تمہیں انکار کی جرأت نہ ہوتی، اگر تم پرانی تاریخ کے صفحات کو اُلٹ کر دیکھتے تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ کامیابی اللہ کی تقدیر سے ہے، اس میں غلبہ پانے والوں کے لیے فخر کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ مغلوب کے لیے کوئی عار ہے۔ کتنے بادشاہ ایسے گزرے ہیں جن پر دوسروں نے غلبہ حاصل کیا، اور پھر جب اُن کی مدد ہوئی تو انہوں نے اپنی پچھلی شکست کا کس کر بدلہ لے لیا، دینِ اسلام کے بادشاہوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔

اب رہا تمہارا یہ کہنا کہ جب تم دمشق آ کر اترے تو ہم نے تمہارے پاس کوئی قاصد نہیں بھیجا تو بات یہ ہے کہ جب ہم مصر پہنچے تو ہم نے جنگ کی تیاری شروع کر دی، ہر طرف سے فوجوں کو جمع کیا اور خدا کی راہ میں خوب روپیہ خرچ کیا، اور جب ہم مصر سے روانہ ہوئے تو تمہارے واپس چلے جانے کی خبر ملی، ہم آگے بڑھنے سے رُک گئے، اور اپنی فوج کے ایک حصے کو ان تاتاریوں کے خلاف بھیجا جو ہمارے شہروں میں ٹھہرے ہوئے تھے، ان میں سے کسی نے اس فوج کا مقابلہ نہیں کیا، ہماری فوج فرات تک گئی، مگر تاتاری قوم کا کہیں نشان نہیں ملا۔

تم کہتے ہو کہ ہم نے اپنی فوجوں اور عام لوگوں کو یہ سمجھایا کہ ہم تم سے حلب یا فرات پر ملیں گے، اسی لیے تم نے اپنی فوجوں کو جمع کر کے فرات پر ہمارا انتظار کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم کو تمہارے آگے بڑھنے کی خبر پہنچی تو ہم نے تمہاری ملاقات کا عزم بالجزم کر لیا ہمارے ساتھ

---

[1] ۲/البقرۃ: ۲۴۹۔

امیر المومنین حاکم بامر اللہ بھی تھے، جو ہمارے سردار رسول اللہ ﷺ کے چچا کی اولاد میں سے ہیں، اور جن کی اطاعت ہر ایک مسلمان پر واجب اور ہر ایک نافرماں بردار اور فرماں بردار پر ان کی بیعت اور پیروی فرض ہے، ہم نے جہاد کے فرض کی ادائیگی میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ دین اور دُنیا کا کوئی کام امیر المومنین کی مشایعت کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا، جس شخص نے ان کو اپنا والی مانا وہ اللہ کی حفاظت میں آ گیا اور خدا اس کا دوست ہوگیا اور جس نے ان سے یا ان لوگوں سے جن کو انہوں نے مقرر کیا دشمنی کی وہ خدا کی طرف سے ذلیل اور خوار ہوگا۔

ہماری فوجیں شام کے شہروں تک پہنچیں، تمام نشیبی زمینیں اور پہاڑ ان سے بھر گئے، اس لشکر کا اگلا حصہ حماۃ تک پہنچ گیا، تمہارے لوگوں نے اس پر حملہ کرنے یا اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کی، ہم کچھ دن تک وہیں ٹھہرے رہے، یہاں تک کہ تمہارے واپس چلے جانے کی خبر ملی۔

یہ جو تم نے لکھا ہے کہ تم نے محض ہمارے شہروں اور لوگوں کی تباہی اور خرابی کا خیال کر کے اپنی فوجوں کو آگے نہیں بڑھایا تو سوال یہ ہے کہ لوگوں اور شہروں کے ساتھ کب سے تمہیں ہمدردی اور مہربانی پیدا ہوئی؟ اور کب سے تمہاری فوجوں کا یہ اخلاق بدلا ہے؟ ذرا خیال تو کرو کہ آل سلجوق کے ساتھ تمہارا کیا سلوک رہا، تمہارے آثار تمہاری حرکت پر گواہ ہیں، آل سلجوق نے نہ کسی گھر سے اور نہ کسی پڑوسی سے تعرض کیا، انہوں نے آثار سلف میں سے کسی کو بھی نہیں مٹایا، کسی مسلمان کو ان سے کوئی تکلیف نہ پہنچی، آل سلجوق میں سے ہر ایک درہم اور دینار دے کر اپنی روزی خریدتا تھا اور کسی مسلمان کو تکلیف یا ایذا دینے سے ہمیشہ گریز کرتا تھا، یہی ہے مسلمانوں کی سنت اور یہی ہے ایک ایسے شخص کا کام جو اپنے ملک کی بقا اور اس کا دوام چاہتا ہے۔

یہ جو تم نے اپنی زبانِ قلم کو بے لگام اور آزاد دوڑایا ہے اور یہ کہہ کر کہ فوجیں جمع کی جا رہی ہیں اور منجنیقیں تیار کی جارہی ہیں، ہمیں ڈرایا ہے تو قرآن کی زبان میں اس کا یہی جواب ہوسکتا ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ﴾ [1]

''وہ لوگ جن کو لوگوں نے کہا، بے شک لوگ تمہارے خلاف جمع ہو گئے ہیں تو تم ان سے ڈرو تو ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہا کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔''

اب رہا تمہارا یہ کہنا کہ اگر ہم اپنی بدعنوانیوں کی تلافی نہیں کریں گے تو مسلمانوں کے خون اوران کے مال سے اس کی تدبیر کی جائے گی، تو اس کا جواب یہی ہے کہ کوئی جواب نہ دیا جائے جو شخص صلح اور اصلاح چاہتا ہے اس قسم کے الفاظ جن سے اللہ اور اس کا رسول راضی اور خوش نہیں ہے اپنی زبان پر کیونکر لاسکتا ہے، اور کسی طرح اپنی نیت کو چھپا کر اس قسم کی طویل طویل بحث کرنے لگتا ہے اس قوم کی خامیاں کچھ پوشیدہ نہیں ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے انسان کی نیت اس کے عمل سے زیادہ اہم ہے، اب سوال یہ ہے کہ کس قانون کی رُو سے مسلمانوں کے خون کو بہایا جائے گا؟ جو بھی ان کے خون سے تعرض کرے گا، دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ اس سے مؤاخذا کرے گا۔

اب رہے تمہارے فلاں اور فلاں قاصد، تو بے شک یہ ہمارے پاس آئے، ہم نے ان کی پوری تعظیم و تکریم کی، ہم نے باوجود اس کے کہ ان کی کم قدری اور ان کے معاملے کی کمزوری ہم سے کچھ چھپی ہوئی نہیں تھی، ان کی باتیں سنیں اور ان کا جواب دیا ان میں اہم امور کے دفاع کی سکت نہیں تھی، انہوں نے اپنے جرائم پر جن کا انہوں نے ارتکاب کیا پردہ ڈالنے کی کوشش کی، اس قسم کے لوگ ہم جیسوں کے پاس بھیجے جانے کے لائق نہیں تھے، اس قسم کے کاموں کے لیے ایسے آدمی منتخب کیے جاتے ہیں جن کی بزرگی اور صفاتی گفتگو پر تمام کا اجماع ہوتا ہے۔

تم نے ہم سے تحفے اور ہدیے طلب کیے ہیں، اگر تم ہم کو تحفے اور ہدیے بھیجتے تو ہم بھی ضرور ان سے بہتر تحفے اور ہدیے تمہیں روانہ کرتے۔ تمہارے چچا ملک احمد نے ہمارے والد

---

[1] ۳/آل عمران: ۱۷۳۔

ماجد کے نام مراسلہ بھیجا اور اس کے ساتھ بہت سے تحفے تحائف روانہ کیے تو ہمارے والد ماجد نے بھی بہت سے نفیس تحفے اور ہدیے انہیں روانہ کیے۔

اب جبکہ تمہارے تمام سوالوں کا جواب دیا جا چکا ہے تو ہمارا کہنا یہی ہی کہ ہم بھی صلح کی طرف مائل ہوں گے بشرطیکہ تم بھی صلح کی طرف مائل ہو تمہیں اسلام کے دائرے میں احسان کرنے والوں کی طرح نہیں، بلکہ اس کے ذریعہ شرف حاصل کرنے والوں کی طرف داخل ہونا چاہیے اور تمہیں چاہیے کہ خدا اور اس کے رسول کی پوری پابندی کرو تمہارا قول تمہارے فعل کے مطابق ہو، ان کافروں کو جو تمہارے اردگرد جمع ہیں چھوڑ دو، ان کو اپنے ساتھ رکھنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے، اگر تمہارا قاصد صلح کی آیتیں پڑھتا ہوا ہمارے پاس آتا اور اس کا خطاب و جواب ایسا عمدہ ہوتا کہ اس کے واپس جانے پر لوگ بے اختیار پکار اٹھتے:

﴿ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝ ﴾ [1]

"اے کاش! میں قاصد ہی کی راہ اختیار کرتا۔"

اس وقت ہمارے اور تمہارے دشمن ہم سے خوف کھاتے اور ہم دونوں مل کر اہل شرک کا قلع قمع کرتے اور ہماری کامیابی ہمارے مخالفین کی کمزوری کا سبب بنتی اور ہم دونوں کی دوستی پر خدا کا یہ قول گواہ ہوتا۔

﴿ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ ﴾ [2]

"اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو تم پر جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی پس تم اس کی نعمت کی وجہ سے بھائی بھائی ہو گئے۔"

اس وقت اگر خدا چاہے تو تمام امور کا بہترین انتظام ہو سکتا ہے اور صلح و کامیابی کی رسی کو اس طرح مضبوط پکڑا جا سکتا ہے، کہ وہ کبھی ٹوٹنے نہ پائے اور صلح کی بنیاد ایسی چیزوں پر ہو سکتی ہے، جن سے اللہ اور اس کا رسول راضی ہے۔

---

[1] ۲۵/الفرقان:۲۷۔ [2] ۳/آل عمران:۱۰۳۔

جنگ کی تیاری

قازان کو جب یہ معلوم ہو گیا کہ مصری حکومت اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اس کی اطاعت کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو اس نے بڑے زور و شور کے ساتھ اعلیٰ پیمانہ پر جنگ کی تیاری شروع کر دی، ادھر ملک ناصر نے مصر میں اور نائب الشام امیر جمال الدین آقوش الافرم نے بھی ملک شام میں زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔

امام ابن تیمیہ وغیرہ کو بدنام کرنے کی کوشش

امام ابن تیمیہ کے اقامت حدود کی بنا پر بعض رند مشرب اوباش ان کے سخت مخالف ہو گئے تھے، انہوں نے اُن کو بدنام کرنے کی کوشش کی، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک جعلی خط بنایا اور یہ مشہور کر دیا کہ امام ابن تیمیہ اور قاضی القضاۃ شمس الدین بن الحریری اور ملک شام کے کئی ایک امیر ''قازان'' سے مل جانے کی کوشش کر رہے ہیں اور شیخ کمال الدین ابن الزملکانی اور شیخ کمال الدین بن العطار تاتاریوں کو امیر جمال الدین آقوش الافرم کی جنگی تیاریوں کے متعلق مختلف خفیہ باتوں کی اطلاع دے رہی ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ امیر سیف الدین قبچاق کو دمشق کا حاکم بنائیں۔ یہ جعلی خط اتفاق سے جمادی الاولیٰ ۷۰۲ھ میں امیر افرم کے ہاتھ لگا، دیکھتے ہی اس نے اندازہ لگا لیا کہ یہ جعلی ہے اور محض ان علمائے کرام کو بدنام کرنے کے لیے ایسا کیا گیا ہے، مگر تحقیق حق کی غرض سے اُس نے خفیہ پولیس سے کام لیا۔ اس سلسلے میں ایک فقیر پکڑا گیا جس کا نام یعفوری تھا اور جو ہمیشہ جامع دمشق کی محرابِ صحابہ میں عبادت کرتا رہتا تھا، جب اس کے متعلق مزید کھوج لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ احمد الغفاری نامی ایک شخص اس کا شریکِ کار ہے اور تاج منادیلی نے ان دونوں کے لیے یہ خط لکھ کر دیا ہے، چنانچہ اس خط کا اصل مسودہ بھی ان کے پاس مل گیا، امیر افرم نے تاج منادیلی کا ہاتھ کٹوا دیا، اور یعفوری اور احمد الغفاری کو بھی سخت سزائیں دیں۔ [1]

ایک نیا مسئلہ کہ تاتاریوں سے لڑنا جائز نہیں ہے

اسی زمانے میں بعض فتنہ پردازوں نے ایک نیا مسئلہ اٹھایا وہ یہ کہ تاتاری مسلمان ہیں،

---

[1] البداية والنهاية: ١٤/ ٢٢۔

ان کے ساتھ لڑائی کرنا قرآن مجید کی رُو سے جائز نہیں ہے، بلکہ جب دونوں مسلمان جماعتیں آپس میں لڑ رہی ہوں تو ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرنی چاہیے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۝﴾ [1]

''اور اگر مومنین کی دو جماعتیں لڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ، پس اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس جماعت سے جو زیادتی کرتی ہے لڑو، یہاں تک کہ اللہ کے حکم پر اتر آئے پس اگر وہ اتر آئے تو ان کی عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور انصاف کرو بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو چاہتا ہے۔''

بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ تاتاری مسلمان ہیں وہ باغی نہیں ہیں کیونکہ وہ امام کی بیعت میں کبھی داخل نہیں ہوئے اس لیے ان کو ہرگز باغی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ امام ابن تیمیہ نے جواب دیا کہ ان کی مثال اُن خوارج کی سی ہے، جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی اور اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے۔ اور یہ تاتاری بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں میں حق کے قائم کرنے کے حقدار ہیں، کیونکہ مصری اور شامی مختلف فسق و فجور میں مبتلا ہیں، حالانکہ یہ تاتاری اس سے زیادہ فسق و فجور میں مبتلا ہیں، امام ابن تیمیہ نے اپنی ایک تقریر میں اس مسئلہ پر نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر میں بھی اپنے سر پر قرآنِ مجید رکھ کر آؤں اور تاتاریوں کی حمایت کروں تو تم مجھے بھی قتل کر دینا۔ [2]

اس پر جوش تقریر سے عام لوگوں کے شکوک اور شبہات زائل ہو گئے اور ان کی ہمتیں پہلے سے زیادہ بڑھ گئیں۔

---

[1] ٤٩/الحجرات:٩۔ [2] البداية والنهاية: ١٤/ ٢٤۔

تاتاریوں کی پیش قدمی اور دمشق میں خوف وہراس

قازان نے اس مرتبہ ایک بہت بڑی فوج تیار کر کے قتلغشاہ کے ساتھ روانہ کی، وہ خود اس جنگ میں شریک نہیں ہوا، جب تاتاری فرات کو پار کر کے حلب کی طرف بڑھے تو وہاں کا والی اپنی فوج لے کر حماۃ کی طرف آ گیا، اور پھر حلب اور حماۃ کی فوجیں دونوں مل کر حمص کی طرف ہٹ آئیں، یہ رنگ دیکھ کر تاتاری لوٹ مار کرتے ہوئے آگے بڑھے، اگرچہ مصری لشکر امیر رکن الدین بیبرس جاشنگیر، امیر حسام الدین لاچین، امیر سیف الدین کرای وغیرہ کی سرکردگی میں ۱۸ شعبان ۷۰۲ھ کو دمشق پہنچ چکا تھا، لیکن چونکہ اس کے ساتھ ملک ناصر نہیں آیا تھا، اس لیے دمشق کے لوگ پریشان ہو گئے، کچھ لوگ مصر کی طرف بھاگنے لگے، دمشق میں ہر جگہ یہ اعلان کیا گیا کہ کوئی شخص شہر چھوڑ کر نہ بھاگے، تمام قاضی، علما وفقہاء اور امراء دمشق کی جامع مسجد میں جمع ہوئے اور تمام سے لڑائی لڑنے پر حلف لیا۔

امام ابن تیمیہ کا فتح ونصرت کی بشارت دینا

امام ابن تیمیہ نے حلب اور حماۃ سے آئی ہوئی فوج سے قطیعہ میں ملاقات کی اور امیروں اور سپہ سالاروں سے دمشق کے قضاۃ وعلما وفقہاء وامراء کے حلف اٹھنے کا واقعہ بیان کیا اور انہیں لڑائی پر اُبھارا ہر ایک سے جنگ لڑنے پر قسم لی، وہ ہر ایک سے یہی کہتے جاتے تھے کہ اس مرتبہ تمہاری جیت ہے اس پر کوئی امیر کہتا کہ ان شاء اللہ کہے تو امام ابن تیمیہ پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ جواب دیتے:

اِنْ شَاءَ اللّٰہ تَحْقِیْقًا لَا تَعْلِیْقًا۔

''تحقیقی ان شاء اللہ ہے نہ کہ تعلیقی ان شاء اللہ۔

وہ ہر ایک کو فتح ونصرت کی بشارت دیتے جاتے تھے اور قرآن مجید کی مختلف آیتوں سے اپنے دعوے پر استدلال کرتے تھے، ان میں سے ایک آیت یہ تھی:

﴿ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ ﴾ [1]

''اور جس شخص پر زیادتی کی جائے تو البتہ خدا ضرور اس کی مدد کرے گا۔''

---

[1] ۲۲/الحج: ۶۰۔

دمشق سے مصری اور شامی فوج کی روانگی

مصری اور شامی فوج ۲۴ شعبان ۷۰۲ھ کو دمشق سے روانہ ہوئی، دمشق سے باہر چند میل کے فاصلے پر مرج الصفر کے مشہور میدان میں قیام کرنے کی بجائے کسوہ کے قریب کے پل پر پڑاؤ کیا، اس کی وجہ سے قسم قسم کی بدگمانیاں ہونے لگیں، بعض کہنے لگے کہ مرج الصفر میں نہر اور نالے زیادہ ہیں، یہاں تاتاریوں سے لڑنا دشوار ہے، اس لیے مصری اور شامی فوج نے پل کے نزدیک کے میدان کو منتخب کیا ہے تاکہ اگر شکست کھا کر بھاگنے کا موقع آ پڑے تو پل پار کر کے مصر کی طرف فرار ہو جائیں، امام بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کے ارادے سے دمشق سے روانہ ہوئے، بعض لوگوں کو گمان ہوا کہ یہ بھی بھاگنے کے ارادے سے شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں، چنانچہ کسی نے ان سی کہہ بھی دیا کہ تم تو ہم کو شہر چھوڑ کر فرار ہونے سے منع کر رہے تھے، اب تم ہی بھاگے جا رہے ہو، امام ابن تیمیہ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئے۔ [1]

دمشق میں لوٹ مار اور خوف و ہراس

مصری اور شامی فوج کے چلے جانے کے بعد شہر دمشق میں ہر طرف وحشت برسنے لگی، چور اور اوباش گھروں اور باغوں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے، عورتیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر بالا خانوں پر چڑھ کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگیں، لوگ مسجد کے میناروں پر چڑھ کر لڑائی کا حال معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگے، مگر انہیں گرد و غبار کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی، جب ۲۹ شعبان ۷۰۲ھ کو جمعرات کا دن آیا تو دمشق والوں میں بے حد خوف و ہراس پیدا ہو گیا، ہر ایک امید و بیم کی حالت میں گرفتار تھا، عورتیں سجدے میں گر کر دعائیں کر رہی تھیں اور بچے مارے خوف کے سہمے جا رہے تھے۔ [2] جب شام ہوئی تو امیر فخر الدین ایاس المرقبی نے آ کر بشارت دی کہ ملک ناصر ایک بہت بڑی فوج لے کر میدانِ جنگ پر پہنچ چکا ہے اور اس نے اسے دمشق بھیجا ہے تاکہ یہ معلوم کر کے تاتاریوں نے کہیں شہر کا رُخ تو نہیں کیا ہے، اس روز مطلع ابر آلود تھا، چاند دکھائی نہیں دیا مگر قاضی نے فتویٰ دیا کہ آج

---

[1] البداية والنهاية: ۱۴/ ۲۴۔ [2] دول الاسلام للذهبي: ۲/ ۱۶۱۔

سے رمضان شروع ہو گیا، تراویح پڑھی جائے، چنانچہ تمام مسجدوں میں تراویح شروع ہوئی، لوگ خلاف معمول لمبی لمبی دُعائیں کرنے لگے اور خدا سے فتح ونصرت چاہنے لگے۔

امام کا فتویٰ کہ روزہ نہ رکھا جائے

یکم رمضان ۷۰۲ھ کو مصری اور شامی فوجیں مرج الصفر کے میدان میں جمع ہوئیں، امام ابن تیمیہ نے فتویٰ دیا کہ لڑائی کی مدت تک روزہ نہ رکھا جائے، تنگ نظر علما نے اعتراض کیا کہ اب تو سفر کا کوئی موقع نہیں ہے، امام موصوف نے جواب دیا کہ جب سفر کی معمولی تھکان کے لیے روزہ توڑ دینا جائز ہے تو دشمن کے ساتھ لڑنے کی طاقت پیدا کرنے کے لیے روزہ توڑ دینا کیوں جائز نہ ہوگا۔ بلکہ جنگ کی حالت میں روزہ نہ رکھنا ہی افضل ہے، امام موصوف ہر ایک امیر اور سپہ سالار کے پاس جاتے تھے اور اس سے انگور یا کوئی اور چیز مانگ کر کھاتے تھے، تاکہ سب کو یہ معلوم ہو، کہ وہ روزہ دار نہیں ہیں۔ [1] وہ ہر ایک سے یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ اس مرتبہ ہماری جیت ہے اور قرآن مجید کی مختلف آیتوں سے اس پر استدلال کرتے تھے۔

دمشق میں پریشانی

یکم رمضان ۷۰۲ھ کو جمعہ کے دن دمشق والوں کو بڑی پریشانی تھی، ہر ایک دوسرے سے جنگ کی خبر دریافت کرتا تھا، مگر کوئی یہ نہیں بتا سکتا تھا، کہ مرج الصفر میں کیا ہو رہا ہے، اتنے میں امیر سیف الدین غرلو عادلی گھوڑا دوڑاتا ہوا شہر میں داخل ہوا، اور نائب قلعہ سے کچھ بات چیت کی اور پھر فوراً ہی میدانِ جنگ کی طرف واپس ہو گیا، کسی کو یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس نے کیا گفتگو کی، ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر مختلف قیاس آرائیاں کرتا جاتا تھا، جب دوسرا دن آیا تو لوگ اور زیادہ پریشان تھے، عورتیں اور بچے اپنے اپنے کوٹھوں پر چڑھ کر دھوپ میں ننگے سر ہو کر خدا سے دعائیں کرنے لگے۔

باقاعدہ جنگ

مرج الصفر کے میدان میں ۲ رمضان ۷۰۲ھ کو سنیچر کے دن عصر کے وقت باقاعدہ

---

[1] البداية والنهاية:١٤/٢٦۔

جنگ شروع ہوئی، طرفین کی شاندار اور زبردست فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آراستہ تھیں۔ جب ملک ناصر نے تاتاریوں کے لشکر پر نظر دوڑائی تو ۶۹۹ھ کی خوفناک جنگ کا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا، اس نے امام ابن تیمیہ سے درخواست کی کہ وہ اس کے جھنڈے کے نیچے کام کریں، امام موصوف نے جواب دیا کہ سنت یہی ہے کہ ہر ایک سپاہی اپنی قوم کے جھندے کے نیچے لڑے اور چونکہ میں شامی ہوں اس لیے مصری جھنڈے کے نیچے لڑ نہیں سکتا، ملک ناصر نے ان کے اس جواب کو قبول کرلیا اور اپنی بات پر کوئی اصرار نہیں کیا۔

فتح و نصرت کی بشارت

اس جنگ میں خلیفہ ابوالربیع سلیمان بھی شریک تھا، امام ابن تیمیہ تمام امیروں اور سپہ سالاروں سے ملاقات کرتے جاتے تھے، اور ان کو فتح و نصرت کی بشارت دیتے جاتے تھے اور جب امیروں کو اس پر شک اور تعجب ہوتا تھا تو وہ قسم کھا کر کہتے جاتے تھے کہ اس مرتبہ ہماری جیت ہے اس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے، جب کوئی امیر کرید کرید کر اس کے متعلق دریافت کرنے لگے تو وہ کہتے کہ مجھ سے بار بار سوال مت کیا کرو، اللہ تعالیٰ نے اس کو لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے، اس کا فیصلہ کبھی ٹل نہیں سکتا۔ [1]

امام کی ثابت قدمی اور بہادری

امام ابن تیمیہ نے اس جنگ میں جس ثابت قدمی اور بہادری کا ثبوت دیا وہ سب کے لیے حیرت کا باعث تھا، وہ نہ تو فوجی آدمی تھے اور نہ فوجی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کا اور ان کے باپ دادا کا پیشہ درس و تدریس اور تعلیم و تعلم تھا، اس کو سپہ گری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر ایمان و ایقان کی پختگی اور جوش جہاد نے ان کو ایک بہادر اور دلیر سپاہی بنا کر میدان جنگ میں لا کر کھڑا کر دیا۔

تاتاری فوج کے ایک حصہ کی پسپائی

اس روز یہ لڑائی شام تک جاری رہی، طرفین کی فوج نے بڑی بہادری اور بے جگری کے

---

[1] مدارج السالکین لابن قیم: ۲/ ۲۵۰۔

ساتھ لڑنا شروع کیا، تھوڑی دیر میں فریقین کے سینکڑوں آدمی مارے گئے اور شام ہوتے ہوتے تاتاری فوج کا ایک حصہ پسپا ہو گیا، مگر تاتاری سپہ سالار چوپان مصریوں کے مقابلے میں برابر ڈٹا رہا، یہاں تک کہ رات کی تاریکی نے دونوں کو جدا کر دیا۔

تاتاریوں کے اطراف گھیرا ڈالنا

اس رات تاتاری غباغبؔ ن پہاڑیوں میں پھیل گئے، مصری اور شامی فوج اندھیرے میں بھی تیر چلاتی رہی، جس کی وجہ سے، بہت سے تاتاری مارے گئے، مصریوں اور شامیوں نے ان پہاڑیوں کو ہر طرف سے گھیر لیا اور جب صبح ہوئی تو تاتاریوں کی حیرت کی انتہا نہیں رہی، انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ہر طرف سے گھر چکے ہیں، اسلامی فوجوں کی کثرت کو دیکھ کر ان کا کلیجہ پانی ہوا جا رہا تھا، تاتاری سپہ سالاروں نے اسلامی لشکر کی صفوں کو چیر کر اپنی فوج کو باہر نکال لے جانے کی کوشش کی، مگر اس میں وہ ناکام رہے، ان پہاڑیوں کے دامن ان کی لاشوں سے بھر گئے۔

شہادت کا شوق

جب دوسرے دن گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی تو امام ابن تیمیہ نے ایک امیر سے کہا کہ ذرا مجھے موت کی جگہ دکھاؤ، اس نے ان کو ایک ایسی جگہ پر لے جا کر کھڑا کر دیا جہاں تاتاریوں کے بے پناہ تیر برس رہے تھے، امیر نے ان سے کہا موت کی بہترین جگہ یہی ہے اس سے زیادہ آپ کو کیا چاہیے۔

امیر موصوف کا بیان ہے کہ امام موصوف نے آسمان کی طرف اپنی نظریں بلند کیں اور تھوڑی دیر تک دعا کی، اس کے بعد میان سے تلوار نکالی اور عقاب کی طرح دشمن کی صفوں پر جھپٹ پڑے اور نظروں سے غائب ہو گئے یہاں تک کہ عصر کے قریب تاتاریوں کو شکست ہوئی اور وہ میدانِ جنگ سے صحیح و سلامت باہر نکل آئے۔ [1]

---

[1] مجموع الدرر، ص: ١٦٤۔

تا تاریوں کی شکست

ملک ناصر اور دوسرے مصری اور شامی سپہ سالار اس روز ثابت قدمی کے ساتھ لڑے، بارش ہو جانے کی وجہ سے سارا میدان کیچڑ ہو گیا تھا، گھوڑوں کے پیر اندر دھنسے جا رہے تھے، ہر طرف کشتوں کے پشتے لگ گئے، ملک ناصر کا استاد الدار امیر حسام الدین لاچین رومی اور سلطنت کے آٹھ بڑے بڑے امیر شہید ہو گئے، ملک سعید کامل بن سعید بن صالح اسماعیل کا لڑکا صلاح الدین بھی شہید ہو گیا اس کے باوجود مصری اور شامی سپاہی اتنی بے جگری سے لڑے کہ تا تاری شکست کھا کر بھاگ نکلے، مگر جانے کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا، بہت سے تا تاری دریائے فرات میں کود پڑے مگر بہت کم لوگ پار کر سکے، تا تاریوں کا اس طرح شکست کھانا تھا کہ مصریوں اور شامیوں نے ۶۹۹ھ کی جنگ کا دل کھول کر بدلہ لینا شروع کیا، اور جو اس پچھلی جنگ میں شکست کھا کر بھاگے تھے، اور جن کو اپنے گناہوں کا احساس تھا، انہوں نے ۷۰۲ھ کی جنگ میں اپنے بہادرانہ کارناموں کے ذریعے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کیا اور تا تاریوں کے خون سے اپنے اُس پرانے داغ کو مٹایا۔ [1]

اس جنگ کو ''واقعہ شقحب'' کہا جاتا ہے، اس میں بہت کم تا تاری بچ کر واپس جا سکے اتنی بڑی فوج کا اس طرح برباد ہو جانا کچھ معمولی بات نہ تھی، جب قتلغشاہ اور چوپان اپنی بچی کھچی شکست خوردہ فوج کو لے کر قازان کے پاس پہنچے تو اس کو سخت صدمہ ہوا، اس نے اپنے سپہ سالاروں کو ان کی غفلت شعاری اور کم ہمتی کی بنا پر درے لگوائے اور طیش میں آ کر انہیں بہت سخت سست کہا، مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا، غیر معمولی شکست کی وجہ سے قازان کا دل بالکل ہی ٹوٹ گیا، اب اُس میں مصر و شام پر حملہ کرنے کی طاقت نہیں تھی، وہ دوسرے ہی سال یعنی ۱۰ شوال ۷۰۳ھ کو اس دنیائے فانی سے رحلت کر گیا۔

سپہ سالاروں اور امیروں کی عقیدت

چونکہ امام ابن تیمیہ کی پیشین گوئی حرف بحرف ثابت ہوئی تھی، اس لیے ملک ناصر، خلیفہ ابو الربیع سلیمان اور مصری اور شامی سپہ سالاروں اور امیروں کی ان سے عقیدت

---

[1] الرسالة القبرصيه لابن تيمية، ص: ١٤۔

بڑھ گئی، وہ انہیں مبارک باد دیتے تھے، اور ان کی غیر معمولی تعریف کرتے جاتے تھے، مگر وہ یہی کہتے تھے کہ قوم کا ایک معمولی فرد ہوں، میں دولت اور سلطنت کے اعیان میں سے نہیں ہوں۔

دمشق میں جشن

۴ رمضان ۷۰۲ھ کو پیر کے دن مصری اور شامی فوج کا ایک حصہ دمشق واپس آیا اور ملک ناصر، خلیفہ ابوالربیع سلیمان اور دوسرے سپہ سالار اور امیر اپنے اپنے دستوں کے ساتھ ۵ رمضان ۷۰۲ھ کو منگل کے دن شہر میں داخل ہوئے، ملک ناصر اور خلیفہ ابوالربیع سلیمان نے قصر ابلق میں قیام کیا اور جمعرات کے دن یہ دونوں قلعے میں منتقل ہو گئے۔ اس فتح کی خوشی میں لوگوں نے بازاروں کو سنوارا اور آراستہ کیا اور اپنے گھروں اور دوکانوں کو روشنی سے منور کیا اور اتنا بڑا جشن منایا کہ اس کی نظیر تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ شیخ شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں کہ خدا کی قسم! ہم لوگوں نے اس دن سے زیادہ سرور اور لذت والا کوئی دن اپنی عمر بھر میں نہیں دیکھا۔ [1] لوگ امام ابن تیمیہ کے پاس جاتے تھے اور انہیں مبارک باد دیتے تھے، یہ فتح اتنی زبردست اور غیر معمولی تھی کہ ملک ناصر اور خلیفے نے پورا رمضان یہیں دمشق میں گزارا، مصری فوج عید کے بعد ۳ شوال ۷۰۲ھ کو منگل کے دن مصر واپس ہوئی اس کے ساتھ ملک ناصر اور خلیفہ بھی واپس ہو گیا۔

کسروان کی لڑائی

اس فتح کے بعد امام ابن تیمیہ درس وتدریس، تفسیر قرآن اور تصنیف وتالیف میں مصروف ہو گئے، انہوں نے زبردستی بدعتوں اور مشرکانہ رسموں کی روک تھام اور عوام کی اصلاح شروع کر دی، مگر ان کو بیان کرنے سے پہلے ہم کسروان کی لڑائی کی تفصیل پیش کرتے ہیں، جو ۷۰۴ھ کے آخر میں پیش آئی، کیونکہ یہ بھی تاتاری جنگوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ شیعہ مذہبی اور قومی دونوں حیثیتوں سے مصر وشام کی سنی حکومت کے سخت مخالف تھے، وہ تاتاریوں کو اپنا معتقد بنا کر تاتاری حدودِ مملکت میں شیعیت

---

[1] دول الاسلام للذهبی: ۲/ ۱۶۲۔

کوفروغ دینے کی کوشش کررہے تھے، اس معاملے میں جرد وکسروان کی پہاڑیوں میں بسنے والے شیعہ سب سے پیش پیش تھے۔شوال ۶۹۹ھ میں ان کی سخت ترین گوشمالی ہوچکی تھی، مگر وہ بہت جلد اس کو بھول گئے، جب قازان کے بعد اس کا بھائی خدابندہ تخت نشین ہوا جس نے علانیہ شیعہ مذہب قبول کرلیا تھا، تو ان کی ہمتیں بہت بڑھ گئیں، اس نے اپنی ملکت میں سنی طریقوں کو بند کرنے کی کوششیں شروع کردیں، دمشق اور طرابلس کے درمیان بہت سی مضبوط پہاڑیاں تھیں، جن کو دروز کی پہاڑیاں بھی کہا جاتا ہے، یہاں بہت سے مضبوط جنگی قلعے تھے، یہاں شیعوں کے مختلف فرقے نصیریہ، اسماعیلیہ، باطنیہ، اباحیہ، امامیہ وغیرہ آباد تھے، بنی العود کے شیوخ کا ان پر بہت زیادہ اثر تھا، وہ عام شیعوں کو بہکاتے تھے اور مصر وشام کی سنی حکومتوں کے خلاف ان شیعوں کو اکساتے رہتے تھے، ان شیوخ نے ان شیعوں کو یہ سمجھا رکھا تھا کہ سنی حکومت کے ساتھ لڑنا ثواب کا کام ہے اگر کوئی ان کے خلاف جنگ کرنے میں قتل ہوجائے تو وہ شہادت کا درجہ پاتا ہے، انہوں نے صلیبی اور تاتاری جنگوں میں سنی مسلمانوں کے خلاف کام کیا، یہ لوگ شام کے ساحلی علاقوں پر چھاپے مارتے تھے اور بہت سے بے گناہ اور مظلوم عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرکے قبرص کے عیسائیوں کے ہاتھ بیچ دیتے تھے، جب ۷۰۲ھ کی جنگ میں تاتاریوں کو شکست ہوئی تو ان شیعوں کو بے حد رنج پہنچا، اب انہوں نے مصری اور شامی حکومت کے خلاف خفیہ کارروائیاں شروع کردیں اور ساحلی علاقوں کے مسلمانوں پر ظلم ڈھانا شروع کردیا۔

حکومت کا استفتاء اور امام ابن تیمیہ کا جواب

حکومت نے امام ابن تیمیہ سے اس بارے میں فتویٰ پوچھا، امام موصوف نے جواب دیا کہ کسروان کے شیعہ درحقیقت باغی ہیں، ان کے خلاف جہاد کرنا اور مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو کو بچانا اسلامی حکومت کا فرض ہے، امام موصوف نے مختلف شہروں کے مسلمانوں کے نام خطوط لکھے اور ہر طرف سے رضا کار مجاہدین کو جمع ہونے کی دعوت دی، چنانچہ چند دنوں کے اندر مجاہدین کی ایک خاصی جماعت تیار ہوگئی، ذی الحجہ ۷۰۴ھ کے آخر میں یہ مختصر سی فوج امیر قراقوش کی سرکردگی میں کسروان کی طرف روانہ ہوئی، امیر جمال الدین آقوش الافرم بھی

ایک زبردست فوج لے کر ۲ محرم ۷۰۵ھ کو دمشق سے روانہ ہوا، ان دونوں فوجوں نے مل کر کئی دن تک کسروان کی پہاڑیوں کا محاصرہ کیا اور ہر طرف سے اُن کی ناکہ بندی کر دی، یہاں ایسے مضبوط سنگی قلعے تھے کہ اسلامی فوج کا وہاں پہنچنا بہت مشکل تھا، حافظ ابن عبد الہادی لکھتے ہیں کہ ان پہاڑیوں میں سب سے زیادہ دشوار گزار پہاڑی کسروان کی تھی، اس سے پہلے بہت سے لوگوں نے ان کو فتح کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ہمیشہ ناکام رہے۔ امیر بیدرا نے بھی کئی دن تک اس کا محاصرہ کیا، مگر اس کو فتح نہیں کر سکا، آخر بڑی کوششوں کے بعد ان دونوں فوجوں نے یہاں کے بسنے والوں شیعوں کو ہر طرف سے تنگ کر دیا، جب یہ لوگ عاجز ہو کر مصالحت پر آمادہ ہوئے تو امام ابن تیمیہ نے خونریزی بند کرا دی اور بنی العود کے شیوخ سے عصمت علی پر گفتگو کی، انہوں نے تاریخی شہادتوں سے یہ ثابت کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے درمیان کئی مسئلوں میں اختلاف پیدا ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بسا اوقات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس سے صاف ثابت ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ معصوم نہیں تھے، امام ابن تیمیہ نے آخر میں شیعوں سے توبہ کروائی اور حکومت کو رائے دی کہ ان سب کو ملک شام کے مختلف شہروں اور قریوں میں منتشر اور پراگندہ کر دیا جائے تاکہ آئندہ ان کی جمعیت نہ ہو اور وہ سرکشی اور بغاوت نہ کر سکیں۔ [1]

اس لڑائی سے مسلمانوں کو بے حد فائدہ پہنچا، ان کی جان و مال اور آبرو محفوظ ہو گئی دشمنوں کے دلوں پر اسلامی حکومت کا رعب چھا گیا اور وہ حسد و غم سے مرنے لگے۔ [2]

تاتاری لڑائیوں کی طرح اس جنگ میں بھی امام ابن تیمیہ نے بے نظیر علم اور شجاعت کے جوہر دکھائے، ان کے سخت ترین مخالفین بھی ان سے خوف کھانے لگے۔

ملک ناصر کے نام خط

شامی لشکر کسروان کی جنگ میں کامیاب ہو کر ۱۷ محرم ۷۰۵ھ کو جمعرات کے دن دمشق لوٹا، امام ابن تیمیہ نے ملک ناصر کے نام ایک طویل خط لکھا جس کا صرف خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

---

[1] منهاج السنة لابن تيمية: ۳/ ۳۹۔ [2] البداية والنهاية: ۱۴/ ۳۵۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

داعی احمد ابن تیمیہ کی طرف سے سلطان مسلمین کی طرف

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ بعد حمد ونعت

یہ معلوم ہو چکا کہ خدا نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی اور تمام گروہوں کو شکست دی، اللہ تعالیٰ نے سلطان پر اور عام مسلمانوں پر اپنی نعمتوں کی وہ بارش برسائی ہے کہ اس کی مثال گزری ہوئی صدیوں میں بہت مشکل سے ملے گی، اس کے زمانہ میں اسلام کی تجدید ہوئی، جس کی وجہ سے اس کی دولت کو دوسری دولتوں پر فضیلت حاصل ہوگئی، صادق و مصدوق اور افضل الاولین والآخرین کی یہ حدیث صحیح ثابت ہوئی کہ چند صدیوں کے بعد دین کی تجدید ہوگی، خدا تمام مسلمانوں کو اس نعمت کے شکر کی توفیق دے اور ان کو تمام دشمنوں پر کامیابی عطا کرے۔

خدا نے محض سلطان کی سلطنت کی برکت اور اس کے حسن نیت اور اس کے صحت اسلام وعقیدہ اور اس کے ایمان ومعرفت اور ہمت وشجاعت اور تعظیم دین وشرع اور پیروی کتاب و سنت کی بدولت امتِ مسلمہ کو کامیابی عطا کی اور خدا کے دشمنوں پر اس کو فتح عنایت کی۔

خدا کے وہ دشمن جو دین کے دائرے سے نکل چکے ہیں دو طرح کے ہیں:

ایک تو وہ اہل فجور وطغیان وعدوان ہیں جو شریعت اسلامیہ کے حدود سے باہر ہو گئے ہیں، اور زمین میں فساد کرنا چاہتے ہیں، یہ تاتاری ہیں جو شریعت اسلامیہ کے دائرے سے خارج ہیں اگرچہ وہ کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت کے قائل کیوں نہ ہوں اور اسلام کی سیاست کے ایک حصے سے متفق کیوں نہ ہوں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو اہل سنت والجماعت کے دائرے سے خارج ہے اور مختلف قسم کی بدعتوں میں مبتلا ہے، اور مسلمانوں کے ساتھ منافقت برتتا ہے، یہ وہی لوگ ہیں جن کے ساتھ لڑنے کی سلطان نے اجازت دی تھی، خدا نے ہم کو جبل دروز وکسروان کے باشندوں پر کامیابی عطا کی۔

ان لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ابوبکر وعمر وعثمان، بدری صحابی، بیعت الرضوان کے شرکاء

جمہور مہاجرین وانصار وتابعین، تمام ائمہ مجتہدین اور تمام مسلمان، کافر اور مرتد ہیں، ان کا کفر یہودیوں اور نصرانیوں کے کفر سے بھی بڑھا ہوا ہے، اسی لیے وہ فرنگیوں اور تاتاریوں کو اہل قرآن وایمان پر ترجیح دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب تاتاری یہاں آئے اور مسلمانوں کو شکست فاش دی تو ان لوگوں نے قبرص والوں کی مدد سے ساحل کے بعض علاقوں پر چھاپہ مارا اور صلیب کا جھنڈا بلند کیا اور مسلمانوں کے گھوڑے، ہتھیار اور قیدی جن کی تعداد کو خدا ہی بہتر جانتا ہے، نصرانیوں کے ہاتھ فروخت کیے یہ لوگ مسلمان قیدیوں اور ان کے مال واسباب کو تقریباً بیس دن تک قبرص والوں کے ہاتھ بھیجتے رہے، تاتاریوں کے آنے سے ان کو بڑی خوشی حاصل ہوئی اور جب اللہ تعالیٰ نے سلطان اور عام مسلمانوں کو ان پر فتح دی تو ان کے ہاں ماتم کی صف بچھ گئی۔

انہی لوگوں کی دعوت پر چنگیز خان نے بلادِ اسلام پر حملہ کیا، ہولاکو نے بغداد کو تباہ و تاراج کیا اور حلب آ کر صالحیہ کو لوٹا، کیونکہ جو بھی ان کے عقیدوں کی تائید نہیں کرتا وہ ان کے نزدیک کافر ہے، جو شخص نبیذ کو حلال سمجھتا ہے یا متعہ کو حرام قرار دیتا ہے یا ابوبکر وعمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی محبت کا قائل ہے ان کے نزدیک سخت کافر ہے جو بھی ان کے امام منتظر کو نہیں مانتا یا جو رؤیت باری کا قائل ہے یا کلام اللہ کو واقعۃً اللہ کا کلام تسلیم کرتا ہے یا تقدیر اور دوسری باتوں پر ایمان لاتا ہے وہ بھی کافر ہے، ان کے امام اسی مذہب کی تلقین کیا کرتے ہیں، اس پہاڑ میں رہنے والے بنی العود کے شیوخ اپنے پیروؤں کو اسی کی تعلیم دیا کرتے تھے، اور سنی مسلمانوں کے خلاف لڑنے اور جہاد کرنے کو فرض بتایا کرتے تھے۔

ان کی بعض کتابیں اب ہماری ہاتھ لگی ہیں، یہاں کے باشندوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ بنی العود کے شیوخ انہیں اسی قسم کی تعلیم دیا کرتے تھے، یہ لوگ تقیہ کرتے ہیں، ان کے دلوں میں نفاق بھرا ہوا ہے، اب بھی یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف اپنا مال خرچ کرنے کے لیے تیار ہیں۔

یہ لوگ ایک دشوار گزار گھاٹی میں رہتے تھے، اور اطراف کے قریوں پر چھاپے مارتے رہتے تھے، یہ سنی مسلمانوں کو قتل کر کے ان کا مال و اسباب لوٹ لیتے تھے، انہوں نے

مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کو جس کا اندازہ خدا کے سوا کوئی اور نہیں کرسکتا، موت کے گھاٹ اتار دیا، جب قبرص کے عیسائی ان کے پاس پہنچتے ہیں تو ان کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں، انہیں سامانِ جنگ بطورِ تحفہ پیش کرتے ہیں اور ان کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے اور ابھارتے رہتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں جنہوں نے روزہ اور نماز کی پابندی کے باوجود حروریہ کو تباہ وتاراج کیا ہم نے ان لوگوں کے ساتھ جنگ کی اور انہیں اپنا مطیع اور فرماں بردار بنایا۔

تاتاریوں کے فساد کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ان سے ملتے رہتے ہیں اور ان کو غلط راستے پر ڈالتے رہتے ہیں، ان لوگوں نے مسلمانوں کا مال تاتاریوں سے زیادہ لوٹا ہے، اس لیے ان کی تمام زمینیں بیت المال کی ملکیت ہوں گی۔

چونکہ یہ لوگ اپنے اپنے قلعوں میں چھپ گئے تھے، اس لیے ہم کو ان کے درخت کاٹنے پڑے، اگر ہم ایسا نہ کرتے تو یہ لوگ اپنی جگہوں سے کبھی باہر نہیں آتے، پس خدا ہی کے لیے حمد ہے جس نے اس جیسے دشوار گزار قلعے پر ہمیں فتح دی۔

سلطان کو اسی وقت پوری کامیابی ہوسکتی ہے، جب کہ وہ تمام شہروں اور قریوں میں شریعت اسلامیہ کے حدود قائم کرے، بنی العود کے شیوخ اور بھائی بند مختلف قریوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر اس باطل مذہب کی تبلیغ میں مصروف ہیں، جب تک ان کی پوری اصلاح نہ ہوگی، ان کا شر وفساد رُک نہیں سکتا۔

دمشق، صفد، طرابلس، حماۃ، حمص، حلب وغیرہ کے علاقوں میں کئی قریے ایسے ہیں جہاں لوگ شریعتِ اسلامیہ کے احکام سے کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتے، یہاں قرآن وحدیث اور احکامِ اسلام کی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہے، نمازوں اور خطبوں کے لیے امام مؤذن، خطیب اور قاری مقرر نہیں ہیں، ان میں سے بہت سے لوگ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، عمرہ، حلال اور حرام کے بنیادی مسائل سے بھی واقف نہیں ہیں، دروز اور کسروان کے باشندوں نے ہمارے سامنے اس کا اعتراف کیا ہے، کہ وہ ان چیزوں میں سے کسی کو بھی نہیں جانتے، بنی العود کے شیوخ نے انہیں جس طرح سمجھا دیا، اسی طرح انہوں نے عمل

کرنا شروع کیا، ان شیوخ نے ان سے کہا تھا کہ مصریوں اور شامیوں کے خلاف لڑنا جہاد عظیم ہے۔ اگر ان میں سے کوئی لڑائی میں مارا جائے تو وہ شہادت کا درجہ پائے گا، اسی لیے سلطان کا ان جگہوں میں شعائر اسلام کا قائم کرنا اور جمعہ و جماعت اور قرآن و حدیث کی تبلیغ کا انتظام کرنا اسلام کی سب سے بڑی مصلحت ہوگی اور اللہ کے راستے میں سب سے بڑا جہاد متصور ہوگا۔

چچازاد بھتیجے کے نام خط

کسروان کی فتح کے متعلق امام ابن تیمیہ نے اپنے چچازاد بھتیجے عزالدین عبدالعزیز بن عبداللطیف بن عبدالعزیز بن عبدالسلام ابن تیمیہ کے نام جو اس وقت مصر میں تھے، ایک دوسرا خط لکھا، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بعد حمد و صلوٰۃ یہ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کو کامیاب بنایا، نیز اسلامی لشکر کو فتح یاب اور احزاب منافقین کو ذلیل اور عاجز کیا:

﴿ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ﴾ [1]

''وہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر روانہ کیا، تاکہ سارے دین پر اس کو غالب کرے۔''

اس فتح و کامیابی سے مسلمانوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں اور دین متین کو عزت ملی، اور کفار اور منافقین کو جو کتاب و سنت سے منحرف ہو چکے تھے، شکست نصیب ہوئی، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے امت اسلامیہ کے خلاف بارہا یہود و نصاریٰ اور تاتاریوں کی مدد کی، یہ لوگ جمہور امت اسلامیہ کو کافر سمجھتے ہیں، اور صفات الٰہی کا انکار کرتے ہیں، یہ لوگ رؤیت الٰہی اور قضا و قدر کے بھی منکر ہیں۔ یہ خدا کو ہادی اور مضل نہیں گردانتے، یہ لوگ صحابہ کرام اور اہل بیت کے مخالف اور دشمن ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات پر طرح طرح کی تہمتیں تراشتے رہتے ہیں، انہوں نے اسلام جیسے کھلے ہوئے دین میں بہت سی برائیاں اور بدعتیں جاری کیں، یہ لوگ محفوظ اور مضبوط قلعوں میں آباد تھے، جہاں تک کوئی فوج نہیں پہنچ سکتی تھی،

---

[1] ٦١/الصف:٩۔

کیونکہ ان قلعوں کے درمیان بہت سی بلند پہاڑیاں، عمیق وادیاں، گھنے جنگل اور ہیبت ناک دریا حائل ہیں، ان لوگوں کو شکست دینا کچھ آسان نہیں تھا، مگر جس قوم کو خدا سزا دینے کا فیصلہ کرلے اس کو کوئی بچا نہیں سکتا۔

﴿وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۗ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ﴾ [1]

''اور یہ لوگ یہ گمان کرتے تھے کہ ان کے قلعے ان کو اللہ سے بچالیں گے، لیکن خدا کا عذاب اس طرح ان پر آپہنچا، جس کا انہیں وہم وگمان بھی نہیں تھا، ان کے دلوں میں رعب بیٹھ گیا اور وہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے قلعوں کو تباہ و برباد کرنے لگے۔''

حیرہ والوں نے ان پر بیسیوں دفعہ حملے کیے، مگر ہر مرتبہ انہیں ناکامی ہوئی، اسی طرح بعض مسیحی اور مسلمان سلاطین کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، انہوں نے بہترین مسلمانوں کا خون بہایا، بے شمار عورتوں کی آبرو لوٹی اور اتنے مفاسد برپا کیے، کہ تاتاریوں کے مظالم بھی ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ہم نے ان کو شکست دی، ان کے شہروں پر قبضہ کیا، اور ان کو جلا وطن کردیا، ان کے مقتولین کی تعداد کو صرف خدا ہی بہتر جانتا ہے، ان میں سے بعض لوگ مسلمان ہوگئے اور بعض کو اس شرط پر آزادی دی گئی کہ وہ اسلامی ملکوں میں سے کہیں جاکر بس جائیں، نماز، روزے، اور دوسرے شرعی فرائض و واجبات کی پابندی کریں، کتاب وسنت کی پیروی کریں اور مسلمانوں کے رنج و راحت میں برابر کے شریک ہوں، اگر اس کے بعد بھی انہوں نے کسی بات کے خلاف ورزی کی تو ان کو موت کی سزا دی جائے گی، انہیں اسلامی شہروں میں بکھیر دیا گیا ہے، تاکہ وہ پھر جمع ہوکر فساد نہ کریں۔ ان کے گھر برباد کردیے گئے، ان کی بستیاں اجاڑ دی گئیں، ان کے کھیت اور درخت کاٹ دیے گئے، اور ان کے ساتھ وہی طریقہ کار اختیار کیا گیا جو رسول اللہ ﷺ نے بنی نضیر کے یہودیوں کے ساتھ اختیار کیا تھا،

---

[1] ٥٩/الحشر: ٢۔

اسی کے بعد یہ لوگ ہماری تلواروں کے سامنے عاجز ہوئے۔

ہمیں ایک ایسی فتح نصیب ہوئی ہے جس کا ہمیں پہلے وہم و گمان نہیں تھا، ہمارے دشمن یہ گمان کرتے تھے کہ ہم زندہ نہیں لوٹیں گے، مگر اللہ تعالیٰ نے ہماری تمام مشکلیں اس طرح حل کر دیں کہ ہمارے تمام مخالفین حیرت میں آ گئے اور ہم پر حسد کرنے لگے، اللہ تعالیٰ سے ہماری یہی دعا ہے کہ وہ اپنے تمام سچے بندوں پر رحمت کاملہ کی بارش برسائے۔ آمین۔

ردِّ شرک و بدعت

اس میں شبہ نہیں کہ امام ابن تیمیہ کے زمانے میں مصر و شام کے اندر خدا کے نیک بندوں اور کتاب و سنت کے واقف کاروں کی کچھ کمی نہیں تھی، ان دونوں ملکوں میں بیسیوں علما ایسے موجود تھے جن کو اجتہاد کا درجہ حاصل تھا، چنانچہ ابوالبرکات مخزومی اپنے قصیدۂ بائیہ میں کہتے ہیں۔

وَكَانَ فِيْ عَصْرِهِ بِالشَّامِ يَوْمَئِذٍ
سَبْعُوْنَ مُجْتَهِدًا مِنْ كُلِّ مُنْتَخَبِ

''اور ان (امام ابن تیمیہ) کے زمانے میں ملک شام کے اندر اس وقت ستر چنے ہوئے مجتہد تھے۔''

مگر ان کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے امام زمانہ کے مشرکانہ رسوم اور بدعات کے خلاف عملی جہاد کریں، وہ بسا اوقات اپنے اہل و عیال اور خاندان کی اصلاح ہی سے عاجز تھے چہ جائیکہ وہ عوام کی اصلاح کر سکیں، ان کی اصلاح کا دائرہ زیادہ تر اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کے حلقے تک محدود تھا، ورنہ ان کے دل زبان حال سے پکار پکار کر یہ کہہ رہے تھے۔

ذَهَبَ الرِّجَالُ الْمُقْتَدٰى بِفَعَالِهِمْ
وَالْمُنْكِرُوْنَ لِكُلِّ اَمْرٍ مُنْكَرِ

''ایسے لوگ دنیا سے اُٹھ گئے جن کی ان کے اعمال و افعال میں پیروی کی جاتی تھی اور جو ہر برے کام کا انکار کیا کرتے تھے۔''

وَبَقِيْتُ فِيْ خَلْفٍ يُزَكِّيْ بَعْضُهُمْ
بَعْضًا لِيَدْفَعَ مُعْوِرٌ عَنْ مُعْوِرِ

''اور میں ایسے پیچھے آنے والوں میں رہ گیا جن میں سے بعض لوگ بعض کی پاکی بیان کرتے ہیں تا کہ ایک بری سیرت والا دوسرے بری سیرت والے کی طرف سے مدافعت کرے۔''

وَبُنَيَّ اِنَّ مِنَ الرِّجَالِ بَهِيْمَةٌ
فِيْ صُوْرَةِ الرَّجُلِ السَّمِيْعِ الْمُبْصِرُ

"اور اے میرے لڑکے! بے شک بعض آدمی سننے اور دیکھنے والے آدمی کی صورت میں جانور ہوتے ہیں۔"

فَطِنٌ بِكُلِّ مُصِيْبَةٍ فِيْ مَالِه
فَإِذَا اُصِيْبَ بِدِيْنِهِ لَمْ يَشْعُرِ

"جو اپنے مال کی ہر آفت کے معاملے میں تو ہوشیار اور چالاک ہے لیکن جب اس کے دین پر کچھ آفت آ پڑتی ہے تو اس کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔"

علمائے صوفیا کی غفلت

امام ابن تیمیہ کے زمانے میں بڑے بڑے علما زیادہ تر فقہ وعقائد کے فروعی مسائل میں الجھے ہوئے تھے، وہ اپنے مخصوص دائرے سے باہر قدم رکھنا نہیں چاہتے تھے، کتاب وسنت میں غور وفکر کرنا اور عوام کو ان کی طرف دعوت دینا انہیں آتا ہی نہیں تھا، مشرکانہ رسوم اور بدعات کے خلاف بعض کا جہاد صرف قلمی حد تک تھا، بعض علما ایسے بھی تھے جو بعض مستند علما کی تحریروں کو صحیح سمجھ کر کتاب وسنت کے ارشادات سے ان بدعی افعال کے جائز اور مستحب ہونے کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔

صوفیا نے عوام کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا، ہر جگہ خانقاہیں قائم تھیں، جہاں ذکر واذکار اور وظائف کے ذریعے صفائے باطن پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی تھی، ان کی مجلسوں میں چند خاص عقائد وصوفیانہ کلمات کی تلقین یا گانے بجانے اور حال اور وجد لانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا، انہوں نے ہر جگہ پیری مریدی کا سلسلہ جاری رکھا تھا، عورتیں بھی ان پیروں کے حلقوں میں داخل تھیں اور ان کا حلقہ الگ قائم ہو چکا تھا، ان صوفیا کی اصلاح، اصلاح نہیں تھی، بلکہ وہ عوام کو اور زیادہ سست اور بے عمل بنا رہی تھی، اس زمانے کی مشرکانہ رسوم اور بدعات کی تردید اور ان کے استیصال کی طرف ان کی کوئی توجہ نہیں تھی، بلکہ ان صوفیا کی وجہ سے ان رسوم وبدعات کو اور زیادہ قوت اور طاقت حاصل ہو رہی تھی۔

مسلمان متکلمین اور فلاسفہ اپنے عقلی گھوڑے دوڑانے میں مصروف تھے، وہ زیادہ تر علوم معقولات کی تشریح و تنقیح میں لگے ہوئے تھے، انہیں اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ عوام کی اصلاح کی طرف کوئی توجہ کریں، اسلامی حکومت بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہی تھی۔

اصلاح عوام کے لیے امام ابن تیمیہ کی جدو جہد

امام ابن تیمیہ ایک پر جوش عالم تھے، وہ ابتدا ہی سے کتاب وسنت کی روشن تعلیمات کی اشاعت میں اپنا بہت زیادہ وقت صرف کیا کرتے تھے، ان کی نظر کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک تھا:

((مَنْ رأیٰ مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) [1]

”تم میں سے جو کوئی کوئی برائی دیکھے تو چاہیے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے، پس اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے بدلے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اس کو اپنے دل میں برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور درجہ ہے۔“

امام ابن تیمیہ نے پبلک زندگی میں قدم رکھتے ہی مشرکانہ رسوم اور بدعات کے خلاف اپنی آواز بلند کرنی شروع کر دی تھی، لوگ جب ان سے ان کے جواز وعدم جواز کے متعلق فتوے پوچھتے تھے تو وہ عام علما کی طرح کتابوں کے حوالے پیش کر دینے پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کے دلائل و براہین کے ساتھ ان کا مدلل اور مفصل جواب لکھا کرتے تھے، ان کا عوام پر بہت اچھا اثر پڑ رہا تھا، ان کو پہلی دفعہ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ عام مسائل زندگی میں کتاب وسنت کے ارشادات سے کس طرح استدلال اور استنباط کیا جا سکتا ہے۔

امام ابن تیمیہ کے خلاف شکایت

تاتاری لڑائیوں کے بعد جب امام ابن تیمیہ کو غیر معمولی شوکت وشہرت حاصل ہوئی تو انہوں نے لوگوں کو جبراً راہ راست پر لانے کی کوشش کی، اس کی وجہ سے بہت سے لوگ ان

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان کون النهي عن المنکر من الایمان، ح: ٤٩ (١٧٧)

کے مخالف بھی ہو گئے، اور حکام وقت سے ان کی شکایت کی، چنانچہ شوال ۷۰۱ھ میں بعض لوگوں نے ان کے خلاف بڑی شورش کی اور دمشق کے نائب السلطنت سے جا کر کہا کہ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ حدود قائم کرتے ہیں، لوگوں کو سزائیں دیتے ہیں، اور بچوں کے سر کے بال زبردستی منڈوا دیتے ہیں۔ اتفاقاً اس وقت امام ابن تیمیہ بھی وہاں پہنچے، نائب السلطنت کے سامنے ہی امام موصوف نے شکایت کرنے والوں کی غلطیاں ظاہر کیں اور کتاب وسنت کے ارشادات کو پیش کر کے انہیں حق بات کی دعوت دی۔ [1]

ساتویں صدی ہجری میں مسلمانوں کی حالت

ساتویں صدی ہجری کے مسلمانوں کے رگ و پے میں مشرکانہ رسوم اور بدعات رچ گئی تھیں، اگر اس زمانے کے مسلمانوں کے تمدن کا اندازہ لگانا ہو تو ہمیں امام ابوعبداللہ محمد بن محمد بن محمد العبدری الفارسی الشہیر بابن الحاج مالکی (المتوفی: ۷۳۷ھ) کی مشہور کتاب "المدخل الی تنمیة الاعمال بتحسین النیات" کا مطالعہ کرنا چاہیے جو چار ضخیم جلدوں میں مصر سے شائع ہو چکی ہے، مصنف نے اپنے زمانے کی تمام مشرکانہ رسوم اور بدعات کو ایک ایک کر کے گنایا ہے اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح توہم پرستی، قبر پرستی، شخص پرستی، وغیرہ میں مبتلا ہو چکے تھے، ان کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جو مشرکانہ رسوم اور بدعات سے خالی ہو، ملک شام اور ملک مصر میں ہر طرف مشہور قبریں تھیں، جو عوام کی زیارت نگاہ بنی ہوئی تھیں، ان میں سے اکثر فرضی تھیں، جیسے دمشق میں حضرت ابی بن کعب اور حضرت اویس قرنی کی قبریں، لبنان میں حضرت نوح علیہ السلام کی قبر، مصر میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قبر، اسی طرح دمشق میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر بھی فرضی تھی، ان کی قبر مسجد دمشق کے احاطے میں تھی، جس کو غلطی سے اس زمانے میں حضرت ہود علیہ السلام کی قبر سمجھا جاتا تھا، بیت المقدس میں بہت سی ایسی قبریں تھیں، جو انبیاء کی طرف منسوب تھیں، مگر وہ سب کی سب فرضی تھیں، ان کے متعلق بھی تعیین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس کی ہیں، اس کے باوجود ان پر مسلمانوں کا ایک میلہ لگا رہتا تھا، مرد عورت اور بچے وہاں پہنچتے تھے اور ان سے منتیں اور مرادیں مانگا

---

[1] البدایة و النهایة: ۱۴/ ۱۹۔

کرتے تھے۔

رجب اور شعبان کی بدعتیں

بدعات کا سب سے زیادہ مظاہرہ رجب اور شعبان کے مہینوں میں ہوتا تھا، رجب کی پہلی جمعرات کو روزہ رکھا جاتا تھا، اور اس رات مسجدوں میں باجماعت صلوۃ الرغائب پڑھی جاتی تھی، یہ بارہ رکعت کی نماز ہوتی تھی، دو دو رکعت پر سلام پھیرا جاتا تھا، ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ تین مرتبہ اور سورۂ اخلاص بارہ مرتبہ پڑھی جاتی تھی، ہر دو رکعت نماز کے بعد آنحضرت ﷺ پر ستر مرتبہ درود بھیجا جاتا تھا، پھر سجدہ میں گر کر ستر مرتبہ سبوح قدوس رب الملائکہ والروح پڑھا جاتا ہے، پھر سجدے سے سر اٹھا کر ستر مرتبہ رب اغفر وارحم وتجاوز عما تعلم انك انت الاعز الاكرم پڑھا جاتا تھا، پھر دوسری مرتبہ بھی سجدہ میں گر کر مذکورۂ بالا تسبیح ستر مرتبہ پڑھی جاتی تھی، اس طرح بارہ رکعت نماز ختم کی جاتی تھی۔

امام غزالی نے اپنے کتاب احیاء العلوم (جزء اول، ص: ۱۸۲) میں اس کو مستحب قرار دیا، اور آنحضرت ﷺ سے یہ جھوٹی روایت نقل کی کہ جو کوئی اس رات یہ نماز ادا کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے تمام گناہ معاف کر دے گا، چاہے اس کے گناہوں کی تعداد سمندر کے جھاگ، بالو کے ریزوں، پہاڑوں کے وزن اور درختوں کے پتوں کی گنتی کے برابر کیوں نہ ہوں اور ایسا شخص قیامت کے دن اپنے خاندان کے سات سو دوزخی آدمیوں کو آگ سے نجات دلائے گا۔

شعبان کی پندرھویں رات کو صلوۃ الالفیہ پڑھی جاتی تھی، یہ سو رکعت کی نماز ہوتی تھی، ہر دو رکعت پر سلام پھیرا جاتا تھا، اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد گیارہ مرتبہ سورہ اخلاص پڑھی جاتی تھی، بعض سو رکعت کی بجائے صرف دس رکعت پڑھتے تھے، مگر سورۂ اخلاص گیارہ کی بجائے سو مرتبہ پڑھتے تھے۔

امام غزالی لکھتے ہیں کہ سلف کے لوگ جماعت کے ساتھ یہ نماز پڑھا کرتے تھے اور اس کو صلوۃ الخیر کہا کرتے تھے، پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے کہا

مجھ سے تیس سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے بیان کیا کہ جو کوئی یہ نماز پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی طرف ستر مرتبہ نظر ڈالتا ہے، اور ہر نظر میں اس کی ستر حاجتیں پوری کرتا ہے، جن میں سے ایک ادنیٰ حاجت مغفرت الٰہی ہے۔ [1]

ابو طالب مکی اور امام غزالی کے لکھ دینے کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ یہ دونوں نمازیں مستحب ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اہل علم نے ہر دور میں ان کی مخالفت کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ دونوں نمازیں بدعت ہیں، امام طرطوشی لکھتے ہیں کہ ۴۸۰ھ سے پہلے بیت المقدس میں صلوٰۃ الرغائب کا رواج نہیں تھا۔ [2] اس بدعت کو سب سے، پہلے ابن الحمراء نے ۴۴۸ھ میں جاری کیا، یہ شخص نابلس کا رہنے والا تھا، اور بڑی خوش الحانی کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا، وہ بیت المقدس آ کر بس گیا تھا، اس نے اس سال رجب کی پہلی جمعرات کو تن تنہا مسجد اقصیٰ میں نماز شروع کی، ایک نے اس کی اقتدا کی، دوسرا بھی اس کے ساتھ مل گیا، اس کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی نماز میں شریک ہو گئے لوگوں نے اس نماز کو اس قدر پسند کیا کہ ہر سال ابن ابی الحمراء کی امامت میں یہ نماز ہونے لگی، بیت المقدس کے لوگ اس نماز کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

امام غزالی اس نماز کو وہ رتبہ نہیں دیتے تھے جو تراویح یا دوسری سنتوں کا تھا، تاہم چونکہ بیت المقدس والے اس پر مداوت کرتے تھے اور اس کو چھوڑنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے، اس لیے اس کو اپنی کتاب احیاء العلوم میں ذکر کیا ہے۔ [3]

صلوٰۃ الرغائب و صلوٰۃ الالفیہ کی اہمیت

جب یہ نمازیں جاری ہوئیں تو ان کی حیثیت محض نمازوں کی رہی، مگر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، عوام کے دلوں میں ان سے اعتقاد بڑھتا گیا، ان کے نزدیک ان کی اہمیت عیدین سے بھی کہیں زیادہ تھی، ان راتوں میں ہر گھر میں حلوے مانڈے پکائے جاتے تھے، ہر مسجد میں روشنی کا بہت زیادہ اہتمام ہوتا تھا، مسجدوں کے صحن اور ان کے اطراف بازار لگتا تھا، جہاں

---

[1] احیاء العلوم: ۱/ ۱۸۲۔ [2] الباعث علی انکار البدع و الحوادث، ص: ۲۳۔
[3] احیاء العلوم: ۱/ ۱۸۲۔

ہر قسم کے لوگ لچے اور بدمعاش سب جمع ہوتے تھے، خوانچہ والے مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر صدا لگاتے تھے، اور سقے مشکوں میں ٹھنڈا پانی لے کر ادھر ادھر گھومتے پھرتے تھے، حلوہ اور میوہ فروش الگ اپنی دکانیں سجاتے تھے، مردوں اور بچوں کے ساتھ عورتیں بھی زرق برق لباس پہن کر اور عطر لگا کر ان نمازوں میں شریک ہوتی تھیں، پندرھویں شعبان کی رات کو خاص کر عورتیں بہت زیادہ تعداد میں مقبروں اور مزاروں پر بھی حاضر ہوتی تھیں۔ اس کی وجہ سے جو اخلاقی مفاسد ہوتے تھے ان کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، مسجدیں عبادت گاہ نہیں معلوم ہوتی تھیں، بلکہ ایک بازار تھیں، جہاں ہر قسم کی چیخ و پکار اور شور و شغب بالکل جائز تھا۔

ان بدعات کو بند کرنے کی کوشش

ہر دور میں بعض علما نے ان بدعات کو بند کرنے کی کوشش کی، مگر عوام کی عقیدت کچھ ایسی تھی کہ وہ ہر مرتبہ بند ہو کر پھر جاری ہو جاتی تھیں، دولت ایوبیہ کے عالم و فاضل فرمانروا سلطان کامل محمد بن ابی بکر رحمہ اللہ نے اپنے عہد حکومت ۶۱۵ھ تا ۶۳۵ھ میں ان کو بند کر دیا تھا مگر اس کی وفات کے بعد یہ بدعتیں پھر سے جاری ہو گئیں۔ [1]

سلطان العلما عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام (المتوفی: ۶۶۰ھ) نے اپنے زمانے میں صلوۃ الرغائب اور پندرھویں شعبان کی نماز کے بدعت ہونے کا فتویٰ دیا تھا [2] اور ان کو باطل قرار دیا تھا، جب مشہور شارح صحیح مسلم امام ابوزکریا یحییٰ نووی رحمہ اللہ سے اس کے متعلق فتویٰ پوچھا گیا تو صاف جواب دیا، کہ یہ بدعت ہے اور بہت ہی بری بدعت ہے، اس میں بہت سی برائیاں ہیں، جن کی بنا پر اس کا چھوڑنا واجب اور اس سے اعراض کرنا ضروری ہے، اور جو بھی اس کو ادا کرتا ہے اس پر انکار کرنا لازمی ہے، حاکم کو چاہیے کہ وہ اپنی رعایا کو اس بدعت کے کرنے سے روکے، کیونکہ وہ ان کا راعی ہے، اور قیامت کے دن اس سے اس کی رعایا کے متعلق سوال کیا جائے گا، انہوں نے یہ بھی لکھا کہ علما کرام نے اس کا انکار کیا ہے اور اس کی سخت ترین مذمت کی ہے، اور اس کے ادا کرنے والے کو جاہل بتایا ہے اور اس سلسلے میں

---

[1] الباعث علی انکار البدع و الحوادث، ص: ۳۰۔

[2] طبقات الشافعیة للسبکی: ۵/ ۸۰ ـ ۱۰۵۔

کئی کتابیں اور رسالے لکھے ہیں، انہوں نے یہ بھی لکھا کہ صرف اس ایک بات سے دھوکہ نہ کھایا جائے کہ اکثر شہروں میں بہت زیادہ لوگ یہ نماز ادا کرتے ہیں، اور ابو طالب مکی اور ابو حامد غزالی جیسے علما نے اپنی کتابوں میں اس کو سنت قرار دے دیا ہے کیونکہ یہ ایک باطل بدعت ہے۔ [1]

امام نووی نے مختلف حدیثوں سے استدلال کر کے لکھا ہے کہ نمازیں توقیفی ہیں ان میں کوئی رد و بدل ہو نہیں سکتا، وہی نمازیں متصوف ہوں گی جن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت ہو۔ یہ نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ یہ پانچویں صدی ہجری میں جاری ہوئی تھی۔ [2]

عوام کے حسن ظن کی وجہ

صلوٰۃ الرغائب اور صلوٰۃ الالفیہ کے ساتھ عوام کے حسن ظن کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان نمازوں میں سورۂ اخلاص کئی مرتبہ پڑھی جاتی تھی۔ اور ایک حدیث میں سورۂ اخلاص کی فضیلت ایک تہائی قرآن کی فضیلت کے برابر بتائی گئی ہے، اور جب ایک رکعت میں سورۂ اخلاص گیارہ یا بارہ مرتبہ پڑھی جائے تو ظاہر ہے کہ صرف ایک رکعت کا ثواب تین چار قرآن ختم کرنے کے برابر ہو گیا۔ [3]

حالانکہ اس حدیث کی غلط تعبیر و تاویل کی جا رہی تھی، چنانچہ ابن الحاج مالکی اس حدیث کی اس غلط تعبیر و تاویل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] المدخل لابن الحاج مالکی: ٤/ ٢٥٩۔ [2] ایضًا، ص: ٢٦٠۔

[3] آج کل کا مروجہ طریقہ فاتحہ بھی اس حدیث کی غلط تعبیر پر مبنی ہے، یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید دو حصوں پر منقسم ہے ایک سبعاً من المثانی (یعنی سورۂ فاتحہ) اور دوسرا قرآن عظیم (یعنی باقی قرآن) جیسا کہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴾ (١٥/الحجر: ٨٧)

''اور بے شک ہم نے تجھ کو بار بار دہرائی جانے والی سات آیتیں اور قرآن عظیم دیا ہے۔''

پس اس حدیث کے مطابق جس نے سورۂ فاتحہ کے ساتھ تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ لیا گویا اس نے ایک قرآن کا ثواب حاصل کر لیا۔

''علما کے نزدیک اس حدیث کے ہرگز وہ معنی نہیں ہیں جو عوام نے مراد لیے ہیں اگر اس کے یہ معنی ہوتے تو آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام نمازوں میں لمبی لمبی سورتیں پڑھنے کی بجائے صرف سورۂ قل ہو اللہ احد کے بار بار پڑھنے پر اکتفاء کرتے اور فرض اور نفل نمازوں میں اسی سورت کو دہراتے رہتے۔ اور پورا قرآن پڑھنے کی بجائے صرف اس سورت پر بس کر لیتے، جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اس حدیث کے ہرگز وہ معنی نہیں ہیں جو عام طور پر مراد لیے جاتے ہیں اور اس بات پر تمام کا اجماع ہے کہ جو شخص ایک رکعت میں تین مرتبہ سورۂ قل ہو اللہ احد پڑھے، اس کا اجر ہرگز اس شخص کے اجر کے برابر نہیں ہوسکتا جو رات بھر قرآن مجید پڑھتا ہے، اور سارا قرآن ختم کرتا ہے۔

امام ابن تیمیہ نے بھی سورۂ اخلاص کی تفسیر میں اس غلط معنی کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ سورۂ اخلاص میں چونکہ توحید کا بیان ہے اور قرآن مجید کی ایک تہائی آیتیں توحید ہی سے متعلق ہے اس لیے گویا سورۂ اخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہوتی ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جو کوئی سورۂ اخلاص تین مرتبہ پڑھ لے وہ گویا پورے قرآن کا ثواب حاصل کر لیتا ہے۔

امام ابن تیمیہ کا فتویٰ

امام ابن تیمیہ نے ان بدعتوں کے خلاف بارہا لوگوں کو تقریر تحریر کے ذریعہ توجہ دلائی، انہوں نے اپنے زمانے کی مشرکانہ رسوم و بدعات پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا:

اور اس سے زیادہ سخت اور بری وہ اسبوعی (ہفتہ دار) اور حولی (سالانہ) نمازیں ہیں جن کو بعض مصنفین نے رقائق و فضائل کے تحت بیان کیا ہے جیسے اتوار، پیر، منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کی نمازیں جس کے متعلق ابو طالب مکی، ابو حامد الغزالی اور شیخ عبدالقادر جیلانی وغیرہ نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ سنت ہیں، یا وہ صلوٰۃ الالفیہ جو پہلی رجب اور نصف شعبان کی رات ادا کی جاتی ہے یا وہ بارہ رکعت کی نماز جو رجب کی پہلی جمعرات کی شب میں پڑھی جاتی ہے یا وہ دوسری نمازیں جن کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ سے مروی ہیں، لیکن اہل علم و معرفت کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ ساری حدیثیں جھوٹی ہیں، اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ ان کا انتساب ٹھیک نہیں ہے مگر اہل علم و دین کی

ایک جماعت کو یہ حدیثیں ملیں اور انہوں نے ان کو صحیح سمجھ کر ان پر عمل کیا، ان کو ان کے سنت کی مخالفت کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے حسن ارادہ و اجتہاد کی بنا پر اجر ملے گا لیکن جن لوگوں کو اچھی طرح سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ سنت نہیں ہیں اس کی باوجود یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ نمازیں دوسری نمازوں سے بہتر ہیں تو وہ گمراہ بلکہ کافر ہیں۔ [1]

ان بدعات کا بند ہونا اور پھر جاری ہو جانا

امام ابن تیمیہ نے ان بدعات کو بند کرانے کی زبردست کوشش کی، دمشق کے نائب السلطنت سے کہہ کر ۷۰۲ھ میں ان بدعتوں کو بند کرا دیا، چار سال تک یہ بدعتیں بند رہیں، لیکن جب عقائد کا فتنہ اٹھا، جس کی تفصیل آگے آتی ہے، امام ابن تیمیہ کو مصر بلا لیا گیا تو بدعتی عالموں اور عام لوگوں نے شعبان ۷۰۶ھ سے ان کو جاری کر دیا۔

جو سلطان ان بدعات کو بند کرتا ہے وہ مر جاتا ہے

ان بدعات کے ساتھ عوام کی عقیدت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ آگے چل کر یہ عقیدہ ہو گیا کہ جو کوئی سلطان ان بدعتوں کو بند کراتا ہے، وہ مر جاتا ہے، آخر کار ۷۵۱ھ میں سلطان ناصر بن محمد قلاون کے لڑکے ملک حسن نے ان کو بند کرا دیا، چنانچہ کتاب البدایۃ والنہایہ میں ہے، اور یہ بدعت لوگوں کے اندر تقریباً ۴۵۰ھ سے لے کر ہمارے زمانے تک لوگوں کے اندر بالکل جڑ پکڑ گئی تھی، اور کتنی مرتبہ فقیہوں، قاضیوں، مفتیوں، عالموں، عابدوں، امیروں، زاہدوں، اور سلطنت کے نائبوں وغیرہ نے اس کو بند کرانے کی کوشش کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی آسانی مہیا نہیں کی مگر صرف اسی سال اور اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ وہ اس سلطان (یعنی ملک حسن) کی عمر زیادہ کرے تاکہ جاہل لوگ، جن کے ذہنوں میں یہ بات سما گئی ہے کہ جب کسی سال یہ روشنی باطل کر دی جاتی ہے تو اس وقت کا سلطان مر جاتا ہے، یہ جان لیں کہ ان کے اس خیال کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس پر کوئی دلیل نہیں ہے سوائے اس کے کہ یہ محض ان کا وہم اور خیال ہے۔ [2]

---

[1] مجموعہ الرسائل الکبریٰ ۲/ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔

[2] البدایۃ و النہایۃ: ۱۴/ ۲۳۵۔

مسجد نارنج کی چٹان کو کاٹ کر پھینکوا دینا

دمشق کی مسجد نارنج کے مصلے کے قریب ایک چٹان تھی، جس سے عوام کو بڑی عقیدت پیدا ہوگئی تھی، لوگ اس پر نذرو نیاز چڑھاتے تھے اور منتیں اور مرادیں مانگا کرتے تھے، امام ابن تیمیہ چند پتھر پھوڑنے والے آدمیوں کو لے کر وہاں پہنچے اور اس چٹان کو کٹوا کر پھنکوا دیا، یہ واقعہ رجب ۷۰۴ھ میں پیش آیا تھا۔ [1] اس کی وجہ سے عوام نے ان کے خلاف زبردست ہنگامہ کیا، مگر امام موصوف پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوسکا، انہوں نے دمشق کی اسی قسم کی اور بہت سی زیارت گاہوں کو ڈھا دیا تھا، چنانچہ ان کے شاگرد حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

دمشق میں اس قسم کی بہت سی زیارت گاہیں تھیں جن کے توڑنے کی اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے توحید پرست پیرؤں کو توفیق عطا فرمائی تھی، جیسے عمود مخلق اور وہ پرستش گاہ جو نارنج کی مسجد میں مصلےٰ کے پاس تھی اور جس کو جاہل لوگ پوجتے تھے اور وہ زیارت گاہ جو عیسائیوں کے قبرستان کے قریب پن چکی کے پاس تھی، جہاں لوگ مختلف وقتوں میں برکت حاصل کرنے کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ یہاں بت کی طرح کا ایک مجسمہ تھا جو قلوط کی نہر میں کھڑا تھا، لوگ اس پر نذرو نیاز چڑھاتے تھے، اور اس سے برکت کے طلبگار رہتے تھے، خدا نے اس زیارت گاہ کا بھی استیصال کر دیا جو رحبہ کے پاس تھی اور جہاں لوگ چراغ جلایا کرتے تھے، اور مشرک اس سے برکت مانگتے تھے، یہ درحقیقت ایک لمبا ستون تھا، جس کے سر پر گیند کی طرح کا ایک گول پتھر تھا، مسجد درب کے پاس بھی ایک زیارت گاہ تھی، جس پر نماز پڑھنے کے لیے ایک چھوٹا سا قطعہ بنا ہوا تھا، مشرک اس کو پوجتے تھے، خدا نے اس کے توڑنے کی بھی شیخ الاسلام کو توفیق عطا فرمائی۔'' اس کے بعد حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

بت پرست خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کی طرف چاہے وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، کس قدر جلد مائل ہو جاتے ہیں اور یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ پتھر یہ درخت اور یہ چشمہ ہماری نذر قبول کرتا ہے گویا وہ ان کی عبادت کو بھی قبول کرتا ہے کیونکہ نذر بھی ایک عبادت ہے اور نذر ردینے

---

[1] ایضًا، ص: ٢٤۔

والا اس کو قرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے نذر دینے والا درحقیقت ان پتھروں، درختوں، اور چشموں کا تقرب چاہتا ہے، اسی لیے یہ لوگ ان چیزوں کو چھوتے اور چومتے رہتے ہیں۔ [1]

فقراء کی اصلاح

امام ابن تیمیہ کے زمانے میں بہت سے گدڑی پوش فقیر تھے، جن کی صورت اور سیرت غیر شرعی تھی، انہوں نے اپنا ایک خاص لباس اختیار کر لیا تھا، یہ لوگ اپنی آنکھیں بند کر کے یا ہو اور یا حق کے نعرے لگاتے تھے، تاکہ عوام ان کو اللہ کا ولی یا خدا رسیدہ خیال کریں، اور ان کے ساتھ غیر معمولی عقیدت رکھیں۔ ان گدڑی پوش فقیروں میں سے اکثر محض دھوکہ باز ہوتے تھے اور طرح طرح کے افعال شنیعہ کے مرتکب ہوتے تھے۔ امام ابن تیمیہ نے ان کے اس غیر شرعی صورت و سیرت اور لباس کے خلاف سخت تنقید شروع کی اور جب وہ اصلاح حال پر راضی نہ ہوئے تو زبردستی ان کی شکل و ہیت کے بدلنے پر انہیں مجبور کیا، چنانچہ اس قسم کی حسب ذیل دو تین واقعات حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیے ہیں۔

مجاہد ابراہیم القطان سے توبہ کروانا

دمشق میں ایک گدڑی پوش فقیر تھا، جس کا نام مجاہد ابراہیم القطان تھا، وہ پیوند لگی ہوئی گدڑی پہنتا تھا، اس نے سر، داڑھی اور مونچھ کے بال بہت بڑھا لیے تھے، اس کے ناخن بھی بہت لمبے تھے، مونچھیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ اس کے لب نظر نہیں آرہے تھے، اس نے ایک عجیب ہیت اور شکل وصورت بنا رکھی تھی، وہ ہمیشہ فحش بکنے کا عادی تھا اور عوام پر اثر ڈالنے کے لیے آنکھیں بند کر کے یا ھو اور یا حق کے نعرے لگاتا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بھنگ وغیرہ بھی کھایا کرتا تھا، جس کی وجہ سے اس پر مدہوشی کا عالم طاری رہتا تھا، امام ابن تیمیہ نے اس کو ہر طرح سے سمجھایا اور کہا کہ وہ عام مسلمانوں کا سا لباس اختیار کرے مگر جب اس نے نہیں مانا تو اپنے ساتھیوں سے کہ کر اس کی گدڑی اتروالی اور اس کو چاک کر کے پھینکوا دیا، پھر اس کے سر اور مونچھ کے بال اور اس کے ناخن زبردستی کٹوائے اور پھر اس سے توبہ

---

[1] اغاثة اللهفان في مصائد الشيطان، ص: ١١١۔

کروائی۔ 1 یہ واقعہ رجب ۷۰۴ھ میں پیش آیا تھا۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد جب شیخ محمد خباز بلاسی کو معلوم ہوا کہ وہ حرام چیزیں بھی کھایا کرتا ہے اور یہودیوں اور نصرانیوں کی صحبت میں رہتا ہے اور خوابوں کی غلط سلط تعبیر کرتا پھرتا ہے تو شیخ موصوف نے اس کو بلایا اور پھر اس سے توبہ کروائی۔ 2

ابراہیم القمینی سے توبہ کروانا

حافظ ابن کثیر نے اسی قسم کا اور ایک واقعہ نقل کیا ہے لکھا ہے کہ دمشق کے محلہ قمامین میں ایک مجذوب اور دیوانہ رہتا تھا جو لوگوں کو اپنے کشف سے غیب کی خبریں بتایا کرتا تھا، اس کا نام ابراہیم تھا، 3 وہ گندی جگہوں پر بیٹھا کرتا تھا اور نماز روزے کا پابند نہیں تھا، عورتیں اور بچے اس کو گھیرے رہتے تھے۔ لوگوں کو اس سے بڑی عقیدت پیدا ہوگئی تھی، امام ابن تیمیہ نے اس کو سرزنش کی اور اس سے توبہ کروائی۔ ابراہیم قمینی نے ۷۲۵ھ میں وفات پائی۔ 4

عدوی شیوخ کے نام تبلیغی خط

امام ابن تیمیہ نام نہاد صوفیہ اور فقراء کے خلافِ شریعت طور طریقوں کے ابتداء ہی سے مخالف تھے، وہ منبروں پر اور مجلسوں میں ان پر سخت تنقیدیں کیا کرتے تھے، انہوں نے مختلف شیوخ کے نام تبلیغی اور اصلاحی خطوط لکھے اور انہیں دعوت دی کہ اپنے مزعومہ عقائد و خیالات، اعمال و افعال اور لباس و شعار کو چھوڑ کر کتاب و سنت کی روشن تعلیمات پر عمل کریں، چنانچہ انہوں نے ۷۰۴ھ مشہور شیخ عدی بن مسافر الالوسی کے شیوخ اور پیروؤں کے نام اسی قسم کا ایک طویل تبلیغی اور اصلاحی خط لکھا جو ان کے مجموعہ الرسائل الکبریٰ میں چھپ گیا ہے۔

شیخ نصر بن سلیمان المنبجی کے نام خط

جب امام ابن تیمیہ کو یہ معلوم ہوا کہ شیخ نصر بن سلیمان المنبجی کے پیروؤں اور دوسرے

---

1 البداية و النهاية: ١٤ / ٣٣، ٣٤۔ 2 ايضًا، ص: ٣٤۔

3 یہ ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ ابراہیم القمینی اور مجاہد ابراہیم القطان جس کا اوپر ذکر ہوا ہے دونوں ایک ہیں یا الگ الگ، ابن کثیر نے ان دونوں کو الگ الگ بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ ہیں۔

4 البداية و النهاية: ١٤ / ١١٩۔

گمراہ فرقوں کے حامیوں میں سے ہیں اور وحدۃ الوجود کے قائل ہیں تو انہوں نے ۷۰۴ھ میں دمشق سے انہیں ایک تبلیغی خط لکھا اور دعوت دی کہ کتاب وسنت کی روشنی میں ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود کو جانچیں اور ہر حال میں حق کی اتباع کریں، یہ خط امام ابن تیمیہ کے مجموعۃ الرسائل والمسائل کی پہلی جلد میں چھپ گیا ہے، شیخ نصر منبجی کو امام موصوف کا یہ خط بہت ناگوار گزرا، امیر بیبرس جاشنگیر نائب السلطنت مصر کے پاس ان کا بہت بڑا رسوخ تھا، انہوں نے اس کو سمجھانا شروع کیا کہ ابن تیمیہ کی تحریک اصلاح بھی ابن تومرت کی تحریکِ اصلاحی جیسی ہے اور جس طرح ابن تومرت اور اس کے پیرو مغرب اقصیٰ کے ایک وسیع خطہ پر حاوی ہو گئے تھے، اسی طرح ایک دن امام ابن تیمیہ ملک شام اور ملک مصر پر قبضہ جمالیں گے، وہ سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ ہیں، حکومت کو ان سے ہمیشہ خبردار رہنا چاہیے، بہت ممکن ہے کہ آیندہ ان کی قوت اور بڑھ جائے اور وہ اپنے پیرؤوں کو لے کر سلطنت پر غاصبانہ قبضہ کرلیں۔

امیروں کو یہ اچھی طرح محسوس ہو رہا تھا، کہ امام ابن تیمیہ کی طاقت روز بروز بڑھتی جارہی ہے لوگ ان دیکھے ان کے معتقد ہوتے جارہے ہیں اور ان کے پاس فتوے بھیجتے ہیں اور جواب پاتے ہیں۔ تاتاری جنگوں میں ان کا جوش جہاد حد سے بڑھا ہوا تھا اور عوام پر ان کی تقریروں اور تحریروں کا اثر پورے طور پر ظاہر ہو چکا تھا، اگر وہ اپنی خطابت کے زور سے سلطنت کے خلاف بغاوت پھیلانا چاہیں تو بھی وہ پھیلا سکتے ہیں۔

مصر میں امام ابن تیمیہ کے خلاف امیروں کے دل میں اس قسم کے موہوم خیالات پرورش پا رہے تھے اور ادھر امام ابن تیمیہ اور فقراء رفاعیہ کے درمیان چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے اچانک ۹ جمادی الاوالی ۷۰۵ھ کو ایک زبردست مناظرہ پیش آیا، جس کی وجہ سے امام ابن تیمیہ کا نام ملکِ شام و ملکِ مصر کے چپہ چپہ میں روشن ہو گیا، ہم اس مناظرہ کی تفصیل ایک مستقل عنوان کے تحت پیش کرتے ہیں۔

فقراءِ رفاعیہ کے ساتھ مناظرہ

فقراء رفاعیہ شیخ ابوالعباس احمد بن شیخ ابی الحسن علی بن احمد بن یحییٰ بن حازم بن علی بن رفاعہ کی جانب منسوب ہیں، شیخ موصوف اپنے مورث اعلیٰ رفاعہ کی نسبت سے رفاعی کہلائے، شیخ کے والد شیخ ابوالحسن علی شمالی افریقہ سے عراق آکر بسے اور بطائح کے ام عبیدہ نامی ایک قریے میں سکونت اختیار کی، یہاں انہوں نے شیخ منصور بطائحی کی بہن سے شادی کی، جو بطائح کے ایک مشہور صوفی تھے، شیخ احمد شیخ ابوالحسن کے آخری لڑکے تھے، مگر ان کی ولادت اپنے والد کی وفات کے کچھ دن بعد محرم ۵۰۰ھ میں ہوئی، ماموں شیخ منصور نے ان کی پرورش کی اور انہیں تعلیم دلائی، شیخ احمد نے ابوالحسن علی القاری الزاہد سے بھی کئی کتابیں پڑھیں، زہدو عبادت اوراذکارووظائف سے انہیں فطری دلچسپی تھی، اسی لیے اپنے ماموں سے اورادووظائف سیکھے اور اس طرح سلوک کی منزلیں طے کرنی شروع کیں، یہاں تک کہ اس میں بہت جلد کمال حاصل کرلیا۔

کہا جاتا ہے کہ شیخ منصور بطائحی نے اپنی وفات سے چند سال پہلے شیخ احمد رفاعی کو اپنا خلیفہ اور جانشین بنانا چاہا، مگر ان کی بیوی نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ لڑکے کے ہوتے بھانجے کو کیوں ترجیح دی جارہی ہے، شیخ منصور نے جواب دیا کہ اس جانشینی کا اہل صرف شیخ احمد ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن جب بیوی کا زیادہ اصرار ہوا تو شیخ منصور نے ایک امتحان کے ذریعہ دونوں کی قابلیت کا فرق بتایا انہوں نے اپنے لڑکے اور بھانجے دونوں کو حکم دیا کہ جاؤ اور نجیلؔ (ایک قسم کی گھاس) کاٹ لاؤ، لڑکا تو بہت سی کاٹ لے آیا، مگر شیخ احمد رفاعی یونہی واپس آئے۔ جب شیخ منصور نے وجہ دریافت کی تو کہا کہ میں اس گھاس کو کس طرح کاٹ سکتا ہوں، جبکہ وہ خدا کی تسبیح پڑھ رہی ہے۔ [1]

---

[1] قلائد الجواهر، ص: ٨٤۔

خلافت کے ملنے کے بعد شیخ احمد نے روحانی حیثیت سے بہت زیادہ ترقی کی، ان کے متعلق بہت سی کرامتیں بیان کی جاتی ہیں، جن میں سے اکثر گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، شیخ احمد نے اپنے قریے میں ایک زاویہ بنایا تھا، جہاں کے ان کے ارادت مندوں کا ایک بڑا حلقہ ان سے سلوک کی تعلیم حاصل کر رہا تھا، رفاعی فقیر ہر جگہ پھیل گئے، مصر و شام اور ہندوستان میں ان کے نام سے بہت سے حلقے قائم ہو گئے اور دور دور تک ان کی شہرت پھیلتی گئی، شیخ احمد اس زمانے کے دو مشہور شیوخ یعنی شیخ عدی بن مسافر الاموی الھکاری (المتوفی: ۵۵۷ھ) اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (المتوفی: ۵۶۱ھ) کے معاصر تھے، ان تینوں میں اکثر ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، شیخ احمد نے ۱۲ جمادی الاولیٰ ۵۷۸ھ کو جمعرات کے دن وفات پائی اور اپنے قریے ہی میں اپنے زاویہ کے احاطہ میں مدفون ہوئے۔

امام ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور شیخ شمس الدین ذہبی وغیرہ کا متفقہ بیان ہے کہ شیخ احمد ایک صالح بزرگ تھے، ذہبی نے اپنی کتاب العبر میں ان کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی بڑی تعریف کی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے پیرؤوں میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی، یہ لوگ طرح طرح کے کرشمے دکھا کر عوام کو اپنا معتقد بنا لیتے ہیں اور شیطانیت کے کام کرتے رہتے ہیں، خدا ہم سب کو ان کے مکر و فریب سے بچائے۔

امام ابن تیمیہ کے زمانے میں فقراء رفاعیہ کی حالت

شیخ احمد رفاعی کی وفات پر سو سال نہیں گزرے تھے کہ ان کے حلقہ میں بھی دجل و فریب اور مکر و دھوکہ پوری طرح سرایت کر گیا تھا، ان کے پیرؤوں نے اپنے آپ کو ایک مستقل گروہ اور فرقہ بنا لیا تھا، اور دوسروں سے اپنے آپ کو ممتاز کرنے کے لیے سیاہ رنگ کا کپڑا پہننا شروع کر لیا تھا، نیز یہ لوگ اپنے ہاتھوں اور گلوں میں لوہے کی زنجیریں ڈالے رہتے تھے، اور نماز، روزہ اور دیگر شرعی احکام سے غافل اور بے پروا تھے۔

رفاعی فقیروں کی شعبدہ بازیاں

عوام کے دلوں پر اپنی ولایت اور کرامت کا سکہ بٹھانے کے لیے یہ لوگ مختلف قسم کے شعبدے دکھاتے تھے، وہ زندہ سانپوں کو نگل جاتے تھے، دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑتے

تھے، بظاہر ان کے سامنے کوئی چیز نہ ہوتی تھی، مگر جب چاہے خون، زعفران، گلاب، شہد اور شکر وغیرہ لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے، کشف کے ذریعہ امیروں کو مختلف قسم کی بشارتیں سناتے تھے، چنانچہ انہوں نے الملک العادل کتبغا کو جماۃ کا والی ہونے کی خوشخبری دی تھی، امیر ایدمری اور امیر سیف الدین قبچاق منصوری کو بھی اسی قسم کی بشارتیں دی تھیں۔

ایک مرتبہ انہوں نے امیر ایدمری سے کہا کہ وہ رجال غیب سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے اس کو اس کا مشاہدہ کرانے کا بھی وعدہ کیا، کہا جاتا ہے کہ مزہ کی پہاڑیوں پر انہوں نے چند رسیاں باندھ دیں اور چند ایسے لوگوں کو مقرر کیا جو ان رسیوں پر آسانی سے چل سکتے ہوں، جیسے کہ آج کل کے شعبدہ باز ان پر چلتے ہیں، امیر ایدمری اور اس کے رفقاء رات کے وقت پہاڑ کے دامن میں کھڑے تھے، اچانک چند آدمی پہاڑ کی چوٹی پر نمودار ہونے اور پہاڑ کی سطح سے چند قدم اوپر فضا میں چلتے پھرتے دکھائی دیے۔

انہوں نے امیر سیف الدین قبچاق سے کہا کہ مردے ان سے بات چیت کرتے ہیں، اور ایک مرتبہ اس کو اس کا مشاہدہ بھی کروایا۔

فقیروں کے ساتھ انتہائی عقیدت

ان احمدی فقیروں نے امیروں اور عام لوگوں کے دلوں پر اپنی ولایت اور کرامت کا سکہ کچھ ایسا بٹھا دیا تھا کہ یہ لوگ ان کو اللہ کا ولی سمجھنے لگے، امراء عقیدت کی بنا پر ان کو اپنے ساتھ رکھتے تھے اور ان سے برکت چاہتے تھے، اور ان سے منتیں اور مرادیں مانگتے تھے، عام لوگ ان کو نذر و نیاز دیتے تھے، اور ان سے تعویذ لکھا لے جاتے تھے، عورتیں بہت زیادہ ان کی معتقد تھیں اور ان سے تعویذ اور فلیتے مانگ لے جاتی تھیں۔

فقیری میں بادشاہی اسی کا نام ہے، اس عہد کے مسلمانوں کی توہم پرستی کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ کتاب وسنت کے بڑے بڑے عالم بھی ان احمدی فقیروں کے مکرو فریب میں گرفتار تھے، اور ان کے معتقد بن گئے تھے، وہ لوگ جو ان کی حقیقت سے واقف تھے ان کو چھیڑ کر اپنے سر کوئی مصیبت نہیں لینا چاہتے تھے۔

امام ابن تیمیہ کی نصیحت

امام ابن تیمیہ نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ عوام کی اس عقیدت کو مٹانا شروع کیا، انہوں نے بتایا کہ شیخ احمد رفاعی کون تھے، ان کا کیا حال تھا، اور اب ان کے پیرؤوں کا کیا حال ہو گیا ہے اور اب شیخ اور ان کے مریدین و متبعین کے عقائد و خیالات اور اعمال و افعال میں کتنا فرق ہو گیا ہے۔ اور ان میں حق اور باطل کی کتنی آمیزش ہو گئی ہے اور رفاعی فقیروں کے اعمال و افعال شریعت اسلامیہ کے معیار پر کتنا اترتے ہیں، انہوں نے بہت سے رفاعی فقیروں کو بلا کر نصیحت کی، اور بتایا کہ ان کے اعمال و افعال سرتاپا شریعت کے مخالف ہیں، ان کو چاہیے کہ مکر و فریب کا یہ سیاہ پیوند لگا ہوا جامہ اپنے جسم سے اتار دیں اور ہاتھوں کے کڑے اور گلے کی زنجیریں نکال دیں اور عام مسلمانوں کی سی زندگی بسر کریں، بعض صادق اور سچی نیت والے فقیروں نے آپ کی بات مان لی اور رفاعی جامہ اتار کر عام مسلمانوں کا لباس پہن لیا، اور نماز، روزہ کی پابندی بھی کرنی شروع کی۔

ولایت اور کرامات کی آڑ لینا

جن لوگوں کے دل میں کھوٹ تھا انہوں نے اپنی رموز و ارشارات اور ولایت و کرامات کی آڑ لینی شروع کی اور ان کے ذریعے عوام پر اثر ڈال کر امام ابن تیمیہ کا منہ بند کرنا چاہا انہوں نے جب ایک مرتبہ عوام کے سامنے اپنی ولایت اور کرامات کے کرشمے دکھانے چاہے تو امام ابن تیمیہ نے مجمع عام میں ان کے مکر و فریب کا پردہ چاک کرنے کا پکا ارادہ کر لیا، اور جب احمدی فقیروں کو اس کی اطلاع ملی تو وہ دوڑے ہوئے آئے اور امام موصوف سے درخواست کی کہ وہ ان کی مخالفت نہ کریں، امام موصوف نے کہا یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ تم لوگ اپنی ناشائستہ حرکتوں سے باز آؤ اور اپنے افعال بد سے توبہ کرو۔

آگ میں کود پڑنے کے لیے تیار ہو جانا

ایک مرتبہ ایک باغ میں ایک رفاعی فقیر سے امام ابن تیمیہ کی مٹھ بھیڑ ہو گئی، لوگوں کا ایک اچھا خاصہ مجمع بھی وہاں موجود تھا، جب امامِ موصوف نے اس رفاعی فقیر کی مخالفت شروع

کی تو اس نے کہا: آؤ ہم اور تم دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑیں، پس جو بھی اس میں جل جائے گا وہ گمراہ سمجھا جائے گا، امامِ موصوف اس کے لیے تیار ہو گئے، مگر شرط یہ لگائی کہ آگ میں کودنے سے پہلے ہم دونوں گرم پانی سے بدن خوب مل کر نہالیں، رفاعی فقیر اس شرط پر راضی نہ ہوا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نہا لینے سے بدن کی وہ ساری دوائیں ڈھل جائیں گی، جن کی وجہ سے آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

رموز واشارات کے کمالات کا ادعا اور جواب

ایک دوسری صحبت میں بعض رفاعی فقیروں نے دعویٰ کیا کہ ان کے خاص رموز و ارشادات ہیں اور وہ ان کے کمالات دکھانا چاہتے ہیں، امام ابن تیمیہ نے جواب دیا کہ اگر تم دیہاتیوں، کاشتکاروں، ترکوں، نام نہاد فقیہوں، صوفیوں اور عام لوگوں کو اپنے کمالات دکھاؤ تو پھر کوئی بات نہیں ہے، اگر اپنے ساتھ خالص سونا رکھتے ہو تو آؤ، اور بازارِ علم کے نقاد جوہریوں کو دکھاؤ، یہاں کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہو جائے گی۔ رفاعیوں نے کہا کہ یہ تو اسی وقت ہوسکتا ہے، جبکہ آپ ہماری حمایت کریں اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ امام ابن تیمیہ مجمع عام میں ان کی گرفت نہ کریں، وہ بھلا اس شرط کو کب گوارا کر سکتے تھے، انہوں نے کہا میں تمہاری حمایت نہیں، بلکہ شدید مخالفت کروں گا، کیونکہ تم اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کو باطل کرنا چاہتے ہو۔

ایک رفاعی فقیر کا دھوکہ دینا

ایک رفاعی فقیر تھا، جس کا نام عبداللہ تھا، وہ اکثر امام ابن تیمیہ کی خدمت میں آیا کرتا تھا، امام موصوف اس کو نصیحت کیا کرتے تھے، اور روپے پیسے سے بھی اس کی مدد کیا کرتے تھے، ایک دن وہ اپنی ڈاڑھی مونڈھ کر اور اسپر سیاہی مل کر آیا اور کہا کہ فلاں امیر نے میری ڈاڑھی جلادی ہے، امام موصوف نے اس کی باتوں کو سچ سمجھا اور اس سے بڑی ہمدردی ظاہر کی اور کچھ روپوں سے بھی اس کی مدد کی، لیکن جب وہ وہاں سے چلا گیا تو ان کو محسوس ہوا کہ اس نے ان کو محض دھوکہ دیا ہے۔

گلے کی زنجیریں تقریبِ الٰہی کا ذریعہ نہیں ہیں

ایک مرتبہ لوگوں نے امام ابن تیمیہ سے بیان کیا، کہ رفاعی فقیر اپنے مخصوص لباس اور ہاتھوں اور گلے کی زنجیروں کو عبادت وتقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور عام لوگوں کو یہ دھوکہ دیتے پھرتے ہیں کہ ان کا لباس خدا کے اسرار میں سے ایک سر ہے اور یہ اولیاء اللہ کی ایک خاص نشانی ہے، چنانچہ ایک دن رفاعیوں کے شیخ صالح احمد منیبعی اور اس کے پیرو مخصوص لباس پہنے اور گلے میں زنجیریں ڈالے دمشق کی جامع مسجد میں داخل ہوئے تو امام موصوف نے انہیں نصیحت کی اور بتایا کہ کسی مخصوص لباس کو اختیار کر لینا اور اس کو شرعی سمجھنا بدعت اور گمراہی ہے، خدا اور اس کے رسول نے اس کو مشروع نہیں کیا ہے، اور نہ ہی سلف صالحین اور مشائخ مسلمین اس کو مشروع سمجھتے ہیں، اس کو خدا کی بندگی اور قربت کا ذریعہ سمجھنا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ ایسی چیز سے خدا کی عبادت کرنا جس کو خدا نے مشروع نہیں کیا ہے گمراہی ہے۔

ایک لطیف استدلال

لوہے کی زنجیروں کے پہننے کے متعلق بتایا کہ بہت سے علما نے غیر مشروع سمجھ کر پہننے کی صورت میں بھی اس کو مکروہ قرار دیا ہے، کیونکہ حدیث میں ہے، نبی کریم ﷺ نے کسی شخص کو لوہے کی انگوٹھی پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ کیا بات ہے کہ میں تیرے بدن پر دوزخیوں کا زیور دیکھتا ہوں، اگر غیر مشروع سمجھ کر پہننے کی صورت میں اس قدر وعید ہو تو ظاہر ہے کہ مشروع سمجھ کر پہننے کی صورت میں کس قدر وعید کا مستحق نہ ہوگا، نیز یہ بھی فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن دوزخیوں کی گردنوں میں زنجیریں ہوں گی اس لیے ان سے مشابہت پیدا کرنا بہت مکروہ ہے، نیز نبی کریم ﷺ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے خواب میں پاؤں کی بیڑی اور قید کو پسند اور گلے کے طوق کو ناپسند فرمایا ہے، اگر خواب کا یہ حال ہو تو بیداری کی حالت میں اپنے گلے میں طوق کا ڈالے رہنا کس طرح جائز ہوگا۔

امام ابن تیمیہ بہت دیر تک ان رفاعی فقیروں کو نصیحت کرتے رہے اور اس کے بعد فرمایا کہ تنبیہ کرنے کے باوجود بدعتوں پر جمار ہنے والا سزا کا مستحق ہے کیونکہ غیر شرعی امور کو شرعی قرار دے لینا رسول اللہ ﷺ کی پیروی سے منہ موڑنے کے مترادف ہے، اس بات پر تمام

علمائے امت کا اتفاق ہے کہ غیر شرعی اُمور سے خدا کی قربت حاصل نہیں ہوتی اور نہ اُن کو خدا تک پہنچنے کا وسیلہ بنایا جاسکتا ہے اور نہ اُن کا کرنے والا خدا کا دوست یا محبوب ہوسکتا ہے، اس لیے اُن کو اپنا شرعی شعار قرار دینا کسی حالت میں بھی جائز نہیں۔

شریعت اسلامیہ کا اصول

آخر میں ان کو شریعتِ اسلامیہ کا یہ اصول بتایا کہ مباح چیزیں اسی وقت تک مباح رہتی ہیں جب تک کہ وہ مباح سمجھی جاتی ہیں، اور جب وہ مستحب یا واجب قرار دے لی جاتی ہیں، تو وہ غیر مشروع ہوجاتی ہیں، پس غیر مستحب اور غیر واجب چیزوں کو مستحب اور واجب قرار دے لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ غیر حرام چیزوں کو حرام قرار دے لینا، حرام وہی ہے جس کو اللہ نے حرام کیا اور دین وہی ہے جس کو اللہ نے مشروع کیا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان لوگوں کی بڑی مذمت کی ہے جو اللہ کی اجازت کے بغیر حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنالیتے ہیں۔

جب مباح چیزیں مستحب یا واجب قرار نہیں دی جاسکتیں تو ظاہر ہے کہ مکروہ اور حرام چیزیں کس طرح مستحب یا واجب قرار دی جاسکیں گی، اسی لیے اگر کوئی شخص مباح یا مکروہ یا حرام کام کرنے کی نذر کرے تو اس کا پورا کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا، اسی طرح ان میثاقوں کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے جو کسی خاص شیخ کے طریقے کی پابندی میں کیے جاتے ہیں، تاوقتیکہ وہ کتاب وسنت کے موافق نہ ہوں، اگر کوئی شخص اس قسم کا عہد کرے تو اس پر کفارہ واجب ہوگا، عہد کا پورا کرنا واجب نہ ہوگا۔

رفاعی فقیر بڑی بے صبری سے امام ابن تیمیہ کی ناصحانہ تقریر سنتے ہیں، وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ان سے اپنا دامن چھڑا کر بھاگیں، مگر اس وقت وہ ایک ایسے شخص کی گرفت میں تھے جس کی نصیحتوں کو سنے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا، ان لوگوں نے زبان سے تو اقرار کرلیا کہ وہ ان کی نصیحتوں پر عمل کریں گے، لیکن اُن کا دل یہ کہہ رہا تھا کہ عاقبت کی موہوم امیدوں پر دنیاوی مقبولیت کو قربان کردینا کہاں کی دانشمندی ہے۔

اسرائیلی روایات سے استدلال

چنانچہ جب وہ امام ابن تیمیہ کی مجلس سے اٹھے تو اُن کے عقائد وخیالات اور اعمال و

افعال میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا، بلکہ شیخ صالح احمد منیعی نے طنز وتعریض اور غصہ وشکایت سے بھرا ہوا ایک طویل خط لکھا جس میں اپنے مزعومہ عقائد وخیالات کی صحت پر اسرائیلیات اور ضعیف روایات سے استدلال کیا، امام ابن تیمیہ نے لکھ بھیجا کہ ایک مختصر سے خط میں آپ کی تمام باتوں کا جواب نہیں دیا جاسکتا، آؤ ہم سے دوبدو گفتگو کرلو۔

فقراء کی شورش

شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ امام ابن تیمیہ کے ہاتھوں ان احمدی فقیروں کے مکر وفریب کا پردہ چاک ہو، چنانچہ جب ۸ جمادی الاولیٰ ۷۰۵ھ کو جمعہ کے دن چند رفاعی فقیر اپنے ہاتھوں میں کڑے اور گلے میں زنجیریں پہنے ہوئے دمشق کی جامع مسجد میں داخل ہوئے تو امام ابن تیمیہ نے زبردستی ایک فقیر کے گلے سے زنجیر نکال لی، فقراء احمدیہ جو پہلے ہی ان کے خلاف بھرے بیٹھے تھے بہت سے برافروختہ ہوئے اور ہنگامہ کرنے لگے، بعض لڑائی پر کمربستہ ہوکر گروہ در گروہ مسجد میں داخل ہونے اور مجذوبانہ حرکتیں کرنے لگے۔

جمعہ کی نماز کے بعد امام ابن تیمیہ نے رفاعی فقیروں کے شیخ سے کہا کہ وہ آئے اور اُن سے بحث کرکے نزاعی باتوں کے متعلق شریعت اسلامیہ کا جو حکم ثابت ہو اُس کو مانے، مگر وہ اپنے پیرووں کو لے کر مسجد سے نکل گیا، پہلے تو قصر امارت کا رُخ کا، اور پھر کچھ سوچ کر یہ لوگ مسجد شاغوں کی طرف پلٹے، امام موصوف نے اتمام حجت کے لیے اس کے پاس آدمی بھیجا، کہ وہ آئے اور اُن سے مناظرہ کرلے، مگر تمام رفاعی فقیر اپنے سر اور اعضاء کو مختلف طریقوں سے ہلاتے اور بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑے اور نہر بردی میں جاکر لوٹنے لگے۔

ان حرکتوں سے ان کا مقصد یہ تھا کہ عوام یہ سمجھیں کہ ان پر کوئی بڑا ظلم ہوا ہے اور اب دمشق والے ان کی بددعاؤں سے محفوظ نہیں رہ سکتے، بہت سے توہم پرست لوگ کچھ خوفزدہ بھی ہوگئے تھے۔

امیر افرم کا رفاعی شیخ کو بلا بھیجنا

بعض لوگوں نے نائب الشام امیر افرم کو اس واقعہ کی اطلاع دی، اس نے رفاعی شیخ کو طلب کیا اور اس سے حقیقت دریافت کی اس نے جھوٹ اور مبالغے سے کام لے کر واقعہ کچھ

اس طرح بیان کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ درحقیقت ان پر بہت بڑا ظلم ہوا ہے۔

امیر افرم تا تاری اور شیعی لڑائیوں میں امام ابن تیمیہ کے دوش بدوش کام کر چکا تھا، وہ ان کے مزاج سے ایک بڑی حد تک واقف تھا، اس نے رفاعی شیخ سے پوچھا کہ آیا ابن تیمیہ اپنی رائے سے زنجیروں کے ڈالنے سے منع کرتے ہیں یا اللہ اور رسول کا حکم سناتے ہیں، رفاعی شیخ نے جواب دیا وہ اللہ اور رسول کا حکم سناتے ہیں، امیر افرم نے کہا کہ اس صورت میں اُن سے کیا کہہ سکتا ہوں، رفاعی شیخ نے کہا کہ اُن سے کہیے کہ ہمارے چند مخصوص مقامات اور احوال ہیں، اس لیے وہ ہمارے معاملات میں دخل نہ دیں اور ہم کو اپنے طریقے پر چھوڑ دیں، امیر موصوف نے کہا تو پھر ہم اُن کو بھی بلا بھیجیں گے اور سب کے سامنے تم دونوں کا اظہار لیں گے، رفاعی شیخ نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری حمایت کریں، امیر نے جواب دیا، ایسا نہیں ہوسکتا، جس کے ساتھ بھی حق ہوگا ہم اسی کی حمایت کریں گے چاہے وہ تمہارے ساتھ ہو یا ان کے ساتھ، رفاعی شیخ نے پوچھا تو کیا ان کا یہاں آنا ضروری ہے؟ امیر نے کہا: ہاں! اُس نے کئی مرتبہ یہی سوال دُہرایا اور ہر مرتبہ یہی جواب پایا، اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ دونوں کا غائبانہ بیان لے لیا جائے اور امام ابن تیمیہ کا سامنا کرنا نہ پڑے، کیونکہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ جھوٹ سچ کہہ کر امیر افرم کو اپنے مزعومہ عقائد وخیالات کا قائل بنالیں۔

امام ابن تیمیہ کی طلبی

امیر افرم نے رفاعی شیخ سے کہا کل ان باتوں کا فیصلہ ہوگا اور ادھر امام ابن تیمیہ کے پاس ایک قاصد بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ وہ کل دار العدل میں حاضر ہوں تاکہ اس جھگڑے کا فیصلہ کیا جائے۔

امام ابن تیمیہ کا بیان

امام ابن تیمیہ خود لکھتے ہیں:

جب مجھے یہ کیفیت معلوم ہوئی تو میرے دل میں یہ یقین پیدا ہوگیا کہ شاید کوئی عجیب وغریب واقعہ ہونے والا ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے دین کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور ان منافقوں اور بدعتیوں کے حالات کو جو روئے زمین کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں کھولنا

چاہتا ہے، میں نہیں چاہتا تھا کہ ان رفاعی فقیروں پر کسی قسم کی زیادتی ہو، میں ان کو نہایت نرمی سے راہِ راست پر لانا چاہتا تھا، میں نے رفاعی شیخ کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر کل مجھے آنا پڑے تو یقین جان لو کہ اس کا وبال تم ہی پر پڑے گا اور لوگ تم ہی کو اپنی لعن طعن کا نشانہ بنائیں گے کیونکہ جو شخص اہل ایمان کے تیروں کا جواب دینا چاہتا ہے وہ ہمیشہ ذلیل ہوتا ہے۔

چنانچہ ہمارے آدمی نے واپس آ کر اطلاع دی کی رفاعی فقیروں نے آپس میں مشورہ کیا اور اپنے ان شیوخ سے بھی رائے طلب کی جو اسرارِ الٰہی کے عارف سمجھے جاتے تھے، انہوں نے بھی یہی رائے دی کہ شریعتِ محمدیہ کی پیروی کا جو حکم دیا جاتا ہے، ان کو مان لو اور ان تمام بدعات کو ترک کر دو جن کے چھوڑ دینے کا ہم سے مطالبہ کیا جاتا ہے، ان کے ایک مشہور شیخ نے یہاں تک کہا کہ ہماری تمام کرامتیں تاتاریوں کے پاس چل سکتی ہیں محمد بن عبداللہ کی شریعت کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتیں، چنانچہ تمام فقیروں نے اپنی گردنوں سے زنجیریں نکال دیں اور شریعت محمدیہ کی اتباع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

پھر مجھے معلوم ہوا کہ امیر افرام نے اپنے کسی بڑے غلام کو رفاعیوں کے پاس یہ کہلا بھیجا ہے کہ کل ان کو ضرور دار العدل میں حاضر ہونا پڑے گا، اس رات میں نے استخارہ کیا اور خدا سے مدد اور ہدایت چاہی اور میں نے وہ طریقہ اختیار کیا جو ایسے وقتوں میں خدا کے برگزیدہ بندے اختیار کرتے ہیں، چنانچہ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر ضرورت پڑے تو مجھے بھی آگ میں کود جانا چاہیے، کیونکہ وہ آگ ملتِ خلیل کے پیرؤوں پر بھی ضرور ٹھنڈی ہو جائے گی اور ان لوگوں کو جلا کر راکھ بنا دے گی، جو اس راستے سے منہ موڑتے ہیں۔

امام الحنفا حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کے دشمن یعنی صابئوں کے کچھ خاندان بطائح میں اب تک آباد ہیں، ان کے ساتھ بعض نصرانی خاندان بھی رہتے ہیں، ان صابئوں اور مسلمان گمراہ عابدوں اور زاہدوں کے درمیان رشتہ داریاں بھی ہیں جن کو تمام اہل علم جانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرامطہ، باطنیہ، نصیریہ اور اسماعیلیہ شرک اور انکار حق میں صابی فلسفیوں کے ساتھ پوری مشابہت رکھتے ہیں، صابئوں کا ایک بڑا شرک تو یہ تھا کہ وہ انسانوں کے مرتبہ کو بڑھانے میں بہت زیادہ غلو کرتے تھے اور شریعت کی راہ سے الگ ہو کر نئی نئی

عبادتیں ایجاد کرتے تھے، اور اسی شرک کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے اپنے مذاق کے مطابق ہمارے اتحادیوں اور گمراہ عابدوں اور زاہدوں کو ملا ہے۔ [1]

شاگردوں کا ساتھ چلنے کا اصرار

دوسرے دن یعنی سینچر کی صبح کو امام ابن تیمیہ قصر امارت کی طرف روانہ ہوئے وہ اپنے ساتھ کسی کو بھی لے جانا نہیں چاہتے تھے تاکہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ اپنی امداد و اعانت کے لیے اپنے شاگردوں اور معتقدوں کو بھی لے آئے ہیں لیکن جب اپنے ساتھیوں اور شاگردوں کو گفتگو سننے کا بہت زیادہ مشتاق دیکھا تو انہیں بھی ساتھ چلنے کی اجازت دے دی۔

مناظرہ سے بچنے کی کوشش

امیر افرم کے حکم حاضری پر رفاعی فقیر بہت پریشان ہوئے، وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ امام ابن تیمیہ کے برمحل شرعی استدلالات کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا، اس لیے ان فقیروں نے اس مناظرہ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی، وہ ایسے امیروں سے ملے جو اُن کے بے حد معتقد تھے اور اُن سے کہا کہ ہمارے مخصوص مقامات اور احوال ہیں جن کا کوئی ولی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا، ہمارا ایک خاص طریقۂ کار ہے جس کو روئے زمین کا کوئی عالم بھی نہیں جانتا، ہمارا شیخ درحقیقت خلیفۃ المشائخ کا مرتبہ رکھتا ہے، اس کو دُنیا کے تمام لوگوں پر فضیلت حاصل ہے، جو لوگ ہمارے طریقوں کا انکار کرتے ہیں وہ ظاہر پرست ہیں اور وہ سر اور حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے، ہمارا اور اہل ظاہر کا طریقہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے، اس لیے شیخ تقی الدین احمد ابن تیمیہ کو ہمارے طریقہ کار کے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

احقاق حق کے لیے مناظرہ بے حد ضروری ہے

فقرائے احمدیہ کے حمایتی امیروں نے امیر افرام سے گفتگو کی، اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ احقاق حق کے لیے مناظرہ بے حد ضروری ہے، اس نے شہر کے تمام رئیسوں، امیروں، قاضیوں، عالموں، فقیہوں اور کاتبوں وغیرہ کو دعوت دے رکھی تھی، عام لوگ بھی ایک بڑی

---

[1] مجموعة الرسائل و المسائل، رسالہ مناظرۃ ابن تیمیة مع الدجاجلة الرفاعیة، ص: ۱۳۳۔

تعداد میں آئے ہوئے تھے، امیر افرم نے امام ابن تیمیہ کے پاس بھی آدمی بھیجا، اس نے واپس کرآ کرخبر دی کہ امامِ موصوف دارالعدل آنے کی غرض سے گھر سے روانہ ہو چکے ہیں۔

امیر افرم سے گفتگو

جب امام ابن تیمیہ دارالعدل پہنچے تو دیکھا کہ سارا ہال لوگوں سے بھرا ہوا ہے ان کے آتے ہی امیر افرم ان کو اپنی مجلس خاص میں لے گیا اور ان سے وہ تمام شکایتیں بیان کیں جو رفاعی شیخ نے امیر موصوف کے سامنے پیش کی تھیں اور پھر ان سے پوچھا کہ آیا انہوں نے فقرائے احمدیہ کو آگ میں کود پڑنے یا آگ سے دہکتی ہوئی زنجیروں کو اپنے گلے میں پہننے کا حکم دیا ہے، امام موصوف نے جواب دیا کہ یہ اُن پر ایک بڑی تہمت ہے انہوں نے کسی سے بھی اس قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی وہ اس کو جائز سمجھتے ہیں کہ کوئی کسی سے آگ میں کود پڑنے کا مطالبہ کرے، یہ لوگ بدعتی اور جھوٹے ہیں اور ہمیشہ جھوٹ بولتے رہتے ہیں انہوں نے مسلمانوں کے دین اور دنیا کو اتنا بگاڑ دیا ہے کہ اس کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ امام موصوف نے فقرائے احمدیہ کی وہ تمام ترکیبیں بتائیں جن کے ذریعہ وہ عوام پر اثر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور نیز امیر ایدیمری، قبچاق اور کتبغا کے وہ تمام واقعات سنائے جن کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے اس کے بعد امامِ موصوف نے کہا کہ یہ رفاعی فقیر انواع و اقسام کی بدعتوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہیں، یہ لوگ اپنی گردنوں میں لوہے کی زنجیریں ڈالے رہتے ہیں اور ان کو ایک عبادت تصور کرتے ہیں، حالانکہ ایسا کرنا شریعت کی رو سے بالکل ناجائز ہے ہم نے ان کو انہی بدعتوں سے منع کیا تھا، اور انہیں احکامِ شریعت کی پابندی کرنے کی ہدایت کی تھی، پھر بدعتوں کے خراب ہونے کے متعلق مختلف حدیثیں سنائیں اور کہا کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کے مخصوص مقامات اور احوال ہیں جن کی برکت سے وہ دہکتی ہوئی آگ میں کود سکتے ہیں اور اہلِ شریعت ظاہر اس پر قدرت نہیں رکھتے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اہل طریقت کی چند خاص کرامات ہیں جن کو اہل شریعت پیش نہیں کر سکتے اور اہل شریعت کو اہل طریقت کے خلاف اعتراض کرنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے، چاہے اہل طریقت کے طریقے شریعت محمدیہ ﷺ کے کھلے نصوص کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔

امام ابن تیمیہ نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے خدا سے استخارہ کیا ہے اور یہ طے کیا ہے کہ اگر یہ لوگ آگ میں کود پڑیں تو وہ بھی آگ میں کود پڑیں، دونوں میں سے جو بھی جل جائے اس پر خدا کی لعنت ہے اور وہ مغلوب سمجھا جائے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ فریقین سرکہ اور گرم پانی سے خوب بدن مل کر نہا لیں، اس پر امیر افرم نے وجہ دریافت کی تو جواب دیا یہ لوگ مینڈک کی چربی، نارنج کے اندرونی چھلکے اور طلق [1] کے پتھر وغیرہ پیس کر اپنے بدن پر مل لیتے ہیں' جس کی وجہ سے ان پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ تو اپنے بدن پر اس قسم کی کوئی چیز نہیں ملتے اگر دونوں گرم پانی سے غسل کر لیں تو اس وقت ان کا سارا مکر و فریب کھل جائے گا اور حق بات واضح ہو جائے گی۔

امیر افرم کا اظہار تعجب

امیر افرم نے تعجب کے طور پر پوچھا کہ اگر غسل کر لینے کے بعد بھی آپ سے آگ میں کود پڑنے کے لیے کہا جائے تو کیا آپ آگ میں کود پڑیں گے، امام ابن تیمیہ نے جواب دیا، ہاں! میں نے خدا سے استخارہ کیا ہے اور میرے دل میں یہ بات ڈال دی گئی ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو میں بھی آگ میں کود پڑوں، اگر ایسا کروں گا تو بھی یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی، کیونکہ نبی کریم ﷺ کے سچے جانشینوں سے بارہا اس قسم کے خوارقِ عادات کا ظہور ہو چکا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہتا ہے جب یہ لوگ اپنی رموز و اشارات اور خوارق عادات سے اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کو باطل کرنا چاہتے ہیں تو ہم پر فرض ہے کہ اس کی حمایت میں اپنی جان و مال کی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں، خدا ہم کو ضرور ایسی نشانیاں عطا فرمائے گا، جس سے ہم ان کے خوارق عادات کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔

حضرت موسیٰ کے واقعہ سے استدلال

اس کے بعد امام ابن تیمیہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے واقعہ سے استدلال کیا کہ جب جادوگروں نے جادو کے زور سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو ید بیضا اور عصا کے دو زبردست معجزے عطا کیے، اس پر امیر افرم بہت خوش ہو گیا،

---

[1] یہ ایک قسم کا سفید اور چمکدار پتھر ہے (بحر الجواہر)

گویا فقرائے رفاعیہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ کوئی شخص بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، امیر موصوف نے حاج بہادر منصوری (المتوفی: ۷۱۰ھ) اور اس مجلس کے بعض امیروں سے ترکی زبان میں گفتگو کی جس کو امام موصوف سمجھ نہیں سکے، امام موصوف لکھتے ہیں کہ شاید امیر موصوف نے ان سے یہ کہا تھا کہ آج تم ایک زبردست مقابلہ دیکھو گے۔

صلح کی درخواست اور جواب

فقرائے رفاعیہ کے شیوخ نے آگے بڑھ کر امیر افرم سے صلح کی درخواست کی اور کہا کہ بہتر ہے کہ اس معاملے کو یہیں ختم کر دیا جائے، امیر موصوف نے جواب دیا کہ صلح حق کے ظہور کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔

مجلس عام

اس کے بعد تمام امیر مجلس خاص سے مجلس عام میں چلے آئے، راستے میں امیر افرم اور حاج بہادر منصوری کے درمیان مصر کے ایوب الحمال اور دوسرے گمراہ عابدوں اور زاہدوں اور صوفیوں کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ ان دونوں کی گفتگو سے ایسا پتہ چل رہا تھا کہ حاج بہادر منصوری کے دل میں ان گمراہوں کی بڑی عزت اور وقعت ہے۔

حاج بہادر مصر کا بہت بڑا امیر تھا اور حال ہی میں دمشق کا حاجب ہو کر آیا تھا، امیر افرم اس کی بہت عزت کرتا تھا، چونکہ وہ فقرائے رفاعیہ کا زبردست حامی تھا اس لیے اس معاملے میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا، امیر افرم اس کو ساتھ لے کر مجلس عام میں آیا، عام لوگ قصرِ امارت میں پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے، تمام رئیس اور امیر، قاضی اور فقیہ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے، فقرائے رفاعیہ بھی حاضر ہوئے اُن میں وہ رفاعی فقیر عبداللہ بھی تھا، جو ایک مرتبہ امام ابن تیمیہ کو دھوکہ دے کر تیس درہم مانگ کر لے گیا تھا، امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ مجھ پر مکاروں کا فریب کبھی پوشیدہ نہیں رہتا تھا، مگر جب عبداللہ نے یہ کہا کہ وہ ایک ستم رسیدہ شخص ہے اور حماۃ کے والی نے اس کی ڈاڑھی جلا دی ہے، تو میں بھی دھوکہ کھا گیا، جب وہ واپس ہوا تو مجھے خیال ہوا کہ اس نے درحقیقت مجھ کو دھوکہ دیا ہے اور اپنی گالوں پر سیاہ روغن مل لیا ہے، لیکن خدا نے اس کا بدلہ بھی بہت اچھا دیا، میرے ہی ذریعے اس منظر عام میں اس کو شرمندہ

اور رسوا کیا۔ [1]

صلح کی درخواست

سب سے پہلے ایک رفاعی شیخ حاتم نے آگے بڑھ کر صلح کی درخواست کی اور کہا کہ ہم سے جو برائیاں سرزد ہو چکی ہیں ان کی معافی مانگتے ہیں اور ہم آیندہ کے لیے ان سے توبہ کرتے ہیں اور یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہم ان زنجیروں کو نکال دیں گے جن کے نکالنے کا ہم سے مطالبہ کیا جاتا ہے اور تمام بدعتوں کو چھوڑ کر شریعتِ محمدیہ کی اتباع اور اس کی پابندی کریں گے۔ امام ابن تیمیہ نے فرمایا: توبہ تو یہ مقبول ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ﴾ [2]

''گناہوں کا بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا، سخت سزا دینے والا۔''

یہ بھی فرمایا:

﴿نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ۝﴾ [3]

''میرے بندوں کو سنا دے کہ میں ہوں بخشنے والا رحم کرنے والا اور یہ کہ میرا عذاب وہی بڑا دردناک عذاب ہے۔''

اسرائیلی روایت سے استدلال

امام ابن تیمیہ یہیں تک کہنے پائے تھے کہ وہ رفاعی شیخ جس نے امیر افرم سے ان کی شکایت کی تھی، اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور زنجیروں کے پہننے کے جواز میں وہب بن منبہ کی وہ اسرائیلی روایت پیش کی جس میں بنی اسرائیل کے ایک عابد و زاہد کا واقعہ مذکور ہے اور جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی گردن میں لوہے کی زنجیر ڈالے رہتا تھا۔

امام ابن تیمیہ نے فرمایا: ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ ان اسرائیلی مراسم میں سے کسی کو جو ہماری شریعت کے مخالف ہیں اپنی عبادت کا ذریعہ بنائیں۔ امام احمد نے

---

[1] مجموعة الرسائل والمسائل، ص: ۱۳۵۔ ۱۳۹۔

[2] ۴۰/المومن:۳۔ [3] ۴۰/المومن:۴۹، ۵۰۔

اپنی مسند میں جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تورات کا کوئی صحیفہ دیکھا تو فرمایا: اے ابن الخطاب! کیا تم لوگوں کو تردد اور اضطراب میں ڈالنا چاہتے ہو۔ میں تو ایک پاکیزہ اور چمکدار شریعت تمہارے پاس لایا ہوں۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے، اور تم لوگ مجھ کو چھوڑ کر ان کی پیروی کرتے تو تم ضرور گمراہ ہو جاتے۔

پھر فرمایا: ابوداؤد کی ایک مرسل روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے کسی ساتھی کے ہاتھ میں اہل کتاب کی کوئی مذہبی کتاب دیکھی تو فرمایا کسی قوم کی گمراہی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے نبی ﷺ پر اتری ہوئی کتاب کو چھوڑ کر دوسرے انبیاء پر اتری ہوئی کتابوں کی اتباع کرے، حالانکہ اللہ تعالیٰ صاف طور پر بتا چکا ہے۔

﴿ اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ط ﴾ 1

''کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر ایسی کتاب اتاری جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔''

اس لیے ہمیں جائز نہیں ہے کہ ان باتوں میں جو ہماری شریعت کی مخالف ہیں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے طریقوں کی اتباع کریں جن کے متعلق ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ طریقے ان پر خدا کی طرف سے اترے ہوئے ہیں، ہم کو تو اسی شریعت کی اتباع کرنی چاہیے جو ہمارے نبی پر اتاری گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ط لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ط ﴾ 2

''پس ان کے درمیان اس چیز سے فیصلہ کرو جس کو اللہ نے اتارا ہے اور تیرے پاس جو حق آ چکا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو، ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور منہاج مقرر کر دیا ہے۔''

اگر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی ہی ناجائز ہو تو بنی اسرائیل کے عابدوں کی پیروی کیونکر جائز ہو گی اور وہ بھی ایک ایسی حکایت کے متعلق جس کی صحت ہمیں معلوم نہیں

---

1 ۲۹/العنکبوت: ۵۱۔ 2 ۵/المائدۃ: ۴۸۔

ہے۔اور ہم کو بنی اسرائیل کے عابدوں سے کیا تعلق؟

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾﴾ [1]

''وہ ایک امت تھی جو گزر گئی،اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کمایا اور تمہارے لیے وہ ہے جو تم نے کمایا اور تم سے اس کے متعلق کہ وہ کیا کرتے تھے کچھ پوچھ نہ ہوگی۔''

اگر تمہارے پاس قرآن مجید اور احادیث صحیح سے کوئی ثبوت ہو تو پیش کرو۔

شافعیوں کی آڑ لینا

امام ابن تیمیہ نے یہ تقریر کچھ ایسے موثر انداز میں کی کہ رفاعی شیخ گھبرا گیا،اس نے اپنے ہم مذہب شافعیوں کی آڑ لینے کی کوشش کی،اس نے امیر فرم سے کہا: ہم شافعی ہیں اور ہماری درخواست ہے کہ آپ شافعی علما کو جمع کر کے ان سے فتویٰ لیں۔امام ابن تیمیہ نے فوراً جواب دیا کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے مسلمان عالموں میں سے کوئی بھی اس کو جائز نہیں قرار دیتا، بلکہ ہر مسلک کا عالم دوسرے انبیاء کے زمانہ کی خلاف شریعت عبادتوں کو بدعت کہتا ہے اور اس سے منع کرتا ہے، یہاں شافعیوں کے مفتی شیخ کمال الدین ابن الزملکانی بیٹھے ہوئے ہیں،امام موصوف نے ان کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا: اے کمال الدین اس بارے میں تم کیا کہتے ہو،انہوں نے جواب دیا کہ یہ بدعت ہے یہ غیر مستحب ہی نہیں بلکہ مکروہ بھی ہے۔

جواز کا فتویٰ پیش کرنا

اس موقع پر کسی رفاعی فقیر نے ایک فتویٰ پیش کیا جس میں بعض علما نے زنجیروں کو گلے میں ڈالے رہنے کے متعلق جواز کا فتویٰ دیا تھا۔امام ابن تیمیہ نے کہا کہ شریعت محمدیہ کے کھلے ہوئے نصوص کے سامنے کسی کا فتویٰ کوئی سند نہیں رکھتا اور کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کتاب وسنت سے باہر اپنا قدم نکالے۔

اہل ظاہر باطنی احوال سمجھ نہیں سکتے

اس پر رفاعی شیخ نے چلا کر کہا کہ ہمارے چند باطنی امور اور احوال ہیں جن کو اہل نظر کبھی

---

[1] ٢/البقرة: ١٣٤۔

سمجھ نہیں سکتے، اس لیے ان کے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، امام ابن تیمیہ نے غضبناک ہو کر کہا کہ ظاہر و باطن، شریعت و طریقت، حقیقت و مجاز سب کچھ اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اور کسی کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کتاب وسنت سے روگردانی کرے، عام اس سے کہ وہ مشائخ ہوں یا فقراء بادشاہوں یا امراء عالم ہوں یا قاضی بلکہ دنیا کی ساری مخلوق پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت واجب ہے۔

امام ابن تیمیہ کا چیلنج

رفاعی شیخ نے کہا کہ ہماری چند خصوصیات ہیں جو کسی اور کو نصیب نہیں ہیں، ان کی بنا پر ہم کو اپنے حال ہی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ کہہ کر اس نے آگ کی کرامتیں وغیرہ گنانی شروع کیں امام ابن تیمیہ نے نہایت ہی غضبناک ہو کر بلند آواز سے کہا: میں پورب سے لے کر پچھم تک کے ہر ایک احمدی فقیر کو چیلنج دیتا ہوں کہ وہ آگ کے اندر جو بھی کر دکھائے گا۔ میں بھی ویسا ہی کروں گا ہم میں سے جو بھی جل جائے اس پر خدا کی لعنت ہے اور وہ مغلوب سمجھا جائے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم دونوں سرکہ اور گرم پانی سے خوب بدن مل کر نہالیں۔ لوگوں کے سوال کرنے پر امام موصوف نے جواب دیا کہ یہ لوگ مینڈک کی چربی، نارنج کے اندرونی چھلکے اور طلق کے پتھر وغیرہ پیس کر اپنے بدن پر مل لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اس پر رفاعی شیخ نے کہا اچھا آؤ ہم اور تم اپنے بدن پر گندھک لیپ کر اور اپنی جسم کو ٹاٹ میں لپیٹ کر آگ میں کود پڑیں، امام ابن تیمیہ نے کہا اچھا یہی سہی۔ انہوں نے رفاعی شیخ کو جھنجھوڑ کر اس کی جگہ سے اٹھایا اس نے مجبوراً اپنا کرتہ نکالا، امام ابن تیمیہ نے کہا: یوں نہیں پہلے گرم پانی سے اچھی طرح نہالو، رفاعی شیخ نے کہا ارے کوئی ہے جو لکڑیوں کا گٹھا لے آئے۔ امام ابن تیمیہ نے کہا یہ سب بے فائدہ ہے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ آزمائش کے لیے چراغ کی ایک چھوٹی سی بتی کافی ہے۔ چلو ہم اور تم اپنی انگلیوں کو چراغ کے شعلے میں رکھ دیں۔ جس کسی کی انگلی جل جائے وہ مغلوب ہوگا اور اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ اس فوری گرفت پر رفاعی شیخ بہت پریشان ہو گیا، لوگوں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ خوف کے مارے پیلا پڑ گیا ہے۔

کرامتیں خلاف شرع دعووں پر دلیل نہیں

امام ابن تیمیہ نے کہا کہ اگر غسل کر لینے کے بعد بھی تم آگ میں جا کر صحیح وتندرست نکل آؤ یا ہوا میں اڑنے لگو یا پانی پر چلنے لگو یا جس قسم کی بھی چاہو کرامت دکھادو، تمہارے خلاف شرع دعووں پر کوئی دلیل نہیں ہوسکتی اور ان کی وجہ سے تم شریعت محمدیہ کو باطل نہیں کر سکتے کیونکہ دجال کے متعلق صحیح حدیثوں میں آتا ہے کہ وہ آسمان سے کہے گا پانی برسا تو وہ پانی برسانے لگے گا، زمین کو حکم دے گا، پودے اُگا، تو وہ پودے اگائے گا، ویرانوں سے کہے گا خزانوں کو اُگل دو تو وہ خزانے اگل دیں گے، آدمی کو قتل کرے گا اور پھر اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہے گا کہ اُٹھ تو وہ زندہ ہو کر کھڑا ہو جائے گا، اس کے باوجود وہ دجال ہے، جھوٹا ہے، ملعون ہے اور اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ ابو یزید بسطامی کہتے ہیں کہ اگر تم کسی آدمی کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھو یا اس کو پانی پر چلتا ہوا پاؤ تو اس سے ہرگز دھوکہ نہ کھانا، تاوقت یہ کہ تم یہ نہ جان لو کہ وہ اوامر ونواہی کا کس حد تک پابند ہے۔

یونس بن عبدالاعلیٰ نے ایک مرتبہ امام شافعی سے کہا: تم جانتے ہو کہ ہمارے ساتھی لیث بن سعد نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا ہے کہ اگر تم کسی نفس پرست کو پانی پر چلتا ہوا دیکھو تو اس سے دھوکہ نہ کھانا، امام شافعی نے فرمایا: لیث بن سعد نے درحقیقت کمی کی، اگر تم کسی شہوت پرست کو ہوا میں بھی اڑتا ہوا دیکھو تو ہرگز اس سے دھوکہ نہ کھانا۔

صلح کی درخواست اور آگ کی کرامتوں کے دکھانے کا اصرار

امام ابن تیمیہ کی اس پُرزور تردید کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفاعی شیوخ نے امیر افرم سے صلح کی درخواست کی، ادھر امام موصوف کا یہ حال تھا وہ نہایت ہی جوش کے ساتھ فقراء احمدیہ سے آگ کی کرامتیں دکھانے کا مطالبہ کرتے جارہے تھے۔ عام لوگ فقیروں پر طرح طرح کی پھبتیاں کسنے لگے کسی نے تو برمحل یہ آیت ہی پڑھ ڈالی۔

﴿ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١١٨﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا

صٰغِرِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ [1]

''پس حق ثابت ہوگیا اور وہ جو کچھ کرتے تھے باطل ہوگیا اور وہ اس وقت مغلوب ہوگئے اور ذلیل ہوکر لوٹے۔''

کتاب وسنت کی اتباع کا اقرار لینا

جب رئیسوں، امیروں، عالموں اور عام لوگوں پر ان احمدی فقیروں کے مکروفریب کا پردہ چاک ہوگیا تو امیر افرم اور حاج بہادر منصوری نے آپس میں کچھ باتیں کیں اور اس کے بعد امیر افرم نے امام ابن تیمیہ سے مخاطب ہوکر پوچھا کہ اب تو یہ لوگ اپنے بلند بانگ دعووں کو ثابت کرنے سے عاجز ہوگئے تو اب ان سے کس چیز کا مطالبہ کیا جائے؟ امام موصوف نے جواب دیا کہ یہ لوگ اس بات کا اقرار کریں کہ وہ آیندہ کتاب وسنت کی ٹھیک ٹھیک اتباع کریں گے اور اپنے مشائخ کی روشنی ہدایت کو چھوڑ کر شریعت محمدیہ کو اپنی مشعل راہ بنائیں گے، ان کو اچھی طرح یہ بتا دیا جائے کہ آیندہ جو کوئی بھی کتاب وسنت سے روگردانی کرے گا وہ سزا کا مستحق سمجھا جائے گا۔

رفاعی شیوخ نے کہا کہ ہم کتاب وسنت کی پیروی کو اپنے اوپر لازم کرتے ہیں، کیا تم کو ہماری زنجیروں کے علاوہ جن کو تو ہم ابھی اپنی گردنوں سے نکالے دیتے ہیں۔ ہماری کسی اور چیز پر اعتراض ہے؟ امام ابن تیمیہ نے کہا زنجیروں ہی کی کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ کتاب وسنت کے عام احکام کی پیروی کی جائے، امیر افرم نے پوچھا کتاب وسنت کے کن احکام کی پیروی لازم ہے، امام موصوف نے جواب دیا کہ کتاب وسنت کے اتنے احکام ہیں کہ اس مختصر سی مجلس میں ان سب کا بیان کرنا بہت دشوار ہے۔ بس اتنا سمجھ لیا جائے کہ کتاب وسنت کے واجبی احکام کی پیروی کو اپنے اوپر لازم کیا جائے اور جو شخص بھی ان میں سے کسی ایک کا انکار کرے، اس کی گردن اڑا دی جائے۔

شرکیہ اوراد ووظائف

اس کے بعد امام ابن تیمیہ نے کہا کہ یہ لوگ نماز میں چیختے چلاتے اور باتیں کرتے رہتے

---

[1] ۷/الاعراف:۱۱۸۔۱۱۹۔

ہیں ابھی کل ہی کا ذکر ہے کہ ایک رفائی فقیر جمعہ کی نماز میں یَاسَیِّدِیْ اَحْمَدْ شَیْئاً لِلّٰہِ (اے میرے آقا! احمد خدا کے لیے کچھ دو) کا وظیفہ پڑھتا رہا۔ قطع نظر اس سے کہ وظیفہ نماز کو باطل کرتا ہے یہ شرک اور کفر بھی ہے، کیونکہ خدائے تعالیٰ نے ہم کو صرف اسی ایک ذات واحد کی عبادت کرنے اور صرف اسی سے مدد چاہنے کا حکم دیا ہے اس لیے ہر نمازی اپنی نماز میں:

﴿ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝ ﴾ [1]

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

کا عہد کرتا ہے۔ سید احمد کو اپنی مدد کے لیے پکارنا صراحۃً اس دعا کے خلاف ہے اسی طرح بعض فقیر اَنَا عَلٰی بَطْنِ اِمْرَاَۃِ الْاِمَامِ (میں امام کی عورت کے پیٹ پر ہوں) جیسے خبیث اقوال کا ورد کرتے رہتے ہیں۔

برے اقوال و افعال اضطراری ہیں

اس پر ایک رفائی فقیر نے کہا کہ یہ اقوال و افعال ہم سے اضطراراً سرزد ہوتے ہیں ہم پر حال اور وجد طاری ہو جاتا ہے ان کا روکنا ہمارے اختیار سے باہر ہے، اسی طرح جس طرح چھینک کا روکنا ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا، اور یہ حال اور وجد بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے، امام ابن تیمیہ نے کہا چھینک تو یہ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ مگر یہ اقوال و افعال خبیثہ شیطان کی طرف سے ہیں، خدا اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے کرنے سے منع کرتا ہے۔ اور وہ جن چیزوں سے ہم کو منع کریں وہ کبھی محبوب نہیں ہو سکتیں، امام موصوف نے یہ بھی کہا کہ آسمان و زمین کے اندر جتنی باتیں ہوتی ہیں وہ سب خدا ہی کی مشیت اور اس کے ارادے سے ہوتی ہے، مگر کوئی شخص بھی اس کو جائز نہیں بتاتا۔

وجد اور حال کیوں کر روکا جاسکتا ہے

اس رفائی شیخ نے پوچھا کہ اس اضطراری وجد اور حال کو کیونکر روکا جا سکتا ہے، امام ابن تیمیہ نے فوراً جواب دیا، شرعی کوڑوں سے۔ امیر افرم نے ہنس کر کہا خوب! شرعی کوڑوں سے! امام موصوف نے کہا: اگر شرعی کوڑوں سے کام نہ چلے تو محمدی تلواروں سے۔ یہ کہہ کر امام

---

[1] ١/الفاتحۃ: ٥۔

موصوف نے امیر موصوف کے ہاتھ سے تلوار لے لی اور اس کو اوپر بلند کر کے کہا یہ شخص (امیر افرم کی طرف اشارہ کر کے) رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا نائب اور ان کا ایک ادنیٰ غلام ہے، اور یہ رسول اللہ کی تلوار ہے، پس جو بھی کتاب وسنت سے روگردانی کرے گا ہم اس کو اسی تلوار سے فنا کے گھاٹ اتار دیں گے۔

رفاعی فقیر کا طنز

اس پر کسی رفاعی فقیر نے طنز کے طور پر کہا، کیا خوب! یہود اور نصاریٰ اسلام کا اقرار کرتے ہیں اور ہم اس کا اقرار نہیں کرتے جس کی وجہ سے ہم پر تلوار چلائی جائے گی۔ امام ابن تیمیہ نے جواب دیا، یہود و نصاریٰ جزیہ دیتے ہیں اور اپنے مذہب کو ظاہر نہیں کرتے، مگر بدعتی اپنے مذہب کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، دارالسلام میں تین ہی طرح کے فرقے ہو سکتے ہیں، مسلمان یا ذمی یا مشرک و مرتد و زندیق، ان تین فرقوں کے علاوہ کوئی چوتھا فرقہ ہو ہی نہیں سکتا، پہلے دو فرقے تو از روئے شریعت محفوظ اور مامون ہیں، تیسرے فرقے کے لیے سوائے اس کے کہ وہ قتل کر دیے جائیں کوئی اور گنجائش نہیں ہے۔

بدعت کی سرحد کفر اور شرک سے مل جاتی ہے

اس کے بعد امام ابن تیمیہ نے یہ ثابت کیا کہ بدعت کی سرحد کفر اور شرک سے مل جاتی ہے اور وہ کبیرہ گناہوں سے بدتر ہوتی ہے۔ رفاعی شیخ نے کہا بدعت بھی ایک ایسا فعل ہے جس سے قتل لازم نہیں آتا، بلکہ اس کا کرنے والا صرف جسمانی سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اور دلیل کے طور پر ایک موضوع حدیث سنائی۔ امام ابن تیمیہ نے اس کی تردید کی اور کہا کہ بدعت معصیت سے بھی بدتر ہے اور امام سفیان ثوری کے قول کا حوالہ دے کر کہا کہ ابلیس کو معصیت سے زیادہ بدعت محبوب ہے کیونکہ انسان معصیت سے تو کبھی نہ کبھی توبہ کر لیتا ہے مگر بدعت کو ایک شرعی فعل سمجھ کر اس سے کبھی توبہ نہیں کرتا، بلکہ اس کو ثواب کا کام سمجھنے لگتا ہے۔

رفاعی فقیروں کے توبہ کرانے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے

کسی رفاعی فقیر نے کہا: ہم تو لوگوں سے توبہ کرواتے ہیں، امام ابن تیمیہ نے پوچھا:

کس سے توبہ کرواتے ہیں؟ رفاعی فقیر نے جواب دیا: چوری اور رہ زنی سے، امام موصوف نے کہا کہ لوگوں کی حالت تمہاری توبہ کروانے سے پہلے بہت زیادہ اچھی ہوتی ہے بہ نسبت اس حالت کے جو تمہارے توبہ کروانے کے بعد ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ توبہ کرنے سے پہلے فاسق و فاجر تھے اور وہ اپنے کاموں کو خود ہی حرام سمجھتے تھے، اور خدا کی رحمت کے امیدوار ہوتے تھے اور کبھی کبھی توبہ بھی کر لیتے تھے یا کم از کم ان کی نیت توبہ کر لینے کی ہوتی تھی ،مگر تمہارے توبہ کروانے کے بعد تو وہ اپنی ذات کو تمام گناہوں سے پاک اور صاف سمجھنے لگتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ شیخ احمد رفاعی کی برکت سے وہ تمام گناہوں کے کرنے کے مجاز ہو گئے ہیں اور پھر مرتے دم تک انہیں توبہ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

معصیت اور بدعت کا فرق

اس کے بعد ابن تیمیہ نے امیر افرم کی طرف خطاب کر کے کہا اب ہم آپ حضرات کے سامنے معصیت اور بدعت کا فرق واضح کر دینا چاہتے ہیں اور یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ معصیت کے برخلاف بدعت قتل کی مستوجب ہوتی ہے چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص تھا جس کا نام حمار تھا، وہ اپنی ظرافت اور خوش طبعی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسایا کرتا تھا، لیکن وہ اکثر شراب پیا کرتا تھا، اس جرم میں اس کو کئی مرتبہ سزا ملی، جب وہ گرفتار ہو کر آیا تو کسی صاحب نے کہا: اس پر خدا کی لعنت ہو کتنی مرتبہ گرفتار ہو کر آتا ہے اور سزا پاتا ہے پھر بھی شراب نہیں چھوڑتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس پر لعنت مت بھیجو، وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔'' [1] اس سے صاف ثابت ہوتا کہ گناہگار مسلمان لعنت کا بھی مستحق نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ قتل کا مستوجب قرار پائے۔

اب ایک دوسری حدیث بھی سنیے، صحیحین میں حضرت علی اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے ایک شخص آیا جس کی پیشانی اٹھی ہوئی تھی، ڈاڑھی گنجان تھی، سر گھٹا ہوا تھا، اور اس کے دونوں ابروؤں کے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب ما یکرہ من لعن شارب الخمر......، ح: ٦٧٨٠۔

درمیان سجدوں کا نشان تھا، اس نے مال غنیمت کی تقسیم کے متعلق اعتراض کیا، آپ نے فرمایا: ''عنقریب اس شخص کی نسل سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جس کی نمازوں، قراتوں اور روزوں کے سامنے تم اپنی نمازوں، قراتوں اور روزوں کو ہیچ خیال کرو گے، وہ قرآن مجید پڑھے گی، مگر اس کا اثر اس کے حلق سے آگے نہ جائے گا۔ وہ اسلام سے اسی طرح نکل جائے گی جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے، اگر میں اس کو پاؤں تو قوم عاد کی طرح اس کو قتل کر دوں۔'' [1]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ اگر وہ لوگ جو اس قوم سے جنگ کریں گے۔ یہ جان لیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان کے لیے کیا بدلہ مقرر کیا گیا ہے تو وہ عمل کرنا ہی چھوڑ دیں۔ [2]

اور تیسری روایت میں ہے کہ آسمان کے گنبد کے نیچے سب سے برا قتل انہی کا ہے اور بہتر قتل ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اس قوم کو قتل کیا۔ [3]

اب دیکھیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی کثرت عبادت اور ان کے زہد و اتقا کے باوجود ان کو قتل کر دینے کی تاکید کی، حضرت علی اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور کے اس حکم پر عمل بھی کیا اس وجہ سے کہ یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کی حدود سے تجاوز کر گئے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ بندے کو شرک کے سوا دوسرے تمام گناہوں میں مبتلا ہو جانا زیادہ بہتر ہے اس سے کہ وہ کسی بدعت میں مبتلا ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ بدعتی، زنا کار، ڈاکو، اور شرابی سے زیادہ برے ہوتے ہیں۔

رفاعیوں کی شان میں گستاخی نہ کیجئے

اس پر رفاعی شیخ نے کہا: مولانا! رفاعیوں کی شان میں گستاخی نہ کیجئے، امام ابن تیمیہ نے بہت ہی برہم ہو کر کہا ''خاموش! شان و شوکت کی بات کرتے ہو! اللہ جل شانہ، کی شان زیادہ بڑی ہے جس کی تم لوگوں نے مخالفت کی، تم لوگ اللہ اور اس کے رسول کے دین کو باطل کرنا چاہتے ہو، رفاعی شیخ نے کہا تو پھر مولانا اس گستاخی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فقراء اپنے دلوں کی آگ سے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا﴾ ح: ۳۳٤٤۔ [2] سنن ابی داود، کتاب السنة، باب فی قتال الخوارج، ح: ٤٧٦٨۔
[3] سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فی ذکر الخوارج، ح: ١٧٦۔

تم کو جلا کر رکھ دیں گے، امام موصوف نے جواب دیا، جی ہاں، اسی طرح جس طرح رافضیوں نے مجھ کو جلا کر رکھ دیا تھا میں نے جس وقت ان سے لڑائی کی لوگوں نے مجھے خوف دلایا اور کہا کہ ان کے نزدیک خدا کے اسرار ہیں جن سے کام لے کر وہ ہم سب کو تباہ برباد کر دیں گے، مگر ان کے اس زعم باطل کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو جبل کسروان کی لڑائی میں کامیابی دی، جس کو یہ تمام لوگ اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اس کے بعد امام موصوف نے بہت ہی تیز اور تند ہو کر کہا: اے جھوٹو! اور اے رفض کے حامیو! میں تمہاری ایک ایک کرامت کا منکر ہوں۔

﴿فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ ۝﴾ [1]

''پس تم سب مل کر میرے ساتھ مکر کرو پھر مجھے مہلت نہ دو۔''

شبہات کا ازالہ

جب تمام فقرائے رفاعیہ عاجز ہو گئے تو انہوں نے پھر صلح کی درخواست کی، امام ابن تیمیہ نے ان کے دلوں میں جو شبہات پیدا ہو رہے تھے ان کی ایک ایک کر کے تردید کی اور ان کا ازالہ کیا اور اس کے بعد ان سب سے توبہ کروائی اور تنبیہ کی کہ آیندہ سے جو کوئی بھی ان بدعتوں کا مرتکب ہوگا وہ قتل کر دیا جائے گا۔

آخر میں امیر افرم نے ایک تقریر کی جس میں کم و بیش امام ابن تیمیہ کی کہی ہوئی باتوں کو دہرایا اور کہا کہ بدعات کا مرتکب قتل کر دیا جائے گا۔ اس طرح یہ مشہور مناظرہ ختم ہو گیا۔

امام ابن تیمیہ کی شہرت

اس ہنگامہ خیز مناظرے کی خبر ملک شام اور ملک مصر کے تمام شہروں میں پھیل گئی اور ہر جگہ اسی کا چرچا ہونے لگا، امام ابن تیمیہ کے حاسدوں کو ان کی روز بروز بڑھتی ہوئی شہرت اور عزت ایک کانٹا بن کر کھٹکنے لگی، انہوں نے ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے ان کے اصلاحی کاموں میں رکاوٹ پیدا کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔

اصلاحی کاموں میں رکاوٹ

کس قدر رنج اور افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ہی علما کی لغزشوں سے ایک بڑے سے بڑا اصلاحی کام بھی ناکام ہو کر رہ جاتا ہے، حالانکہ اس قسم کے کاموں میں سب سے پہلی

---

[1] ۱۱/ھود:۵۵۔

جماعت علما ہی کی ہونی چاہیے تھی۔ اگر امام ابن تیمیہ کے راستے میں علمائے وقت کے رشک و حسد اور تعصب کا روڑا نہ آ گیا ہوتا تو نہ معلوم ان کا اصلاحی کام کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوتا۔ امام ابن تیمیہ کی غیر معمولی قوت علم و عمل تھی جس نے اپنے زمانے کے علما کی تنگ نظری کا زور دار مقابلہ کیا، اگر ان کی جگہ پر کوئی دوسرا عالم ہوتا تو وہ بہت جلد اپنی سپر ڈال دیتا، ان کا یہی بڑا کمال تھا کہ سخت سے سخت قید و بند کی حالت میں بھی وہ اپنے ارادوں پر قائم اور ثابت رہے انہوں نے حتی المقدور اپنے اصلاحی کام کو جاری رکھا، انہوں نے اپنی علمی اور عملی قوت کے زور سے رفقاء کار، تلامذہ اور مصلحین امت کی ایک بڑی جماعت پیدا کر دی جس نے ان کی وفات کے بعد بھی ان کے کام کو زندہ رکھا، ان کے بعد ہر دور کے علما نے ان کی تصنیفات سے فائدہ اٹھایا اور ان کے خیالات کو عام مسلمانوں میں پھیلایا آج بھی امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصنیفات ایمانی جوش اور ولولہ پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں، اگر ان کی تصنیفات کو عام کیا جائے تو یقیناً مسلمانوں کے مردہ جسم میں ایک نئی روح پیدا ہو جائے گی۔

عقائد کے جھگڑے کو زندہ کرنا

اوپر گزر چکا ہے کہ مصر کے مشہور عام صوفی شیخ نصر بن سلیمان المنبجی (المتوفی: ۷۱۹ھ) کو وحدۃ الوجود کے مسئلے میں امام ابن تیمیہ سے پرخاش ہو چکی تھی، صوفیت کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز فقر اور توکل ہے، اسی لیے صوفیوں کو فقیروں اور باباؤں سے بڑی ہمدردی اور دلچسپی ہوتی ہے، شیخ نصر ابن سلیمان المنبجی کو امام ابن تیمیہ کی فقرائے احمدیہ سے مخالفت بہت ناگوار گزری انہوں نے ۶۹۸ھ کے فتنۂ عقائد کو از سر نو زندہ کرنے کا تہیہ کر لیا، انہوں نے اپنے مرید امیر بیبرس جاشنگیر سے کہا کہ ابن تیمیہ کے عقائد ٹھیک نہیں ہیں۔ ان سے اس کے متعلق باز پرس کرنی چاہیے، سلطان مصر ملک ناصر کمزور تھا وہ بسا اوقات امیر بیبرس جاشنگیر کی خواہشات کے پورا کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا، اس نے نائب الشام امیر افرم کے نام فرمان لکھوایا کہ دمشق کے قضاۃ اور علما و فقہاء کو جمع کر کے امام ابن تیمیہ کے عقائد کی تحقیق کی جائے اور حکومت کو اس کے نتیجہ سے اطلاع دی جائے، چنانچہ اس نے سلطانی فرمان کے مطابق امام ابن تیمیہ اور تمام قضاۃ اور علما فقہاء کو جمع کیا اور اس سلسلہ میں تین مجلسیں منعقد ہوئیں جن کی روداد ایک مستقل عنوان "فتنہ عقائد" کے تحت پیش کی جاتی ہے۔

فتنۂ عقائد

قرآن مجید میں ہر ایک مسلمان کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم آخرت، قضا وقدر، قیامت، بعث بعد الموت اور جزاء وسزا پر ایمان لائے کیونکہ ان پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص بھی مومن اور مسلمان نہیں ہوسکتا، مسلمانوں کے تمام اعمال کی بنیاد انہی عقائد پر ہے۔ ان پر ایمان لائے بغیر ان کا ہر ایک عمل بیکار ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ایمان کے ساتھ ساتھ عمل پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور عقائد کی صرف انہی باتوں کو بار بار دہرایا گیا ہے جو انسان کے دل ودماغ اور اس کی عبادات اور اعمال واخلاق کی اصلاح اور درستگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور ان کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ عام لوگوں کے ذہن نشین ہو جائیں۔

عقائد کا پہلا اور اہم جز

عقائد کا سب سے پہلا اور اہم جز اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا ایک واضح تصور پیش کیا گیا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اچھے نام ہیں، چنانچہ ایک جگہ فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝۸ ﴾ [1]

"اللہ وہ ہے کوئی معبود نہیں سوائے اس کے، اسی کے لیے ہیں سارے اچھے نام۔"

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ ﴾ [2]

"(اے پیغمبر!) کہہ دو، تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، تم جو کچھ بھی کہہ کر پکاروگے تو اسی کے لیے سارے اچھے نام ہونگے۔"

---

[1] ۲۰/طٰہٰ:۸۔ [2] ۱۷/اسرائیل:۱۱۰۔

﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ﴾ [1]

''اور اللہ ہی کے لیے ہیں سارے اچھے نام، پس تم اس کو انہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام میں کج بحثی کرتے ہیں۔

صحیح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو کوئی بھی ان کو شمار کرے گا، وہ جنت میں داخل ہوگا، وہ یہ ہیں:

((هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۚ الْمَلِكُ ۚ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ الْقَهَّارُ الْوَهَّابُ الرَّزَّاقُ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الْخَافِضُ الرَّافِعُ الْمُعِزُّ الْمُذِلُّ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ الْحَكَمُ الْعَدْلُ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ الْحَلِيْمُ الْعَظِيْمُ الْغَفُوْرُ الشَّكُوْرُ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ الْحَفِيْظُ الْمُقِيْتُ الْحَسِيْبُ الْجَلِيْلُ الْكَرِيْمُ الرَّقِيْبُ الْمُجِيْبُ الْوَاسِعُ الْحَكِيْمُ الْوَدُوْدُ الْمَجِيْدُ الْبَاعِثُ الشَّهِيْدُ الْحَقُّ الْوَكِيْلُ الْقَوِيُّ الْمَتِيْنُ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ الْمُحْصِي الْمُبْدِئُ الْمُعِيْدُ الْمُحْيِ الْمُمِيْتُ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ الْوَاجِدُ الْمَاجِدُ الْوَاحِدُ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الْقَادِرُ الْمُقْتَدِرُ الْمُقَدِّمُ الْمُؤَخِّرُ الْاَوَّلُ الْاٰخِرُ الظَّاهِرُ الْبَاطِنُ الْوَالِي الْمُتَعَالِي الْبَرُّ التَّوَّابُ الْمُنْتَقِمُ الْعَفُوُّ الرَّؤُفُ مَالِكُ الْمُلْكِ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ الْمُقْسِطُ الْجَامِعُ الْغَنِيُّ الْمُغْنِيْ الْمَانِعُ الضَّآرُّ النَّافِعُ النُّوْرُ الْهَادِي الْبَدِيْعُ الْبَاقِي الْوَارِثُ الرَّشِيْدُ الصَّبُوْرُ الْكَافِيْ)) [2]

ان میں سے ہر ایک نام خدا کی کسی نہ کسی صفت کو واضح کرتا ہے۔ اور قرآن مجید میں ہر

---

[1] ۷/الاعراف:۱۸۰۔ [2] سنن الترمذی، کتاب الدعوات، باب حدیث فی اسماء اللّٰه الحسنی......، ح: ۳۵۰۷؛ صحیح بخاری، مختصرًا، ح: ۷۳۹۲۔

ایک صفت کی مختلف پیرایوں میں توضیح کی گئی ہے، جن کا استقصا طوالت کا موجب ہے مگر اس کی ذات اور صفات کا ایک ہلکا سا نقش اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ تمام تعریف اللہ کے لیے ہے جو ساری کائنات کا پروردگار ہے، وہ رحمٰن اور رحیم ہے، جزا کے دن کا مالک ہے (۱/ الفاتحہ:۱۔ ۳)، اللہ ایک ہے وہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ اس کو کسی نے جنا اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے (۱۱۲/ اخلاص:۱۔ ۳) وہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے، نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کی ملکیت میں ہے، کوئی اس کے نزدیک اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش نہیں کرسکتا، وہ انسانوں کے آگے پیچھے کا علم رکھتا ہے، کوئی اس کے علم کے کسی حصہ کا بھی احاطہ نہیں کرسکتا، الا ماشاء اللہ، اس کی کرسی آسمانوں اور زمین پر پھیلی ہوئی ہے، ان دونوں کی حفاظت سے وہ کبھی نہیں تھکتا اور وہ بلند اور بزرگ ہے (۲/ البقرۃ:۲۵۵)، اس کی رحمت ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے (۷/ الاعراف:۱۵۶) وہ غیب اور شہادت کا علم رکھتا ہے، وہ پیدا کرنے والا، باری اور مصور ہے (۵۹/ الحشر:۲۴) زمین اور آسمان کی کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے وہ ماں کے رحم میں جس طرح چاہتا ہے تصور کھینچتا ہے (۳/ آل عمران:۶) وہ بادشاہ ہے پاک ہے، سلامتی چاہنے اور سلامتی دینے والا ہے، وہ امن دینے والا، نگہبان، غالب، زبردست اور بڑائی والا ہے (۵۹/ الحشر:۲۲، ۲۳) اسی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی ملکیت، وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہی پہلے ہے اور وہی پیچھے ہے۔ وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے (۵۷/ الحدید:۳) وہ ہر اس چیز کو جانتا ہے جو زمین میں گھستی ہے اور اس کو بھی جو اس سے نکلتی، اور اس کو بھی جو آسمان سے نیچے آتی ہے اور اس کو بھی جو آسمان کی طرف چڑھتی ہے (۵۷/ الحدید:۴) وہ اس کائنات کا مالک ہے جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے، جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے، اسی کے ہاتھ میں ساری بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے (۳/ آل عمران:۲۶) اگر وہ کسی کو تکلیف میں مبتلا کرے تو اللہ کے سوا کوئی اس کو نجات دینے والا نہیں ہے اور اگر وہ کسی کی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ (۱۰/ یونس:۱۰۷) اللہ جس کو گمراہ کرے اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں ہے۔ اور اللہ

جس کو ہدایت دے اس کو گمراہ کرنے والا کوئی نہیں ہے (۳۹/ الزمر:۳۶، ۳۷) وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، وہ ایک ہے اور سب پر غالب ہے (۱۳/ الرعد:۱۶) وہ اپنے بندوں پر قاہر ہے اور وہ حکیم اور خبیر ہے (۶/ الانعام:۱۸) وہ نیک کام کرنے والوں، توبہ کرنے والوں، اللہ پر پورا بھروسہ کرنے والوں، انصاف کرنے والوں، گناہوں سے بچنے والوں، اس کی راہ میں لڑنے والوں، صبر کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو پیار اور ان سے محبت کرتا ہے اور انکار کرنے والوں، ظلم کرنے والوں، شرک کرنے والوں وغیرہ سے محبت نہیں کرتا۔

صفات ذاتی و فعلی

قرآن مجید میں خدا کی ہر ایک صفت کے متعلق ایک سے زیادہ آیتیں پائی جاتی ہیں جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے خدا کی کئی صفتوں میں سے سات صفات ذاتی ہیں یعنی حیات علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر اور کلام، دوسری صفات صفاتِ فعلی تصور کی جاتی ہیں۔ یہ ذاتی صفات اس کی ذات کے ساتھ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ صفات فعلی جیسے جلانا، مارنا، پیدا کرنا، روزی پہنچانا، جزا وسزا دینا وغیرہ ان کا صدور اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان کی ضرورت ہو، صفت حیات کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا، اس پر موت کبھی نہیں آئے گی، خدا کا علم بھی ازلی اور ابدی ہے، اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے اور اس کو کلیات اور جزئیات دونوں کا علم ہے، کوئی چیز بھی اس کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں ہے، وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے، اس کو روکنے اور منع کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر وہ چاہے تو زمین کے تمام آدمی مومن ہو سکتے ہیں، خدا تعالیٰ سنتا ہے اور دیکھتا ہے۔ وہ چھپی اور کھلی دونوں قسم کی باتوں کو سنتا اور جانتا ہے، وہ ہمارے تمام اعمال کو دیکھتا ہے، حدیث میں ہی آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے، تو وہ گویا تم کو دیکھتا ہے۔'' [1]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام والاحسان، ح: ۸ (۹۳)

صفت کلام

خدا کی ذاتی صفات میں سے ایک اہم صفت صفتِ کلام ہے، قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء سے کلام کیا اور ان کے درجے بڑھائے (۲/البقرہ ۲۵۳) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی (۴/النساء: ۱۶۴) اور وادیٔ سینا میں ان سے بات چیت کی اور پھر جب وہ تورات لینے کے لیے کوہ طور پر گئے تو اللہ نے ان سے کلام کیا (۲۸/قصص: ۴۶؛ ۷/الاعراف: ۱۴۳) کلامِ الٰہی کے متعلق بعض جگہ ندا کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جیسے ''تیرے پروردگار نے موسیٰ کو پکارا کہ ظالم قوم کے پاس پہنچ کیونکہ وہ خدا سے نہیں ڈرتی (۲۶/الشعراء: ۱۰)''پس جب موسیٰ اس آگ کے قریب پہنچے تو یہ ندا کی گئی کہ بابرکت ہے وہ جو آگ کے اندر ہے اور اس کے اردگرد ہے اور پاک ہے وہ اللہ جو ساری کائنات کا پروردگار ہے۔ اے موسیٰ! بے شک میں ہی ہوں اللہ جو زبردست اور حکمت والا ہے (۲۷/النمل: ۸،۹) ''اور جب موسیٰ! اس آگ کے قریب پہنچے تو وادیٔ ایمن کے کنارے مبارک جگہ میں ایک درخت سے یہ آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں ہی ہوں اللہ جو تمام عالم کا پروردگار ہے (۲۸/القصص: ۳۰) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں کو ندا کرے گا اور پوچھے گا کہ تم نے مرسلین کی دعوت کا کیا جواب دیا۔ یہ بھی بتایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد و پیمان کو تھوڑی سی پونجی کے بدلے بیچتے ہیں، ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا اور وہ قیامت کے دن ان سے کوئی کلام نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے گا۔ (۳/آل عمران: ۷۷)

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے

قرآن مجید میں کئی جگہ اس بات کو ظاہر کیا گیا ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، چنانچہ فرمایا: ''اگر مشرکین میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے (۹/التوبہ: ۶) دوسری جگہ ہے۔ ''کیا تم یہ حرص کرتے ہو کہ وہ تم پر ایمان لائیں گے، حالانکہ ان میں سے ایک فریق اللہ کے کلام کو سنتا ہے اور پھر اس کو سمجھنے اور جاننے کے بعد بدل دیتا ہے۔'' (۲/البقرۃ: ۷۵) ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ''یہ لوگ اللہ کے کلام کو بدل دینا چاہتے ہیں۔'' (۴۸/الفتح: ۱۵)

خدا کے کلام کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود ہی فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝﴾ [1]

''اور کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے، مگر وحی کے ذریعہ یا پردے کے پیچھے سے یا کسی رسول کو بھیجے اور وہ اس کی اجازت سے اس کو وحی کرے جو چاہے بے شک وہ بلند اور حکمت والا ہے۔''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے تین طریقوں سے ہم کلام ہوتا ہے، ایک یہ کہ براہِ راست بندوں کے دل پر بیداری میں یا خواب میں القاء کرتا ہے، یا پردے کے پیچھے سے بات کرتا ہے جیسے کہ اس نے درخت یا آگ کے پیچھے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات چیت کی، یا کسی فرشتے کے ذریعہ نبی کے پاس اپنا پیام بھیجتا ہے، جیسا کہ مختلف انبیاء کے ساتھ اس طریقہ پر اس نے کلام کیا۔

اللہ تعالیٰ کا آسمان میں ہونا

قرآن مجید میں کئی آیتیں ایسی ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ آسمان میں ہے، چنانچہ ایک جگہ فرماتا ہے ''کیا تم اس ذات سے جو آسمان میں ہی خود کو امن میں سمجھتے ہو کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا نہ دے جبکہ وہ جوش مار رہی ہو یا تم اس ذات سے جو آسمان میں ہے، خود کو امن میں سمجھتے ہو کہ وہ کہیں تم پر کنکریوں کی آندھی نہ چلا دے'' (۶۷/ الملک:۱۶، ۱۷) قبلہ کے متعلق ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بار بار آسمان کی طرف دیکھا کرتے تھے اور قبلہ کی تبدیلی کے لیے وحیٔ آسمانی کا انتظار کرتے تھے (۲/ البقرۃ:۱۴۴) ایک جگہ فرمایا: ''اچھے کلمے اور نیک عمل اس کی طرف چڑھتے ہیں اور ان کو اللہ اپنی طرف اٹھاتا ہے۔'' (۳۵/ الفاطر:۱۰) فرعون نے ہامان سے کہا تھا کہ اس کے لیے ایک بہت بڑا محل بنائے تا کہ وہ آسمان پر چڑھ کر موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو دیکھے (۴۰/ المومن:۳۷، ۳۸) اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

---

[1] ٤٢/الشوری:٥١۔

اے عیسیٰ! میں تجھ کو وفات دینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں (۳/آل عمران: ۵۵) دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا اور نہ انہیں سولی دی بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا۔ (۴/النساء: ۱۵۷)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید، انجیل، تورات، اور دوسرے آسمانی صحیفوں اور کتابوں کے متعلق جا بجا نزول (اتارنے) کا صیغہ استعمال کیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صحیفے اور کتابیں اوپر سے نیچے اتاری گئی، ہیں جیسے ''تورات اور انجیل نہیں اتاری گئی مگر ابراہیم علیہ السلام کے بعد۔'' (۳/آل عمران: ۶۵) ''تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس سے پہلے کے لوگوں کو ہدایت کے لیے تورات اور انجیل اور فرق کرنے والی کتاب اتاری'' (۳/آل عمران: ۳، ۴) ''اور یہ کتاب وہ ہے جس کو ہم نے برکت والی کتاب بنا کر اتارا ہے وہ اس سے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے'' (۶/الانعام: ۹۲) ''کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو حکم بناؤں، حالانکہ اسی نے تمہاری طرف ایک تفصیلی کتاب اتاری اور وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے اچھی طرح جانتے ہیں کہ بے شک وہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ اتاری گئی ہے۔'' (۶/الانعام: ۱۱۴) ''اور یہ کتاب وہی ہے جس کو ہم نے برکت والی کتاب بنا کر اتارا پس تم اس کی پیروی کرو، اور خدا سے ڈرو شاید کہ وہ تم پر رحم کرے، تم یہ نہ کہو کہ ہم سے پہلے دو جماعتوں پر کتاب اتاری گئی اور ہم ان کے پڑھنے سے غافل تھے یا تم یہ کہو کہ اگر ہمارے اوپر بھی کتاب اتاری جاتی تو ہم بھی ان سے بہتر ہدایت یافتہ ہوتے۔'' (۶/الانعام: ۵۵، ۵۷)

قرآن مجید میں بکثرت اس قسم کی آیتیں ملیں گی جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا اوپر ہے اور وہاں سے رسولوں کے نام پیام آتے ہیں۔

حدیثوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک لونڈی لائی گئی، آپ نے اس سے پوچھا: ''بتاؤ اللہ کہاں ہے؟'' اس نے جواب دیا: آسمان میں۔ آپ نے پھر پوچھا: ''بتاؤ میں کون ہوں؟''

اس نے کہا: آپ اللہ کے رسول ہیں، آپ نے حکم دیا: ''اس کو آزاد کر دو یہ مؤمنہ ہے۔'' ❶

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں عرفات کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر ایک شاندار خطبہ دیا، آپ نے آخر میں مجمع کو بار بار خطاب کر کے کہا: ''کیا میں نے اللہ جل شانہٗ کا پیغام تم تک نہیں پہنچا دیا؟'' سب نے یک زبان ہو کر کہا: ہاں! آپ نے ہر مرتبہ آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''اے اللہ تو گواہ رہ۔'' ❷

اللہ عرش پر ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد عرش پر دراز اور قائم ہو گیا۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ ❸

''پھر وہ عرش پر دراز اور قائم ہو گیا۔''

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝﴾ ❹

''رحمٰن عرش پر دراز ہو گیا۔''

سورۂ ہود کی ابتداء میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا (۱۱/ھود: ۷)، سورۂ نمل آیت: ۲۶ اور سورۂ توبہ آیت: ۱۲۹ میں ہے کہ وہ عرش عظیم کا پروردگار ہے، سورۂ مومنون آیت: ۱۱۶ میں عرش عظیم کی بجائے عرش کریم کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے بعض جگہ عرش کو اپنی طرف نسبت دی ہے، اور خود کو ذوالعرش (عرش والا) بتایا ہے (۴۰/المومن: ۱۵؛ ۸۵/البروج: ۱۵) سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ اللہ کے ساتھ اگر کوئی دوسرے معبود ہوتے، جیسا کہ یہ کافر لوگ کہتے ہیں تو وہ البتہ عرش والے تک راہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیل عرش والے کے نزدیک جگہ پائے ہوئے ہیں۔ (۸۱/التکویر: ۲۰) ایک اور جگہ فرمایا کہ اللہ

---

❶ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب تحریم الکلام فی الصلاۃ: ۵۳۷ (۱۱۹۹) ❷ مسند احمد: ۲۳/ ۲۴۰، ح: ۱۴۹۸۹۔

❸ ۷/الاعراف: ۵۴، ۱۳/الرعد: ۲؛ ۱۰/یونس ۳، ۲۵/الفرقان: ۵۹، ۳۲/السجدۃ: ۴، ۵۷/الحدید: ۴۔ ❹ ۲۰/طٰہٰ: ۵۔

بخشنے والا، محبت کرنے والا اور بزرگ عرش والا ہے جس بات کا ارادہ کر بیٹھتا ہے اس کو پورا کرتا ہے (۸۵/ البروج: ۱۴، ۱۵) یہ بھی بتایا کہ فرشتے عرش گھیرے کھڑے ہیں اور اپنے پروردگار کے حمد کی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں (۳۹/ الزمر: ۷۵) ایک اور جگہ فرمایا کہ وہ فرشتے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کو گھیرے ہوئے ہیں اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے مغفرت چاہتے ہیں جو اس پر ایمان لے آئے ہیں (۴۰/ المومن: ۷) ایک دوسری جگہ بتایا کہ قیامت کے دن فرشتے چاروں طرف ہوں گے اور اپنے پروردگار کے عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے رہیں گے۔ (۶۹/ الحاقۃ: ۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی عرش اور استواء کے یہی معنی لیتے تھے، جس کی اوپر تشریح کی گئی ہے، چنانچہ مشہور صحابی شاعر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دو شعر سنائے جن کو آپ نے بہت پسند فرمایا اور ان کی تعریف کی، اگر عرش و استواء کے متعلق حضرت عبداللہ بن رواحہ کا تخیل غلط ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ضرور ان کی اصلاح فرما دیتے۔ وہ دو شعر یہ ہیں:

شَهِدْتُ بِاَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ
وَاَنَّ النَّارَ مَثْوَى الْكَافِرِيْنَا

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور یہ کہ کافرین کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

وَاَنَّ الْعَرْشَ فَوْقَ الْمَاءِ طَافٍ
وَفَوْقَ الْعَرْشِ رَبُّ الْعَالَمِيْنَا

اور یہ کہ عرش پانی پر گھوم رہا ہے اور عرش پر تمام عالم کا پروردگار ہے۔

عرش اور استواء کے معنی خود قرآن مجید ہی سے متعین کیے جا سکتے ہیں، سورۂ یوسف اور سورۂ نمل میں حضرت یوسف اور ملکہ سبا کے تخت کا ذکر ہے اور اس کو عرش ہی کہا گیا ہے۔ جیسے:

﴿ وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ﴾ [1]

"اور یوسف علیہ السلام نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور وہ سب اس کے سامنے

---

[1] ۱۲/یوسف: ۱۰۰۔

سجدے میں گر پڑے۔"

﴿ وَّ لَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴾ [1]

"اور (ملکہ سبا) کا ایک بہت بڑا تخت ہے۔"

﴿ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا ﴾ [2]

"حضرت سلیمان نے کہا کہ اس کا تخت بدل دو۔"

﴿ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ﴾ [3]

"(جب ملکہ سبا آئی) تو اس سے کہا گیا کہ کیا تیرا تخت اسی طرح کا ہے۔"

قرآن مجید میں استویٰ کا لفظ تین طرح سے استعمال ہوا ہے۔ پہلا مطلق یعنی صلے کے بغیر استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی کامل اور تمام ہونے کے ہیں جیسے:

﴿ وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰى ﴾ [4]

"اور جب وہ اپنی قوت کو پہنچ گیا اور کامل ہوا۔"

دوسرا "اِلٰی" کے صلہ کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی توجہ کرنے کے ہوتے ہیں جیسے:

﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ﴾ [5]

"وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی تمام چیزیں پیدا کیں پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور سات آسمان بنائے۔"

﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ ﴾ [6]

"پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔"

تیسرا استعمال "علیٰ" کے صلہ کے ساتھ ہے جس کے معنی دراز ہونے، سوار ہونے، ٹھہرنے اور قرار پانے کے ہیں جیسے:

---

[1] ۲۷/النمل:۲۳۔ [2] ۲۷/النمل:۴۱۔ [3] ۲۷/النمل:۴۲۔
[4] ۲۸/القصص:۱۴۔ [5] ۲/البقرۃ:۲۹۔ [6] ۴۱/حٰمٓ السجدۃ:۱۱۔

﴿ فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ ❶

''پس اگر تم اور وہ لوگ جو تمہارے ساتھ ہیں کشتی پر سوار ہو جاؤ تو کہو کہ سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہم کو ظالم قوم سے نجات دی۔''

﴿ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ ﴾ ❷

''تا کہ تم ان (جانوروں) کی پیٹھوں پر سوار ہو جاؤ پھر اپنے پروردگار کی نعمت کو یاد کرو جب کہ تم اس پر سوار ہو جاؤ۔''

﴿ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ ﴾ ❸

''اور جب (نوح کی) کشتی جودی پہاڑ پر آ کر ٹھہر گئی۔''

استوی علی العرش میں یہی تین معنیٰ مراد لیے گئے ہیں، اس کے علاوہ جو کچھ معانی بیان کیے جاتے ہیں وہ سب تاویل باطل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن مجید میں بعض اعضاء خداوندی کا ذکر

قرآن مجید میں کئی جگہ اعضاءِ خداوندی کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف چہرہ، آنکھ، ہاتھ، پہلو، نفس اور پنڈلی وغیرہ کو نسبت دی ہے، چہرہ کے متعلق یہ آیتیں پائی جاتی ہیں۔

﴿ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ ﴾ ❹

''پس جس طرف بھی تم منہ پھیرو تو ادھر اللہ کا چہرہ ہے۔''

﴿ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ﴾ ❺

''اور تیرے پروردگار کا چہرہ باقی رہے گا۔''

﴿ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ﴾ ❻

''یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کا چہرہ یعنی اس کی مرضی چاہتے ہیں۔''

---

❶ ۲۳/المومنون:۲۸۔ ❷ ۴۳/الزخرف:۱۳۔ ❸ ۱۱/ھود:۴۴۔

❹ ۲/البقرۃ:۱۱۵۔ اکثر آیتوں میں ''وجہ اللہ'' اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح کہ ہم آج اردو میں بولتے ہیں کہ ''محض آپ کا چہرہ دیکھ کر'' میں نے فلاں کی مدد کی۔

❺ ۵۵/الرحمٰن:۲۷۔ ❻ ۳۰/الروم:۳۸۔

﴿ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ﴾ ❶
''تم اللہ کے چہرے یعنی اس کی مرضی چاہتے ہوئے۔''
﴿ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴾ ❷
''مگر اپنے بلند پروردگار کے چہرے یعنی اس کی مرضی کو تلاش کرتے ہوئے۔''
﴿ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ﴾ ❸
''اور تم خرچ نہیں کرتے ہو مگر اللہ کے چہرے یعنی اس کی مرضی کو تلاش کرتے ہوئے۔''
﴿ ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ ﴾ ❹
''اپنے پروردگار کے چہرے یعنی اس کی مرضی کو تلاش کرتے ہوئے۔''
﴿ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ ﴾ ❺
''بیشک ہم تم کو اللہ کے چہرے یعنی اس کی مرضی کے لیے کھلاتے ہیں۔''
﴿ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ﴾ ❻
''ہر چیز اس کے چہرے کے سوا ہلاک ہو جانے والی ہے۔''
﴿ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ ﴾ ❼
''اس کی مرضی کو تلاش کرتے ہوئے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جا بجا خدا کے لیے وجہ (چہرہ) کا لفظ استعمال کیا ہے، چنانچہ ابوداؤد میں ہے آپ اکثر اپنی دعاؤں میں فرماتے تھے:

((أَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ وَبِوَجْهِهِ الْكَرِیْمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ)) ❽

''میں عظمت والے اللہ، اس کے عذاب والے چہرے اور اس کی قدیم سلطنت

---

❶ ۳۰/الروم:۳۹۔ ❷ ۹۲/اللیل:۲۰۔ ❸ ۲/البقرۃ:۲۷۲۔ ❹ ۱۳/الرعد:۲۲۔
❺ ۷۶/الدھر:۹۔ ❻ ۲۸/القصص:۸۸۔
❼ ٦/الانعام:۵۲؛ ۱۸/الکھف:۲۸۔ ❽ سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب ما یقول الرجل عند دخوله المسجد، ح: ٤٦٦۔

کی پناہ کا طلب گار ہوں شیطان مردود سے۔"

آپ یہ دعا بھی فرمایا کرتے تھے:

((أَسْأَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ إِلَى وَجْهِكَ وَالشَّوْقَ إِلَى لِقَائِكَ)) [1]

"میں تیرے چہرے کی طرف دیکھ کر لذت حاصل کرنے اور تیری ملاقات کا شوق پیدا کرنے کی تجھ سے درخواست کرتا ہوں۔"

اس قسم کی بیسیوں حدیثیں موجود ہیں جن میں چہرہ کا ذکر ہے، مگر طوالت کے خوف سے ان تمام کو یہاں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید میں کئی جگہ خدا کی آنکھ کا بھی ذکر ہے جیسے:

﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ [2]

"اور تم کشتی کو ہماری آنکھوں کے سامنے بناؤ۔"

﴿أَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ [3]

"یہ کہ تم کشتی کو ہماری آنکھوں کے سامنے بناؤ۔"

﴿وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي ۝٣٩﴾ [4]

"اور تاکہ تم میری آنکھوں کے سامنے پرورش پاؤ۔"

﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ [5]

"اور تو اپنے پروردگار کے حکم پر صبر کر پس تو بے شک ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔"

﴿تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا ج﴾ [6]

"(نوح کی کشتی) ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی۔"

صحیح حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] سنن نسائی، کتاب الصلاۃ، باب نوع آخر: ۱۳۰۶، ۱۳۰۷۔

[2] ۱۱/ھود:۳۷۔ [3] ۲۳/المومنون:۲۷۔ [4] ۲۰/طٰہٰ:۳۹۔

[5] ۵۲/الطور:۴۸۔ [6] ۵۴/القمر:۱۴۔

((إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا قَامَ فِي الصَّلٰوةِ فَإِنَّمَا هُوَ بَيْنَ عَيْنِي الرَّحْمٰنِ)) 1

''بے شک بندہ جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو گویا خدا کی آنکھوں کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔''

آپ نے دجال سے ڈراتے ہوئے فرمایا کہ وہ کانا ہوگا اور خدا کانا نہیں ہے۔

((إِنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِأَعْوَرٍ)) 2

''بے شک تمہارا پروردگار کانا نہیں ہے۔''

اسی طرح ہاتھ کے متعلق بھی قرآن مجید میں کئی آیتیں آئی ہیں جیسے:

﴿ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ ﴾ 3

''اللہ کا ہاتھ ان سب کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔''

﴿ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ ﴾ 4

''اور یہود نے کہا اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔''

﴿ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ ﴾ 5

''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔''

﴿ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ ﴾ 6

''بے شک فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

﴿ وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ﴾ 7

''اور بے شک فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۝ ﴾ 8

''کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے جن کو ہمارے

---

1 تعظیم قدر الصلاۃ، لمحمد بن نصر المروزی، ح: ۱۲۹؛ سلسلة الاحادیث الضعیفة، ح: ۱۰۲٤۔ 2 صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حجة الوداع، ح: ٤٤۰۲؛ صحیح مسلم، ح: ۲۹۳۳ (۷۳٦۳)۔ 3 ٤۸/الفتح: ۱۰۔
4 ٥/المائدة: ٦٤۔ 5 ٥/المائدة: ٦٤۔ 6 ۳/آل عمران: ۷۳۔
7 ٥۷/الحدید: ۲۹۔ 8 ۳٦/یٰسٓ: ۷۱۔

ہاتھوں نے بنایا پس وہ ان کے مالک بنے ہوئے ہیں۔“

﴿مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ط﴾ 1

”تجھ کو کس چیز نے اس شخص کے سامنے جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا سجدہ کرنے سے روکا۔“

﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۶﴾ 2

”تیرے ہی ہاتھ میں ساری بھلائی ہے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔“

﴿فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ 3

”پس وہ ذات پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے۔“

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ 4

”بابرکت ہے وہ ذات پاک ہے جس کے ہاتھ میں بادشاہت ہے۔“

بعض جگہوں پر لفظ ”ید“ کی بجائے ”یمین“ (سیدھے ہاتھ) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جیسے:

﴿وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ط﴾ 5

”اور تمام آسمان اس کے سیدھے ہاتھ سے لپیٹے جائیں گے۔“

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝۴۴ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝۴۵﴾ 6

”اور اگر ہم پر بعض باتیں جھوٹ بولے تو البتہ ہم اس کو سیدھے ہاتھ سے پکڑ لیں گے۔“

حدیثوں میں ہاتھ کے لیے ”ید“ ”یمین“ اور ”کف“ وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ان الله تبارك و تعالىٰ خمر طينة ادم علیہ السلام اربعين يوما ثم ضرب بيده فيها فما كان من طيب خرج بيمينه وما كان من

---

1 ۳۸/صٓ:۷۵۔ 2 ۳/آل عمران:۲۶۔ 3 ۳۶/یسٓ:۸۳۔

4 ۶۷/الملك:۱۔ 5 ۳۹/الزمر:۶۷۔ 6 ۶۹/الحاقة:۴۴۔۴۵۔

خبیث خرج بیدہ الاخری ثم خلطه)) [1]

''بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ آدم کی مٹی کو چالیس دن گوندھارہا پھر اس میں ہاتھ مارا، پس جو بھی اچھی تھی اس کو اپنے سیدھے ہاتھ سے نکالا اور جو بری تھی اس کو اپنے دوسرے ہاتھ سے نکالا پھر ان دونوں کو ملایا۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ما تصدق احد بصدقة من طیب الا اخذها الرحمٰن بیمینه وان كانت تمره فتربو فی كف الرحمٰن حتی تكون اعظم من الجبل كما یربی احدكم فلوه او فصیله)) [2]

''کوئی شخص کوئی اچھا صدقہ نہیں کرتا ہے مگر خدا اس کو اپنے سیدھے ہاتھ میں لے لیتا ہے، اگرچہ وہ ایک کھجور ہی کیوں نہ ہو، تو وہ خدا کی ہتھیلی میں بڑھتی ہی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ سے بھی بڑی ہوجاتی ہے، جس طرح تم میں سے کوئی اپنے اونٹ یا گائے کے بچھڑے کی پرورش کرتا رہتا ہے۔''

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اکثر منبر پر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

خَفِّضْ عَلَيْكَ فَإِنَّ الْأُمُوْرَ
بِكَفِّ الْإِلٰهِ مَقَادِيْرُهَا

غم کو اپنے اوپر ہلکا کر کیونکہ تمام امور کی تقدیر اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

فَلَيْسَ بِآتِيْكَ مَنْهِيُّهَا
وَلَا قَاصِرٌ عَنْكَ مَأْمُوْرُهَا [3]

پس جو کچھ تجھ سے روک دی جاچکی ہے وہ تجھے پیش آنے والی نہیں ہے اور جس کا حکم ہوچکا ہے ضرور آکر رہے گی۔

حدیثوں میں اصابع (انگلیاں) ساعد (بازو) ذراع (ہاتھ) کے الفاظ بھی استعمال

---

[1] الأسماء والصفات للبیهقی: ح: ۷۱٦۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب قبول الصدقة من الکسب الطیب وتربیتها: ۱۰۱٤ (۲۳٤۲)
[3] الأسماء والصفات للبیهقی، ح: ۷۲۸۔

کیے گئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ان قلب ابن آدم بین اصبعین من اصابع الرحمٰن ان شاء اقامه وان شاء ازاغه)) ❶

''بے شک ابن آدم کا دل رحمٰن کا انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے اگر وہ چاہے تو اس کو قائم رکھ سکتا ہے اور اگر چاہے تو اس میں کجی پیدا کر سکتا ہے۔''

جنب (پہلو) کے متعلق قرآن مجید میں یہ آیت ہے:

﴿ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ ﴾ ❷

''اس وقت نفس یہ کہے گا اے کاش! میری اس تقصیر پر جو اللہ کے بارے میں مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ اپنے لیے نفس کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جیسے:

﴿ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴾ ❸

''اور میں نے تجھ کو اپنے نفس کے لیے منتخب کر لیا۔''

﴿ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ﴾ ❹

''اور اللہ تم کو اپنے نفس سے ڈراتا ہے۔''

﴿ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ ❺

''تمہارے پروردگار نے اپنے نفس کے اوپر رحمت لکھ دی ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن خدا سے عرض کریں گے۔''

﴿ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ﴾ ❻

''تو جانتا ہے جو کچھ میرے نفس میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے نفس میں ہے۔''

ساق (پنڈلی) کے متعلق قرآن مجید میں یہ آیت ہے:

---

❶ سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فی ما انکرت الجهمية: ١٩٩؛ المعجم الكبير للطبرانی: ٢٣/ ٣٦٦۔ ❷ ٣٩/الزمر:٥٦۔ ❸ ٢٠/طٰه:٤١۔
❹ ٣/آل عمران:٢٨۔ ❺ ٦/الانعام:٥٤۔ ❻ ٥/المائدة:١١٦۔

﴿ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُوْدِ ﴾ [1]

''اور جس دن کو پنڈلی کھولی جائے گی اور لوگ سجدہ کرنے کیلئے بلائے جائیں گے۔''

حدیثوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے قدم (پیر) اور رجل (پاؤں) کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((لا تزال جهنم تقول هل من مزيد حتى تضع رب العزة فيها قدمه فتقول قط قط وعزتك)) [2]

''جہنم ہمیشہ یہ کہتی رہے گی اور کچھ اور کچھ حتی کہ رب العزۃ اس میں اپنا پیر رکھے گا تو وہ کہنے لگے گی بس بس اور تیری عزت کی قسم۔''

دوسری روایت میں قدمہ کی جگہ رجلہ بھی ہے۔

حدیثوں میں اللہ کے لیے ذات کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، جیسے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((لم يكذب ابراهيم قط الاثلاث كذبات اثنتين فى ذات الله قوله انى سقيم وقوله بل فعله كبيرهم هذا وواحدة فى شان سارة انك اختى)) [3]

''حضرت ابراہیم نے صرف تین مرتبہ جھوٹ کہا، دو خدا کی ذات کے بارے میں، ان کا یہ کہنا کہ میں بیمار ہوں اور ان کا یہ کہنا کہ اس کو بڑے بت نے کہا اور ایک سارہ کی شان میں کہ تو میری بہن ہے۔''

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے مشہور شعر ہیں:

وَلَسْتُ أُبَالِي حِيْنَ أُقْتَلُ مُسْلِمًا
عَلَى أَيِّ شِقٍّ كَانَ لِلَّهِ مَصْرَعِيْ

---

[1] ٦٨/القلم:٤٢۔ [2] صحيح بخارى، كتاب الأيمان والنذور، باب الحلف بعزة الله.....، ح: ٦٦٦١۔ [3] صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب من فضائل ابراهيم الخليل ﷺ: ٢٣٧١ (٦١٤٥)

اور میں کچھ پروا نہیں کرتا جبکہ میں مسلمان قتل ہو رہا ہوں کہ کس پہلو پر خدا کی راہ میں میرا گرنا ہے۔

وَذَالِكَ فِي ذَاتِ الْإِلٰهِ وَإِنْ يَشَاءْ
يُبَارِكْ عَلَى أَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعِ [1]

اور یہ اللہ کی ذات کے بارے میں ہے اور اگر وہ چاہے تو ٹکڑے ٹکڑے کیے ہوئے جوڑوں پر برکت دے سکتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

تَفَكَّرُوْا فِي كُلِّ شَيْءٍ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِي ذَاتِ اللّٰهِ۔ [2]

ہر چیز میں غور کرو مگر اللہ کی ذات میں غور نہ کرو۔

حدیثوں میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنی صورت ☆ پر پیدا کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اذا ضرب احدکم فلیجتنب الوجه فان الله خلق آدم على صورته)) [3]

''جب تم میں سے کوئی کسی کو مارے تو چہرے پر مارنے سے پرہیز کرے کیونکہ اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔''

اللہ تعالیٰ اس دنیا میں کسی کو نظر نہیں آتا مگر وہ قیامت کے دن لوگوں کو اسی طرح نظر آئے گا، جس طرح چاند لوگوں کو نظر آتا ہے اور اس کو دیکھنے سے لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ما یذکر فی الذات والنعوت......،ح: ٧٤٠٢۔ [2] الأسماء والصفات للبیهقی، ح: ٦١٨۔

☆''علی صورته'' سے مراد ''اللہ کا چہرہ'' نہیں بلکہ ''آدم علیہ السلام کا چہرہ'' ہے گویا مکمل حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ''اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی سے لڑے تو (اس کے) چہرے پر نہ مارے کیونکہ اللہ نے آدم (علیہ السلام) کو اس (شخص) کی صورت پر پیدا کیا ہے۔ (صحیح مسلم: ٢٦١٢) تفصیل کے لیے دیکھئے (کتاب التوحید لابن خزیمة: ٣٧، ٣٨) نیز دیکھئے: فتاویٰ علمیہ الشیخ زبیر علی زئی: ١/ ١٧٦، ١٧٧)

[3] مسند احمد: ١٢/٢٧٥، ح: ٧٣٢٣؛ صحیح ابن حبان: ٥٦٠٥۔

قرآن مجید اور حدیث میں کئی جگہ اس کا بھی ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اچھے کاموں سے خوش ہوتا ہے اور برے کاموں سے نفرت کرتا ہے وہ غضبناک بھی ہوتا ہے اور تائب بندوں سے راضی بھی ہوتا جاتا ہے، وہ ہنستا بھی ہے فرحت و سرور بھی ظاہر کرتا ہے۔ اگر ان سب کی مثالوں کو جمع کیا جائے تو اچھی خاصی کتاب ہو جائے۔

مماثلت کی نفی

اللہ تعالیٰ نے اپنے ان تمام اسماء و صفات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ایک جامع اور مانع بات بتادی اور فرمایا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ﴾ [1]

''اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔''

اس کے معنی یہ ہیں کہ اگرچہ دوسرے لوگ خدا کی ان صفات میں اشتراک تو رکھتے ہیں، مگر بندوں کی صفات وصفِ کمال کی حیثیت سے خدا کی صفات کی برابری نہیں کرسکتیں، اس آیت سے اس مماثلت کی پوری نفی ہو جاتی ہے، جو اللہ اور ماسوائے اللہ کے درمیان ہو سکتی ہے۔

عقائد میں اختلاف اور اس کی نوعیت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جس طرح اپنی ذاتی و فعلی صفات کو پیش کیا اور آنحضرت ﷺ نے ان کی جس طرح تعبیر کی، اس کو آپ کے ساتھیوں نے بلا چون و چرا تسلیم کیا اور ان کو اسی طرح سمجھا جس طرح آج ایک خالی الذہن آدمی اس کے معانی سمجھ سکتا ہے، آنحضرت ﷺ کے ابتدائی ساتھی عرب تھے اور وہ اہل زبان تھے، اس لیے قرآن مجید کے ٹھیک ٹھیک سمجھنے میں ان سے کوئی غلطی نہیں ہوسکتی تھی۔ اور قرآن مجید کی کسی آیت میں تاویل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑسکتی تھی، لیکن جیسے جیسے ایرانی، شامی، رومی، اور مصری اپنے فلسفیانہ اور متکلمانہ دل و دماغ کو لے کر اسلام کے حلقے میں داخل ہوتے گئے، قرآن مجید کے پیش کیے ہوئے سیدھے سادے عقائد کو وہ اپنے عقلی میزان پر بھی تولنے لگے، انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ خدا عادل اور منصف ہے۔ وہ وہی کرسکتا ہے، جو بندوں کے حق میں بہتر ہو، وہ جس کو چاہے

---

[1] ٤٢/الشوری: ١١۔

ہدایت نہیں دے سکتا اور جس کو چاہے گمراہ نہیں کر سکتا، اگر وہ ایسا کرے گا تو ظالم ہوگا، انسان مجبور محض نہیں ہے، وہ اپنے تمام اعمال کا ذمہ دار ہے، اللہ تعالیٰ جبراً کسی کو مسلمان اور کسی کو کافر نہیں بنا سکتا۔ اس طرح انہوں نے قضاء قدر اور مشیت الٰہی کا انکار کیا، اور خیر و شر اور حسن و قبح عقلی کے مسائل پر بحثیں شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں یہ بحث بھی شروع ہوگئی کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے یا نہیں بعض کا خیال تھا کہ کافر نہیں ہے اور بعض نے کہا کافر ہے اور بعض کا یہ خیال تھا کہ وہ نہ کافر ہے اور نہ مومن ہے اس کا درجہ ایمان اور کفر کے درمیان ہے۔

انہوں نے یہ بھی سوچنا شروع کیا کہ خدا ایک ہے اور اس کو ہر حیثیت سے ایک ہی ہونا چاہیے اس سلسلے میں یہ بحث بھی چھڑ گئی کہ آیا صفات الٰہی ذات الٰہی کا عین ہیں یا اس کا غیر ہیں اگر اس کی ذات کا عین ہیں تو پھر صفات کے الگ ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اگر اس کا غیر ہیں تو بیک وقت کئی خداؤں کا ماننا لازم آتا ہے اور چونکہ صفات کا ظہور اشیاء کے ظہور میں آنے کے بعد ہوتا ہے اس لیے صفات حادث قرار پاتے ہیں اور ماقام به الحوادث فهو حادث (جس کے ساتھ حوادث قائم ہوں وہ بھی حادث ہے) کے اصول کی بنا پر اگر صفات کو مان لیں تو خدا محل حوادث ہو جاتا ہے اور خود بھی حادث قرار پاتا ہے۔

ان کا یہ خیال تھا کہ اگر قرآن مجید کے الفاظ وجہ (چہرہ) عین (آنکھ) ید (ہاتھ) یمین (سیدھا ہاتھ) جنب (پہلو)، نفس، ساق (پنڈلی) وغیرہ کے حقیقی معنیٰ مراد لیے جائیں تو اس کی وجہ سے خدا کی جسمیت لازم آتی ہے اور چونکہ ہر جسم حادث ہوتا ہے، اس لیے ان مذکورہ بالا الفاظ کے حقیقی معنی مراد لینے کی صورت میں خدا بھی حادث ہو جاتا ہے اس بنا پر ان لوگوں نے ہر ایک لفظ کی جا و بیجا تاویل شروع کر دی اور یہ کہنا شروع کیا کہ وجہ کے معنی مرضی، عین کے علم، ید کے معنی قدرت وغیرہ کے ہیں، ان کی یہ تاویلیں بعض جگہ تو ٹھیک بیٹھ جاتی ہیں مگر بعض جگہ ٹھیک نہیں ہوتیں۔

انہوں نے یہ بھی سوچنا شروع کیا کہ اگر استویٰ کے معنیٰ استقرار (جگہ پانے) کے لیں تو گویا خدا عرش کا محتاج ہو جاتا ہے اور جو کسی کا محتاج ہو وہ قدیم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے استویٰ کی تاویل کی اور یہ کہنا شروع کیا کہ استویٰ کے معنیٰ استقر کے نہیں ہیں، بلکہ استولیٰ (قبضہ کیا)

کے ہیں جو کسی حال میں بھی ان آیتوں میں ٹھیک نہیں بیٹھتا اس نئی تاویل کی صحت پر انہوں نے ایک عربی شعر سے جو مشہور شاعر اخطل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے استدلال کیا۔

قَدِ اسْتَوَی بِشْرٌ عَلَی الْعِرَاقِ
مِنْ غَیْرِ سَیْفٍ وَ دَمٍ مُهْرَاقِ

بے شک بشر (بن مروان) نے عراق پر کسی تلوار اور خون بہانے کے بغیر قبضہ کر لیا۔

پہلے تو اس شعر میں استویٰ کے معنیٰ استولٰی کے لیے ضروری نہیں ہیں، استقر ہی کے لیے جا سکتے ہیں، دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں استویٰ کے جو معانی بیان کیے گئے ہیں اس کے مقابلے میں اس شعر سے استدلال ٹھیک نہیں ہو سکتا، اس لیے جب حضرت امام مالک سے استویٰ کا معنیٰ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

أَلْإِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ وَالْإِيْمَانُ بِهِ وَاجِبٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ۔[1]

استواء کے معنیٰ معلوم ہیں لیکن اس کی کیفیت مجہول ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق کسی قسم کا سوال کرنا بدعت ہے۔

جب صفات الٰہی کا انکار کیا گیا تو لامحالہ اس کی ایک اہم صفت کلام کا بھی انکار کرنا پڑا، اور پھر ﴿ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴾ کے معنیٰ یہ بیان کیے جانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوئی بات چیت نہیں کی، بلکہ اللہ نے آواز کو ہوا میں پیدا کیا اور حضرت موسیٰ نے درخت سے آواز سنی، اس خلط مبحث میں پڑنے کے بعد ان لوگوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کیا کہ خدا خود کلام نہیں کرتا، بلکہ وہ آواز کو دوسری چیزوں میں پیدا کرتا ہے انبیاء اس آواز کو سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی آواز ہے اور جب یہ بحث کچھ آگے بڑھی تو خلق قرآن کا مسئلہ پیدا ہوا۔ ان لوگوں کا طرز فکر یہ تھا کہ قرآن مجید صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا، آپ سے پہلے اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ ایک بامعنی عبارت ہے اور عبارت جملوں سے اور

---

[1] الاسماء والصفات للبیهقی: ٨٦٧۔

جملے الفاظ سے اور الفاظ حروف سے مرکب ہیں، اور حروف کی یہ ترتیب اور شکل وصورت قدیم سے موجود نہیں تھی۔ بعد کو پیدا ہوئی، اس لحاظ سے سارا قرآن مجید مخلوق ٹھہرا، اس کے علاوہ قرآن مجید میں بہت سے اشخاص اقوام اور واقعات کا ذکر ہے جن کا وجود مختلف زمانوں میں تھا، اس لیے سارا قرآن مجید مخلوق اور حادث قرار پایا اور جب ان سے دلیل کا مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے قرآن مجید کی بعض آیتوں کو پیش کرنا شروع کیا جیسے:

﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ﴾ [1]

''اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔''

﴿قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ۫﴾ [2]

''اے پیغمبر کہہ دے کون سی چیز سب سے بڑی گواہ ہے کہہ دے اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔''

﴿اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا﴾ [3]

''ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا۔''

یہاں جَعَلْنَاهُ کے معنی خَلَقْنَاهُ کے قرار دیتے تھے حالانکہ ہر جگہ یہ معنی صادق نہیں آسکتے تھے۔

جب یہ بحث اور آگے بڑھی تو خود اہل سنت والجماعت میں اس مسئلہ پر اختلاف پیدا ہوگیا کہ انبیاء نے خدا کا جو کلام سنا وہ کلام لفظی ہے یا کلام نفسی، ظاہر ہے کلام لفظی الفاظ اور حروف سے مرکب ہوتا ہے اور چونکہ الفاظ اور حروف حادث ہیں اس لیے کلام لفظی بھی حادث ہوجاتا ہے اور چونکہ حادث کا قیام خدا کے ساتھ نہیں ہوسکتا اس لیے اس سے کلام لفظی کا صدور نہیں ہوسکتا، اس لحاظ سے انبیاء نے جو کلام سنا وہ کلام نفسی ہی ہوسکتا ہے جو الفاظ اور حروف سے بالکل عاری ہوتا ہے، اس کے دوسرے معنی یہ ہوگئے کہ قرآن مجید کے صرف معانی خدا کے ہیں اور الفاظ اور حروف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں، حالانکہ قرآن مجید صراحۃً اس عقیدے کا سخت مخالف ہے وہ تو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا ایسا کلام بتاتا ہے جو دوسروں کو بھی سنائی دے

---

[1] ۳۹/الزمر:۶۲۔ [2] ۶/الانعام:۱۹۔ [3] ۴۳/الزخرف:۳۔

سکتا ہے چنانچہ سورۂ توبہ میں ہے۔

﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ﴾ [1]

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ کا یہ کلام لفظی ہے کلام نفسی نہیں ہے اس قسم کی کج بحثی سے قرآن مجید کی عظمت و برتری کو ایک زبردست دھچکا لگنے والا تھا، اگر متبعین قرآن و سنت اس قسم کی عقلی قیاس آرائیوں اور کج بحثیوں کے سامنے سر جھکا دیتے تو قرآن مجید کی حیثیت محض ایک انسان کی بنائی ہوئی کتاب کی ہو جاتی جیسا کہ تورات وانجیل وغیرہ کی اصل کے کھو جانے کی وجہ سے آج ان کی حالت ہوگئی ہے۔ متبعین کتاب وسنت نے اس خطرے کو پوری طرح محسوس کیا اور ہر قدم پر اس قسم کی غلط قیاس آرائیوں اور عقلی کج بحثیوں کی سخت ترین مخالفت شروع کر دی، جس کی وجہ سے انہیں قید و بند اور رنج ومحن کی صبر آزما مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

کج بحثیوں کی ابتدا

صحابہ کرام ہی کے زمانے میں اس قسم کی کج بحثیوں کی ابتداء ہو چکی تھی، بعض لوگ تقدیر کا انکار کرنے لگے تھے، صحابہ کرام تقدیر کے مسئلے پر شدت کے ساتھ یقین رکھتے تھے، طاؤس یمانی کا بیان ہے کہ میں نے متعدد صحابہ سے ملاقات کی، سب کا یہی خیال تھا کہ تمام چیزیں تقدیر سے وجود میں آئی ہیں۔ [2] ابن دیلمی کہتے ہیں کہ میرے دل میں مسئلہ تقدیر کے متعلق خدشہ پیدا ہوا، میں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اس کا تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا: اگر تم خدا کی راہ میں اُحد کے پہاڑ کے برابر بھی سونا دو تو خدائے تعالیٰ اس وقت تک اس کو قبول نہیں کر سکتا جب تک تم تقدیر پر ایمان نہ لاؤ، اگر تم کو اس حالت میں موت آ جائے تو تم جہنم میں داخل ہو گے، ابن دیلمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ بن الیمان اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوحفصہ رضی اللہ عنہ کو نصیحت کی اور فرمایا: بیٹے تم کو اس

---

[1] ۹/التوبة: ٦۔ [2] صحيح مسلم، كتاب القدر، باب كل شيء بقدر، ح: ٢٦٥٥ (٦٧٥١)؛ مسند احمد: ١٠/١٣٣، ح: ٥٨٩٣۔

وقت تک ایمان کی حقیقی لذت نہ ملے گی جب تک کہ تم کو یہ یقین نہ ہو کہ جو کچھ ہوا اس کا ہونا لازمی تھا اور جو کچھ نہیں ہوا اس کا نہ ہونا ضروری تھا۔ [1] اسی بنا پر جب کوئی مسئلہ تقدیر کا انکار کرتا تو صحابہ کرام سختی کے ساتھ اس کی مخالفت کرتے اور اس سے اپنی برأت ظاہر کرتے تھے۔ چنانچہ جب یحییٰ بن یعمر اور حمید بن عبدالرحمٰن نے حج کے سفر میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ سنایا کہ کچھ مسلمان تقدیر کا انکار کر رہے ہیں تو آپ نے صاف طور پر فرمایا کہ ان سے ملنا تو یہ کہہ دینا کہ میں ان سے الگ ہوں اور وہ مجھ سے الگ ہیں، خدا کی قسم! اگر وہ احد کے پہاڑ کے برابر بھی سونا خیرات کر دیں اور تقدیر سے انکار کریں تو ہرگز خدا ان کی خیرات کو قبول نہیں کرے گا۔ [2]

معبد الجہنی

تقدیر کے انکار کرنے والوں میں سب سے زیادہ معروف و مشہور نام معبد الجہنی کا ہے، وہ بصرہ میں رہتا تھا۔ اور اعلانیہ بنی امیہ کی خلافت کا منکر تھا۔ اس بنا پر حجاج بن یوسف ثقفی نے ۸۰ھ میں اس کو قتل کروا دیا۔

غیلان الدمشقی

معبد الجہنی کے بعد ابو مروان غیلان بن مروان الدمشقی نے اس مسئلہ کا پرچار شروع کیا اور حکومت وقت کی پرزور مخالفت شروع کی، جس کی بنا پر اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے ۱۲۵ھ میں اس کو قتل کروا دیا۔

جعد ابن درہم

سب سے پہلا شخص جس نے صفات الٰہی کا انکار کیا اور قرآن مجید کے مخلوق ہونے کا نظریہ پیش کیا وہ جعد بن درہم تھا، وہ ابان سمعان کا شاگرد تھا، جس نے لبید بن اعصم یہودی کے بھانجے اور داماد طالوت سے تعلیم حاصل کی تھی، یہ لبید بن اعصم وہی شخص تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا، کہا جاتا ہے کہ لبید نے یمن کے ایک یہودی سے علم حاصل کیا

---

[1] ابو داود، کتاب السنة، باب فی القدر: ٤٦٩٩۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام......ح: ٨ (٩٣)

تھا، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جعد بن درہم پر یہودی خیالات کا کتنا بڑا اثر ہوگیا تھا، امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ جعد بن درہم اصل میں حران کا رہنے والا تھا اور اس نے وہاں کے ستارہ پرست صابی فلاسفہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ [1]

جعد بن درہم دمشق آ کر بس گیا تھا، حافظ ابن کثیر نے ابن عساکر کی تاریخ کی حوالے سے کہا ہے کہ جعد اکثر وہب بن منبہ (المتوفی: ۱۱۰ھ) کی خدمت میں آیا کرتا تھا اور اُن سے صفاتِ الٰہی کے مسئلہ پر بحث کیا کرتا تھا، ایک دن وہب نے کہا: اے جعد! تو ہلاک ہو، اس سوال کو بار بار اٹھایا نہ کر، میں سمجھتا ہوں کہ تو اسی میں ہلاک ہوگا، پھر کہا اگر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ہم سے یہ کہتا کہ اس کے ہاتھ نہیں ہیں تو ہم بھی یہ کہہ دیتے کہ اس کے ہاتھ نہیں ہیں اور اگر ہم سے یہ کہتا کہ اس کی آنکھیں نہیں ہیں تو ہم بھی یہ کہہ دیتے کہ اس کی آنکھیں نہیں ہیں، اور اگر ہم سے یہ کہتا کہ اس کے لیے نفس نہیں ہے تو ہم بھی کہہ دیتے کہ اس کے لیے نفس نہیں ہے اور اگر ہم سے یہ کہتا کہ اس کے کان نہیں ہیں تو ہم بھی کہہ دیتے کہ اس کے کان نہیں ہیں، وہب ابن منبہ نے دوسری صفاتِ الٰہی کے متعلق بھی اسی قسم کا الزامی جواب دیا۔ [2]

جب اس کی اس بحث کا ہر طرف چرچا ہوا اور علما کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہونے لگی تو جعد بن درہم دمشق کوفہ چلا گیا جو اس زمانے میں شیعی تحریک کا ایک زبردست مرکز بن چکا تھا، وہاں سے وہ واسط چلا گیا، یہاں کے عامل خالد بن عبداللہ القسری نے اس کو گرفتار کیا اور ٹھیک بقرعید کے دن ۱۲۵ھ میں اس کو قتل کر دیا۔

جہم بن صفوان

جعد بن درہم کے قتل ہو جانے کی وجہ سے یہ فتنہ دب نہیں گیا، بلکہ اس کے شاگرد جہم بن صفوان نے ان خیالات کی زوردار تبلیغ شروع کی، یہ شخص اصل میں خزر کا رہنے والا تھا، بعض کہتے ہیں کہ وہ ترمذ کا تھا، اور بلخ میں سکونت اختیار کی تھی، کہا جاتا ہے کہ وہ عموماً مقاتل بن سلیمان کی مسجد میں نماز پڑھا کرتا تھا اور اکثر ان سے مناظرہ بھی کیا کرتا تھا، جب لوگوں نے اس کے ان فاسد خیالات کو سنا تو اس کے خلاف شورش شروع کر دی، وہ بلخ سے ترمذ اور ترمذ

---

[1] مجموعة الرسائل الكبرى ١/ ٤٢٥۔ [2] البداية والنهاية: ٩/ ٣٥٠۔

سے مرو چلا گیا، جب حارث بن سُریج نے بنی امیہ کے خلاف بغاوت اختیار کی تو جہم بن صفوان بھی اس کے ساتھ مل گیا، ان دونوں نے خراسان کے عامل نصر بن سیار کو اپنے ساتھ ملا لینے کی کوشش کی، جب وہ ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوا تو جہم بن صفوان نے مسجدوں میں اور سڑکوں پر حارث بن سُریج کی تعریف وتوصیف شروع کر دی اور بہت سے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنالیا، یہ دیکھ کر نصر بن سیار نے ان دونوں کے خلاف ایک زبردست فوج روانہ کی، کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی میں جو ۱۲۸ھ میں پیش آئی کسی نے جہم کے منہ پر اس زور کا نیزہ مارا کہ وہ ہلاک ہو گیا، بعض کہتے ہیں کہ وہ گرفتار ہو کر امیر سلم بن اعوز المازنی کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے اس کو قتل کر دیا۔

مسلک اعتزال

اسی زمانے میں فتنۂ اعتزال پیدا ہوا، جس کا بانی واصل بن عطاء (المتوفی: ۱۳۱ھ) تھا یہ شخص حضرت امام حسن بصری کا شاگرد تھا اور اپنے دور کا بہترین خطیب، متکلم اور مناظر تھا، جب ایک مرتبہ امام حسن بصری کی درسگاہ میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی کہ آیا گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے یا نہیں تو واصل نے کہا کہ وہ نہ تو کافر ہے اور نہ مسلمان۔ وہ ایمان اور کفر کے درمیان کا درجہ رکھتا ہے، امام حسن بصری نے اس کو اپنی مجلس سے اٹھوا دیا۔ اُس نے بصرے کی جامع مسجد ہی میں اپنا الگ حلقۂ درس قائم کیا، حضرت امام حسن بصری کے حلقۂ درس سے الگ ہو جانے کی وجہ سے لوگوں نے اس کو معتزلی کہنا شروع کیا اور اس وقت سے اس کے مسلک کا نام مسلک اعتزال اور اس کے پیروؤں کا نام معتزلہ پڑ گیا، اس مسلک کے ماننے والوں میں بہت سے قابل اشخاص گزرے ہیں، ھیاج بن علاء السلمی۔ بشر بن غیاث المریسی (المتوفی: ۲۱۸ھ) قاضی احمد بن ابی داؤد (المتوفی: ۲۴۱ھ) یحییٰ بن مبارک زبیدی، ثمامہ ابن الشرس بصری (المتوفی: ۲۱۳ھ)، ابو الہذیل العلاف (المتوفی: ۲۲۶ھ) اور ابراہیم بن سیار نظام (المتوفی: ۲۳۱ھ)، ابو سہیل بشر ابن المعتمر (المتوفی: ۲۳۰ھ) جیسے لوگوں نے اس مذہب کو بڑی ترقی دی اور اس کو ہر جگہ پھیلایا۔

بشر بن غیاث المریسی

جہم بن صفوان کے بعد اس کا لڑکا محمد اس کا جانشین ہوا، جب بنی امیہ کا تختہ اُلٹ گیا اور بنی عباس سریر آرائے خلافت ہوئے تو محمد ابن جہم اور اس کے ساتھیوں نے جن میں بہت سے معتزلہ بھی تھے عباسی دربار میں رسائی پیدا کی اور خلفاء پر دھیرے دھیرے اپنا اثر ڈالنا شروع کیا، جب مامون باللہ خلیفہ ہوا، تو اس نے دینِ اسلام کی ہر ایک چیز کو عقل اور فلسفہ کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا، یونانی کتابوں کے مطالعے اور مشائخ اعتزال کی صحبت نے اس کو طبعاً عقلیت پسند بنا دیا تھا، مشہور معتزلی ابوعبدالرحمٰن بشر بن غیاث بن ابی کریمۃ المریسی، مامون باللہ کا استاد تھا، اس نے اور قاضی احمد بن ابی داود معتزلی نے اس کو غلط راستے پر ڈالنا شروع کیا اور سمجھایا کہ راہِ حق مسلک اعتزال کے ماننے ہی میں ہے اور اسی صورت میں عقلیت اور فلسفہ کی طرف سے اسلام کے خلاف پیش کیے ہوئے شبہات کا تشفی بخش جواب دیا جا سکتا ہے۔

فتنۂ خلقِ قرآن

انہی حالات میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مامون باللہ تمام علما کو خلق قرآن کے مسئلہ کی طرف اصرار کے ساتھ دعوت دینے پر مجبور ہو گیا، دربارِ خلافت میں اکثر مناظرے اور مباحثے ہوا کرتے تھے، ایک مرتبہ اس کی مجلس میں ایک عیسائی نے دعویٰ کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قدیم ہیں جب اس سے دلیل کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے کہا کہ قرآنِ مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے اور اللہ کا کلمہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق غیر مخلوق اور قدیم ہے، اس لیے حضرت مسیح بھی اللہ کا کلمہ ہونے کے باعث قدیم اور غیر حادث ہو گئے، اس کا یہ عجیب وغریب استدلال مامون باللہ کو بے چین کر گیا اس نے خود ہی اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قاضی احمد ابن ابی داؤد اور اس کے ساتھیوں نے مامون باللہ کو اس پر آمادہ کیا کہ تمام علما کو خلقِ قرآن کے ماننے پر مجبور کرے

چنانچہ اس نے ۲۱۸ھ میں رقہ سے اپنے نائب بغداد اسحاق بن ابراہیم بن مصعب الخزاعی کے نام خط لکھا کہ عام جاہل اور بے وقوف رعایا کا ایک بڑا حصہ فکر ونظر کی اہلیت نہیں

رکھتا، اس کو علم و برہان کی روشنی حاصل نہیں ہے وہ اللہ کے بارے میں جہالت اور گمراہی میں پڑا ہوا ہے، اور دین کی حقیقت سے واقف نہیں ہے، وہ خدا کا صحیح مرتبہ نہیں جانتا اور اس کے اور اس کی خلق کے درمیان تمیز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، اس لیے وہ قرآن کو قدیم مانتا ہے، حالانکہ قرآن مجید کی مختلف آیتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ مخلوق ہے، ایک گروہ جو اپنے آپ کو اہل حق اور اہل سنت و جماعت تصور کرتا ہے اور دوسروں کو اہل کفر و باطل خیال کرتا ہے ان عام لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے، یہ لوگ درحقیقت بدترین امت ہیں انہیں توحید کا علم حاصل نہیں ہے، ایسے لوگ دین کے دشمن ہیں، ان کی گواہی قبول نہیں ہونی چاہیے، پس تمہیں چاہیے کہ اپنے دربار کے قاضیوں کو جمع کر کے ان کا امتحان لو اور ان کے جوابات لکھ بھیجو، نیز سات شخصوں یعنی محمد بن سعد کاتب الواقدی، یحییٰ بن معین، ابوخثیمہ، ابومسلم مستملی، یزید ابن ہارون، اسماعیل بن داؤد، اسماعیل بن ابی مسعود اور احمد بن ابراہیم دورقی کو بغداد سے رقہ روانہ کرو، مامون نے اُن سے خلق قرآن کے متعلق سوالات پوچھے، ابتدا میں تو اُن لوگوں نے توقف کیا، مگر پھر تلوار کے ڈر سے اُنہوں نے خلق قرآن کے مسئلہ کو مان لیا، یہ لوگ رقہ سے بغداد واپس کر دیئے گئے، مامون نے دوبارہ لکھا کہ ان سات آدمیوں نے خلق قرآن کو مان لیا ہے، اب دوسروں کو بھی بلا کر مجبور کرو کہ وہ اس مسئلے کو تسلیم کر لیں، مذکورہ بالا اشخاص کا کہنا یہ تھا کہ یہ محض مجبوری کا اعتراف ہے انہوں نے درحقیقت اس مسئلہ کو نہیں مانا، وہ یہ کہتے تھے کہ اُن کا دل ابھی تک ایمان پر قائم ہے، وہ اس آیت کو اپنے لیے بطور عذر پیش کرتے تھے:

﴿ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ ﴾ [1]

''مگر وہ جو مجبور کیا گیا اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہے۔''

یعنی جبر و اکراہ کی بنا پر انہوں نے اس مسئلے کو مانا۔

مامون کے خط کی بنا پر اسحاق نے امام احمد بن حنبل، بشر بن الولید الکندی، ابوحسان الزیادی علی بن ابی مقاتل، فضل بن غانم، عبیداللہ بن عمر القواریری، علی ابن الجعد، حسن بن حماد سجادہ، ذیال بن ہیثم، قتیبہ بن سعید، سعدونۃ الواسطی، اسحاق بن ابی اسرائیل، ابن الہرش،

---

[1] ١٦/النحل: ١٠٦۔

ابن علیۃ الاکبر، محمد بن نوح العجلی جندیسابوری، یحییٰ بن عبدالرحمٰن العمری، ابونصر التمار، ابومعتمر القطیعی، محمد بن خاتم بن میمون وغیرہ کو بلایا، اور اس مسئلہ کے ماننے پر انہیں مجبور کیا، امام احمد ابن حنبل، محمد بن نوح العجلی جندیسابوری، حسن بن حماد سجادہ اور عبیداللہ بن عمر القواریری کے سوا سب نے اس کو مان لیا، اسحاق نے انہیں بیڑیاں پہنا دیں، جب اور سختی کی تو دوسرے دن حسن ابن حماد سجادہ نے اور تیسرے دن عبیداللہ بن عمر القواریری نے بھی اس مسئلہ کو تسلیم کرلیا، امام احمد اور محمد بن نوح کو مامون کے پاس طرسوس روانہ کیا، راستے ہی میں ۱۲ رجب ۲۱۸ھ کو مامون باللہ کے وفات پا جانے کی خبر ملی، دونوں راستے ہی سے بغداد لوٹا دیئے گئے، عانات پہنچ کر محمد بن نوح کا انتقال ہو گیا، امام احمد نے جنازے کی نماز پڑھائی اور انہیں دفن کیا، امام احمد چند مہینے بغداد کے قید خانہ ناصریہ اور دارالتریب میں محبوس رہے، اور پھر درب الموصلیہ کے عام قید خانے میں بند کر دیئے گئے، اسحاق بن ابراہیم کی طرف سے علما آتے تھے اور امام احمد سے بحث کرتے تھے، مگر کوئی بھی ان کو اس مسئلے کا قائل نہیں کر سکا، آخر رمضان ۲۲۱ھ میں وہ معتصم باللہ کے سامنے پیش کیے گئے، جو مأمون باللہ کے بعد خلیفہ ہوا تھا، اس نے قاضی احمد بن ابی داؤد کو حکم دیا کہ وہ امام احمد سے بحث کر کے انہیں اس مسئلہ کا قائل کرے، قاضی احمد نے پوچھا بتاؤ تم قرآن کے بارے میں کیا کہتے ہو، امام احمد چپ رہے، معتصم نے کہا تم جواب کیوں نہیں دیتے، امام احمد نے خلیفہ سے مخاطب ہوکر پوچھا بتایئے آپ اللہ کے علم کے بارے میں کیا کہتے ہیں، خلیفہ چپ رہا، امام احمد نے کہا جو شخص اللہ کے علم کو مخلوق کہتا ہے وہ کافر ہے، احمد بن ابی داؤد اور اس کے حواریوں نے فوراً کہا، دیکھا اس شخص (امام احمد) نے آپ (معتصم) کو اور ہم سب کو کافر بنا دیا، ابن ابی داؤد نے کہا اللہ تھا اور قرآن نہیں تھا، امام احمد نے کہا اللہ تھا اور علم نہیں تھا، احمد ابن ابی داؤد کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا، اس نے کہا کیا اللہ یہ نہیں کہتا: ﴿ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، چونکہ قرآن بھی ایک چیز ہے اس لیے اس آیت کے مطابق قرآن مجید بھی مخلوق ٹھہرا۔ امام احمد نے فوراً اسی قسم کی دوسری آیت پیش کی اور فرمایا کیا اللہ یہ نہیں فرماتا: ﴿ تُدَمِّرُ كُلَّ

شَیْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰۤی اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ط ﴾ [1] آندھی (جو قوم عاد پر بھیجی گئی) اپنے رب کے حکم کے ہر چیز کو تباہ کر رہی تھی، پس وہ ایسے ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ''ہر چیز'' فرمایا ہے اور چیز کا اطلاق تمہارے قول کے مطابق مساکن (گھروں) پر بھی ہونا چاہیے گھر برباد نہیں ہوئے تھے، گھر باقی رہ گئے تھے جیسا کہ آیت مذکورہ سے صاف واضح ہے، ابن ابی داود نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ بے شک ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا، کیا مجعول مخلوق کے سوا اور کوئی چیز ہو سکتی ہے؟ امام احمد نے فوراً ہی اسی قسم کی دوسری آیت پیش کی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ﴾ پس ان کو کھائی جانے والی بھوسی کی طرح بنا دیا، تو کیا یہاں فَجَعَلَهُمْ (ان کو بنایا) کے معنی خَلَقَهُمْ (ان کو پیدا کیا) کے ہیں؟ بہت دیر تک امام احمد سے اس قسم کی بحث ہوتی رہی اور وہ اسی قسم کے الزامی جوابات دیتے رہے، اس قسم کے مسکت جوابات کی بنا پر احمد بن ابی داؤد اور اس کے حواری بہت خفیف ہوئے اور اپنی خفت مٹانے کے لیے انہوں نے امام احمد کو گمراہ اور بدعتی کہنا شروع کیا، اور خلیفہ سے کہا کہ اس کو ضرور اس کی سزا ملنی چاہیے، جب قرآن و سنت کے دلائل دینے کی بجائے، محض عقلی گھوڑے دوڑانے شروع کیے اور امام احمد کو اس مسئلہ کے ماننے پر مجبور کیا تو کہا:

أَعْطُوْنِيْ شَيْئًا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِهٖ حَتّٰى أَقُوْلَ بِهٖ.

مجھ کو اللہ کی کتاب اور اسکے رسول کی سنت سے کچھ دو تا کہ اس کو میں مانوں۔

اوپر کی بحث سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ احمد ابن ابی داؤد اور اس کے حواری قرآن مجید اور سنت رسول سے اپنے دعوؤں کو ثابت نہیں کر سکتے تھے، وہ محض عقلی قیاس آرائیاں کرتے تھے، جب امام احمد نے دوسرے اور تیسرے دن بھی ان کے اس گمراہ کن مسئلے کو نہیں مانا تو معتصم نے جلادوں کو حکم دیا کہ اپنی پوری شدت اور قوت کے ساتھ کوڑے لگائیں، ہر ایک

---

[1] ٤٦/الاحقاف:٢٥۔

جلاد آگے بڑھتا تھا اور اپنی پوری قوت کے ساتھ دو کوڑے لگاتا تھا اور پیچھے ہٹ آتا تھا، معتصم سمجھتا تھا کہ امام احمد کم از کم مار کی تکلیف کی وجہ سے اس کو مان لیں گے اور جب وہ مان لیں گے تو عام مسلمانوں سے اس کے منوانے میں کوئی بڑی دقت نہ ہوگی، مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ ہر ایک کوڑے پر امام احمد کا عزم اور پختہ ہوتا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ۲۵ رمضان ۲۲۱ھ کو پیش آیا تھا، امام احمد روزہ رکھے ہوئے تھے، سارا بدن چھلنی ہو گیا تھا، روزے کی حالت میں کوڑوں کی مار بہت ہی سخت ہوتی ہے، اس کے باوجود امام احمد نے اس مسئلہ کے ماننے سے سخت انکار کر دیا انہوں نے اتنی مار کھائی کہ وہ بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو کھانے کے لیے ستو پیش کیا گیا، امام احمد روزہ چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے، اس کے بعد وہ اسحاق بن ابراہیم کے گھر لائے گئے بدن سے خون بہتا جا رہا تھا، وہاں ظہر کی نماز پڑھی۔ قاضی ابن سماعہ نے اعتراض کیا اور کہا تم نے خون بہنے کی حالت میں نماز پڑھی؟ امام احمد نے فوراً جواب دیا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی حالت میں نماز پڑھی تھی، قاضی ابن سماعہ چپ ہو گئے اس کے بعد امام احمد کو ان کے گھر پہنچا دیا گیا۔

خلق قرآن کا یہ فتنہ معتصم اور واثق کے زمانۂ خلافت میں جاری رہا، امام احمد سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا، کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ امام موصوف کسی حالت میں بھی اس مسئلہ کو نہیں مانیں گے، البتہ دوسرے علما کی پکڑ دھکڑ ہوتی رہتی تھی، اور انہیں سزائیں دی جاتی تھیں، جب ۲۳۲ھ میں متوکل تخت خلافت پر آیا تو اس نے عام حکم جاری کر دیا کہ اس مسئلے سے متعلق مسلمانوں سے کوئی گرفت نہ کی جائے۔

جہمیہ اور معتزلہ کی تردید

امام احمد نے کتاب الرد علی الجہمیہ اور ان کے لڑکے عبداللہ نے کتاب السنۃ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں جہمیہ اور معتزلہ کے خیالات کی تردید تھی، امام احمد کے شاگرد مشہور محدث عثمان بن سعید دارمی (المتوفی: ۲۸۰ھ) نے "نقض عثمان بن سعید علی الکاذب العنید فیما افتری علی اللّٰہ فی التوحید" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جن میں بشر بن غیاث بن ابی کریمۃ المریسی کے خیالات کی تردید کی تھی، امام بخاری اور

دیگر محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں توحید اور صفاتِ الٰہی کے متعلق حدیثوں کو جمع کیا اور ان پر قرآن مجید سے استدلال لیا تھا، جب تیسری صدی ہجری کے آخر میں جہمیہ اور معتزلہ کا زور ہوا تو امام ابوبکر احمد بن محمد الخلال (المتوفی: ۳۱۰ھ) نے کتاب السنۃ کے نام سے اور حافظ ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ (المتوفی: ۳۱۱ھ) نے کتاب التوحید کے نام سے اور اسی طرح مشہور محدث عبدالرحمٰن بن ابی حاتم رازی (المتوفی: ۳۲۷ھ) نے کتاب الرد علی الجہمیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

امام ابوالحسن اشعری

یہی وہ زمانہ تھا جب کہ امام ابوالحسن علی بن اسماعیل الاشعری (المتوفی: ۳۳۰ھ) نے مسلک اعتزال کی دھجیاں اڑانی شروع کیں، وہ ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور مشہور معتزلی شیخ ابوعلی محمد بن عبدالوہاب الجبائی (المتوفی: ۳۰۳ھ) کی شاگردی اختیار کی تھی، کہا جاتا ہے کہ امام ابوالحسن اشعری چالیس سال تک مسلک اعتزال کے پیرو اور اس کے زبردست حامی رہے، مگر جب قرآن وحدیث کا مطالعہ زیادہ ہوا تو ان کے خیالات میں ایک زبردست انقلاب ہوگیا، وہ کچھ دن تک روپوش رہے اور اس کے بعد جب باہر آئے تو بصرہ کی جامع مسجد میں علی الاعلان مسلک اعتزال سے توبہ کی اور اپنے ہی شیخ ابوعلی الجبائی سے مناظرے شروع کردیے۔

امام ابوالحسن اشعری نے جہمیہ اور معتزلہ کی تردید میں کئی ایک کتابیں لکھیں، جن میں کتاب الابانہ عن اصول الدیانہ اور مقالات الاسلامیین بہت ہی مشہور ہیں، ایران، عراق، شام، مصر اور عرب کے مختلف علاقوں سے جو سوالات آئے تھے ان کے تفصیلی جواب لکھے اور ہر ایک میں بڑی شدت اور قوت کے ساتھ جہمیہ اور معتزلہ کے خیالات کی تردید کی، کتاب الابانہ کی ابتداء میں جو تمہیدی مقدمہ ہے، ان سے ان کے خیالات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔اسی لیے ذیل میں اس کا ترجمہ دیا جاتا ہے وہ لکھتے ہیں:

معتزلہ اور قدریہ کے اکثر لوگ اپنی خواہشات نفسانی کی بنا پر اپنے روساء اور ان کے اسلاف کی تقلید کرتے ہیں اور قرآن مجید کی آیات کی ایسی تاویل کرتے ہیں جس کی دلیل اللہ

تعالیٰ نے نہیں اتاری اور نہ اس کو رسول اللہ ﷺ اور سلف متقدمین نے نقل کیا، اسی وجہ سے رؤیت باری کے مسئلہ میں انہوں نے آنحضرت ﷺ سے صحابہ کی روایت کی مخالفت کی، حالانکہ مختلف جہتوں سے اس کے متعلق روایات، آثار اور اخبار منقول ہیں، انہوں نے شفاعت آنحضرت ﷺ کا بھی انکار کیا اور سلف متقدمین سے اس کے متعلق جو روایت آئی ہے اس کو قبول نہیں کیا، یہ لوگ عذاب قبر کے بھی منکر ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ قبروں میں کفار کو عذاب نہیں ہوگا، حالانکہ اس بات پر صحابہ اور تابعین کا اجماع ہے، یہ لوگ اپنے مشرک بھائیوں کی طرح جو قرآن کو بشر کا کلام کہتے ہیں خلق قرآن کے قائل ہیں اور مجوس کی طرح جو خیر اور شر کے دو الگ الگ خالق مانتے ہیں، بندوں کو اشیاء کا خالق قرار دیتے ہیں، قدریہ کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر کا اور شیطان شر کا خالق ہے، اور اجماع مسلمین کے برخلاف وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسی چیز چاہتا ہے جو ہوتی نہیں ہے، اور ایسی چیز نہیں چاہتا جو ہو جاتی ہے۔ حالانکہ خدا نے کئی جگہ یہ بتایا کہ وہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے، اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہیں لڑتے۔ نیز فرمایا: اگر ہم چاہتے، تو ہر نفس کو ہدایت دیتے۔ نیز فرمایا کہ وہ جو چاہتا ہے اس کو کر بیٹھتا ہے قرآن مجید میں حضرت شعیب کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ایمان لانے کے بعد کفر میں لوٹ پڑیں مگر یہ کہ اللہ چاہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو اس امت کا مجوس قرار دیا ہے، کیونکہ انہوں نے ٹھیک مجوس کے دین اور ان کے قول کی اتباع کی اور خیر اور شر کے دو الگ الگ خالق قرار دیے اور یہ بھی کہا کہ شر خدا کے چاہنے کے بغیر بھی صادر ہو سکتا ہے، انہوں نے انسان کو اپنے نفع اور نقصان کا مالک اور اپنے اعمال پر قادر قرار دیا، جس پر خدا کا کوئی قابو نہیں ہو سکتا، یہ لوگ اپنے آپ کو ایسی قدرت والا بتاتے ہیں، جتنا کہ وہ خدا کے متعلق نہیں بتاتے، جیسا کہ مجوس شیطان کو شر پر ایسی قدرت ثابت کرتے ہیں جتنی کہ خدا کو حاصل نہیں ہے، اسی وجہ سے وہ اس امت کے مجوس ہوئے کیونکہ انہوں نے مجوس کے دین کی پیروی کی اور ان کے اقوال کی پابندی کی، اور ان کی گمراہیوں کی طرف مائل ہو کر دوسرے لوگوں کو خدا کی رحمت سے ناامید کیا، ان کا یہ فیصلہ ہے کہ گنہگار ہمیشہ کے لیے دوزخی

ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمایا کہ وہ شرک کے سوا باقی گناہوں کو بخش دیتا ہے، وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ گنہگار دوزخ میں داخل ہونے کے بعد اس سے باہر نہیں آسکتے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ سے صاف روایت آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو آگ میں تہس نہس ہونے اور سیاہ ہو جانے کے بعد اس سے نکالے گا، وہ اس کا بھی انکار کرتے ہیں کہ اللہ کے لیے چہرہ ہے، باوجود اس کے قرآن مجید میں مذکور ہے، تیرے بزرگی اور عزت والے پروردگار کا چہرہ باقی رہے گا، وہ اس کا بھی انکار کرتے ہیں کہ اللہ کے لیے ہاتھ ہیں، باوجود اس کے کہ اللہ نے فرمایا: تجھ کو کس چیز نے اس شخص کے سامنے جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا سجدہ کرنے سے روکا، وہ اس کا بھی انکار کرتے ہیں کہ اللہ کی آنکھیں ہیں، حالانکہ اللہ نے فرمایا: حضرت نوح کی کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی، نیز فرمایا تا کہ تم (حضرت موسیٰ) میری آنکھوں کے سامنے پرورش پاؤ، یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی اس حدیث کو بھی نہیں مانتے کہ اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر اترتا ہے، ان شاء اللہ میں ان میں سے ہر ایک چیز کا بابا بابا تذکرہ کروں گا۔

اگر کہنے والا یہ کہے کہ تم نے معتزلہ، قدریہ، جہمیہ، حروریہ، رافضہ، مرجیہ کے قول کا انکار کیا پس تم اپنا وہ قول بتاؤ جس کے تم قائل ہو اور وہ دین بتلاؤ جس کی تم پیروی کر رہے ہو تو ہم یہ کہیں گے کہ ہمارا قول جس کے ہم قائل ہیں اور ہمارا دین جس کی ہم پیروی کر رہے ہیں، کتاب وسنت اور صحابہ و تابعین اور ائمۂ حدیث کی روایات کی پابندی کرنا ہے، اور اس چیز کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا ہے جس کے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ قائل تھے اور ان کے مخالفین سے پرہیز کرنا ہے کیونکہ وہ امام فاضل اور رئیس کامل تھے جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے گمراہی کے زمانے میں حق کو ظاہر کیا اور شریعت کی راہ کو واضح کیا اور بدعتوں کی بدعت کو اور گمراہوں کی گمراہی کو اور شک کرنے والوں کے شک کو دور کیا، اللہ تعالیٰ اتنے بڑے سمجھدار امام پر اپنی رحمت کاملہ نازل فرمائے، اور تمام ائمہ مسلمین کو اپنی مہربانیوں سے نوازے۔

اس کے بعد امام ابوالحسن اشعری نے اللہ اور اس کی صفات، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اس کے رسولوں، جنت اور دوزخ، قیامت، بعثت بعد الموت، استواء علی العرش،

اعضائے خداوندی، خلق قرآن، مشیت الٰہی، رؤیت باری، شفاعت وغیرہ کے متعلق انہی خیالات کا اظہار کیا ہے جن کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

یہاں ایک بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ عقائد میں امام ابوالحسن اشعری اور امام احمد بن حنبل کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا، امام ابوالحسن امام احمد کی جلالت شان اور علو مقام کے بے حد قائل تھے، جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے، مگر آگے چل کر اشاعرہ اور حنابلہ عقائد کے معاملہ میں بری طرح ایک دوسرے سے الجھنے لگے، اس کی وجہ سے ان دونوں فرقوں کے درمیان بسا اوقات سر پھٹول ہوتی تھی، بلکہ کشت وخون کی نوبت بھی آجاتی تھی، اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ متاخرین اشاعرہ نے امام الحسن اشعری کے اصل مسلک سے ہٹ کر عقلیت پسندی کو اپنا شعار بنالیا تھا، اور قرآن مجید کی صاف اور واضح آیات اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تاویل شروع کر دی تھی، جیسا کہ آیندہ کی تصریحات سے واضح ہوگا، اور جب حنابلہ ان کی اس عقلیت پسندی کی تائید نہیں کرنے لگے بلکہ الٹی تنقید کرنے لگے تو ان کو برا لگتا تھا اور اس کی وجہ سے بارہا جھگڑے ہونے لگتے تھے۔

عقائد کے متعلق سلسلۂ تصنیفات

چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں عقائد کے متعلق اور کتابیں لکھی گئیں جن میں ابو عبداللہ بن بطۃ العکبری الحنبلی (المتوفی: ۳۸۷ھ) کی کتاب الابانہ، قاضی ابوبکر محمد بن الطیب بن الباقلانی (المتوفی: ۴۰۳ھ) کی کتاب الابانہ اور کتاب التمہید، استاد ابوبکر بن فورک (المتوفی: ۴۰۶ھ) کی ہجری کی کتاب التاویلات، حافظ ابوالقاسم ہبۃ اللہ بن الحسن بن منصور الالکائی کی کتاب السنن، ابوذر الہروی (المتوفی: ۴۳۴ھ) کی کتاب السنۃ، حافظ ابو نعیم الاصبہانی (المتوفی: ۴۳۰ھ) کی کتاب الحلیہ فی العقیدہ بہت مشہور ہیں، آگے چل کر حافظ ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی (المتوفی: ۴۵۸ھ) نے کتاب الاسماء الصفات لکھی جس میں تمام اسماء صفات الٰہی کو قرآن وحدیث سے ثابت کیا، اور ان میں تاویل نہیں کی، شیخ الحنابلہ قاضی ابویعلی (المتوفی: ۴۵۸ھ) نے تاویل کی تردید میں کتاب ابطال التاویل لکھی۔

اشعری مسلک کی ترویج

امام ابوالحسن اشعری کے بعد قاضی ابوبکر محمد بن الطیب بن الباقلانی (المتوفی: ۴۰۳ھ)، استاذ ابوبکر محمد الحسن بن فورک الانصاری الاصبہانی (المتوفی: ۴۰۶ھ) اور ابواسحاق ابراہیم بن محمد الاسفرائینی (المتوفی: ۴۱۸ھ) نے اپنی گرانقدر تصنیفات کے ذریعہ اشعری مسلک کو پھیلانے کی کوشش کی، ابواسحاق اسفرائینی نے کتاب الحلی فی اصول الدین کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، ان کے زمانے میں قاضی عبدالجبار المعتزلی (المتوفی: ۴۱۵ھ) کا بہت بڑا شہرہ تھا، کہا جاتا ہے کہ ابواسحاق اسفرائینی نے کئی مرتبہ ان سے مناظرہ کیا اور ان کو لاجواب کر دیا۔

ان کے بعد ابو اسحاق ابراھیم بن علی شیرازی (المتوفی: ۴۷۶ھ) اور امام الحرمین ابومعالی عبدالملک بن عبداللہ الجوینی (المتوفی: ۴۷۸ھ) نے اس مسلک کو اور زیادہ فروغ دیا، ان دونوں کو فلسفہ وعلم کلام سے غیر معمولی دلچسپی تھی، انہوں نے مذہبی عقائد کو فلسفہ وعلم کلام کے مسلمہ اصول کی روشنی میں ثابت کیا، امام الحرمین نے کتاب الرسالۃ النظامیۃ، الشامل فی اصول الدین اور الارشاد فی اصول الدین کے نام سے کتابیں لکھیں، لیکن فلسفہ ومنطق اور علم کلام کا جیسے جیسے گہرا اثر پڑتا گیا وہ اصل عقائد سے کچھ ہٹتے چلے گئے، ان کے عقائد بعینہ وہی نہیں رہے جو امام ابوالحسن اشعری کے تھے، کہا جاتا ہے کہ ابوالمعالی جہت خداوندی کے قائل نہیں تھے، چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے تقریر کی اور کہا کہ خدا کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اوپر ہے یا نیچے ہے، دائیں ہے یا بائیں ہے، آگے ہے یا پیچھے ہے، ابوجعفر الہمدانی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اگر خدا کے متعلق تمہارا یہ تصور صحیح ہے تو پھر بتایا جائے کہ دعا کے وقت ہماری نظر خود بخود اوپر کی طرف کیوں اٹھ جاتی ہے، ابوالمعالی اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے، اس کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے ہمدانی نے حیران کر دیا۔

ان لوگوں نے وجہ (چہرہ)، عین (آنکھ)، ید (ہاتھ)، ساق (پنڈلی) وغیرہ کی تاویل کرنی شروع کی، اور کہا کہ وجہ سے مراد ذات یا مرضی الٰہی، عین سے مراد علم، ید سے مراد قدرت اور ساق سے مراد مداخلت ہے اور جب زیادہ پوچھ گچھ ہونے لگی تو کہا کہ امام الحسن اشعری سے دو قول منقول ہیں، پہلا عدم تاویل ہی کے قائل تھے، جیسا کہ خود ان کی تصنیفات

اور حافظ ابو القاسم علی بن حسن بن ہبۃ اللہ بن عساکر الدمشقی (المتوفی: ۵۷۱ھ) کی کتاب "تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الامام ابی الحسن الاشعری" سے ظاہر ہوتا ہے۔

اشعری مسلک کا قبول عام حاصل کرنا

امام غزالی (المتوفی: ۵۰۵ھ) امام الحرمین کے شاگرد تھے، انہوں نے دیگر علوم وفنون کے ساتھ ساتھ کلام اور عقائد پر بھی کئی کتابیں لکھیں اور احیاء العلوم اور الاقتصاد فی الاعتقاد جیسی کتابوں میں عقلی دلائل سے اشعری مسلک کو ثابت کیا اور اتنے زوردار طریقہ سے اس کی تبلیغ کی، ہر جگہ اسی کو قبول عام حاصل ہوتا گیا، انہوں نے اگر ایک طرف قدیم فلاسفہ کے خیالات کی تردید کی اور تہافت الفلاسفہ کی جیسی کتابیں لکھیں تو دوسری طرف ان کے بعض غلط اصول کو بھی تسلیم کرلیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بعض مسائل ہیں امام ابو الحسن اشعری کے قدیم خیالات پر قائم نہیں رہ سکے، بعض جگہوں پر عقلی تاویلات کیں، امام غزالی کو فن حدیث میں کامل مہارت نہیں تھی جیسا کہ ان کی کتاب احیاء العلوم سے واضح ہوتا ہے اس میں بہت سی ضعیف اور کمزور روایتوں سے استدلال لیا گیا ہے، امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ خود امام غزالی کو اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ حدیث اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ [1] امام ابن تیمیہ نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ تصوف اور فلسفے میں امام غزالی کی معلومات کا سرچشمہ ابو طالب مکی (المتوفی: ۳۸۶ھ) اور ابو علی ابن سینا (المتوفی: ۴۲۹ھ) کی تصنیفات ہیں۔ [2] اس لیے وہ بقول امام ابن تیمیہ کلام اور فلسفہ کی دلدل میں کچھ اس طرح پھنسے کہ نہ تو خود ہی اس سے نکل سکے اور نہ دوسروں ہی کو اس سے نکال سکے۔

امام غزالی کے بعد جب امام رازی (المتوفی: ۶۰۶ھ) کا زمانہ آیا تو متاخرین اشاعرہ کے مسلک کو اور زیادہ فروغ حاصل ہوا، یہاں تک کہ وہ مصر، شام اور عراق کا عام مسلک ہوگیا، صرف حنابلہ اس کے سخت مخالف تھے، امام رازی نے خصوصیت کے ساتھ اپنی کتابوں مطالب عالیہ، مباحث مشرقیہ، اربعین فی اصول الدین اور اساس التقدیس میں عقائد کے مسائل پر عقلی بحثیں کی ہیں، وہ اپنی کتابوں میں خود ہی اعتراضات اور شبہات وارد کرتے

---

[1] شرح العقیدۃ الاصفھانیۃ، ص: ۱۱۳۔ [2] کتاب السبعینیۃ، ص: ۱۰۷۔

ہیں، اور خود ہی جوابات دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ قرآن و حدیث سے عقائد کا استنباط کرنے کی بجائے اپنے مزعومہ عقائد کو بنیاد بنا کر قرآن و حدیث کو ان پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور ظاہر ہے اس کا نتیجہ سوائے تاویل کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، انہوں نے اپنا ایک اصول یہ بنایا تھا کہ جب عقلی اور نقلی دلیل میں کوئی تعارض ہو تو عقلی دلیل ہی کو ترجیح دی جائے گی، اور نقلی دلیل میں تاویل کی جائے گی، اسی بنا پر انہوں نے خدا کی ذات وصفات سے متعلق قرآن و حدیث کے تمام الفاظ میں تاویل کی ہے، کیونکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ ان کے ظاہری معنی لینے کی صورت میں خداوند تعالیٰ کا جسم و جسمانی ہونا لازم آتا ہے اور یہ محال ہے، اس لیے کہ اس صورت میں جسم مرکب ہوتا ہے اور ہر مرکب اپنے اجزاء کا محتاج ہو جاتا ہے، اور جو چیز غیر کی محتاج ہو وہ ہرگز خدا نہیں بن سکتی، اگر خدا کے لیے اعضاء جوارح تسلیم کیے جائیں تو وہ دیکھنے کے لیے آنکھ کا، کام کرنے کے لیے ہاتھ کا، سننے کے لیے کان کا اور چلنے کے لیے پاؤں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اور یہ احتیاج خدا کی شان بے نیازی کے بالکل مخالف ہے۔

امام رازی کا یہ خیال تھا کہ قرآن وحدیث میں اس قسم کے الفاظ اس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ عوام کے ذہن میں خدا کا ایک تصور قائم ہوا، اگر یہ کہا جاتا کہ خدا ایک ایسی ذات ہے جو نہ جسم ہے نہ کسی مکان میں واقع ہے وہ نہ جوہر ہے اور نہ عرض ہے، نہ عالم کے اندر ہے اور نہ عالم کے باہر ہے نہ وہ متصل ہے اور نہ وہ منفصل ہے، نہ وہ کسی جہت میں ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے تو عوام ہرگز اس کو سمجھ نہیں سکتے تھے، اس لیے ان کو ایسے الفاظ میں سمجھا گیا جو ان کے ذہن سے قریب تر ہیں ان الفاظ کے اصلی معنی مقصود نہیں ہیں، امام رازی کی اس تاویل کے دوسرے معنے ہوئے کہ آنحضرت ﷺ نے قصدا جان بوجھ کر لوگوں کو جہالت اور گمراہی میں رکھا، آپ کے متعلق اس قسم کا تصور کرنا بالکل ہی غلط ہوگا اور یہ آپ کے فرائض نبوت سے بالکل ہی بعید بات ہوگی۔

امام ابن تیمیہ نے جابجا امام رازی پر سخت تنقیدیں کی ہیں اور ان کی کتابوں کا رد لکھا ہے انہوں نے بتایا کہ امام رازی کی معلومات کا سرچشمہ علم کلام میں امام الحرمین ابو المعالی الجوینی اور ابوالفتح محمد بن عبدالکریم بن احمد الشہرستانی (المتوفی: ۵۴۷ھ) کی کتابیں ہیں اور فلسفے میں

ابوعلی بن سینا کی کتابیں ہیں [1] ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ معتزلہ کے بارے میں امام رازی کی معلومات کا سرچشمہ ابوالحسین البصری (المتوفی: ۴۳۶ھ) اور ان کے شاگرد محمود الخوارزمی اور ان کے شیخ عبدالجبار الہمدانی وغیرہ کی کتابیں ہیں، اسی طرح فلسفے میں ابوعلی ابن سینا اور ابو البرکات بغدادی (المتوفی: ۵۴۷ھ) کی کتابیں ہیں، مذہب اشعری کی معلومات کا سرچشمہ ابوالمعالی کی کتابیں الشامل فی اصول الدین اور قاضی ابوبکر باقلانی کی کتابیں ہیں، وہ شہرستانی کی کتابوں سے بھی کچھ نقل کرتے ہیں، مگر ان کی کتابوں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ امام ابو الحسن اشعری اور ابومحمد عبداللہ بن سعید بن کلاب (المتوفی: ۲۴۱ھ) جیسے متقدمین کی کتابوں سے بھی واقف تھے، ان کی کتابوں سے اس بات کی بھی شہادت نہیں ملتی کہ وہ قدیم معتزلی، نجاری اور ضراری علما کی کتابوں سے واقف تھے وہ متقدمین فلاسفہ کے اقوال سے بھی واقف نہیں تھے۔ [2]

اس کے باوجود اس وقت کی حکومتوں نے عقائد کے معاملے میں امام رازی ہی کے مسلک کو صحیح تسلیم کیا تھا، اس سے ذرا سا انحراف کفر اور ارتداد کے مترادف سمجھا جاتا، حنابلہ من حیث الجماعت اس کے سخت مخالف تھے، مگر ان کو اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ دوسروں کو اس کی تبلیغ کریں، جب مصر میں ۶۶۳ھ سے چاروں مذاہب کے قاضیوں کا تقرر ہونے لگا تو حنبلی قاضی کو ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ عقائد میں اپنے مسلک کے مطابق فتویٰ نہ دے۔ [3]

امام ابن تیمیہ کی مخالفت

امام ابن تیمیہ کے زمانے تک کوئی حنبلی عالم ایسا نہیں ہوا جو عقلی طور پر متاخرین اشاعرہ کے خیالات کی زوردار تردید کر سکے، امام ابن تیمیہ نہ صرف قرآن وحدیث اور فقہ وتاریخ کے عالم تھے، بلکہ انہوں نے علوم معقولات کا بھی بڑا ہی گہرا مطالعہ کیا تھا، ان کے زمانے تک علوم منقولات ومعقولات پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئی تھیں ان میں سے اکثر وبیشتر ان کی نظر سے گزر

---

[1] کتاب السبعینیة، ص: ۱۰۷۔

[2] درء تعارض العقل والنقل: ۲/ ۸۱ نیز دیکھو شرح العقیدة الاصفهانیة، ص: ۱۱۸۔

[3] صبح الاعشی: ۱۱/ ۲۰۳۔

چکی تھیں، فلسفہ وکلام اور منطق کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں تھا، جس کی پوری تاریخ سے وہ واقف نہ ہوں، خود ان کا دعویٰ ہے کہ خوارج کے سوا اور ہر ایک مذہب ومسلک کی کتابوں سے واقف تھے، وہ لوگوں کے اقوال اور مذاہب کے جاننے میں سب سے زیادہ بحث اور تلاش سے کام لیتے تھے [1] ان کا یہ دعویٰ محض ادعاء نہیں تھا، خود ان کی کتابوں سے ان کے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے، ان کی کتابوں میں بے شمار قدیم کتابوں کے جابجا حوالے ملتے ہیں جس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے واقعی ان علوم کا بہت ہی وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا، انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ کس مصنف نے کس کتاب سے لیا ہے اور اس کو معلومات کا سرچشمہ کیا ہے علوم معقولات میں ان کے اس غیر معمولی انہماک پر ان کے معاصرین علما نے ان پر سخت تنقید بھی کی ہے، مگر ہم ان کی تصنیفات سے صاف اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کسی وقت بھی ان علوم معقولات سے مرعوب نہیں ہوئے انہوں نے ہمیشہ متکلمین اسلام کی بے بصری پر افسوس ظاہر کیا ہے اور برسوں سے علما کے دلوں پر ان عقلی علوم کی جو دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اس کو مٹایا ہے، اور ان عقلی دلائل کا تاروپود بکھیرا ہے جو برسوں سے مسلم مانے جارہے تھے، انہوں نے ایک ایک کر کے ان یونانی اصول کو توڑا ہے جن کے توڑنے کی طرف ان سے پہلے کسی کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی، درس وتدریس کی مسند پر بیٹھتے ہی انہوں نے ان علوم کے خلاف باقاعدہ جہاد کرنا شروع کر دیا، جو بھی ایک مرتبہ ان کی صحبت میں جا بیٹھتا، اسے ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے سامنے فکر ونظر کی ایک وسیع دنیا کھل گئی ہے۔

شیخ عماد الدین واسطی کی مثال

چنانچہ شیخ عماد الدین واسطی (المتوفی: ۷۱۱ھ) لکھتے ہیں کہ وہ جب حقیقت کی تلاش میں ادھر اُدھر گھوم پھر کر امام ابن تیمیہ کی درس گاہ میں پہنچے تو اتفاق سے علم کلام ہی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ امام ابن تیمیہ فرما رہے تھے کہ دنیا میں متکلمین وفلاسفہ سے بڑھ کر مضطرب ومحروم اور قلب وروح کے سرور اور اطمینان کی لذت سے ناآشنا دوسرا کوئی گروہ نہیں ہے پھر انہوں نے قدیم فلسفیوں اور ارباب مقالات کے چند اقوال سنائے جس میں انہوں نے خود

---

[1] منہاج السنۃ:۲/ ۱۴۳۔

اپنے وجود پر مجہولیت و بے بصیرتی کی شہادت دی ہے، اس سلسلے میں انہوں نے شہرستانی ورازی کے یہ اشعار سنائے:

لَعُمْرِی لَقَدْ طُفْتُ الْمَعَاهِدَ کُلَّهَا
وَسَیَّرْتُ طَرْفِیْ بَیْنَ تِلْكَ الْعَالِمِ

میری زندگی کی قسم میں نے اداروں کا چکر لگایا اور ان کے نشانات تک اپنی نظر دوڑائی۔

فَلَمْ اَرَ اِلَّا وَاضِعًا کَفَّ حَائِرٍ
عَلٰی ذَقَنٍ اَوْقَارِعًا سِنَّ نَادِمِ

لیکن بجز اس حیرت زدہ شخص کے جو ٹھڈی کے نیچے ہاتھ دیے بیٹھا ہو یا بجز اس شخص کے جو پشیمانی کے باعث اپنے دانت ٹونکتا ہو، کسی اور کو نہیں دیکھا۔

اور یہ بھی کہا کہ بعض لوگوں نے اپنی عمر بھر کے قیل وقال و چون و چرا کا حاصل یہ بتایا ہے۔

نِهَایَةُ اِقْدَامِ الْعُقُوْلِ عِقَالُ
وَاَکْثَرُ سَعْیِ الْعَالَمِیْنَ ضَلَالُ

عقلوں کی پہنچ کی انتہا بیڑی ہے، اور دنیا والوں کی زیادہ تر دوڑ دھوپ گمراہی کی طرف ہے۔

وَاَرْوَاحُنَا فِیْ وَحْشَةٍ مِنْ جُسُوْمِنَا
وَحَاصِلُ دُنْیَانَا اَذًی وَّوَبَالُ

اور ہماری روحیں ہمارے جسموں سے وحشت کر رہی ہیں اور ہماری دنیا کا حاصل تکلیف اور مصیبت ہے۔

وَلَمْ نَسْتَفِدْ مِنْ بَحْثِنَا طُوْلَ عُمْرِنَا
سِوٰیٓ اَنْ جَمَعْنَا فِیْهِ قِیْلَ وَقَالُوْا

اور ہم نے اپنی عمر بھر کے بحث مباحثہ سے سوائے اس کے کہ قیل (کہا گیا) اور

قالوا (انہوں نے کہا) جمع کیا اور کچھ فائدہ نہیں اٹھایا۔

شیخ عماد الدین کہتے ہیں کہ اس ایک ہی صحبت میں سارے شکوک و اضطراب کے پردے چاک ہو گئے اور میرے دل نے ایقان کی حلاوت اور طمانیت کی لذت پائی، میرا دل بے اختیار یہ پکار اٹھا کہ جس نور حقیقت کی جستجو میں میں سرگرداں اور حیراں ہوں اس کی شعائیں امام ابن تیمیہ کے ناصیۂ امامت پر چمک رہی ہیں جب وہ میرے حالات سے مطلع ہوئے تو وصیت فرمائی کہ تمام چیزوں کو چھوڑ کر سیرت نبوی کے مطالعے اور تفکر و تدبر کو اپنے اوپر لازم ٹھہرالو، ایمان ویقین کی تمام بیماریوں کے لیے یہی ایک نسخہ کافی ہے، چنانچہ میں نے اس وصیت کو حرز جاں بنالیا اور جو کچھ پایا، اسی وسیلے سے پایا اور اسی کے طفیل سے دنیا اور آخرت میں ہلاک ہونے سے بچا۔

عقیدے کے متعلق تقریریں

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، کہ امام بن تیمیہ نے ۶۹۰ھ میں صفات خداوندی کے متعلق ایک تقریر کی تھی جس پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا اور جس کو قاضی شہاب الدین ابن الخوی نے فرو کیا تھا۔

العقیدۃ الواسطیہ

اس واقعے کے دو تین سال بعد ۶۹۲ھ یا ۶۹۳ھ میں واسط کے ایک پرہیز گار اور متقی قاضی رضی الدین دمشق سے گزرے، انہوں نے امام ابن تیمیہ سے اپنی جگہ کے مسلمانوں کے متعلق شکایت کی کہ وہ تاتاریوں کے غلبہ کی بنا پر اسلام سے بالکل بیگانہ ہو گئے ہیں اور ان سے درخواست کی کہ وہ عقائد کے متعلق انہیں ایک مختصر رسالہ تحریر کر کے دیں، امام ابن تیمیہ نے کہا کہ اس موضوع پر بہت سے رسالے لکھے گئے ہیں، ان میں سے کسی موزوں رسالے کا انتخاب کرلو، مگر قاضی رضی الدین نے نہیں مانا، ان کے اصرار سے مجبور ہو کر امام ابن تیمیہ نے عقائد کے متعلق ایک رسالہ العقیدہ الواسطیہ لکھا جس میں کتاب وسنت آثار صحابہ وتابعین اور اقوال ائمۂ مجتہدین کی روشنی میں اسلامی عقائد کی تشریح کی اور صفات خداوندی اور عرش وکرسی وغیرہ کے متعلق انہی خیالات کا اظہار کیا جو امام احمد ابن حنبل اور امام ابوالحسن اشعری کا عقیدہ

تھا، اور ان کی تشریح میں انہی الفاظ کی پابندی کی جو کتاب وسنت میں آئے ہیں، اس طرح ایمان وعمل، تقدیر، شفاعت، محبت، اہل بیت وصحابہ، اختلاف صحابہ، کرامات اولیاء کے مسائل پر کتاب وسنت سے روشنی ڈالی ہے، آخر میں کتاب وسنت اجماع وقیاس کے چار اصول کی تشریح کی ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ہر ایک مسلمان کا فرض واجبی قرار دیا ہے۔

العقیدۃ الحمویۃ الکبری

ربیع الاول ۶۹۸ھ کی ابتداء میں حماۃ سے صفات خداوندی کے متعلق ایک سوال آیا تھا، جس میں یہ دریافت کیا گیا تھا کہ صفات واعضاء جوارح خداوندی اور عرش وغیرہ کے متعلق جتنی آیتیں اور حدیثیں آئی ہیں ان کے ظاہری معنی مراد لیے جائیں گے، یا ان کی تاویل کی جائے گی، امام ابن تیمیہ نے ظہر سے لے کر عصر تک ایک ہی بیٹھک میں چھپن ۵۶ صفحوں کا ایک طویل جواب لکھا جو العقیدہ الحمویۃ الکبری کے نام سے مشہور ہے، چونکہ امام موصوف صفات واعضاء وجوارح خداوندی اور عرش وغیرہ کے متعلق امام احمد ابن حنبل اور امام ابوالحسن اشعری ہی کے عقائد کو کتاب وسنت کے مطابق سمجھتے تھے، اس لیے متاخرین اشاعرہ کے عقیدے کے برخلاف ان دونوں اماموں کے عقیدے کی پرزور تائید کی اور سلف صالحین کے مسلک کو متکلمین کے مسلک پر ترجیح دیتے ہوئے متاخرین اشاعرہ کی غلطیاں ثابت کیں، اس رسالے میں بھی انہوں نے کتاب وسنت ہی کے الفاظ کی پابندی کی، اور آیتوں اور حدیثوں کے الفاظ میں تاویل اور ردوبدل کرنے کو بالکل ہی ناجائز قرار دیا۔

منجمین کی شورش

اس رسالے کے لکھنے سے چند دن پہلے امام ابن تیمیہ کے خلاف ایک شورش ہو چکی تھی، امام موصوف ستاروں اور افلاک کی تاثیر کے منکر تھے، انہوں نے بارہا امام رازی کے خلاف سخت تنقیدیں کی تھیں جنہوں نے الاحکام العلانیہ فی الاعلام السماویہ اور السر المکتوم فی مخاطبۃ النجوم جیسی کتابیں لکھ کر عوام کے ذہنوں میں ستاروں اور افلاک کی تاثیرات کا پکا اعتقاد بٹھا دیا تھا، امام ابن تیمیہ نے اپنی ایک گفتگو میں عام منجمین کو گمراہ قرار دیا تھا، ان میں سے بعض لوگوں نے امیر سیف الدین جاغان سے جو امیر سیف الدین قبچاق منصوری کے قازان

کی طرف فرار ہو جانے کے بعد دمشق کا عارضی نائب مقرر ہوا تھا شکایت کی، اس نے امام ابن تیمیہ کو بلا بھیجا، انہوں نے نہایت ہی تفصیل سے منجمین کے باطل افکار وخیالات کی تردید کی، امیر موصوف پر ان کی اس تقریر کا بہت اچھا اثر ہوا، وہ ان کا گرویدہ ہو گیا اور ان سے کہا کہ وہ کبھی کبھی اس کے پاس تشریف لایا کریں اور اپنے بصیرت افروز خیالات سے اسے مستفید کرتے رہیں۔

امیر موصوف کی اس پرزور تائید کی بنا پر منجمین کا طبقہ بگڑ بیٹھا، جب ان کے رسالۂ العقیدہ الحمویۃ الکبریٰ کا زیادہ چرچا ہوا تو حاسد مخالفین اس کو لے کر مختلف قاضیوں کے پاس پہنچے اور ان سے شکایت کی کہ ابن تیمیہ تجسیم کے قائل ہیں اور وہ لوگوں کو اپنے فاسد عقائد اور خیالات کی دعوت دے رہے ہیں، اس لیے ان کو اس کی سزا ملنی چاہیے۔

قاضی احناف سے شکایت

بعض لوگ قاضیٔ احناف شیخ جلال الدین احمد بن الحسن بن احمد بن الحسن بن انوشیروان الرازی الحنفی (المتوفی: ۷۴۵ھ) کے پاس پہنچے جن کے والد قاضی حسام الدین حسن بن احمد بن الحسن بن انوشیروان حنفی امیر عساف کے نصرانی کاتب کے معاملے میں امام ابن تیمیہ کی حمایت کر چکے تھے، قاضی جلال الدین ان لوگوں کو لے کر دار الحدیث الاشرفیہ پہنچے اور وہاں سے امام ابن تیمیہ کو بلا بھیجا، امام موصوف نے کہلا بھیجا، کہ عقائد کی جانچ کچھ آپ ہی کے ذمے نہیں ہے، سلطان نے آپ کو لوگوں کے جھگڑے چکانے کے لیے مقرر کیا ہے، برائیوں کی روک تھام کچھ قاضیوں ہی کا کام نہیں ہے، حریفوں نے کہا، دیکھا آپ نے! کس قدر بے ادب اور دلیر آدمی ہے، آپ کے بلانے پر بھی حاضر نہیں ہوا، اور اس قسم کا سخت جواب کہلا بھیجا۔

قاضی جلال الدین حنفی طبیعت کے نیک تھے وہ اس جواب سے خفا نہیں ہوئے اور ان کے دل میں کوئی رنجش اور کدورت نہیں پیدا ہوئی، وہ متاخرین اشاعرہ ہی کے عقائد کو صحیح سمجھتے تھے، انہوں نے چند آدمی بھیجے تاکہ شہر میں گھوم پھر کر ابن تیمیہ کے عقائد کے باطل ہونے کا اعلان کر دیں، ابھی شہر کے ایک حصے میں بھی اس کا اعلان نہیں ہوا تھا، کہ امیر سیف الدین

جاغان کو اس کی خبر مل گئی، اس نے فوراً چند سپاہی روانہ کیے تا کہ منادی کرنے والوں کو پکڑ لائیں، امیر موصوف نے انہیں درے لگوائے اور مفسدوں کا کھوج لگانا شروع کیا، سب لوگ روپوش ہو گئے، شورش کرنے والوں کے سرگردہ نے امیر بدرالدین اتابکی کی پناہ لی، اس نے امیر سیف الدین جاغان سے اس کی سفارش کی، اور اس کی خطا معاف کروائی اور اس طرح یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

تفسیر قرآن

۱۳ ربیع الاول ۶۹۸ھ کو جمعہ کے دن امام ابن تیمیہ نے اپنی عادت کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کی اور اس آیت۔

﴿ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾ [1]

''بے شک تم بڑے اخلاق پر ہو۔''

پر ایک مبسوط تقریر کی، اس میں بہت زیادہ لوگ آئے ہوئے تھے۔

بعض علمائے وقت کا اپنے شبہات کو دور کرنا

حکومت کی فوری توجہ سے اگرچہ یہ شورش ختم ہوگئی، تاہم امام ابن تیمیہ کے عقائد بڑے بڑے علما کو کھٹکتے تھے، قاضی امام الدین قزوینی شافعی (المتوفی: ۶۹۹ھ) نے امام ابن تیمیہ سے درخواست کی کہ وہ علما کی مجلس میں اپنا رسالہ العقیدہ الحمویہ الکبری پڑھ کر سنائیں اور اس کے متعلق ان کے دل میں جو شبہات پیدا ہوں ان کو دور کرنے کی کوشش کریں، امام موصوف نے ان کی درخواست کو مان لیا۔

۱۴ ربیع الاول ۶۹۸ھ کو ہفتے کے دن خاص علما کی ایک مجلس ہوئی، جس میں نائب دمشق امیر سیف الدین جاغان بھی شریک تھا، امام ابن تیمیہ نے اپنا رسالہ سنانا شروع کیا، علما اپنے شبہات پیش کرتے جاتے تھے، اور امام موصوف ان کا تشفی بخش جواب دیتے جاتے تھے، مسلسل سولہ گھنٹوں کی نشست کے بعد یہ مجلس ختم ہوئی، حاضرین مجلس کی پوری تشفی ہوگئی کہ امام ابن تیمیہ جو کہتے ہیں وہی صحیح ہے۔

---

[1] ۶۸/القلم: ٤۔

آخر میں قاضی امام الدین قزوینی نے ایک مختصر تقریر کی، امام موصوف کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی تعریف کرنے کے بعد یہ کہا کہ آیندہ سے جو بھی امام موصوف کے بارے میں بیجا گفتگو کرے گا اس کو میں خود عدالت سے سزا دلواؤں گا، امام الدین کے چھوٹے بھائی شیخ جلال الدین قزدینی (المتوفی: ۷۳۹ھ) نے بھی کہا جو شخص بھی امام موصوف کی شان میں گستاخیاں کرے گا اس کو سخت سزا دی جائے گی۔

ان دونوں بزرگوں کے ان الفاظ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امام ابن تیمیہ کے خلاف کیا کیا بیجا باتیں نہ کہی گئی ہوں گی، حریفوں نے بڑی افترا پردازیاں کی تھیں اور طرح طرح سے انہیں بدنام کیا تھا، انہیں ایذا اور تکلیف پہنچانے کے لیے ہر ایک قاضی اور امیر کا وسیلہ ڈھونڈا تھا، شیخ علم الدین برزالی لکھتے ہیں کہ شیخ تقی الدین اور ان کے ساتھیوں اور دوستوں کے خلاف شورش کرنے والوں کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم میں سے ہر ایک آدمی بھی ان کو پہچانتا ہے۔

اس کے بعد لوگوں کی توجہ تاتاری لڑائیوں کی طرف منعطف ہوگئی اور ان میں امام ابن تیمیہ نے جس جوش وخروش سے کام لیا اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

عقائد کی جانچ کا فرمان

اب جبکہ امام ابن تیمیہ نے عوام کی اصلاح کا کام شروع کیا، اور رجب ۷۰۵ھ میں فقرائے رفاعیہ کے ساتھ وہ مشہور مناظرہ پیش آیا جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، تو شیخ نصر بن سلیمان المنبجی نے اس فتنۂ عقائد کو از سر نو زندہ کرنے کا تہیہ کرلیا، انہوں نے نائب السلطنت مصر امیر بیبرس جاشنگیر سے کہہ کر نائب دمشق امیر جمال الدین آقوش الافرم کے نام ایک فرمان لکھوایا کہ شہر کے قاضیوں، عالموں اور فقیہوں کو جمع کر کے ابن تیمیہ کے عقائد کا اظہار لے اور اس کی روداد مصر روانہ کرے، چنانچہ اس نے اس حکم کی تعمیل میں ۸ رجب ۷۰۵ھ کو پیر کے دن امام ابن تیمیہ کو بلا بھیجا اور قضاۃ وعلما وفقہاء کے سامنے قصر امارت میں ان کے عقائد کا اظہار لیا۔

پہلی مجلس

عقائد کے متعلق مختلف اوقات میں تین مجلسیں منعقد ہوئی تھیں، ان میں سے یہ پہلی مجلس تھی ، اس مجلس کے انعقاد کے مقصد سے کسی کو اطلاع نہیں دی گئی تھی ، جب سب لوگ جمع ہوگئے تو امیر افرم نے امام ابن تیمیہ سے مخاطب ہو کر کہا، یہ مجلس آپ ہی کی وجہ سے بلائی گئی ہے، مصر سے سلطان کا حکم آیا ہے کہ میں آپ کے عقائد کو جانچوں اور ان خطوط اور رسائل کی تحقیق کروں جو آپ نے مصر اور شام کے لوگوں کے نام لکھے ہیں اور جن میں آپ نے اپنے عقائد کے قبول کرنے کی دعوت دی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس وقت تمام قاضی اور علما وفقہاء آپ سے بحث مباحثہ کر کے کوئی ایک بات طے کرلیں، امام ابن تیمیہ نے جواب دیا، عقائد کا معاملہ ایسا ہے کہ وہ نہ مجھ سے لیے جاسکتے ہیں اور نہ مجھ سے کسی بڑے آدمی سے، وہ تو صرف اللہ اور اس کے رسول ہی سے لیے جاسکتے ہیں، پس وہ جس طرح ہمیں بتائیں اسی طرح ہمیں عقیدہ رکھنا چاہیے، رہا خطوط اور رسائل کا معاملہ تو میں نے خود اپنی ذات سے کسی کو خطوط اور رسائل نہیں لکھے، اور نہ میں نے کسی کو اپنے عقائد کے قبول کرنے کی دعوت دی ہے، بلکہ مصر و شام کے اکثر شہروں سے عقائد کے متعلق میرے پاس خطوط اور سوالات آئے تو میں نے کتاب وسنت کے مطابق ان کا جواب لکھ بھیجا۔

اس پر امیر افرم نے کہا بہتر ہے آپ اپنے عقائد لکھوا دیں، یہ کہہ کر اس نے شیخ کمال الدین ابن الزملکانی کو حکم دیا کہ امام ابن تیمیہ جو کچھ بیان کریں اس کو قلم بند کرلیں ، امام موصوف نے صفات خداوندی ، ایمان وعمل، تقدیر، وعید، امانت اور تفضیل خلفاء کے متعلق کتاب وسنت اور سلف صالح کا عقیدہ مختصراً لکھوا دیا، اس کے بعد امیر افرم اور حاضرین مجلس کی طرف خطاب کر کے کہا، میں جانتا ہوں بہت سے لوگ مجھ پر جھوٹ بولتے اور تہمت باندھتے رہتے ہیں، انہوں نے اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ میرے متعلق جھوٹ کہا ہے، مجھے یہ خبر ملی ہے کہ میرے ایک رسالے میں تحریف اور تاویل کر کے امیر رکن الدین بیبرس جاشنگیر کو دکھایا گیا ہے، معلوم نہیں یہ خبر کہاں تک صحیح ہے، البتہ میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرے متعلق قصداً غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں اور مجھ پر افتراء اور بہتان باندھے گئے ہیں ، اگر میں اس

وقت اپنی یاد سے اپنے عقائد لکھواؤں تو غالباً بعض لوگ یہ سمجھیں گے کہ میں نے کچھ کمی بیشی کردی ہے اس لیے میں اس عقیدے کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو میں نے تاتاریوں کے آنے کے سات سال پہلے لکھا تھا، یہ کہہ کر انہوں نے ایک خادم کو اپنے گھر بھیجا تاکہ وہ ''العقیدہ الواسطیہ'' کا رسالہ لے کر آئے اور اس کے واپس آنے تک انہوں نے ایک دلدوز تقریر کر ڈالی۔ انہوں نے کہا:

دل دوز تقریر

کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ آج میرے عقائد میں نقص نکالے جارہے ہیں اور مجھ کو نشانۂ ملامت بنایا جارہا ہے اور سلطان کے نزدیک مجھ پر طرح طرح کے بہتان باندھے جارہے ہیں اور مجھ کو بدعقیدہ، مبتدع اور نہ معلوم اور کیا کیا کہا جارہا ہے لیکن مجھے بتایا جائے کہ سخت سے سخت مصیبت کے وقت میرے سوا کس نے اسلام اور مسلمانوں کی حمایت کی، منکرین اسلام کے سامنے کس نے اس کے دلائل اور براہین کو واضح کیا، اس کے دشمنوں سے کس نے لڑائی کی، وہ کون تھا جس نے پھر سے ان لوگوں کے اسلام کو مضبوط کیا جو اسلام کے حلقے سے نکلے جارہے تھے، ایسے وقت جبکہ تمام لوگوں کی زبانیں بند تھیں، میں نے اپنی آواز بلند کی، اور مذہب اسلام کے دلائل اور براہین کو واضح کیا اس کے باوجود اگر یہ لوگ میرے اسلام میں نقص نکالنے کی جرأت کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ دوسرے لوگوں کے متعلق یہ لوگ کیا کیا نہ کریں گے، اگر ایک یہودی بھی سلطان سے انصاف کا طالب ہو تو انصاف کرنا اس پر واجب ہوجاتا ہے میں تو کبھی اپنے حقوق سے دستبردار ہوجاتا ہوں اور کبھی سلطان سے اپنے حقوق کا طالب ہوتا ہوں، سلطان کو چاہیے کہ ان تمام لوگوں کو جنہوں نے مجھ پر بہتان باندھے ہیں، جمع کرکے ان کے افتراء اور بہتان کی تحقیق کرے۔

امیر افرم نے اپنے درباری کاتب محی الدین بن فضل اللہ العمری سے کہا کہ وہ امام ابن تیمیہ کی تقریر کو لفظ بلفظ قلمبند کرلیں۔

العقیدۃ الواسطیہ کے لکھنے کی وجہ

اس مدت میں جب رسالہ ''العقیدۃ الواسطیہ'' آگیا تو امام ابن تیمیہ نے اس رسالہ کے

لکھنے کی وجہ یوں بیان کی کہ واسط کے ایک قاضی رضی الدین شافعی حج کرتے ہوئے دمشق سے گزرے اور انہوں نے اپنے ہاں کے مسلمانوں کی جہالت کی شکایت کی اور کہا کہ تاتاریوں کی ظالمانہ حکومت کی وجہ سے مذہب اور علم کے تمام آثار مٹ چکے ہیں اور تمام مسلمان گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، بہتر یہ ہے کہ آپ عقائد کے متعلق ایک مختصر رسالہ لکھ دیں جو میرے اور میرے خاندان کے کام آئے، میں نے ان سے معذرت چاہی، اور کہا کہ مجھ سے پہلے عقائد کے متعلق مختلف کتابیں لکھی جا چکی ہیں، ان میں سے اہل سنت و جماعت کے عقائد کی کسی کتاب کو منتخب کر لیجیے، انہوں نے نہیں مانا اور اصرار سے کہا کہ میں وہی عقیدہ اختیار کروں گا جو آپ لکھ دیں گے چنانچہ میں نے مجبور ہو کر عصر کی نماز کے بعد ان کے لیے عقائد کا یہ مختصر رسالہ لکھا جس کے نسخے مصر اور عراق وغیرہ کے اکثر شہروں میں پھیل چکے ہیں۔

فرقوں کے اختلاف کرنے سے ان کے عقیدے کو غلط قرار نہیں دیا جا سکتا

امام ابن تیمیہ نے فرمایا کہ وہ مخالفین کے مذاہب کو خود ان سے بہتر جانتے ہیں، مسلمانوں کا کوئی فرقہ ایسا نہیں ہے جس کو ان کے عقائد سے اختلاف نہ ہو، ہر ایک فرقہ ان سے کچھ نہ کچھ اختلاف رکھتا ہے اس لیے ان کے صرف اختلاف کرنے سے کسی عقیدے کو غلط قرار نہیں دیا جا سکتا، تاوقتیکہ وہ کتاب وسنت اور سلف صالح کے بیان کیے ہوئے عقائد کے خلاف نہ ہو۔

اس کے بعد امام ابن تیمیہ نے مجلس کے لوگوں کے سامنے اپنا رسالہ ''العقیدۃ الواسطیہ'' پڑھ کر سنانا چاہا، امیر افرم نے شبہات کو دُور کرنے کے لیے کہا، بہتر ہے شیخ کمال الدین ابن الزملکانی یہ رسالہ پڑھیں اور امام موصوف اس کی قابل اعتراض باتوں کا جواب دیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

عقیدے کے متعلق علمائے اسلام کے تین گروہ

اس مجلس کی تفصیل روئیداد کو معلوم کرنے سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ صفاتِ باری اور جہت خداوندی کے متعلق علمائے اسلام کے تین گروہ ہو گئے ہیں، ایک تو وہ ہے جو صفات اور جہت کا قائل ہے اور اُن کے معانی میں حذف واضافے، تغییر وتبدیل اور تحریف وتاویل کی

مطلق اجازت نہیں دیتا، بلکہ یہ کہتا ہے کہ کتاب وسنت سے جتنی صفات کا ثبوت ہو خواہ وہ صفات ذاتی ہوں یا فعلی، ان پر ایمان لانا واجب ہے، یہ مسلک تمام محدثین کرام اور حنابلہ کا ہے، امام ابوالحسن اشعری اور امام ابن خزیمہ کا بھی یہی مسلک ہے جیسا کہ ان کی تصنیفات ''کتاب الابانہ'' اور کتاب التوحید فی الصفات'' سے ظاہر ہوتا ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو صفات اور جہت کا منکر ہے، اور صفات کو عینِ ذات تسلیم کرتا ہے، اور قرآن مجید کی بعض آیتوں میں جہاں ید، عین، وجہ، وغیرہ کا ذکر ہے تاویل کرتا ہے، یہ مسلک معتزلہ کا ہے۔

تیسرا گروہ اشاعرہ اور ان کے ہم خیال ماتریدیوں کا ہے جو جہت خداوندی کا انکار کرتا ہے اور صفات کو نہ عین ذات مانتا ہے اور نہ غیر ذات اور بعض ذاتی صفات میں جیسا کہ چہرہ، ہاتھ، پیر وغیرہ ہے تاویل کرتا ہے۔

ان تین گروہوں کے علاوہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو صفاتِ باری اور جہت خداوندی سے متعلق آیتوں اور حدیثوں کو ان متشابہات میں سے قرار دیتا ہے، جن کے معانی کسی کو معلوم نہیں ہیں، وہ یہ کہتا ہے کہ ہم ان آیتوں اور حدیثوں کو تو مانتے ہیں، لیکن ہم ان کے معانی اور مطالب کا کوئی تعین نہیں کرتے، چونکہ ان کے معانی کا علم خدا کے سوا کسی اور کو نہیں ہے اس لیے ہم ان کے معانی ومطالب کو خدا کے سپرد کر دیتے ہیں۔

چونکہ امام ابن تیمیہ کے نزدیک پہلا مسلک ہی کتاب وسنت اور آثارِ صحابہ وتابعین کے مطابق تھا، اس لیے انہوں نے رائج الوقت مسلک اشاعرہ کے خلاف صفاتِ باری اور جہت خداوندی کو ثابت کیا، اور اسی کو اعتقاد الفرقة الناجية المنصورة الى قيام الساعة اهل السنة والجماعة (نجات پانے والے اور تا قیامت فتح یاب رہنے والے فرقۂ اہل سنت وجماعت کا عقیدہ) قرار دیا تھا، اور یہی ایک چیز سب سے زیادہ ان کے عہد کے علما کی برانگیختگی کا باعث ہوئی تھی۔

امام ابن تیمیہ نے ''العقیدۃ الواسطیہ'' میں لکھا تھا:

''اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا چاہیے اور

موت کے بعد اُٹھنے اور تقدیر کے اچھے اور برے ہونے پر ایمان لانا چاہیے۔ اللہ پر ایمان لانے سے مراد ان اوصاف پر ایمان لانا ہے جن کے ساتھ اللہ نے اپنی کتاب میں اپنے نفس کی تعریف کی ہے اور جن کو اللہ کے رسول محمد ﷺ نے بیان کیا ہے، ان میں تحریف یا تعطیل یا تکلیف یا تمثیل نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اس بات پر ایمان لانا چاہیے کہ اللہ کے مانند کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، پس ہمیں ان صفات کی نفی نہیں کرنی چاہیے، جن سے اللہ نے اپنی توصیف کی ہے، اور نہ کلموں کو ان کی اپنی جگہ سے بدلنا چاہیے اور نہ اللہ کے ناموں اور اس کی نشانیوں میں کجی اختیار کرنی چاہیے اور نہ اس کی صفات کو اس کی مخلوق کی صفات سے مماثلت دینی چاہیے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نام والا یا اس کی برابری کرنے والا اور اس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے، اور نہ اس کو اس کی مخلوق پر قیاس کیا جاسکتا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے نفس کو اور دوسروں کو زیادہ بہتر جانتا ہے، اس کا قول اور اس کی بات اس کی مخلوق کے قول اور بات کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور سچی ہے، اس کے رسول صادق اور مصدوق ہیں، ان لوگوں کے برخلاف جو اللہ کے متعلق ایسی باتیں کہتے ہیں جن کو وہ نہیں جانتے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ تیرا رب جو بڑی عزت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جن کو یہ بیان کرتے ہیں، اور سلام ہو ان رسولوں پر اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے (صفات) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان صفات سے جن سے اس کے مخالفین نے اس کی توصیف کی ہے اپنے آپ کو پاک بتایا ہے اور رسولوں پر اس لیے سلامتی بھیجی گئی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے متعلق جو کچھ کہا وہ نقص اور عیب سے بالکل پاک ہے۔''

اس کے بعد امام ابن تیمیہ نے وہ تمام آیتیں جمع کی ہیں، جن میں خدائے تعالیٰ کا کوئی نہ کوئی وصف بیان کیا گیا ہے:

حریفوں کا اعتراض اور اس کا جواب

اس پر کسی حریف نے ان سے پوچھا کہ اللہ اور اس کی صفات پر ایمان لانے کے سلسلے میں انہوں نے تحریف، تعطیل، تکلیف اور تمثیل کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں اُن سے ان کی کیا مراد ہے؟ اس سے اس تاویل کی نفی تو مقصود نہیں ہے، جس کو اہل تاویل ''لفظ کو اس کے

ظاہری معنی سے واجب یا جائز طور پر پھیرنے" کے معنی میں لیتے ہیں۔

امام ابن تیمیہ نے جواب دیا کہ چونکہ انہوں نے اس رسالے میں کتاب وسنت، صحابہ و تابعین اور علمائے سلف ہی کے الفاظ کو استعمال کرنے کی پابندی کی ہے، اس لیے تاویل اور تشبیہ کے الفاظ کی بجائے تحریف اور تمثیل کے الفاظ استعمال کیے ہیں، کیونکہ قرآنِ مجید میں انہی لفظوں سے خدا کی آیتوں میں کمی بیشی کرنے کی مذمت اور کسی چیز کو خدا کے ساتھ مشابہت دینے کی ممانعت آئی ہے جیسے:

﴿ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهِ ﴾ [1]

"کلموں کو ان کی اپنی جگہ سے پھیر دیتے ہیں۔"

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴾ [2]

"اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔"

تاویل کا لفظ اگرچہ قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے، مگر چونکہ اس کے معنی وہ نہیں ہیں، جو متأخرین فقہاء اور اصولیین نے مراد لیے ہیں، اس لیے اس کو یہاں استعمال نہیں کیا گیا۔

تکییف کا لفظ اگرچہ کتاب وسنت میں نہیں ہے، مگر علمائے سلف سے مروی ہے چنانچہ حضرت ابن عیینہ، حضرت ربیعہ اور حضرت امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ سے مسئلہ استواء کے متعلق مشہور مقولہ منقول ہے:

أَلْاَسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ وَالْإِيْمَانُ بِهِ وَاجِبٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ.

استواء معلوم ہے اور اس کی کیفیت مجہول ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔

لیکن اس لفظ کا مفہوم قرآن مجید ہی سے مستنبط ہے، کیونکہ قرآنِ مجید سے یہ ثابت ہے کہ ذات باری کی کیفیت اور حقیقت کا ادراک نہیں ہوسکتا۔

امام ابن تیمیہ نے ان الفاظ کی تشریح کر کے بتایا کہ ان سے جہمیوں، رافضیوں،

---

[1] ٤/النساء:٤٦۔ [2] ٤٢/الشوریٰ:١١۔

قدریوں، کی یہ تاویل کہ ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ ''اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا کلام کرنا'' سے مراد جَرَّحَ اللّٰهُ مُوْسٰى بِاَظَافِرِ الْحِكْمَةِ تَجْرِيْحًا ''اللہ نے اپنے ناخنِ حکمت سے موسیٰ کی گرہ کشائی کی۔''

امام ابن تیمیہ نے کچھ اس انداز سے اپنی یہ تقریر پیش کی کہ ان کے حریف ان کا کوئی جواب نہ دے سکے، وہ یہ چاہتے تھے کہ اور اعتراضات کریں مگر چونکہ انہیں معلوم تھا کہ امام ابن تیمیہ ہر ایک کا جواب دیں گے، اس لیے وہ پیچ وتاب کھا کر خاموش ہو گئے۔ [1]

تجسیم کا الزام اور اس کی تردید

امام ابن تیمیہ نے تنزیہ اور تشبیہ کی آیتیں اور حدیثیں پیش کیں اور خدا کی صفاتِ ذاتی جیسے چہرہ، ہاتھ، آنکھ، سمع، بصر وغیرہ سے بحث کرتے ہوئے قرآن مجید کی آیتیں پیش کیں، اس پر کسی بڑے مخالف نے کہا، اس صورت میں یہ کہاں بجا ہو گا کہ خدا جسم رکھتا ہے، کیونکہ صفات ذاتی اور جہت جسم ہی کے لوازمات میں سے ہیں۔

امام ابن تیمیہ نے فوراً جواب دیا کہ انہوں نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ خدا جسم ہے، بلکہ یہ لکھا ہے کہ خدا نے جن الفاظ اور صفات سے اپنی ذات کو متصف کیا ہے اور اس کے رسول نے جن الفاظ اور صفات سے اس کی توصیف کی ہے ہم بھی انہیں الفاظ اور صفات سے اس کی توصیف کریں گے اور چونکہ کتاب وسنت میں خدا کا جسم والا ہونا یا جسم والا نہ ہونا مذکور نہیں ہے اس لیے اس کے جسم والے ہونے کے متعلق یہاں کسی قسم کا اعتراض کرنا بالکل ہی بے جا ہے۔

جسمیت کے متعلق بعض علما حاضرین نے امام ابن تیمیہ کے جواب کی تائید کی اور ان کی حمایت میں کچھ دلیلیں بھی پیش کیں۔

اس عقیدے کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں ہے

جب حریفوں نے نائبِ دمشق امیر افرم کے سامنے اپنا پہلو کمزور پڑتے دیکھا تو کہا: آپ نے امام احمد ابن حنبل کا عقیدہ تحریر کیا ہے، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر امام ابن

---

[1] العقود الدرية، ص: ۲۱۵۔

تیمیہ اس بات کو مان جائیں تو پھر یہ جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ حنبلی مذہب بھی ان مذاہب میں سے ایک تھا، جس کی پیروی حکومت کی طرف سے جائز قرار دی گئی تھی، امام ابن تیمیہ نے کہا کہ اس عقیدے کو امام احمد بن حنبل کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ اور تمام صحابہ و تابعین اور علمائے سلف کا عقیدہ ہے، امام احمد ابن حنبل تو کتاب و سنت اور احادیث رسول اللہ ﷺ کے علم کو لوگوں تک پہنچانے والوں میں سے ایک فرد ہیں، اگر کوئی شخص ایسی بات کہے جس کی سند اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں نہیں ہے تو پھر وہ کسی طرح بھی قبول نہیں کی جا سکتی، چاہے وہ امام احمد بن حنبل ہی کا کہا ہوا کیوں نہ ہو۔

حریفوں کو تین سال کی مہلت دینا

اس کے بعد امام ابن تیمیہ نے نہایت ہی زوردار الفاظ میں اپنے تمام مخالفین کو خطاب کر کے کہا، میں اپنے تمام مخالفین کو تین سال کی مہلت دیتا ہوں، اس مدت میں اگر کوئی شخص اِسلام کی ابتدائی تین صدیوں میں سے جن کے بہتر ہونے کی نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں شہادت دی ہے:

((خیر القرون قرنی الذی بعثت فیھم ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم)) [1]

''بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے جس میں مَیں مبعوث ہوا پھر وہ لوگ جو اس زمانے سے قریب ہیں پھر وہ جو اس زمانے سے قریب ہیں۔''

ایک بات بھی اس عقیدے کے خلاف ثابت کر دی تو میں اپنے عقیدے سے رجوع کرنے کے لیے تیار ہوں، اور میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ ان تین زمانوں کے حنفیوں، مالکیوں، شافعیوں، حنبلیوں، اشعریوں اور محدثوں وغیرہ کے اقوال میرے عقیدے کے درست ہونے کی سند میں پیش کروں۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الشھادات، باب لا یشھد علی شھادۃ جور، ح: ۲۶۵۲، ۳۶۵۱۔ نوٹ: خیر القرون کی جگہ خیر الناس ہے۔

خلق قرآن پر بحث

جب خلقِ قران کی بحث آئی تو مخالفین نے امام ابن تیمیہ سے پوچھا کہ حروف اور آواز کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ اس سوال سے ان کی غرض یہ تھی کہ اگر وہ حروف اور آواز کو مخلوق بتائیں جیسا کہ مخالفین کا عقیدہ تھا تو پھر ان کا مقصد پورا ہو گیا اور اگر ان کو غیر مخلوق اور قدیم بتائیں جیسا کہ اس زمانے کے حنابلہ کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ وہ حروف اور آواز کو بھی قدیم کہتے ہیں تو پھر آسانی کے ساتھ امام ابن تیمیہ پر تجسیم کا الزام لگایا جا سکتا ہے، امام موصوف نے تفصیلی جواب دیا اور کہا کہ امام احمد بن حنبل اور ان کے ساتھیوں کے متعلق یہ جو روایت کی جاتی ہے کہ وہ قاریوں کی آواز اور مصاحف کی روشنائی کو قدیم اور ازلی کہتے ہیں بالکل جھوٹ اور غلط ہے اور اُن پر محض بہتان ہے، امام ابوبکر الخلال اور امام ابوبکر مروزی اپنی کتابوں میں صاف طور پر لکھتے ہیں کہ امام احمد نے قاریوں کی آواز اور مصاحف کی روشنائی کو کسی وقت بھی قدیم اور ازلی نہیں کہا، بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ قرآنِ مجید کی عبارت اور اس کے حروف غیر مخلوق اور قدیم ہیں اور قاریوں کی آواز مصاحف کی روشنائی مخلوق ہے۔

طنز اور اس کا جواب

اس جواب کو سن کر مخالفین چپ ہو گئے، مگر کسی نے بطور طنز کے کہا کہ امام احمد ابن حنبل کے پیروؤں میں حشویہ اور مشبہ کی ایک بڑی جماعت پائی جاتی ہے، امام ابن تیمیہ نے فوراً جواب دیا کہ دوسرے ائمہ کے پیروؤں میں امام احمد کے پیروؤں سے زیادہ تجسیم اور تشبیہ کا عقیدہ پایا جاتا ہے، یہ کردی قومیں جو تمام کی تمام شافعی ہیں، تشبیہ اور تجسیم کے قائل ہیں، جیلان میں شافعی اور حنبلی دونوں مذہب کے لوگ موجود ہیں، مگر حنبلیوں میں تشبیہ و تجسیم کے ماننے والے اتنے زیادہ نہیں ہیں جتنے کہ شافعیوں میں پائے جاتے ہیں کُرَّامِیَہ کل کے کل حنفی ہیں اور تجسیم کے قائل ہیں۔

اس کے بعد امام ابن تیمیہ نے بہت ہی برہم ہو کر بلند آواز سے پوچھا: بتاؤ! ائمہ حنابلہ میں سے کون حشوی ہے، کیا اثرم؟ ابوداؤد مروزی؟ ابوبکر خلال؟ ابوبکر بن عبدالعزیز؟ ابوالحسن یمی؟ ابن حامد؟ قاضی ابویعلی؟ ابوالخطاب ابن عقیل؟ ان میں سے کون تشبیہ اور تجسیم کا قائل

ہے، کیا ابن الخطیب کے جھوٹ بولنے اور بہتان باندھنے سے شریعت اور مذہب وزینی کی باتیں باطل قرار دی جائیں گی، کیا اس کے صرف اتنا نقل کر دینے سے کہ حنابلہ قاریوں کی آواز اور مصاحف کی روشنائی تک کو قدیم کہتے ہیں یہ مان لیا جائے گا کہ وہ درحقیقت تشبیہ اور تجسیم کے قائل ہیں، اگر اس کی یہ روایت صحیح ہے تو پھر بتایا جائے کہ کس حنبلی نے یہ کہا ہے؟ اور کس کتاب میں اس کا حوالہ ہے؟

منه بدأ و اليه يعود کی تشریح

جب خلقِ قرآن کے مسئلے میں منه بدأ واليه يعود (اسی سے نکلا اور اسی کی طرف لوٹ جائے گا) کا جملہ پڑھا گیا تو مخالفین نے اس کا مطلب پوچھا، امام ابن تیمیہ نے کہا: یہ جملہ سلف سے منقول ہے۔ چنانچہ عمرو بن دینار کا قول ہے کہ میں ستر سال سے بزرگوں سے بہت سنتا آیا ہوں کہ اللہ خالق ہے، اور قرآن کے سوا تمام چیزیں مخلوق ہیں، کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے، اسی سے نکلا اور اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔

پھر اس جملے کی تشریح کر کے بتایا کہ اُسی سے نکلا کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کلام کیا اور اس کو اپنے بندے پر اتارا اور آخری زمانے میں اسی کی طرف لوٹ جائے گا، یعنی مصاحف اور سینوں میں اس کا ایک حرف بھی باقی نہیں رہے گا، اس جملے سے ان جہمیوں کی تردید مقصود ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے قرآنِ مجید کو ہوا میں پیدا کیا، اس نے خود کوئی کلام نہیں کیا۔

اس کے بعد خلقِ قرآن کے متعلق اتنے عمدہ پیرائے میں بحث کی کہ مخالفین بھی ان کی تعریف کرنے لگے، صدرالدین ابن الوکیل شافعی نے تو یہاں تک کہا کہ امام ابن تیمیہ نے ہمارے شبہات کو دور کر دیا، اور ہمارے سینوں کی کدورت کو صاف کر دیا۔

مجموعی حیثیت سے چار اعتراضات

امام ابن تیمیہ نے آخرت، تقدیر، فسق و فجور [1] اور دیگر مسائل کے متعلق مخالفین کے

---

[1] یعنی یہ مسئلہ فسق و فجور کرنے والا مؤمن ہے یا نہیں، اہل سنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ مؤمن ہے بشرطیکہ وہ فسق و فجور کو حلال سمجھ کر اس کا ارتکاب نہ کرتا ہو، خوارج اس کو کافر قرار دیتے ہیں۔ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ ایسا شخص نہ مؤمن ہے اور نہ کافر، اس کا درجہ ایمان اور کفر کے درمیان ہے، ان کی اصطلاح میں اس کو "منزلة بين منزلتين" (دو منزلوں کے درمیان ایک منزل) کہتے ہیں۔

اعتراضات کے تشفی بخش جواب دیئے اور جب یہ رسالہ شروع سے آخر تک پڑھا جا چکا تو اس پر مجموعی حیثیت سے چار اعتراض کیے گئے، پہلا اعتراض اس رسالے کے نام پر تھا، دوسرا اعتراض اس دعوے پر تھا کہ خدا عرش پر ہے، تیسرا اعتراض خدا اور عرش کو چاند اور آسمان کے ساتھ تشبیہ دینے پر تھا، چوتھا اعتراض حقیقت اور مجاز کی تعبیر سے متعلق تھا۔

پہلا اعتراض نام کے متعلق

امام ابن تیمیہ نے اس رسالۂ العقیدۃ الواسطیہ کا نام "اعتقاد الفرقة الناجية الیٰ قیام الساعة اهل السنة والجماعة" (نجات پانے والے اور قیام قیامت تک فتح یاب رہنے والے فرقہ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ) رکھا تھا، مخالفین نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ جب اس عقیدے کو ماننے والی جماعت ہی نجات پانے والی اور فتح یاب رہنے والی ٹھہری تو لامحالہ اس سے وہ لوگ نکل گئے جو اس عقیدے کو نہیں مانتے، جیسے ہم اشعرعین اور متکلمین کی جماعت جو ایمان کو ایسا قول اور عمل نہیں قرار دیتی جو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، بلکہ اس سے صرف تصدیق اور اقرار مراد لیتی ہے اور اس کے لیے ضروری قرار نہیں دیتے۔ اس لحاظ سے یہ نام رکھنے کے یہ معنی ہوئے کہ ہم لوگ ہلاک ہونے والوں میں سے قرار پائے۔

امام ابن تیمیہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ انہوں نے اس کو نجات پانے والی جماعت کا اس لیے عقیدہ قرار دیا کہ ایسی ہی جماعت کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجات کی خوشخبری دی ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ آپ کی امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، جن میں سے بہتر فرقے تو دوزخی ہوں گے اور ایک جنتی ہوگا اور یہ وہ فرقہ ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے نقشِ قدم پر چلے گا۔ چونکہ یہی عقیدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں سے مروی ہے اس لیے اس کے ماننے والی جماعت ہی نجات پانے والی ٹھہرے گی، اور چونکہ اس عقیدے کی تمام باتیں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مستند طور پر ثابت ہیں، اس لیے صرف بعد میں آنے والے لوگوں کو مخالفت کرنے سے اس عقیدے کے دعاوی اور دلائل پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تاوقتیکہ پیش کی ہوئی روایات اور دلائل

سے زیادہ قوی اور مضبوط روایات اور دلائل پیش نہ کیے جائیں۔

اب رہا اس عقیدے کے نہ ماننے والوں کا معاملہ تو یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر وہ شخص جو اس عقیدے کو نہ مانتا ہو، حتمی طور پر ہلاک ہونے والوں میں سے قرار پائے، کیونکہ بعض صورتوں میں وہ غلط اجتہاد کرتا ہے، جس کو خدا معاف کر دیتا ہے، یا وہ ایک ایسی دلیل کو جو حقیقت میں صحیح نہیں ہے، صحیح سمجھ کر حجت قرار دیتا ہے، یا یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس اتنی نیکیاں ہوں کہ اس کی تمام اعتقادی غلطیوں کا کفارہ بن جائیں، اس لیے تاویل کرنے والا، توبہ کرنے والا، نیک اور صالح آدمی اس وعید میں داخل نہ ہوگا، وہی شخص اس وعید کا مستحق ہوگا جو دیدہ و دانستہ اس عقیدے کے خلاف عقیدہ رکھتا ہو۔

دوسرا اعتراض مسئلہ استواء کے متعلق

جب استواء علی العرش کا مسئلہ آیا تو امام ابن تیمیہ نے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دینا چاہا، بعض لوگوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مسئلہ کو کسی دوسری مجلس کے لیے اٹھا رکھا جائے، کیونکہ اس روز کی بیٹھک بہت لمبی ہوگئی تھی، اور بہت سے لوگ مسلسل نشست سے اکتا چکے تھے، اس کے علاوہ ایک دوسری بات بھی تھی، یعنی یہ کہ پہلی مجلس اچانک پیش آئی تھی اور موافقین اور مخالفین میں سے کوئی بھی ان مختلف فیہ مسائل پر تیار ہو کر نہیں آیا تھا، علاوہ ازیں اشعریوں کے بڑے بڑے مناظر اس مجلس میں شریک نہیں ہو سکے تھے، ان کو بھی آیندہ مجلس میں کھینچ کر لانا چاہتے تھے، تاکہ امام ابن تیمیہ کا پوری شدت وقوت کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکے۔

دوسری مجلس

چنانچہ یہ دوسری مجلس چار دن بعد ۱۲ رجب ۷۰۵ھ کو جمعہ کی نماز کے بعد منعقد ہوئی امام ابن تیمیہ اپنے رسالہ ''العقیدۃ الواسطیہ'' اور ''العقیدۃ الحمویۃ الکبریٰ'' کے ساتھ حافظ ابن عساکر شافعی (المتوفی: ۵۷۱ھ) کی کتاب ''تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الامام ابی الحسن الاشعری'' بھی لے آئے، مخالفین کی طرف سے صفی الدین محمد بن عبدالرحیم الہندی الشافعی (المتوفی: ۷۱۵ھ) بھی تشریف لائے، یہ اس دور کے بہت بڑے متکلم، اصولی اور

مُناظر سمجھے جاتے تھے، یہ امام ابن تیمیہ سے سترہ سال بڑے تھے، ۶۴۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، ۶۶۷ھ میں دہلی سے یمن گئے اور پھر مکہ، مدینہ، مصر، بلادِ روم کی سیر کرتے ہوئے ۶۸۵ھ میں دمشق آئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے، مخالفین نے انہی کو افسر مناظرہ مقرر کیا۔

اتحاد و اتفاق کی دعوت

سب سے پہلے امام ابن تیمیہ نے ایک مختصر تقریر کی، جس میں تمام مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دی، اس کے بعد بتایا کہ وہ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ بلا شبہ اللہ اور اس کے رسول اور علمائے سلف کا کہا ہوا ہے، چونکہ اللہ ایک ہے اور اس کا رسول بھی ایک ہے، اس لیے اس کے دین کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے، اگر تمام مسلمان اللہ اور اس کے رسول اور علمائے سلف کی کہی ہوئی باتوں پر متفق ہو جائیں تو پھر تمام مسلمانوں کی خوش قسمتی اور سرخروئی کا کیا کہنا اور اگر کوئی شخص اس کے بعد بھی مخالفت پر کمر بستہ ہے تو وہ پھر باطل کے تمام پردوں کو چاک کرنے اور فاسد مذاہب کی غلطیوں کو جنہوں نے تمام دولتوں اور ملتوں کو گندہ اور خراب کر دیا ہے مخالفین کے سامنے کھول کر رکھ دینے کے لیے تیار ہیں۔

امام ابن تیمیہ کو ان باتوں کے کہنے کی اس لیے ضرورت پڑی تھی کہ اس دوسری مجلس کے منعقد ہونے سے پہلے چند شافعی، اشعری اور حنفی عالموں نے ان کے گھر پر ان سے ملاقات کی، یہ لوگ پہلی مجلس کا رنگ دیکھ چکے تھے کہ امام ابن تیمیہ کس طرح مخالفین پر چھا رہے تھے، ان کو اس کا احساس ہو گیا تھا کہ اس دوسری مجلس میں بھی وہ امام موصوف کے زوردار دلائل کا کوئی جواب نہیں دے سکیں گے، اس میں اشعری علما کی بڑی سبکی ہو گی اور متعصب اشخاص شورش پر آمادہ ہو جائیں گے، اس لیے انہوں نے بلطائف الحیل اس جھگڑے کو مٹانے کی کوشش کی، انہوں نے امام موصوف سے کہا کہ مخالفین کے دلوں میں اپنی جماعت کا تعصب اتنا ہے کہ وہ برسرِعام اپنے مقتداؤں کے اقوال کے خلاف کسی دلیل کو بھی ماننے کے لیے تیار نہ ہوں گے، اس لیے اگر امام موصوف یہ مان جائیں کہ انہوں نے امام احمد بن حنبل اور ان کے پیرؤوں کا عقیدہ لکھا ہے تو مخالفین کی مخالفت ختم ہو جائے گی اور مسلمان بھی اس کشمکش اور فتنہ و فساد سے جو اس وقت انہیں ہیجان میں ڈالے ہوئے ہے، نجات پا جائیں گے اور اس

طرح تمام علما کی عزت بھی باقی رہ جائے گی۔

امام ابن تیمیہ نے کہا: خدا کی قسم! عقائد اور اعمال و افعال کے معاملے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، میں نے درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور تابعین اور تمام ائمہ اہل حدیث اور علمائے سلف کا عقیدہ لکھا ہے، امام موصوف نے یہ بھی کہا کہ امام شافعی اور امام ابوالحسن اشعری صفات کے اندر تاویل کرنے کے ہرگز قائل نہیں تھے، امام ابوالحسن اشعری کے متعلق صفات کی تاویل کے جو دو قول نقل کیے جاتے ہیں وہ ہرگز صحیح نہیں ہیں، بلکہ اس بارے میں اشاعرہ کے دو قول ہیں جن میں ترکِ تاویل صفات کا قول ہی متقدر متقدمین اشاعرہ کا قول ہے، جیسا کہ امام ابوالحسن اشعری اور متقدمین اشاعرہ کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے۔

اس دوسری مجلس میں امام ابن تیمیہ نے کہا کہ بعض باتیں ایسی ہیں جن کو وہ اس مجلس میں نہیں کہنا چاہتے، بلکہ وہ ان باتوں کو سلطان مصر کے سامنے پیش کریں گے، یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں کہ لوگ آپس میں شدید اختلاف رائے رکھتے ہیں، کوئی اپنے آپ کو حنبلی کہتا ہے اور کوئی اشعری اور اس کی وجہ سے ان کے درمیان ایسی باتوں پر جن کی حقیقت سے وہ خود بھی آشنا نہیں ہوتے، روز نت نئے فتنے کھڑے ہوتے ہیں۔ امامِ موصوف نے کہا: میں نے سلف صالح کا عقیدہ پیش کیا ہے، امام ابوالحسن اشعری نے بھی اسی کو سلف صالح کا عقیدہ قرار دیا ہے، اس کے ثبوت میں امام موصوف نے ''تبیینِ کذب المفتری'' کا وہ باب پڑھ کر سنایا جس کو ابن عساکر نے امام ابوالحسن اشعری کی ''کتاب الابانہ'' سے نقل کیا ہے۔ [1]

اسلام میں پہلا اختلاف

اس بحث کے ضمن میں جب معتزلہ کا ذکر آیا تو امیر افرم نے امام ابن تیمیہ سے معتزلہ کی وجہ تسمیہ پوچھی، امامِ موصوف نے جواب دیا کہ ابتدائے اسلام میں فاسق کے متعلق اہل اسلام کے درمیان اختلاف پیدا ہوا، اور یہ پہلا اختلاف تھا جو ملتِ اسلام میں ظاہر ہوا، خارجی لوگ کہتے تھے کہ فاسق کافر ہے، اہل سنت و جماعت کا خیال تھا کہ وہ مومن ہے، ایک

---

[1] تبیین کذب المفتری، مطبوعہ دمشق از ص: ۱۴۸ تا ۱۶۵۔

دن امام حسن بصری کی درس گاہ میں اسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی، ایک جماعت نے کہا کہ فاسق نہ تو مومن ہے اور نہ کافر، بلکہ وہ ایمان اور کفر کے درمیان ہے، اس جماعت کا سرگردہ واصل بن عطاء تھا، جب اس اختلاف کی بنا پر حضرت امام حسن بصری کی درس گاہ سے اٹھ گیا اور الگ ہوگیا تو لوگوں نے کہا اِعْتَزَلَ عَنْ مَجْلِسِهِ (ان کی مجلس سے الگ ہوگیا) اسی بنا پر اس کے پیرؤوں کا نام معتزلہ پڑ گیا۔

شیخ صفی الدین ہندی کی تردید اور اس کا جواب

اس پر شیخ صفی الدین ہندی نے کہا کہ سب سے پہلا اختلاف خلق قرآن کے مسئلے پر ہوا تھا، اور سب سے پہلے جس شخص نے یہ مسئلہ چھیڑا وہ عمرو بن عبید تھا، اس کے بعد واصل بن عطاء نے اس مسئلہ کو اور ترقی دی، ثبوت کے لیے انہوں نے شہرستانی کی کتاب الملل والنحل کا حوالہ دیا۔

امام ابن تیمیہ نے جواب دیا تم نے جو کچھ کہا ہے وہ اجماع کے صریحاً مخالف ہے۔ اسلام کی ہر ایک بدعت کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوں کہ وہ کب جاری ہوئی اور کس نے اس کو جاری کیا، خلق قرآن کا مسئلہ دوسری صدی ہجری کے بعد مأمون باللہ کے زمانے میں پیدا ہوا اور معتزلہ اس سے بہت پہلے دوسری صدی ہجری کی ابتداء میں پیدا ہو گئے تھے، حالانکہ اس وقت خلق قرآن کی بحث ابھی تک نہیں چھڑی تھی، پھر امامِ موصوف نے کہا کہ شہرستانی نے معتزلہ کے متعلق نہیں بلکہ متکلمین کے متعلق یہ لکھا ہے کہ ان کے درمیان سب سے پہلا اختلاف خلق قرآن کے مسئلہ پر ہوا، یہاں سوال معتزلہ کا ہے، متکلمین کا نہیں ہے، اور شہرستانی نے متکلمین کی جو وجہ تسمیہ بتائی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ خلق قرآن کے مسئلے کے وجود میں آنے سے بہت پہلے ایک جماعت کو متکلمین کے لقب سے پکارا جاتا تھا، چنانچہ واصل بن عطاء کو متکلم کہا جاتا تھا، حالانکہ اس وقت تک خلق قرآن کی بحث چھڑی نہیں تھی، پھر واصل کی فصاحت و بلاغت کی تعریف کرنے کے بعد کہا کہ واصل کا زمانہ عمرو بن عبید کے بعد کا نہیں بلکہ دونوں ایک ہی زمانہ کے تھے، چنانچہ جب ایک مرتبہ واصل بن عطاء نے بڑی فصیح و بلیغ تقریر کی تو عمرو بن عبید نے کہا کہ اگر ہم سے کوئی نبی پیدا ہوا بھی تو اس سے اچھی کیا

تقریر کرسکتا ہے۔

ائمہ کی طرف بہت سی غلط باتیں منسوب ہو گئی ہیں

جب امام ابن تیمیہ "تبیین کذب المفتری" کا باب پڑھ چکے تو شیخ صفی الدین ہندی نے کہا: اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ امام احمد بن حنبل بڑے ہی جلیل القدر امام تھے، مگر بعد میں لوگوں نے ان کی طرف بہت سی باتیں ایسی منسوب کر دی ہیں جن سے وہ بالکل بری ہیں، امام موصوف نے ان کے اس قول کی تصدیق کی اور کہا کہ اس میں امام احمد ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ تمام ائمہ اسلام کے ساتھ لوگوں نے ایسا ہی کیا ہے انہوں نے امام مالک کی طرف بہت سی ایسی باتیں منسوب کر دی ہیں، جن سے وہ بری ہیں، اسی طرح امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دی ہیں جن سے وہ بری ہیں۔ انہیں پر کیا منحصر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی دشمنوں نے ایسی باتیں منسوب کر دی ہیں جن سے وہ بالکل بری ہیں۔

شیخ صفی الدین کا طنز اور اس کا جواب

شیخ صفی الدین ہندی نے کہا، لیکن امام احمد ابن حنبل کے پیروؤں میں حشویہ اور مشبہ اور مجسمہ کی ایک بہت بڑی تعداد پائی جاتی ہے، امام ابن تیمیہ نے بگڑ کر کہا کہ دوسرے ائمہ کے پیروؤں میں امام احمد کے پیروؤں سے زیادہ تشبیہ اور تجسیم کا اعتقاد پایا جاتا ہے، یہ کردی قومیں تمام کی تمام شافعی ہیں ان میں تشبیہ و تجسیم کے قائل اتنے زیادہ پائے جاتے ہیں جو کسی اور مسلک کے لوگوں میں نہیں مل سکتے، گیلان میں شافعی اور حنبلی دونوں مسلک کے لوگ ہیں، لیکن حنبلیوں کی بہ نسبت شافعیوں میں تشبیہ اور تجسیم کا عقیدہ زیادہ رائج ہے، کرامیہ تمام کے تمام تجسیم کے قائل ہیں، حالانکہ وہ سب کے سب حنفی ہیں۔

لفظ حشویہ کی تشریح

امیر افرم یا کسی اور شخص کے سوال کرنے پر حشویہ کے لفظ کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ سب سے پہلے معتزلہ نے اس لفظ کو استعمال کیا، جب کسی بات یا عقیدے کی تحقیر کرنی ہوتی تو

وہ اس کو حشو یا عامی کہتے تھے اور اس کے ماننے والوں کو حشویہ کہا کرتے تھے، جیسا کہ رافضی سنی عوام الناس کو جمہور کا لقب دیتے ہیں۔

ائمہ حنابلہ میں سے کون حشوی ہیں؟

پھر امام ابن تیمیہ نے شیخ صفی الدین ہندی کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا ذرا بتاؤ ائمہ حنابلہ میں سے کون حشوی ہے؟ کیا اثرم؟ ابوداؤد مروزی؟ ابوبکر خلال؟ ابوبکر بن عبدالعزیز؟ ابوالحسن تمیمی؟ ابن حامد؟ قاضی ابویعلیٰ؟ ابوالخطاب ابن عقیل؟ ان میں سے کون تشبیہ اور تجسیم کا قائل ہے، کیا ابن الخطیب کے جھوٹ بولنے اور بہتان باندھنے سے شریعت اور مذہب و دین کی باتیں باطل قرار دی جائیں گی، کیا اس کے صرف اتنا نقل کر دینے سے کہ حنابلہ قاریوں کی آواز اور مصاحف کی روشنائی تک کو قدیم کہتے ہیں یہ مان لیا جائے گا کہ وہ درحقیقت تشبیہ اور تجسیم کے قائل ہیں، اگر یہ روایت صحیح ہے تو پھر بتایا جائے کہ کس حنبلی امام نے ایسا لکھا ہے؟ اور کس کتاب میں اس کا حوالہ ہے؟

وہی مقامات پڑھ کر سنا دیے جائیں جن سے مخالفین کو اختلاف ہے

چونکہ شیخ صفی الدین ہندی پہلی مجلس میں شریک نہیں تھے اس لیے امام ابن تیمیہ نے العقیدۃ الواسطیہ کا رسالہ پھر سے ان کو پڑھ کر سنانے کا حکم دیا، مگر بعض لوگوں نے یہ رائے دی کہ ایسا کرنے میں وقت زیادہ صرف ہو جائے گا وہی مقامات پڑھ کر سنا دیے جائیں جن سے مخالفین کو اختلاف ہے۔

کیا خالق کی صفات مخلوق پر حقیقی طور پر بولی جاتی ہیں

جب امام ابن تیمیہ کی اس تحریر پر بحث شروع ہوئی کہ آیا خالق کی صفات مخلوق پر حقیقی طور پر بول جاتی ہیں یا نہیں، تو شیخ صفی الدین ہندی نے حقیقت اور مجاز پر ایک بہترین منطقی بحث کی جس کو امام ابن تیمیہ نے بہت پسند کیا اور ان کے اسلوبِ بیان کی بڑی تعریف کی، پھر کہا خدا بلاشبہ حقیقی طور پر زندہ ہے، جاننے والا ہے، سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے، تمام اہل السنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے، البتہ مبتدعین نے ان کی بعض صورتوں سے اختلاف کیا

ہے، اللہ جس طرف حقیقی طور پر موجود ہے اس طرح مخلوق بھی حقیقی طور پر موجود ہے، خواہ یہ وجود دونوں پر اشتراکِ لفظ کی حیثیت سے بولا جائے یا تواطی کی حیثیت سے جو لفظی اور معنوی دونوں قسم کے اشتراک کو متضمن ہے، یا تشکیک کی حیثیت سے جو تواطی ہی کی ایک قسم ہے، ان میں سے ہر ایک قول کے مطابق اللہ جس طرح حقیقی طور پر موجود ہے اسی طرح مخلوق بھی حقیقی طور پر موجود ہے، اور کسی قسم کے خالق اور مخلوق پر حقیقی طور پر اطلاق کرنے سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔

لفظِ وجود متواطی ہے یا مشترک

اس بحث کے دوران میں مخالفین کے اندر ہی یہ بحث چھڑ گئی کہ وہ [1] وجود کا لفظ آیا متواطی ہے یا مشترک۔ ایک نے کہا متواطی ہے۔ دوسرے نے کہا ترکیب کے لازم ہونے کی وجہ سے مشترک ہے اور پھر امام فخر الدین رازی کا حوالہ دیتے ہوئے بیان کیا کہ اس جھگڑے کی بنیاد اس پر ہے کہ شے کا وجود اس کی ماہیت سے الگ ہے یا نہیں، پس جس شخص کے نزدیک شے کا وجود اس کی عین ماہیت ہے وہ وجود کے لفظ کو مشترک مانتا ہے، اور جو شخص شے کے وجود کو زائد از ماہیت تسلیم کرتا ہے وہ وجود کے لفظ کو متواطی قرار دیتا ہے، پہلے نے کہا اس شخص کا قول ہی راجح ہے جو شے کے وجود کو زائد از ماہیت تسلیم کرتا ہے، دوسرے نے اس کی تردید کی اور کہا کہ امام ابوالحسن اشعری اور تمام اہل سنت و جماعت کا مذہب یہی ہے کہ شے کا وجود اس کی عین ماہیت ہے، پہلے نے اس دعوے کے تسلیم کرنے سے انکار کیا، امام ابن تیمیہ نے کہا کہ یہ مسلک تمام اہل السنت والجماعت کا نہیں ہے، بلکہ صرف متکلمین اہل السنت والجماعت کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ شے کا وجود اس کی عین ماہیت ہے، دوسرا قول معتزلہ کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ شے کا وجود زائد از ماہیت ہے اور ہر ایک گروہ کا مسلک ایک حیثیت سے صحیح ہے۔

---

[1] امام ابن تیمیہ نے بحث کرنے والوں کا نام نہیں دیا ہے، صرف تنازع کبیران لکھا ہے، یعنی دوسرے گروہوں نے آپس میں جھگڑا کیا، اس مجلس میں صفی الدین ہندی کے ساتھ شیخ کمال الدین ابن الزملکانی، شیخ صدر الدین ابن الوکیل اور قاضی انجم الدین ابن صصری حریفوں کی طرف سے بحث میں حصہ لے رہے تھے، غالباً انہی میں سے کوئی دو بزرگ ہوں گے۔

پھر امام ابن تیمیہ نے فرمایا: سچ تو یہ ہے کہ خدا کے تمام نام اور ناموں کی طرح متواطی ہیں اور متواطی ماننے کی صورت میں لزومِ ترکیب کا جو شبہ وارد ہوتا ہے وہ صحیح نہیں ہے، اگر شے کے وجود کو عین ماہیت تسلیم کر لیں تو اس صورت میں یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ کوئی اسم اپنی ذات پر اور اپنے نظیر پر اشتراک لفظ کی حیثیت سے بولا جائے، مثلاً سیاہ ہونے کی حیثیت سے ہر ایک سیاہ چیز پر لفظ کا اطلاق ہوسکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ایک چیز کی سیاہی بعینہٖ دوسری چیز کی سیاہی نہیں ہوتی، اسم تو صرف قدر مشترک یعنی مطلق سیاہی پر دلالت کرتا ہے، جس کا وجود اطلاق کی شرط کے ساتھ صرف ذہن میں پایا جاتا ہے، اور اس وجہ سے اس قدر مشترک کی نفی لازم نہیں آتی جو خارج میں اعیان موجودہ کے اندر پایا جاتا ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان تمام لغوی، فقہی اور منطقی اسماء ے متواطیہ کی نفی ہو جائے گی، جو اسم میں تو متواطی ہیں، مگر اس کے اعیان مسمیات خارج میں ایک دوسرے سے متمیز ہیں۔

اوعال کی حدیث پر جرح

جب استواء علی العرش کے مسئلے پر بحث ہوئی تو مخالفین اس مسئلے کے متعلق کھلی آیتوں اور حدیثوں کا تو کوئی جواب نہیں دے سکے، البتہ بحث کو خلط ملط کرنے اور اس کو طویل بنانے کے لیے ایک حدیث پر جرح کرنی شروع کی، اور ان کا یہ خیال تھا کہ شاید امام ابن تیمیہ اس جرح کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے اور اس طرح حاضرین مجلس میں ان کی ساکھ قائم رہے گی، مگر آگے چل کر معلوم ہو گیا کہ اس معاملے میں وہ امام موصوف کو شکست نہیں دے سکتے تھے۔

امام ابن تیمیہ نے خدا کے عرش پر ہونے کے متعلق مختلف حدیثوں سے استدلال کیا تھا، ان میں سے ایک حدیث اوعال کی بھی تھی، جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے کہ خدا عرش پر ہے، یہ حدیث حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، ان سے احنف بن قیس نے یہ حدیث سنی تھی اور احنف بن قیس سے عبداللہ بن عمیرہ نے روایت کی ہے، امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث پر جرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ احنف بن قیس سے عبداللہ بن عمیرہ کا سننا معلوم نہیں ہے، زکی الدین عبدالعلیم نے اپنی ایک کتاب میں امام بخاری کی اس جرح کو نقل

کیا ہے، اور جب یہ جرح مخالفین کے ہاتھ لگی تو ان کو خیال ہوا کہ امام ابن تیمیہ کی پیش کی ہوئی حدیثوں میں کم از کم ایک ضعیف حدیث تو ایسی مل گئی، جس کا امامِ موصوف سے کوئی جواب نہیں بن سکتا تھا، انہیں اس کی خبر نہیں تھی کہ یہ جرح بھی ان کی نظر سے گزر چکی تھی، آخر وہ کون سی حدیث ایسی تھی جس کا حسن اور قبح، قوت اور ضعف ان پر ظاہر نہیں ہو چکا تھا، الا ماشاء اللہ۔ چنانچہ جب کسی مخالف نے ان حدیثوں کو سنانے کی درخواست کی جو خدا کے عرش پر ہونے کے ثبوت میں نقل کی گئی ہیں، تو امام موصوف نے فوراً ہی ان کا مقصد تاڑ لیا اور کہا کہ شاید تم اوعال کی حدیث پر جرح کرنا چاہتے ہو، اس نے کہا ہاں، امام موصوف نے کہا: اس حدیث کو ابوداود، ابن ماجہ اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث دو طریقوں سے مروی ہے اور ایک کی قدح سے دوسرے کی قدح لازم نہیں آتی۔

مخالف نے کہا کیا اس حدیث کی صحت کا دارومدار عبداللہ بن عمیرہ پر نہیں ہے؟ حالانکہ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ احنف بن قیس سے عبداللہ بن عمیرہ کا سننا معلوم نہیں ہے، امام ابن تیمیہ نے فوراً جواب دیا کہ امام الائمہ محمد بن خزیمہ نے اپنی کتاب التوحید فی الصفات میں اس حدیث کو نقل کیا ہے اور یہ وہ کتاب ہے، جس میں حافظ ابن خزیمہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ صرف انہی موصولہ حدیثوں کو دلیل میں پیش کریں گے جن کا سلسلہ عدل اور ثقہ راویوں سے نقل ہوتا ہوا نبی کریم ﷺ تک جا پہنچتا ہے، اس لیے اثبات بہر حال نفی میں مقدم ہے اس کے علاوہ امام بخاری نے صرف اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے لوگوں کے علم کی نفی نہیں کی ہے، اور ایک شخص کی لاعلمی سے دوسرے شخص کی لاعلمی کچھ ضروری نہیں ہے، اگر کسی شخص کے نزدیک کسی سند کی صحت ثابت ہو جائے اور دوسرے کے نزدیک اس کی صحت ثابت نہ ہو تو اس شخص کے قول کو ترجیح دی جائے گی جس کے نزدیک اس سند کی صحت ثابت ہو گئی ہے، امام ابن تیمیہ کے اس عالمانہ اور مدلل جواب سے مخالفین بوکھلا گئے اور غصے اور ندامت کے ملے جلے جذبات سے متاثر ہو کر بے تکے اور غیر متعلق اعتراضات کرنے لگ گئے، حاضرین مجلس میں سے بہت سے لوگ بے اختیار ہو کر امام موصوف کی تعریفیں کرنے لگے جس کی وجہ سے مخالفین کا غصہ اور بڑھتا جا رہا تھا۔

وجہ کی تاویل اور اس پر بحث

مخالفین کے ایک سربرآوردہ شخص نے گفتگو کا رُخ بدلنے کے لیے امام بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات پیش کی اور کہا لیجیے اس میں وجہ کی تاویل کی گئی ہے، امام ابن تیمیہ نے فوراً ہی کہا شاید تمہاری مراد قرآنِ مجید کی یہ آیت ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ ﴾ [1]

''اور اللہ ہی کے لیے ہے مشرق و مغرب، پس تم جدھر منہ پھیرو اسی طرف اللہ کا چہرہ ہے۔''

مخالف نے کہا ہاں! حضرت مجاہد اور امام شافعی نے اس آیت میں 'وجہ اللہ' سے ''قبلة اللہ'' مراد لیا ہے، امام ابن تیمیہ نے کہا ہاں یہی ٹھیک ہے، یہ آیت آیاتِ صفات میں سے نہیں ہے، جس شخص نے وجہ اللہ سے اللہ کا چہرہ مراد لیا، اس نے درحقیقت آیت کو غلط سمجھا، یہاں وجہ جہت اور طرف ہی کے معنی میں ہے آیت کا سیاق اور سباق بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، اور روزمرہ کے استعمال میں بھی وجہ کا لفظ بعض اوقات جہت کے معنی میں لیا جاتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: اَیَّ وَجْهٍ تُرِیْدُ ''تم کس طرف کا قصد رکھتے ہو'' قرآن مجید میں وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ (ہر کسی کو ایک جہت ہے) اسی معنی میں آیا ہے، اس لیے ﴿ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ ﴾ [2] کے معنی یہ ہوں گے کہ مشرق اور مغرب دونوں خدا کی ہی جہتیں ہیں پس تم جدھر بھی رُخ کرو گے وہی اللہ کی جہت ہوگی۔

خدا کے عرش پر ہونے کا ثبوت

اس کے بعد امام ابن تیمیہ نے کتاب وسنت اور عقلی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ خدا عرش پر ہے اور بتایا کہ تمام اہل سنت و جماعت اور ائمہ حدیث وسلف امت کا بھی یہی عقیدہ ہے، بلکہ اللہ نے ہر انسان کی فطرت میں یہ بات رکھ دی ہے کہ جب کبھی اس پر کوئی بلا یا مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ آسمان کی طرف نظر اٹھا کر صدق دل سے دعا کرنے لگتا ہے، اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی بیان کیا، وہ یہ کہ ایک مرتبہ ابوالمعالی منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کر رہے تھے، اور

---

[1] ۲/البقرۃ:۱۱۵۔ [2] ۲/البقرۃ: ۱۱۵۔

خدا کی صفات کے متعلق ان کا بیان ہو رہا تھا، انہوں نے کہا: خدا کے متعلق یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کہاں ہے، اوپر ہے یا نیچے، دائیں یا بائیں، آگے یا پیچھے، ابوجعفر ہمدانی بھی اُن کی مجلس وعظ میں شریک تھے، انہوں نے اُٹھ کر پوچھا کہ اگر خدا کے متعلق جہات کی نفی کی جاتی ہے تو پھر اس بدیہی بات کا تو جواب دیا جائے کہ جب کبھی کوئی شخص خدا کو پکارتا ہے تو اُس کی آنکھیں اوراس کے ہاتھ کسی قصد اور ارادے کے بغیر آسمان کی طرف کیوں اُٹھ جاتے ہیں، آخر وہ دائیں یا بائیں منہ کر کے دعا کیوں نہیں کرتا، ابوالمعالی اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکے، اور بعد میں اپنے لوگوں سے کہا کہ ہمدانی نے مجھے حیران کر دیا۔

کیا آسمان دُعا کا قبلہ ہے؟

مخالفین میں سے ایک نے جواب یہ دیا کہ لوگ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس لیے دُعا کرتے ہیں کہ آسمان دُعا کا قبلہ ہے جس طرح کعبہ نماز کا قبلہ ہے، امام ابن تیمیہ نے جواب دیا کہ نماز پڑھنے والا تو خدا کے گھر کی طرف منہ کرتا ہے، اور دُعا کرنے والا صرف اللہ کی طرف منہ کرتا ہے اوراسی سے دُعا کا طالب ہوتا ہے، اتنے میں عارف کبیر شیخ محمد بن قوام بول اٹھے اور اس مخالف کی طرف مخاطب ہو کر کہا تم پر بلا کی ہو، نبی کریم ﷺ معراج کی رات کس طرف گئے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بار بار کہنے پر رکعات کی تعداد کی تخفیف کے لیے آپ کس کے پاس گئے، اگر وہاں خدا نہیں تھا تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ آنحضرت ﷺ اس جگہ گئے جہاں خدا موجود نہیں تھا، اور آپ نے وہاں کسی سے بھی ملاقات نہیں کی، کیا تم معراج نبوی کا انکار کرتے ہو؟ پھر انہوں نے امیر افرم کی طرف خطاب کر کے کہا کہ تمہارے پروردگار کا کلام نزول وصعود اور رفع وفوق کی آیتوں سے بھرا پڑا ہے، انہوں نے اس سلسلے میں بہت سی آیتیں پڑھ کر سنائیں، پھر کہا اگر اگلی آسمانی کتابوں اور آنحضرت ﷺ کی حدیثوں کو نظر انداز کر بھی دیا جائے تو صرف کتاب اللہ میں تین سو سے زیادہ ایسی آیتیں آئی ہیں جن سے خدا کا آسمان میں ہونا ثابت ہوتا ہے، تو کیا اس کا انکار خدا کی آیتوں کا انکار نہیں ہے؟

کلام اور حروف وصوت پر بحث

جب کلام اور حروف وصوت کے مسئلہ پر بحث شروع ہوئی تو امام ابن تیمیہ نے کہا کہ

کتاب اور سنت میں بہت سی آیتیں اور حدیثیں ایسی ہیں جن سے خدا کا بات کرنا ثابت ہوتا ہے اور یہ کہ اس کی آواز بھی ہے۔ جیسے:

﴿ وَ اِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰۤی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۙ﴾ [1]

''اور جب کہ تیرے پروردگار نے موسیٰ علیہ السلام کو پکارا کہ ظالم قوم کے پاس جا۔''

﴿ وَ نَادَیْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا ﴾ [2]

''اور ہم نے طور پر ایمن کی جانب سے اس کو پکارا اور ہم نے سرگوشی کے لیے اس کو اپنے نزدیک کیا۔''

﴿ وَ یَوْمَ یُنَادِیْهِمْ فَیَقُوْلُ اَیْنَ شُرَكَآءِیَ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴾ [3]

''اور اس دن جبکہ وہ (خدا) ان کو پکارے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں وہ لوگ جن کو تم میرے شریک سمجھتے تھے۔''

ظاہر ہے کہ ندا آواز کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

صحیح حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، آپ نے فرمایا: ''جب خدا وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے تو آسمان والے اس کی آواز کو اس طرح سنتے ہیں جیسے کوئی شخص ایک پتھر کی چٹان پر زنجیر ہلا رہا ہو۔'' [4] دوسری روایت میں ہے آپ فرماتے ہیں: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو پکارے گا، حضرت آدم علیہ السلام جواب دیں گے لبیک و سعدیک یا رب! اے پروردگار! میں حاضر ہوں، میں خوش بخت ہوں۔ خدا بلند آواز سے پکارے گا: اے آدم! خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ دوزخیوں میں سے جسے چاہے نکال لو۔'' [5] ایک صحیح روایت میں ہے کہ خدا قیامت کے دن بلند آواز سے پکارے گا، جس کو دُور رہنے والے بھی اسی طرح سنیں گے جس طرح نزدیک رہنے والے سنیں گے، خدا فرمائے گا، میں ہوں جزا دینے والا بادشاہ، کہاں ہیں اب زمین کے بادشاہ؟ [6] امام بخاری فرماتے ہیں کہ

---

[1] ٢٦/الشعراء:١٠_ [2] ١٩/مریم:٥٢_ [3] ٢٨/القصص:٦٢_ [4] سنن ابی داود، کتاب السنة، باب فی القرآن، ح: ٤٧٣٨_ [5] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قصة یاجوج و مأجوج، ح: ٣٣٤٨، مسلم: ٢٢٢ (٥٣٢)_

[6] الاسماء والصفات للبیهقی، ح: ٦٠٠؛ صحیح بخاری معلقًا قبل الرقم: ٧٤٨١_

ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا کی بھی آواز ہے لیکن وہ مخلوق کی آواز سے مشابہ نہیں ہوتی۔

کسی معارض نے کہا، ان آیتوں اور حدیثوں کا مطلب یہ ہے کہ خدا ندا کرنے والے کو حکم دے گا اور وہ اس حکم کے مطابق دوسروں کو ندا کرے گا اور ندا کے وہ تمام الفاظ جو کتاب و سنت میں آئے ہیں، منادی کی زبان سے ادا کیے گئے ہیں، امام ابن تیمیہ نے فوراً جواب دیا کہ اس صورت میں لبیک وسعد یک یارب کا جواب بھی ندا کرنے والے کے لیے ہوگا نہ کہ اللہ کے لیے۔ اس طرح کا جواب تو کفر ہو جائے گا۔ اگر بالفرض اس کو مان لیا جائے تو ان آیتوں کا کیا مطلب ہوگا، جس میں ندا کرنے والا خود کو پروردگار اور اللہ بتاتا ہے جیسے:

﴿ فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ؕ﴿۱۱﴾ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ؕ﴿۱۲﴾ وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿۱۳﴾ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾ ﴾ [1]

”جب وہ (موسیٰ) اس (درخت) کے پاس آیا تو ندا کی گئی: اے موسیٰ! بے شک میں تیرا پروردگار ہوں تو اپنے جوتوں کو نکال ڈال، بے شک تو مقدس وادیٔ طویٰ میں ہے اور میں نے تجھے چن لیا ہے، پس تو اس کو سن جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے، بے شک میں ہی ہوں اللہ، نہیں ہے کوئی معبود سوائے میرے پس تو میری عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز کو قائم کر۔“

اس آیت میں اگر ندا کرنے والا خدا کے سوا کوئی اور شخص ہو تو ندا کرنے والا اور اس کی ندا کو قبول کرنے والا دونوں کافر ٹھہریں گے، اگر درحقیقت ندا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی اور ہوتا تو ندا کے اندر تمیز کر دی جاتی جس طرح ایک حدیث میں اللہ اور جبریل علیہ السلام کی ندا میں تمیز کر دی گئی ہے، صحیح حدیث میں ہے کہ جب اللہ کسی بندے کو چاہتا ہے تو جبریل کو آواز دیتا ہے، اے جبرئیل میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں، تم بھی محبت کرو، جبریل اُس سے محبت کریں گے، اور پھر آسمان والوں کو آواز دیں گے، اور کہیں گے کہ خدا فلاں سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، بعض کی روایات میں بھی اسی طرح اللہ اور جبرائیل کی نداؤں میں تمیز

---

[1] ۲۰/طٰہٰ:۱۱، ۱۴۔

کردی گئی ہے۔

روزمرہ کے استعمال میں بھی یہ ہوتا ہے کہ اگر منادی کسی دوسرے شخص کی طرف سے کوئی حکم سناتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ فلاں نے یہ حکم دیا ہے یا فلاں نے اس سے منع کیا ہے۔ اگر کسی امیر کا کوئی قاصد امیر کے حکم کو اپنی طرف منسوب کر کے حکم سنائے تو لوگ اس کی توہین کرنے پر آمادہ ہو جائیں، اگر اللہ کسی ندا کرنے والے کو حکم دیتا تو اس کو یوں کہنا چاہیے تھا: من یتوب الی اللہ فیتوب علیہ من یستغفر فیغفر لہ (کون ہے جو اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے تاکہ وہ بھی اس کی توبہ قبول کرے اور کون ہے جو اس سے بخشش چاہتا ہے تاکہ وہ اس کی مغفرت کرے) اور جب ندا کرنے والا خود یہ کہتا ہے: ھل من تائب فاتوب علیہ ھل من مستغفر فاغفر لہ ھل من سائل فاعطیہ (کون ہے جو میری طرف رجوع کرتا ہے تاکہ میں اس کی توبہ قبول کروں، کون ہے جو میری بخشش چاہتا ہے تاکہ میں اس کو بخشوں، کون ہے جو مجھ سے کچھ مانگتا ہے تاکہ میں اس کو دوں) تو اس سے معلوم ہوا کہ ندا کرنے والا خود اللہ ہی ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا اگر کوئی دوسرا ہوتو اس طرح کہنے والا خود ہی کافر ہو جائے گا، جیسے کہ فرعون اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں ہوں تمہارا بڑا پروردگار) کہہ کر کافر ہوا۔

اس کے بعد امام ابن تیمیہ نے معارض کی طرف خطاب کر کے کہا، ذرا یہ تو بتاؤ کہ سورتوں کی ابتداء میں جو حروف آئے ہیں جیسے: الم۔ الٓر۔ طٰہٰ۔ طسم۔ حم۔ حٰمٓ عٓسٓقٓ وغیرہ، ان کا بولنے والا کون ہے؟ کیا یہ کسی غیر اللہ کے کہے ہوئے ہیں، اگر یہ کسی غیر اللہ کے کہے ہوئے ہیں تو کون شخص ان کے معنوں سے واقف ہے، آیا یہ حروف خود بخود ظہور میں آئے یا اللہ نے اُن کو ہوا میں پیدا کیا، جیسا کہ جہمیہ کا خیال ہے، کیا کسی کی عقل سلیم یہ تصور کر سکتی ہے کہ کوئی ذات زندہ ہے، عالم ہے، قادر ہے، اور وہ کلام کرتی ہے اور اس کا کلام حروف اور آواز کے بغیر سنائی دیتا ہے، ایسا ہونا محال ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ جو شخص قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے اور اس کو اعراب کے ساتھ پڑھتا ہے تو اس کے ہر ایک حرف کے بدلے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف

ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔

قاضی مالکی کی تنقیص اور امام ابن تیمیہ کی برہمی

امام ابن تیمیہ نے اتنا کہا تھا کہ مالکیوں کے قاضی شیخ جمال الدین ابوعبداللہ محمد بن سلیمان بن یوسف الزواوی مالکی (المتوفی: ۷۱۷ھ) نے جھنجھلا کر کہا کہ ان میں تمہارے دعوے کے ثبوت پر کوئی دلیل نہیں ہے، تم نے سوائے اس کے کہ چند آیتوں اور حدیثوں کو ادھر اُدھر سے جمع کر کے اس کو نجات پانے والی جماعت کا عقیدہ نام رکھ لیا ہے اور کچھ نہیں کیا ہے، امام ابن تیمیہ نے بہت ہی تیز وتند ہو کر کہا کہ ہم نے جو جمع کیا ہے یا جو کہا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کا فرمایا ہوا ہے، جس کا ماننا دنیا کے تمام لوگوں پر واجب ہے، ہم وہی کہتے ہیں جو اللہ کہتا ہے اور انہی باتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں جو اس کے رسول کی بتائی ہوئی ہیں، کیونکہ وہی صادق اور مصدوق ہیں، انہی نے ہم تک خدا کا پیغام پہنچایا ہے، وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے، بلکہ وہ وہی باتیں سناتے ہیں جن کے سنانے کا انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا ہے، وہ مخلوق میں سب سے بڑے عالم، سب سے بڑے ناصح، سب سے بڑے عارف اور سب سے بڑے فصیح وبلیغ ہیں، آپ نے ہم تک اپنی رسالت پہنچائی ہے اور خدا کی امانت ہمارے سپرد کی ہے، اور ہمیں ہر قسم کی گمراہیوں سے ڈرایا ہے، اور ہمیں ہر طرح کی نصیحت کی ہے، اور ہمارے لیے ایک ایسی پاکیزہ اور روشن شریعت چھوڑی ہے، جس کی رات اس کے دن کے مانند ہے، اسی سے وہی شخص منہ موڑے گا، جو ہلاک ہونا چاہتا ہے اور جہالت وگمراہی کا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے، رسول کا کام صرف رسالت کا پہنچا دینا ہے اور بس پس جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کرے۔

ایسا ہوتے ہوئے اگر میں اس روشن شریعت سے اپنے اعتقادات کو جمع نہ کروں اور ان پر ایمان نہ لاؤں تو کیا میں تمہارے شیخ محمد بن تومرت بربری کے عقیدے پر ایمان لاؤں، جس نے اپنے رسالے کا نام مرشدہ (ہدایت دینے والا) رکھا تھا، حالانکہ وہ حقیقت میں مضلہ (گمراہ کرنے والا) تھا۔ یہ وہی جھوٹا شخص تھا جس نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا، اور لوگوں کو اس کے اس دعوے کو ماننے پر مجبور کیا تھا، وہ اپنی سچائی کے ثبوت کے لیے طرح طرح کی شعبدہ

بازیاں کرتا تھا، کبھی تو وہ آدمیوں کو قبر میں اتار دیتا تھا، اور لوگوں سے کہتا تھا، دیکھو مردے ہم سے باتیں کرتے ہیں اور پکارتا تھا اے قبر والو! بتاؤ میں کون ہوں؟ ادھر سے جواب آتا تھا، تم وہ امام معصوم ہو جو کبھی غلطی نہیں کرتے اور نہ کوئی بات جھوٹ بولتے ہو، اور نہ کبھی بھولتے ہو، تم وہ مہدی ہو جس کے ظہور کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی ہے، پھر اس کے حکم سے قبریں ڈھادی جاتی تھیں تاکہ اس کا راز فاش نہ ہو جائے، اسی طرح وہ (یعنی محمد بن تومرت) چند آدمیوں کو کنوؤں میں اتار دیتا تھا اور لوگوں سے کہتا تھا کہ فرشتے ہم سے باتیں کرتے ہیں، چنانچہ وہ کنویں کے منہ پر کھڑے ہو کر اُن کو پکارتا تھا اور اندر سے اس کا جواب آتا تھا، پھر یہ کہہ کر ان کنوؤں کو ڈھادیتا تھا کہ ان کنوؤں میں فرشتے رہتے ہیں اگر غلطی سے کوئی ان میں پیشاب کر دے تو فرشتوں کی بے حرمتی ہوگی۔

پھر امام ابن تیمیہ نے کہا کہ محمد بن تومرت نے اپنے پیروؤں کو لے کر مغرب پر چڑھائی کی اور لاکھوں آدمیوں کا خون بہایا اور عبدالمومن بن علی کو تختِ سلطنت پر بٹھایا، اور پھر تمام لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ مؤطا کی کتاب باقاعدہ پڑھتے رہا کریں، اس نے اپنے پیروؤں کا نام مرابطین رکھا اور ان کے لیے ایک دن مقرر کیا جو ''یوم فرقان'' کہلاتا تھا، اس دن یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جنت اور دوزخ والوں کے درمیان تفریق ہوتی ہے وہ لوگوں کے سامنے اپنا رسالہ ''مرشدہ'' پڑھ کر سنایا کرتا تھا، جس میں نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام کا ذکر ہے اور نہ جنت و دوزخ اور ثواب وعقاب کا، اس میں خدا کی صفات کا کوئی ذکر نہیں تھا اور نہ اُس اسماء حسنیٰ کا جن کا کتاب وسنت میں بیان موجود ہے، اور جو عقل ونقل دونوں سے ثابت ہیں، بلکہ اس رسالے میں صفات باری کا سلب محض تھا، جس کی تائید نہ تو قرآن سے اور نہ سنت سے ہوتی ہے، اور نہ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ اس پر دلالت کرتے ہیں، اس قسم کا عقیدہ صرف گمراہ اور غالی جہمیوں ہی کا ہو سکتا ہے جو یہ کہتے ہیں خدا کے متعلق یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ کہاں ہے اوپر ہے یا نیچے، دائیں ہے یا بائیں، کل ہے یا بعض، جب بہت سے علمائے کتاب وسنت نے اس کے اس عقیدے کو ماننے سے انکار کر دیا تو محمد بن تومرت نے اُن کو قتل کرا دیا۔ یہ ایسی مشہور باتیں ہیں جن کو مغرب کا ایک ایک بچہ جانتا ہے، اس پر بھی وہ اپنے پیروؤں کو موحدین

کا لقب دیتا ہے، پس جو کچھ میں کہتا ہوں وہ محمد بن عبداللہ عربی فداہ ابی واُمی کی توحید ہے اور تم جس عقیدے کی حمایت کرتے ہو وہ محمد بن تومرت بربری کا عقیدہ ہے۔

مجلس کو برخاست کر دینا

امام ابن تیمیہ کے اس تیز وتند جواب اور محمد بن تومرت پر کڑی تنقید کی وجہ سے مالکیوں میں سخت برہمی پیدا ہوگئی، اور وہ مجلس میں شور اور ہنگامہ برپا کرنے لگے، جس کی وجہ سے تلخی کے بڑھنے اور فتنہ وفساد کا اندیشہ ہوگیا تھا، اس لیے نائب السلطنت ملک شام امیر جمال الدین آقوش الافرم نے مجلس ہی کو برخاست کر دیا، لیکن یہ حقیقت سب پر ظاہر ہوگئی کہ امام ابن تیمیہ جو کہتے ہیں وہی صحیح ہے، مخالفین بھی اپنے دلوں میں امام ابن تیمیہ کے زوردار دلائل کی قوت کو محسوس کر رہے تھے، مگر زبان سے اس کا اعتراف نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ اس میں ان کی رُسوائی ہوتی تھی۔

سُبکی کا بیان

شیخ تاج الدین سبکی نے اپنی کتاب طبقات الشافعیہ جلد پنجم ص ۲۴۰ پر لکھا ہے کہ جب مسئلہ حمویہ کے بارے میں دارالسعادہ دمشق میں امیر تنکز [1] کے سامنے ایک مجلس منعقد ہوئی اور تمام علما بلائے گئے تو سب کی رائے یہ قرار پائی کہ امام ابن تیمیہ سے بحث کرنے کے لیے شیخ صفی الدین ہندی بلائے جائیں، چنانچہ وہ تشریف لائے، شیخ ہندی لمبی تقریر کرنے کے عادی تھے، اور جب وہ کسی مسئلے پر گفتگو کرنے لگتے تھے تو اس کے ہر ایک پہلو پر اس شرح و بسط کے ساتھ بحث کرتے تھے کہ کسی معترض کو کوئی شبہ یا اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا، جب شیخ صفی الدین تقریر کرنے لگے تو امام ابن تیمیہ اپنی حدت طبع کی بنا پر بار بار ان سے

---

[1] سبکی نے اس دوسری مجلس کے سلسلے میں امیر تنکز کا نام لیا ہے، حالانکہ اس وقت ملک شام کا نائب السلطنت امیر جمال الدین آقوش الافرم تھا، اسی کے سامنے یہ تفصیلی بحث ہوئی تھی، امیر تنکز ربیع الآخر ۷۱۲ھ میں ملک شام کا نائب السلطنت ہو کر دمشق آیا تھا، اور عقیدے کے متعلق بحث مباحثہ کا یہ واقعہ ۷۰۵ھ کا ہے، یہ ممکن ہے کہ امیر تنکز اور امراء کے ساتھ بحیثیت سامع کے نہ کہ بحیثیت حاکم شریک ہوا ہو، اور چونکہ امیر تنکز شیخ صفی الدین ہندی کا بڑا احترام کرتا تھا اور ان کا بڑا معتقد تھا، اس لیے سبکی نے امیر افرم کا نام لینے کی بجائے امیر تنکز کا نام لیا ہو۔
(الدرر الكامنة: ١/ ٥٢، البداية والنهاية: ١٤/ ٥٦)

الجھنے لگے اور جب شیخ صفی الدین ان کی کسی ایک بات پر گرفت کرتے تو وہ فوراً دوسری بات کو معرض بحث میں لے لیتے تھے، اسی لیے شیخ صفی الدین ہندی نے کہا:

مَا اَرَاكَ يَا ابْنَ تَيْمِيَّةَ اِلَّا كَالْعُصْفُوْرِ حَيْثُ اَرَدْتُ أَنْ أَقْبَضَهٗ مِنْ مَكَانٍ يَفِرُّ اِلٰى مَكَانٍ اٰخَرَ [1]

اے ابن تیمیہ! تم تو ایک چڑیا کی مانند ہو جب اس کو کسی جگہ پر پکڑنا چاہوں تو وہ دوسری جگہ اُڑ کر چلی جاتی ہے۔

شیخ صفی الدین کی ناکامی

تذکروں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ صفی الدین منطقیانہ بحث تو کر سکتے تھے، مگر وہ امام ابن تیمیہ کی لاتعداد اور بے پناہ آیتوں اور حدیثوں کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے اس لیے مخالفین نے شیخ صفی الدین ہندی کو چھوڑ کر شیخ کمال الدین ابن الزملکانی کو افسر مناظرہ مقرر کیا۔ مگر وہ بھی ان کا کامیاب مقابلہ نہیں کر سکے، اور آخر سخت کلامی کی وجہ سے یہ مجلس برخاست کر دی گئی۔

چنانچہ ابن کثیر نے اپنی البدایہ والنہایہ (جلد ۱۴، صفحہ ۳۷) میں لکھا ہے کہ جب تمام لوگ ۱۲ رجب ۷۰۵ھ کو جمعہ کی نماز کے بعد جمع ہوئے اور شیخ صفی الدین ہندی بھی تشریف لائے اور انہوں نے امام ابن تیمیہ سے بڑی بحثیں کیں، لیکن ان کا پرنالۂ علم امام ابن تیمیہ کے ذخار بحر العلوم کی زبردست موجوں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اس لیے شیخ کمال الدین ابن الزملکانی کو ان سے مناظرہ کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ چنانچہ ان دونوں نے ایک دوسرے سے مناظرہ کیا، لوگوں نے شیخ کمال الدین ابن الزملکانی کے فضائل جودتِ ذہن اور حسن بحث کی بڑی قدر کی اور ابن تیمیہ جیسے علم کے بحر ذخار سے مقابلہ اور بحث کرنے پر ان کو بڑی داد دی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے الدرر الکامنہ جلد اول، ص: ۱۴۵ پر لکھا ہے کہ ۱۲ رجب ۷۰۵ھ کو تمام علما جمع ہوئے اور شیخ صفی الدین ہندی کو امام ابن تیمیہ سے مناظرہ کرنے کے

---

[1] طبقات الشافعية: ٥/ ٢٤٠۔

لیے مقرر کیا گیا اور جب ان کے مقابلے میں چل نہیں سکے تو مخالفین نے شیخ کمال الدین ابن الزملکانی کو افسر مناظرہ مقرر کیا۔

عقائد کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا

حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ پھر اس معاملے کا یوں فیصلہ ہوا کہ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ نے اعتقاد کے لحاظ سے شافعی ہونے کا اعتراف کر لیا، مگر ابن تیمیہ کے پیرؤوں نے یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ اس مناظرے میں انہی کی جیت رہی اور جب مخالفین کو معلوم ہوا تو وہ غصے میں آ گئے اور ابن تیمیہ کے پیرؤوں میں سے بعض کو گرفتار کر کے شافعی نائب الحکم قاضی جلال الدین قزوینی کے پاس مدرسۂ عادلیہ لے گئے، جنہوں نے ان کو سزا دی۔

اس روایت کے برخلاف ابن کثیر کا یہ بیان ہے:

ثم انفصل الحال علی قبول العقیدة و عاد الشیخ الی منزله معظما و مکرما و بلغنی ان العامة حملوا له الشمع من باب النصر الی القصاعین علی جاری عادتهم فی امثال هذه الاشیاء۔[1]

پھر یہ معاملہ عقیدے کے قبول کر لینے پر ختم ہوا، اور شیخ (امام ابن تیمیہ) پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے گھر لوٹے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ عام لوگ باب النصر سے قصاعین کے محلے تک اپنی اس عادت کے مطابق جو اس جیسے موقعوں پر ظاہر ہوتی ہے ان کے سامنے شمعیں لے کر چلے۔

یعنی اس زمانہ کا یہ دستور تھا کہ جب کبھی کوئی اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر آتا تو لوگ اس کے سامنے شمعیں لے کر چلتے تھے اور اس کو اس کے گھر چھوڑ آتے تھے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے حریف اس دوسری مجلس میں لا جواب ہو چکے تھے۔

---

[1] البدایة والنهایة: ١٤/ ٣٧۔

حریفوں کی شورش

امام ابن تیمیہ کے حریف اپنی جگہ خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے۔انہوں نے عوام میں یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ اس مناظرے میں ان کے حریفوں ہی کی جیت رہی اور امام ابن تیمیہ سے ان کے سوالات کا کوئی جواب نہ ہوسکا۔اس کا لازمی ردعمل یہ تھا کہ امام معصوف کے پیرو بھی حریفوں کی غلط بیانیوں کی تردید کرنے لگے۔اس کی وجہ سے دونوں جماعتوں میں بحث وتکرار اور پھر ہاتھا پائی کی نوبت پہنچ گئی۔حریفوں کی جماعت میں شیخ صدرالدین ابن الوکیل اور ان کے پیرو پیش پیش تھے۔شیخ صدرالدین موصوف نے قاضی القضاۃ شیخ نجم الدین ابن صصری شافعی سے کہہ کر امام ابن تیمیہ کے بعض پرجوش ساتھیوں کو پکڑا منگوایا اور ان کو پٹوا دیا اور بعض دوسرے حامیوں کو اور قسم کی سزائیں دیں۔اس کی وجہ سے سارے شہر میں ایک بے اطمینانی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔نائب السلطنت دمشق امیر شمس الدین افرم بھی موجود نہیں تھا وہ شکار کے لیے باہر گیا تھا اگر وہ موجود ہوتا تو اس قسم کے شر اور فتنے کا فوری تدارک ہوسکتا تھا۔

شیخ جمال الدین المزی کو زبردستی حوالات سے نکالنا

اس درمیان میں ایک دوسرا واقعہ پیش آیا شیخ جمال الدین یوسف المزی [1] الشافعی نے جامع اموی کے قبۂ نسر کے نیچے ۲۲ رجب ۷۰۵ھ کو پیر کے دن صحیح بخاری سنائی اور الرد علی الجہمیہ اور خلق افعال العباد کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔اس میں ایسی حدیثیں تھیں جن سے امام ابن تیمیہ کے عقائد وخیالات کی تائید ہوتی تھی، اس مجلس میں بعض شافعی علما بھی موجود تھے، جو عقائد میں امام موصوف کے خیالات کے سخت مخالف تھے۔ان کو گمان ہوا کہ شیخ مزی نے قصداً یہ حصہ پڑھ کر سنایا ہے تاکہ امام موصوف کے حریفوں کے دل کو ٹھیس لگے۔ان لوگوں نے قاضی القضاۃ شیخ نجم الدین ابن صصری سے جا کر شکایت کی اور انہوں نے شیخ مزی کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔

---

[1] شیخ موصوف مزہ کے رہنے والے تھے جو دمشق کے جنوب مغرب میں تقریباً تین سو کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا قریہ ہے۔دمشق کا شہر ترقی کر کے مزہ تک پہنچ چکا ہے۔شہر کی بسیں وہاں تک جاتی ہیں۔خاکسار ۸ فروری ۱۹۵۸ء کو وہاں سے ہو کر آیا ہے۔

شیخ موصوف امام ابن تیمیہ کے ساتھیوں میں سے تھے اور بڑے ہمدرد حامی تھے۔

جب امام موصوف کو یہ کیفیت ملی تو وہ بہت برافروختہ ہوئے اور قید خانے جا کر زبردستی شیخ موصوف کو حوالات سے نکالا اور ان کو ساتھ لے کر شاہی محل پہنچے۔ وہاں ملک الامرا کے سامنے قاضی القضاۃ شیخ نجم الدین سے مٹھ بھیڑ ہوگئی امام موصوف نے شیخ مزی کی علمی برتری کی تعریف کی اور قاضی موصوف کی جہالت بتائی۔ اس کی وجہ سے دونوں کے درمیان تیز اور تند گفتگو ہونے لگی۔ اور آخر قاضی موصوف کو غصہ آ گیا اور ملک الامراء سے صاف کہہ دیا کہ اگر شیخ مزی کو اسی وقت حوالات میں لوٹایا نہیں جاتا تو وہ اپنے عہدہ قضاوت سے دستبردار ہوتے ہیں۔ قاضی موصوف کو مصر کے قاضی القضاۃ قاضی زین الدین بن مخلوف مالکی شیخ نصر بن سلیمان المنجی اور نائب سلطنت مصر امیر بیبرس جاشنگیر کی تائید حاصل تھی۔ اس لیے ملک الامراء کو خوف پیدا ہوگیا کہ اگر وہ اس وقت قاضی القضاۃ کی بات پر عمل نہیں کرتا تو بہت ممکن ہے کہ اس کی معزولی کا فرمان صادر ہو جائے اور اس کو اس کے عہدے سے الگ کر دیا جائے۔ اس نے قاضی موصوف کو راضی رکھنے کی غرض سے شیخ مزی کو دوبارہ حوالات میں بھیج دیا اور امام موصوف خفا ہو کر اپنے گھر چلے گئے۔

جب نائب السلطنت دمشق امیر افرم شکار سے واپس آیا تو امام موصوف نے اس سے شکایت کی اور سارا واقعہ بیان کیا۔ وہ بھی کچھ مجبور سا تھا۔ تاہم اس نے شیخ مزی کو رہا کر دیا اور اس کے ساتھ ہی شہر بھر میں اس کی منادی کرا دی کہ جو کوئی بھی عقائد کے متعلق گفتگو کرتا ہوا پایا جائے گا اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ اس کی دوکان لوٹ لی جائے گی اور اس کے گھر کا سارا مال و اسباب ضبط کر لیا جائے گا اور اس کا مال اور خون حلال کر دیا جائے گا۔ اتنا سخت اعلان محض اس غرض سے کرایا گیا تھا کہ شر اور فتنہ ختم ہو جائے اور آیندہ کسی قسم کا فساد رونما نہ ہو۔

تیسری مجلس

عقائد کے تصفیے کے متعلق یہ تیسری مجلس ۷ شعبان المعظم ۷۰۵ھ کو منگل کے دن دار السعادہ دمشق میں منعقد ہوئی۔ شیخ صدر الدین ابن الوکیل، شیخ کمال الدین ابن الزملکانی

اور قاضی القضاۃ شیخ نجم الدین ابن صصری شافعی کے علاوہ اور بہت سے علما وفقہا بھی شریک ہوئے۔ عقائد کے متعلق بحث شروع ہوئی۔ امام ابن تیمیہ نے امام ابوالحسن الاشعری کی کتاب مقالات الاسلامیین اور کتاب الابانہ اور حافظ ابن عساکر دمشقی کی کتاب تبیین کذب المفتری فیما نسب الی ابی الحسن الاشعری کے حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ تمام ائمہ کرام حتی کہ امام شافعی رحمہ اللہ بھی صفات باری کے قائل تھے اور ان میں ہرگز تاویل نہیں کرتے تھے۔ امام ابو الحسن الاشعری سے تاویل کے متعلق جو دو قول نقل کیے جاتے ہیں وہ غلط ہیں تاویل کا قول بعد میں ان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ تاویل کے قائل نہیں تھے۔ تاویل قرون ثلاثہ کے بعد کی چیز ہے۔ قرون ثلاثہ میں ائمہ کرام ہرگز تاویل کے قائل نہیں تھے۔ امام موصوف نے یہ بھی بتایا کہ شیخ ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری (المتوفی: ۴۶۵ھ) کے زمانہ تک عقائد وخیالات کے لحاظ سے اشاعرہ اور حنابلہ کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا۔ ابوالقاسم القشیری کے زمانے میں بغداد میں عقائد کا فتنہ کھڑا ہوا جس کے بعد ان دونوں فرقوں کے درمیان اختلاف بڑھتے چلے گئے۔ امام موصوف کا دعویٰ یہ تھا کہ عدم تاویل تمام ائمہ اربعہ کا مسلک رہا ہے۔ اس میں امام احمد بن حنبل کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اگر وہ یہ کہتے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں حنابلہ کا مسلک ہے تو پھر اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں تھی۔ حریف ان کے اس دعوے کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ یہ سلف کا مسلک ہے۔ امام موصوف نے حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی علما وفقہاء اور نیز محدثین ومتکلمین وصوفیہ کی تقریباً پچاس کتابیں فراہم کر رکھی تھیں۔ [1] جو ان کے اس دعوے پر دلیل بنتی تھیں۔ انہوں نے تمام حریفوں کو چیلنج دے دیا تھا کہ وہ سب کو تین سال کی مہلت دیتے ہیں۔ اس مدت میں اگر کوئی قرون ثلاثہ سے تاویل کا ثبوت پیش کر دے تو وہ اپنے عقائد سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہیں حریفوں کے پاس متاخرین کی کتابوں اور ان کے دلائل کے سوا کوئی ایسی معتبر شہادت نہیں تھی جس سے وہ امام موصوف کے دلائل کی تردید کر سکیں، وہ ان کے مقابلے میں قرآن وحدیث اور آثار سلف کے صریح اور واضح نصوص بھی پیش نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کسی کو ان سے کھل

---

[1] مجموع الدرر، صفحہ ۳۸۲۔

کر مناظرہ کرنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ اور جب قرآن مجید کے متعلق بحث ہونے لگی تو امامؒ موصوف نے کہا کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اس کے متعلق یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ وہ محض اللہ کے کلام کی تعبیر ہے۔ یعنی یہ کہ وہ کلام نفسی ہے کلام لفظی نہیں ہے۔ اگر لوگ اس کو پڑھتے ہیں تو وہ بھی اللہ ہی کا کلام ہے اور اس کو مصاحف میں لکھتے ہیں تو وہ بھی اللہ ہی کا کلام ہے۔ کیونکہ کلام اسی کا ہوتا ہے جس نے اس کو سب سے پہلے کہا۔ اس کا نہیں ہوتا جس نے اس کو دوسروں تک پہنچایا۔

امام موصوف کا اصرار تھا کہ یہی عقیدہ امام شافعی رحمۃ اللہ کا ہے اور امام ابوالحسن الاشعری نے بھی یہ بات لکھی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک رسالے میں جو کتاب مجموع الرسائل والمسائل کے تیسرے جز کی حیثیت سے چھپا ہے۔ اس مسئلے پر مختلف صورتوں سے بحث کی ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ شیخ امام ابوالحسن محمد بن عبدالملک الکرخی کی کتاب الفصول فی الاصول کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شیخ ابوالحسن الکرخی موصوف کہتے ہیں میں نے امام ابومنصور محمد بن احمد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ شیخ ابوحامد الاسفرائینی نے فرمایا: میرا مذہب اور امام شافعی اور تمام شہروں کے فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے۔ جو بھی اس کو مخلوق کہے گا وہ کافر ہے۔ قرآن اللہ کا وہ کلام ہے جس کو جبرئیل اللہ سے سن کر نبی کریم ﷺ تک لے آئے۔ اس طرح نبی کریم ﷺ نے جبرئیل سے اور صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے سنا اور وہ وہی ہے جس کی ہم اپنی زبانوں سے تلاوت کرتے ہیں اور جو دونوں دفیتوں کے درمیان موجود ہے اور جو ہمارے سینوں میں ہے اسی کو ہم سنتے ہیں، لکھتے ہیں اور یاد کرتے ہیں۔ اس کا ہر ایک حرف جیسے باء و تاء وغیرہ ہے اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے اور جو بھی اس کو مخلوق کہتا ہے وہ کافر ہے اس پر اللہ، فرشتے اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔''

جب امام موصوف نے اس قسم کے حوالے پیش کرنے شروع کیے تو شیخ صدرالدین ابن الوکیل نے بھی اعتراف کرلیا کہ امام شافعی کا بھی یہی عقیدہ تھا، عقائد کی پہلی یا دوسری مجلس میں امام ابن تیمیہ نے شیخ ابوالبیان کا عقیدہ پیش کیا تھا اس میں ایک جگہ یہ لکھا تھا کہ جو بھی قرآن

مجید کے کسی ایک حرف کو مخلوق کہتا ہے وہ کافر ہے اس کے حاشیہ پر خود شیخ صدر الدین ابن الوکیل نے یہ نوٹ لکھا تھا کہ یہی امام شافعی اور ان کے ساتھیوں کا مذہب ہے اور میں بھی یہی عقیدہ رکھتا ہوں۔ امام موصوف نے جب انہیں یہ دکھایا تو کہا کہ ہاں یہی امام شافعی کا مذہب ہے۔ شیخ کمال الدین نے اس سے انکار کیا اور دونوں کے درمیان تھوڑی دیر تک ردوکد ہوتی رہی۔ صدر الدین ابن الوکیل نے ابن ایاس شافعی کی کتاب الانتصار کا بھی حوالہ پیش کیا۔ شیخ کمال الدین ابن الزملکانی اس کو اس لیے ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ اس کو مان لیں تو پھر امام الحرمین ابوالمعالی الجوینی جیسے ان تمام علما شافعیہ کو کافر قرار دینا پڑے گا جو قرآن مجید کو کلام نفسی قرار دے رہے تھے۔ اس بحث میں شیخ صدر الدین ابن الوکیل کا عجیب رویہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک طرف امام موصوف کی پیش کی ہوئی سندوں کو مان چکے تھے کہ جو بھی کلام الٰہی کو کلامِ نفسی قرار دیتا ہے وہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک کافر ہے۔ مگر دوسری طرف ان علمائے شافعیہ کو جو کلامِ نفسی کے قائل تھے کافر کہنے پر آمادہ نہیں تھے۔ جب تیسری مجلس میں بحث طویل ہونے لگی اور شیخ صدر الدین پر ہر طرف سے گرفت ہونے لگی تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں نے ایسا نہیں کہا اور ایسا نہیں کہا۔ بعض لوگ شیخ صدر الدین کے خلاف ہو گئے اور شہادت دی کہ تم نے ایسا کہا تھا اور یہ بھی کہا کہ تم کو ایک بات کہہ کر پھر اس سے مکرنا نہیں چاہیے اور دوسروں نے شیخ صدر الدین کی تائید کرنی شروع کی اور جب ان پر گرفت ہوئی تو کہہ دیا کہ ہم نے نہیں سنا۔ نائب دمشق امیر افرم نے کہا کہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک تصدیق کرتا ہے اور دوسرا جھٹلاتا ہے۔ جب شیخ صدر الدین نے اس طرح مکرنا شروع کیا تو شیخ کمال الدین ابن الزملکانی کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے شیخ صدر الدین ابن الوکیل کے خلاف شیخ نجم الدین ابن صصری سے تائید لینی چاہیے کیونکہ وہ دمشق میں شافعیوں کے قاضی القضاۃ تھے۔ شیخ موصوف نے کہا میں نے کچھ نہیں سنا۔ اس کی وجہ سے شیخ کمال الدین اور بھی برافروختہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے دونوں زانوں پر بار بار ہاتھ مار کر کہنا شروع کیا کہ اس مجلس میں شافعیوں پر جو بھی گزر جائے کم ہے۔ افسوس ہے کہ اس بھری مجلس میں امام الحرمین جیسے ہمارے شافعی علما کی تکفیر کی جاتی ہے اور لوگ اس کو خاموشی سے سن رہے ہیں اور

اس کو برداشت بھی کر رہے ہیں۔ ہم اپنی علما کی تکفیر پر ہرگز ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ ان کا اشارہ درحقیقت شیخ نجم الدین ابن صصری کی طرف تھا وہ بھی اس بات پر بگڑ بیٹھے اور اس طرح دونوں کے درمیان سخت کلامی ہونے لگی۔ امام ابن تیمیہ نے شیخ نجم الدین کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے شیخ کمال الدین کی تیز وتند اور تلخ باتوں سے متاثر ہو کر حاضرین کے سامنے اعلان کیا اور کہا سب لوگ گواہ ہیں کہ وہ اپنے عہدۂ قضاوت سے دستبردار ہوتے ہیں۔ [1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تیسری مجلس بھی مشتعل جذبات پر ختم ہوگئی۔ حریفوں نے صاف طور پر کوئی اعتراف نہیں کیا کہ امام ابن تیمیہ کے عقائد صحیح ہیں۔ مگر چونکہ وہ بالکل لاجواب ہو چکے تھے اس لیے انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ صرف شیخ کمال الدین آخر وقت تک مخالف رہے۔ لیکن ان کے پاس بھی امام موصوف کے پرزور دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ہر ایک محسوس کر رہا تھا کہ امام ابن تیمیہ کے عقائد وخیالات کی تردید کرنے کے لیے ان کے حریفوں کے پاس کوئی دلائل نہیں ہیں۔ تمام لوگ امام موصوف کے علم وفضل اور وسعت مطالعہ کی تعریف کرتے ہوئے اپنے گھر لوٹے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود امیر افرم علما مخالفین کی شکست محسوس کر رہا تھا اس نے ایک تفصیلی روداد مرتب کر کے مصر بھیجی۔ اور تمام لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ساری جماعت امام موصوف کے عقیدے پر متفق ہوگئی۔ اس لیے حافظ ابن عبدالہادی اور حافظ ابن کثیر نے لکھ دیا کہ ساری جماعت امام موصوف کے عقیدے پر متفق ہوگئی، چنانچہ ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں:

اجتمع الجماعة على الرضى بالعقيدة المذكورة۔ [2]

ساری جماعت مذکور عقیدے پر راضی اور مجتمع ہوگئی۔

براءت کا اعلان

جب امیر افرم کی بھیجی ہوئی روداد مصر پہنچی تو وہاں سے سلطان ناصر کا خط ۲۶ شعبان

---

[1] اس کی پوری تفصیل امام ابن تیمیہ کے ایک قلمی رسالے "المناظرة فی صفات الباری" میں ہے جس کو میں نے پٹنہ کے پبلک لائبریری کے نسخے سے نقل کیا تھا۔

[2] البداية والنهاية: ١٤/ ٣٧۔

۷۰۵ھ کو اتوار کے دن دمشق پہنچا۔ اس میں صاف لکھا تھا:

انا كنا رسمنا بعقد مجلس للشيخ تقى الدين ابن تيمية وقد بلغنا ما عقد له من المجالس و انه على مذهب السلف و انما اردنا بذلك براءة ساحته ممانسب اليه۔[1]

''ہم نے شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کے لیے مجلس منعقد کرنے کا فرمان جاری کیا تھا اور ہم کو منعقدہ مجالس کی روداد ملی ہے۔ بلاشبہ وہ سلف کے مذہب پر ہیں ان مجلسوں کے انعقاد سے ہم نے صرف ان کی ان چیزوں سے براءت چاہی ہے جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔

شیخ نجم الدین کی بحالی

شیخ زین الدین ابن مخلوف مالکی اور شیخ نصر بن سلیمان المنبجی کی کوششوں سے شیخ نجم الدین کی بحالی کا بھی فرمان صادر ہوا تھا۔ شیخ موصوف دوبارہ قاضی بنا دیئے گئے۔ مگر وہ اس کوشش میں لگے رہے کہ امام ابن تیمیہ کو نیچا دکھانے کی کوئی تدبیر نکل آئے۔

طلبی کا فرمان

براءت کا اعلان امام ابن تیمیہ کے عقائد وخیالات کے صحیح ہونے کا اعلان تھا جس کو ان کے حریف کسی حالت میں بھی تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔ شیخ نصر بن سلیمان المنبجی کو خیال ہوا کہ یہ سب کچھ نائب دمشق امیر افرم کی تائید سے ہو رہا ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کی موافقانہ روداد ہی کی وجہ سے امام موصوف کی براءت کا اعلان ہو گیا ہے۔ اگر ان کو مصر بلا کر ان سے براہ راست ان کے عقائد کا اظہار لیا جائے تو یقیناً ان کو گرفت میں لایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے نائب سلطان مصر امیر بیبرس جاشنگیر کے ذریعہ کوشش کی کہ امام موصوف کو ان کے عقائد کے اظہار کے لیے مصر طلب کیا جائے۔ ان کے متعلق نئے سرے سے الزامات کی ایک فرد بھی تیار کی جس میں ان تمام واقعات کا حوالہ دیا گیا تھا جو ۶۹۸ھ میں نائب دمشق امیر سیف الدین جاغان کی موجودگی میں قاضی امام الدین قزوینی شافعی وغیرہ کے ساتھ پیش آئے تھے۔ عقائد

[1] ایضاً۔

کے متعلق امام موصوف نے امام الدین قزوینی سے بحث کی تھی جس کی روداد اس سے پہلے پیش کی جا چکی ہے۔ سلطان ناصر امام موصوف کا دل سے حامی تھا۔ وہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا مگر جب امیر بیبرس جاشنگیر اور مصر کے بڑے بڑے علما ان کے مصر بلانے پر اصرار کرنے لگے تو مجبوراً اس کو ان کی بات ماننی پڑی۔ چنانچہ اس نے ان کی طلبی کا فرمان صادر کیا جو ۵ رمضان ۷۰۵ھ کو پیر کے دن دمشق پہنچا۔ اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ امام ابن تیمیہ اور شیخ نجم الدین ابن صصری کو سرکاری ڈاک گاڑی میں بٹھا کر مصر روانہ کر دیا جائے۔

خود نائب دمشق امیر افرم نے محسوس کیا کہ اس فرمان کے پیچھے کوئی بڑی سازش کام کر رہی ہے اس نے قاصد سے کہا کہ میرے سامنے سارے علما کی تین مجلسیں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک میں بھی امام موصوف کی بدعقیدگی ثابت نہیں ہو سکی۔ بلکہ تمام علما ان کا جواب دینے سے عاجز ہو چکے۔ ان کی براءت کا اعلان ہونے کے باوجود انہیں دوبارہ مصر کیوں طلب کیا جا رہا ہے؟ پھر اس نے قاصد سے کہا میں خود اس بارے میں سلطان سے خط و کتابت کرنا چاہتا ہوں اور ان معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ قاصد نے اسے مشورہ دیا کہ انہیں مصر بھیجنے سے انکار نہ کیا جائے کیونکہ اس کی وجہ سے سلطان ناصر اور دوسرے اراکین دولت کی بدگمانیاں بڑھ جائیں گی کہ وہ امام موصوف کے ذریعہ عوام کے اندر مقبولیت پیدا کر کے امور سلطنت پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ امیر افرم درحقیقت حریفوں کی نظر میں ایک کانٹا بن کر کھٹک رہا تھا۔ اسی لیے انہوں نے مصر میں اس کے خلاف اس قسم کا گندہ پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ امیر افرم کو اب محسوس ہو رہا تھا کہ یہ بظاہر معمولی معاملہ کتنی خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس نے فوراً امام موصوف کو بلا بھیجا اور ان کے سامنے سلطان کا فرمان پڑھ کر سنایا۔ اور ساتھ ہی اپنا یہ ارادہ بھی ظاہر کیا کہ وہ اس بارے میں سلطان سے مزید خط و کتابت کرنا چاہتا ہے۔ جب تک سلطان کے پاس سے دوسرا اور آخری جواب نہ آ جائے وہ مصر جانے کی کوشش نہ کریں کم از کم سلطان کے دوسرے جواب کا انتظار کریں۔

امام موصوف اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ دمشق میں رہ کر اپنے خیالات کا بخوبی پرچار نہیں کر سکتے اور ان کو ان اصلی حریفوں سے مقابلہ کرنا پڑے گا جو مصر میں بیٹھ کر ان کے خلاف

مختلف قسم کے الزامات لگاتے جا رہے تھے اور انہیں بدنام کر رہے تھے۔ اسی لیے انہوں نے امیر افرم سے صاف طور پر کہا ''مجھے مصر جانے سے ہرگز روکا نہ جائے۔ مجھے جانے دیا جائے۔ مصر جانے میں ایک بہت بڑی مصلحت ہے، اس سے بہت سی دوسری مصلحتیں ظہور میں آئیں گی۔ [1]

جب امام موصوف کے ساتھیوں اور دوستوں کو اس طلبی کی اطلاع ہوئی تو ان میں سے بعض رو پڑے اور کہا شاید اس مرتبہ دشمن انتقام لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ امام موصوف نے پورے جوش وخروش کے ساتھ جواب دیا کہ دشمن ہرگز اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ عقیدت مندوں نے پوچھا پھر کیا ہوگا؟ کہا بہت ممکن ہے کہ میں قید کیا جاؤں اور میری یہ قید بہت لمبی ہو۔ آئندہ کے حالات بتاتے ہیں کہ ان کا یہ خیال صحیح نکلا۔

مصر کو روانگی

امیر افرم نے بادل ناخواستہ امام موصوف کے سفر مصر کا انتظام کیا وہ اور شیخ نجم الدین ایک ہی ڈاک گاڑی سے روانہ ہوئے۔ تاتاری لڑائیوں کی وجہ سے عوام میں امام موصوف کی کافی شہرت ہو چکی تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ مصر بلائے گئے ہیں تو انہیں رخصت کرنے کے لیے سارا شہر امنڈ آیا۔ ان کے گھر سے لے کر جو قصاعین [2] کے محلے میں تھا جسورہ تک جو دمشق اور کسوہ [3] کے درمیان ایک مشہور جگہ ہے ٹھٹھ لگ گئی۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ان کے دل سے حامی اور گرویدہ تھے اور ان کے مصر جانے پر رنج وغم کے آنسو بہا رہے تھے۔ ان میں سے چند ایسے حریف بھی تھے جو ان کی روانگی کے منظر کو دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ اکثر محض تماشبین تھے جو اس غیر معمولی منظر سے لطف اندوز ہونے کی غرض سے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

---

[1] البداية والنهاية: ٣٨/٤١۔

[2] یہ محلہ اب تک موجود ہے۔ قصاع کے نام سے بسیں جاتی ہیں، مگر جدید عمارات کی وجہ سے اس کی پرانی شکل بالکل بدل گئی ہے۔ [3] یہ دمشق سے جنوب میں تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک مشہور مقام ہے۔

فلما توجه لمصر ازدحم الناس لوداعه و ورؤيته حتى انتشروا من باب داره الى قرب الجسورة فيما بين دمشق والكسوة وهم فيما بين باك و حزين و متفرج و متنزه و مزاحم متغال فيه. [1]

جب وہ مصر کے لیے روانہ ہوئے تو ان کو رخصت کرنے اور ان کو دیکھنے کے لیے لوگ کثیر تعداد میں جمع ہو گئے تھے اور وہ ان کے گھر سے لے کر جسورہ کے قریب تک جو دمشق اور کسوہ کے درمیان ایک مقام ہے پھیل گئے تھے ان میں سے بعض رو رہے تھے اور بعض غمگین تھے۔ بعض سیر تماشے کی غرض سے آئے تھے اور بعض مزاحم اور غلو کرنے والوں میں سے تھے۔

حافظ بن عبدالہادی کا بھی قریب قریب یہی بیان ہے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ دن دمشق کی تاریخ میں ایک یادگار دن تھا۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:

ولما توجه الشيخ فى اليوم الذى توجه فيه من دمشق المحروسة كان يوما مشهودا غريب المثل فى كثرة ازدحام الناس لوداعه ورؤيته حتى انتشروا من باب داره الى قريب الجسورة فيما بين دمشق والكسوة التى هى اول منزلة منها وهم ما بين باك وحزين و متعجب و متنزه ومزاحم متغال فيه۔ [2]

اور جب شیخ دمشق محروس و محفوظ سے مصر کی طرف روانہ ہوئے تو وہ دن ایک یادگار دن تھا لوگوں کے ہجوم و اژدحام کی کثرت میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ سب لوگ ان کو رخصت کرنے اور ان کو دیکھنے کے لیے آئے تھے یہاں تک کہ ان کے گھر کے دروازے سے لے کر جسورہ کے قریب تک جو دمشق اور کسوہ کے درمیان مشہور مقام ہے پھیل گئے۔ کسوہ دمشق اور مصر کے راستے کی پہلی

---

[1] البداية والنهاية: ١٤/ ٣٨۔ [2] العقود الدرية، ص: ٢٤٩۔

منزل ہے۔ بعض لوگ رو رہے تھے اور بعض غمگین تھے اور بعض سیر تماشے کی غرض سے آئے تھے اور بعض ان کے بارے میں مزاحم اور غلو کرنے والوں میں سے تھے۔

الغرض جب وہ دمشق سے مصر روانہ ہوئے تو ہر ایک منزل پر لوگ ان کے پاس آتے تھے اور ان سے مل کر بے حد خوش ہوتے تھے۔

غزہ کی مسجد میں تقریر

جب امام موصوف ۱۷ رمضان ۷۰۵ھ کو ہفتے کے دن غزہ پہنچے جو ملکِ شام کی جنوب مغربی سرحد پر ایک مشہور مقام تھا۔ تو وہاں کے لوگوں نے جامع مسجد میں ایک شاندار جلسہ کیا اور امام موصوف کو تقریر کرنے کی دعوت دی، یہ تقریر بہت ہی دلچسپ اور معلومات سے لبریز تھی، حاضرین نے اس کو بہت ہی پسند کیا، اور اکثر لوگ ان کے معتقد ہو گئے، بہت سے لوگوں نے آپ سے دُعا اور برکت کی درخواست کی۔ [1]

ملک ناصر سے ملاقات اور گفتگو

امام موصوف غزہ سے آگے روانہ ہوئے اور ۲۲ رمضان ۷۰۵ھ کو جمعرات کے دن وہ اور قاضی القضاۃ شیخ نجم الدین قاہرہ داخل ہوئے، ملک ناصر سے ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو ملک ناصر نے اُن سے کہا، مجھے خبر ملی ہے کہ آپ نے ملک پر قبضہ کرنے کے ارادے سے دمشق کے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنالیا ہے، امامِ موصوف نے پورے اطمینان کے ساتھ جواب دیا، ہاں میرا ارادہ ایسا ہی ہے، پھر بڑے ہی جوش کے ساتھ کہا، خدا کی قسم! تیری اور مغلوں (یعنی تاتاریوں) کی سلطنت میرے نزدیک ایک پر کاہ کی بھی قدر و قیمت نہیں رکھتی، سلطان نے مسکرا کر کہا، قسم بخدا آپ بے شک سچے ہیں اور جس نے میرے پاس آپ کی چغلی کھائی ہے وہ جھوٹا ہے۔ [2]

دونوں کی اس گفتگو سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ فتنہ پردازوں نے امامِ موصوف کے خلاف کس قسم کا خطرناک حربہ استعمال کیا تھا، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ سلطان دشمنوں

---

[1] اس وقت یہ مقام فلسطین کے جنوب مغربی سرحد پر ہے۔ [2] مجموع الدرر، ص: ۱۲۶۔

کے جھوٹے الزامات سے متاثر ہوا کیونکہ وہ تاتاری لڑائیوں میں امامِ موصوف کے اثر و اقتدار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبان و قلم میں اتنی تاثیر دے رکھی تھی کہ وہ عوام کو جس بات پر چاہتے آمادہ کر سکتے تھے، لیکن ایک دوسری بات بھی موجود تھی، سلطان کے دل پر شروع ہی سے امامِ موصوف کی صداقت و سچائی، خلوصِ نیت اور بے لوث زندگی کا ایک گہرا نقش تھا، اس لیے جب امامِ موصوف نے سلطان کے اس سوال کا بے باکانہ جواب دیا تو اس کی بدگمانی کافور ہو گئی۔

اس بے باکانہ جواب کے بعد ملک ناصر کے دل میں آپ کی وقعت و محبت پہلے سے زیادہ ہو گئی، دشمنوں کی خواہش کے برخلاف وہ آپ کی امداد کرنا چاہتا تھا، مگر وہ امیر بیبرس جاشنگیر کے ہاتھوں میں کچھ ایسا بے بس تھا کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی حکم نافذ نہیں کر سکتا تھا۔ [1] بیبرس یہ چاہتا تھا کہ امام ابن تیمیہ کھلی عدالت کے سامنے اپنے عقائد کا اظہار دیں اور اگر ان پر کفر ثابت ہو جائے جیسا کہ اس کا خیال تھا تو ان کو قتل کر دیا جائے۔

کھلی عدالت میں مقدمہ

دوسرے دن یعنی ۲۳ رمضان ۷۰۵ھ کو جمعہ کی نماز کے بعد قلعہ میں قضاۃ، فقہاء، علما اور ارا کینِ دولت کا ایک عام اجتماع ہوا، اور یہ مقدمہ قاضی القضاۃ شیخ زین الدین علی بن مخلوف بن ناہض بن مسلم بن منعم بن خلف النویری المالکی (المتوفی: ۷۱۸ھ) کے سامنے پیش ہوا، حکومت کی طرف سے شیخ شمس الدین محمد بن احمد بن عدلان شافعی (المتوفی: ۷۴۹ھ) نے امام ابن تیمیہ کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کیا کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا عرش پر ہے، اور انگلیوں سے اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اور نیز خدا آواز اور حروف کے ساتھ بولتا ہے، یہ کہہ کر ابن عدلان نے قاضی مالکی کی طرف مخاطب ہو کر کہا، کیا ایسا شخص سخت ترین سزا کا مستحق نہیں ہے؟ اس سے ان کا اشارہ قتل کی طرف تھا، کیونکہ مالکی مذہب میں تبدیلِ عقائد کی سزا صرف قتل تھی، قاضیِ موصوف نے امام ابن تیمیہ سے پوچھا: اے فقیہ! اس بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ امام موصوف نے اپنی عادت کے مطابق خدا کی حمد و ثنا سے اپنی

---

[1] الدرر الکامنۃ: ۱/ ۵۰۵۔

گفتگو شروع کی، قاضی نے کہا: ہم نے تمہیں یہاں خطبہ دینے کے لیے نہیں بلایا ہے، تم الزامات کا جواب دو۔ امام موصوف کو اس غیر شرعی تحکم پر سخت غصہ آیا، انہوں نے پوچھا: اس مقدمہ میں حاکم کون ہے؟ عدالت والوں نے قاضی مالکی کی طرف اشارہ کیا، امام موصوف نے کہا: جب وہ اس مقدمے میں میرے خصم اور حریف بنتے ہیں تو وہ میرے حاکم کیونکر ہو سکتے ہیں، یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہیں دیا، عدالت نے ان سے جواب طلب کیا، تو صاف کہہ دیا کہ وہ کوئی جواب دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، عدالت جو چاہے فیصلہ کر لے، قاضی مالکی نے انہیں قید کا حکم سنایا، دونوں بھائی شیخ زین الدین عبدالرحمٰن ابن تیمیہ اور شیخ شرف الدین عبداللہ ابن تیمیہ اُن کے ساتھ قید خانے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ ان تینوں کو برج کے قید خانے میں بھیج دیا گیا۔

اس وقت شیخ شرف الدین عبداللہ ابن تیمیہ کے منہ سے بددعا نکلی، امام موصوف نے انہیں ٹوکا اور کہا: یوں مت کہو، بلکہ یہ کہو کہ اے اللہ! تو دشمنوں کو ہدایت کی روشنی دکھا، تاکہ وہ حق کا راستہ پائیں۔

امام ابن تیمیہ کا جواب نہ دینا ہی مناسب تھا کیونکہ ان کے دشمنوں نے پہلے ہی سے یہ طے کر لیا تھا کہ ان پر ارتداد و کفر کا الزام لگا کر انہیں قتل کر دیا جائے، اسی وجہ سے انہوں نے شافعی قاضی القضاۃ کی عدالت میں یہ مقدمہ پیش کرنے کی بجائے جو اس زمانے میں عدالتِ عالیہ سمجھی جاتی تھی، مالکی قاضی القضاۃ کے روبرو پیش کیا، تاکہ قتل کے فیصلہ میں آسانی ہو، جب امام موصوف نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے مجبوراً قید کا حکم سنایا۔

قید کی سختی

برج ایک تنگ و تاریخ قید خانہ تھا جہاں بڑے بڑے مجرم قید کیے جاتے تھے۔ [1] امام موصوف کے دوست احباب اور دوسرے عقیدت منداُن سے ملتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے لیکن جب قاضی مالکی کو اس کی اطلاع ہوئی تو کہا کہ ابن تیمیہ پر کفر ثابت تو ہو چکا ہے، اُن کو قتل کر دینا چاہیے تھا، مگر اب کم از کم اُن پر قید کی سختی ہونی چاہیے۔ [2] پھر اُس نے

---

[1] خطط مقریزی: ۳/ ۳۰۶۔ [2] الدرر الکامنة: ۱/ ۱۴۷۔

انہیں برج کے قید خانے سے جِب کے قید خانے میں جہاں عموماً باغی قید کیے جاتے تھے۔ [1] منتقل کرنے کا حکم دے دیا، تینوں بھائی عید الفطر کی شب میں وہاں پہنچا دیئے گئے اور کسی کو اُن سے ملنے کی اجازت نہیں تھی، امام موصوف نے حکومت سے مفت کپڑا اور خرچ لینا منظور نہیں کیا۔ [2] یہاں وہ مطالعہ کتب، تلاوتِ قرآن اور ذکر و اذکار میں مشغول ہو گئے۔ [3]

دمشق میں اعلان

اس مقدمے کے بعد قاضی القضاۃ شیخ نجم الدین ابن صصری قضاوت کی بحالی کا پروانہ لے کر ذوالقعدہ ۷۰۵ھ کو دمشق لوٹے، اور اپنے ساتھ ایک شاہی اعلان بھی لے آئے تھے، جس کو امیر افرم کے کاتب السر شیخ شمس الدین محمد بن شہاب الدین محمود حنبلی (المتوفی: ۷۲۷ھ) نے دمشق کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد پڑھ کر سنایا، اس میں امام ابن تیمیہ کے متعلق تحقیری الفاظ استعمال کیے گئے تھے اور ان کے عقائد کو باطل قرار دیا گیا تھا، اور یہ اعلان کیا گیا کہ جو شخص بھی ان کے عقائد رکھے گا، اور ان کی تبلیغ کرے گا اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اس کا سارا مال و اسباب ضبط کر لیا جائے گا۔ [4]

دمشق کے حنابلہ سے اقرار لینا

شیخ نجم الدین ابن صصری شافعی نے مسندِ قضاوت پر متمکن ہوتے ہی دمشق کے محلۂ صالحیہ کے تمام حنبلیوں کو بلوا بھیجا، اور اُن سے جبراً یہ اقرار لیا کہ وہ عقائد میں امام شافعی کی پیروی کریں گے۔ حنفیوں کے قاضی شیخ شمس الدین ابن الحریری نے امام ابن تیمیہ کے علم و فضل کی بڑی تعریف کی اور محضر پر اپنے قلم سے تیرہ سطریں لکھیں اور امام موصوف کی بڑی تعریف و توصیف کرنے کے بعد صاف طور پر لکھا کہ تین سو سال سے امامِ موصوف کا کوئی مثیل اور نظیر نہیں دیکھا گیا، جب قاضی زین الدین ابن مخلوف مالکی کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے بیبرس جاشنگیر سے کہہ کر شیخ شمس الدین ابن الحریری کی معزولیت کا فرمان لکھوایا

---

[1] خطط مقریزی: ۳/ ۳۰۶۔ [2] العقود الدریة، ص: ۲۵۱۔

[3] البدایة والنهایة: ۱۴/ ۴۳۔

[4] الدرر الکامنة: ۱/ ۱۴۷؛ البدایة والنهایة: ۱۴/ ۳۸۔

اوران کی جگہ شیخ شمس الدین محمد الاذرعی کو قاضیٔ احناف مقرر کیا۔ ❶ مگر وہ بھی ایک سال کے بعد معزول ہو گئے۔

قاہرہ کے حنابلہ سے اقرار لینا

ادھر قاہرہ میں بھی تمام حنابلہ کو جمع کیا گیا، اوران سے اقرار لیا گیا کہ امام ابن تیمیہ کے عقائد فاسد ہیں اور اشاعرہ ہی کے عقائد درست ہیں، اس وقت مصر میں حنبلیوں کے قاضی شیخ شرف الدین عبدالغنی بن یحییٰ حرانی (المتوفی: ۷۰۹ھ) تھے، وہ کم علم ہونے کے ساتھ ساتھ کم ہمت بھی تھے، ان کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر دشمنوں نے ایک خط لکھوا لیا کہ اشاعرہ کے عقائد ہی صحیح ہیں۔ ❷ اس کی وجہ سے حنابلہ کی اور زیادہ پکڑ دھکڑ ہونے لگی، اور جب کسی نے اس کو تسلیم نہیں کیا تو اس کو سزا دی جانے لگی، عجیب بات یہ ہے کہ مصر کے حنفی قاضی شیخ شمس الدین محمد بن ابراہیم بن عبدالغنی سروجی (المتوفی: ۷۱۰ھ) نے امام ابن تیمیہ کی تائید کی۔ ❸ مصر کے شافعی قاضی القضاۃ شیخ بدرالدین بن جماعہ نے جو شیخ تقی الدین ابن دقیق العید کے بعد مصر کے قاضی ہوئے تھے، اس ہنگامہ میں خاموشی اختیار کر لی۔ ❹

فتنہ کو فرو کرنے کی کوشش

ان دنوں دمشق میں شیخ تقی الدین سلیمان بن حمزہ ابن قدامہ مقدسی (المتوفی: ۷۱۵ھ) حنبلیوں کے قاضی تھے۔ جب دمشق کے حنابلہ کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور اُن کو اشعری عقائد کے ماننے پر مجبور کیا گیا تو شیخ تقی الدین مقدسی نے دشمنوں کے ساتھ لطف و مدارات سے کام لے کر اس فتنہ کو فرو کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ چند دنوں کے بعد یہ مخالفت فرو ہو گئی۔ ❺

امام ابن تیمیہ کو رہا کرنے کی کوشش

اگرچہ امیر رکن الدین بیبرس جاشنگیر اور اُس کے شیخ، شیخ نصر بن سلیمان المنبجی اور

---

❶ الدرر الکامنة: ۱/ ۱٤۷۔ ❷ ایضًا۔ ❸ ایضًا۔ ابن کثیر نے ان کے تذکرے میں لکھا ہی کہ شیخ شمس الدین سروجی نے علم کلام سے متعلق امام ابن تیمیہ کے خیالات کی تردید کی اور اپنی ناواقفیت کی بناپر جگ ہنسائی کر لی۔ امام موصوف نے ان کے رد میں کئی جلدیں لکھی ہیں، البدایة والنهایة: ١٤/ ٦٠۔
❹ الدرر الکامنة: ۱/ ۱٤۷۔ ❺ الدرر الکامنة: ۲/ ٤۷۔

دیگر بعض علما امام ابن تیمیہ کے سخت مخالف تھے، تاہم مصر کا نائب سلطنت امیر سیف الدین سالار [1] امام موصوف کا حامی تھا اور دل سے ان کے علم و فضل کی قدر کرتا تھا، اس نے درمیان میں پڑ کر اس معاملے کو سلجھانے کی بہت کوشش کی، وہ یہ چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ قضاۃ و علما و فقہاء کی ایک مجلس کی جائے اور ان کے سامنے امام ابن تیمیہ ان اختلافی مسائل کے متعلق اُن سے بحث کریں، مگر قضاۃ کا اِصرار یہ تھا کہ وہ اپنے عقائد سے باز آجائیں، اور ادھر امامِ موصوف کا یہ اصرار تھا کہ اتنے دنوں تک اراکین سلطنت قاضیوں کی باتیں سنتے رہے، اب ایک مرتبہ اُن کا بھی اظہار لے لیا جائے، چنانچہ جب رمضان ۷۰۶ھ میں اس کے متعلق گفت و شنید شروع ہوئی تو امامِ موصوف نے اپنی بات پر اصرار کیا، وہ خود لکھتے ہیں:

رمضان ۷۰۶ھ [2] کے آخر دو امیر امراء و قضاۃ و علما کی جماعت کے قاصد بن کر میرے پاس آئے اور امراء کی طرف سے یہ پیغام سنایا کہ میں ان کے ساتھ چل کر قاضیوں سے گفتگو کروں، تاکہ اس جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے اور میں قید سے نکلوں، اس گفتگو سے اصلی مقصود یہی ہے کہ میں قید سے نکالا جاؤں، مگر شرط یہ ہے کہ یہ گفتگو بہت مختصر ہو، میں نے اُن قاصدوں سے کہا جاؤ اور میری طرف سے ان امیروں کو سلام کہہ کے یہ عرض کرو کہ ایک سال کی مدت گزر چکی ہے، اس سے پہلے بھی تم لوگ دن رات میرے مخالفین کی باتیں سنتے رہے مگر مجھ سے اب تک ایک کلمہ بھی نہیں سنا، اور یہ بہت بڑا ظلم ہے، اگر کوئی خصم یا حریف یہودی یا نصرانی یا اسلام کا کوئی دشمن ہو یا وہ تمہاری دولت اور سلطنت کا مخالف ہو تب بھی تمہارے لیے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ اُس کی بات کو سنے بغیر اس کا فیصلہ کرو، تم لوگ مختلف مجلسوں

---

[1] امیر سیف الدین سالار مصر کا ایک مشہور امیر تھا، وہ ۶۹۸ھ سے ۷۱۰ھ تک مصر کا نائب السلطنت رہا، اس نے بہت بڑی دولت جمع کر رکھی تھی، وہ بہت کریم اور سختی تھا اور لوگوں میں بہت زیادہ محبوب تھا، ملک ناصر اس سے بدظن ہو گیا تھا، آخر ربیع الاول ۷۱۰ھ میں اس کو قتل کرا دیا اور اس کا سارا مال و اسباب ضبط کر لیا۔ البداية والنهاية: ١٤/ ٥٩۔

[2] كتاب التسعينيه، صفحہ ۲۔۳، اس مطبوعہ نسخے میں تاریخ رمضان ۷۲۶ھ دی گئی ہے جو غلط معلوم ہوتی ہے، یہ واقعہ ۷۰۶ھ کا ہے جیسا کہ اس کی بعض عبارتوں سے مفہوم ہوتا ہے۔ نیز مناظرہ مصریہ کے قلمی نسخے میں جو ندوۃ العلما کے کتب خانے میں ہے رمضان ۷۰۶ھ کی ہی تاریخ درج ہے۔

میں میرے مخالفین کی باتیں سنتے رہے، اب مجھ ایک کا بھی ایک مجلس میں بیان سن لو، اس کے بعد ہم سب ایک جگہ جمع ہوں گے اور تمہاری موجودگی میں ایک دوسرے سے بحث کریں گے، اور یہ عدل و انصاف کا ایک ادنیٰ ترین درجہ ہے جس کی پیروی کا اللہ پاک نے اپنی اس آیتِ کریمہ میں حکم دیا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝۵۸﴾ [1]

''بے شک اللہ تعالیٰ تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو ان کے لوگوں کے پاس پہنچا دو، اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، بے شک اللہ تم کو اچھی نصیحت کرتا ہے، بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

ان قاصدوں نے مجھ سے کہا کہ یہی جواب ایک کاغذ پر لکھ دوں، میں نے ایک کاغذ پر لکھ کر ان کے حوالے کیا، یہ لوگ چلے گئے اور پھر واپس لوٹ آئے اور مجھ سے کہا کہ مجھے حاضر ہونا ہی پڑے گا، تاکہ میں قضاۃ سے ایک دو باتیں کر لوں، اور اس جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے۔

رمضان کے نصف اول میں یہی دونوں قاصد ایک کاغذ لے آئے تھے، جس کو اس قاضی نے لکھا تھا جو اس معاملہ میں حکم بنایا گیا تھا، میں نے ان دونوں سے کہا کہ اس کاغذ کی ایک نقل دے دیں، میں نے ان قاصدوں سے کہا کہ کیا مجھ سے اس قسم کا خطاب کیا جا سکتا ہے جیسا کہ اس کاغذ میں ہے؟ یہ دونوں قاصد خود شرمندہ ہوئے اور اس کی نقل میرے حوالے کی، میں نے کہا: میں ایسے شخص کے پاس نہیں جا سکتا جو میرے بارے میں جاہلیت کا غیر شرعی فیصلہ کرتا ہے، اور جو میرے ساتھ اس قسم کا سلوک روا رکھتا ہے، جیسا کہ پہلی مجلس میں میرے ساتھ کیا گیا جس کو یہودی اور نصرانی بھی کسی کے ساتھ روا نہیں رکھتے، میں نے قاصدوں سے کہا، یہ سب کچھ تو تمہاری ہی آنکھوں کے سامنے ہوا کیا تم لوگ میرے ساتھ اس قسم کا مکر کرنا چاہتے ہو، جس طرح تم نے پچھلے سال میرے ساتھ کیا، میں ایسی باتوں کا ہرگز

---

[1] ٤/النساء:٥٨۔

جواب نہیں دے سکتا، لیکن جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں نے کوئی غلط بات کہی ہے تو اس کو چاہیے کہ میری جن باتوں کا اس کو انکار ہے انہیں ایک کاغذ پر لکھ دے اور اپنی دلیلیں بھی بیان کرے، میں اس کی ہر ایک بات کا جواب لکھ دوں گا، اور اس کے بعد یہ تمام علمائے مشرق و مغرب کے سامنے رکھے جائیں، میں نے یہی بات ملک شام میں کہی تھی اور یہی اب بھی کہہ رہا ہوں، اور یہی وہ میرے عقائد ہیں جن کے متعلق میں نے ملک شام کے تمام قضاۃ و مشائخ و علما کے سامنے بحث کی تھی، تمہارے نائب نے تمہیں عقائد کا وہ نسخہ روانہ کیا تھا [1] جو اس وقت ان قضاۃ و مشائخ و علما کے سامنے پڑھا گیا تھا، اور اس بحث کی روداد بھی بھیجی تھی، جو میرے اور ان علما کے درمیان ہوئی تھی، اگر مجھ سے کوئی قصور ہوا ہو یا میرے ساتھ کوئی ظلم ہوا ہو اور میرے مخالفین سے چشم پوشی کی گئی ہو، جس کو خدا بہتر جانتا ہے، اور تمام مسلمان جانتے ہیں تو تم میرا وہ نسخہ دیکھو جو تمہارے پاس موجود ہے، اس وقت میرے پاس اس کا دوسرا نسخہ بھی موجود تھا، میں نے قاصدوں سے کہا، یہ نسخہ لے جاؤ اور ان کو دکھاؤ، اگر کسی کو میرے اعتقادات پر اعتراضات ہوں تو اس کو کہو کہ اپنے دلائل کے ساتھ انہیں لکھ دے اور میں ان میں سے ہر ایک کا جواب دوں گا۔

یہ دونوں قاصد میرا یہ نسخہ لے کر چلے گئے اور کچھ دیر بعد لوٹ آئے اور اپنے ساتھ ایک کاغذ لے آئے، جس میں میرے اعتقادات پر کوئی اعتراضات نہیں تھے، بلکہ میرے دشمنوں کے مقصد ہی کی بات تھی، قاصدوں نے مجھے بتایا کہ میرے مخالفین نے ایک کاغذ لکھا اور پھر اس کو چاک کر دیا اور دوبارہ یہ کاغذ لکھا جس کو وہ میرے پاس لے آئے ہیں، اس میں مجھ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ سے جہت اور تحیز کی نفی کروں، اور یہ نہ کہوں کہ اللہ کا کلام حروف اور آواز ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے، بلکہ وہ ایک معنی ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، اور اس بات کا اعتراف کروں کہ خدا کی طرف انگلیوں سے حسی اشارہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ عوام کے سامنے صفات الٰہی کے متعلق آیات قرآن و احادیث رسول سے بحث نہ کروں اور شہروں کو فتویٰ نہ بھیجا کروں۔

---

[1] یعنی امیر جمال الدین آقوش الافرم نائب السلطنت شام (یعنی العقیدہ الواسطیہ والعقیدۃ الحمویۃ الکبریٰ)۔

جب قاصدوں نے مجھے میرے مخالفین کا یہ رقعہ دکھایا تو میں نے اسی وقت اس کا جواب لکھا اور وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ قاصد جواب کے لیے جلدی کر رہے تھے، میں نے لکھا:

''اب کہنے والے کا یہ کہنا کہ میں اللہ تعالیٰ سے جہت اور تحیز کی نفی کروں اور اس کا عقیدہ رکھوں تو میرے کلام میں ان الفاظ کا کوئی ثبوت نہیں ہے، نفی یا اثبات میں، ان الفاظ کا استعمال و اطلاق بدعت ہے۔ میں وہی کہوں گا جو کتاب و سنت میں ہے یا جس پر سلف امت کا اتفاق ہے اگر کہنے والے کی اس سے یہ مراد ہے کہ آسمانوں پر کوئی پروردگار نہیں ہے اور نہ عرش پر کوئی خدا ہے اور نہ محمد ﷺ آسمانوں پر چڑھ کر اپنے پروردگار کی طرف گئے اور نہ عالم کے اوپر عدم محض کے سوا کوئی چیز ہے تو یہ باطل ہے اور اجماع ائمہ امت کے خلاف ہے اور اگر اس سے کہنے والے کا یہ مطلب ہے، کہ خدا کی مخلوقات اس کو گھیرے ہوئے نہیں ہے اور وہ موجودات کے جوف میں نہیں ہے تو میرے کلام میں اس کی صراحت موجود ہے، تو پھر اس کے دہرانے سے کیا فائدہ ہے۔''

اب رہا کہنے والے کا یہ کہنا کہ میں یہ نہ کہوں کہ اللہ کا کلام حرف وصورت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے بلکہ یہ کہوں کہ وہ ایک معنیٰ ہے جو اسکی ذات کے ساتھ قائم ہے تو میرے کلام میں اس کا بھی وجود نہیں ہے میں نے کسی وقت بھی ایسا نہیں کہا ہے، کیونکہ ایسا کہنا کہ قرآن حرف وصورت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے، بدعت ہے بلکہ یہ کہنا بھی کہ وہ ایک معنیٰ ہے جو اس کے ذات کے ساتھ قائم ہے بدعت ہے، سلف میں سے کسی نے بھی ایسا نہیں کیا ہے، میرے کلام میں ان بدعتوں میں سے کوئی ایک بھی موجود نہیں ہے بلکہ میرے کلام میں وہ باتیں ہیں جن پر سلف امت کا اجماع ہے، یعنی یہ کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور وہ غیر مخلوق ہے۔

اب رہا کہنے والے کا یہ کہنا کہ میں اس بات کا اعتراف کروں کہ خدا کی طرف انگلیوں سے کوئی حسی اشارہ نہیں کیا جاسکتا تو میرے کلا میں یہ الفاظ بھی نہیں ہیں، بلکہ میرے کلام میں

ان باتوں کا مطلق انکار ہے جن کو بدعتیوں نے ایجاد کیا، اور نفی کے الفاظ استعمال کیے، جیسے کہ ان کا یہ کہنا کہ خدا کی طرف حسی اشارہ نہیں کیا جا سکتا تو اس قسم کی نفی بھی بدعت ہے اگر اس سے کہنے والے کی مراد یہ ہو کہ خدا مخلوقات میں محصور نہیں ہے یا اس کے اور کوئی صحیح معنیٰ لیے جا رہے ہوں تو یہ ٹھیک ہے اور اگر اس کی مراد یہ ہو کہ دعا کرنے والا اللہ کی طرف ہاتھ نہ اٹھائے تو یہ ان متواتر حدیثوں کے خلاف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، اللہ نے اپنے بندوں کی فطرت ہی میں یہ بات رکھ دی ہے کہ دعا کے وقت وہ اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھائیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ بیشک زندہ اور کریم ہے، وہ اس بات سے شرم کرتا ہے کہ اس کا بندہ اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف اٹھائے، اور کچھ مانگے اور خدا ان کو خالی کر کے واپس بھیجے۔'' [1] اگر کوئی نام رکھنے والا اس کا نام اشارۂ حسیہ رکھ دے اور کہنے لگے کہ یہ جائز نہیں ہے تو اس کی بات قبول نہیں کی جا سکتی۔

اب رہا کہنے والے کا یہ کہنا کہ میں عوام کے سامنے صفات الٰہی سے متعلق آیات قرآن مجید و احادیث رسول پیش نہ کروں تو میں نے کسی عامی کے سامنے ہرگز اس بحث کی ابتداء نہیں کی لیکن جب کوئی ارشاد و ہدایت کا طلبگار اس کے متعلق سوال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق اس کا جواب دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص سے کسی علم کے متعلق دریافت کیا جائے، جس کو وہ جانتا ہے اور پھر بھی اس کو چھپا دیتا ہے تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی، خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴾ [2]

''بے شک وہ لوگ جو ہماری اتاری ہوئی کھلی نشانیوں اور ہدایت کو بعد اس کے ہم نے لوگوں کو کتاب میں بیان کر دی ہیں، چھپاتے ہیں تو انہی پر اللہ لعنت بھیجتا

---

[1] سنن ترمذی، کتاب الدعوات، باب فی فضل التوبة ...... : ٣٥٥٦۔

[2] ٢/البقرة:١٥٩۔

ہے، اورلعنت کرنے والے بھی ان پرلعنت بھیجتے ہیں۔''

اس لیے کسی عالم کو کسی ایسی بات کا حکم نہیں دیا جا سکتا، جس کی وجہ سے وہ اللہ کی اور لعنت کرنے والوں کی لعنت کا مستحق اور سزاوار بن جائے۔

دونوں قاصد میرا یہ جواب لے کر چلے گئے اور بہت دیر کے بعد لوٹے، وہ کوئی فیصلہ کن جواب تو نہیں لائے، مگر اتنا کہا کہ مجھے ان کے پاس چلنا ہے، میں نے غصہ میں آکر اور گرج کر کہا، او شریعت کے بدلنے والوں! او شریعت سے منہ موڑنے والو! او زندیقو! اور نہ معلوم میں نے غصہ میں آکر کیا کیا کہا، آخر میں میں کھڑا ہو گیا، اور دروازہ کھول کر اپنے گھر جانے کے لیے آمادہ ہو گیا، اور جب ذرا سکون ہوا تو میں نے ان باتوں کی تردید لکھی، جن کے ذریعہ اللہ کے دین کو بدلنے کی کوشش کی جارہی تھی اور مومنین کے راستے کو چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کیا جارہا تھا، اس میں مسلمانوں ہی کے لیے بہت بڑی منفعت ہے۔

اس کے بعد نہایت ہی تفصیل کے ساتھ مخالفین کے عقائد و خیالات کی تردید کی ہے۔

تفصیلی بحث سے مخالفین کا گریز

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مخالفین امام ابن تیمیہ کے ساتھ تفصیلی بحث کرنے سے گریز کرتے رہے کیونکہ انہیں صاف اندازہ تھا کہ تفصیلی بحث میں ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے سکیں گے، اور اس کی وجہ سے ارا کین دولت، عمائدین شہر اور عوام کی نظر میں حقیر و ذلیل ٹھہریں گے۔ وہ صرف اتنا چاہتے تھے کہ امام موصوف ان کے مختصر سوال کا اثبات یا نفی میں جواب دیں۔ اگر اثبات میں جواب دیں تو گویا امام موصوف اپنے عقائد و خیالات سے باز آئے، اور اگر نفی میں جواب دیں تو قانون کی تلوار سے ان کی گردن اڑا دی جائے، مگر ان کی یہ تدبیر کچھ کارگر نہیں ہوسکی، جب مخالفین ان سے تفصیلی بحث کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو انہوں نے ارا کین دولت اور قضاۃ و مشائخ و علما کے سامنے حاضر ہونے سے قطعی انکار کر دیا۔

دوبارہ کوشش

امیر سیف الدین سالار نے امام ابن تیمیہ کو رہا کرانے کی دوبار کوشش کی، اس نے عید

الفطر ۷۰۶ھ کی شب کو تینوں مذہب کے قاضیوں اور فقیہوں کو ایک جگہ جمع کیا، قاضی القضاۃ شیخ زین الدین علی بن مخلوف مالکی، قاضی القضاۃ شیخ بدرالدین ابن جماعہ شافعی، قاضی القضاۃ شیخ شمس الدین محمد بن ابراہیم سروجی حنفی حاضر ہوئے، فقیہوں میں شیخ علاء الدین علی باجی شافعی، شیخ شہاب الدین احمد یحییٰ جزری، شیخ عزالدین عبدالعزیز بن عبدالجلیل نمرادی شافعی تشریف لائے، جب امیر سالار نے امام موصوف کی رہائی کا ذکر کیا تو ان سب لوگوں نے یہ جواب دیا کہ اگر وہ اپنے عقائد سے باز آجائیں اور ہماری چند شرطوں کو مان لیں تو ان کی رہائی ہوسکتی ہے، امیر سالار نے امام موصوف کے پاس آدمی بھیجا مگر انہوں نے آنے سے انکار کر دیا، کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس چھ مرتبہ آدمی بھیجا گیا تھا، مگر انہوں نے ہر دفعہ انکار ہی کیا، آخر بہت دیر کے بعد یہ مجلس برخاست ہوگئی۔ [1]

تیسری کوشش

دو مہینے بعد نائب السلطنت مصر امیر سالار نے امام موصوف کو رہا کرانے کی کوشش کی، اس نے ۲۷ ذوالحجہ ۷۰۶ھ کو جمعرات کے دن تمام قاضیوں اور فقیہوں کو جمع کیا اور امام موصوف کو بلا بھیجا، مگر ان کی بجائے ان کے دونوں بھائی شیخ زین الدین عبدالرحمٰن بن تیمیہ اور شیخ شرف الدین عبداللہ بن تیمیہ تشریف لائے، شیخ شرف الدین نے قاضی القضاۃ شیخ زین الدین علی بن مخلوف مالکی سے عرش و کلام و نزول کے مسائل میں بحث کی اور قاضی موصوف کی غلطیاں واضح کیں، مجلس کے اختتام پر ان دونوں کو قید خانے بھیج دیا گیا۔

دوسرے دن جمعہ کی نماز کے بعد صرف شیخ شرف الدین عبداللہ ابن تیمیہ کو بلایا گیا، انہوں نے نائب السلطنت امیر سالار کے سامنے مذکورہ مسائل کے متعلق شیخ شمس الدین ابن عدلان سے بحث کی اور ان کو مغلوب کر دیا، مگر کوئی خاص فیصلہ نہیں ہوسکا، بحث کے بعد شیخ شرف الدین کو قید خانہ بھیج دیا گیا۔

چوتھی کوشش

نائب السلطنت مصر امیر سالار نے پھر ایک مرتبہ کوشش کی ۲۴ سفر ۷۰۷ھ کو جمعہ کے

---

[1] العقود الدرية، ص ۲۵۱ ؛مجموع الدرر، ص: ۱۷۶۔

دن قلعۃ الجبل میں اوحدی کے گھر میں تمام قاضیوں کو جمع کیا اور امام موصوف کو بلا بھیجا، وہ تشریف لائے، صبح کی نماز کے بعد سے نشست شروع ہوئی، قاضی القضاۃ شیخ بدر الدین ابن جماعہ شافعی نے امام موصوف سے بحث کی، جمعہ کی نماز تک ان سے بحث ہوتی رہی، نماز کے بعد پھر کچھ دیر تک بحث ہوتی رہی، مخالفین امام موصوف کی باتوں کا کوئی جواب تو نہیں دے سکے، مگر اس پر اصرار کیا، کہ ان کی پیش کی ہوئی چند شرطوں پر دستخط کر دیں تو ان کی رہائی ہو جائے، امام موصوف نے محض رہائی کی غرض سے بھی ان پر دستخط کرنا منظور نہیں کیا اور بخوشی قید خانہ واپس چلے گئے۔

امیر عرب کی کوشش

ربیع الاول ۷۰۷ھ کی ابتداء میں امیر عرب حسام الدین مہنا بن عیسیٰ بن مہنا (المتوفی: ۳۵ھ) قاہرہ آیا وہ امام ابن تیمیہ کا بہت بڑا معتقد تھا، اس نے اراکین سلطنت سے امام موصوف کی رہائی کے مسئلہ پر گفتگو کی، اور حکومت کی اجازت سے ۲۳ ربیع الاول ۷۰۷ھ کو جمعہ کے دن امام موصوف سے قید خانے میں ملا اور انہیں باہر آنے پر مجبور کیا، امیر سالار نے اپنے گھر پر تمام قاضیوں اور فقیہوں کو جمع کیا، امام موصوف بھی امیر عرب کے جبر سے اس مجلس میں تشریف لائے، نماز سے پہلے ان قاضیوں اور فقیہوں سے عقائد کے مسائل پر بحث ہوتی رہی، نماز کے لیے یہ اجلاس ملتوی کیا گیا، پھر جمعہ کی نماز کے بعد سے مغرب کی نماز تک مختلف مسائل پر بحث ہوتی رہی، لیکن کوئی خاص فیصلہ نہ ہو سکا، قاضی القضاۃ شیخ زین الدین علی بن مخلوف مالکی اور ان کے رفقاء نے پہلے ہی سے ایک محضر تیار کر رکھا تھا، جس کی عبارت ''الدرر الکامنہ'' میں منقول ہے اور جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

> ''میں یہ اعتقاد رکھتا ہوں کہ قرآن ایک معنیٰ ہے جو اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور قرآن ذات الٰہی کی قدیم صفتوں میں سے ایک صفت ہے اور وہ غیر مخلوق ہے اور وہ حرف اور آواز نہیں ہے اور رحمٰن کے عرش پر مستوی ہونے کے ظاہری معنی نہیں ہیں، اور میں اس کی مراد کی حقیقت کو نہیں جانتا بلکہ اس کو اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ نزول باری کے بارے میں بھی میرا قول استوا کے قول کی

طرح ہے۔'' [1]

مخالفین امام ابن تیمیہ سے تفصیلی بحث کرنے پر آمادہ نہیں تھے، وہ صرف اتنا چاہتے تھے کہ وہ ان کے اس تیار کردہ محضر پر دستخط کر دیں، مگر امام موصوف اس پر آمادہ نہیں تھے، چنانچہ یہ پہلی مجلس یونہی ختم ہوگئی۔

دوسری مجلس

سلطان مصر ملک ناصر نے حکم دیا کہ اس سلسلہ میں ۲۵ ربیع الاول ۷۰۷ھ کو اتوار کے دن دوسری مجلس منعقد کی جائے، اور تمام قضاۃ وفقہاء نزاعی مسائل کے متعلق امام موصوف سے بحث کریں، اتوار کی صبح کو نشست ہوئی، قاضیوں میں سے کوئی بھی حاضر نہیں ہوا، جب امیر سالار نے ان کے بلانے کیلئے آدمی بھیجے تو ہر ایک نے ناسازی مزاج وغیرہ کا بہانہ کیا، امیر موصوف نے ان کی معذرت قبول کر لی، فقہا میں سے چند آدمی حاضر ہوئے جن سے شیخ نجم الدین بن الرفعہ شافعی، شیخ علاء الدین علی باجی، شیخ فخر الدین بن بنت ابی اسعد، شیخ عز الدین عبدالعزیز بن عبدالجلیل نمرادی، شیخ شمس الدین ابن عدلان وغیرہ شامل تھے، امام موصوف کے مقابلے میں شیخ نجم الدین ابن الرفعہ شافعی کو پیش کیا گیا۔ شیخ موصوف عمر کے لحاظ سے تقریباً پندرہ سال بڑے تھے، شافعی فقہ میں ان کو کمال حاصل تھا، مگر ان کلامی مسائل میں امام موصوف کی ہمہ گیر قابلیت کے سامنے ان کی کچھ نہ چلی، مجلس کے ختم ہونے کے بعد لوگوں نے امام موصوف نے انکے متعلق رائے پوچھی تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے ان کو ایسا شیخ پایا جن کی داڑھی سے شافعی فقہ ٹپک پڑتی ہے۔ [2]

اس روز تمام قاضی ڈر کے مارے حاضر نہ ہوئے، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ امام موصوف کے پرزور دلائل کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے، اور بھری مجلس میں خود اپنی بے عزتی ہوگی، دن کے ایک بڑے حصہ تک ان فقیہوں سے بحث ہوتی رہی، مگر کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا۔

---

[1] الدرر الکامنة: ۱/ ۱۴۸۔ [2] الدرر الکامنة: ۱/ ۲۸۵۔

تیسری مجلس

۶ ربیع الآخر ۷۰۷ھ کو جمعرات کے دن قاہرہ کے مدرسہ صالحیہ میں تیسری مجلس منعقد ہوئی جس میں چند قاضی اور فقیہ تشریف لائے، ان میں سے ایک مخالف نے کہا: تم اللہ سے مغفرت چاہو اور توبہ کرو، امام موصوف نے کہا: ہم سب اللہ سے مغفرت چاہتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں، پھر امام موصوف نے حاضرین میں سے ایک کی طرف خطاب کر کے کہا: خدا سے مغفرت مانگو اور توبہ کرو، اس شخص نے کہا: میں خدا سے مغفرت مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں، انہوں نے دوسرے اور تیسرے شخص سے بھی یہی کہا اور ہر ایک نے ایسا ہی کیا مخالف نے کہا، ایسا نہیں تم ان ان عقائد سے توبہ کرو، امام موصوف نے کہا: اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہے جس سے توبہ لازم آتی ہے تو میں توبہ کرتا ہوں، مخالف نے کہا: یہ تو توبہ نہیں ہوئی، امام موصوف نے سختی کے ساتھ اس کو لتھاڑا اور کہا: تم جاہل ہو، اس کے بعد اس کی غلطیاں دکھائیں، اس تیسری مجلس میں بھی ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکا، اور یہ مجلس یونہی ختم ہوگئی۔

کیا امام ابن تیمیہ نے مخالفین کے عقائد کو تسلیم کر لیا تھا؟

حافظ ابن رجب نے شیخ شمس الدین ذہبی اور شیخ علم الدین برزالی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام ابن تیمیہ نے قتل کے ڈر سے ان نزاعی مسائل میں مخالفین سے اتفاق کر لیا بعض دوسری روایتوں میں ہے کہ امیر عرب مہنا بن عیسیٰ بن مہنا کے جبر سے انہوں نے اپنے مخالفین کے پیش کئے ہوئے محضر پر دستخط کر دیے، مگر جو بھی امام موصوف کی سیرت کا ادا شناس ہے وہ ان روایتوں کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا، اوپر کی روئداد سے صاف اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح موصوف آخر وقت تک اپنے مخالفین کے خیالات کی تردید کرتے رہے، دوسری مجلس میں خود قاضی حاضر نہیں ہوئے، اور جب آئے بھی تو ان کی باتوں کا جواب نہیں دے سکے، ان کو صاف اندازہ ہو گیا، امام موصوف پر زور ڈال کر اپنے عقیدوں کے اعتراف نامہ پر دستخط لینا ناممکن ہے مگر انہوں نے چالا کی یہ کی کہ امام ابن تیمیہ کی قید پر زور نہیں دیا، پہلی مجلس کے بعد سے وہ قید خانہ جانے کی بجائے شیخ تقی الدین ابو حفص عمر بن عبداللہ بن عبدالاحد بن شقیر کے

گھر مہمان رہے [1] اور وہیں سے دوسری اور تیسری مجلس میں شرکت کی، اور جب کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا، تو امام موصوف کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا، امیر عرب مہنا بن عیسیٰ ان کو اپنے ساتھ دمشق لیجانا چاہتا تھا مگر نائب السلطنت مصر امیر سیف الدین سالار نے ان کو روک لیا اور کہا کہ وہ چند مہینے قاہرہ میں قیام کریں، تا کہ لوگ ان کے علم و فضل کو دیکھیں اور ان سے فائدہ اٹھائیں۔ [2]

سلیمان بن عبدالقوی کا مدحیہ قصیدہ

چونکہ مسلسل اٹھارہ مہینوں کے بعد امام موصوف قید سے رہا ہوئے تھے، اس لیے ان کے دوستوں، شاگردوں اور معتقدوں کو بے انتہا خوشی ہوئی، دمشق میں شیخ نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی نے ایک پرزور مدحیہ قصیدہ لکھا جس میں امام موصوف اور ان کے بھائیوں کی بڑی تعریف کی اور ان کے دشمنوں کی ہجو بیان کی، اس کے چند اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

فَاصْبِرْ فَفِي الصَّبْرِ مَا يُغْنِيكَ عَنْ حِيَلِ
وَكُلَّ صَعْبٍ اِذَا صَابَرْتَهُ هَانَا

پس صبر کیجیے، کیونکہ صبر میں وہ بات ہے جو آپ کو حیلوں سے بے پروا کر دے گی، اور ہر وہ مشکل جس پر آپ صبر کریں تو وہ آسان ہو جائے گی۔

وَلَسْتَ تَعْدُمْ مِنْ خَطْبٍ رُمِيتَ بِهِ
اِحْدَى اثْنَتَيْنِ فَايْقِنْ ذَاكَ اِيْقَانَا

اور آپ اس حادثہ کی وجہ سے جس کی زد آپ پر پڑی ہے معدوم نہیں ہو جائیں گے، صرف دو باتوں میں سے ایک ہوگی، اس کا آپ یقین رکھیں۔

---

[1] موصوف حران کے رہنے والے اور حنبلی مذہب کے تھے، اور مصر میں رہتے تھے امام موصوف کے بڑے ہمدردوں اور بہی خواہوں میں سے تھے۔ ٦٦٦ھ میں پیدا ہوئے تھے اور جمادی الآخرہ ٧٤٤ھ میں انتقال کیا تھا۔

[2] العقود الدرية، ص ٢٥٥، ٢٥٦۔

تَمْحِيْصُ ذَنْبٍ لِتَلْقَى اللّٰهَ خَالِصَةً
اَوْ اِمْتِحَانًا بِهِ تَزْدَادُ قُرْبَانَا

یا گناہ مٹیں گے تاکہ آپ پاک صاف ہو کر اللہ سے ملیں، یا آپ کی آزمائشیں ہوں گی، جس سے خدا کی نزدیکی حاصل ہوگی۔

يَا سَعْدُ اِنَّا لَنَرْجُو اَنْ تَكُوْنَ لَنَا
سَعْدًا وَمَرْعَاكَ لِلْوُرَّادِ سُعْدَانَا

اے نیک بخت! بے شک ہم یہ امید کرتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے نیک بخت ثابت ہوں گے اور آپ کی چراگاہ آنے والوں کے لیے مبارک جگہ ثابت ہوگی۔ [1]

وَاِنْ يَضُرَّ بِكَ الرَّحْمٰنُ طَائِفَةً
وَلَّتْ وَيَنْفَعُ مَنْ بِالْوُدِّ وَالاَنَا

اور اگر آپ کی وجہ سے خدا کسی جماعت کو تکلیف پہنچائے تو وہ پیٹھ پھیر لیتی ہے اور اس شخص کو نفع پہنچاتا ہے جو ہمارے ساتھ محبت کا دم بھرتا ہے۔

يَا اَهْلَ تَيْمِيَةَ الْعَالِيْنَ مَرْتَبَةً
وَمَنْصَبًا فَرَعَ الاَفْلَاكِ تِبْيَانَا

اے تیمیہ کے خاندان والو! مرتبہ اور منصب کے لحاظ سے تم لوگ بلند ہو اور تبیان میں افلاک کی فرع ہو۔

جَوَاهِرُ الْكَوْنِ اَنْتُمْ غَيْرَ اَنَّكُمْ
فِيْ مَعْشَرٍ اُشْرِبُوْا فِي الْعَقْلِ نُقْصَانَا

تم لوگ کائنات کے جوہر ہو، مگر بات یہ ہے کہ تم ایسی جماعت میں ہو جن کی عقل میں نقصان رچ گیا ہے۔

---

[1] سعدان ایک خاردار پودا ہے، جس کو اونٹ بہت ذوق سے کھاتے ہیں۔

لَا يَعْرِفُوْنَ لَكُمْ فَضْلًا وَلَو عَقَلُوْا
لَصَيَّرُوْا لَكُمْ الْأَجْفَانَ اَوْطَانَا

وہ تمہاری بزرگی کو پہچانتے نہیں ہیں، اور اگر وہ اس کو سمجھتے تو البتہ تم کو اپنی پلکوں میں جگہ دیتے۔

يَامَنْ حَوٰى مِنْ عُلُوْمٍ الْخَلْقِ مَا قَصُرَتِ
عَنْهُ الْاَوَائِلُ مُذْ كَانُوْا اِلَى الْآنَا

اے وہ شخص جس نے مخلوق کے علوم کا جن کو پہلے کے لوگ شروع سے لے کر اب تک احاطہ نہیں کر سکے تھے! احاطہ کر لیا ہے۔

اِنْ تُبْتَلٰى بِلِئَامٍ النَّاسِ يَرْفَعُهُمْ
دَهْرٌ عَلَيْكَ لِاَهْلِ الْفَضْلِ قَدْ خَانَا

اگر کمینے لوگوں کے ذریعہ آپ کی آزمائش کی جاتی ہے تو زمانہ اُن کو آپ پر بڑھا دیتا ہے۔ تو گویا وہ اہل فضل کی خیانت کرتا ہے۔

اِنِّيْ لَاُقْسِمُ وَالْاِسْلَامُ مُعْتَقَدِيْ
وَاِنَّنِيْ مِنْ ذَوِى الْاِيْمَانِ اِيْمَانَا

بے شک میں قسم کھاتا ہوں اس حالت میں کہ اسلام پر میرا عقیدہ ہے اور بے شک میں ایمان والوں میں سے ہوں۔

لَمْ اَلْقَ قَبْلَكَ اِنْسَانًا اَسُرُّ بِهٖ
فَلَا بَرِحْتَ لِعَيْنِ الْمَجْدِ اِنْسَانَا

میں نے آپ سے پہلے ایک ایسے انسان سے ملاقات نہیں کی جس سے میں خوش ہو سکتا ہوں، پس آپ ہمیشہ بزرگی کی آنکھ کی پتلی بن کر رہیں۔

والدہ کے نام خط

امام ابن تیمیہ نے دوسری مجلس کے دوسرے دن یعنی ۲۶ ربیع الاول ۷۰۷ھ کو پیر کے دن اپنی والدہ اور دوسرے دوستوں کے نام خط لکھے، جن کو ''العقود الدریہ'' میں نقل کیا گیا

ہے، والدہ کے خط میں ان کے نام کی تصریح کی گئی ہے دوسرے خط میں مرسل الیہ کی تصریح نہیں ہے، بہت ممکن ہے کہ اپنے اخیافی بھائی شیخ بدرالدین قاسم یا کسی اور کے نام خط لکھا ہو، والدہ کے خط میں حمد وثنا کے بعد یہ لکھا ہے۔

''آپ جانتی ہیں کہ اس وقت ہمارا اس ملک میں ٹھہرنا چند ضروری امور کی وجہ سے ہے، اگر ہم ان امور میں کاہلی برتیں گے تو دین اور دنیا کا کام فاسد ہو جائے گا، قسم بخدا ہم آپ سے دور رہنا نہیں چاہتے، اگر پرندے اپنے پروں پر ہم کو بٹھا کر لے جا سکتے تو ہم ضرور آپ کے پاس پہنچتے، لیکن غائب آدمی کا عذر بھی اس کے ساتھ ہے اگر آپ کو حقیقی امور کی اطلاع ہوتی تو آپ بھی ہمارا یہاں رہنا ضروری سمجھتیں، ہم ایک مہینہ بھی یہاں رہنا گوارا نہیں کرتے، بلکہ ہر روز ہم اپنے متعلق اور آپ کے متعلق خدا سے استخارہ کیا کرتے ہیں، آپ کیلئے اور ساری بھلائی و بہودی کے لیے دعا فرمائیں، ہم بھی اللہ جل شانہ سے یہی دعا کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے لیے، آپ کے لیے اور سارے مسلمانوں کے لیے وہی تجویز کرے جس میں ہم سب کی بھلائی اور عافیت مضمر ہو۔

اللہ تعالیٰ نے بھلائی و رحمت اور ہدایت و برکت کے ایسے دروازے ہم پر کھولے ہیں جس کا وہم و گمان بھی ہمارے دل و دماغ میں موجود نہیں تھا ہم ہر وقت سفر کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں اور اس کے متعلق ہر روز اللہ جل شانہ، سے استخارہ کیا کرتے ہیں، آپ یہ گمان نہ فرمائیں کہ ہم آپ کی قربت اور نزدیکی پر دنیاوی امور کو ترجیح دے رہے ہیں، بلکہ ہم ایسے دینی امور کو بھی ترجیح نہیں دے رہے ہیں، جن کے مقابلہ میں آپ کی قربت اور نزدیکی راجح ہے، مگر بہت سے ایسے اہم امور ہیں جن کے ترک کرنے سے خواص اور عوام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، اور حاضر وہ کچھ دیکھتا ہے جو غائب نہیں دیکھ سکتا۔''

اس کے بعد اس خط کو طلب دعا اور سلام پر ختم کیا ہے

اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہ مسلمانوں کی زندگی میں بعض ایسے

نقائص دیکھ رہے تھے، جن کی اصلاح ان کے خیال میں بہت ضروری تھی، اسی لیے انہوں نے امیر سیف الدین سالار کی خواہش پر اور چند دن قاہرہ میں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

دوستوں کے نام خط

اس خط میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا مرسل الیہ کا نام نہیں ہے مگر یہ خط بہت ہی اہم ہے کیونکہ اس سے امام ابن تیمیہ کے عقائد وخیالات اور کردار پر کافی روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سینے میں کسی قسم کا کشادہ دل تھا جو ان کے دشمنوں کیلئے بھی اسی طرح کھلا ہوا تھا، جس طرح ان کے دوستوں، شاگردوں اور معتقدوں کیلئے کھلا ہوا تھا، اس خط میں امام موصوف حمد وثنا کے بعد لکھتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی نعمتوں اور احسانوں سے مجھ کو نوازا ہے، جن کا شکر ادا کرنا اور اس کی اطاعت پر ثابت قدم رہنا اور مصائب پر صبر کرنا میرے لیے واجب ہے، بندے کا فراخیوں میں صبر کرنا تنگیوں میں صبر کرنے سے بھی زیادہ اجر رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھاتے ہیں اور پھر اس سے وہ چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے اور اگر سخت تکلیفوں کے بعد اس کو نعمتوں کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرا سارا دکھ درد چلا گیا، بس وہ اترانے اور شیخی کرنے لگتا ہے مگر وہ لوگ صبر کرتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں انہی کیلئے بخشش اور بڑا اجر ہے۔'' [1]

تم یہ جانتے ہو کہ اس قضیہ میں اللہ تعالیٰ کے ہم پر بہت سے احسانات ہوئے ہیں اس نے اپنے دین کی مدد کی، اپنے کلمہ کو بلند کیا اور اپنی فوج کو کامیابی بخشی، نیز اہل السنت و الجماعت کو قوی اور اہل بدعت وافتراق کو ذلیل کیا، اور امت محمدیہ ہدایت وکامیابی اور دلائل و ظہور حق کے اتنے دروازے کھول دیے کہ ان کو کوئی شمار نہیں کرسکتا۔ لوگوں کی توجہ اہل السنت والجماعت کے راستے کی طرف منعطف ہوگئی ہے، اس کے علاوہ ہم پر اللہ تعالیٰ کے بہت سے دوسرے احسان ہوئے ہیں جن کا شکر ادا کرنا ہم پر واجب ہے۔

---

[1] ۱۱/ھود:۹۔۱۱۔

تم یہ بھی جانتے ہو کہ دین کے اجماعی قواعد میں سے ایک لوگوں کے دلوں کو ایک دوسرے سے ملانا اور ان کے آپس کے اختلافات کو مٹا کر ان کو ایک کلمہ پر جمع کرنا ہے، قرآن مجید میں اس کے متعلق بہت سی آیتیں اور حدیث کی کتابوں میں بہت سے ارشادات آئے ہیں، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مسلمان کا دل تین باتوں سے بغض نہیں رکھتا، پہلی اخلاصِ عمل، دوسری حکمرانوں کو نصیحت اور تیسری مسلمانوں کی جماعت کا ساتھ دینا۔'' [1] میں اپنی ذات ہی سے ان اصول پر عمل کی ابتداء کرتا ہوں، تم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اپنی ذات سے اپنے ساتھیوں کو تو کیا بلکہ عام مسلمانوں کو بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا، ان میں سے کسی پر مجھ کو کوئی غصہ نہیں ہے اور نہ میں کسی کو ملامت کرتا ہوں، نہ ظاہر میں اور نہ باطن میں، بلکہ ان میں سے ہر ایک کے لیے میرے دل میں پہلے سے زیادہ قدر و عزت ہے، ہر ایک شخص تین باتوں سے خالی نہیں ہوگا، یا تو وہ مجتہد ہوگا اور ٹھیک اجتہاد کرے گا، یا وہ مجتہد ہو گا مگر اس کا اجتہاد خطا کرے گا، یا وہ قصداً اور جان بوجھ کر غلطی اور گناہ کا مرتکب ہوگا، پہلا شخص خدا کے نزدیک ماجور و مشکور ہوگا، دوسرا بھی خدا کے نزدیک قابلِ عفو ہوگا ور اُس کو معاف کر دیا جائے گا، تیسرے کو بھی اگر خدا چاہے تو معاف کر دے گا۔

اس لیے بعض لوگوں کا یہ الزام دینا کہ فلاں نے فلاں قصور کیا، فلاں نے فلاں کام نہیں کیا، فلاں کی وجہ سے فلاں کو سزا ملی، فلاں اس قضیہ کا بانی تھا، فلاں کی وجہ سے فلاں کو تکلیفیں پہنچیں، یہ اس قسم کی باتیں ہیں جو بعض بھائیوں اور ساتھیوں کی مذمت کے طور پر بیان کی جاتی ہیں، مگر میں ان کو پسند نہیں کرتا۔

تم یہ بھی جانتے ہو کہ دمشق اور مصر میں بعض بھائیوں اور ساتھیوں پر بڑی سختیاں کی گئیں اس کی وجہ سے اُن کے اندر کوئی نقص پیدا نہیں ہوا، اور نہ اس کی بنا پر ہمارے اندر کوئی تغیر آیا، ہم کو کسی سے بھی بغض نہیں ہے، بسا اوقات سختیوں کی وجہ سے بھلائیاں پیدا ہوتی ہیں، اور لوگوں کے دل میں لطافت اور نرمی جگہ لیتی ہے۔

---

[1] سنن ترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی الحث علی تبلیغ السماع، ح: ۲۶۵۸۔

تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہم سب نیکی اور تقویٰ کے پھیلانے میں ایک دوسرے کے مدد معاون ہیں اس سلسلے میں اگر کسی کو کسی سے تکلیف پہنچی ہو تو اس کا بدلہ نہیں لینا چاہیے، وہ شخص سخت غلطی پر ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ دمشق اور مصر میں سختیوں کا اب بدلہ لیا جا سکتا ہے۔

تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس معاملے میں آراء کا کتنا اختلاف رہا، اور ہم پر کتنے جھوٹ اور بہتان باندھے گئے، مگر ان میں سے ہر ایک جھوٹ اور بہتان ہمارے لیے خیر و برکت کا باعث ہوا، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم پر جھوٹ بولنے یا ظلم کرنے کی وجہ سے کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے، میں ہر ایک مسلمان کو معاف کرتا ہوں اور تمام مسلمانوں کی بھلائی چاہتا ہوں، ہر مؤمن کے لیے وہی بھلائی چاہتا ہوں جو میں اپنے نفس کے لیے چاہتا ہوں، میں ان سب لوگوں کو معاف کرتا ہوں، جنہوں نے مجھ پر کوئی ظلم کیا۔

اب رہا حقوق اللہ کا معاملہ تو جو لوگ صدق دل سے توبہ کریں گے، اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ قبول کرے گا۔

ذہنیت کی تبدیلی

امام ابن تیمیہ کے زمانے میں علومِ منقولات پر علوم معقولات کا جو پختہ اثر ہو چکا تھا اس کے پیش نظر علمائے وقت کی ذہنیت کی تبدیلی بہت ہی دشوار تھی، قرآن و حدیث اور فقہ و اصول کے تمام مسائل پر امام الحرمین ابو المعالی الجوینی، امام غزالی اور امام رازی کے نظریات و خیالات بالکل چھا چکے تھے، ہر ایک انہی کے نظریوں کے مطابق عقائد کے مسائل کو بھی جانچنے لگا تھا، اس لیے عقائد کے متعلق امام ابن تیمیہ قرآن و حدیث کے جو کھلے نصوص و ارشادات پیش کر رہے تھے وہ ان علما کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہے تھے، امام الحرمین کی کتاب الارشاد، امام غزالی کی کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد اور امام رازی کی کتاب اساس التقدیس، کتاب محصل افکار المتقدمین والمتأخرین، کتاب الاربعین، کتاب المباحث المشرقیہ وغیرہ ان علما کے لیے آسمانی کتابیں بنی ہوئی تھیں، وہ ان کے عقائد و خیالات سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہونا چاہتے تھے، اس لیے عقائد کا یہ جھگڑا یہیں ختم نہیں ہو گیا، بلکہ امام ابن تیمیہ کی وفات تک برابر جاری رہا، انہوں نے ان مذکورہ بالا ائمہ کی تردید میں کئی کتابیں لکھیں امام

رازی کی کتاب اساس التقدیس کی تردید میں جو عقائد کے متعلق ایک اہم کتاب مانی جاتی ہے، تخلیق التلبیس من کتاب التأسیس کے نام سے ایک زبردست کتاب لکھی۔ نیز درء تعارض العقل والنقل، تلبیس الجهمیه فی تأسیس بدعهم الکلامیه، کتاب النبوات، کتاب الرد علی المنطقیین جیسی کتابیں لکھی، جن میں بہت ہی تفصیل کے ساتھ متاخرینِ اشاعرہ کے عقائد و نظریات اور خیالات کی تردید کی ہے، یہ جھگڑا نہ صرف امام ابن تیمیہ کی زندگی تک جاری رہا، بلکہ ان کے بعد بھی ان مسائل پر بحثیں ہوتی رہیں، امامِ موصوف کے شاگردِ رشید حافظ ابن قیم نے خاص کر اپنی کتاب الصواعق المرسله علی الجهمية والمعطلة میں اُن پر بڑی بحث کی ہے۔

امام ابن تیمیہ نے ان مسائل سے متعلق کئی رسائل لکھے ہیں جو درحقیقت ان سوالوں کے جوابات تھے جو مختلف شہروں سے ان کے پاس آیا کرتے تھے، عام لوگوں میں ان مسائل سے ایک طرح کی غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی، اور ہر جگہ بحث مباحثے ہونے لگے تھے، اگرچہ علمائے متکلمین امامِ موصوف کے نقطۂ نظر سے متحد نہیں ہو سکے، تاہم اُن کو یہ محسوس ہونے لگا کہ فلسفہ و کلام اور منطق کے مسلم مسائل مشبہات و خدشات سے خالی نہیں ہیں، اُن پر انگلی رکھنے کی گنجائش ہے۔

عقل و نقل میں کس کو ترجیح دی جائے

اس زمانے میں ایک اہم سوال یہ تھا کہ اگر عقل اور نقل میں تعارض ہو تو کس کو ترجیح دی جائے، امام رازی اور اُن کے پیرؤوں نے کتاب وسنت کے ان ارشادات کے متعلق جو زیادہ تر عقائد کے بارے میں آتے ہیں یہ کلی قانون بنایا تھا کہ جب عقل اور نقل یا قواطعِ عقلیہ اور ظواہر نقلیہ یا عقلی اور سمعی دلائل کے درمیان تعارض ہو تو عقل کو نقل پر ترجیح دی جائے گی اور نقل میں تاویل کی جائے گی، کیونکہ اگر ان دونوں کے درمیان تعارض ہو تو ظاہر ہے کہ ایک ساتھ دونوں معنی نہیں لیے جا سکتے، ان دونوں کے درمیان مطابقت دینی بھی محال ہوگی، اس لیے کہ اس صورت میں یہ مطابقت دینی جمع بین النقیضین کے مترادف ہوگی، اور یہ محال ہے، یا یہ کہ نقل کو عقل پر ترجیح دی جائے، اور یہ جائز نہیں ہے کیونکہ نقل عقل کی فرع ہے، اور عقل نقل کی

اصل ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اصل پر فرع کو ترجیح نہیں ہوسکتی، اس بنا پر لامحالہ عقل ہی کو نقل پر ترجیح دینی ہوگی، اور نقل میں تاویل کرنی پڑے گی اور اگر تاویل ممکن نہ ہو تو ایسی آیتوں اور حدیثوں کو متشابہات میں سے قرار دے کر ان کے معانی کو اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کردیا جائے گا۔

امام ابن تیمیہ نے اپنی مشہور کتاب درء تعارض العقل والنقل میں اس مسئلہ پر اٹھارہ صورتوں سے بحث کی ہے، اور اس قانونِ کلی کو غلط قرار دیا ہے، انہوں نے یہ لکھا ہے کہ انسانی عقلِ صحیح کو نقل پر ترجیح نہیں دی جاسکتی، کیونکہ انسانی عقول کا ایک معیار نہیں ہے، بعض کی عقلیں دوسروں کی عقلوں کے مطابق نہیں ہوتیں اس سلسلہ میں انہوں نے کئی مثالیں دی ہیں۔ [1]

ایک جگہ لکھا ہے کہ عقلِ سلیم نقلِ صحیح کی ہرگز مخالف نہیں ہوسکتی، ہمیں درحقیقت سمع وعقل کی اصطلاحات سے دھوکا دیا جارہا ہے۔ امامِ موصوف کا کہنا یہ ہے کہ ہم جو مذہبی باتوں پر یقین رکھتے ہیں، اور ان پر عمل کرتے ہیں وہ سمعی دلائل کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ شریعت کے قطعی دلائل کی وجہ سے ہے، اور تمام انسانی عقلیں شریعت کی تابع ہوتی ہیں، اس صورت میں یہاں عقل اور نقل کے تعارض کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، عقل شریعت کی تابع ہے جس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ [2]

فلاسفہ و متکلمین کے طریقۂ استدلال کی خامیاں

امام ابن تیمیہ نے شیخ ابونصر فارابی، شیخ ابوعلی بن سینا، امام ابوحامد الغزالی، فخر الدین رازی وغیرہ کے طریقۂ جائے استدلال کی خامیاں بتائی ہیں، ان لوگوں نے وجودِ باری کو ترکیبِ اجسام، واجب الوجود اور ممکن الوجود کے عقلی استدلال سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ امام موصوف نے بتایا کہ ان کے طریقہ ہائے استدلال یقین بہم نہیں پہنچا سکتے، ان کے مقابلہ میں قرآن مجید بہتر عقلی استدلال پیش کرتا ہے جو زیادہ مؤثر اور کلی طور پر ایقان بخش ہے۔ [3] انہوں نے جابجا امام غزالی اور امام رازی کی بے جا تاویلوں پر جرح کی ہے، جو

---

[1] درء تعارض العقل والنقل: ۱/ ۸۲۔ [2] ایضًا، ص: ۷۸۔
[3] ایضًا، ص: ۱۴، ۱۶، ۱۱۴۔

انہوں نے قرآنِ مجید کی بعض آیتوں کی تفسیر میں اختیار کی ہیں۔ [1]

ایک غلط نقطۂ خیال کی تردید

شیخ ابوعلی بن سینا اور بعض فلاسفہ و متکلمین کا یہ خیال تھا کہ قرآن مجید اور حدیثِ نبوی میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے متعلق جو ارشادات آئے ہیں ان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں ان میں عوام کی سمجھ کے مطابق گفتگو کی گئی ہے، چونکہ عوام خدا کو آسمان پر مقیم سمجھ رہے تھے اور اس کے متعلق عام انسانی تصورات رکھتے تھے اس لیے انہی کے خیال کے مطابق ان سے گفتگو کی گئی ہے ورنہ حقیقت تو وہ ہے جس کو آگے چل کر ان فلاسفہ و متکلمین نے واضح کیا ہے، اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء نے اور خاص کر آنحضرت ﷺ نے عمداً اور جان بوجھ کر عوام کو غلط فہمی میں رکھا، امام ابن تیمیہ نے اس غلط نقطۂ خیال کی سخت تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ درحقیقت یہ انبیاء کی کلی تبلیغ رسالت پر ایک بدنما الزام لگانا ہے جس کی جسارت کوئی معقول اور سلیم الطبع مسلمان نہیں کرسکتا۔

اصولِ دین کیا ہیں؟

امام ابن تیمیہ کے زمانے میں علما کا یہ عام تصور ہو گیا تھا کہ متکلمین اسلام کی طرف سے عقائد کے متعلق جو عقلی بحثیں کی جارہی ہیں وہی اہم اصول دین ہیں اسی بنا پر امام رازی نے اپنی کتاب کا نام الاربعین فی اصول الدین رکھا تھا جس میں توحید، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور دیگر ارکان اسلام پر بحث کرنے کی بجائے فلسفیانہ اور کلامی و منطقی بحثیں کی ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے اس غلط تصور کی بھی سختی کے ساتھ تردید کی ہے اور اپنی مختلف کتابوں اور خاص کر کتاب الایمان اور کتاب النبوات میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ دین کے اہم اصول مسائل وہی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اور آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات میں امتِ مسلمہ کے سامنے پیش کیا اور جن پر اسے عمل کرنے کی دعوت دی، انہی اصولی مسائل کے قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے میں امت مسلمہ کی نجات منحصر رکھی گئی ہے۔ متکلمین کے یہ دوسرے تمام عقلی استدلالات محض ڈھکوسلے ہیں جن کی شریعت کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اور جو

---

[1] ایضًا، ص: ۵۸، ۱۹۱، ۱۹۴، ۱۹۵۔

ہمارے اطمینان قلب کا کوئی سامان مہیا نہیں کر سکتے۔

یونانی فلاسفہ کے بعض اصول کی تردید

یونانیوں نے محض اپنی ذہانت اور چالاکی کے زور سے اپنی الٰہیات یعنی اپنی بت پرستی و کواکب پرستی کو بھی ایک مرتب و مدلل فلسفہ بنا کر چھوڑ دیا تھا، ان کے نزدیک مسلمانوں کے خدائے مطلق و مختار کا کوئی تصور نہیں تھا۔ کائنات کے نظم و تدبیر میں دوسروں کا بھی دخل رکھا اور ہر ایک قوت کا الگ خدا بنایا، انہوں نے عقول عشرہ، نفوس اور افلاک کی اصطلاحات میں ان کو کھپانے کی کوشش کی۔ ان کا ایک اصول یہ تھا کہ اَلْوَاحِدُ لَا یَصْدُرُ عَنْهُ اِلَّا الْوَاحِدُ ایک سے ایک ہی چیز پیدا ہو سکتی ہے، اس اصول کے تحت خدا ایک علت العلل یعنی تمام اسباب کا ایک سبب ٹھہرا اور اس نے عقل اول کو پیدا کیا جس نے عقل دوم اور فلکِ اول کو پیدا کیا، اس طرح دس عقول اور نو افلاک بنائے گئے، اور ان کے وجود اور صحت پر دلیلیں قائم کی گئیں، جب ان یونانیوں کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں تو یہ اصطلاحیں بھی اسلامی فلسفہ کا جز بن گئیں بعض مسلمان فلاسفہ نے یونانی الٰہیات کو کھینچ تان کر قرآن و حدیث کے ارشادات پر منطبق کرنا شروع کیا، قرآنِ مجید میں کئی جگہ سات آسمانوں کا ذکر ہے، انہوں نے عرش و کرسی کو ملا کر نو کی تعداد پوری کر لی، اسی طرح عقلِ اول کی پیدائش پر اس موضوع حدیث سے استدلال کرنا شروع کیا۔

((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ))

''پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ عقل ہے۔''

امام ابن تیمیہ نے ان اصول پر مختلف جگہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے، تیسری صدی ہجری میں اس طرح کی روایتیں گھڑی گئیں، داؤد بن المحبر نے کتاب العقل لکھی جس میں اس قسم کی موضوع اور جھوٹی حدیثیں جمع کیں جن سے عقل کی فضیلت ثابت ہوتی تھی، اس کے بعد ابو الحسن تمیمی نے اس نام سے ایک کتاب لکھی۔ [1]

قرآن مجید میں ہر جگہ ملائکہ یعنی فرشتوں کا ذکر ہے، بعض مسلمان فلاسفہ نے یہ تعبیر کی کہ

---

[1] کتاب السبعينية، ص: ۲۹، ۳۳۔

یہ فرشتے درحقیقت وہی ہیں جن کو یونانیوں نے نفوس سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ ان دونوں اصطلاحوں کے معانی ومقاصد میں زمین آسمان کا فرق موجود ہے۔

منطقیین کی تردید

امام ابن تیمیہ کے زمانے میں منطق کے اصول مسلمہ مانے جا رہے تھے، اس فن کی غرض وغایت ہی یہ تھی کہ انسان کو فکر کی غلطی سے بچایا جائے، یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں تمام علومِ متداولہ میں منطق کا کلی دخل ہو گیا تھا، یہاں تک کہ طب میں بھی جس میں زیادہ تر تجربات اور مشاہدات سے واسطہ تھا، منطقی اصول کی بحث ہوتی تھی، امام ابن تیمیہ نے منطق اور منطقیین کی تردید میں ایک ضخیم کتاب ہی لکھ ڈالی، انہوں نے دیباچہ میں صاف طور پر لکھا کہ ایک ذہین آدمی کو منطق کی ضرورت نہیں ہے اور ایک کند ذہن اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس کے تمام مقدمات واستدلالات غلطیوں سے خالی نہیں ہیں، انہوں نے نوبختی کی کتاب الآراء والدیانات کے حوالے سے بتایا ہے کہ فلاسفہ خود آپس میں کتنا اختلاف رکھتے ہیں، اور منطق کی تردید میں نوبختی کی تحریریں نقل کی ہیں۔ [1]

مشہور ماہرِ فن خونجی کا اعتراف جہل خود اسی کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ [2]

احتسابِ عقائد اور اصلاح

آج آزادیٔ رائے کا زمانہ ہے اس لیے اس قسم کی بحثوں کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جا رہی ہے، مگر امام ابن تیمیہ کے زمانے میں اس قسم کے مسائل بہت زیادہ اہمیت رکھتے تھے، انہی پر کفر اور ایمان کا دارومدار ہو گیا تھا، اگر کسی نے مسلمہ مسلک کے خلاف آواز اٹھائی، تو اس کو احتساب کے شکنجہ میں کس دیا جاتا تھا اور بسا اوقات اس کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ ہر ایک کی زبان وقلم پر سخت ترین پابندی عائد تھی، کوئی ان مسائل میں دوسروں سے اُلجھنے کی اس وقت تک ہمت نہیں کر سکتا تھا، جب تک کہ اس میں زوردار مقابلہ کرنے کی طاقت نہ ہو، علم وعمل اور تقریر وتحریر کے لحاظ سے امامِ موصوف کا کوئی مدِ مقابل نہیں تھا، اس لیے اُن کو اس سخت ترین جنگ میں کامیابی حاصل ہوئی، اگر کوئی دوسرا ہوتا تو اتنے زبردست گروہ کے

---

[1] كتاب الرد على المنطقيين، ص: ٣٣١ تا ٣٣٧۔ [2] ايضًا، ص: ١١٤، ٢٤٩۔

سامنے اپنی سپر ڈال دیتا۔

اس سوال پر ہمیں ایک دوسری حیثیت سے بھی غور کرنا چاہیے، مسلمان عام طور پر قرآن وحدیث کو بھول چکے تھے، انہیں یا تو جامد فقہ سے دلچسپی تھی یا فلسفہ وکلام اور منطق ان کی بحثوں کا موضوع بنے ہوئے تھے، وہ ہر ایک مسئلے کو انہی علوم معقولات کے اصول سے جانچنے لگے تھے، گویا عقلیت پسندی کا روگ مسلمانوں کے رگ و ریشے میں سرایت کر گیا تھا، قرآن و حدیث کے کھلے نصوص پر کوئی غور نہیں کر رہا تھا، ایسی حالت میں امام ابن تیمیہ نے انہیں براہِ راست قرآن وحدیث پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی اور علوم کی فوقیت و برتری ختم ہوگئی اور اُن کی جگہ شرعی علوم کی اہمیت دن بدن بڑھنے لگی، انہی کے بعد سے لوگ قرآن وحدیث کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگے۔

ہنگامۂ دیگر

عقائد کی جنگ کو ختم ہوئے ابھی کچھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک اور زبردست ہنگامہ کھڑا ہوا جس کی وجہ سے امام ابن تیمیہ کو پھر قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں، یہ ہنگامہ کیا تھا؟ یہ صوفیوں کی سورش اور مخالفت تھی، جس نے عقائد کی جنگ سے بھی زیادہ فتنہ وفساد پیدا کیا، پہلا مقابلہ قاضیوں اور عالموں سے تھا تو یہ دوسرا مقابلہ کور باطن نام نہاد صوفیوں اور عامی آدمیوں سے پیش آیا جو مار پیٹ اور قتل وخونریزی کے لیے بھی آمادہ تھے، لیکن جب امامِ موصوف نے پوری ہمت اور استقلال سے کام لیا، تو یہ زبردست ہنگامہ بھی آن کی آن میں فرو ہوگیا، اس کی تفصیل ایک مستقل عنوان کے تحت پیش کی جاتی ہے۔

صوفیہ پر تنقید

صوفیہ اور ان کے بعض مسائل پر سخت تنقید کی وجہ سے جو ہنگامہ برپا ہوا اس کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ اور تصوف کی اجمالی تاریخ پیش کی جائے، تاکہ اس کی روشنی میں اس بات کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے کہ امام ابن تیمیہ اور ان کے ساتھیوں اور شاگردوں نے شیخ اکبر شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ عمر بن الفارض، شیخ علی الحریری، شیخ نجم الدین ابن اسرائیلی، شیخ عبدالحق ابن سبعین، شیخ صدر الدین محمد بن اسحاق قونوی، شیخ عفیف الدین تلمسانی، شیخ عبدالکریم آملی، شیخ احمد ابن عطاء اللہ الاسکندرانی وغیرہ نے جو زبردست قلمی اور لسانی جہاد شروع کیا تھا اس میں وہ کہاں تک حق بجانب تھے۔

تصوف کی ابتدا

تصوف دوسری صدی ہجری کی پیداوار ہے۔[1] اس سے پہلے صوفی قسم کے لوگوں کو عابد وزاہد کہا جاتا تھا، جب یہ اصطلاح وجود میں آئی تو پہلی صدی ہجری کے اُن لوگوں کو بھی صوفی کہا جانے لگا جو عبادت وزہد میں مشہور تھے۔

صوفی کی وجہ تسمیہ

صوفی کی وجہ تسمیہ کے متعلق عموماً پانچ وجہیں بیان کی جاتی ہیں:

(۱) صوفہ کی طرف منسوب ہے، جو زمانۂ جاہلیت کے ایک شخص غوث بن مر کا لقب تھا، اور جو شب وروز خدا کی عبادت میں لگا رہتا تھا، اس کی اولاد اس لقب سے منسوب ہو کر صوفی کہلائی، شیخ شمس الدین ابو الفرج عبدالرحمٰن ابن الجوزی نے اپنی مشہور کتاب تلبیس ابلیس میں یہی وجہ تسمیہ بتائی ہے، ممکن ہے کہ غوث ابن مر کی اولاد اس لقب سے منسوب ہو کر صوفی کہلائی ہو، مگر پہلی صدی ہجری میں گروہِ صوفیہ کا نام صوفی کہیں نظر نہیں آتا۔

---

[1] مجموعة الرسائل والمسائل: ١/ ٢٢٠۔

(۲) صوفی اہل صُفّہ کی طرف منسوب ہیں، صفہ عربی میں چبوترے کو کہتے ہیں، اہل صفہ سے وہ بے یار و مددگار صحابی مراد ہوتے تھے جو مسجد نبوی سے ملحق چبوترے پر زندگی بسر کرتے تھے، اور محنت مزدوری کر کے یا لوگوں کی امداد اعانت پر اپنا پیٹ پالتے تھے، اور آنحضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے، قرآنِ مجید میں اُن کو فقراء سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ صوفی کے نام سے مشہور نہ تھے، بہت دنوں تک اُن کی غربت کی یہ حالت نہیں رہی، جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا، اور مختلف جگہوں سے خراج آنے لگا تو ان لوگوں نے گرہستی کی زندگی اختیار کر لی، اگر صوفی صفہ کی طرف منسوب ہو تو لغوی اشتقاق کی حیثیت سے صفی ہونا چاہیے صوفی نہیں ہو سکتا تھا۔

(۳) لفظ صوفی یونانی لفظ سوفیا سے لیا گیا ہے جس کے معنی محب حکمت کے ہوتے ہیں صوفی اور یونانی لفظ سوفیا میں لفظی تشابہ تو ضرور ہے، لیکن ان کے معنی ایک نہیں ہیں، یونانی لفظ سوفیا سے روحانی حکیم اور صوفیہ مراد نہیں تھے، بلکہ وہ حکماء مراد ہوتے تھے جنہیں علم طبیعیات کے فن میں کامل مہارت ہوتی تھی، چنانچہ قفطی نے تاریخ الحکماء کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں اسی قسم کے طبیعی حکیموں کا ذکر کیا ہے۔

(۴) لفظ صوفی صفا سے مشتق ہے، یعنی ایسا شخص جو صفائی نیک نیتی صاف باطنی اور پاکیزگی کا حامل ہو، مشہور شاعر ابو الفتح علی بن محمد البستی (المتوفی: ۳۶۳ھ) نے صوفی کی وجہ تسمیہ یہی بیان کی ہے وہ کہتا ہے:

تنازع الناس فی الصوفی واختلفوا
فیه وظنوه مشتقا من الصوف

لوگوں نے صوفی کے بارے میں جھگڑا اور اختلاف کیا ہے، اور یہ سمجھا ہے کہ وہ صوف سے مشتق ہے۔

ولست انحل هذا الاسم غیر فتی
صافی فصوفی حتی لقب الصوفی

اور میں اس لقب کو اس شخص کے سوا جس نے صفائی اور پاکیزگی پیدا کی ہو اور پاک ہو گیا ہو یہاں تک کہ اس کا لقب صوفی ہو گیا ہو، کسی اور کے ساتھ منسوب نہیں کرتا۔

مشہور شاعر ابو العلاء المعری (المتوفی: ۴۴۹ھ) نے اس نقطۂ خیال کی تردید کی ہے اور طعن کے طور پر اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے: [1]

صوفية ما رضوا للصوف نسبتهم
حتى ادعوا انهم من طاعة صوفو

صوفیہ صوف کی طرف اپنی نسبت دینے پر راضی نہیں ہیں، یہاں تک کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اطاعت و بندگی کی بدولت پاک صاف ہو کر صوفی کہلائے ہیں۔

(۵) صوفی لفظ صوف کی طرف منسوب ہے، جس کے معنی عربی میں موٹے دھاتے اونی کپڑے کو کہتے ہیں، چونکہ زاہدوں اور صوفیوں نے پرانے مسیحی راہبوں کی طرح صوف کے موٹے اونی کپڑے کو اپنا جماعتی لباس اور شعار قرار دے لیا تھا، اس لیے وہ اس بنا پر صوفی کہلائے، اسی سے لفظ تصوف بنا جو عربی میں مصدر کے معنی دیتا ہے، یعنی صوف کا کپڑا پہننا، جیسے تَقَمَّصَ قمیص پہننا، آگے چل کر تصوف اس علم کا نام ہو گیا جس میں قلب و نظر، دل و دماغ، نفس و روح کے تزکیے اور افعال و اعمال کی اصلاح کے اصول و شرائط سے بحث کی جاتی ہے۔

پہلا صوفی

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا وہ السید ابو ہاشم محمد بن احمد الصوفی تھا۔ جس کا انتقال ۱۵۰ھ میں ہوا تھا۔ [2]

---

[1] کتاب اللزومیات: ۲/ ۱۰۵۔
[2] نفحات الانس تذکرۂ ابو ہاشم۔

زہاد و عباد

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں متقشفانہ اور متصوفانہ زندگی بسر کرنے والوں کو زاہد و عابد کہا جاتا تھا، جیسے امام حسن بصری (المتوفی: ۱۱۰ھ)، حبیب الاعجمی (المتوفی: ۱۲۱ھ)، ابراہیم بن الادہم (المتوفی: ۱۶۲ھ)، شعوانۃ العابدۃ الزاہدۃ (المتوفیہ: ۱۷۵ھ)، عفیرۃ العابدۃ (المتوفیہ: ۱۸۰ھ)، رابعۃ العدویۃ (المتوفیہ ۱۸۵ھ)، فضیل بن عیاض (المتوفی: ۱۸۷ھ)، معروف الکرخی (المتوفی: ۲۰۶ھ)، سیدہ نفیسۃ (المتوفیہ: ۲۰۸ھ)، بشر الحافی الزاہد (المتوفی: ۲۱۷ھ) وغیرہ، مگر جب آگے چل کر صوفی کی اصطلاح مستعمل ہونے لگی تو ہر غیر معمولی زاہد و عابد کو بھی صوفی کہا جانے لگا، چنانچہ اسی بنا پر حافظ ابونعیم الاصفہانی (المتوفی: ۴۳۰ھ) نے حلیۃ الاولیاء کے نام سے دس جلدوں میں جو کتاب لکھی ہے اس میں خلفائے اربعہ اور بہت سے زاہد و عابد صحابہ و تابعین کو بھی گروہ صوفیہ و اولیاء میں شمار کرلیا ہے۔

حارث بن اسد محاسبی

پہلا شخص جس نے فقر و فاقہ اور وساوس و خطرات پر بحث کی اور تصوف کو ایک علمی شکل عطا کی وہ حارث ابن اسد محاسبی تھے، اُن کی نشوونما نہایت ہی عفت و ریاضت اور سخت ترین مجاہدات پر ہوئی تھی، وہ مال اور مالداروں کے سخت مخالف تھے اور اپنے وعظ میں اُن کی مذمت بیان کرتے تھے، خوش حالی اور فارغ البالی کے باوجود عمر بھر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی، اپنے والد کی متروکہ جائیداد کے لینے سے محض اس بنا پر انکار کردیا کہ وہ رافضی تھے اور تقدیر کے قائل نہیں تھے۔

حارث بن اسد محاسبی رحمہ اللہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے شیخ تھے، کھانے پینے میں بہت زیادہ احتیاط برتتے تھے انہیں ہمیشہ اس کا خوف لگا رہتا تھا کہ کوئی ناجائز چیز ان کے پیٹ میں چلی نہ جائے، وہ ہر وقت اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہتے تھے اسی لیے اُن کا لقب ''محاسبی'' ہوگیا تھا، کہا جاتا ہے کہ علم کلام کے بعض مسائل پر گفتگو کرنے کی وجہ سے حضرت امام احمد بن حنبل نے ان سے ملنا جلنا بند کردیا تھا، حارث نے ۲۴۳ھ میں وفات پائی۔

ابو عبداللہ الحکیم الترمذی

اسی زمانے میں ایک صاحب ابو عبداللہ الحکیم الترمذی تھے جنہوں نے ختم الولایۃ کے نام سے ایک کتاب لکھی اور انبیاء و اولیاء کے سلسلہ میں سے ہر ایک کا ایک خاتم قرار دیا۔ شیخ اکبر شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی فتوحاتِ مکیہ میں جا بجا ان کا حوالہ دیا ہے اور انہی کے خیالات سے متاثر ہو کر یہ نقطۂ نظر پیش کیا کہ ولایت نبوت اور رسالت سے افضل ہے، اور یہی مسئلہ آگے چل کر اس صورت میں نمودار ہوا کہ خاتم الاولیاء خاتم الانبیاء سے افضل ہے۔

ابو عبداللہ الحکیم کا اصلی نام محمد تھا، وہ علی بن حسن بن بشیر کے صاحبزادے تھے، خراسان اور عراق کے مختلف علما سے حدیث پڑھی تھی، نیسابور میں ۲۸۵ھ میں درس دیا تھا، انہوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں، جیسے کتاب غرس الموحدین، کتاب عود الامور، کتاب المناہی، کتاب شرح الصلوٰۃ اور کتاب ختم الولایۃ وغیرہ، جب انہوں نے ختم الولایۃ لکھی اور علم تصوف کے بعض مسائل پر اپنا خاص نقطۂ نظر پیش کیا تو علمائے وقت نے اُن کے خلاف بڑی شورش کی، اور اُن پر کفر کا فتویٰ صادر کیا، آخر انہیں ترمذ سے جلاوطن ہو کر بلخ میں پناہ لینی پڑی، اسی سال کی عمر پائی تھی اُن کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

تصوف کی تدریجی ترقی

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں کئی ایسے بزرگ پیدا ہوئے جنہوں نے توحید الٰہی معرفت نفس، فقر و فاقہ، توکل، صبر و رضا، اخلاص و استقامت، ترکِ دنیا وغیرہ جیسے خاص خاص مسائل پر اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا، اور بعض نے چھوٹے بڑے رسائل لکھے، اُن کے یہی ملفوظات آگے چل کر علمِ تصوف کے بنیادی مسائل قرار پائے، ان بزرگوں میں سے چند قابل ذکر نام یہ ہیں، حضرت ذوالنون مصری (المتوفی: ۲۴۵ھ)، حضرت سری سقطی بغدادی (المتوفی: ۲۵۹ھ)، حضرت جنید بغدادی (المتوفی: ۲۹۸ھ)، حضرت بایزید بسطامی (المتوفی: ۲۶۱ھ)، حضرت حمدون القصار (المتوفی: ۲۷۱ھ)، حضرت سہل بن عبداللہ التستری (المتوفی: ۲۸۳ھ)، حضرت ابو سید الخراز (المتوفی: ۲۸۶ھ)، حضرت ابوبکر محمد بن عبداللہ الدقاق (المتوفی: ۲۹۰ھ)، حضرت ابو الحسین نوری (المتوفی: ۲۹۵ھ)، حضرت

ابوعمرو بن عثمان مکی (المتوفی: ۲۹۷ھ)، حضرت ابوعلی الثقفی (المتوفی: ۳۲۸ھ)، حضرت ابوبکر الشبلی (المتوفی: ۳۳۴ھ) وغیرہ۔

اُن بزرگوں کے متعلق اگرچہ بہت سے عجیب وغریب حالات اور واقعات بیان کیے جاتے ہیں تاہم اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک نہایت ہی صالح اور کتاب وسنت کے پابند تھے اور دوسروں کو بھی کتاب وسنت کی پابندی کی تلقین کرتے تھے، یہ سب اکل حلال، صلح کل اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی پر بہت زور دیا کرتے تھے اور تکبر وغرور کرنے والوں سے ہمیشہ بچتے تھے، اُن کی نظروں کے سامنے ہمیشہ کتاب و سنت کی روشن تعلیمات رہتی تھیں اور انہی سے وہ اپنے لیے روشنی حاصل کیا کرتے تھے، ان کی تربیت کا ایک خاص طریقہ تھا جو بھی ان کی صحبت میں پہنچ جاتا تھا اس کی فطرت کو وہ ہمیشہ کے لیے صالح بنا دینے کی کوشش کرتے تھے، علمائے ظاہر کے طریقۂ اصلاح سے الگ ان کا طریقۂ اصلاح ہوتا تھا، وہ سماع اور وجد کی عام محفلوں سے بالکل ہی اجتناب کرتے تھے، اگر کوئی ایسی محفل ہوتی تو صرف اس میں اہلِ ذوق کو شریک ہونے کی اجازت ہوتی تھی، جنہیں جائز وناجائز حرکات کے درمیان تمیز کرنے کا پورا احساس رہتا تھا، اُن کی تعلیمات کے خلاف عام محدثین اور علمائے ظاہر کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا، امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم نے جابجا ان کی تعریف کی ہے، اور اُن کو سادات مومنین اور خیار مسلمین میں شمار کیا ہے۔ [1]

تصوف میں فلسفیانہ الجھاؤ

علمِ تصوف کی بنیاد جب تک قرآنِ مجید اور سنت رسول کے کھلے نصوص پر رہی، اس کے عام مسائل میں علمائے کرام کو اربابِ تصوف سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں رہا، لیکن جب تصوف پر کلام ومنطق اور فلسفہ کا اثر پڑتا گیا اور نئے نئے نظریے پیدا ہوتے گئے جو قرآن و حدیث کے کھلے نصوص کے بالکل برخلاف تھے تو علما نے بھی ان نئے مسائل کی مخالفت شروع کردی۔

---

[1] العقیدۃ الاصفھانیہ، ص: ۱۱۲؛ مجموعۃ الرسائل الکبریٰ: ۲/ ۲۹۶؛ مدارج السالکین: ۲/ ۲۲۷۔

خالق اور مخلوق اور معبود اور عابد کے درمیان جو کھلا ہوا رشتہ ہے اس کو تو سب جانتے ہیں، لیکن کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ مخلوق اور عابد روحانی ترقی کے مختلف مدارج طے کر کے خالق اور معبود کے درجے پر پہنچ جائے یا اس کی ذات سے واصل ہو جائے؟ اسلام سے پہلے اکثر قومیں اسی لیے گمراہ ہوئیں کہ انہوں نے بعض انسانوں کو خدا کا درجہ دے دیا تھا، قرآن مجید نے اس تصور کی سختی کے ساتھ مخالفت کی، آنحضرت ﷺ نے صاف طور پر بتایا کہ کوئی انسان چاہے وہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے، ہرگز ہرگز خدا نہیں بن سکتا، لیکن کسی بزرگ و برتر انسان سے انتہائی حسنِ عقیدت کبھی کبھی لوگوں کو یہ سمجھنے کی دعوت دیتی رہتی ہے کہ اگر متقی اور پرہیزگار انسان خدا نہیں تو بھی کم از کم خدا کا مظہر اور پرتو ضرور ہیں، غالی شیعوں نے اسی انتہائی عقیدت کی بنا پر حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین رضی اللہ عنہم اور اُن کی بعض اولاد کو خدا کا مظہر اور پرتو مانا، اور جب اس تصور کو اور زیادہ ترقی ہوئی تو حلول اور اتحاد کا عقیدہ بھی پیدا ہو گیا۔

اسلام سے پہلے جس کسی نے بھی اُلوہیت اور ربوبیت کا دعویٰ کیا، اس کو بدترین کافر قرار دیا گیا، ان کو کافر کہنے میں ہمیں کوئی تذبذب نہیں ہوتا محض اس لیے کہ وہ کافر مشہور تھے اور قرآن و حدیث میں ایسے لوگوں کو صاف الفاظ میں کافر بتایا گیا، مگر جب ایک ایسے شخص کی زبان سے جو نہ صرف اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، بلکہ وہ عابد و زاہد بھی ہے، اس قسم کے کلمے صادر ہوتے ہیں تو عقیدت اس کے متعلق صاف الفاظ میں کچھ کہنے سے ہمیں روک دیتی ہے۔

حسین بن منصور الحلاج

یہی وجہ ہے کہ مختلف کلمات کفریہ کہنے کے باوجود حسین بن منصور الحلاج کے متعلق مسلمانوں کا کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہو سکا، بعض اُن کو گمراہ اور کافر قرار دیتے ہیں اور بعض اُن کو خدارسیدہ اور بڑا ولی سمجھتے ہیں، ان کی زندگی کے حالات پر عقیدت اور تعصب کے اتنے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ آج اُن کے اصلی حالات کا پتہ چلانا بہت مشکل ہے، خود صوفیہ کی تصنیفات میں اُن کے بہت سے کفریہ اقوال منقول ہیں جن کی تاویل کی جاتی ہے، حلاج کے بیسوں اشعار ایسے ہیں جن سے اتحاد اور حلول کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے جیسے:

سبحان من اظهرنا سرته سر سنا لاهوته الثاقب

پاک ہے وہ جس نے اپنے ناسوت کو اپنے چمکدار لاہوت کا روشن بھید بنا کر ظاہر کیا۔

ثم بدا مستترا ظاهرا فی صورة الأكل والشارب

پھر وہ کھانے والے اور پینے والے شخص کی صورت میں چھپا کھلا ظاہر ہوا۔

حتی لقد عاينه خلقه كلحظة الحاجب بالحاجب

یہاں تک کہ اس کی مخلوق نے اس کو صاف طور پر دیکھ لیا جیسا کہ ایک کوری نگاہ والا دوسرے کوری نگاہ والے کو دیکھ لیتا ہے۔

حلاج کا یہ شعر ہے:

بینی و بینك انی تزاحمنی فارفع بحقك انی من البين

میرے اور تیرے درمیان انانیت ہے جو مجھ سے مزاحم ہوتی ہے، پس اپنے حق کے طفیل سے ہمارے درمیان سے اس انانیت کو اٹھا دے۔

انہی کا یہ شعر بھی ہے:

عقد الخلائق فی الاله عقائدا وانا اعتقدت جميع ما اعتقدوه

لوگ خدا کے بارے میں بہت سے عقائد رکھتے ہیں اور میں اُن تمام کے عقائد پر اپنا عقیدہ رکھتا ہوں۔

خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ دینور میں ایک شخص پکڑا گیا جس کے ساتھ ایک توبرا تھا، اس کو وہ کبھی اپنے سے الگ نہیں کرتا تھا، جب اس توبرے کی تلاشی لی گئی تو اُس میں سے ایک خط برآمد ہوا، جس میں ''من الرحمٰن الرحیم الیٰ فلان بن فلان'' تھا، خط فوراً بغداد روانہ کیا گیا، قاضی کے سامنے حلاج کو پیش کیا گیا، انہوں نے اعتراف کیا کہ یہ خط انہی کا لکھا ہوا ہے، قاضی نے پوچھا: اتنے دن تک تو تم نبوت کا دعویٰ کرتے تھے اب ربوبیت کا بھی دعویٰ کرنے لگے ہو حلاج نے جواب دیا میں ربوبیت کا دعویٰ نہیں کرتا، لیکن یہ ہمارے

نزدیک عین الجمع ہے، کیا کاتب اللہ کے سوائے کوئی اور ہو سکتا ہے، میں اور میرا ہاتھ تو صرف ایک آلہ ہے۔ [1]

شیخ محی الدین ابن عربی نے حلاج کا ایک خط نقل کیا ہے جس کو انہوں نے اپنے ایک شاگرد کے نام لکھا تھا، اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''اے میرے لڑکے تجھ پر سلامتی ہو! خدا تجھ سے ظاہری شریعت کو چھپائے اور تجھ پر کفر کی حقیقت کھولے، کیونکہ شریعت کا ظاہر شرک خفی ہے، اور کفر کی حقیقت معرفتِ جلیہ ہے۔ امابعد یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ جس کسی کو چاہتا ہے ایک سوئی کے ناکے کے اندر سے اپنی تجلی دکھا دیتا ہے اور جس کسی سے چاہتا ہے تمام آسمانوں اور زمین سے اوجھل اور مستور ہو جاتا ہے، اس نے گواہی دی کہ وہ نہیں ہے اور اُس چیز نے گواہی دی کہ وہ اللہ کا غیر ہے، پس اس کے اثبات اور اُس کی نفی پر گواہی دینے والا دونوں مذموم ہیں، اس خط سے مقصود تم کو یہ وصیت کرنی ہے کہ اللہ سے دھوکا مت کھانا اور اس سے نا اُمید مت ہو جانا اور نہ اُس کی محبت کی طرف رغبت کرنا اور نہ اس بات پر راضی ہو جانا کہ تم اُس سے محبت کرنے والے کے سوا کچھ اور بنو، نہ تو تم اس کے اثبات کے قائل بنو اور نہ اس کی نفی کے، تم توحید سے بچتے رہو۔ والسلام''

پھر اس کے بعد حلاج کا یہ شعر لکھا ہے:

كفرت بدين الله والكفر واجب
لدى و عند المسلمين قبيح

میں نے اللہ کے دین کا انکار کیا اور میرے نزدیک کفر واجب ہے، اور مسلمانوں کے نزدیک وہ برا ہے۔ [2]

شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی فتوحاتِ مکیہ [3] میں لکھا ہے کہ جب مشہور بزرگ شیخ ابوعمرو بن عثمان مکی حلاج کے سامنے سے گزرے تو پوچھا کیا لکھ رہے ہو؟ حلاج نے جواب دیا: قرآن کا جواب لکھ رہا ہوں۔ یہ سن کر ابوعمرو بن عثمان مکی نے بد دعا کی اور اُنہی کی بد دعا کا

---

[1] تاریخ بغداد: ۸/ ۱۲۷۔ [2] رسائل ابن عربی مطبوعہ حیدر آباد جزء اول، رسالہ امام رازی، ص: ۱۳۔ [3] فتوحاتِ مکیہ: ۳/ ۱۷۔ ۴۰۔

نتیجہ تھا کہ حلاج قتل کر دیا گیا۔

حلاج نے سکر کی حالت میں نہیں بلکہ جان بوجھ کر اور صحو کی حالت میں انا الحق کا دعویٰ کیا، جب عدالت کی طرف سے پوچھ گچھ شروع ہوئی، تو اُس کی وضاحت کرنے کی بجائے اصطلاحات کے پردوں میں گفتگو شروع کر دی، بعض نے اُن کے اُس دعوے کی صحت پر یوں استدلال کیا ہے

روا باشد انا الحق از درختے
چرا نبود روا از نیک بختے

ایک درخت سے انا الحق کی آواز درست ہے تو ایک نیک بخت کی طرف سے یہ آواز کیوں درست نہیں ہو سکتی۔

اس شعر میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے ایک درخت سے انی انا رب العالمین کی آواز سنی، اور جب ایک درخت سے یہ آواز ٹھیک تھی، تو حلاج کے منہ سے انا الحق کی آواز کیوں درست نہیں ہو سکتی، لیکن یہ استدلال اسی وقت ٹھیک ہو سکتا ہے، جب کہ اس آواز کو درخت کی آواز قرار دیا جائے، یہ آواز خدا کی تھی اور درخت کے اوٹ سے آئی تھی، وہاں حضرت موسیٰ مخاطب کی حیثیت سے موجود تھے، اور وہ ندا رب کی طرف سے تھی، حلاج کے منہ سے جو آواز برآمد ہوئی اس میں ندا کرنے والے کا ذکر نہیں ہے، وہ تو انسان کی آواز تھی، اگر اس کو بھی خدا کی آواز قرار دیا جائے تو یہ خصوصیت حلاج ہی کے ساتھ کیوں ہو، کیوں نہ تمام انسانوں اور حیوانوں کی آواز کو خدا کی آواز قرار دیا جائے، اور یہ بداہتہً غلط ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب حلاج نے اس قسم کے کفریہ خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا تو عباسی خلیفہ بغداد المقتدر باللہ نے ان کو اپنے وزیر حامد بن العباس کے حوالے کر دیا اور جب انہوں نے توبہ نہیں کی تو علمائے وقت کے متفقہ فیصلہ کے مطابق ۲۴ ذوالقعدہ ۳۰۹ھ کو انہیں بغداد میں قتل کروا دیا۔

حلاج کے خیالات پر باطنیت کے اثرات نمایاں ہیں اور یوں بھی تصوف عام طور پر شیعیت سے متاثر ہے، اس پر تفصیلی طور پر بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے ہمیں تو یہ دکھانا

مقصود ہے کہ حلاج کے متعلق امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کا کیا خیال تھا، انہوں نے جا بجا صاف طور پر یہی لکھا ہے کہ حلاج کافر تھا اور اُس کے متعلق علما کا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا، چنانچہ امام ابن تیمیہ ایک جگہ اُس کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حلاج کے متعلق دو گروہ ہو گئے ہیں، ایک یہ کہتا ہے کہ حلاج فنا میں ڈوب گیا تھا اس لیے وہ باطنی حیثیت سے معذور تھا، مگر ظاہری طور پر اس کا قتل واجب تھا، اور اس کا یہ قتل شہادت کا درجہ رکھتا ہے، دوسرا یہ کہتا ہے کہ وہ توحید ربوبیت میں فنا ہو گیا تھا اور وہ بہت بڑا محقق اور موحد تھا۔''

پھر کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''یہ دونوں گروہ اس بارے میں اختلاف کرتے ہیں کہ آیا حلاج مظلوم مقتول ہوا، یا اُس کا قتل کرنا جائز تھا، اس قسم کے لوگ شریعت اور اہل شریعت پر اُس کے قتل کا الزام دھرتے ہیں، مگر یہ نہیں جانتے کہ شریعت کیا ہے۔''

پھر شریعت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حلاج اپنے کفر کی وجہ سے قتل کیا گیا، وہ قرآن کا معارضہ کیا کرتا تھا، اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر کسی کا حج فوت ہو جائے تو وہ اپنے ہاں کعبہ بنا کر اس کا طواف کر سکتا ہے اور حج کے تمام رسوم ادا کر سکتا ہے اور حج پر جتنی رقم خرچ ہو سکتی ہو اس کو صدقہ دے سکتا ہے۔''

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

''بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حلاج سرِّ توحید کے طشت از بام کرنے کی وجہ سے قتل کیا گیا اور اس کے ثبوت میں یہ شعر پیش کرتے ہیں:

من باح بالسر كان القتل شميته
بين الرجال ولم يوخذ له ثار

جو شخص راز فاش کر دے، اس کا نتیجہ علی الاعلان قتل ہے جس کا بدلہ نہیں لیا جا سکتا۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

''جنید، عمرو بن عثمان مکی اور ابو یعقوب نہر جوری جیسے جلیل القدر مشائخ نے حلاج کی مذمت کی ہے، وہی شخص حلاج کی حقیقت سے واقف نہیں ہوسکتا جو اُس کے اصلی حالات سے آگاہ نہیں ہے۔ 1

نئی نئی اصطلاحات

جب فن تصوف کو وسعت اور ہمہ گیری حاصل ہوتی گئی اور اس موضوع پر مختلف کتابیں لکھی جانے لگیں، تو نئی نئی اصطلاحات وجود میں آنے لگیں جن کے خاص خاص معانی مراد لیے جانے لگے، جیسے مرید، مراد، سالک، سفر، مسافر، طریق، وقت، ادب، مقام، حال، انزعاج، مکان، قبض، بسط، ہیبت، انس، تواجد، وجد، وجود، عدم، جلال، جمال، جمع الجمع، بقا، فنا، حضور، غیبت، صحو، سکر، محو ذوق شرب، اثبات، نفی، قرب، بعد، خاطر، علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین، دارد، شاہد، روح، سر، ولہ وقفہ، فترہ، تجرید، تفرید، لطیفہ، ریاضۃ، مجاہدۃ، فصل، ذہاب، زاجر، سحق، محق، ستر، تجلی تخلی، مکاشفہ، مشاہدہ، محادثہ، مسامرہ، اللوائح، الطوالع، اللوامع، اللبوادۃ، رغبہ، رہبۃ، اصطلام، غربہ، ہمۃ، فتوح، وصل، غوث، قطب، ابدال، اوتاد، نجباء، اماماں وغیرہ۔ ان کی تشریحات پر خاص خاص کتابیں لکھی گئی ہیں، ان اصطلاحات کی وجہ سے تصوف اور فنون کی طرح ایک ممیز فن بن گیا۔

زہد و اتقاء میں غلو

تصوف کا مقصد اصلی روح کا تزکیہ ہے، اس کے لیے زہد و اتقاء شرط ہے، اور کثرت عبادت و ریاضت تزکیۂ روح کا اہم ذریعہ ہے، صوفیہ فطری طور پر دنیاوی علائق سے بچنے کی کوشش کرتے تھے اور دوسروں کو بھی ان سے بچنے کی تاکید کرتے تھے، جب زہد و عبادت اور تقویٰ و طہارت کا زیادہ اہتمام ہونے لگا تو ہر چیز میں غلو پیدا ہو گیا، صوفیوں کا ترک دنیا رہبانیت سے قریب ہوتا چلا گیا، رات بھر عبادت کرتے رہنا، ہر دن روزہ رکھنا، موٹا جھوٹا اور کم کھانے کی کوشش کرنا، اچھی غذاؤں سے پرہیز کرنا، موٹا اور ریشمی لباس پہننا، فقر و فاقہ کی زندگی گزارنا، آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بسیرا لینا، جسم کو مختلف قسم کی ایذائیں پہنچاتے

---

1 مجموعة الرسائل الكبرىٰ، ص:٢/ ٩٧۔ ٩٩۔

رہنا، جسمانی قویٰ کی بحالی اور ان کی ترقی کے لیے کوشش نہ کرنا، قرآنی الفاظ میں روزمرہ گفتگو کرنے کا التزام کرنا، ظاہری تقویٰ وطہارت میں حد درجہ احتیاط برتنا، چھت کے نیچے آرام کرنے سے پرہیز کرنا، دن رات خانقاہوں یا مسجدوں میں رہنا، لوگوں سے ملنے جلنے سے کترانا، مالداروں، امیروں اور بادشاہوں کی صحبت سے بھاگتے رہنا، اکثر متأخرین صوفیہ کی زندگی کا دستور العمل بن گیا تھا، حالانکہ شریعتِ اسلامیہ اس قسم کی راہبانہ زندگی بسر کرنے کی کہیں تعلیم نہیں دیتی، اس کا کھلا ہوا اصول تو یہ ہے کہ کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو، جائز طور پر دولت کماؤ اور جائز طور پر خرچ کرو، آسمان اور زمین اور اُن دونوں کے درمیان جتنی بھی چیزیں پیدا کی گئی ہیں وہ انسان ہی کے کام کے لیے بنائی گئی ہیں، انسان اس دُنیا میں خدا کا جانشین ہے اور وہ خود عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس کو چاہیے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی ان نعمتوں سے جائز طور پر فائدہ اٹھائے، اور عبادتِ الٰہی کے ذریعہ خدا کا شکر بجالاتے رہیں۔

ضعیف اور موضوع روایات کی بھرمار

ہم بیان کر چکے ہیں کہ تصوف کی ابتداء زہد وعبادت اور ورع وتقویٰ سے ہوئی تھی، عام لوگوں کو دنیاوی عیش وعشرت، جاہ وعزت اور ثروت ودولت سے متنفر کرنے اور انہیں خدا اور اس کے رسول کی طرف پھیرنے اور اُن میں دین کی رغبت پیدا کرنے کے لیے ایسی آیتوں اور حدیثوں کی ضرورت تھی جن میں اس دنیا کی زندگی اور دولت کی بے ثباتی کا ذکر ہو، جب اس غرض سے صحیح روایتیں نہیں مل سکیں تو بعض نے ضعیف اور موضوع روایات سے استدلال لینے کو جائز سمجھا اور ترغیب وترہیب پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔ چنانچہ چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں فنِ تصوف پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں اُن ضعیف اور موضوع روایتوں سے بہت کام لیا گیا ہے، ابونصر السراج (المتوفی: ۳۷۸ھ) کی کتاب اللمع فی التصوف ابوطالب مکی (المتوفی: ۳۸۲ھ) کی قوت القلوب، ابوعبدالرحمٰن السلمی (المتوفی: ۴۱۲ھ) کی کتاب السنن اور کتاب حقائق التفسیر، ابوالحسن الجہضمی المکی (المتوفی: ۴۱۴ھ) کی بہجۃ الاسرار، حافظ ابونعیم الاصبہانی کی کتاب حلیۃ الاولیاء، ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری (المتوفی: ۴۶۵ھ) کا الرسالۃ القشیریۃ فی التصوف، امام غزالی (المتوفی: ۵۰۵ھ) کی کتاب

احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت اور شیخ شہاب الدین عمر بن حفص سہروردی (المتوفی: ۶۳۰ھ) کی کتاب عوارف المعارف میں بہت سی ضعیف اور موضوع روایتیں پائی جاتی ہیں، بعض نے اُن کو صحیح سمجھ کر نقل کیا، اور بعض نے محض ترغیب وترہیب کی خاطر اُن سے کام لینے کو جائز سمجھا، اکثر صوفیہ کی زندگیوں کے اطراف خوارق عادات اور کرامات کا ہالہ بنتا چلا گیا، اور ان کے کمالات کے متعلق عجیب وغریب واقعات بیان کیے جانے لگے، امام غزالی جیسے محقق عالم نے بھی اپنی کتابوں میں ضعیف روایتوں سے کام لیا ہے، چنانچہ شیخ تاج الدین سبکی نے اپنی کتاب طبقات الشافعیہ میں ایک مستقل فصل ہی باندھی ہے، جس میں ان کی مشہور کتاب احیاء العلوم کی بے بنیاد حدیثوں کو جمع کیا ہے اور جو سینتیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کس طرح غیر مستند اور بے بنیاد روایات تصوف کی کتابوں میں جگہ لیتی چلی جارہی تھیں۔

تین مشہور سلسلے

امام ابن تیمیہ کی پیدائش سے تقریباً ایک سو سال پہلے ملک عراق اور شام میں تین بزرگ ایسے گزرے جنھوں نے تصوف میں پورا کمال پیدا کیا تھا، اور جن کی وفات کے بعد ان کے نام سے پیری مریدی کا ایک حلقہ قائم ہوگیا تھا، یہ تین بزرگ شیخ عدی بن مسافر الاموی، شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ احمد رفاعی تھے، انھی کے ناموں کی نسبت سے عدویہ، قادریہ اور رفاعیہ تین سلسلے قائم ہوئے۔

عدویہ

عدویہ شیخ عدی بن مسافر الاموی الہکاری (المتوفی: ۵۵۷ھ) کی طرف منسوب ہیں شیخ موصوف اموی خاندان کے ایک فرد تھے، ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے، شیخ عدی بن مسافر بن اسماعیل بن موسیٰ بن مروان بن الحسن بن مروان۔ یہ اصل میں دمشق کے مغرب میں بیت نار نامی ایک قریے کے رہنے والے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بغداد گئے اور وہاں شیخ حماد الدباس، شیخ ابو نجیب سہروردی، شیخ ابوالوفاء حلوانی، شیخ عقیل المنبجی اور شیخ عبدالقادر جیلانی وغیرہ سے صحبت رہی، اور جب بغداد سے وطن لوٹے تو ان پر تصوف کا گہرا رنگ چڑھ

چکا تھا، انہوں نے ملک شام کے ہکار نامی پہاڑ میں گوشہ نشینی اختیار کی، اسی وجہ سے اُن کو ہکاری لکھا جاتا ہے، انہوں نے یہاں ایک خانقاہ بھی بنائی، اور لوگوں کو سلوک کی تعلیم دینی شروع کی، سینکڑوں آدمی اُن کے مرید ہو گئے اور بہت جلد معتقدین کا ایک زبردست حلقہ قائم ہو گیا، شیخ عدی نے ستر سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے زاویہ میں مدفون ہوئے۔

اُموی خاندان کے ایک فرد ہونے کی وجہ سے شیخ عدی کے عقیدت مندوں کو حضرات امیر معاویہ اور یزید کے متعلق بڑی عقیدت پیدا ہو گئی بعض لوگ یزید کو صحابی تصور کرنے لگے تھے، اور اس کو بہترین شخص ماننے لگے تھے۔

شیخ عدی کی وفات کے بعد اُن کے معتقدین اور مریدین کا حلقہ بڑھتا ہی گیا، اس سلسلے کے ایک شیخ خضر بن ابی بکر بن موسیٰ کردی نہروانی نے اپنے زمانہ میں بہت بڑا نام پیدا کیا تھا، مصر اور شام کا طاقتور اور زبردست سلطان الملک الظاہر بیبرس بندقداری ان کا بڑا معتقد ہو گیا تھا، وہ اُن کی حد سے زیادہ قدر اور تعظیم کرتا تھا، ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ ضرور ان کی خانقاہ میں حاضری دیا کرتا تھا، اور اُن سے ملاقات کا شرف حاصل کرتا تھا، سفر میں اُن کو اپنے ساتھ رکھا کرتا تھا، اس کی اس غیر معمولی عزت اور تکریم کی بنا پر عدوی سلسلہ کو عوام میں بے حد مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ [1]

شیخ عدی کے بعد اُن کے معتقدین میں غیر شرعی عقائد و خیالات اور مراسم پھیل گئے تھے، عدوی گروہ کی اہمیت اور مقبولیت کا لحاظ کرتے یہ ضروری تھا کہ اس گروہ کے غیر شرعی اُمور پر گرفت کی جائے اور اُن کی اصلاح کی جائے، امام ابن تیمیہ نے ہر جگہ اس کا اعتراف کیا ہے کہ شیخ عدی ایک صالح متقی اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ [2] انہوں نے شیخ موصوف کے معتقدین کے نام ایک کھلی چٹھی لکھی جو الوصیۃ الکبریٰ کے نام سے امام ابن تیمیہ کے مجموعۃ الرسائل الکبریٰ میں چھپ گئی ہے، اس میں امامِ موصوف نے تمام عدوی گروہ کو کتاب وسنت پر عمل کرنے کی دعوت دی اور آخر میں یہ لکھا کہ یزید کے متعلق ان کا یہ عقیدہ کہ وہ صحابی تھا، ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ یزید حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں پیدا ہوا، اس

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/ ۲۷۸۔ [2] مجموعۃ الرسائل الکبریٰ: ۱/ ۲۷۳۔

نے آنحضرت ﷺ کو کبھی نہیں دیکھا، وہ اپنے دین اور اصلاح حال کی حیثیت سے مشہور نہیں تھا، وہ صرف ایک نوجوان مسلمان تھا، وہ کافر اور زندیق نہیں تھا، باپ کے مرنے کے بعد وہ خلیفہ بنا، بعض مسلمان اس کی خلافت سے راضی اور بعض ناخوش تھے، اس میں شجاعت اور سخاوت کے اوصاف تھے، وہ فواحش کا کھلم کھلا مرتکب نہیں ہوتا تھا، جیسا کہ اس کے دشمن اس کے متعلق بیان کیا کرتے ہیں۔ [1]

قادریہ

دوسرا سلسلہ قادریہ کا ہے، اور یہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے، شیخ موصوف ۴۷۰ھ میں گیلان میں پیدا ہوئے، ان کا نام ابوصالح ابومحمد الجیلی تھا، اٹھارہ سال کی عمر میں بغداد گئے، اور شیخ ابوسعید المخرمی الحنبلی اور دوسرے علما سے حدیث اور فقہ پڑھی، بغداد میں شیخ ابوسعید کا خاص مدرسہ تھا، جس کو انہوں نے اپنی آخر عمر میں شیخ عبدالقادر جیلانی کے حوالے کر دیا، انہوں نے اس مدرسہ کو خوب ترقی دی، ہر ہفتہ ان کا واعظ ہوا کرتا تھا، جس میں لوگ کثرت سے شریک ہوا کرتے تھے، اُن کے مواعظِ حسنہ سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں نے شرعی زندگی اختیار کی اور بہت سے غیر مسلم اسلام لے آئے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی نے شیخ حماد بن مسلم الرجبی الدباس (المتوفی: ۵۲۵ھ) سے تصوف اور سلوک کی تعلیم حاصل کی تھی، اور اس میں اتنا کمال پیدا کیا کہ وہ سب سے آگے ہو گئے، شیخ حماد ہی کے ہاتھوں انہوں نے خرقۂ خلافت پہنا تھا۔

شیخ عبدالقادر جیلانی اپنے دور کے بہت بڑے عابد اور زاہد تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بڑی سختی سے پابند تھے، انہوں نے غنیۃ الطالبین اور فتوح الغیب کے نام سے دو کتابیں لکھیں، انہوں نے تصوف کو غیر شرعی تصورات سے پاک کیا، اور کتاب وسنت کے مطابق اس کی توضیح اور تشریح کی، شیخ موصوف نے نوے سال کی عمر پائی اور ۵۶۱ھ میں انتقال کیا، اور اپنے مدرسے ہی کے احاطے میں مدفون ہوئے۔

امام ابن تیمیہ اور اُن کے شاگردوں نے شیخ عبدالقادر جیلانی کے زہد وتقویٰ کی ہر جگہ

---

[1] مجموعة الرسائل الكبرىٰ ١/ ٣٠٠۔

تعریف کی ہے، اور اُن کو ساداتِ مشائخ میں سے شمار کیا ہے، امام ابن تیمیہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بڑی سختی کے ساتھ پابند تھے، اور لوگوں کو بھی اس کی وصیت فرمایا کرتے تھے، اُن کا سارا کلام اتباع مأمور و ترک محظور و صبر علی المقدور کے نقطہ ہی کے اطراف گھومتا ہے، اُن کے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو اس راستہ سے ذرا بھی ہٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ [1]

شیخ عبدالقادر جیلانی کی وفات کے بعد اُن کے معتقدین کے خیالات میں بے راہ روی آ گئی تھی، غیر معمولی عقیدت کی بنا پر ان کو سید الخلق بعد الحق تصور کرنے لگے تھے، اور ان کا عقیدہ یہ ہو گیا تھا، کہ ولایت محمد ﷺ یہ ان کی ذات سے قائم ہے، اور وہ مطلقاً سید الخلق ہیں، یعنی خدا کے بعد انہی کا درجہ ہے، چنانچہ جب شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے کسی ایک کی مجلس میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی تو امام ابن تیمیہ نے اس نقطہ خیال کی سخت تردید کی، اس موقع پر امام موصوف نے لکھا ہے کہ یہ عقیدہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے کسی کا نہ تھا، بلکہ ان کے معتقدین اور مریدین نے اپنی عقیدت کی بنا پر قائم کر لیا ہے، امام موصوف نے صاف لکھا ہے، کہ آنحضرت ﷺ کو جو ولایت حاصل تھی، وہ بعینہ کسی کی طرف منتقل نہیں ہوئی، یہ نہ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کو حاصل ہوئی اور نہ دیگر انبیاء اور رسل کو مل سکی، اور جب حالت یہ ہو تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی طرف کیوں کر منتقل ہو سکتی ہے۔ [2]

امام ابن تیمیہ کی تصنیفات کے پڑھنے سے یوں اندازہ ہوتا ہے، کہ ان کے زمانے میں قادریہ سلسلہ کو وہ اہمیت حاصل نہیں تھی جو عدویہ یا رفاعیہ کو حاصل تھی، البتہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے متعلق بہت سی عجیب و غریب حکایات بیان کی جانے لگی تھیں، جن کے متعلق حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ان میں سے اکثر کے متعلق غلو کیا گیا ہے۔ [3]

---

[1] مجموعة الرسائل الكبرىٰ: ٢/ ١٤٣۔ [2] كتاب السبعينية، ص: ١٢٤۔

[3] البداية و النهاية: ١٢/ ٢٥٢۔

رفاعیہ

تیسرا سلسلہ شیخ احمد رفاعی کی طرف منسوب ہے، انہوں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ عدی بن مسافر الاموی کا زمانہ پایا تھا، وہ ۵۰۰ھ میں بصرہ اور واسط کے درمیان ام عبیدہ نامی ایک قریہ میں پیدا ہوئے اور اپنے ماموں شیخ منصور بطائحی سے تعلیم وتربیت پائی اور ان سے سلوک کی منزلیں طے کر کے خرقہ خلافت پایا، بغداد میں بہت سے بزرگوں کی صحبت اٹھائی، اور تصوف وسلوک میں کمال حاصل کیا، ان کے متعلق کئی کرامات بیان کی جاتی ہیں۔

وطن لوٹنے کے بعد اپنی ایک خانقاہ بنائی، جہاں سلوک سے دلچسپی رکھنے والے ان سے استفادہ کرنے لگے، اور بہت جلد ان کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی، انہوں نے ۲۲ جمادی الاولیٰ ۵۷۸ھ کو وفات پائی اور اپنے قریے میں مدفون ہوئے۔

شیخ احمد کی نرینہ اولاد نہیں تھی، اس لیے مشیخت کا سلسلہ ان کے بھائی کی اولاد میں جاری رہا، امام ابن تیمیہ کے زمانے تک اس خاندان کے افراد یکے بعد دیگرے سجادہ نشینی کرتے رہے، شیخ احمد کے پیرؤوں اور معتقدین کو بہت زیادہ شہرت نصیب ہوئی، اور عوام کے دلوں پر ان کی غیر معمولی کرامات کا گہرا سکہ بیٹھ گیا تھا، یہ لوگ سیاہ لباس پہنتے تھے، گلے اور ہاتھوں میں زنجیریں ڈالے رہتے تھے، زندہ سانپوں کو نگل جاتے تھے، دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑتے تھے، اور انگاروں سے کھیلا کرتے تھے، شیروں کی سواری کیا کرتے تھے، اور طرح طرح کے کرشمے اور شعبدے دکھاتے پھرتے تھے، امام ابن تیمیہ کے زمانے میں بڑے بڑے تاتاری امیر ان کے معتقد ہو گئے تھے اور ان کی حد سے زیادہ عزت اور احترام کرتے تھے، اسی لیے امام ابن تیمیہ نے اسی زور اور قوت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، اور فقرائے رفاعیہ کے ساتھ وہ مشہور مناظرہ پیش آیا جس کی تفصیل دی جا چکی ہے۔

یونسیہ

ان تین مشہور سلسلوں کے علاوہ امام ابن تیمیہ کے زمانے میں ایک گروہ یونسیہ کا بھی تھا جو شیخ یونس بن یوسف شیبانی (المتوفی: ۶۱۹ھ) کے مرید اور معتقد تھے، ان میں بھی مشیخت کا سلسلہ جاری تھا، امام موصوف کے زمانے میں شیخ یونس کے پڑپوتے شیخ سیف الدین بن

سابق بن ہلال بن یونس (المتوفی:۷۰۶ھ) سجادہ نشیں تھے، امراء وقضاۃ، اعیان دولت اور عوام کے نزدیک ان کی بڑی عزت تھی، [1] اس گروہ میں بھی بہت سی برائیاں تھیں جن پر امام موصوف نے کئی جگہ تنقید کی ہے، اوران کوراہ راست پر لانے کی کوشش کی ہے۔ [2]

سہروردیہ

ایک دوسرا گروہ سہروردیہ کا تھا جو شیخ شہاب الدین ابوحفص عمر بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن محمد بن حمویۃ السہروردی (المتوفی: ۶۳۰ھ) کے متبع تھے، شیخ موصوف نے عوارف المعارف کے نام سے دوجلدوں میں ایک مشہور معروف کتاب لکھی ہے، امام ابن تیمیہ نے ان پر کچھ زیادہ تنقید نہیں کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں اس گروہ کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی، سہرورد کے ایک اور شخص بھی مشہور ہیں، جن کا لقب بھی شہاب الدین تھا، ان کا نام یحییٰ بن حبش بن امیرک تھا، اور کنیت ابوالفتوح تھی، علما کے فتوے پر انہیں ۵۸۷ھ میں حلب میں قتل کر دیا تھا، اس لیے تاریخ میں وہ الشیخ المقتول کے نام سے مشہور ومعروف ہیں، یہ حکیم اور فلسفی تھے، امام ابن تیمیہ نے ان کے عقائد وخیالات پر کئی جگہ تنقید کی ہے، اور ان کو گمراہ قرار دیا ہے۔

شیخ ابوالفرج ابن الجوزی

اس موقع پر شیخ شمس الدین ابوالفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی (المتوفی: ۵۹۷ھ کا ذکر ضروری ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی مشہور کتاب تلبیس ابلیس لکھ کر مسلمانوں کے تمام گروہوں اور خاص کر صوفیہ پر تنقید کی، اوران کے عقائد وخیالات اور اعمال وافعال کو قرآن وحدیث کی روشنی میں پرکھا، اور ان کی بے راہ روی کو واضح کیا، امام ابن تیمیہ نے جابجا ابن جوزی کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان کو ضعیف، جھوٹی، اور موضوع حدیثوں کے پرکھنے کا بڑا ملکہ حاصل تھا، ابن جوزی نے وحدۃ الوجود کے نظریے پر کوئی تنقید نہیں کی، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے زمانے تک اس مسئلہ نے کوئی خاص شکل اختیار نہیں کی تھی، اورلوگوں میں اس کا کوئی چرچا نہیں تھا، جب شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (المتوفی: ۶۳۸ھ) نے اس مسئلہ پر

---

[1] البدایۃ و النہایۃ: ۱۴/ ۴۴۔ [2] مجموعۃ الرسائل: ۱/ ۱۷۵۔

اپنے خاص انداز میں روشنی ڈالی اوران کے بعد آنے والوں نے اس پر اپنے حاشیے چڑھائے تو یہ مسئلہ تصوف کے نزاعی مسائل میں سے ایک بہت ہی اہم مسئلہ بن گیا، اس کے بعد ہر دور میں اس مسئلہ پر بڑی بحث و تمحیص ہوتی رہی، جب امام ابن تیمیہ کا زمانہ آیا تو یہ مسئلہ بڑا ہی معرکہ الآراء مسئلہ بن گیا، موافق اور مخالف بحثیں جاری تھیں، امام ابن تیمیہ نے اس کے خلاف بڑی شدت کے ساتھ بحث وتنقید شروع کردی۔

مدعیان وحدۃ الوجود سے اختلاف

اس پورے گروہ صوفیہ میں امام ابن تیمیہ کا شدید ترین اختلاف زیادہ تر ایسے ہی لوگوں سے تھا جو نظریہ وحدۃ الوجود کے حامی تھے، اس سلسلہ میں انہوں نے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، شیخ عمر بن الفارض، شیخ علی الحریری، شیخ نجم الدین بن اسرائیلی الحریری، شیخ عبدالحق بن سبعین، شیخ کبیر شیخ صدرالدین قونوی اور شیخ عفیف الدین تلمسانی کے عقائد وخیالات پر سخت ترین تنقید کی ہے، اسی کی وجہ سے بعض علمائے وقت اور عوام کے جذبات بھڑکتے رہے ہیں، اب ہم ذیل میں ان اشخاص کا مختصر تذکرہ درج کرتے ہیں۔

شیخ محی الدین بن عربی

ان کا نام محمد، کنیت ابوعبداللہ، لقب محی الدین، اورعرف ابن عربی تھا، وہ قبیلہ بنو طے کی ایک شاخ یعنی خاندان عبداللہ بن حاتم کی نسل سے تھے اس لیے حاتمی اور طائی کہلائے، ان کا سلسلہ نسب یہ ہے محمد بن علی بن محمد بن احمد بن عبداللہ الحاتمی الطائی

ابن عربی کو بغیر الف لام کے لکھا اور بولا جاتا ہے تاکہ قاضی القضاۃ اشبیلیہ قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ بن العربی (المتوفی: ۵۴۴ھ) سے تشابہ نہ پیدا ہو۔

ابن عربی ۱۷ رمضان المبارک ۵۶۰ھ کو پیر کے دن اندلس کے جنوب مشرقی شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے، ان کی ابتدائی تعلیم یہیں شروع ہوئی تھی اور پھر جب آٹھ سال کے ہوئے تو ان کے والد ماجد انہیں لے کر اشبیلیہ منتقل ہو گئے جو اس زمانہ میں اندلس کے اندر اسلامی علوم وفنون کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ ابن عربی نے یہاں کے مختلف اساتذہ سے تعلیم پائی، علوم معقولات اور فن تصوف سے خاص ذوق تھا، اس لیے ان میں بہت جلد شہرت پیدا کرلی۔

ابن عربی کی کتابوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نوجوانی سے پہلے ہی بہت سی ریاضتیں شروع کر دی تھیں، اوران کے زمانہ کے بڑے بڑے لوگ ان کی علمی قابلیت کوتسلیم کرتے تھے۔ابن عربی نے خود اپنا واقعہ بیان کیا ہے کہ جب وہ ایک دن قرطبہ میں قاضی ابوالولید بن رشد (المتوفی: ۵۹۵ھ) کے پاس پہنچے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ کر ان کا پرجوش استقبال کیا اور انہیں اپنے گلے سے لگا لیا، حالانکہ اس وقت ان کے چہرے پر ڈاڑھی اور مونچھ بھی نہیں نکلی تھی۔ [1]

تعلیم کے دوران میں اور اس کے بعد بھی کئی دنوں تک وہ اندلس اور شمالی افریقہ کے مختلف شہروں میں گھومتے تھے اور ہر جگہ کے اہل اللہ سے علمی اور روحانی فیوض حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، مرسیہ، مریہ، غرناطہ، قرطبہ، اشبیلیہ، (یہ تمام شہر اندلس میں ہیں) سبتہ، بجایہ، فاس، مراکش، تلسمانی، اور قیروان کا کئی مرتبہ سفر کیا، ہر جگہ مختلف اساتذہ وقت کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور ان سے حدیث اور دوسرے ارشادات حاصل کرتے رہے۔

فتوحات مکہ کے مقدمہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابن عربی نے ۵۹۰ھ میں مشرق کا سفر کیا تھا، دمشق سے بیت المقدس ہوتے ہوئے مدینہ منورہ اور مکہ معظّمہ تشریف لے گئے اور پھر اپنے وطن واپس ہو گئے۔

پھر ۵۹۸ھ میں دوبارہ اشبیلیہ سے روانہ ہوئے، مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچے، کئی مہینے وہاں رہے، دوسروں سے پڑھا اور خود بھی دوسروں کو پڑھایا، پھر وہاں سے بغداد، موصل، حلب، قونیہ وغیرہ کی سیر کی، ۶۰۱ھ میں بغداد اور موصل میں اساتذۂ وقت سے حدیثیں سنی ہیں۔ [2] ۶۰۸ھ میں پھر وہ بغداد میں نظر آتے ہیں ۶۰۹ [3] ھ میں انہوں نے بلاد روم کے فرمانروا سلطان غالب بامر اللہ بن کیکاؤس کے نام خط لکھا ہے۔ [4] ۶۱۵ھ میں انہوں نے مالطہ میں اصطلاحات الصوفیہ کے نام سے کتاب لکھی ہیں [5] ۶۱۸ھ میں ان کا

---

[1] فتوحات مكية: ١/ ١٥٤۔ [2] فتوحات مكية: ٣/ ١٧ و ٤/ ٤٩٥۔٥٤٩۔
[3] ایضًا ٢/ ٥٣٠۔ [4] ایضًا ٤/ ٥٤٧۔ [5] رسائل ابن عربی جلد دوم۔

بڑا لڑکا سعید الدین مالطہ ہی میں پیدا ہوا۔ 1 اس سے اندازہ ہوتا کہ یہ زمانہ وہیں گزرا۔ ۶۲۰ھ کے قریب یا اس سے کچھ پہلے وہ دمشق آئے اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ 2

فتوحات مکیہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربی نے آنحضرت ﷺ کے اس مشہور فرمان

((علیك بالشام فانها خیرة الله من أرضه یجتبی الیها خیرته من عباده)) 3

''تم ملک شام کی سکونت کو اپنے اوپر لازم کرلو کیونکہ یہ اللہ کی زمینوں میں سے ایک برگزیدہ زمین ہے اور اللہ کے برگزیدہ بندے اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔''

پر عمل کرتے ہوئے دمشق ہی کو اپنی بقیہ زندگی کے لیے سکونت گاہ قرار دے لیا تھا۔ 4

دمشق کے خاندان قاضی القضاۃ ابن الزکی کے نزدیک ابن عربی کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ 5

اور اس کی طرف سے ان کے لیے روزانہ تیس درہم مقرر تھے۔ 6

حمص کا فرمانروا الملک المجاہد اسد الدین شیرکوہ بن ناصر الدین محمد بن اسد الدین شیرکوہ بن شادی (المتوفی: ۶۳۷ھ) بھی ان کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے ان کے لیے روزانہ سو درہم مقرر کر رکھے تھے۔ اسی طرح بلاد روم کے فرمانروا غالب بامر اللہ بن کیکاؤس بھی ان کی مالی امداد و اعانت کیا کرتا تھا۔ 7

ابن عربی نے اپنی باقی زندگی درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور ارشاد و نصیحت میں گزار دی، مردوں کے علاوہ بہت سی عورتوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان سے خرقہ

---

1 فتوحات مکیة: ٤/ ٥٦١۔ 2 دیوان الاکبر للشیخ محی الدین بن عربی۔

3 ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی سکنی الشام، ح: ٢٤٨٣۔

4 فتوحات مکیة: ٤/ ٥۔ 5 اس خاندان کے اکثر افراد قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے ان میں سے دو یعنی قاضی القضاۃ محمد بن علی (المتوفی: ۵۹۸ھ) اور ان کے لڑکے ابو الفضل یحییٰ (المتوفی: ۶۶۸ھ) بہت مشہور ہوئے ہیں۔ مؤخر الذکر ابن عربی کے شاگرد اور مرید تھے۔

6 فتوحات مکیة: ٤/٦٥۔ 7 ایضًا۔

خلافت پہنا۔ اس کی تفصیل ان کے عربی دیوان میں ملتی ہے جو ۱۲۷۱ھ میں مصر سے چھپا ہے۔ ان عورتوں میں قاضی القضاۃ ابن الزکی کی لڑکی بھی شامل تھی۔ وہ بھی ان کی مرید ہو گئی تھی۔ ان کی تعریف میں خود ابن عربی نے اشعار لکھے ہیں۔

ابن عربی نے ۲۲ ربیع الآخر ۶۳۸ھ کو دمشق میں وفات پائی اور جبل قاسیون کے دامن میں دفن کیے گئے۔ [1]

ابن عربی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ ظاہری تھے اور ابن حزم کے پیرو تھے۔ مگر خود ابن عربی نے اس الزام کی تردید کی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

نسبونی الی ابن حزم و انی
لست ممن یقول قال ابن حزم

مجھے ابن حزم کی طرف نسبت دی ہے حالانکہ میں ان لوگوں سے نہیں ہوں جو ہر بات میں ابن حزم کا حوالہ دیتے ہیں۔

لاولا غیرہ فان مقالی
قال نص الکتاب ذلك علمی

میں ان لوگوں سے بھی نہیں ہوں جو دوسروں کا حوالہ دیتے ہیں بلکہ میرا کہنا یہ ہوتا ہے کہ کتاب کی نص اس پر دلالت کرتی ہے یا میرا علم یہ کہتا ہے۔

او یقول الرسول او اجمع ال
خلق علی ما اقول ذلك حکمی

یا رسول ایسا کہتا ہے یا جو کچھ میں کہتا ہوں اس پر تمام لوگوں کا اجماع ہے اور یہی میرا حکم ہے۔

درحقیقت ابن عربی فقہ و عقائد میں کسی ایک خاص مسلک کے پیرو نہیں تھے بلکہ انہوں

---

[1] فروری ۱۹۵۸ء کو راقم دمشق میں ان کے مزار پر حاضر ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے دونوں لڑکے سعد الدین اور عماد الدین بھی مدفون ہیں۔ اس سے متصل سلطان سلیم نے ۹۲۴ھ میں ایک مسجد بنا دی ہے۔ یہ محلہ محی الدین ابن عربی کے نام سے مشہور ہے۔ بس اور ٹرام وہیں مسجد کے پاس جا کر ختم ہوتی ہے۔

نے دوسروں کو تقلید سے منع کیا ہے، چنانچہ خود ہی وصیت کرتے ہیں۔

والذی اوصیك به ان كنت عالما فحرام عليك ان تعمل بخلاف ما اعطاك دليلك ويحرم عليك تقليد غيرك مع تمكنك من حصول الدليل وان لم تكن لك هٰذه الدرجة وكنت مقلدا فاياك ان تلتزم مذهبا بعينه بل اعمل كما امرك اللّٰه فانّ اللّٰه امرك ان تسال اهل الذكر ان كنت لاتعلم واهل الذكرهم العلماء بالكتاب والسنة ۔[1]

اور وہ چیز جس کی میں وصیت کرتا ہوں یہ ہے کہ اگر تم عالم ہو تو اپنی دلیل کی رہبری کے خلاف عمل کرنا تم پر حرام ہے اور تم کو دلیل حاصل کرنے کی طاقت رکھتے ہوئے دوسرے کی تقلید کرنا بالکل ناجائز ہے اور اگر تمہیں علم کا یہ درجہ حاصل نہ ہو اور تم مقلد ہو تو تم کسی ایک خاص مذہب کی پابندی کرنے سے بچو بلکہ اسی طرح عمل کرو جس طرح اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے کیونکہ اللہ نے تمہیں یہ حکم دیا ہے کہ جب تم نہیں جانتے ہو تو اہل ذکر سے پوچھو اور اہل ذکر وہ لوگ ہیں جو کتاب وسنت کا علم رکھتے ہیں۔

ابن عربی نے بیسیوں کتابیں لکھی ہیں جن میں ان کی دو کتابوں یعنی فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کو خاص طور پر شہرت حاصل ہے پہلی کتاب بہت بسیط ہے اور تقریباً تین ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور چار ضخیم جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی ہے اور دوسری کتاب بہت مختصر مگر بہت ہی اہم ہے اس کی اب تک کئی چھوٹی بڑی شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔

یہ صاف طور پر پتہ نہیں چلتا کہ فتوحات مکیہ کب سے لکھنی شروع کی تھی، کتاب کے اندر بعض حوالے ایسے ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۶۲۸ھ سے پہلے لکھنی شروع کی تھی، اور اپنی وفات سے دو سال پہلے ۶۳۶ھ میں ختم کیا تھا، فصوص الحکم ۶۲۷ھ کی تصنیف ہے، اس میں دو جگہ فتوحات مکیہ کا حوالہ دیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کے بہت

---

[1] فتوحات مكية: ٤/ ٤٩١۔

سے ابواب اس سے پہلے ہی لکھے جا چکے تھے۔

فتوحات مکیہ چھ فصلوں پر منقسم ہے یعنی (۱) معارف (۲) معاملات (۳) احوال (۴) منازل (۵) منازلات اور (۶) مقامات۔ ان میں سے ہر ایک فصل کئی ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں کل پانچ سو ساٹھ ابواب ہیں، آخری باب میں انہوں نے لوگوں کو بہت سی عمدہ اور مفید وصیتیں کی ہیں۔

فصوص الحکم ایک مقدمہ اور ۲۷ فصوص (نگینے) پر مشتمل ہے اور ہر ایک فص کو ایک نبی کے ساتھ موسوم کیا ہے اور ہر نبی سے متعلق قرآن مجید میں جو آیتیں وارد ہوئی ہیں ان کی ایک عجیب وغریب پیرایہ میں تشریح کی ہے۔

ابن عربی نے فصوص الحکم کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے محرم ۶۲۷ھ کے عشرۂ اخیر میں دمشق کے اندر آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا، آپ کے ہاتھ میں فصوص الحکم کی کتاب تھی آپ نے ابن عربی سے فرمایا: ''اے محمد! اس کتاب کو لو اور اس کو لوگوں میں پھیلاؤ تاکہ اس سے ان کو نفع پہنچے۔'' ابن عربی نے اس کو بخوشی اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر کچھ گھٹانے یا بڑھانے کے بغیر اس کو مرتب کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

چونکہ یہ ایک غیر معمولی دعوی تھا اس لیے فوراً ہی ان الفاظ میں اپنی صفائی پیش کر دی اور لکھا:

فما القی الیکم الا مایلقی الی ولا انزل فی هٰذا المسطور الاما ینزل به علی ولست بنبي ولا رسول ولکنی وارث ولآخرتی حارث فمن اللّٰه فاسمعوا والی اللّٰه فارجعوا۔

پس میں تمہاری طرف وہی القا کر رہا ہوں جو مجھ پر القا ہوا تھا اور ان لکھی ہوئی سطروں میں وہی تم پر اتار رہا ہوں جو مجھ پر اتارا گیا تھا اور میں نبی نہیں ہوں اور نہ رسول ہوں ولیکن وارث رسول ہوں اور اپنی آخرت کی کھیتی کا کاشتکار ہوں پس یہ سب باتیں اللہ ہی کی طرف سے ہیں اس لیے ان کو سنو اور اللہ ہی کی طرف لوٹو۔

فتوحات مکیہ کی ابتداء میں بھی ایک خطبہ ہے جس کے متعلق خود ابن عربی نے لکھا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ''عالم حقائق'' مثال میں دیکھا، آپ کے اردگرد انبیاء ورسل، فرشتے اور اولیاء صف باندھے کھڑے تھے۔ آپ کے داہنے حضرت ابوبکر اور بائیں حضرت عمر تھے۔ آپ کے سامنے ختم (خاتم الاولیا) تھے جن کے پیچھے ابن عربی بیٹھے ہوئے تھے، حضرت عثمان اور حضرت علی بھی تشریف فرما تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عربی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اے محمد! اٹھ اور اس کی ثنا کر جس نے مجھ کو بھیجا اور میری تعریف بیان کر۔ فوراً ابن عربی کے سامنے ایک منبر لا کر رکھا گیا جس کی پیشانی پر چمکدار نور سے یہ لکھا ہوا تھا هذا هو المقام المحمدی الاطهر (یہ ہے وہ پاک محمدی مقام) ابن عربی شرماتے ہوئے اس منبر پر چڑھے اور فی البدیہہ ایک فصیح وبلیغ عربی خطبہ دیا اور جب وہ عالم بالا کے اس ''مشہد نومی'' سے عالم سفلی کی طرف آئے تو اسی حمد مقدس کو اپنی کتاب فتوحات مکیہ کا خطبہ قرار دیا۔

اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ابن عربی علوم منقول ومعقول کے ماہر اور ایک زبردست ادیب وخطیب تھے، ان کو نظم اور نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی، ان کا دماغ عجیب وغریب علمی وروحانی حقائق اور اچھوتے دلائل قرآن وسنت اور استنباطات مسائل کا ایک زبردست خزینہ تھا، وہ علوم حکمت کا ایک بحر ذخار تھے۔ مگر ان کی تصنیفات کے آئینے میں ہمیں ان کی ایک عجیب وغریب شخصیت دکھائی دیتی ہے جس کا مثیل ونظیر سارے عالم اسلامی کی تاریخ میں کوئی نظر نہیں آتا، انہوں نے اتنے غیر معمولی دعوے اور اتنے عجیب وغریب واقعات اور حقائق بیان کیے ہیں کہ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ان میں کہاں تک صداقت اور واقعیت ہو سکتی ہے۔

ابن عربی نے اقطاب کی تعداد پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے میں نے تمام انبیاء ورسل کا عینی مشاہدہ کیا ہے، میں نے قوم عاد کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام سے براہ راست گفتگو کی ہے۔ میں نے تمام مومنین کا جو اس وقت تک پیدا ہو چکے ہیں اور قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے، عینی مشاہدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو مختلف وقتوں میں لیکن ایک ہی جگہ ان کا

مشاہدہ کرایا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر میں نے باقی تمام رسولوں کی ہم نشینی کا فیض اٹھایا ہے اور اس سے نفع حاصل کیا ہے۔ میں نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے قرآن پڑھا ہے۔ حضرت عیسیٰ روح اللہ کے ہاتھ پر توبہ کی ہے، حضرت موسیٰ کلیم اللہ نے مجھے کشف و ایضاح اور رات دن کے الٹ پھیر کا علم عطا فرمایا ہے۔ اور جب مجھے یہ علم حاصل ہو گیا تو میرے لیے رات رات نہ رہی بلکہ پورا ہی دن ہو گیا۔ میرے لیے سورج کے طلوع و غروب کا کوئی فرق باقی نہ رہا، اس کا کشف خدا کی طرف سے اس بات کی اطلاع تھی کہ آخرت میں شقاوت و بدبختی کے اندر میرا کوئی حصہ نہیں ہے، میں نے حضرت ہود علیہ السلام سے ایک مسئلہ کی وضاحت چاہی تو آپ نے مجھے اس کی معرفت بخشی اور مجھے اس زمانہ تک کے وجود کی معرفت بخشی ہو گئی، رسولوں میں سے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت ہود، اور حضرت داؤد کے ساتھ معاشرت اختیار کی، باقی رسولوں کو میں نے صرف دیکھا ہے ان کی صحبت مجھے حاصل نہیں ہوئی ہے۔ [1]

ابن عربی نے اور جگہ لکھا ہے کہ دمشق میں یحییٰ بن اخفس نامی ایک صاحب علم و فضل بزرگ تھے جن کے والد طلبہ کو عربی کا درس دیا کرتے تھے، ایک دن یحییٰ نے مجھے چٹھی لکھی کہ انہوں نے گزشتہ رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں جامع اموی دمشق کے مقصورۂ خطابت میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ لوگ آگے بڑھ بڑھ کر آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے، مگر وہ ہجوم کی وجہ سے چپکے کھڑے رہے اور جب اژدحام ذرا کم ہوا تو آگے بڑھے اور آپ سے مصافحہ کیا۔ آنحضرت نے فرمایا: ''اے یحییٰ! کیا تم محمد کو جانتے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا: کون محمد؟ آپ نے کہا: ''محمد ابن عربی۔'' یحییٰ نے کہا: ہاں میں ان کو جانتا ہوں، پھر آپ نے ان سے کہا کہ ابن عربی سے جا کر کہو وہ کام پورا کر دیں جس کا آپ نے حکم دیا ہے۔ پھر آپ نے یحییٰ کو حکم دیا کہ ابن عربی کے ساتھ رہ کر ان کے علم سے فائدہ اٹھائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت کو بلایا اور کہا کہ یحییٰ کو اپنا ایک شعر دے دو تا کہ ابن عربی اس کے قافیہ اور ردیف پر انصار اور خاص کر سعد بن عبادہ کی مدح میں ایک شاندار قصیدہ لکھیں اور جمعرات کی

---

[1] فتوحات مکیۃ: ٤/ ٧٧۔

شب کو دمشق کی قبر الست پر بیٹھے ہوئے حامد نامی ایک شخص کے حوالے کر دیں۔ حسان بن ثابت نے اپنا ایک شعر ان کے حوالے کیا۔

ابن عربی نے لکھا ہے کہ ان کی والدہ خود انصار سے تھیں۔ اس لیے انہوں نے کسی تفکر و تدبر کے بغیر ایک قصیدہ لکھا جس کے تین اشعار یہاں ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

فاقول مبتديا الطاعة احمد

فی مدح قوم سادة ابرار

پس میں آنحضرت کے فرمان کی اطاعت کرتے ہوئے نیک اور سردار قوم کی تعریف اور مدح میں لکھتا ہوں۔

انی امراؤٌ من جملة الانصار

فاذا مدحتهمو مدحت بخاری

بے شک میں انصار ہی کے خاندان سے ہوں پس جب میں ان کی مدح کرتا ہوں تو گویا اپنے ہی خاندان کی مدح کرتا ہوں۔

بسیوفهم قام الهدی وبهم علت

انواره فی راس کل منار

انہی کی تلواروں کی بدولت ہدایت قائم ہوئی اور اس کے انوار منارے کے اوپر ظاہر ہوئے۔

ابن عربی نے اپنا یہ قصیدہ لکھ کر یحییٰ کے حوالے کیا اور وہ آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق جمعرات کی شب کو عشا کی نماز کے بعد قبر الست پر بیٹھے ہوئے آدمی کے پاس لے گئے۔ انہیں دیکھتے ہی اس شخص نے پوچھا وہ قصیدہ لائے ہو جس کے لکھنے کا آنحضرت نے حکم دیا تھا۔ یحییٰ نے یہ قصیدہ ان کے حوالہ کیا۔ موم بتی کی روشنی میں حامد نے یہ قصیدہ پڑھنا چاہا مگر رسم الخط کے بدل جانے کی وجہ سے وہ اس کو پڑھ نہ سکے۔ [1] آخر خود یحییٰ نے پڑھ کر یہ قصیدہ سنایا۔ [2]

---

[1] یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ شخص خط نسخ سے واقف نہیں تھا جس میں ابن عربی نے اپنا قصیدہ لکھا تھا، وہ شخص صحابہ یا تابعین سے تھا جس کے زمانہ میں خط کوفی رائج تھا۔ [2] فتوحات مكية: ١/ ٢٦٧۔

ابن عربی نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ میں حضرت عیسیٰ و یونس علیہ السلام کے ساتھیوں کی ایک جماعت زندہ ہے جو لوگوں سے الگ تھلگ زندگی گزارتی ہے۔ ابن عربی لکھتے ہیں کہ میں نے یونس کے ساتھیوں میں سے ایک کو دیکھا اور اس کا پیچھا کیا مگر وہ بہت ہی تیزی کے ساتھ آگے نکل گیا۔ میں نے اس کے قدم کا ناپ لیا تو اپنی بالشت سے پونے چار بالشت پایا۔ [1]

ابن عربی نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے:

فلیس فی العالم عندنا فی نظرنا شيئ موجود الا ولنا فيه شهود عين حق۔ [2]

''ہمارے نزدیک اس دنیا میں کوئی چیز ایسی موجود نہیں ہے جس کا عینی ٹھیک مشاہدہ ہمیں حاصل نہ ہو۔''

ابن عربی کا زیادہ تر اعتماد کشف پر تھا۔ اگر کوئی حدیث روایتاً یا درایتاً صحیح نہ ہو اس کے باوجود کشف اس کی صحت پر دلالت کر رہا ہو تو ابن عربی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہوتی تھی۔ [3]

ابن عربی نے عناصر اربعہ پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ سب سے پہلے پانی کا عنصر وجود میں آیا ہے۔ اس دعوے کی بنیاد کشف پر رکھی ہے چنانچہ کہتے ہیں:

مستندنا الكشف فى ما ندعيه من هذا وغيره من العلوم وقد تكون تلك العلوم مما يدرك بالنظر الفكرى فمن اصاب فى نظره وافق اهل الكشف و من اخطأ فى نظره خالف اهل الكشف۔ [4]

''ایسے اور دوسرے علوم میں جو کچھ ہم دعویٰ کرتے ہیں ہمارا اعتماد کشف ہی پر ہے اور کبھی یہ علوم فکری نظر سے بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ پس جس کی نظر ٹھیک

---

[1] فتوحات مكية: ١/ ٢٢٣۔ [2] فتوحات مكية: ١/ ٢٢٢۔

[3] ایضًا، ٢٣٤۔ [4] رسائل ابن عربی مطبوعہ حیدرآباد جزء ثانی کتاب الاسفار صفحہ ۷ اور ۸۔

ہوگی وہ کشف والوں کی موافقت کرے گا۔ اور جس کی نظر غلط ہوگی وہ کشف والوں کی مخالفت کرے گا۔"

ابن عربی کا نظریہ یہ بھی تھا کہ ان کا زمانہ کشف وشہود اور علمی فتوحات میں قرون اولیٰ سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ قرون اولیٰ کے لوگ محض عملی حیثیت سے فوقیت رکھتے تھے ان کے زمانہ میں کشف وشہود اور علمی فتوحات زیادہ نہیں تھیں مگر زمانہ جیسے جیسے آگے بڑھتا جائے گا۔ عمل میں کمی ہوتی جائے گی اور علم اور کشف کی طاقت بڑھتی جائے گی یہاں تک کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا وقت آئے گا تو انسان اپنی ران سے باتیں کرنے لگے گا۔ ابن عربی نے لکھا ہے کہ ان کے زمانے کی ایک رکعت پچھلے زمانے کے لوگوں کی عمر بھر کی عبادت کے برابر ہے۔

ابن عربی نے خود ہی لکھا ہے کہ انہوں نے کئی مرتبہ بیداری اور خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور ان سے فتویٰ پوچھا۔ [1] انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام سے کئی مرتبہ ملاقات کی اور انہیں پانی پر چلتے اور فضائے آسمانی میں حصیر بچھا کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ [2] یہی نہیں بلکہ کئی بزرگوں کو ہوا میں اڑتے ہوئے پایا۔ [3] انہوں نے کعبہ کے اندر عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے زاہد و عابد لڑکے احمد السبتی کی متجسد روح سے ملاقات کی اور اس سے حالات دریافت کیے۔ [4] اسی طرح مشہور صوفی ابوعبدالرحمٰن السلمیٰ (المتوفی: ۴۱۲ھ) کی متجسد روح سے بھی ملاقات کی۔ [5] بڑے بڑے اوتاد و ابدال اور اقطاب سے بھی ملے۔ [6] یہی نہیں بلکہ تجلی کی حالت میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ذوالنون مصری، حضرت سہل بن عبداللہ تستری، حضرت جنید بغدادی، حسین بن منصور حلاج، ابوعبداللہ المرتعش اور ابن عطا سے ملاقات کی اور گفتگو کی۔ ان سب نے ابن عربی کی غیر معمولی ذکاوت وذہانت اور قابلیت ولیاقت کا اعتراف کیا۔ [7] حضرت جنید ان کی غیر معمولی قابلیت

---

[1] فتوحات مکیۃ: ٤/ ٥٥٢۔ [2] ایضًا: ١/ ١٨٦ و ٣/ ٣٣٦۔ [3] ایضًا: ١/ ٢٢٥۔
[4] ایضًا: ١/ ٢٣٨، ٢/ ١٥، ٤/ ١٢۔ [5] ایضًا: ٢/ ١٦٢۔ [6] ایضًا: ٢/ ٧، ٨۔
[7] رسائل ابن عربی، کتاب التجلیات: ٢/ ٣٢۔ ٣٧۔

دیکھ کر شرمسار ہو گئے۔ ابن عربی نے انہیں اطمینان دلایا کہ جب انہیں ابن عربی جیسا جانشین ملا ہے تو پھر انہیں کیا خوف ہو سکتا ہے۔ [1] حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے ابن عربی سے فرمایا تم علم توحید میں امام ہو۔ تم نے وہ کچھ جان لیا ہے جس کو میں نہیں جان سکتا تھا۔ [2]

ایک مرتبہ ابن عربی نے حسین بن منصور حلاج کی موجودگی میں ابوعبداللہ المرتعش سے پوچھا بتاؤ توحید کی بنیاد کن چیزوں پر ہے۔ مرتعش نے جواب دیا تین قواعد پر۔ ابن عربی نے کہا: جس توحید کی بنیاد تین قواعد پر ہو وہ توحید ہی نہیں ہے۔ یہ سن کر مرتعش شرمندہ ہوئے۔ ابن عربی نے کہا تم شرمندمت ہو۔ مرتعش نے جواب دیا۔ تم نے تو میری کمر توڑ دی ہے۔ ابن عربی نے کہا سہل اور جنید کے مقابلہ میں تمہاری کیا حقیقت ہے۔ ان دونوں نے میرے کمال پر گواہی دی ہے۔ مرتعش نے کہا تم مجھ کو کم از کم متاخرین کی صف میں شامل کر لو۔ ابن عربی نے کہا: ہاں۔ [3]

ابن عربی شمالی افریقہ کے شہر فاس میں تھے۔ ایک رات انہیں سخت بے چینی محسوس ہوئی۔ دل بہلانے کی غرض سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں دروازے کے پیچھے سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ بند تھا۔ یہ دروازہ خود بخود کھلا اور قطب وقت اندر تشریف لائے اور فرمایا عارف کیا چاہتا ہے۔ ابن عربی نے جواب دیا۔ ملاء اعلیٰ کے اسرار معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ قطب وقت نے ملاء اعلیٰ کی طرف تمسخرانہ انداز میں دیکھا اور کہا لکھ جو کچھ کہ مجھ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ابن عربی قطب وقت کو دیکھ رہے تھے اور ایسا محسوس کر رہے تھے کہ خود ان پر اسرار الٰہی نازل ہو رہے ہیں...... ابن عربی پر بے پناہ وجد طاری ہو گیا اور انہوں نے اپنے محسوسات کو نظم کرنا شروع کیا۔ ابن عربی ایسا محسوس کر رہے تھے کہ وہ خود اپنی طرف سے کچھ نہیں بول رہے ہیں بلکہ وہ قطب وقت ہی کے دل و دماغ کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ جیسے ہی اس نظم کا سلسلہ ختم ہوا۔ قطب وقت نے فرمایا: ان اسرار کو لوگوں پر ظاہر مت کرو کیونکہ یہ الٰہی اسرار ہیں۔ ابن عربی نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور پھر ان کو کسی پر ظاہر ہونے

---

[1] ایضًا: ۳۵۔ [2] ایضًا: ۳۸۔ [3] ایضًا: ۳۹۔

نہیں دیا۔ ❶

ابن عربی نے جامع تونس کے مقصورہ مثنی میں بیٹھ کر چند اشعار لکھے، جب تین مہینے بعد اشبیلیہ پہنچے تو وہاں کی جامع عدیس میں ایک شخص کو وہی اشعار پڑھتا ہوا پایا۔ ابن عربی نے اس سے پوچھا کہ یہ اشعار اسے کہاں سے ملے ہیں اس نے کہا: فلاں رات ایک شخص یہ اشعار پڑھتا ہوا گزرا اور ہمیں اچھے معلوم ہوئے تو ہم نے ان کو یاد کرلیا۔ اور تاریخ بالکل وہی بتائی جس رات کو ابن عربی نے لکھا تھا اس سے ابن عربی نے یہ نتیجہ نکالا ہو نہ ہو۔ خضر نے ان کے یہ اشعار اشبیلیہ پہنچائے ہیں۔ ❷

ایک مرتبہ ۵۸۶ھ میں ایک شخص نے ابن عربی کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کے ٹھنڈی ہونے کے واقعہ سے انکار کیا اور اس کی تاویل کی۔ ابن عربی نے سامنے رکھی ہوئی انگیٹھی کے جلتے اور دہکتے ہوئے انگارے اس کے دامن میں انڈیل دیئے۔ وہ ان انگاروں سے کھیلتا رہا۔ مگر آگ اس کو جلا نہ سکی اور پھر جب ان انگاروں کو انگیٹھی میں الٹ دیا تو آگ کی خاصیت واپس لوٹ آئی۔ یہ دیکھ کر وہ شخص معجزات انبیا کا قائل ہو گیا۔ ❸

ابن عربی کے شیخ یوسف بن یخلف الکرمی نے ایک دن بطور طنز کہا آج کل ابن عربی تو زندوں سے زیادہ مردوں کی صحبت پسند کرتے ہیں۔ ابن عربی نے شیخ یوسف کو اس کا مشاہدہ کرانے کا تہیہ کرلیا۔ ایک دن قبرستان میں بیٹھ کر شیخ یوسف کو بلا بھیجا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مردے ابن عربی سے بات چیت کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ ان روحوں کا ان پر ایسا زبردست بوجھ محسوس ہوا کہ انہیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان کے اعضا پھٹ جائیں گے ابن عربی کے فارغ ہونے تک شیخ یوسف اپنی گردن اٹھا نہ سکے۔ جب وہ وہاں سے اٹھے تو ابن عربی کے کمالات کا اعتراف کر لیا۔ ❹

ابن عربی نے اپنی دو سال سے بھی کم عمر بچی زینب سے جماع کے متعلق ایک مسئلہ

---

❶ رسائل ابن عربی، رسالہ منزل قطب: ۲/ ۱٤۔ ❷ فتوحات مكية: ۳/ ۳۳۹۔
❸ ايضًا: ۲/ ۳۷۱۔ ❹ فتوحات مكية: ۳/ ٤٥۔

پوچھا تو وہ فوراً بول پڑی۔ یہ دیکھ کر بچی کی ماں اور نانی چیخ اٹھی اور بچی کی نانی تو بے ہوش ہو گئی۔ [1]

۵۹۹ھ میں جبکہ ابن عربی مکہ میں تشریف فرما تھے۔ ایک عورت نے خواب دیکھا کہ قیامت ہو چکی ہے اور سب کے اعمال کا حساب کتاب ہو گیا ہے۔ اس عورت کے ہاتھ میں جہنم سے چھٹکارے کا پروانہ دیا گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں یہ پروانہ لیا ہی تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی مٹھی بند ہو گئی۔ لوگوں نے اس کو کھولنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کھلنے کی بجائے اور بند ہوتی جا رہی تھی۔ علما و فقہاء اور اطباء اس کے متعلق کوئی تدبیر نہیں بتا سکے۔ آخر میں ابن عربی کو بلایا گیا اور انہوں نے چپکے سے عورت کے کان میں کہا کہ اپنا ہاتھ منہ تک لے جاؤ اور اس کو نگل جاؤ۔ عورت نے ایسا ہی کیا مٹھی فوراً کھل گئی اور وہ عورت سر الٰہی کو نگل گئی۔ لوگوں نے جب حیرت زدہ ہو کر سبب دریافت کیا تو ابن عربی نے حضرت امام مالک کے زمانہ کے ایک عجیب و غریب واقعہ سے استدلال کیا۔ [2]

ابن عربی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ کعبۃ اللہ کو مجھ پر بڑا ہی طیش آ گیا۔ وہ اپنی بنیادوں سے بلند ہو کر ابن عربی پر گر جانا چاہتا تھا۔ ابن عربی نے حجر اسود کو ڈھال بنایا۔ انہوں نے کعبۃ اللہ کو یہ کہتے ہوئے صاف طور پر سنا کہ ذرا نزدیک تو آؤ۔ دیکھو میں تمہیں کیا کرتا ہوں۔ کب تک تم میری قدر گھٹاتے رہو گے اور عارفین کو مجھ پر فضیلت دیتے رہو گے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے لیے ساری عزت اور بڑائی ہے! میں ہرگز ہرگز تمہیں اپنا طواف کرنے نہیں دوں گا۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ اس وقت میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو ادب سکھانا چاہتا ہے۔ میں نے خدا کا شکریہ ادا کیا۔ کعبہ اپنی بنیادوں سے بلند ہو کر اسی طرح مجھ پر حملہ کرنا چاہتا تھا جس طرح کہ ایک شخص اپنا دامن سمیٹ کر اپنے دشمن پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ میں نے کعبہ کی تعریف شروع کر دی۔ جیسے جیسے میں اس کی تعریف کرتا جا رہا تھا۔ اس کا غصہ بھی ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ اور وہ اپنی بنیادوں پر جمتا جا رہا تھا۔ اس نے پھر میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں طواف شروع کروں جب میں حجر اسود کے پاس پہنچا تو میری زبان سے کلمۂ

---

[1] ایضاً: ۶۰۔ [2] ایضاً: ۶۰۔

شہادت نکلا جو حجر اسود میں متمکن ہو گیا۔ میں نے کعبہ کی تعریف میں کئی رسائل لکھے ہیں جن کو تاج الرسائل کے نام سے مرتب کر دیا ہے۔ [1]

اس قسم کے بیسیوں واقعات ان کی مختلف کتابوں سے چن کر پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن ان واقعات سے زیادہ ان کے خصوصی مسائل جیسے مسئلہ وحدت الوجود، مسئلہ اکتساب مقام نبوت، مسئلہ ختم ولایت وغیرہ لوگوں کے دلوں میں زیادہ کھٹکتے رہے ہیں۔ ہر زمانہ میں علما کے درمیان ان نزاعی مسائل کے متعلق موافق یا مخالف بحث ہوتی رہی ہے۔ علما و مشائخ کی ایک بڑی تعداد ابن عربی کی زندگی اور ولایت کی قائل تھی اور جو بھی ابن عربی پر تنقید کرتا وہ ان سب کا نشانۂ ملامت بن جاتا تھا مگر ان کی موافقت کرنے والے بھی ان کے خیالات کے سمجھنے سے قاصر تھے۔ کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ ابن عربی کے خیالات کی وضاحت کر سکیں بعض لوگوں نے ان مسائل کے ثبوت کے لیے کشف کی آڑ لی ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ مسائل عقلی و نقلی دلائل سے ثابت نہیں کیے جا سکتے۔ اس کے لیے سلوک کی مختلف منزلیں طے کرنی ہوں گی اور کشف کے ذریعہ ان مسائل کی حقانیت کا مشاہدہ کرنا ہو گا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کشف ہی پر ان کی بنیاد ہو تو پھر وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا اختلاف کیونکر ہوا۔ کشف تو بہر حال ایک ہی راہ دکھا سکتا ہے۔ اب ہم ذیل میں ابن عربی کے ان مذکورۂ بالا مسائل کے متعلق صرف توضیحی بحث کرتے ہیں۔

مسئلہ وحدت الوجود

وحدت الوجود سے ابن عربی کیا مراد لیتے تھے، ان کی کتابوں سے صاف اور واضح نہیں ہوتا۔ انہوں نے اکثر جگہ ارشادات میں گفتگو کی ہے۔ اگر کسی جگہ ان پر گرفت ہوئی تو انہوں نے جھٹ سے ایسے معانی بیان کر دیے ہیں جن کی حقانیت میں کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انہوں نے ایک مرتبہ لکھا:

---

[1] فتوحات مکیة ١/ ٧٠٠، ٧٠١۔ یہ کل آٹھ رسائل ہیں جو مطبع کردستان العلمیہ مصر سے ١٣٢٨ھ میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ الہیہ، قدسیہ، اتحادیہ، سریانیہ، مشہدیہ، فردوسیہ، عذریہ، وجودیہ۔

يا من يراني ولا اراه
كم ذا اراه ولا يراني

اے وہ جو مجھ کو دیکھتا ہے اور میں اس کو نہیں دیکھتا، کتنی مرتبہ میں اس کو دیکھتا ہوں اور وہ مجھ کو نہیں دیکھتا۔

کسی نے اس پر گرفت کی اور ابن عربی سے پوچھا تم کس طرح یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ تم کو نہیں دیکھتا جبکہ تم یہ جانتے ہو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ ابن عربی نے فوراً اس شعر کی یوں تضمین کی اور کہا:

يا من يراني مجرما ولا اراه آخذ
كم ذا اراه منعما ولا يراني لائذا

اے وہ جو مجھ کو گنہگار دیکھتا ہے اور میں اس کو گرفت کرنے والا نہیں دیکھتا، کتنی مرتبہ میں اس کو احسان کرنے والا دیکھتا ہوں اور وہ مجھ کو پناہ لینے والا نہیں دیکھتا۔

اب اس شعر کی حقانیت میں کسی کو کیا شبہ اور اعتراض ہو سکتا ہے۔

ابن عربی نے وحدت الوجود کے متعلق مختلف حیثیتوں سے اظہار خیال کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

الرب حق والعبد حق
ياليت شعري من المكلف
ان قلت عبد فذاك ميت
او قلت رب انّٰى يكلف

پروردگار بھی حق ہے اور بندہ بھی حق ہے۔ اے کاش! میں یہ جانتا کہ ان میں سے کون مکلف ہے اگر تم کہو کہ وہ بندہ ہے تو وہ مردہ ہے اور اگر یہ کہو کہ وہ پروردگار ہے تو وہ مکلف کیونکر ہو سکتا ہے۔

ایک دوسری جگہ اسی مضمون کو دوسرے پیرایہ میں ادا کیا ہے، کہتے ہیں:

تعجبت من تکلیف ما هو خالق
له وانا لا فعل لی فاراه
فیالیت شعری من یکون مکلفا
وما ثم الا اللّٰه لیس سواه

مجھے اس شخص کے مکلف بنانے پر تعجب ہے جس کا وہ خالق ہے حالانکہ میں اپنا کوئی فعل نہیں دیکھتا پس اے کاش: مجھے یہ معلوم ہوتا کہ کون مکلف ہے اس لیے کہ یہاں اللہ کے سوائے کسی اور کا وجود نہیں ہے۔

ایک جگہ خدا اور بندے کو ایک شفاف شیشے اور اس کے اندر کی شراب سے تشبیہ دی ہے۔فرماتے ہیں:

رق الزجاج و رقت الخمر
فتشاکلا فتشابه الامر
فکانما خمر ولا قدح
وکانما قدح ولاخمر

شیشہ شفاف ہو گیا اور شراب بھی شفاف ہو گئی۔ دونوں کی شکل ایک ہو گئی اس لیے معاملہ مشتبہ ہو گیا۔ پس یوں کہنا ٹھیک ہو گا کہ شراب ہے اور پیالہ نہیں ہے یا پیالہ ہے اور شراب نہیں ہے۔

ایک دوسری جگہ لکھا ہے:

فلولاه لما کنا
ولو لا نحن ما کان

پس اگر وہ نہ ہوتا ہم نہ ہوتے اور اگر ہم نہ ہوتے تو وہ نہیں ہوتا۔

فان قلنا بانا هو
یکون الحق ایانا

پس اگر ہم یہ کہیں کہ ہم وہ ہیں تو ہم ہی سے حق مراد ہو گا۔

فابد انا واخفاه

وأبداه و أخفانا

پس اس نے ہم کو ظاہر کیا اور اپنے آپ کو چھپالیا اور اپنے آپ کو ظاہر کیا اور ہم کو چھپالیا۔

فکان الحق اکوانا

وکنا نحن اعیانا

پس حق اکوان ہو گیا اور ہم اعیان ہو گئے۔

فیظهرنا لنظهره

سرارا ثم اعلانا

پس وہ ہم کو ظاہر کرتا ہے تاکہ ہم اس کو ظاہر کریں پہلے چھپا کر پھر کھلم کھلا۔

ابن عربی نے فصوص الحکم میں کئی جگہ وحدت الوجود کی طرف اشارے کیے ہیں۔ایک جگہ کہتے ہیں:

فان العارف من یری الحق فی کل شئ بل یراه عین کل شئ

(فص هارونیه)

''پس عارف وہی ہے جو ہر چیز میں حق کو دیکھتا ہے بلکہ وہ حق ہی کو ہر چیز کا عین دیکھتا ہے۔''

فص لقمان میں آنحضرت ﷺ کی اس حدیث قدسی کی طرف (جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب بندہ نوافل زیادہ پڑھتا ہے تو خدا اس کے قریب ہوجاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کی آنکھ، کان، زبان، ہاتھ اور پاؤں ہوجاتا ہے) اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فعین مسمی العبد هو الحق لا عین العبد۔

''پس بندے کا عین مسمی وہی حق ہے وہ بندے کا عین نہیں ہے۔''

اس جگہ ابن عربی نے عبد کے مسمی اور خود بندے کے درمیان تفریق کی ہے:

فص ہود میں اسی حدیث قدسی پر بحث کرتے ہوئے صاف لکھا ہے:

فلا قرب اقرب من ان یکون هویته عین اعضاء العبد وقواه لان عینه تعالٰی بعینه موجودة فی کل صغیر وکبیر ولیس العبد سوی هٰذا الاعضاء والقوی فهو حق مشهود فی خلق متوهم فالخلق معقول والحق محسوس مشهود عند المومنین و اهل الکشف والوجود وما عدا هٰذین الصنفین فالحق عندهم معقول والخلق مشهود فهم بمنزلة الماء الملح الاجاج والطائفة الاولٰی بمنزلة الماء العذب الفرات السائغ لشاربه۔

''پس کوئی نزدیکی اس سے زیادہ نزدیک نہیں ہوسکتی کہ خدا کی ہویت بندے کے اعضاء وقوی کے عین ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عین بعینہٖ ہر چھوٹی اور بڑی چیز میں موجود ہے اور بندہ ان اعضاء اور قوی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا پس موہوم مخلوق میں حق کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ پس وہ لوگ جو مومن ہیں اور اہل کشف وجود ہیں مخلوق کو عقلی طور پر جانتے ہیں اور حق کا حسی مشاہدہ کرتے ہیں اور ان دونوں صنفوں کے علاوہ دوسرے جو لوگ ہیں وہ حق کو عقلی طور پر جانتے ہیں اور مخلوق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ پس ایسے لوگ کھارے بدمزے پانی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور پہلی جماعت یعنی اکابر صوفیہ پانی پینے والے کی پیاس بجھانے والے میٹھے اور شیریں پانی کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

اور آگے چل کر واضح طور پر لکھا ہے:

انه عین الاشیاء۔

''بے شک (اللہ تعالیٰ) اشیاء کا عین ہے۔''

فص سلیمانیہ میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے:

انما الکون خیال وهو حق فی الحقیقة
کل من یفهم هٰذا حازا اسرار الطریقة

بے شک عالم ایک خیال ہے اور وہ حقیقت میں حق ہے اس بات کو جو شخص سمجھتا ہے وہی طریقت کے اسرار پر حاوی ہو گیا ہے۔

فتوحات مکیہ میں بھی کئی جگہ اس مسئلہ کی طرف اشارے کیے ہیں چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

ففی الحق عین الخلق ان کنت ذا عین
وفی الخلق عین الحق ان کنت ذا عقل

"پس حق ہی میں خلق کا عین ہے اگر تو آنکھ والا ہے اور خلق ہی میں حق کا عین ہے اگر تو عقل والا ہے۔"

فان کنت ذا عین وعقل معا فما
تری غیر شي واحد فیه بالفعل

"پس اگر تو آنکھ اور عقل والا دونوں ہو تو بالفعل ایک ہی چیز کے سوا کسی اور کو نہیں دیکھے گا۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں: [1]

فالحق معنا اینما کنا فی عدم او وجود فبمعیته ظهرنا فنحن ذونور ولا شعور لنا۔

"پس جہاں کہیں بھی ہم ہوں عدم یا وجود میں حق ہمارے ساتھ ہے پس ہم اسی کی معیت میں ظاہر ہوئے اور ہم نور والے ہوئے اور ہمارے لیے کوئی شعور نہیں تھا۔"

معرفۃ رجال الحیرۃ والعجز کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک صاحب عقل یہ شعر یوں پڑھتا ہے:

وفی کل شيئ له آیة
تدل علی انه واحد

[1] فتوحات: ۳/ ۳۲۹۔

اور ہر چیز میں اسی کی نشانی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک ہے۔

مگر ایک صاحب تجلی اس کے مقابلے میں یہ شعر اس طرح پڑھے گا:

وفی کل شیئ له آیة

تدل علی انه عینه

اور ہر چیز میں اسی کی نشانی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اس کا عین ہے۔

اس کے متعلق مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان دونوں اشعار کے درمیان وہی فرق ہے جو ان دونوں کلموں (یعنی واحد اور عینہ) کے معانی میں پایا جاتا ہے پس وجود میں اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہے اور اللہ کو اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ اسی حقیقت کی بنا پر کہا جس نے بھی کہا کہ میں ہی خدا ہوں۔ جیسا کہ ابو یزید بسطامی اور دوسرے قدیم اہل اللہ نے دعویٰ کیا تھا۔ [1]

ابن عربی نے کئی جگہ اہل نظر اور اہل تصوف کے درمیان تفریق اور تمیز کی ہے اور پہلے گروہ کو علمائے رسوم سے تعبیر کیا ہے جو محض حقیقت کی تہ تک نہ پہنچنے کی وجہ سے اہل تصوف پر طعن تشنیع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ابن عربی نے ان مسائل پر کوئی مستقل اور واضح بحث نہیں کی ہے۔ ہر جگہ مبہم اشعار اور فقروں سے کام لیا ہے۔ شاید انہیں اس کا ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں علمائے ظاہر ان کے ساتھ حلاج کا سا سلوک نہ کریں چنانچہ ایک جگہ خود ہی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یا رب جوهر علم لو ابوح به

لقیل لی أنت ممن یعبد الوثنا

علم کے بہت سے جواہر ریزے ایسے ہیں جن کو اگر ظاہر کروں تو لوگ یہ کہیں گے کہ تم بت پرست ہو۔

---

[1] فتوحات مكية: ١/ ٢٧٢۔

ولاستحل رجال مسلمون دمی
یرون اقبح ما یا تونہ احسنا

اور البتہ وہ مسلمان لوگ جو اپنے برے سے برے کرتوتوں کو بھی اچھا سمجھتے ہیں میرا خون حلال کر دیتے۔

خدا اور بندے کے متعلق ابن عربی کے ان خیالات کو خدا کے وجود حق، انسان کے بلند مرتبے اور کائنات کے فنائے کلی کو ثابت کرنا قرار دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری کائنات انسان کے لیے پیدا کی ہے انسان خدا کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور دنیا میں خدا کا ظہور انسان کی وجہ سے ہوا ہے اور اگر انسان نہ ہوتا تو یہ کائنات بھی وجود میں نہیں آتی۔ خدا کا وجود ازلی و ابدی ہے۔ اس کے وجود کے مقابلے میں اس ساری کائنات کے وجود کی جس میں انسان کا وجود بھی شامل ہے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن خدا اور اس کے ماسوا کے درمیان کسی قسم کی تمیز نہ کرنا بداہتہ غلط ہے۔ ابن عربی کی تحریروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ خدا کے علاوہ دوسری چیزوں کے وجود کو بھی مانتے تھے۔

فالعین واحدۃ والحکم مختلف
وذاك سر لاھل العلم ینکشف

پس عین ایک ہے اور حکم مختلف ہے اور یہ ایک راز ہے جو اہل علم پر منکشف ہوتا ہے۔

وحدۃ الوجود کے قائلین نے بھی وحدت کے ماننے کے باوجود بندے اور پروردگار کے درمیان تمیز کی ہے چنانچہ ایک مشہور شعر ہے۔

العبد عبد و ان ترقی
والرب رب و ان تنزل

بندہ بندہ ہے اگر چہ وہ ترقی ہی کیوں نہ کرے۔ اور پروردگار پروردگار ہی ہے اگر چہ وہ نیچے کیوں نہ اتر آئے۔[1]

صوفیہ کے نزدیک حفظ مراتب ضروری ہے۔ اس کا نہیں ماننے والا زندیق ہو جاتا ہے۔

ہر مرتبہ از وجود حکمی دارد
گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

”وجود کا ہر ایک مرتبہ علیحدہ حکم رکھتا ہے۔ اگر تم مراتب کا لحاظ نہ رکھو تو تم زندیق بن جاؤ گے۔“

ابن عربی کے بعد کے صوفیوں نے اس مسئلہ کو اتنا الجھا دیا ہے کہ اس کی حقیقت واضح ہونے کی بجائے اور زیادہ مبہم ہو گئی۔ عام طور پر یہ عقیدہ ہو گیا کہ یہ کائنات جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں بالکل ہیچ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوائے کسی اور کا کوئی وجود نہیں ہے۔

خودی کفر است نفی خویش کن زود
کہ جز حق درحقیقت نیست موجود

یہ عالم جو ہمیں نظر آتا ہے ایک جسم ہے جس کی روح درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے چنانچہ شیخ سعد الدین حموی (المتوفی: ۶۵۰ھ) فرماتے ہیں:

حق جان جہان است و جہاں جملہ بدن
ارواح و ملائک چو حواس ایں تن
افلاک و عناصر و موالید اعضاء
توحید ہمین است دگر شیوہ وفن

عالم کا یہ تنوع اسی ایک ذات الٰہی کے مختلف مظاہر کا نتیجہ ہے۔

درکون و مکان نیست عیاں جز یک نور
ظاہر شدہ آں نور بانواع ظہور

خدائے تعالیٰ انسان کی ذات سے الگ نہیں ہے۔ چنانچہ ایک صاحب صوفی صافی کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے صوفی صافی تو خدامی طلبی
کوری مگراز خویش جدامی طلبی

حق باتو زماں زماں سخن می گوید
سرتابقدم اوست گرامی طلبی

بعض نے ابن عربی ہی کے نقطۂ نظر کے مطابق کہ انہ عین الاشیاء (اللہ تعالیٰ اشیاء کا عین ہے) یوں تصریح کی ہے:

غیرتش غیر درجہاں نگذاشت
لاجرم عین جملہ اشیاء شد

ان تصورات کے متعلق امام ابن تیمیہ نے جو تنقید کی ہے اس کی بحث آگے آئے گی۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ خود صوفیہ کے درمیان وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر اختلاف پیدا ہو گیا اور ایک طبقہ نے اس نقطۂ خیال کی سختی کے ساتھ تردید شروع کر دی جس کے سرگروہ شیخ علاء الدولہ سمنانی (المتوفی: ۷۳۶ھ) تھے انہیں نے سب سے پہلے وحدۃ الوجود کے مقابلے میں وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کیا جس کو آگے چل کر حضرت مجدد الف ثانی نے بڑی شہرت دی تھی۔

مسئلہ اکتساب مقام نبوت

نبوت اور رسالت ایک خاص عطیہ الٰہی تھا جو ہر کسی کو نہیں مل سکتا تھا۔ صرف اسی شخص کو عطا ہوتا تھا جو خدا کا برگزیدہ ہوتا تھا۔ آنحضرت ﷺ پر اس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آپ آخری نبی اور رسول تھے اور خاتم النبیین تھے اور آپ نے یہ اعلان فرمایا:

((لا نبی بعدی)) [1]

"میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔"

اس کے باوجود حدیثوں میں مذکور ہے کہ قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے، صلیب توڑیں گے، سوروں کو قتل کریں گے اور دنیا میں عدل وانصاف قائم کریں گے۔ اہل کتاب میں سے کوئی آدمی ایسا نہیں ہوگا جو آنحضرت ﷺ پر ایمان نہ لایا ہو۔ اس سے محی الدین ابن عربی یہ استدلال کرتے ہیں کہ آپ کے بعد کوئی نبی ایسا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل، ح: ۳۴۵۵۔

نہیں آئے گا جو کوئی نئی شریعت جاری کرنے والا ہو۔ بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شریعت کو قائم کرے گا۔ دوسرے الفاظ میں تشریعی نبوت ختم ہو چکی ہے، مگر نبوت کا مقام باقی ہے:

فهذا هو الذى انقطع وسد بابه لا مقام النبوة [1]

''پس نئی شریعت کی طرف بلانے کا زمانہ ختم ہو چکا اور اس کا دروازہ بند ہو چکا۔ لیکن نبوت کا مقام بند نہیں ہوا۔''

ابن عربی کے پاس نبوت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مقام ہے جس کو انسان حاصل کرتے ہیں:

فالنبوة مقام عند اله يناله البشر وهو مختص بالاكابر من البشر۔ [2]

''پس نبوت اللہ کے نزدیک ایک مقام ہے جس کو انسان پاتا ہے اور وہ برتر انسانوں کے لیے مخصوص ہے۔''

ایک شخص کسب کے ذریعہ یہ مقام حاصل کرسکتا ہے۔ یعنی روحانی ریاضتوں کے ذریعہ ایک نبی کی سی کیفیت اور معرفت پیدا کرسکتا ہے۔

اس مسئلہ میں ابن عربی منفرد نہیں ہیں بلکہ ان سے پہلے امام غزالی (المتوفی: ۵۰۵ھ) کی رائے بھی یہی تھی۔ چنانچہ ابن عربی لکھتے ہیں:

فاذا وقفتم على كلام احد من اهل اللّٰه اصحاب الكشف يشير بكلامه الى الاكتساب مثل الغزالى وغيره فليس مراد هم سوى ماذكرناه۔

''اگر تم کو خدا والے اصحاب کشف میں سے کسی کی یہ بات معلوم ہو کہ وہ اکتساب مقام نبوت کی طرف اشارہ کرتا ہے جیسا کہ امام غزالی وغیرہ نے کیا تھا تو ان کی مراد اس کے سوائے کچھ اور نہیں تھی جس کو کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔''

پھر اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

---

[1] فتوحات مكية: ۲/ ۳۔ [2] ايضًا۔

فسددنا باب اطلاق لفظ النبوة علىٰ هذا المقام مع تحققه لئلا يتخيل متخيل ان المطلق لهذا اللفظ يريد نبوة التشريع فيغلط كما اعتقده بعض الناس فى الامام ابى حامد فقال عنه انه يقول باكتساب النبوة فى كيمياء السعادة وغيره معاذ اللّٰه ان يريد ابو حامد غير ما ذكرناه۔ [1]

''پس اس مقام پر اس کے ثابت ہونے کے باوجود نبوت کے لفظ کا اطلاق ہم نے بند کر دیا ہے تا کہ کوئی خیال کرنے والا یہ خیال نہ کرے کہ اس لفظ نبوت کا اطلاق کرنے والا تشریعی نبوت مراد لیتا ہے اور اس طرح غلطی میں پڑ جاتا ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے امام حامد غزالی کے متعلق یقین کر لیا اور یہ کہنا شروع کیا کہ انہوں نے اپنی کتاب کیمیائے سعادت وغیرہ میں نبوت کے اکتسابی ہونے کا ذکر کیا ہے۔ خدا کی پناہ ابو حامد کی مراد اس کے سوا کچھ نہیں تھی جس کو کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔''

صوفیہ کا تصور یہ تھا کہ مراقبہ کرنے سے ملاء اعلیٰ سے اتصال پیدا ہوتا ہے اور صفاء باطنی کے حاصل ہونے کے بعد ان کے دلوں پر کلمات حق کا نزول ہونے لگتا ہے اور لوح وجود کی ساری باتیں ان کے آئینہ دل پر ہویدا ہو جاتی ہیں۔ اسی اتصال کے لیے تمام صوفی تنہائی کی جگہ پر بیٹھ کر مراقبہ اور چلہ کشی پر زور دیتے ہیں اور یہ استدلال کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے غار حرا کے اندر اسی قسم کا مراقبہ کیا تھا۔ امام ابن تیمیہ نے کئی جگہ اس نقطۂ خیال کی تردید کی ہے کہ خلوت میں بیٹھ کر مراقبہ کرنے سے ملاء اعلیٰ سے اتصال پیدا ہوتا ہے اور نبی کی سی معرفت حاصل ہوتی ہے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں:

''خلوات کے متعلق غار حرا کی خلوات سے استدلال لینا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عبادتیں ابھی تک مشروع نہیں ہوئی تھیں۔ نبوت کے ملنے کے بعد عبادتوں کا ایک خاص نظام جاری ہو گیا تو نمازوں اور مسجد کے اعتکاف

---

[1] فتوحات مكية: ۲/ ۳۔

نے ان کی جگہ لے لی۔ نبوت سے پہلے کی زندگی کو سامنے رکھ کر اس سے استدلال لینا ٹھیک نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے ملنے کے بعد غار حرا میں پھر کبھی اعتکاف نہیں کیا۔" [1]

بعض لوگ چلہ کشی کی مدت چالیس دن قرار دیتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ خدا نے انہیں چالیس دن کے لیے طور پر بلایا تھا۔ اس قسم کا استدلال غلط ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عمل ہمارے لیے نمونہ نہیں ہے۔ اس قسم کی خلوت سے اگر انزال وحی وغیرہ کی سی باتیں مراد ہیں تو یہ غلط ہے۔" [2]

صرف خلوت سے کوئی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ عقل اور سمع سے معرفت حاصل ہوتی ہے اگر کوئی انسان سب سے الگ تھلگ ہو کر خلوت میں بیٹھتا ہے تو یہ کیسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کو معرفت حاصل ہوجاتی ہے۔ [3]

امام ابو حامد نے چین اور روم کی دیواروں کے صیقل کرنے سے دل کے صیقل کرنے کو تشبیہ دی ہے جو غلط ہے۔ ابو حامد وغیرہ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام علوم نفوس فلکیہ میں منقوش ہیں اور جب دل کے آئینہ کو صیقل کیا جائے تو اس پر ان نفوس ملکیہ کا عکس پڑتا ہے۔ یہ درحقیقت ابن سینا کی اتباع میں لوح محفوظ کو نفوس فلکیہ کا نام دیا ہے۔ قرآن مجید کا لوح محفوظ نفوس فلکیہ نہیں ہے۔ صوفیہ نے فلاسفہ کے دماغ پر شریعت کا لباس چڑھا دیا ہے اور شرعی اصطلاحات کو فلسفیانہ اصطلاحات پر منطبق کر کے ہمیں یہ دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ خیالات بنیادی طور پر شرعی ہیں۔ [4]

صوفیہ نے جوع (بھوک) سہر (بیداری) صمت (خاموشی) اور خلوت (تنہائی) کی تعلیم دی ہے اور ان میں شرعی حدود کا کوئی لحاظ نہیں کیا ہے۔ ابن عربی نے ان کے تفصیلی فضائل بیان کیے ہیں۔ ابو طالب مکی نے بھی ان کی اہمیت بیان کی ہے۔ مگر ابو طالب مکی ابن عربی سے زیادہ کتاب وسنت کے پیرو تھے۔ [5]

---

[1] مجموعة الرسائل والمسائل جزء: ٥/ ٨٤، ٨٥۔ [2] ایضًا: ٨٥۔

[3] ایضًا: ٨٨۔ [4] ایضًا: ٩١۔ [5] ایضا: ٩١، ٩٢۔

ان خلوتوں کے لیے مہجور و متروک مسجدوں اور مقبروں کو اپنی جگہ بنانا ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں احوال شیطانیہ حاصل ہوتے ہیں۔ جن اور شیاطین انسانوں کی صورت میں آ کر یہ کہتے ہیں کہ ہم فلاں ہیں اور فلاں ہیں۔ صوفیہ یہ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ان میں سے بعض نے آنحضرت ﷺ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا اور آپ نے اس کا جواب دیا۔ اگر صحیح ہو تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام نے آنحضرت ﷺ سے اپنے اختلافات کیوں نہیں حل کر لیے۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ صحابہ آنحضرت ﷺ کی قبر پر جاتے اور ان سے سوالات کر کے اپنے شکوک رفع کر لیتے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو باغ فدک کی میراث کے متعلق شبہ پیدا ہوا کیا وہ آنحضرت ﷺ سے اپنے اس شبہ کو دور نہیں کر سکتی تھیں؟ [1]

تمام صوفیہ کرام نے قرآن و حدیث کی تعلیم ضروری قرار دی ہے مگر غلط کار صوفیوں نے ان کو چھوڑ کر اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کیا ہے جو غلط ہے۔'' [2]

صوفیہ کا یہ دعویٰ کہ وہ براہ راست خدائے تعالیٰ سے ہدایات حاصل کرتے ہیں غلط ہے۔'' [3]

امام ابن تیمیہ کی اس قسم کی جستہ جستہ بیسیوں تنقیدیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر طوالت کے خوف سے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ابن عربی نے نہ صرف مقام نبوت کے بقا کے مدعی تھے بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ نبوت کا مقام انہیں حاصل ہے۔ اسی لیے وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں اپنی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح نبی کی باتوں میں شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے اسی طرح ابن عربی کی باتوں میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ ایک جگہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وهذا الكتاب من ذٰلك النمط عندنا فوالله ماكتبت منه حرفا الاعن املاء الٰهی والقاء ربانی اونفث روحانی فی روع كيانی، هٰذا جملة الامر مع كوننا لسنا برسل مشرعين ولا

---

[1] ایضًا: ۹۴۔ [2] ایضًا: ۹۹۔ [3] ایضًا: ۱۰۰۔

انبیاء مکلفین بکسر اللام اسم فاعل فان رسالة التشریع و نبوة التکلیف قد انقطعت عند رسول اللّٰه محمدﷺ فلا رسول بعدهﷺ ولا نبی یشرع ولا یکلف و انما هو علم و حکمة وفهم عن اللّٰه فیما شرعه علی السنة رسله وانبیائه علیهم سلام اللّٰه وما خطه و کتبه فی لوح الوجود من حروف العالم و کلمات الحق فالتنزیل لا ینتهی بل هو دائم دنیا و آخرة۔

''اور یہ کتاب اس نہج پر ہمارے نزدیک پس قسم بخدا میں نے اس سے ایک حرف نہیں لکھا مگر خدا کی طرف سے املاء اور القاء ہونے کے بعد یا کیانی دل میں روحانی پھونک ہونے کے بعد۔ یہ سب کچھ اس کے باوجود کہ ہم شریعت کے لانے والے رسول اور دوسروں کو مکلف بنانے والے نبی نہیں ہیں، کیونکہ تشریعی رسالت اور تکلیفی نبوت محمد ﷺ پر منقطع ہو چکی ہے پس آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی رسول نہیں ہے اور نہ کوئی نبی ہے جو شریعت جاری کرسکتا ہو یا دوسروں کو مکلف بنا سکتا ہو۔ بلکہ وہ علم و حکمت ہے اور رسل و انبیاء علیہم السلام کی زبانوں سے پیش کی ہوئی شریعت کی سمجھ ہے اور لوح وجود میں حروف عالم اور کلمات حق سے جو کچھ لکھ دیا گیا ہے اس کا اترنا منتہی نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ دنیا و آخرت میں جاری رہتا ہے۔''

اللّٰه انشأ من طی و خولان [1]
جسمی فعدلنی خلقا و سوانی

اللہ تعالیٰ نے طی اور خولان سے میرے جسم کو بڑھایا اور پیدائشی طور پر مجھ کو ٹھیک اور برابر کیا۔

---

[1] ابن عربی باپ کی طرف سے طائی اور ماں کی طرف سے خولانی تھے۔ ان کے ماموں کا نام ابو مسلم الخولانی تھا۔

وانشأ الحق لی روحا مطهرة

فلیس بنیان غیری مثل بنیانی

اللہ نے میرے لیے ایک پاک روح پیدا کی پس میرے غیر کی کاٹھی میری کاٹھی کی طرح نہیں ہے۔

انی لاعرف روحا کان ینزل بی

من فوق سبع سمٰوٰت بفرقان

میں بے شک ایسی روح کو جانتا ہوں جو مجھ پر سات آسمانوں کے اوپر سے فرقان لے کر اترتی تھی۔

نرید قوله تعالی:﴿ اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا ﴾ [1]

اس سے ہماری مراد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ ''اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہارے لیے فرقان پیدا کرے گا۔''

وما انا مدع فی ذاك من نباءاك

اله ولكن جود احسان

میں اس بارے میں خدا کی خبر و نبوت کا مدعی نہیں ہوں بلکہ یہ اس کا جود اور احسان ہے۔

ان النبوة بیت بیننا غلق

و بینه موثق بقفل ایمان

بے شک نبوت ایک ایسا گھر ہے جو ہمارے اور اس کے درمیان بند ہے اور اس میں ایمان کا قفل لگا ہوا ہے۔

وانما قلنا ذٰلك لئلا یتوهم متوهم انی وامثالی ادعی نبوة لا واللّٰه ما بقی الا میراث وسلوك علیٰ مدرجة محمد رسول اللّٰه ﷺ خاصة وان كان للناس عامة ولنا ولا مثالنا

---

[1] ۸/الانفال:۲۹۔

خاصة من النبوة ما ابقى الله علينا منها مثل المبشرات ومكارم الاخلاق و مثل حفظ القرآن اذا استظهره الانسان فان هٰذا وامثاله من اجزاء النبوة والموروثة۔❶

''اور ہم نے بے شک یہ بات اس لیے کہی ہے تا کہ گمان کرنے والا یہ گمان نہ کرے کہ میں نے اور مجھ جیسے لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔نہیں قسم بخدا اب کوئی چیز باقی نہیں رہی سوائے میراث اور سلوک کے جو خاص آنحضرت ﷺ کے طریقہ پر ہو۔اگر چہ وہ لوگوں کے لیے عام ہے مگر ہمارے لیے اور ہم جیسوں کے لیے خاص ہے اس نبوت سے جو اللہ تعالیٰ نے اس سے ہم پر باقی رکھا ہے جیسے مبشرات اور مکارم اخلاق اور جیسے حفظ قرآن جب کہ انسان اس کو اپنے اوپر غالب کرے کیونکہ یہ اور اس قسم کی چیزیں موروثی نبوت کے اجزاء میں سے ہیں۔''

نبوت اور مقام نبوت میں ایک باریک فرق ہے جس کا نہ سمجھنے والا بسا اوقات لغزشوں کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے ہر ایک قول اور فعل کو اللہ کی طرف نسبت دینے لگتا ہے، حالانکہ قرآن مجید نے تمام اخلاق مسائل میں ذاتی علم اور کشف وشہود کی بجائے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے ایسی حالت میں ابن عربی کا یہ دعویٰ کہ وہ جو کچھ لکھتے اور بولتے ہیں اللہ ہی کی طرف سے ہے۔اسی وقت قابل قبول ہو سکتا ہے، جبکہ قرآن مجید اور سنت نبوی سے اس کی تائید ہوتی ہو۔

ابن عربی کا دعویٰ یہ تھا کہ فہم قرآن کی کنجی انہیں مل چکی ہے۔اس لیے وہ جو کچھ بھی بولتے اور لکھتے ہیں وہ قرآن ہی پر مبنی ہوتا ہے۔

فجميع مانتكلم فى مجالسى وتصانيفى انما هومن حضرة القرآن وخزائنه اعطيت مفتاح الفهم فيه الامداد منه.❷

''پس اپنی نشستوں اور تصنیفوں میں ہم جو کچھ بھی بولتے ہیں وہ قرآن ہی کے

---

❶ فتوحات مكية: ٣/ ٤٥٦۔ ❷ فتوحات مكية: ٣/ ٣٣٤۔

دربار اور اس کے خزانوں سے ہوتا ہے۔ مجھے اس کی سمجھ کی کنجی مل گئی ہے اور اس سے امداد لینے کا طریقہ حاصل ہو گیا ہے۔''

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض لوگوں میں کسب و ریاضت سے مخصوص عرفانی کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں، جو عام طور پر ایک نبی میں پائی جاتی ہیں جیسے غیب کی باتیں بتا دینا۔ خواب کی صحیح تعبیر پیش کرنا، مردوں سے بات چیت کرنا، معجزہ اور خوارق عادت اور کرامات وغیرہ کے واقعات دکھانا اور لوگوں پر عجیب وغریب اثرات کا مرتب کر دینا۔ ابن عربی میں بھی یہ کیفیتیں موجود تھیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا، کہ ابن عربی کو ایک نبی کا مقام حاصل ہو گیا تھا، کیونکہ ایک نبی کے لیے ان سب سے بڑھ کر وحی کے ذریعہ خدا سے اتصال پیدا کرنا ہوتا ہے۔

ایک نبی اور غیر نبی کے درمیان سب سے بڑا فرق یہی ہوتا ہے کہ نبی کو وحی آتی ہے اور دوسروں کو وحی نہیں آتی۔ آنحضرت ﷺ پر وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا۔ آنحضرت ﷺ کے بعد کسی کو بھی نبوت کا کلی مقام حاصل نہیں ہے۔ بعض جزئیات کے حصول کی بنا پر ابن عربی کا یہ دعویٰ کہ انہیں نبوت کا مقام حاصل ہے قابل قبول نہیں ہو سکتا، اگر ایسا ہوتا تو ہر مسئلہ میں ان کی پیش کی ہوئی رائے قطعی اور واجب التسلیم ہوتی اور کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔

مسئلہ ختم ولایت

ولایت بزرگی کا ایک بہت ہی اونچا درجہ ہے جو انبیا اور صدیقین وشہدا وصالحین کی کلی اتباع کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں اور آپ کے بعد بعض لوگوں نے کتاب وسنت کی کلی اتباع کر کے بہت بڑا درجہ حاصل کیا۔ ہر دور میں عام لوگ بعض بزرگوں کو ان کے بہترین علم وعمل کی بنا پر خدا رسیدہ اور ولی تصور کرتے تھے اور یہ تصور اب تک قائم ہے اور یہ قیامت تک جاری رہے گا۔ لیکن کوئی بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ فلاں شخص کتنا بڑا خدا رسیدہ اور ولی ہے اس کا علم صرف خدا کو حاصل ہے۔

سب سے پہلے ابو عبداللہ محمد بن علی الحکیم الترمذی نے ولایت کے مسئلہ پر خاتم الولایہ کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں ایسے خیالات کا اظہار کیا جن کو اس زمانے کے علما نے

ناپسند کیا اور ان پر کفر کے فتوے شائع کیے جن کی وجہ سے انہیں گھر سے بے گھر ہونا پڑا، لیکن ان کے خیالات پھیلتے ہی رہے اور اشاعت پاتے رہے اور جب ابن عربی کا زمانہ آیا تو انہوں نے اس پر مزید حاشیے چڑھائے، انہوں نے ولایت کی دو قسمیں بتائی ہیں، ایک ولایت عامہ مطلقہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے مخصوص ہے۔ اور دوسری ولایت خاصہ محمدیہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص متبعین کو حاصل ہوگی۔

ابن عربی نے ہر دور کا ایک خاتمہ الاولیاء مقرر کیا ہے۔ چنانچہ خود انہوں نے لکھا ہے کہ ۵۹۵ء میں انہوں نے اپنے دور کے خاتم الاولیاء کو دیکھا، یہ عرب ہی کا ایک نجیب الطرفین باشندہ تھا۔ ابن عربی نے اس کے اندر ولایت کی نشانی دیکھی جو اوروں کو دکھائی نہیں دی۔ مغربی افریقہ کے شہر فاس میں ان کو اس کا کشف حاصل ہوا تھا۔ [1]

ابن عربی اپنے آپ کو خاتم الاولیاء، سمجھتے تھے اور ولایت عامہ اور ولایت خاصہ دونوں کا حامل خیال کرتے تھے، چنانچہ خود ہی کہتے ہیں۔

انا ختم الولایة دون شك

لورث الهاشمی مع المسیح

میں بے شک خاتم الاولیا ہوں۔ مجھے حضرت مسیح کی ولایت کی وراثت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت کی میراث بھی ملی ہے۔

ابن عربی نے ۵۹۹ھ میں مکہ کے اندر ایک خواب دیکھا کہ کعبۃ اللہ کی دیوار سے دو اینٹوں کی جگہ خالی ہے۔ اس میں سے ایک اینٹ سونے کی اور دوسری اینٹ چاندی کی غائب تھی۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ان کی ذات ان دونوں اینٹوں کی جگہ پر منطبع ہوگئی ہے اور وہ دیوار پوری ہوگئی ہے اتنے میں ان کی آنکھ کھل گئی۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کی ذات ان دونوں اینٹوں کی عین ہے اور پھر اس خواب کی تعبیریں کی۔

انی فی الاتباع فی صنفی کرسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی الانبیاء علیهم السلام وعسیٰ ان اکون ممن ختم الولایة بی وما ذٰلك علی اللّٰه بعزیز [2]

---

[1] فتوحات مکیة: ۲/ ۴۹۔ [2] فتوحات مکیة: ۱/ ۳۱۹۔

”میں بے شک پیروی میں اپنے ہم جنسوں کے اندر وہی حیثیت رکھتا ہوں جو تمام انبیاء علیہم السلام کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ میں ان لوگوں سے قرار پاؤں جن پر ولایت ختم ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کچھ دشوار نہیں ہے۔“

ابوعبداللہ محمد بن علی الحکیم الترمذی نے ختم ولایت کا نظریہ پیش کیا۔ ابن عربی نے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ تفریق کی کہ ولایت کا درجہ نبوت اور رسالت سے اونچا ہے چنانچہ ان کا مشہور شعر ہے۔

مقام النبوة في برزخ
فويق الرسول ودون الولي

نبوت کا مقام بیچ میں ہے، اس کا مرتبہ رسول سے اوپر اور ولی سے نیچے ہے۔“

ایک دوسری جگہ اس تصور کی مزید تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

بين النبوة والولاية فارق
لكن لها الشرف الاتم الاعظم

نبوت اور ولایت کے درمیان ایک فارق ہے لیکن اسی کے لیے پورا اور اونچا شرف ہے۔

يعنو لها الفلك المحيط بسره
وكذلك القلم العلي الافخم

فلک محیط اپنے سر کے ساتھ اسی کی طرف جھکتا ہے اور اسی طرح بلند اور شاندار قلم بھی اسی کی طرف مائل ہوتا ہے۔

ان النبوة والرسالة كانتا
وقد انتهت ولها السبيل لاقوم

نبوت اور رسالت قائم تھی مگر اب ختم ہوگئی اور اب اس کے لیے سیدھا راستہ ہے۔

واقام بیتا للولایة محکما
فی ذاته فله البقاء الادوم

اورولایت کے لیے ایک مضبوط گھر اپنی ذات میں بنایا پس اسی کے لیے ہمیشہ کی بقا ہے۔

لا تطلبنه نهلیة یسعی لها
فیکون عند بلوغه یتهدم

تم ہرگز اس کو ختم کرنے کے درپے مت ہو، پس اس کی انتہا کے وقت وہ گھر ہی منہدم ہوجائے گا۔

صفة الدوام لذاته نفسیة
فهو الولی فقهره متحکم

ہمیشگی کی صفت اس کی ذات کے لیے نفسی اور ذاتی وصف ہے پس وہ ولی ہے اور اس کا غلبہ زبردست ہے۔

یاوی الیه نبیه ورسوله
والعالم الاعلیٰ ومن هوا قدم

اس کا نبی اور اس کا رسول اور عالم علوی اور ساری قدیم چیزیں اسی کے اندر پناہ لیتی ہیں۔

اس تفریق کا ایک منطقی نتیجہ یہ نکالا گیا کہ ایک ولی نبی سے افضل ہے کیونکہ ایک ولی خدا سے براہ راست علم وعرفان حاصل کرتا ہے اور ایک نبی واسطہ یعنی فرشتہ کے ذریعے الٰہی ارشادات پاتا ہے۔ جب اس تصور کو مزید ترقی ہوئی تو اس مسئلہ پر قیاس کر کے ایک دوسرا مسئلہ یہ پیدا کیا گیا کہ خاتم الاولیاء خاتم الانبیاء سے افضل ہیں، جب اس مسئلہ پر زیادہ لے دے شروع ہوئی تو ابن عربی نے فصوص الحکم کے فص عزیزیہ میں اس کی توضیح کی اور یہ دیکھا کہ ولایت نبوت سے افضل ہے کہ معنی یہ ہیں کہ ایک نبی کی ولایت ایک نبی کی نبوت سے افضل ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک عام اور تابع ولی عام نبی سے افضل ہے۔ کیونکہ عام

نبی بہر حال متبوع ہوتا ہے اور ایک عام ولی کی حیثیت محض تابع کی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ تابع متبوع کے برابر نہیں ہوسکتا۔

ابن عربی کی یہ تفریق کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ ایک شخص واحد کے متعلق ایک حیثیت سے افضل اور دوسری حیثیت سے مفضول قرار دینا بے معنی ہے۔ ان کے اس نظریہ کے مطابق ہر ایک نبی کی تین حیثیتیں قرار دینی پڑیں گی۔ اور اس کو ایک حیثیت سے افضل اور دوسری حیثیت سے مفضول قرار دینا پڑے گا۔ اگر اس کو مان بھی لیا جائے تو آنحضرت ﷺ کی ذات پر یہ بحث ختم ہوجاتی ہے۔ آپ کے بعد جتنے بھی اولیاء ہونگے وہ سب آنحضرت ﷺ کے تابع ہونگے اور ان کی ولایت آنحضرت کی نبوت یا رسالت کے برابر نہیں ہوسکتی۔ چہ جائیکہ اس سے بڑھ کر ہو۔ اس کے علاوہ اولیاء کے بارے میں نبوت اور رسالت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر ان کی ولایت کا موازنہ عام نبوت یا رسالت سے کرنا بالکل بے کار ہوجاتا ہے۔

ابن عربی نے اگرچہ اس قسم کی قابل فہم تفریق تو کی ہے۔ مگر امام ابن تیمیہ کے زمانے میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ ہر ولی نبی سے افضل ہے اور خاتم الاولیاء خاتم الانبیاء سے افضل ہیں اور جب ایسے لوگوں سے مناقشہ کیا جاتا تھا تو محض اپنا پہلو بچانے کی خاطر یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ ولایت نبی کی نبوت سے افضل ہے۔ [1]

اب ہم ذیل میں ان لوگوں کے بھی مختصر حالات درج کرتے ہیں جن کے نظریات و خیالات کی امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں نے تردید کی تھی۔

ابن الفارض

ان کا نام عمر، کنیت ابوحفص اور لقب شرف الدین تھا، ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ شرف الدین ابوحفص عمر بن ابی الحسن علی ابن المرشد بن علی ابن الفارض، یہ اصل میں ملک شام کے شہر حماۃ کے ایک مشہور خاندان کے فرد تھے۔ ۴/ ذوالقعدہ ۵۷۶ھ کو قاہرہ میں پیدا ہوئے اور مختلف اساتذہ وقت سے تعلیم و تربیت پائی ایک مدت تک وہ مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔

---

[1] دیکھو، مجموعة الرسائل والمسائل لابن تیمیه جزء رابع، صفحه: ۵۹۔

شاعری کا ذوق فطری تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے چالیس برس تک شاعری کی مگران کا جو دیوان ہے وہ بہت ہی مختصر ہے اور صرف ۱۲۸ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ تمام اشعار میں عشق ومحبت اور ہجر ووصال ہی کے مضامین ہیں اور سرزمین حجاز کے مقدس مقامات کا تذکرہ ہے۔

صوفیہ کے گروہ میں شیخ عمر ابن الفارض کی بڑی عزت تھی۔ ان کا لقب امام العشاق اور سلطان العاشقین تھا۔ چنانچہ ایک جگہ اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

نسخت بحبی آیة العشق من قبلی
فاهل الهوی جندی و حکمی علی الکل

میں نے اپنی محبت سے مجھ سے پہلے کے عشق ومحبت کی آیت کومنسوخ کردیا ہے۔ پس محبت والے میری فوج ہیں اور میرا حکم تمام پر جاری ہے۔

وکل فتی یهوی فانی امامه
وانی بری من فتی سامع العذل

اور ہر وہ نوجوان جو محبت کرتا ہے پس میں بے شک اس کا امام ہوں اور میں ایسے نوجوان سے بالکل الگ ہوں جو ملامت کرنے والوں کی باتوں کو سنتا ہے۔

ایک دوسری جگہ اپنے محبوب کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔

یحشر العاشقون تحت لوائی
وجمیع الملاح تحت لواکا

تمام عاشق لوگ قیامت کے دن میرے جھنڈے کے نیچے اٹھائے جائیں گے اور تمام خوبصورت تیرے جھنڈے کے نیچے آئیں گے۔

ان کا ہر ایک شعر عشق ومحبت کے جذبات سے لبریز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن حقیقی کے بے پناہ عاشقوں میں سے تھے چنانچہ ان کے چند اشعار بطور مثال کے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

زدنی بفرط الحب فیك تحیرا
وارحم حشی بلظی هواك تسعرا

تیری محبت کو زیادہ کر کے میری حیرانی کو بڑھا دے اور میری آنتوں پر رحم کر جو تیری محبت کی آگ سے بھڑک اٹھی ہیں۔

واذا سالتك ان اراك حقيقة
فاسمح ولا تجعل جوابی لن ترٰی

اور جب میں تجھ سے حقیقۃ تجھ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کروں تو میری اس خواہش کو پوری کر دے اور مجھے یہ جواب نہ دے کہ تو نہیں دیکھ سکتا۔

یا قلب انت وعدتنی فی حبهم
صبرا فحاذر ان تضیق وتضجوا

اے دل! تو نے مجھ سے ان کی محبت میں صبر کا وعدہ کیا تھا پس تو تنگ ہونے اور پریشان ہونے سے حذر کر۔

انّ الغرام هو الحیاة فمت به
صبا فحقك ان یموت وتعذرا

بے شک بے پناہ عشق ہی زندگی ہے۔ پس اس کی محبت میں تو مر جا۔ پس تجھے سزاوار ہے کہ تو مر جائے اور تیرا عذر قبول کیا جائے۔

قل للذین تقدمو قبلی ومن
بعدی ومن اضحٰی لا شجانی یرٰی

ان لوگوں سے کہہ دے جو مجھ سے پہلے گزر چکے ہیں اور جو میرے بعد آنے والے ہیں اور جو میرے غموں کو دیکھ رہے ہیں۔

عنی خذوا وبی اقتدو اولیٰ اسمعوا
وتحدثوا بصبابتی بین الورٰی

مجھ ہی سے لو اور میری ہی اقتدا کرو اور مجھی کو سنو اور میرے عشق کا قصہ تمام لوگوں کے درمیان بیان کرو۔

ولقد خلوت مع الحبیب وبیننا
سرٌّ ارَقُّ من النسیم اذا سرٰی

اور بے شک میں محبوب کے ساتھ خلوت میں رہا اور ہمارے درمیان ایک بھید ہے جو نسیم سے بھی جبکہ وہ چلے زیادہ رقیق ہے۔

واباح طرفی نظرة اَمّلتُها
فغدوت معروفا وکنتُ مُنکّرا

اور میرے گوشۂ چشم سے ایک نظر کی اجازت دیدی جس کی مجھے امید تھی۔ پس میں بے جانا بوجھا ہوا تھا۔ اب معروف ہو گیا۔

فدهشت بین جماله وجلاله
وغدا لسان الحال عنی مخبرا

پس میں اس کے جمال وجلال کو دیکھ کر ششدر ہو گیا اور میری زبان حال میری خبر دینے لگی۔

فاَدِر لحاظك فی محاسن وجهه
تلقی جمیع الحسن فیه مصورا

پس اپنی نظر کو اس کے چہرے کے محاسن میں دوڑا تو اس وقت تمام حسن کو اس کے اندر مصور دیکھے گا۔

لو ان کل الحسن یکمل صورة
وراه کان مهللا ومکبّرا

اگر پورا حسن صورت میں مکمل ہو جائے اور اس کو دیکھے تو وہ اس کی تعریف کرنے لگے گا۔

اسی مختصر دیوان میں وہ مشہور قصیدۂ تائیہ کبریٰ بھی ہے جس کا نام نظم السلوک ہے اور سات سو سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں وحدۃ الوجود کے نظریہ کے مطابق صوفیانہ حقائق کی تعبیر کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ محی الدین بن عربی نے ابن فارض سے اس قصیدۂ

تائیہ کی شرح لکھ دینے کی فرمائش کی۔ ابن فارض نے جواب دیا۔ اس کی شرح کی کیا ضرورت ہے جبکہ تمہاری فتوحات مکیہ اس کی بسوط شرح کی حیثیت رکھتی ہے۔ [1]

شیخ عمر بن الفارض، ابن عربی سے عمر میں سولہ سال چھوٹے تھے۔ مگر ان سے چھ سال پہلے ۲ جمادی الاولیٰ ۶۳۲ھ کو قاہرہ میں انتقال کیا اور جبل المقطم کی مسجد ابن الفارض کے احاطہ میں مدفون ہوئے۔

اس قصیدۂ تائیہ کی ابتدا میں ابن فارض نے محبوب کے سامنے اپنے بے پناہ عاشقانہ جذبات کا اظہار کیا ہے اور یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

وعن مذهبی فی الحب مالی مذهب
وان ملت یو ما عنه فارقت ملتی

اور محبت میں میرا مذہب تو میرا کوئی مذہب نہیں ہے اگر کسی دن محبت سے اعراض کروں تو میں اپنی ملت سے جدا ہو جاؤں گا۔

ولو خَطَرَتْ لی فی سِوَاكِ ارادةٌ
علیٰ خاطری سهوًا قضیت بِرِدَّتِی

اور اگر تیرے سوا کسی اور کے بارے میں میرے دل کے اندر بھول چوک کر بھی کوئی ارادہ اور خیال گزرے تو میرے مرتد ہونے کا فیصلہ کر دے سکتی ہیں۔

لكِ الحكم فی امری فما شئت فاصنعی
فلم تك الا فیك لاعنك رغبتی

میرے بارے میں تیرا ہی حکم ہے پس تو جو چاہے کر سکتی ہے۔ تجھی میں میرا میلان رہا ہے۔ تجھ سے کبھی بھی الگ نہیں ہو سکتا۔

محبوب اپنے عاشق کے اس دعوی کو قبول نہیں کرتا تاوقت یہ کہ وہ اپنی ذات کو محبوب کی ذات میں فنا نہ کر دے، چنانچہ محبوب کا جواب اس کی زبان سے یوں ادا کرتے ہیں۔

---

[1] نفح الطیب: ۱/ ۵۷۔

فلم تهوني مالم تكن في فانيا
ولم تفن مالا تجتلىٰ فيك صورتي

پس تو مجھ سے محبت نہیں کرتا تاوقتیکہ تو اپنے آپ کو مجھ میں فنا نہ کر دے اور تو فنا نہیں ہوتا تاوقتیکہ میری صورت تجھ میں آشکارا نہ ہو جائے۔

یہیں سے وحدۃ الوجود کے نظریہ کی تفصیلی تعبیر شروع ہو جاتی ہے۔ ابن فارض اپنے اور محبوب کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔

ففي الصحو بعد المحو لم اك غيرِها
وذاتي بذاتي اذ تَحَلَّت تَجَلَّتِ

محو ہونے کے بعد جب صحو حاصل ہوا تو میں اس کا غیر نہیں تھا اور میری ذات، میری ذات ہی سے جبکہ وہ صفات سے متصف ہوگئی آشکارا ہوگئی۔

فوصفي اذلم تُدْعَ باثنين وصفها
وهيئتها اذ واحد نحن هيئتي

پس میرا وصف محبوب کا وصف ہے جبکہ دوئی نہیں ہوتی ہے اور اس محبوب کی شکل میری شکل ہے۔ جب کہ ہم ایک ہوتے ہیں۔

فان دعيت كنت المجيب وان اكن
منادىً اجابت من دعاني ولبَّتِ

پس جب محبوب پکارا جائے تو میں اس پکار کا جواب دیتا ہوں اور جب مجھے ندا کی جائے تو وہ ندا کرنے والے کا جواب دیتا ہے اور اس پر لبیک کہتا ہے۔

وان نطقت كنت المناجي كذاك ان
قصصتُ حديثا انما هي قصَّتِ

اور اگر محبوب کچھ بول پڑے تو میں ہی اس کے ساتھ سرگوشی کرتا ہوں اسی طرح اگر میں کوئی بات بیان کروں تو گویا اس کو محبوب ہی بیان کرتا ہے۔

فقد رُفِعَتْ تاء المخاطب بيننا
وفي رفعها عن فُرْقَةِ الفرق رفعتِي

پس ہمارے درمیان سے مخاطب کی ت اٹھا دی گئی ہے اور امتیاز کی جدائی سے اس ت کے اٹھانے ہی میں میری عزت ہے۔

پھر عاشق اور معشوق اور محب اور محبوب کے درمیان کسی قسم کا فرق باقی نہیں رہ جاتا عاشق اور محبوب ہر چیز میں اپنی ہی صورت اور تصویر کو جلوہ گر پاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک شخص اپنے سامنے کے مختلف آئینوں میں اپنی ہی تصویر دیکھتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

وشاهد اذا استجليت نفسك من ترى
بغير مراء في المرائى الصقيلة

اور جب تو اپنے نفس کو جلا دینا چاہے تو دیکھ کہ صیقل کئے ہوئے آئینوں میں بغیر کسی شک کے کس کو دیکھ رہا ہے؟

اغيرك فيها لاح ام انت ناظرٌ
اليك بها عند انعكاس الاشعةِ

کیا ان آئینوں میں تیرے سوا کوئی اور ظاہر ہوا ہے یا شعاعوں کے منعکس ہونے کے وقت تو ہی اپنے آپ کو دیکھ رہا ہے۔

اس اتحاد ذاتی پر عقلی دلیلوں کے علاوہ نقلی دلیل بھی دی ہے اور یہ وہی مشہور حدیث قدسی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ بندہ جب نوافل زیادہ پڑھتا ہے تو خدا بندے کے قریب ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بندے کی آنکھ، کان، ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

وجاء حديث في اتحادی ثابتٌ
روايته في النقل غير ضعيفة

اور میرے اتحاد کے بارے میں ایک ثابت حدیث آئی ہے۔ نقل میں اس کی

روایت ضعیف نہیں ہے۔

یشیر بحب الحق بعد تقرُّبٍ
الیه بنفل او اداء فریضةٍ

اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ اگر نفل یا ادائے فرض کے بعد خدا سے تقرب حاصل کر لیتا ہے تو خدا اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔

اس اتحاد کے باوجود ابن فارض حلول کے عقیدے کا انکار کرتے ہیں چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں۔

یری ملکا یوحی الیه وغیره
یری رجلا یدعی لدیه بصحبة

آنحضرت ﷺ حضرت جبریل کو ایک فرشتہ دیکھ رہے تھے جو ان کی طرف وحی کر رہا تھا اور دوسرے لوگ حضرت جبریل کو ایک ایسا شخص (یعنی حضرت دحیہ کلبی) دیکھ رہے تھے جسے آنحضرت کی صحبت بابرکت کا شرف حاصل تھا۔

ولی من اتم الرؤیتین اشارة
تنزه عن رای الحلول عقیدتی

اور میری ان دونوں کامل رؤیتوں سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میرا عقیدہ حلول کی رائے سے بالکل پاک ہے۔

ابن فارض کے اشعار کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ابن عربی کی طرح مسئلہ اکتساب مقام نبوت اور ختم ولایت کے قائل تھے چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

فعالمنا منهم نبی ومن دعا
الی الحق منا قام بالرسلیة

پس ہمارا عالم بنی اسرائیل کا نبی ہے اور ہم میں سے جو شخص حق کی دعوت دے وہ گویا رسالت کو لے کر کھڑا ہوا ہے۔

اس میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

علماء امتی کأنبیاء بنی اسرائیل

میری امت کے علما بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔

ابن فارض نے اگرچہ صاف الفاظ میں ختم ولایت کا دعویٰ نہیں کیا ہے لیکن اپنی بہت بڑی فضیلت جتائی ہے چنانچہ کہتے ہیں:

فما عالمٌ الا بفضلی عالمٌ
ولا ناطق فی الکون الا بمدحتی

پس کوئی عالم نہیں ہے مگر وہ میری ہی وجہ سے عالم بنا ہوا ہے اور دنیا میں کوئی بھی میری مدح کے سوا کسی اور بات میں اپنی زبان نہیں کھولتا ہے۔

ولاغر وَاِن سدتُ الالی سبقوا وقد
تمسکت من طه باوثق عروة

اور کوئی تعجب نہیں ہے اگر میں مجھ سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کی سرداری کروں اور میں نے مضبوط رسی سے طہ (محمد ﷺ یا قرآن) کی دی ہوئی دولت کو تھام لیا ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ ابن فارض کا ادنیٰ پیروکار معارف الٰہیہ کی دولت سے مالا مال ہے۔

فاصغر اتباعی علی عین قلبه
عرائسُ ابکار المعارف زفّتِ

پس میرے ادنیٰ پیروکار کے عین دل پر نئے نئے اور شاہکار معارف الٰہیہ کا ہجوم ہوتا ہے۔

ابن فارض کے ساتھ ابن تیمیہ کی مخالفت محض ضمنی تھی۔ انہوں نے ابن عربی کی تنقیدوں میں ابن سبعین وغیرہ کے ساتھ ابن فارض کا بھی بار بار نام لیا ہے۔ ان پر مستقل بالذات کوئی بحث نہیں کی ہے۔ ابن عربی کے خیالات کی تردید گویا ابن فارض کے بھی خیالات کی تردید تھی۔

شیخ علی الحریری

یہ ملک شام کے بسر نامی ایک قریے کے باشندے تھے مگر دمشق آکر بس گئے تھے۔ ریشم کا کپڑا بنتے تھے اس لیے حریری کہلائے۔ بعد میں یہ پیشہ چھوڑ دیا۔ اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اپنے لیے ایک خانقاہ بنائی تھی جہاں ان کے مریدین اور معتقدین جمع ہوتے تھے۔ ہر روز سماع کی محفل گرم رہتی تھی۔ چونکہ داد و دہش اور سخاوت زیادہ تھی۔ اس لیے عوام کا ایک بہت بڑا گروہ ان کا حلقہ بگوش ہو گیا تھا، شیخ موصوف اہل ظاہر کا بہت مذاق اڑاتے تھے اور جب ان کے خلاف شریعت اقوال و افعال پر گرفت یا نکتہ چینی کی جاتی تو ان کو بھی اہل ظاہر سے قرار دے کر ان کا ٹھٹھا اڑایا جاتا تھا۔ آخر شیخ عزالدین بن عبدالسلام، شیخ تقی الدین بن صلاح اور شیخ عمر بن حاجب جیسے علما نے ان کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ علی الحریری گرفتار کر کے قلعہ میں قید کر دیے گئے۔ پھر الملک الصالح اسمٰعیل نے انہیں اس شرط پر رہا کیا کہ دمشق چھوڑ کر چلے جائیں۔ شیخ نے بسر میں اقامت اختیار کی اور وہیں رمضان ۶۴۵ھ میں وفات پائی۔

شیخ علی الحریری ہر ایک چیز کی ظاہر اور باطن دونوں حیثیتوں سے تشریح کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام ایک کامل انسان تھے، ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے ان کی توحید کامل اور مکمل تھی۔ خدا نے بظاہر انہیں حکم دیا تھا کہ ممنوعہ درخت سے کچھ نہ کھائے مگر باطنی حیثیت سے انہیں حکم ملا تھا کہ کھالیں۔ اسی باطنی حکم کی بنا پر حضرت آدم نے گیہوں کھالیا تھا۔ اسی طرح ابلیس کو بظاہر حکم ملا تھا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو مگر باطنی طور پر یہ حکم ملا تھا کہ سجدہ نہ کرو۔ ابلیس نے باطن کی پیروی کی اور ظاہر کے خلاف گیا۔

شیخ نجم الدین بن اسرائیل الحریری

یہ شیخ علی الحریری کے پیرو اور معتقد تھے۔ ان کا نام محمد لقب نجم الدین اور عرف ابن اسرائیل تھا، ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے نجم الدین ابو المعالی محمد بن سوار بن اسرائیل بن الخضر بن اسرائیل بن الحسن بن علی بن محمد الحسین الشیبانی الدمشقی۔ ۱۲ ربیع الاول ۶۰۳ھ کو دوشنبہ کے

دن پیدا ہوئے اور اساتذہ وقت سے تعلیم و تربیت پائی۔ پہلے شیخ شہاب الدین ابو حفص عمر السہروردی کے مرید ہوئے اور اس کے بعد ۶۱۶ھ سے شیخ علی الحریری کی صحبت اختیار کی۔

شیخ نجم الدین عربی کے زبردست شاعر اور نظریہ وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔ ان کے بہت سے اشعار تاریخ اور تذکرے کی کتابوں میں منقول ہیں۔ انہی کا یہ شعر ہے:

انظر اترانی منظرا معتبرا

مافی سوی وجود من اوجدنی

مجھ کو دیکھ کیا تو مجھ کو ایک معتبر منظر خیال کرتا ہے؟ مجھ میں مجھ کو ایجاد کرنے والے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک رات سماع کی محفل گرم تھی، مغنی نے ابن اسرائیل کا یہ شعر گایا:

وما انت غیر الکون بل انت عینه

ویفهم هذا السر من هو ذائق

اور تو کون (عالم) کے سوا نہیں ہے۔ بلکہ تو اس کا عین ہے وراس بھید کو وہی جانتا ہے جس کو اس کا ذوق ہے۔

اس مجلس میں نجم الدین بن الحکم الحموی بھی موجود تھے۔ انہوں نے فوراً کہا: یہ کفر ہے یہ کفر ہے۔ ابن اسرائیل نے فوراً جواب دیا یہ کفر نہیں ہے بلکہ تم نہیں سمجھتے اس لیے یہاں گڑ بڑ مت کرو۔

انہی کا یہ قول تھا کہ خدا حقیقۃ اشیاء میں ظاہر ہوا اور مجازاً ان سے چھپ گیا، پس جو بھی اہل حق و جمع سے ہوگا وہ خدا کی تجلیوں اور اس کے مظاہر کا مشاہدہ کرے گا، اور جو اہل مجاز و فرق سے ہوگا وہ خدا کو مستور اور محجوب دیکھے گا۔

شیخ نجم الدین نے ۱۴ ربیع الآخر ۶۷۷ھ کو اتوار کی رات دمشق میں وفات پائی اور شیخ رسلان کے مقبرے میں مدفون ہوئے۔ شیخ رسلان شیخ علی الحریری کے شیخ علی المغربل کے شیخ تھے۔ شیخ علی المغربل کے ہاتھوں شیخ علی الحریری نے خرقہ خلافت پہنا تھا۔

شیخ عبدالحق ابن سبعین

ان کا نام عبدالحق، لقب قطب الدین اور عرف ابن سبعین تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ قطب الدین ابو محمد عبدالحق بن ابراہیم بن محمد بن نصر بن محمد بن نصر بن المقدسی الرقوطی المعروف بابن سبعین ۔ ۶۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور علوم متداولہ میں کمال حاصل کیا۔ فلسفہ سے خاص شغف تھا۔ ترک وطن کر کے مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مکہ کا حاکم ان کا بڑا معتقد ہو گیا تھا۔ اکثر غار حرا میں مراقبہ کیا کرتے تھے۔

ابن سبعین بھی وحدۃ الوجود، اکتساب مقام نبوت اور ختم ولایت کے قائل تھے، اپنی مجلسوں میں اہل ظاہر کا خوب مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک شریعت کے ظاہری مراسم کی پابندی کی کوئی وقعت نہیں تھی، جب لوگوں کو کعبہ کا طواف کرتے دیکھتے تو کہتے تھے کہ بے جان عمارت کے اطراف چکر کاٹنے کی بجائے بہتر ہے کہ کسی انسان کے دل میں طواف کریں۔ ان کے خیالات کی بنا پر مشہور محدث شیخ قطب الدین قسطلانی نے ان کی سخت مخالفت شروع کر دی۔ مگر مکہ کے حاکم کی حمایت کی وجہ سے خود قسطلانی کو مکہ چھوڑنا پڑا اور انہوں نے مصر میں اقامت اختیار کی۔

ابن سبعین نے ۲۸ شوال ۶۶۹ھ کو مکہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ کتاب البدو اور کتاب الھو وغیرہ اپنی یادگار چھوڑی۔ انہیں کا یہ قول تھا۔

عین ما تری ذات لا تری
وذات لا تری عین ما تری

جو کچھ تم دیکھتے ہو اس کا عین وہ ذات ہے جس کو تم نہیں دیکھتے اور وہ ذات جس کو تم نہیں دیکھتے بعینہ وہی ہے جس کو تم دیکھتے ہو۔

ان کا یہ بھی کہنا تھا:

رب مالك وعبد هالك وانتم
ذٰلك اللّٰه فقط والكثرة وهم

رب مالک ہے اور بندہ ہلاک ہونے والا ہے اور تم یہی ہو اللہ فقط اور کثرت وہم ہے۔

شیخ صدر الدین قونوی

ان کا نام محمد، کنیت ابو المعالی اور لقب صدر الدین تھا۔ ان کے والد کا نام اسحاق تھا۔ ترکی کے مشہور شہر قونیہ کے خاندان کے فرد تھے اس لیے قونوی کہلائے بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کی ماں نے ابن عربی سے شادی کر لی۔ اس طرح وہ ابن عربی کے سایہ عاطفت میں تربیت پاتے رہے۔ ابن عربی کے نظریات و خیالات کا ان پر بہت گہرا اثر پڑا۔ ایک مدت تک ملا نصیر الدین طوسی اور شیخ صدر الدین قونوی کے درمیان مختلف مسائل پر مراسلت جاری رہی۔ صدر الدین نے کئی کتابیں لکھی تھیں، جن میں ان کتاب مفتاح الغیب اور تفسیر فاتحہ کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ ان کی تفسیر فاتحہ اعجاز البیان فی تفسیر ام القرآن کے نام سے حیدر آباد سے شائع ہو گئی ہے جس میں شیخ نے ظاہر و باطن اور حقیقت و مجاز کی اصطلاحات کے پردے میں آیتوں کی تشریح کی ہے۔ صدر الدین قونوی نے ۶۷۳ھ میں انتقال کیا۔

شیخ عفیف الدین تلمسانی

ان کا نام سلیمان کنیت ابو الربیع اور لقب عفیف الدین تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ ابو الربیع عفیف الدین سلیمان بن علی بن عبداللہ بن علی بن یٰسین العابدی الکومی التلمسانی غالباً دمشق ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی، عربی ادب اور تصوف میں بڑا کمال حاصل کیا۔ شاعری کا ذوق فطری تھا اپنے بعد ایک عربی دیوان اور کئی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ انہوں نے شیخ محمد بن عبدالجبار بن الحسن النغرہی الصوفی (المتوفی: ۳۵۴ھ) کی مشہور تصنیف کتاب المواقف کی شرح کی تھی۔ نیز اسماء اللہ الحسنیٰ کی شرح لکھی تھی۔

ادیب اور شاعر ہونے کی وجہ سے اہل علم کا ایک بڑا طبقہ ان کا معتقد ہو گیا تھا۔ فصوص الحکم کی شرح کیا کرتے تھے اور جب اس کے خلاف شریعت مسائل پر نکتہ چینی ہوتی تھی تو معترضین پر کم عقلی کا الزام لگاتے تھے۔ کبھی کبھی علمائے ظاہر کو چڑھانے کی خاطر کفریہ اقوال بھی بک دیا کرتے تھے۔

چنانچہ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ شیخ کمال الدین ابن المراعی کو ابتداء میں شیخ عفیف الدین تلمسانی سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ ان سے فصوص الحکم پڑھنے لگے۔ اثناء درس میں کمال

الدین نے فصوص الحکم کے بعض قابل اعتراض باتوں پر گرفت کی اور کہا کہ یہ قرآن وحدیث کے صریح ارشادات کے خلاف ہیں تو ایک مرتبہ تلسمانی کو سخت غصہ آ گیا اور کہا بار بار قرآن و حدیث کا کیا حوالہ دیتے ہو۔ انہیں اٹھا کر دروازے سے باہر پھینکو اور یہاں صاف دل ہو کر آؤ تا کہ تمہیں فصوص الحکم میں خالص توحید ملے۔ ان کی ان باتوں سے شیخ کمال الدین کے دل میں سخت ٹھیس لگی۔ وہ فوراً ان کی مجلس سے چلے آئے۔ اور جب تلسمانی کو ڈر لگا کہ کہیں یہ بات عام لوگوں میں پھیل نہ جائے اور ان کے خلاف کوئی زبردست ہنگامہ کھڑا نہ ہو جائے تو وہ روتے ہوئے کمال الدین کے پاس چلے آئے اور انہیں راضی کیا۔

شیخ کمال الدین ہی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ شیخ عفیف الدین تلسمانی نے کہا کہ قرآن میں توحید کہاں ہے؟ وہ تو پورے کا پورا شرک سے بھرا ہوا ہے جو شخص بھی قرآن کی اتباع کرے گا وہ کبھی توحید کے بلند مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا۔

انہی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے شیخ عفیف الدین سے کہا کہ اگر عالم کی تمام چیزیں ایک ہیں جیسا کہ تمہارا عقیدہ ہے تو پھر تمہارے نزدیک جورو، بیٹی اور ایک اجنبی عورت میں کیا فرق ہے۔ تلسمانی نے جواب دیا۔ ہمارے پاس تو کوئی فرق نہیں ہے۔ چونکہ ان محجوبوں نے ان کو حرام قرار دیا ہے اس لیے ہم نے بھی کہا کہ یہ چیزیں تم پر حرام ہیں۔ ہم پر تو کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض ظاہری علما کو چڑانے کی غرض سے ایسی باتیں کیا کرتے تھے۔ ورنہ کوئی بھی عقل سلیم رکھنے والا شخص اس قسم کی باتیں نہیں کر سکتا۔

شیخ عفیف الدین کا نظریہ یہ تھا کہ خدا ایک وجود مطلق ہے جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے چنانچہ کہتے ہیں:

البحر لاشك عندی فی توحده
وان تعدد بالامواج والزبد

میرے نزدیک سمندر کے ایک ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اگرچہ وہ اپنی موجوں اور جھاگ کی وجہ سے متعدد دکھائی دیتا ہے۔

فلا یغرنك ما شاهدت من صور
فالواحد الرب ساری العین فی العدد

پس تم اس بات سے دھوکہ نہ کھاؤ کہ تمہیں کئی صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ پس ایک ہی پروردگار ہے جو تمام چیزوں میں جاری و ساری ہے۔

شیخ عفیف الدین کا لڑکا محمد بھی بہت اچھا شاعر تھا۔ صاحب دیوان تھا۔ اس کا دیوان بیروت سے ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اس نے اپنے باپ ہی کی زندگی میں ۶۸۸ھ میں وفات پائی۔ اس سے شیخ عفیف الدین کے دل کو بڑا سخت صدمہ پہنچا۔ انہوں نے اس کی وفات پر دلدوز مرثیے لکھے ہیں۔

شیخ عفیف الدین نے ۵ رجب ۶۹۰ھ کو چہار شنبہ کے دن دمشق میں وفات پائی اس وقت امام ابن تیمیہ کی عمر تقریباً تیس سال کی تھی۔ امام ابن تیمیہ نے کئی جگہ شیخ عفیف الدین پر سخت تنقیدیں کی ہیں اور انہیں فاسق و فاجر لکھا ہے۔ امام موصوف شیخ کی شاعری کے معترف ہیں مگر یہ لکھتے ہیں کہ ان کی شاعری پر عربی کی یہ مثل صادق آتی ہے لحم خنزیر فی طبق صینی (چینی طبق میں سور کا گوشت)

امام موصوف لکھتے ہیں کہ تلسمانی کا قول سب سے زیادہ کافرانہ اور زندیقانہ ہے کیونکہ وہ مظاہر اور ظاہر کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے کثرت اور تفرقہ کو ایک ہی چیز قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی شہود حقیقت سے محجوب و مستور ہوگا وہی کثرت کا مشاہدہ کرے گا اور جب کسی کی نظر سے یہ سارا حجاب اٹھ جائے گا تو اسے ہر طرف وحدت نظر آنے لگے گی اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہر طرف خدا ہی خدا ہے اس کے سوا کسی اور کا کوئی وجود نہیں ہے۔ گویا دیکھنے والا خود اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوگا۔ اور خود ہی شاہد اور خود ہی مشہود ہوگا۔ یہ ایک ایسا قول ہے جس کو ان سے پہلے کسی اور نے نہیں کہا ہے۔

امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ اس قسم کے خیالات کی نشوونما تاتاری حکومت کے غلبہ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اسلام سے پہلے نصرانیوں میں حلول اور اتحاد کے خیالات موجود تھے۔ اسلام کے بعد رافضیوں نے ان خیالات کو قبول کیا پھر جہمیوں نے حلول عام کا عقیدہ پیش کیا

اور یہ کہنا شروع کیا کہ خدا اپنی ذات سے ہر جگہ موجود ہے اور اب ان اتحادی ملحدوں نے اتحاد عام کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔

امام موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن عربی، ابن سبعین، صدر الدین قونوی اور تلمسانی کے خیالات کے تین ذرائع ہیں۔ ایک جہمیوں کی سلب و تعطیل ہے، دوسرا صوفیوں کے مجمل اور متشابہ کلمات ہیں اور تیسرا فلسفیوں کے غلط خیالات اور دلائل ہیں۔ چنانچہ ابن عربی کے کلام پر صوفیہ کے مجمل کلمات اور اصطلاحات کا بڑا اثر ہے۔ قونوی اور ابن سبعین نے فلسفہ سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور تلمسانی نے ان سب کو ملا کر ایک معجون مرکب تیار کیا ہے۔

امام ابن تیمیہ کی مخالفت

امام ابن تیمیہ کی تصنیفات سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے اور علوم کے ساتھ ساتھ علم تصوف کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اور وہ زمانہ بھی کچھ ایسا تھا کہ ہر طرف تکیے، زاوئے اور خانقاہیں قائم تھیں۔ جہاں بہت سے قوی اور تنومند نوجوان ذکر واذکار اور اوراد و وظائف کے شغل کے بہانے سے گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے انہیں اپنی روزی کے لیے محنت اور مشقت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ ہر ایک کو حکومت کی طرف سے وظیفہ مقرر تھا۔ ظاہری شکل وصورت فقیرانہ تھی مگر ان میں سے اکثر کا دل سیاہ اور مکروہ تھا۔ اکثر تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے۔ تجرد کی زندگی جتنی عمدہ اور پاکیزہ دکھائی دیتی ہے اتنی ہی اخلاقی حیثیت سے بہت خطرناک ہوتی ہے۔ بیشتر اشخاص اپنی خواہشات نفسانی سے مغلوب ہو کر اخلاقی مفاسد میں گرفتار ہو جاتے تھے۔ علمی واخلاقی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بہت پست ہوتا تھا۔ ان کی ظاہری شکل وصورت سے مرعوب ہو کر عوام ان کے معتقد ہو جاتے تھے۔ لوگ قرآن وحدیث کو چھوڑ کر صوفیہ کے بتائے ہوئے اوراد و وظائف کا ورد کرنے لگے تھے۔ غوث قطب، ابدال، اوتار، نجباء، امام اور حضرت خضر کی موہوم شخصیتوں کے ساتھ ان کی دلچسپی اور دل بستگی زیادہ ہو گئی تھی۔ اکثر لوگوں کو معجزانہ کمالات کے دیکھنے اور دکھانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور انہیں رجال غیب کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی خواہش بڑھ گئی تھی۔ پیروں اور مشائخ طریقت کے رتبوں کو بہت ہی بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا تھا، اس کی وجہ سے مسلمانوں کی ساری عملی قوتیں کمزور اور بیکار

ہوگئی تھیں۔اور ان پر ضعف اور اضمحلال طاری ہوگیا تھا۔عام مشائخ طریقت اور ان کے متبعین میں بہت سی اعتقادی اور عملی برائیاں پیدا ہوگئی تھیں جن کی اصلاح ضروری تھی۔اسی جذبے کے ماتحت امام ابن تیمیہ نے شیخ عدی بن مسافر الاموی کے پیروؤں کے نام ایک کھلا تبلیغی خط لکھا جو ''الوصیۃ الکبریٰ'' کے نام سے امام ابن تیمیہ کے مجموعۃ الرسائل الکبریٰ میں چھپ گیا ہے۔اس میں انہوں نے ان کے بعض فاسد اعتقادات اور اعمال پر گرفت کی ہے اور انہیں قرآن وحدیث پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے۔

ابن عربی اور ابن فارض وغیرہ کے فلسفیانہ تصوف سے نہ صرف امام ابن تیمیہ کو اختلاف تھا بلکہ ان سے پہلے بھی علما کے اندر ان کے متعلق موافق یا مخالف بحثیں جاری تھیں۔جب امام ابن تیمیہ اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد استاد مقرر ہوئے تو وحدۃ الوجود اور دیگر نزاعی مسائل کے متعلق ان سے سوالات ہونے لگے۔انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں ان کی مخالفت شروع کی اور قرآن وحدیث کی روشنی میں انہیں غلط قرار دیا۔ان کو قدماء صوفیہ سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں تھا۔وہ ان کے مداح تھے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ان کو صرف فلسفیانہ تصوف سے اختلاف تھا اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جارہا تھا ان کے اس اختلاف میں اور زیادہ شدت پیدا ہوتی جارہی تھی۔وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اگر انہیں ان نام نہاد صوفیہ کی عام مضرت کا احساس نہ ہوتا تو انہیں ان کے خلاف قلم اٹھانے کی کوئی حاجت نہ ہوتی۔ان کے الفاظ ہیں۔

ولولا ان اصحاب هٰذا القول كثروا وظهروا وانتشروا وهم عند كثير من الناس سادات الانام ومشائخ الاسلام واهل التوحيد والتحقيق وافضل اهل الطريق حتى يفضلوهم على الانبياء و المرسلين و اكابر مشائخ الدين لم يكن بنا حاجة الى بيان فساد هٰذه الاحوال وايضاح هٰذا الضلال ولكن يعلم بذٰلك ان الضلال لاحد له وانه اذا كدرت العقول لم يبق لضلالها حد معقول فسبحان من فرق في

نوع الانسان فجعل منه من هو افضل العالمين وجعل منه من هو شرارا لشياطين ولكن تشبيه هولاء بالانبياء والاولياء كتشبيه مسيلمة الكذاب بسيد اولى الالباب هوالذى يوجب جهاد هولاء الملحدين الذين يفسدون الدنيا والدين۔[1]

''اور اگر اس قول کے ماننے والے اتنے زیادہ نہ ہوتے اور بڑھ کر پھیل نہیں جاتے اور وہ اکثر لوگوں کے نزدیک سادات امام، مشائخ اسلام اور اہل توحید و تحقیق اور اہل طریق میں سب سے افضل گنے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان کو انبیاء مرسلین اور اکابر مشائخ دین پر فضیلت دیتے ہیں تو ہم کو ان کے احوال کے فساد کے بیان کرنے اور ان کی گمراہی کی وضاحت کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہوتی لیکن اس سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ گمراہی کی کوئی حد نہیں ہے اور جب عقلیں مکدر ہوجائیں تو اس کی گمراہی کی کوئی معقول حد نہیں ہوتی۔ پس پاک ہے وہ خدا جس نے انسان کی نوع میں فرق کیا۔ پس ان میں سے بعض کو عالم میں افضل قرار دیا اور بعض کو بدترین شیطانوں میں سے بتایا اور لیکن ان کو انبیا اور اولیاء کے ساتھ تشبیہ دینا اسی طرح ہے جیسا کہ مسیلمہ کذاب کو سید اولی الالباب سے تشبیہ دی جائے اور یہی ایک چیز ان ملحدوں کے خلاف جو دین و دنیا کو خراب کرتے ہیں جہاد کو واجب کرتی ہے۔

شیخ نصر المنبجی کے نام خط

تصوف کے نزاعی مسائل کے متعلق یہ بحثیں جاری تھیں کہ لوگوں کی توجہ تاتاری لڑائیوں کی طرف منعطف ہوگئی اور جب اس سے فراغت ملی تو امام ابن تیمیہ نے اپنے زمانہ کی بدعات وسیئات کے خلاف زوردار جہاد شروع کردیا۔ امام موصوف نے ان نام نہاد صوفیوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ مصر میں شیخ نصر بن سلیمان المنبجی

---

[1] مجموعة الرسائل والمسائل لابن تيمية: ١/ ١١٦۔

(المتوفی: ۷۱۹ھ) کی مجلس میں وحدۃ الوجود اور دوسرے نزاعی مسائل کا ذکر آیا اور انہوں نے امام ابن تیمیہ پر سخت تنقید کی تو انہوں نے ۷۰۴ھ میں ان کے نام ایک طویل خط لکھا۔ اس کے آخری جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خط جلدی میں لکھا گیا تھا کیونکہ جن صاحب کے ذریعہ یہ خط دمشق سے مصر روانہ کیا جا رہا تھا وہ سفر کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ یہ خط تیئس ۲۳ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ہم ذیل میں اس خط کا محض خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ [1]

احمد بن تیمیہ کی طرف سے شیخ عارف وقدوۂ سالک وناسک ابوالفتح نصر بن سلیمان المنبجی کے نام۔ افاض اللّٰه علینا ببرکات انفسه۔

شیخ کے ظاہر وباطن پر اللہ تعالیٰ وہی اسرار کھولے جن کو اس نے اپنے اولیاء کے دلوں پر کھولا ہے۔ نیز جن وانس کے شیاطین کے خلاف اللہ تعالیٰ شیخ کی مدد کرے اور ان کو ایسے طریقے پر چلائے جو محمد ﷺ کی لائی ہوئی شریعت اسلامیہ کے مطابق ہو اور ان پر ایسی حقیقت دینیہ کا انکشاف کرے جس کی مدد سے شیخ خدا کی مخلوق اور اس کی اطاعت وارادت اور محبت کے درمیان فرق کر سکیں۔ تا کہ شیخ کلمات کونیہ وکلمات دینیہ اور صادق وصالح مومنین اور مشابہ منافقین کے درمیان اسی طرح تمیز کر سکیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اس کے رسول نے اپنی سنت میں تمیز کی ہے۔

امابعد۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور دنیا کی ظاہری اور باطنی نعمتوں سے شیخ کو نوازا ہے اور شیخ کا رتبہ ان برگزیدہ مسلمانوں کی نظر میں جو زمین کے اندر سرکشی اور فساد نہیں چاہتے بہت بڑھا دیا ہے اور نیز اس حسن معرفت اور نیک ارادے کی بنا پر جو شیخ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے ان برگزیدہ مسلمانوں کے دلوں میں شیخ کی محبت ڈال دی ہے۔ کیونکہ علم اور نیک ارادہ ہی ہدایت اور عبادت کی راہ میں اصل ہیں۔

ایمان کی محبت ہی سے ایمان کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور ایمان کی مٹھاس اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور خلاف ایمان چیزوں سے نفرت کرنے ہی پر موقوف ہے۔ اس دعوے کی

---

[1] امام ابن تیمیہ نے اس خط میں جا بجا آیتوں اور حدیثوں سے لطیف استدلال کیا ہے۔ ہم نے اکثر جگہ ان کے صرف بنیادی مفہوم کو لیا ہے اور ان کی تحریروں کا بعض جگہ خلاصہ اور بعض جگہ آزاد ترجمہ دیا ہے۔

صداقت پر کئی حدیثیں دلالت کرتی ہیں۔ ذوق اور وجد اعمال ظاہرہ کی اصل اور اعمال باطنہ کا ثمرہ اور پھل ہیں۔ ان دونوں کی مدد سے خدا اور اس کے رسول کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتوں کے درمیان تمیز کرنی چاہیے۔ اسی لیے حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے فرمایا۔ ہر وہ وجد جو کتاب وسنت کے مطابق نہ ہو باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے کہ جو لوگ اللہ سے محبت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ پہلے نبی کی کامل پیروی کریں۔

اللہ تعالیٰ نے شیخ کو معرفت کا وہ نور بخشا ہے جس سے کام لے کر وہ ایمانی اور مجمل و مشترک محبت کے درمیان فرق کر سکتے ہیں۔

سالکین میں سے اکثر ایسے لوگ ہیں جو اپنے سلوک میں اللہ تعالیٰ کی کامل ربوبیت اور قیومیت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسی ربانی توحید میں فنا ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اللہ اور اس کے رسول کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں اور ان چیزوں سے بالکل بچتے رہتے ہیں جن سے بچنے کی اللہ اور اس کے رسول نے تاکید کی ہے۔ مگر بعض سالکین ایسے بھی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے اوامر ونواہی کی پابندی میں اپنے آپ کو آزاد تصور کرتے ہیں۔

جامع توحید میں بندے کے تین مقام ہیں۔ پہلا مقام فرق و کثرت کا ہے۔ دوسرا مقام جمع وفنا کا ہے۔ تیسرا مقام جمع میں تفرقہ اور وحدت میں کثرت کے مشاہدہ کرنے کا ہے۔ اور یہی تیسرا مقام فناء کامل کا مقام ہے۔ ایسا شخص ہرگز ماسوی اللہ کی عبادت یا اس سے استعانت نہیں کرتا اور ہرگز غیر اللہ کا قصد نہیں کرتا وہ یہی سمجھتا ہے کہ خدا ایک ہے اور وہی ساری کائنات کا خالق اور پروردگار ہے اور اسی کی وجہ سے یہ ساری دنیا قائم ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیا نے اسی دین اور توحید کی تعلیم دی ہے۔ اور تمام قدیم مشائخ طریقت اور علمائے دین اسی کی تعلیم دیتے رہے ہیں لیکن بعض ذوی الاحوال مشائخ کو فناء قاصر کی حالت میں سکر پیدا ہوا اور ان کی زبان سے سبحانی ما اعظم شانی (پاک ہوں میری شان کتنی بڑی ہے) یا مافی جبتی الا اللّٰہ (میرے جبے میں اللہ کے سوا کچھ نہیں ہے) کہ فقرے سرزد ہوئے جیسا کہ حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کے متعلق روایت کی جاتی ہے۔ سکر والے آدمیوں کے کلمات کو لپیٹ کر بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ اور ان کو کسی کے سامنے بیان

نہیں کیا جاتا کیونکہ جسمانی اور روحانی سکر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ جسم کا سکر کھانے پینے سے اور نفوس کا سکر تصویروں سے اور روح کا سکر آوازوں سے ہوتا ہے۔ اسی سکر کی بنا پر بعض لوگوں نے عینی حلول و اتحاد کا غلط دعویٰ کیا تھا۔ جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت مسیح کے بارے میں یا غالی شیعوں نے حضرت علی اور دیگر اہل بیت کے بارے میں یا حلاج اور مصر کے سلطان حاکم بامر اللہ نے خود اپنے بارے میں دعویٰ کیا تھا۔ انہیں درحقیقت نوعی و حکمی اتحاد اور عینی و ذاتی اتحاد کے درمیان ایک غلط اشتباہ ہو گیا تھا۔

انجیل میں بعض کلمات ایسے ہیں جن کی وجہ سے نصاریٰ کو اشتباہ ہوا۔ جیسے حضرت مسیح کا یہ قول کہ میں اور میرا باپ دونوں ایک ہیں۔ جس نے مجھے دیکھا اس نے گویا میرے باپ کو دیکھا، نصاریٰ اس قول کے ظاہری معنی مراد لے کر گمراہ ہو گئے۔ اسی طرح بعض مسلمان تقرب الی اللہ کی مشہور حدیث قدسی کے ظاہری معنی مراد لے کر گمراہ ہو گئے۔ اس حدیث میں خدا کی زبان سے یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ میرا بندہ نوافل کے ذریعے میری قربت اور نزدیکی حاصل کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سننے لگتا ہے میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھنے لگتا ہے۔ میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑنے لگتا ہے میں اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلنے لگتا ہے پس وہ میرے ہی ذریعے سنتا ہے۔ میرے ہی ذریعے دیکھتا ہے، میرے ہی ذریعے پکڑتا ہے اور میرے ہی ذریعے چلتا ہے۔

مجھے خبر ملی ہے کہ بعض لوگوں نے آپ کے حضور میں اتحادی مذہب کے متعلق کچھ گفتگو کی ہے۔ اس سے پہلے میں نے آپ کی خدمت میں ایک خط لکھا تھا جس میں ان اتحادیوں کی طرف بلا قصد و ارادہ ضمنی اشارہ ہو گیا تھا۔ میرا مقصد خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کرنا نہیں تھا، چونکہ شیخ پر تمام مومنین کا اجماع ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ تمام دینی اور دنیاوی امور میں شیخ کی امداد و اعانت کریں۔

بعض لوگ ان اتحادیوں کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے داعی (یعنی امام ابن تیمیہ) کو خط لکھا۔ میں نے اس بارے میں اس سے پہلے بھی ایک مراسلہ لکھا تھا۔ جس کی

نقل عنقریب شیخ کی خدمت میں روانہ کی جائے گی۔ سیدنا عماد الدین [1] نے بھی اس بارے میں کئی رسائل لکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر اہل طریقت اور سالکین الی اللہ کی طرف سے ان اتحادیوں کے ضرر اور نقصان کا دفع کرنا بے حد ضروری نہ ہوتا تو مجھے ان کے طریقت کے اسرار کے کھولنے اور ان کی پوشیدہ باتوں کے برملا کرنے کی کوئی حاجت نہ ہوتی۔ ان کے ضرر اور نقصان کا دفع کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ مومنین سے تاتاریوں کے ضرر اور نقصان کو دفع کیا گیا ہے۔ شیخ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ دعوت نبوی بلکہ لوگوں کے پیدا کرنے، کتابوں کے اتارنے اور رسولوں کے بھیجنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ دین پورے کا پورا اللہ ہی کا ہو اور لوگوں کو خدا کی طرف بلایا جائے۔ لیکن ان اتحادیوں کی وجہ سے سالکین پر وہ توحید مشتبہ ہوگئی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں اور اپنے رسولوں کے ذریعہ واضح کیا تھا۔ ان اتحادیوں کی توحید درحقیقت صانع کو معطل کرنا اور خالق کا انکار کرنا ہے۔

مجھے ابن عربی کے متعلق ابتداء میں بہت ہی حسن ظن تھا۔ کیونکہ ان کی فتوحات مکیہ، الکنہ المحکم المربوط، الدرۃ الفاخرہ اور مطالع النجوم جیسی کتابوں میں بہت سی مفید باتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جب میں نے ان کی کتاب فصوص الحکم پڑھی تو اندرونی حقیقت ظاہر ہوگئی۔ جب ہم لوگ آپس میں مل بیٹھتے ہیں تو حقیقت کی تلاش اور جستجو کرتے رہتے ہیں اور حق کے اتباع کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور جب ہم پر حقیقت واضح ہوگئی تو ہمیں اپنی ذمہ داری محسوس ہونے لگی۔ اور جب مشرق کے شہروں سے معتبر مشائخ تشریف لائے اور ہم سے اسلام کا حقیقی اور سچا راستہ دریافت کیا تو ہم پر ان اتحادیوں کی حقیقت کا ظاہر کرنا ضروری ہوگیا، ہم نے ان کی وضاحت کی اور جب ملک شام کے اطراف کے ایسے لوگوں نے جن کا شمار صادق وطالب سالکین میں سے ہے ہمیں خطوط لکھے تو ہم نے وہ تمام باتیں بیان کیں جن کا بیان کرنا ضروری تھا۔ اور جو ان کے تمام مقاصد کے جامع تھے۔ اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ وہ ان مسائل

---

[1] یعنی شیخ عماد الدین واسطی جو ایک زمانہ تک صوفیہ کے ساتھ رہے اور پھر ان کے مخالف ہو گئے تھے آخر میں امام ابن تیمیہ کی صحبت اختیار کی اور ۷۱۱ھ میں دمشق کے اندر وفات پائی۔

میں شیخ کی رہنمائی کرے۔ شیخ سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنے دل کی روشنی، نفس کی ذکاوت اور اسلام اور اہل اسلام اور اخوان صالحین کی نصیحت کے نیک ارادے کے پیش نظر وہی کام کریں جس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو اور اس کی وجہ سے دنیا و آخرت میں شیخ کو نجات ملے۔

تا تاریوں کے ظہور سے پہلے کسی کو ان اتحادیوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں تھی۔ قدیم زمانے میں اتحاد سے مراد اتحاد معین ہی ہوتا تھا جیسے نصاریٰ کا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ اور حضرت مسیح دونوں ایک ہی ہیں۔ یا غالی شیعوں کا یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات حضرت علی یا اہل بیت کے بعض افراد میں حلول کیے ہوئے ہے یا بعض جاہل فقیروں اور صوفیوں کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کسی مخصوص بزرگ یا ولی کے جسم میں ہوتا ہے۔ اب رہا حلول مطلق کا عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے۔ صرف قدیم جہمیہ کا تھا جن کو علمائے اسلام کافر کہا کرتے تھے آج کل کے اتحادی اسی مطلق حلول کے عقیدے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ ان سے پہلے اس قسم کا عقیدہ یا تو فرعون جیسے منکر خدا کے دعاوی میں ملتا ہے یا قرامطہ کے خیالات میں پایا جاتا ہے۔ ان اتحادیوں کا یہ بھی خیال ہے کہ خالق کا وجود مخلوق کے وجود کا عین ہے اس خیال کے مطابق ہرگز یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ خدا نے اپنی ذات کے سوا کوئی اور چیز پیدا کی ہو یا کسی دوسری کائنات کا پروردگار رہا ہو۔ ان اتحادیوں کی باتیں اتنی مبہم ہیں کہ بسا اوقات کوئی ان کا صحیح مفہوم معلوم نہیں کر سکتا۔

ان اتحادیوں کا کہنا یہ ہے کہ تمام ذوات کل کی کل عدم میں ثابت ہیں اور وہ ازلی اور ابدی ہیں۔ یہ لوگ حیوانات و نباتات و معدنیات بلکہ حرکات و سکنات کی ذوات تک کو ازلی و ابدی اور انہیں عدم میں ثابت مانتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا وجود ان پر فائض ہے۔ اسی لیے ان ذوات کا وجود گویا حق کا وجود ہے۔ اس کے باوجود ان کی ذوات حق کی ذات نہیں ہوتیں۔ اس طرح وہ وجود اور ثبوت کے درمیان فرق کرتے ہیں۔

یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ نے کسی کو کچھ نہیں دیا۔ نہ تو اس نے کسی کو غنی بنایا اور نہ کسی کو شقی یا سعید قرار دیا۔ اگر تعریف کرو تو اپنے ہی نفس کی تعریف کرو اور اگر مذمت کرو تو

اپنے ہی نفس کی مذمت کرو۔ یہ لوگ اسی کو تقدیر کا راز بتاتے ہیں۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اشیاء کے دیکھنے کے بعد ان کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم کے ایک ذرے کو بھی بدلنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ یہ لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ چیزوں کو اسی حیثیت سے جانتے ہیں جس حیثیت سے کہ خدا ان کو جانتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے اور خدا کے علم کا سرچشمہ ایک ہے اس لحاظ سے وہ بعض صورتوں سے خاتم الرسل پر فضیلت رکھتے ہیں کیونکہ رسولوں کا علم صوفیوں کی طرح براہ راست نہیں ہے بلکہ ان کا سرچشمہ اس سے ہے جس سے فرشتے فیض پاتے ہیں۔

یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی شخص غیر اللہ کی عبادت نہیں کرتا کیونکہ جب غیر اللہ کا وجود ہی نہ ہو تو پھر غیر اللہ کی عبادت کیونکر متصور ہو سکتی ہے۔ بتوں کے پجاری بھی اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں۔

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ﴾ [1]

''اور تیرے پروردگار نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرنا۔''

کیونکہ وہ اللہ ہی کے فیصلہ پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ [2] نوح علیہ السلام کی قوم نے بتوں کی پرستش پر جو اصرار کیا وہ ٹھیک تھا۔ پتھروں اور درختوں کی پوجا کو دیکھ کر ایک جاہل یہی تصور کرتا ہے کہ وہ پتھر اور درخت ہیں مگر ایک عارف انہی میں جلوہ و جمال الٰہی دیکھتا ہے ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ نصرانیوں نے ایک شخص واحد کی پرستش کر کے کفر کیا اور بت پرستوں کی خطا یہ ہے کہ انہوں نے صرف چند مظاہر کی پرستش پر اکتفا کیا۔ مگر ایک عارف باللہ ہر چیز کی پرستش کرتا ہے اس لیے کہ اس میں جلوہ و جمال الٰہی نظر آتا ہے۔ ان کے اس خیال کے مطابق خود خدا بھی ہر ایک چیز کی پرستش کرتا ہے۔ کیونکہ تمام چیزیں اس کے اسماء و احکام کے لیے بمنزلہ غذا کے ہیں اور خود خدا ان اشیاء کے وجود کے لیے غذا کا کام دیتا ہے گویا اللہ تعالیٰ ان

---

[1] ۱۷/بنی اسرآءیل: ۲۳۔

[2] حسن سنجری فرماتے ہیں کافراں سجدہ کہ بر روئے بتاں میں کردند ہمہ رو سوئے تو بود و ہمہ سو روئے تو بود۔

چیزوں کا محتاج ہے اور یہ چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں۔اس لیے ہر ایک چیز خدا کی دوست ہے۔ یہ لوگ اللہ کے نیک ناموں کو ان کے وجود اور ثبوت کے درمیان محض ایک نسبت اور اضافت قرار دیتے ہیں۔ان کے پاس یہ عدمی امور نہیں ہیں۔خدا کے ناموں میں سے ایک علی ہے جس کے معنی بلند و بالا کے ہیں لیکن جب یہاں خدا کے سوا کسی اور کا کوئی وجود ہی نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کس پر بلندی رکھتا ہے۔

جب حضرت ہارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے منع کیا تو حضرت موسیٰ نے انہیں بہت برا بھلا کہا۔ یہ لوگ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ حضرت ہارون سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ بنی اسرائیل نے گوسالہ کی جو پرستش کی تو گویا انہوں نے خدا ہی کی پرستش کی۔ چونکہ حضرت ہارون میں حضرت موسیٰ کی سی وسعت نظر نہیں تھی اس لیے انہوں نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے منع کیا۔ان کے نزدیک فرعون سب سے بڑا عارف تھا۔ یہی وجہ ہے جادوگروں نے فرعون کے اس دعوے کو تسلیم کر لیا کہ وہ ان سب کا بڑا پروردگار ہے۔ [1]

میں بعض علما و فضلاء کے سامنے ان اتحادیوں کی حقیقت کو ظاہر کر رہا تھا کہ ان میں سے بعض نے مجھے بتایا کہ بڑے بڑے اتحادی فرعون ہی کے قول پر ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔

یہ تمام مذکورۂ بالا نظریے صاحب فصوص الحکم ہی کے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس عقیدے پر اس شخص کی موت ہوئی ہے۔خدا ہم سب زندوں اور مردوں کی مغفرت کرے۔

صاحب فصوص الحکم کا دعویٰ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ کتاب عنایت کی۔مگر اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا انبیاء و مرسلین اور اولیاء و صالحین تو کیا یہود و نصاریٰ اور صابی لوگ ان کے قائل نہیں ہو سکتے بت پرست مشرکین اور کافر اہل کتاب بھی ایک صانع کا اعتراف کرتے ہیں۔ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ خالق مخلوقات کا عین ہے۔

ان اتحادیوں کا یہ قول دو اصل پر مبنی ہے۔

---

[1] اس تفصیل کے لیے دیکھو فصوص الحکم فص ہارونیہ و فص موسویہ۔

ایک یہ ہے کہ معدوم عدم میں ایک ثابت شے ہے جیسا کہ اکثر معتزلہ اور رافضہ کا خیال تھا۔ یہ مذہب عقل کی رو سے باطل اور کتاب وسنت اور اجماع صحابہ کے مخالف ہے۔ ان لوگوں نے درحقیقت اس حیثیت سے غلطی کی ہے کہ انہوں نے خدا کے اس علم کے درمیان جو چیزوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہوتا ہے اور اس علم کے درمیان جو چیزوں کے وجود میں آنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے پیدا کرنے سے پہلے ان کی تقدیر لکھ دی ہے لیکن اہل سنت و جماعت وجود علمی خارجی کے درمیان فرق کرتے ہیں۔

یہ اصل اور یہ قول کہ معدوم عدم میں ایک ثابت شئ ہے اگرچہ باطل ہے مگر چار سو سال سے اس کا عقیدہ چلا آ رہا ہے۔ ابن عربی نے اس عقیدے والوں کی موافقت کی ہے۔

دوسری اصل یہ ہے کہ احادیث و محدث مخلوقات کا وجود عین خالق کا وجود ہے نہ تو وہ خالق کا غیر ہیں اور نہ ہی اس کے سوا کچھ اور ہیں۔ اس اصل کو سب سے پہلے ابن عربی ہی نے پیش کیا۔ وہ اس معاملے میں بالکل منفرد ہیں۔ ان سے پہلے کسی شیخ اور عالم نے یہ نظریہ پیش نہیں کیا۔ آج کل کے تمام اتحادی اسی نظریے کی پیروی کر رہے ہیں لیکن ان سب میں ابن عربی اسلام سے قریب تر ہیں۔ اکثر جگہوں پر ان کا کلام بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ظاہر اور مظاہر کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ اور اوامر و نواہی اور امور شریعت کو اپنی جگہ پر برقرار رکھتے ہیں اور مشائخ امت نے جن اخلاق و عبادات کی تعلیم دی ہے ان پر عمل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ عابد و زاہد لوگ جو ان کے کلام کو اپنا رہنما اور رہبر بناتے ہیں اپنے سلوک کی منزلوں کے طے کرنے میں ان کے کلام سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ ابن عربی کے پیش کردہ حقائق کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ اور جو لوگ سمجھ سکتے ہیں ان پر ان کے خیالات و نظریات کی حقیقت کھل جاتی ہے۔

اب رہے ابن عربی کے ساتھی صدر الدین رومی قونوی تو وہ متفلسف (فلسفہ جاننے کے مدعی) تھے اور شریعت اور اسلام سے دور تھے۔ اسی لیے فاجر عفیف الدین، تلمسانی کہا کرتا تھا کہ میرا پرانا شیخ متروحن (روحانیت کا مدعی) اور متفلسف (فلسفہ جاننے کا مدعی) تھا اور

دوسرا فیلسوف اور مترو حسن تھا اس سے ان کی مراد صدر الدین رومی سے تھی کیونکہ انہوں نے ان سے علم حاصل کیا تھا۔عفیف الدین کی ملاقات ابن عربی سے نہیں ہوئی تھی۔

صدر الدین رومی نے اپنی کتاب مفتاح غیب الجمع والوجود وغیرہ میں لکھا ہے۔کہ اللہ بے شک وہی ہے جس کا وجود مطلق ہے اور یہ ایک بدیہی بات ہے کہ مطلق کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔جب بھی کوئی وجود پایا جائے گا وہ معین ہی پایا جائے گا۔ان کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔اگر اس کا وجود پایا جائے گا تو وہ مخلوقات ہی کے وجود میں پایا جائے گا۔اسی لیے ان کا اور ان کے شیخ کا کہنا یہ ہے کہ خدا کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا اور وہ جب بھی دکھائی دے گا تو کسی خاص معین چیز ہی کی شکل میں دکھائی دے گا۔

اب رہا فاجر تلمسانی تو وہ ان لوگوں میں سب سے زیادہ خبیث تھا۔اس کا کفر سب سے زیادہ گہرا تھا۔وہ وجود اور ثبوت کے درمیان اس طرح کا کوئی فرق نہیں کرتا جس طرح ابن عربی کرتے ہیں اور مطلق اور معین کے درمیان اس طرح کی کوئی تمیز نہیں کرتا جس طرح صدر الدین قونوی کرتے ہیں۔اس کے نزدیک تو اللہ کے سوا کسی اور چیز کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ وہ یہ کہا کرتا تھا کہ جب تک بندے پر حجاب طاری رہتا ہے وہ ماسوی اللہ کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے اور جب یہ حجاب اٹھ جاتا ہے تو پھر اس کو اللہ کے سوا کوئی اور چیز نظر نہیں آتی۔اسی بنا پر وہ تمام محرمات کو حلال سمجھتا تھا۔یہاں تک کہ بعض معتبر لوگوں کا بیان ہے کہ وہ اپنی لڑکی، اپنی ماں اور ایک اجنبی عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا تھا۔وہ یہ کہا کرتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی ہم پر حرام نہیں ہے اور چونکہ یہ محجوب لوگ ان کو حرام سمجھتے ہیں اس لیے ہم بھی ان کو ان پر حرام قرار دیتے ہیں۔لیکن یہ ہم پر حرام نہیں ہیں۔تلمسانی یہ بھی کہا کرتا تھا کہ قرآن پورے کا پورا شرک سے بھرا ہوا ہے۔اگر توحید کہیں پائی جاتی ہے تو وہ صرف ہمارے ہی کلام میں پائی جاتی ہے۔وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ وہ کسی شریعت کا پابند نہیں ہے۔اگر کبھی قرآن کی تعریف کرتا تو اتنا کہتا کہ قرآن جنت کی راہ دکھاتا ہے اور خود اس کا (تلمسانی کا) کلام اللہ تک پہنچاتا ہے۔اس نے اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کی تشریح کی ہے۔اس کا ایک دیوان

بھی ہے جو شاعری کے لحاظ سے اچھا ہے مگر اس کے کلام پر عربی کی یہ مشہور مثل صادق آتی ہے۔ لحم خنزیر فی طبق صینی (چینی طبق میں سور کا گوشت) اس نے نصیری شیعوں کے لیے ایک عقیدہ بھی لکھا تھا۔ تلمسانی کے نزدیک حق تعالیٰ کی حیثیت ایک سمندر کی سی ہے۔ اور دوسرے تمام موجودات موجوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اب رہا ابن سبعین تو وہ بھی وحدۃ الوجود کا قائل تھا۔ وہ یہ کہا کرتا تھا کہ اللہ کے سوا کسی اور چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ابن الفارض کا بھی کم وبیش یہی عقیدہ تھا، جیسا کہ اس کے قصیدۂ تائیہ نظم السلوک سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی کہ آیا یہ دونوں اس عقیدے میں تلمسانی کے حامی تھے یا صدر الدین قونوی اور ابن عربی کے مگر ان سب میں تلمسانی سے بڑھ کر میں کسی کو کافر نہیں پاتا۔

مشائخ شیراز میں سے ایک شرف الدین عبداللہ البلبانی ہے جس کا یہ شعر ہے۔

وفی کل شئ له آیة
تدل علی انه عینه

اور ہر چیز میں اسی کی نشانی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اس کا عین ہے۔

اسی کا یہ دوسرا شعر بھی ہے:

وما انت غیر الکون بل انت عینه
ویفهم هٰذا السر من هو ذائقه

اور تو کون کے سوا نہیں ہے بلکہ تو اس کا عین ہے۔ اس راز کو وہی سمجھتا ہے جو اس کا ذوق رکھتا ہے۔

اس قسم کے بہت سے اشعار میں اور نثر میں تو اتنی چیزیں ہیں کہ جن کو کوئی شمار نہیں کر سکتا اس کے باوجود یہ لوگ عوام کو اس وہم میں ڈالتے ہیں کہ یہ لوگ مشائخ اسلام اور ائمہ ہدایت میں سے ہیں جن کی زبان کو اللہ تعالیٰ نے لسان صدق (سچی زبان) قرار دیا ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو سعید بن المسیب رحمہ اللہ، حسن بصری رحمہ اللہ، عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ، مالک ابن

انس رحمہ اللہ، اوزاعی رحمہ اللہ، ابراہیم ابن ادہم رحمہ اللہ، سفیان ثوری رحمہ اللہ، فضیل بن عیاض رحمہ اللہ، معروف الکرخی رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، ابوسلیمان دارانی رحمہ اللہ، احمد بن حنبل رحمہ اللہ، بشر الحافی رحمہ اللہ، عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ، شقیق بلخی رحمہ اللہ وغیرہ جیسے بے شمار مشائخ متقدمین اور جنید بن محمد القواریری، سہیل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ، عمرو بن عثمان مکی رحمہ اللہ، ابوطالب مکی رحمہ اللہ، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ شیخ عدی بن مسافر الاموی رحمہ اللہ شیخ ابوالبیان رحمہ اللہ، شیخ ابومدین مغربی رحمہ اللہ، شیخ عقیل المنبجی رحمہ اللہ، شیخ ابوابوفاء رحمہ اللہ، شیخ رسلان رحمہ اللہ، شیخ عبدالرحیم رحمہ اللہ، شیخ عبداللہ الیونینی رحمہ اللہ وغیرہ جیسے مشائخ متاخرین کے مانند سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب حضرات متفقہ طور پر اس عقیدے کے لوگوں کو کافر سمجھتے تھے۔ ان سب کا یہی خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کا عین نہیں ہے اور نہ وہ اپنی مخلوقات کا جز ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اوروں سے ممتاز ہے اور اپنی مخلوقات سے بالکل الگ اور نہ ان سب پر ارفع اور اعلیٰ ہے۔ چاروں آسمانی کتابیں یعنی زبور، تورات، انجیل، اور قرآن مجید اسی پر گواہی دے رہی ہیں اور لوگوں کی فطرت بھی اسی پر شہادت دے رہی ہے۔

اکثر میں یہی خیال کرتا رہتا ہوں کہ تاتاریوں کے ظہور اور غلبہ اور شریعت اسلام کے مٹنے کا ایک بہت بڑا سبب اس قسم کے لوگوں کی پیدائش ہے۔ یہ لوگ درحقیقت کانے دجال کے پیشرو ہیں کیونکہ یہ لوگ ہر چیز کو اللہ تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دجال بھی فرعون کی طرح ایک بڑا عارف ہے اور آنحضرت ﷺ کے بعد سب سے بڑا پیغمبر ہے۔

بہت زمانے پہلے ہمارے ساتھیوں میں سے ایک جو وحدۃ الوجود کے قائل تھے مگر بعد میں توبہ کر لی ہم سے کہا کہ ہمارے پاس ایک ایسا شخص آیا ہے جو یہ کہتا ہے کہ وہ خاتم الاولیاء ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ جب حلاج نے انا الحق کہا تو وہ اللہ ہی تھا جس نے حلاج کی زبان پر کلام کیا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ کوئی جن ایک پاگل کی زبان سے بولنے لگتا ہے۔ اس کے دوسرے معنے یہ ہوئے کہ صحابۂ کرام نے آنحضرت ﷺ کی زبان سے جو کلام سنا وہ آنحضرت کا نہیں تھا بلکہ اللہ کا کلام تھا۔ میں نے اس قول کا فساد ظاہر کیا اور کہا کہ اگر واقعی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے۔ تو صحابۂ کرام بھی موسیٰ بن عمران کے مرتبے پر ہوتے یہ

اتحادی موسیٰ بن عمران سے بھی بڑھ کر نکلے کیونکہ حضرت موسیٰ نے درخت سے کلام الٰہی سنا مگر یہ لوگ براہ راست خدا سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان اتحادیوں میں سے اکثر اتنے جاہل ہیں کہ وہ تلمسانی کے پیش کئے ہوئے اتحاد عام اور نصاریٰ اور غالی شیعوں کے اتحاد معین کے درمیان کوئی تمیز اور فرق نہیں کر سکتے۔

ائمہ سادات اور سلف امت کے لوگ جہمیوں کے کفر کو یہودیوں کے کفر سے بھی بڑھ کر خیال کرتے تھے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن المبارک اور حضرت امام بخاری رحمہما اللہ وغیرہ نے تصریح کی ہے مگر یہ اتحادی ان جہمیوں سے بھی بڑھ کر کافر ہیں۔ یہ ان باتوں کو بھی سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے جو علمائے اسلام نے جہمیوں کی تردید میں کہی ہیں۔ بعض لوگوں نے ٹھیک لکھا ہے کہ متکلمین جہمیہ کسی چیز کی بھی پرستش نہیں کرتے۔ لیکن ان کے عابد و زاہد ہر چیز کی پرستش کرتے ہیں۔ کیونکہ متکلمین جہمیہ کے دل میں نہ تو خدا ہی کا خیال ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی عبادت کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے رب کو سلبی صفات سے متصف کرتے ہیں۔ مگر عابد و زاہد لوگوں کے دل میں خدا پرستی اور عبادت کا جذبہ ہوتا ہے اور ان کا دل ہمیشہ کسی موجود شے کی پرستاری کا طلبگار رہتا ہے اسی لیے وہ مخلوقات کی پرستش کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ اتحادی درحقیقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اسی قدر مشترک کی پرستش کرتے ہیں جو اللہ اور اس کی مخلوقات کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اب رب کو دوسروں کے برابر قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن سبعین ہندوستان چلے جانے کا ارادہ رکھتا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اسلامی سرزمین ان خیالات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان جیسی سرزمین ہی میں جہاں ہر چیز کی پوجا ہوتی ہے۔ اس کے خیالات فروغ پا سکتے ہیں۔

یہ ہے اتحادیوں کے قول کی حقیقت، میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں فلسفہ اور کلام سے غیر معمولی دلچسپی ہے اور جن کو ان اتحادیوں کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلنے کی بڑی خواہش ہے۔

یہ لوگ رب کے لیے ایسی صنعتیں پیش کرتے ہیں جو اس کے لیے مناسب اور موزوں نہیں ہو سکتیں۔ اور جب اس پر کوئی معقول اعتراض کیا جاتا ہے تو فوراً یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ ہمارا

ذوق اور وجدان اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ایسے گمراہوں کا جواب یہی ہے کہ ہر وہ ذوق اور وجد جو اسلامی معتقدات و خیالات کے مطابق نہ ہو یا تو ان میں سے ایک باطل ہوگا یا دونوں باطل ہوں گے کیونکہ ذوق اور وجد معارف اور اعتقادات کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے کہ دل کا علم اور اس کا حال دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم ہیں۔ علم اور معرفت کے مطابق ہی وجد یا حال پیدا ہوسکتا ہے۔ اگر یہ لوگ انبیائے مرسلین کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے جنہیں اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرنے کا حکم ملا تھا اور اپنے رب کے وہ اوصاف بیان کرتے جو خود اللہ نے اپنے متعلق بیان کئے ہیں یا جن کو رسولوں نے بیان کیا ہے اور پھر وہ اگلے مسلمانوں کے راستے کی پیروی کرتے تو وہ ضرور ہدایت کا رستہ پاتے اور یقین کی ٹھنڈک حاصل ہوتی جس سے ان آنکھوں کو بھی ٹھنڈک اور سیری ملتی۔ رسولوں نے تفصیلی طور پر صفات الٰہی گنائے ہیں اور چند مجمل اوصاف کی نفی کی ہے مگر ان اتحادیوں نے صابی لوگوں کی طرح الٹا طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہ زیادہ تر سلبی صفات سے اللہ کو متصف کرتے ہیں۔ اور محض چند ایجابی اوصاف بیان کرتے ہیں۔

خدا شیخ کو اسلام کی تائید کا ذریعہ بنائے اور ان کی سانسوں کی برکت اور ان کے نیک ارادوں اور ان کے دل کی روشنی سے مسلمانوں کو نفع پہنچائے۔ یہ مراسلہ بہت زیادہ طویل ہوگیا ہے۔ اس میں صرف چند نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کی تشریح ایک خط میں نہیں ہوسکتی۔ میں نے اس وقت وہی باتیں لکھ دی ہیں جو میری نظر میں ضروری معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ خط جلدی میں لکھا گیا ہے کیونکہ اس کا لے جانے والا سفر کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ خدا سے میری یہی دعا ہے کہ وہ عام اور خاص مسلمانوں کی اصلاح کرے اور انہیں ایسی باتوں کی ہدایت دے جو انہیں خدا سے قریب کرنے والی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے میری یہ بھی دعا ہے کہ وہ شیخ کو بھلائی اور نیکی کی طرف بلانے والوں میں سے بنائے۔

اس خط کا ردِ عمل

یہ نہیں معلوم ہے کہ شیخ نصر بن سلیمان المنبجی نے اس خط کا کیا جواب دیا مگر بعد کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے امام ابن تیمیہ کے اس خط کا بالکل الٹا اثر لیا۔ انہیں

ان سے ایک طرح کی دشمنی پیدا ہوگئی تھی اور جب کچھ مہینوں کے بعد امیر افرم نائب السلطنت شام کی موجودگی میں فقرائے رفاعیہ کے ساتھ وہ مشہور مناظرہ پیش آیا جس کی تفصیل اوپر دی جا چکی ہے۔ تو ان کا رویہ اور زیادہ سخت ہوگیا۔ شیخ نصر بن سلیمان المنبجی نے امام ابن تیمیہ کو احتساب عقائد کے شکنجے میں کسنے کی کوشش کی جس کی پوری تفصیل ''فتنۂ عقائد'' کے عنوان سے دی جا چکی ہے۔

سلسلۂ تردید

امام ابن تیمیہ نے اس مدت میں کئی رسالے لکھے ہیں جن میں صوفیہ کے عقائد و اعمال باطلہ کی پرزور تردید کی ہے۔ وحدۃ الوجود کے ابطال پر ''حقيقة مذهب الاتحاديين او وحدة الوجود وبيان بطلانه بالبراهين النقليه والعقليه'' کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں کم و بیش انہی دلائل کو دہرایا ہے جن کو اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ اصحاب صفہ کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ان کے حقیقی تاریخی حالات پیش کئے ہیں اور ان کی تعداد بتائی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اصحاب صفہ ہرگز عشرۂ مبشرہ سے افضل نہیں تھے اور نہ انہوں نے کوئی سماع کی محفل منعقد کی تھی۔ ان لوگوں کی فضیلت ان کے فقرو فاقہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ مضبوط ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے ہے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی آیتوں سے اولیاء اللہ کی تشریح کی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ ولایت کا حصول اطاعات کی بدولت ہوتا ہے۔ انہوں نے فقراء اور اغنیاء کا مقابلہ کر کے اس مشہور عوام حدیث کی تردید کی ہے کہ فقراء اغنیاء سے آدھے دن پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اگر اغنیاء شریعت کی کلی اتباع کے ساتھ ساتھ اپنے مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کریں تو ان کا درجہ ان فقراء سے بھی بڑھ جاتا ہے۔

انہوں نے غوث، قطب، ابدال، اوتاد، نجباء، رجال الغیب اور خاتم الانبیا و خاتم الاولیاء کی غیر شرعی اصطلاحات کو بھی واضح کیا ہے اور لکھا ہے کہ قرآن و سنت سے ان کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں جتنی حدیثیں بھی پیش کی جاتی ہیں سب کی سب ضعیف اور موضوع ہیں۔ اصل میں صوفیہ نے باطنیت کے فلسفہ سے متاثر ہو کر اس قسم کی اصطلاحیں گھڑ لی ہیں اور

یہ لکھ دیا ہے کہ غوث ایک ہے جو مکہ میں ہوتا ہے۔ سات اقلیموں کا لحاظ کرتے ہوئے ہر ایک اقلیم کے لیے ایک قطب قرار دیا ہے جس پر دین و دنیا کے ظاہری و باطنی امور کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اس طرح ابدال و اوتاد و نجباء کی جو تعداد چالیس سے لے کر تین سو تک کی بتائی جاتی ہے۔ وہ بھی غلط ہے۔ رجال غیب کا نظریہ درحقیقت رافضیوں کا تھا جو یہ سمجھتے تھے کہ حضرت علی بادل میں غائب ہیں۔ محمد بن الحنیفہ رضوی کے پہاڑوں میں روپوش ہیں۔ محمد بن الحسن سامر کے سرنگ میں جا کر غائب ہو گئے ہیں اور فاطمی خلیفہ حاکم بامر اللہ مصر کے پہاڑ میں روپوش ہو گیا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کے مطابق یہ خیال کیا جانے لگا کہ ابدال لبنان کی پہاڑوں میں روپوش ہو گئے ہیں اور صوفیہ اور اولیاء کو دکھائی دیتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ پرہیز گار اولیاء اللہ بلکہ انبیا مرسلین میں سے کوئی بھی ایسا نہیں گزرا جس کا جسم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لوگوں کی نظروں سے غائب رہا ہو یا رہتا ہو۔

انہوں نے عبادات شرعیہ وعبادات بدعیہ پر بھی بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ مراقبے کی مروجہ شکل غیر مفید اور غیر شرعی ہے اور اسم مفرد کے ساتھ ذکر یعنی صرف ''ہو ہو'' کہتے جانا بدعت ہے۔ آنحضرت ﷺ یا صحابہ کرام سے اس قسم کا ذکر ہرگز مروی نہیں ہے۔

انہوں نے خرقۂ تصوف پر بھی بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ حضرت علی کے متعلق یہ روایت کہ آنحضرت ﷺ نے انہیں اپنے ہاتھ سے خرقۂ خلافت پہنایا بالکل جھوٹ ہے۔ یہ سب چیزیں بعد کی پیداوار ہیں۔ اسی طرح ظاہر و باطن کے متعلق جو مشہور حدیث پیش کی جاتی ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ قرآن کا باطن ہے اور اس باطن کا ایک باطن ہے اس طرح اس کا سلسلہ سات باطن تک پہنچتا ہے بالکل جھوٹ ہے۔ اہل علم میں سے کسی نے بھی اس کو روایت نہیں کیا ہے۔ البتہ ایک موقوف اور مرسل حدیث حضرت حسن بصری سے بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''بے شک ہر آیت کا ایک ظاہر و باطن اور حد و مطلع ہوتا ہے۔'' مگر اس کی تشریح میں علوم ظاہری اور علوم باطنی کے درمیان جو تفریق کی جاتی ہے وہ غلط ہے۔ آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے اپنی کوئی بات نہیں چھپائی۔ اب رہی حضرت ابوہریرہ کی یہ حدیث کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے دو تھیلیاں حاصل

کیں۔ ایک کو تمہارے اندر بکھیر دیا ہے اور دوسری کو اگر بکھیروں تو تم میرا گلا کاٹ دو گے۔
اس حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے مگر اس کو علوم ظاہری اور علوم باطنی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیندہ ہونے والے ملاحم وفتن کے واقعات کے متعلق ہے۔ صوفیہ عام طور پر قرآن مجید کی آیتوں اور حدیث کے ارشادات کی جو باطنی تشریح کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ ان کی تمام تحریروں پر باطنیت کا کھلا ہوا اثر ہے۔

انہوں نے مسئلہ سماع کے متعلق بھی ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور صوفیہ کے گانے بجانے اور وجد وحال پیدا کرنے کے جواز کی سخت تردید کی ہے اپنی اوائل عمر کا ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ کہ انہیں ایک مرتبہ زاہدوں اور عابدوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جو سماع کے شائق اور حامی تھے۔ انہوں نے ایک مجلس سماع منعقد کرنی چاہی۔ امام موصوف کو اس میں شرکت کی دعوت دی مگر انہوں نے شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ آخر انہیں ایک علیحدہ کمرے میں چھوڑ کر سماع کی مجلس منعقد کی۔ جب قوال ساز اور طنبورے پر گانے لگے تو ان صوفیہ پر وجد وحال طاری ہو گیا۔ صوفیہ کے سرگروہ نے ابن تیمیہ کا نام لے لے کر پکارنا شروع کیا آؤ اور اپنا حصہ حاصل کرو۔ امام موصوف اس سے ذرا بھی متاثر نہ ہو سکے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ انہیں کسی ایسی چیز میں حصہ پانے کی ہرگز خواہش نہیں ہے جو محمد بن عبداللہ کی لائی ہوئی شریعت کے مطابق نہ ہو۔ [1]

انہوں نے اپنے رسالہ العبودیۃ میں فنا کے مسئلہ پر بھی ایک عالمانہ بحث کی ہے اور اس کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک وہ ہے جو انبیا کاملین اور اولیاء صالحین کو حاصل ہوتا ہے۔ اس میں بندے کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو رضائے الٰہی کا تابع بنائے اور اپنی خواہش اور اپنے ارادے کو بالکل مٹا دے یہ فنا کا بلند ترین مقام ہے۔ فنا کی دوسری قسم وہ ہے جو بعض سالکین کو پیش آتی ہے۔ ایک سالک ذات الٰہی کے مشاہدے میں اتنا مستغرق ہو جاتا ہے کہ یہ تمام مخلوقات حقیقت میں معدوم اور فنا ہو جاتی ہیں۔

بلکہ وہ صرف ان کے مشاہدے سے قاصر ہوتا ہے۔ اس مقام میں پہنچ کر بہت سے

---

[1] مجموعة الرسائل والمسائل ٥/ ١٠٣۔

سالکوں کو لغزش ہوئی ہے اور انہوں نے یہ خیال کیا ہے کہ محبوب سے ان کا کلی وصال حاصل ہوگیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ دو چیزیں متحد ہو کر ایک نہیں ہو جاتیں تاوقتیکہ ان کی نوعیت ایک نہ ہو۔ پانی پانی سے مل سکتا ہے۔ دودھ دودھ سے مل سکتا ہے۔ لیکن پانی اور دودھ مل کر خالص پانی یا خالص دودھ نہیں ہوسکتا۔ وہ کوئی تیسری چیز بن جاتی ہے حضرت ابوبکر وعمر اور صحابہ کرام کو یہ مقام کبھی حاصل نہیں ہوا۔ ان میں حجاب، ضعف، سکر، بے خودی، بیہوشی، مستی، دیوانگی کی کیفیتیں کبھی پیدا نہیں ہوئیں۔ اس قسم کے واقعات تابعین کے دور اخیر میں پیش آئے۔ جبکہ بصرہ کے مرتاض اور کثیر العبادۃ لوگوں نے اپنے اندر اس قسم کی کیفیتیں پیدا کر لیں۔ اسی وجہ سے ان کی زبان سے سکر کی حالت میں ایسے کلمے صادر ہوئے جن کو ہوش میں آنے کے بعد خود ہی غلط سمجھنے لگے تھے چنانچہ حضرت بایزید بسطامی، شیخ ابوالحسن نوری اور شیخ ابوبکر شبلی کے متعلق اس قسم کی روایتیں پیش کی جاتی ہیں کہ انہوں نے خدا کے ساتھ اتحاد کا دعوی کیا۔ مگر ابوسلیمان دارانی، معرروف کرخی، فضیل بن عیاض اور جنید بغدادی میں اس قسم کی غلط کیفیتیں پیدا نہیں ہوسکیں کیونکہ فنا وسکر کی حالت میں بھی ان کی عقل اور قوت تمیز ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی۔

فنا کی تیسری قسم وہ ہے جس میں سالک یہ دعویٰ کرے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور چیز کو نہیں دیکھتا کیونکہ اس کے نزدیک رب اور عبد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ خالق کا وجود ہی مخلوقات کا وجود ہے۔ یہ ان اہل ضلال والحاد کا فنا ہے جو حلول و اتحاد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں صاحب استقامت مشائخ کے اقوال بطور سند کے پیش کیے جاتے ہیں۔ مگر ان کی مراد درحقیقت یہ ہوتی تھی کہ خدا کی ایک ذات کے سوائے کوئی دوسرا حقیقی معنی میں رب یا خالق یا معبود یا مدبر نہیں ہے۔ وہ کسی اور سے محبت یا خوف نہیں کرتے تھے اور کسی دوسرے سے کوئی چیز طلب نہیں کرتے تھے۔ ان مشائخ صالحین کا مقصد یہ تھا کہ بندہ خدا کے سوا کسی اور طرف متوجہ نہ ہو اور نہ ماسوا پر محبت یا خوف یا امید کے جذبے سے نظر ڈالے۔ اس سے مراد ہرگز فنا فی الوجود، وحدۃ الوجود یا توحید وجودی نہیں تھی۔ یہ تو قرامطہ جیسے آل فرعون کی تحقیق وتوحید کی معرفت تھی۔ مخلوقات میں سے جس چیز پر نظر ڈالی جائے وہی آسمان وزمین کا

پروردگار ہے۔ یہ بات تو وہی کہہ سکتا ہے جو پرلے درجے کا بے علم یا گمراہ ہو، سلف امت کے مقتدر پیشوا خالق کو مخلوق سے اور معبود کو عابد سے اور قدیم کو حادث سے بالکل ممتاز سمجھتے تھے اور یہ گواہی دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا رب اور اس کا مالک و خالق ہے اور یہی حقیقی توحید کا مشاہدہ کرنا ہے۔

دشمنوں کا اعتراف

امام ابن تیمیہ کی یہ تمام تردیدی تحریریں اس زور کی تھیں کہ نام نہاد صوفیہ کے اندر ان کی وجہ سے ایک کھلبلی مچ گئی تھی۔ ان کے دشمنوں سے بھی امام موصوف کے قرآن وسنت کے کھلے ہوئے دلائل کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ان کی تحریروں کی غیر معمولی قوت کو محسوس کر رہے تھے اور دل سے ان کے کمال اور قابلیت کا اعتراف کر رہے تھے۔ اگر ان کی شدت اور سختی نہ ہوتی تو یہ لوگ ان کو اپنا امام ماننے کے لیے بھی تیار تھے۔ چنانچہ خود امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

ولهذا لما بينت لطوائف من اتباعهم ورءساءهم حقيقة قولهم وسر مذهبهم صاروا يعظمون ذلك ولولا ما اقرنه بذلك من الذم والرد لجعلوني من ائمتهم وبذلوا لی من طاعة نفوسهم واموالهم مايجل عن الوصف كما تبذله النصارٰی لروساءهم والاسماعيلية لكبراء هم۔[1]

"اور اس لیے جب میں نے ان کے پیروں اور رئیسوں کی چند جماعتوں کے سامنے ان کے قول کی حقیقت اور ان کے مذہب کا راز بتایا تو وہ کوئی بڑی چیز تصور کرنے لگے اور اگر میں اس کے ساتھ ساتھ ان کی مذمت اور تردید نہیں کرتا تو وہ مجھ کو اپنا امام بنا لیتے اور میرے لیے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو اتنا خرچ کرتے کہ کچھ بیان نہیں کیا جا سکتا بالکل اسی طرح جس طرح کہ نصاری اپنے رؤسا کے لیے اور اسماعیلیہ اپنے بڑوں کے لیے اپنی جانوں اور مالوں کو خرچ

---

[1] مجموعة الرسائل والمسائل ٤/ ٤۔

کرتے ہیں۔"

مصر میں پہلا وعظ

اوپر تفصیل دی جا چکی ہے کہ امام ابن تیمیہ کس طرح دمشق سے بلائے گئے تھے اور قاہرہ میں قید کر دیئے گئے تھے۔تقریباً دو سال بعد ۲۳ ربیع الاول ۷۰۷ھ کو رہائی ملی۔عام لوگوں میں ان کی کافی شہرت ہو چکی تھی۔جب ۳۰ ربیع الاول ۷۰۷ھ کو قاہرہ کی جامع حاکمی میں پہلا جمعہ ادا کیا۔تو لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے تقریر کی درخواست کی۔مگر وہ چپ رہے۔دائیں اور بائیں لوگوں کو دیکھتے جاتے تھے اتنے میں کسی نے بلند آواز سے یہ آیت پڑھی۔

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ﴾ [1]

"اور جبکہ اللہ نے کتاب والوں سے وعدہ لیا کہ تم ضرور لوگوں کو اس کے متعلق بیان کرو گے اور اس کو نہیں چھپاؤ گے۔"

اتنا سننا تھا کہ امام موصوف کھڑے ہوئے اور حمد وثنا کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھی اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پر عصر کی نماز تک ایک دلچسپ اور مبسوط تقریر کی اور عبادت و استعانت کے متعلق بہترین تشریح کی۔

مصر میں ان کا یہ پہلا وعظ تھا۔انہوں نے اس وعظ میں صرف قرآن مجید کی مختلف آیات اور صحیح احادیث وآثار سے استدلال کیا تھا وہ تقریر کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے موضوع یا جھوٹی یا ضعیف روایتوں کو کبھی پیش نہیں کرتے تھے۔ان کا طرز بیان اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ سننے والوں کو محو کر دیتا تھا۔

ہر جمعہ کو تقریر کی درخواست

اس پہلی تقریر کے ساتھ لوگوں کی شیفتگی اور عقیدت اتنی بڑھی کہ اس کے بعد ہر جمعہ کو ان سے تقریر کی درخواست کی جانے لگی۔وہ ہر جمعہ کو تقریر کرتے تھے اور مختلف جگہوں سے

---

[1] ۳/آل عمران:۱۸۷۔

جو سوالات آتے تھے۔ان کا جواب دیا کرتے تھے۔اس طرح چھ مہینے وعظ وارشاد اور فتووں کے جوابات میں گزر گئے۔

مدعیان وحدۃ الوجود پر بے لاگ تنقید

آخر ۶ شوال ۷۰۷ھ کو امام ابن تیمیہ نے جمعہ کی نماز کے بعد حسب دستور ایک تقریر کی جو عصر تک جاری رہی۔اور اس تقریر میں جب وحدۃ الوجود اور دوسرے مسائل کا ذکر آیا تو انہوں نے اپنے پورے زور بیان اور قوت استدلال کے ساتھ صوفیوں کے غلط عقائد و نظریات وخیالات کی سخت تردید کی اور ابن عربی، ابن فارض، صدر الدین قونوی، ابن سبعین اور تلمسانی پر بے لاگ تنقید کی۔اس کا یہ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ صوفی بگڑ بیٹھے اور مسجد ہی میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور پھر سلطان سے جا کر شکایت کی۔اس زمانہ میں قاہرہ کے اندر صوفیہ کے دو سرگروہ ایسے تھے جن کا عوام پر بڑا اثر اور رسوخ تھا ان میں سے ایک شیخ عبدالکریم آملی تھے اور دوسرے ابن عطاء اللہ الاسکندرانی تھے۔

عبدالکریم آملی

شیخ عبدالکریم کی کنیت ابوالقاسم اور لقب کریم الدین تھا وہ حسین بن عبداللہ الآملی الطبری کے لڑکے تھے۔ان کا اعیان وامرائے دولت پر بڑا اثر تھا۔قاہرہ کی مشہور عام خانقاہ سعیدیہ کے شیخ الشیوخ تھے۔امام ابن تیمیہ ان پر سخت تنقیدیں کیا کرتے تھے۔خود صوفیہ کا ایک گروہ ان کا سخت مخالف تھا۔چنانچہ ایک مرتبہ ان کی مخالف جماعت نے سولہ صورتوں سے ان کی زندیقیت ثابت کی تھی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے عہدے سے معزول کر دیے گئے مگر بعض اعیان دولت کی سفارش سے اپنے عہدے پر بحال کر دئے گئے۔شوال ۷۱۰ھ میں انتقال کیا۔ان کی وفات کے بعد ان کی جگہ پر شیخ علاء الدین قونوی کو شیخ الشیوخ مقرر کیا گیا۔[1]

ابن عطاء اللہ الاسکندرانی

عبدالکریم آملی سے زیادہ ابن عطاء اللہ الاسکندرانی کی شہرت تھی۔وہ صوفی اور مصنف دونوں تھے۔اور ابن عربی وغیرہ کے کلام کے بہترین شارح تصور کیے جاتے تھے۔ان کا نام

---

[1] الدرر الکامنۃ: ۲/ ۳۹۷۔

احمد کنیت ابوالفضل اور لقب تاج الدین تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے تاج الدین ابوالفضل احمد بن محمد بن عبدالکریم بن عطاء اللہ الاسکندرانی۔ یہ شیخ ابوالعباس مرسی کے شاگرد تھے جو اسکندریہ میں مدفون ہیں۔ شیخ ابوالعباس مرسی شاذلی طریقہ کے بانی شیخ ابوالعباس مرسی شاذلی طریقہ کے بانی شیخ ابوالحسن علی بن عبداللہ المعتزلی الشاذلی الاسکندرانی (المتوفی: ۶۵۴ھ) کے شاگرد اور مرید تھے۔ ابن عطاء اللہ الاسکندرانی نے اپنا وطن ترک کر کے قاہرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ تصوف میں امام مانے جاتے تھے۔ ازہر کی جامع مسجد میں ان کے لیے کرسی رکھی جاتی تھی۔ جس پر بیٹھ کر وہ ہر ہفتہ وعظ کہا کرتے تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں جو شاذلی طریقے کے صوفیوں میں بہت مقبول ثابت ہوئیں ان کے بعض فقرے اور جملے صوفیانہ حقائق کی معجزانہ تعبیر کی بہترین مثال سمجھے جاتے ہیں۔ اس قسم کے چند جملے شیخ تاج الدین سبکی نے اپنی کتاب طبقات الشافعیہ [1] میں نقل کئے ہیں مثلاً:

كيف يتصور ان يحجبه شئ وهو الذى اظهر كل شئ

یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس کو کوئی چیز چھپائے گی جبکہ اسی نے ہر چیز کو ظاہر کیا ہے۔

كيف يتصور ان يحجبه شئ وهو الذى ظهر فى كل شئ

یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس کو کوئی چیز چھپائے گی جبکہ وہ ہر چیز میں ظاہر ہوا ہے۔

كيف يتصور ان يحجبه شئ وهو الذى يظهر لكل شئ

یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس کو کوئی چیز چھپائے گی جبکہ وہ ہر چیز کے لیے ظاہر ہوا ہے۔

كيف يتصور ان يحجبه شئ وهو الظاهر قبل وجود كل شئ وهو اظهر من كل شئ

یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس کو کوئی چیز چھپائے گی جبکہ وہ ہر چیز کے وجود سے

---

[1] طبقات الشافعية: ٥/ ١٧٦، ١٧٧۔

پہلے ظاہر ہوا ہے اور وہ ہر چیز سے بڑھ کر ظاہر ہے۔

ان جملوں میں زیادہ تر الفاظ اور فقروں کا الٹ پھیر ہے مگر ایسے ہی جملے ہوتے ہیں جن سے عوام میں غیر معمولی عقیدت پیدا ہوتی ہے۔ ابن عطاء اللہ الاسکندرانی کی الحکم العطائیہ اب تک صوفیہ کے گروہ میں بڑی اہمیت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ شیخ ابن عطاء اللہ الاسکندرانی نے جمادی الآخرہ ۷۰۹ھ میں وفات پائی۔

سلطان سے شکایت

ان مذکورہ بالا دونوں بزرگوں نے اپنے پیرؤوں کو لے کر جن کی تعداد پانچ سو بتائی جاتی ہے قلعہ پہنچ کر سلطان سے شکایت کی۔ سلطان ناصر نے قصر شاہی کے اندر ہی سے ان لوگوں کا شور و غوغا سنا تو دریافت کروایا کہ کیا معاملہ ہے۔ خدام شاہی نے خبر دی کہ یہ سب امام ابن تیمیہ کی شکایت لے کر آئے ہیں کہ وہ ابن عربی وغیرہ جیسے صوفیہ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں اور ان کی قدر و منزلت کو گھٹا رہے ہیں۔ سلطان قاضی القضاۃ بدرالدین بن جماعہ شافعی کو حکم دیا گیا کہ وہ اس معاملہ کی تحقیق کریں اور فیصلہ دیں، چنانچہ قاضی موصوف کے حکم سے ۱۰ شوال ۷۰۷ھ کو منگل کے دن دارالعدل قاہرہ میں ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں بہت سے علما مدعو کیے گئے تھے۔ شافعی عدالت کے سامنے ابن عطاء اللہ الاسکندرانی نے امام ابن تیمیہ کے خلاف الزامات لگائے اور عدالت سے انصاف کا مطالبہ کیا۔ امام موصوف نے ان الزامات کی ایک ایک کر کے پرزور تردید کی۔ ہر ایک مسئلہ کے متعلق قرآن و حدیث کے اتنے واضح اور صاف دلائل تھے کہ خود مدعی سے ان کا کوئی جواب نہیں ہو سکا۔ جرح کے سلسلہ میں مسئلہ استغاثہ پر بھی بحث ہوئی۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ سے استغاثہ کرنے کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ امام موصوف نے اس مسئلہ پر مدلل تقریر کی اور اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔ تمام علما اور فقہاء نے کہا کہ اس میں تو کوئی بات ایسی نہیں ہے جس پر شرعی حیثیت سے گرفت ہو سکے۔ قاضی القضاۃ بدرالدین ابن جماعہ نے کہا: اس میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ سوء ادب ہے اور انہیں اس سوء ادب کی سزا ملنی چاہیے۔ مگر دوسرے علما و فقہاء ان کی اس رائے کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس میں امام ابن تیمیہ کے متعلق

کوئی خاص فیصلہ نہ ہو سکا۔

دوبارہ شکایت

جب مخالفین نے دیکھا کہ انہیں کوئی سزا نہیں دی جا رہی ہے تو دوبارہ سلطان سے شکایت کی اور ان امیروں کو جو ان کے معتقد تھے۔ امام موصوف کے خلاف ابھارا۔ حکومت نے مجبور ہو کر ان کے سامنے تین شرطیں پیش کیں ایک یہ کہ وہ مصر سے دمشق چلے جائیں اور وہاں چند شروط کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ دوسرے یہ کہ قاہرہ سے اسکندریہ چلے جائیں اور وہاں چند شروط کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اگر یہ دونوں شرطیں منظور نہیں ہیں تو قید خانے میں رہنے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ چند شرطیں ان کی زبان بندی سے تعلق رکھتی تھیں۔ امام ابن تیمیہ ہرگز اپنی زبان اور اپنے قلم پر پابندی لگانا منظور نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے قید خانے کی زندگی ہی کو ان دونوں شرطوں پر ترجیح دی۔

دمشق لے جانے پر دوستوں کا اصرار

امام ابن تیمیہ کے چند دوستوں نے انہیں دمشق چلنے پر اصرار کیا ان لوگوں نے اپنی طرف سے یہ ذمہ داری لی کہ آئندہ دمشق میں ان سے خلاف قانون کوئی حرکت سرزد نہ ہوگی۔ چنانچہ ان کی درخواست پر حکومت نے انہیں دمشق واپس بھیجنے کا انتظام کیا اور وہ ۱۲ شوال ۷۰۷ھ کو جمعرات کے دن سرکاری ڈاک گاڑی میں بیٹھ کر دمشق روانہ ہوئے۔ ابھی پہلی منزل بلبیس پہنچے تھے کہ پیچھے سے سرکاری ہرکارہ گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور انہیں قاہرہ لوٹنے کا حکم دیا چنانچہ وہ وہیں سے قاہرہ لوٹ آئے۔

قید کی سزا

امام ابن تیمیہ کے قاہرہ لوٹانے کی وجہ یہ تھی کہ قاضی زین الدین بن مخلوف مالکی کو ان کے متعلق یہ ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ دمشق پہنچ کر ان تنگ نظر علما کے خلاف کوئی زبردست ہنگامہ نہ کھڑا کر دیں اور امیر بیبرس جاشنگیر کے آئندہ سلطان بننے کے راستہ میں روڑا نہ اٹکائیں۔ کیونکہ وہ سلطان ملک ناصر کے حامی تھے اور اس کی جگہ پر امیر بیبرس جاشنگیر کی تخت

نشینی کے فتوے پر کبھی دستخط نہیں کر سکتے تھے جیسا کہ آیندہ آئے گا۔ حکومت کی طرف سے جس وقت انہیں دمشق بھیجنے کا انتظام کیا گیا تو قاضی موصوف کو اس کی بروقت اطلاع نہ ہو سکی کیونکہ وہ بیمار تھے اور فریش تھے۔ جیسے ہی انہیں اس کی اطلاع ملی۔ نائب السلطنت مصر امیر بیبرس جاشنگیر سے کہہ کر امام ابن تیمیہ کو راستہ ہی سے لوٹا لیا اور جب وہ قاضی موصوف کے سامنے پیش کیے گئے تو کہا حکومت انہیں قید ہی میں رکھنا چاہتی ہے اور اسی میں ان کی بھلائی ہے۔ قاضی موصوف نے شیخ شمس الدین تونسی مالکی کو حکم دیا کہ وہ امام ابن تیمیہ کے لیے قید کا حکم سنائیں۔ وہ سخت متحیر تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ جب امام ابن تیمیہ نے علما کا یہ اختلاف دیکھا تو خود ہی کہا کہ اگر قید ہی میری بھلائی ہے تو میں خود قید خانہ جانے کے لیے تیار ہوں۔ اس پر شیخ نورالدین زدادی مالکی نے کہا کہ اگر ان کو قید ہی کرنا ہے تو پھر انہیں ایسی جگہ رکھا جائے جو ان کے مرتبہ اور شان کے شایان اور مناسب ہو۔ قاضی القضاۃ زین الدین مخلوف مالکی نے جواب دیا کہ حکومت کا مقصد صرف قید ہے اس سے زیادہ ان پر کوئی سختی نہ ہوگی۔ چنانچہ انہیں اسی دن یعنی ۱۹ شوال ۷۰۷ھ کو جمعہ کے دن حارۃ الدیلم کے قید خانے میں بھیج دیا گیا۔ جہاں کچھ زمانہ پہلے قاضی القضاۃ شیخ تقی الدین ابن بنت الاغر کو قید کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ کچھ خدمتگار بھی مقرر کر دیے گئے تا کہ انہیں ہر طرح کا آرام حاصل ہو۔ ہر شخص کو ان سے ملنے کی اجازت تھی۔ لوگ یہاں بھی سوالات لے کر پہنچتے تھے اور جوابات لکھوا لے جاتے تھے۔

قیدیوں کی اصلاح

حارۃ الدیلم کا یہ قید خانہ اونچے درجے کے قیدیوں کے لیے مخصوص تھا۔ ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ اکثر قیدی سرکاری کھانا کھاتے تھے اور سرکاری کپڑا پہنتے تھے۔ دن رات شطرنج وغیرہ کھیل کر اپنا وقت کاٹتے تھے۔ بہت سوں کو نماز روزے کی پابندی کا بھی کوئی خیال نہیں ہوتا تھا۔ قید خانے میں داخل ہوتے ہی امام ابن تیمیہ نے تمام قیدیوں کو محنت مشقت اور احکام شریعت کی پابندی کی طرف توجہ دلائی اور کاہلی اور سستی سے منع کیا۔ انہوں نے قید خانے کی چہار دیواری کے اندر ہی درس و تدریس کی مسند بچھائی اور ان کو کتاب و سنت کی تعلیم

دینی شروع کی ان کے فیض صحبت سے چند دنوں کے اندر ان قیدیوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت بہت بلند ہوگئی۔ ان میں سے بہت سے قیدیوں کو امام موصوف کے ساتھ اتنی محبت اور عقیدت ہوگئی تھی کہ میعاد ختم ہونے کے بعد بھی وہ قید سے رہا ہو کر گھر جانا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ وہ انہی کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیا کرتے تھے۔

چھوٹے بھائی کو قید کرنا

ایک سال اسی طرح گزرا۔ امام ابن تیمیہ کے دونوں بھائی شیخ زین الدین عبدالرحمٰن ابن تیمیہ اور شیخ شرف الدین عبداللہ ابن تیمیہ آزاد رہ کر اپنے عزیز بھائی کے قابل قدر خیالات کو عوام کے کانوں تک پہنچا رہے تھے۔ جب مخالفین نے یہ محسوس کیا تو قاضیوں کو ان دونوں کی گرفتاری پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ۲۰ شوال ۷۰۸ھ یعنی چہار شنبہ کی رات کو ان دونوں کی گرفتاری کا حکم جاری ہوا۔ شیخ شرف الدین عبداللہ ابن تیمیہ تو ہاتھ نہ آسکے۔ البتہ ان کے بڑے بھائی زین الدین عبدالرحمٰن ابن تیمیہ کو اور ان کے چند ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے دن ان کے ساتھیوں کو رہا کر دیا گیا۔ مگر زین الدین عبدالرحمٰن کو امام موصوف کے ساتھ ایک ہی کمرے میں قید کر دیا گیا۔

بیبرس جاشنگیر کی تخت نشینی اور تشویش

اس اثناء میں مصر کے سیاسی حالات نے ایک کروٹ لی۔ سلطان ناصر اپنے نائب السلطنت امیر بیبرس جاشنگیر کے سامنے بالکل بے بس ہوگیا تھا۔ وہ کوئی کام بھی اپنے اختیار سے نہیں کرسکتا تھا اس لیے اس نے ملک شام کے مشہور مقام کرک میں جا کر اقامت اختیار کر لی اور وہاں سے خود اپنی معزولیت کا خط لکھ کر مصر روانہ کر دیا۔ امیر رکن الدین بیبرس جاشنگیر نے سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور ۲۳ شوال ۷۰۸ھ کو ہفتے کے دن اپنے باقاعدہ سلطان ہونے کا اعلان کیا۔ مصر کے تمام قاضیوں نے اس کے برحق سلطان ہونے پر فتوے جاری کیے اور اس اعلان نامے پر بھی اپنے دستخط کر دیے۔ امیر بیبرس نے ملک شام کے امیروں اور قاضیوں کے نام یہ فتوے بھیجے اور انہیں وہاں کے لوگوں سے اپنی بیعت لینے کا حکم دیا۔ اس کی وجہ سے امام ابن تیمیہ کے بہی خواہوں کو تشویش شروع ہوگئی۔ بعض لوگوں کو یہ

یقین ہو چلا تھا کہ اب امام موصوف کا پیمانۂ حیات لبریز ہو چکا ہے اور ان کے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ کیونکہ امام ابن تیمیہ ملک ناصر کے زبردست حامی تھے۔ تمام تاتاری جنگوں میں اس کی مدد کی تھی۔ وہ امیر بیبرس جاشنگیر کے سخت مخالف تھے۔ ان کے مخالفین کے لیے اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہوسکتا تھا کہ اس سیاسی مخالفت کی آڑ لے کر انہیں قتل کر دیں مگر بعد کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت مصر انہیں قتل کر کے کسی نئے فتنے کا باعث نہیں بننا چاہتی تھی۔ حکومت کے لیے اتنا کافی تھا کہ امام موصوف قید خانے کی چار دیواری میں رہیں اس لیے کہ وہ عوام کو امیر بیبرس کے خلاف ورغلا نہیں سکتے تھے۔

اسکندریہ میں قید

جب ملک کے سیاسی حالات زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے اور امام ابن تیمیہ کے علم وفضل اور تقویٰ کی شہرت زیادہ پھیلنے لگی تو امام ابن تیمیہ کو قاہرہ سے دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس زمانہ میں اسکندریہ شاذلی صوفیہ کا بہت بڑا مرکز تھا۔ لوگ زیادہ تر ابن عربی اور ابن سبعین کے معتقد تھے۔ امیر بیبرس جاشنگیر اور دوسرے مخالفین کو خیال ہوا کہ اگر امام موصوف کو قاہرہ کے بجائے اسکندریہ میں نظر بند کیا جائے تو ابن عربی اور ابن سبعین کے پیرؤوں میں سے کوئی ان کا خاتمہ کر دے گا اور اس طرح امام موصوف اپنے کیے کی سزا پا جائیں گے۔ اور ان کے قتل کی ذمہ داری حکومت کے سر نہ رہے گی۔ مگر کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ امام موصوف کے علم وفضل اور قوت بیان کے سامنے عوام کا تعصب قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اور وہ بہت جلد اپنا مقام آپ پیدا کرلیں گے۔

حکومت نے ۵ سفر ۷۰۹ھ کو شیخ زین الدین عبدالرحمٰن ابن تیمیہ کو رہا کیا اور چند دن بعد ۳۰ سفر ۷۰۹ھ کو جمعہ کے دن ایک امیر کے ساتھ امام موصوف کو اسکندریہ بھیج دیا۔ کسی کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دی۔ ۲ ربیع الاول ۷۰۹ھ کو اتوار کے دن وہ اسکندریہ پہنچے۔ اور انہیں سمندر کے کنارے ایک وسیع اور خوشنما برج میں قید کیا گیا۔ اس کے دو راستے تھے جس میں سے ایک سمندر کی طرف کھلتا تھا۔ لوگ اسی راستے سے ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ امام موصوف نے یہاں بھی درس وتدریس کی مسند بچھائی اور کتاب وسنت کی تعلیم کو عام

کرنا شروع کیا۔

اپنے بھائی بدر الدین کے نام شیخ شرف الدین کا خط

اسکندریہ پہنچنے کے چند دن بعد شیخ شرف الدین ابن تیمیہ نے اپنے سوتیلے بھائی شیخ بدر الدین کے نام ایک خط لکھا ہے جو العقود الدریہ میں منقول ہے اس میں وہ حمد وصلوٰۃ کے بعد لکھتے ہیں۔

"ہمارے مکرم بھائی اسکندریہ پہنچ گئے ہیں۔ خدا کے دشمنوں نے اسلام اور اہل اسلام کو ضرر اور نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے مگر ان کے تمام برے مقاصد الٹ گئے اور ان کو ہر طرح سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ خدا اور مؤمنین عارفین کے نزدیک ان کا منہ کالا ہو گیا ہے اور وہ خود اپنے کیے پر نادم اور پشیمان ہو گئے ہیں۔ اور حسرت سے دانت چبانے لگے ہیں۔ اسکندریہ کے لوگوں نے بھائی صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور وہ سب کتاب اللہ اور سنت رسول کی باتوں پر لبیک کہتے جا رہے ہیں اور ارباب بدعت و ضلالت اور کفر و جہالت سے اور خاص ملاحدۂ اتحادیہ و جہمیہ سے نفرت کرتے جا رہے ہیں۔ اب ان کے دلوں میں ان ملاحدہ کی کوئی عزت باقی نہیں رہی ہے۔"

"ایک عجیب اتفاق کہ یہاں ایک ابلیس الحاد نے انڈے دے رکھے تھے اور بچے پیدا کئے تھے اور اپنا ایک گھونسلہ بنا رکھا تھا اور ابن سبعین اور ابن عربی کے پیرؤوں کو اور زیادہ گمراہ کر رہا تھا۔ بھائی صاحب کے یہاں پہنچنے کے بعد ان سب کی جماعتیں تتر بتر ہو گئیں اور ان کے رموز و اسرار کے سارے پردے چاک ہو گئے ہیں اور کفر و الحاد کے سارے بند ٹوٹ گئے ہیں۔ بہت سی جماعتوں نے توبہ کر لی ہے اور ان کے رئیسوں میں سے ایک جوان ملحدین کا سب سے زیادہ حامی تھا۔ تائب ہو گیا ہے اور خود ہی ایک کتاب لکھی ہے جس میں اپنی جماعت کے کفر الحاد کو واضح کیا ہے۔ خواص اور عوام مؤمنین کے نزدیک

بھائی صاحب بہت مشہور ہو گئے ہیں اور امیر اور قاضی مفتی اور فقیہ، شیخ اور مجاہد سب کے سب آپ کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ وہی شخص ان سے دور ہے جو جہالت میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر اس کو مؤمنین کے ہاتھوں اور ان کی زبانوں سے اہانت اور ذلت کا ڈر لگا ہوا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں پر اللہ کا کلمہ بلند ہو گیا ہے اور لوگوں کی عام مجلسوں میں ان ملاحدہ پر لعنت بھیجی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ سے شیخ نصر بن سلیمان المنبجی کو بھی سخت پریشانی لاحق ہو گئی ہے اور اسے اتنا خوف پیدا ہو گیا ہے کہ یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا۔''

حاکم سبتہ کو روایت تصانیف کی اجازت دینا

اس مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہ نے اپنے علم و فضل اور خوش بیانی کی بدولت کتنی جلدی اہل سکندریہ کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ دور دور تک ان کی شہرت پھیل گئی تھی یہاں تک کہ سبتہ کے حاکم نے ان سے ان کی تصانیف کی روایت کی اجازت مانگی اور آپ نے تقریباً دس صفحوں میں اپنی تمام تصنیفات کی ایک فہرست مرتب کی اور ان کی روایت کرنے کی بخوشی اجازت دے دی۔ [1]

ساتھیوں اور دوستوں پر سختی

شیخ نصر بن سلیمان المنبجی اور ان کے رفقاء نے قاہرہ اور دمشق کے اندر امام ابن تیمیہ کے ساتھیوں اور دوستوں پر سختی کرنی شروع کی۔ کئی ایک کو اپنے عہدے سے معزول کیا اور بعض کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا۔ شیخ کمال الدین ابن الزملکانی بھی ان میں سے ایک تھے۔ جن پر شیخ نصر کا عتاب نازل ہوا۔ شیخ نصر نے سلطان بیبرس جاشنگیر سے کہہ کر شیخ کمال الدین کو سرکاری شفاخانہ کے عہدۂ ناظری سے ربیع الاول ۷۰۹ھ کے آخر میں معزول کر دیا۔ [2]

حصول سلطنت کے لیے ملک ناصر کی کوشش

ملک ناصر نے اگرچہ اپنی بے بسی کی بنا پر اپنے آپ کو معزول کر لیا تھا مگر اس کے

---

[1] مجموع الدرر، ص: ۱۴۴۔ [2] البدایة و النهایة: ۱۴/ ۱۵۔

دوست اور احباب ملک کے حاصل کرنے پر اسے ہمیشہ ورغلاتے رہے۔ چنانچہ اس نے رجب ۷۰۹ھ میں کرک سے دمشق پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ دمشق کے بہت سے امیر خفیہ طور پر اس سے مل گئے۔ جب عام لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ نائب السلطنت شام امیر افرم مصر جا کر وہاں سے فوج لانا چاہتا ہے اور ملک ناصر کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے تو شہر دمشق میں بے چینی پھیل گئی۔ اکثر دکانیں بند رہنے لگیں۔ قاضیوں اور امیروں نے سلطان بیبرس جاشنگیر کے لیے دوبارہ بیعت لی۔ لیکن ملک ناصر اپنی فوج لے کر خمان پہنچ گیا۔ بعض دانشمند اور امیر چھپ کر اس سے ملے اور یہ رائے دی کہ اتنی سی فوج کے بل بوتے پر مصری اور شامی فوج کا مقابلہ بہت مشکل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ کرک واپس ہو جائے۔ اور مزید تیاری کے بعد دمشق کی طرف روانہ ہوا۔ مختلف صوبوں کے حکام بھی اس کے ساتھ مل گئے یہ دیکھ کر امیر افرم نے بھی اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اور ۲۳ شعبان ۷۰۹ھ کو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

امام ابن تیمیہ کی پیشین گوئی

جب مصر میں ملک ناصر کی ان تیاریوں کی خبر پھیلی تو امام ابن تیمیہ کے ساتھیوں اور دوستوں کو فطری طور پر خوشی ہوئی مگر اس کے ساتھ یہ بھی خدشہ تھا کہ ملک ناصر کے اور مخالفین کے ساتھ امام موصوف کو بھی ختم نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے جب امام موصوف کو اس کی اطلاع دی تو وہ فوراً سجدے میں گر پڑے اور بہت دیر تک دعا کی پھر سجدے سے سر اٹھایا۔ لوگوں نے پوچھا: اس وقت سجدے کا کیا موقع ہے؟ آپ نے فرمایا: سلطان بیبرس کے زوال کا وقت قریب آ گیا ہے۔ لوگوں نے کہا کب؟ آپ نے جواب دیا لشکر کے گھوڑے مصر کی طرف بڑھائے نہیں جائیں گے کہ سلطان بیبرس مغلوب ہو جائے گا۔[1] ان کی پیشین گوئی حرف بحرف صادق ہوئی۔ رمضان کے آخر میں ملک ناصر ایک زبردست فوج لے کر مصر کی طرف بڑھا ہی تھا کہ سلطان بیبرس وہاں سے فرار ہو گیا اور غزہ کے جنگلوں میں پناہ لی۔ سلطان ناصر ٹھیک عید الفطر کے دن قلعۃ الجبل قاہرہ میں داخل ہوا۔ اور سلطان بیبرس اور اس کے سپاہیوں کی گرفتاری کے لیے ہر طرف سپاہی روانہ کیے۔ مشہور

---

[1] مدارج السالکین لابن القیم: ۲/ ۲۵۱۔

امیر سیف الدین قراسنقر منصوری نے ذوالقعدہ ۷۰۹ھ میں غزہ کے جنگلوں میں شکار کا حلقہ ڈالا تو سلطان بیبرس اور اس کے بعض ساتھی گرفتار ہو گئے۔ یہ سب سلطان ناصر کے سامنے پیش کیے گئے اور اس کے حکم سے سلطان بیبرس کو قتل کر دیا گیا۔

فوری طلبی اور سلطان سے ملاقات

مصر میں داخل ہوتے ہی ملک ناصر نے سب سے پہلا فرمان امام موصوف کی رہائی کا جاری کیا۔ ۲ شوال کو اس نے حکم دیا کہ امام موصوف کو اسکندریہ سے پورے اعزاز و احترام سے لایا جائے۔ چنانچہ آپ ۸ شوال کو اسکندریہ سے روانہ ہوئے۔ روانگی کے دن سارا شہر امنڈ آیا تھا۔ لوگوں کی وارفتگی کا عجیب عالم تھا۔ لوگ آگے بڑھ بڑھ کر ان سے مصافحہ کرتے تھے۔ اور ان سے یہ خواہش کرتے تھے کہ اسکندریہ کو دوبارہ اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرف بخشیں۔ ۲۴ شوال ۷۰۹ھ کو جمعہ کے دن امام ابن تیمیہ نے قلعہ الجبل میں سلطان ناصر سے ملاقات کی۔ اس وقت وہ قاضیوں اور امیروں کے ساتھ اپنے دربار میں بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے ہی امام موصوف دروازے سے داخل ہوئے ملک ناصر اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے لینے کے لیے آگے بڑھا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ اٹھ کھڑے ہوئے سلطان نے پہلے تو بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پھر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑکی کے پاس لے گیا۔ اس نے اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکالے اور انہیں دکھائے۔ یہ درحقیقت وہ فتوے تھے جو ان کے قتل کے جواز میں دیے گئے تھے اور بعض وہ کاغذات بھی تھے جن میں سلطان بیبرس جاشنگیر کی بیعت کی صحت کا فتویٰ تھا۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ سلطان ان کی آڑ لے کر اپنے دشمنوں کو ہلاک کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔ انہوں نے ان کی تنقیص کی بجائے ان کی تعریف شروع کر دی اور کہا کہ یہ سب لوگ تیری سلطنت کے چیدہ اشخاص ہیں اگر وہ ختم ہو جائیں تو ان کی سی قابلیت اور لیاقت کے آدمی تمہیں کہاں سے ملیں گے۔ اب رہی ان کی مجھ پر زیادتیاں تو میں اپنے دل سے ان کو معاف کرتا ہوں ان سے مجھے کسی قسم کی پرخاش نہیں ہے۔ [1]

سلطان کا مقصد خاص کر قاضی القضاۃ زین الدین بن مخلوف مالکی اور شیخ نصر بن سلیمان

---

[1] مجموع الدرر، صفحہ ۱۸۳۔

المنبجی اور ان کے ہمنواؤں کو قتل کرانا تھا۔ کیونکہ انہی لوگوں نے آگے بڑھ کر امیر بیبرس جاشنگیر کی تائید کی تھی اور اس کی بیعت کے صحیح ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ [1] اسی لیے قاضی زین الدین بن مخلوف مالکی کہا کرتے تھے ہم نے ابن تیمیہ سے بڑھ کر عفو اور درگزر کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ ہم نے ان کے قتل کرانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا مگر جب بھی انہیں ہم پر قابو ملا تو انہوں نے پوری دریا دلی کے ساتھ ہمیں معاف کر دیا۔ [2]

سلطان کی تعریف

ملک ناصر ابن تیمیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑکی سے اپنی جگہ واپس آیا اس درمیان میں وزیر فخر الدین بن الخلیل بھی آ گیا تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ وزیر سلطان کے بائیں جانب بیٹھا۔ اس سے کچھ پیچھے قاضی نجم الدین صصری بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے حنفی قاضی صدر الدین علی (المتوفی: ۷۲۷ھ) تھے۔ خطیب جمال الدین، شیخ کمال الدین ابن الزملکانی اور قاضی جمال الدین بن القلانسی قاضی لشکر بھی موجود تھے۔ سلطان کے دائیں جانب مصر کے قاضی القضاۃ شیخ بدر الدین بن جماعہ شافعی تشریف فرما تھے۔ سلطان نے سب کے سامنے امام ابن تیمیہ کے علم و فضل اور ان کے اخلاق حمیدہ کی بڑی تعریف شروع کی اور اتنا کچھ کہا کہ دوسروں کو ان پر رشک اور حسد ہونے لگا۔ مگر ان درباری قاضیوں اور عالموں نے بادل ناخواستہ سلطان کے ہاں میں ہاں ملائی اور اس کے کہے پر صاد کیا۔

ذمیوں کے متعلق بحث

تھوڑی دیر بعد وزیر فخر الدین ابن الخلیل نے ذمیوں کی یہ درخواست پیش کی کہ انہیں سرخ و زرد اور نیلے عماموں کے پہننے سے معاف رکھا جائے اور مسلمانوں کی طرح سفید عمامے باندھنے کی اجازت دی جائے۔ اگر حکومت ان کے ساتھ اتنی سی رواداری برتنے پر آمادہ ہو جائے۔ تو وہ ہر سال لگان اور خرچ کے علاوہ سات لاکھ درہم حکومت کو دیا کریں گے۔ سلطان نے قاضیوں کی طرف خطاب کر کے پوچھا تم لوگ اس بارے میں کیا کہتے ہو۔ سب لوگ

---

[1] الدرر الکامنة: ۱/ ۵۰۵، ۵۰۶۔

[2] مجموع الدرر: ۱۸۳۔

چپ رہے کسی نے بھی اپنی زبان نہیں کھولی۔ یہ دیکھ کر امام ابن تیمیہ دوزانو ہو بیٹھے اور اس مسئلہ کے متعلق نہایت ہی وضاحت کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ انہوں نے وزیر کی پیش کی ہوئی درخواست کی سخت ترین تردید کی اور کہا کہ کیا تم اس پہلی ہی مجلس میں اسلام اور اہل اسلام کو چھوڑ کر محض چند دنیاوی فائدوں کی غرض سے کافروں کی تائید کرنا چاہتے ہو۔ تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو جبکہ اس نے تمہیں تمہارا ملک واپس دلایا۔ اور تمہارے دشمنوں کو نیچا دکھایا اور ان پر تمہیں کامیابی عطا کی۔ سلطان نے کہا کہ یہ حکم امیر رکن الدین بیبرس جاشنگیر کا جاری کیا ہوا ہے۔ امام موصوف نے پورے جوش سے جواب دیا۔ خدا کی قسم! جاشنگیر نے تمہارے ہی قانون کو جاری کیا تھا۔ کیونکہ وہ صرف تمہارا نائب تھا۔ اس دلیرانہ جواب سے سلطان کو بڑا تعجب ہوا۔ مگر اس کی وجہ سے اس کے دل میں ان کی قدر اور زیادہ ہوگئی۔ امام موصوف کا لہجہ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔ مگر سلطان اس کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر میں اس کو اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا اور اس نے حکم دیا کہ ذمیوں پر پرانا حکم ہی جاری رکھا جائے اور ان کی درخواست مسترد کر دی جائے۔

ذمیوں پر پابندی لگانے کی وجہ

امام موصوف نے اس مجلس کے ختم ہونے کے بعد دمشق کو ایک خط لکھا ہے جس میں اپنی خیریت و عافیت کی خبر دینے کے بعد یہودی اور عیسائی ذمیوں سے متعلق اپنے بعض رسائل منگوائے ہیں۔ انہوں نے گرجاؤں کے متعلق ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس مسئلہ سے متعلق انہوں نے قاضی ابویعلیٰ کی تعلیق بھی منگوا بھیجی تھی جو گیارہ جلدوں میں تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ ان رسالوں اور کتابوں کے نکلوانے میں شیخ جمال الدین یوسف بن الحجاج المزی سے مدد لی جائے۔ اس خط کا تھوڑا سا حصہ العقود الدریہ اور کتاب البدایہ والنہایہ میں منقول ہے۔ اس کے ایک ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مصر اور شام کے ذمی یہودی اور نصرانی اپنے عہد و پیمان پر قائم نہیں رہتے تھے اور مسلمانوں کا سا جامعہ پہن کر مسلمانوں ہی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لیے ان کو عام مسلمانوں سے تمیز کرنے کے لیے ان پر سرخ وزرد اور نیلے عماموں کے پہننے کی پابندی لگائی گئی تھی۔ چنانچہ امام موصوف لکھتے ہیں:

”ہم نے اس بارے میں ان پر چند شرطیں لگائی ہیں جن کی وجہ سے اسلام اور سنت نبوی کی عزت اور باطل اور بدعت کی بیخ کنی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ سب لوگ ان باتوں میں دخل دے چکے تھے۔ اور ہم نے ان سے ان باتوں کو قبول نہیں کیا تاوقتیکہ ان کے افعال سے ان کے اقوال کی صداقت ظاہر نہ ہو جائے۔ ہم نے ان کے عہد و پیمان کا کوئی اعتبار نہیں کیا۔ اور ان کی کوئی مقصد برآری نہیں کی تاوقتیکہ جس چیز کی شرط لگائی گئی ہے وہ عمل میں نہ آجائے اور اوپر جو کچھ کہا گیا ہے وہ پورے طور پر فعل میں نہ آجائے۔ اور خواص و عوام کے لیے اسلام اور سنت نبوی کی اتنی شان ظاہر نہ ہو جائے جس سے ان کے گناہ دھل جائیں۔ خدا نے ایسے اسباب کے پیدا کرنے میں جن سے اسلام اور سنت نبوی کا درجہ بلند ہوتا ہے اور کفر و بدعت کی جڑ کٹتی ہے ہماری مدد کی ہے ان کا بیان کرنا طوالت سے خالی نہیں ہے۔ یہود و نصاریٰ ہم پر بہت کچھ دست درازیاں کر چکے تھے اور انہیں پوری شوکت و قوت حاصل ہو چکی تھی اور اس معاملہ میں بعض لوگوں نے (ان سے مراد شیعہ ہیں) ان کی بڑی امداد و اعانت کی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کر دئے جن کی وجہ سے ان یہود و نصاریٰ اور ان کے ہمنواؤں کو ذلت کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور ان کی بیخ کنی ہو گئی اور اسلام کا بول بالا ہو گیا۔“

شیخ عماد الدین کی وصیت

قید سے رہا ہونے کے بعد امام ابن تیمیہ مسجد سیدنا حسین کے قریب ایک مکان میں رہنے لگے۔ قاہرہ کے بہت سے علما فقہاء ان کے پاس آئے اور ان سے اپنی زیادتیوں کی معافی چاہی۔ امام موصوف نے کہا میں سب کو معاف کرتا ہوں مجھے کسی سے کوئی گلہ اور شکوہ نہیں ہے۔

امام موصوف نے یہ ساری مدت قید و بند میں گزاری تھی۔ اس کے باوجود مصر میں ان کے معتقدین کا ایک اچھا خاصہ حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔ دمشق میں تو ان کے چاہنے والے بہت

زیادہ تھے۔ ان میں سے ایک شیخ عماد الدین واسطی بھی تھے جو حزامی قبیلہ کے شیخ تھے اور امام ابن تیمیہ کے بہت بڑے گرویدہ اور معتقد تھے وہ ایک مدت تک صوفیوں کے ساتھ رہ چکے تھے اور ان کو ان کے عقائد و خیالات اور اعمال سے ایک طرح کی نفرت ہو چکی تھی۔ انہوں نے اتحادیوں اور نام و نہاد صوفیوں کے خلاف باقاعدہ لسانی اور قلمی جہاد شروع کر دیا تھا وہ اپنے زمانہ کے علما میں ایسی شخصیت کو تلاش کر رہے تھے جس کے چہرے سے نبوت کا نور جھلک رہا ہو مگر امام ابن تیمیہ سے بڑھ کر انہیں کوئی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے دمشق سے اپنے مصری دوستوں کے نام ایک طول طویل خط التذکرة والاعتبار والانتصار للابرار کے نام سے لکھا ہے جو تیس صفحوں میں پھیلا ہے، اس میں شیخ تقی الدین ابو حفص عمر بن عبداللہ بن عبدالاحد بن شقیر، شیخ شمس الدین محمد بن عبدالاحد الآمدی، شیخ شرف الدین محمد بن المنجی۔ شیخ زین الدین عبدالرحمٰن بن محمود بن عبیدان البعلبکی، شیخ نورالدین محمد بن محمد بن محمد بن الصائغ، شیخ فخر الدین محمد اور شیخ شرف الدین محمد بن سعد الدین، سعد اللہ بن نجیح وغیرہ کو خطاب کرتے ہوئے پہلے گمراہ فرقوں پر تنقید کی ہے اور اس کے بعد امام ابن تیمیہ اور ان کے ساتھیوں کی حقیقی قدر و منزلت جتائی ہے۔ اس خط کے بعض اقتباسات سے پتہ چل سکتا ہے کہ شیخ عماد الدین کے دل میں امام ابن تیمیہ کی کیا قدر و منزلت تھی۔ وہ اپنے ان مذکورہ بالا دوستوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''تم لوگ اس شخص کی حقیقت اور قدر کو پہچانو اور اس کی قدر کو وہی شخص پہچان سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے دین کی حقیقی قدر و منزلت کو پہچانتا ہو۔

''تم لوگ یہ جان لو کہ یہاں وہ شخص ہے جس نے تمام اقلیوں میں سفر کیا ہے اور لوگوں کی طبیعتوں اور ان کے ذوق سے اچھی طرح واقف ہے اور ان کے اکثر احوال کو جانتا ہے۔ خدا کی قسم! اور پھر خدا کی قسم! اور پھر خدا کی قسم! اس نے اس آسمان کی چھت کے نیچے تمہارے شیخ کے جیسا کوئی شخص نہیں پایا۔ نہ تو علم میں اور نہ عمل میں، نہ تو حال میں اور نہ قال میں، نہ تو خلف میں اور نہ اتباع میں، نہ تو کرم میں اور نہ حلم میں۔''

''ہم نے اپنے زمانہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس کے چہرے پر نبوت

محمدیہ کی روشنی پائی جاتی ہو اور جس کے اقوال و افعال سے سنت نبوی کی کرنیں جھلکتی ہوں سوائے اس شخص کے اس کو دیکھنے کے بعد ہمارا قلب سلیم یہ گواہی دے رہا ہے کہ ہاں حقیقی اتباع نبوی اس کو کہتے ہیں۔''

آخر میں شیخ عماد الدین نے انہیں اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ امام ابن تیمیہ کے بتائے ہوئے نقش قدم پر چلیں' اور اسی کو اپنے دین و ایمان کی سرخروئی کا ذریعہ بنائیں۔ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو پورا خط یہاں نقل کیا جا سکتا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ شیخ عماد الدین زیادہ دن تک زندہ نہیں رہے۔ امام ابن تیمیہ کے دمشق کو لوٹنے سے پہلے ہی ۷۱۱ھ میں شیخ کا انتقال ہو گیا۔

کیا اکل حلال ناممکن ہے؟

صوفیہ کی اہم ترین تعلیمات میں سے ایک اکل حلال وصدق مقال بھی ہے جس پر وہ ہمیشہ سے زور دیتے ہوئے چلے آئے ہیں۔ وہ ایسی چیزوں کے کھانے سے جو حرام ذریعوں سے حاصل ہوئی ہیں ہمیشہ بچتے تھے اور دوسروں کو بھی ان سے بچنے کی تاکید کرتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس مسئلہ میں حد سے زیادہ غلو کیا جانے لگا۔ خشک قسم کے زاہد اور صوفی نہ صرف مشتبہ چیزوں سے بچنے لگے تھے بلکہ محض وہم اور گمان کی بنا پر حلال چیزوں سے بھی پرہیز کرنے لگے تھے اور اس کو اتقاء و پرہیز گاری کا ایک بلند ترین معیار سمجھتے تھے۔

امام ابن تیمیہ جس وقت مصر میں تھے یہ مسئلہ اٹھایا گیا کہ اس زمانے میں اکل حلال ناممکن ہے کیونکہ تمام اموال خلط ملط ہو گئے ہیں اور ان میں حرام اور حلال کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی ہے۔ چونکہ یہ مشکوک و مشتبہ ہو گئے اس لیے ان کا استعمال بھی ناجائز ہے۔ اگر کوئی شخص دماغی یا جسمانی محنت کر کے اس قسم کے اموال سے اپنی اجرت حاصل کرے تو وہ اجرت بھی اکل حلال میں شمار نہ ہو گی۔ کیونکہ اس قسم کے تمام اموال بالذات حرام ہیں۔

اس نقطۂ نظر کی صحت کے ثبوت میں بہت سی غلط اور موضوع روایتیں پیش کی جاتی تھیں۔ ان میں ایک یہ تھی کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنے لڑکے صالح کے گھر میں روٹی کھانے سے بالکل انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف قضاوت کا

عہدہ قبول کر لیا تھا۔ اور جب ان کے اہل وعیال نے صالح کے گھر کے تنور میں روٹی تیار کی اور اس کے کھانے سے انکار کر دیا اور جب یہ روٹیاں دجلہ میں پھینک دی گئیں تو اس کی شکار کی ہوئی مچھلیوں کے کھانے سے بھی انکار کر دیا۔

امام ابن تیمیہ نے اس مسئلہ سے متعلق ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کا قول وہی شخص کہہ سکتا ہے جو بدعتی ہو یا برخود غلط فقیہ ہو یا خشک قسم کا زاہد عابد و ناسک ہو۔ امام احمد بن حنبل کے متعلق مذکورہ بالا روایت بالکل جھوٹ ہے۔ تمام اہل علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ صالح کو اپنے والد کی زندگی میں قضاوت کا عہدہ نہیں ملا تھا۔ وہ باپ کے مرنے کے بعد قاضی ہوئے تھے اور پھر علمائے اسلام کا متفقہ فتوی ہے کہ اگر بہتا ہوا خون یا سور یا مردار کا گوشت دریا میں گر جائے اور مچھلیاں اس کو نگل جائیں تو یہ کبھی حرام نہیں ہوتیں۔ صرف ان روٹیوں کے کھا لینے کی وجہ سے کیونکر حرام ہو سکتی ہیں۔

اس روایت کے برخلاف ایک دوسری صحیح روایت میں ہے کہ امام احمد نے ایک زاہد خشک کو جس نے ان کے سامنے اس قسم کی بحث کی تھی جھڑک کر کہا: ذرا اس خبیث کو تو دیکھو! یہ مسلمانوں کے مالوں کو حرام کہتا ہے۔

امام احمد کے متعلق البتہ یہ روایت صحیح ہے کہ انہوں نے اپنے خاندان کے بعض افراد کے اموال سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں نے ان کی مرضی کے خلاف خلیفہ کے صلے اور وظائف قبول کر لئے تھے۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یہ اموال حرام ہیں۔ بلکہ انہیں اس کا ڈر لگا ہوا تھا کہ خلیفہ کہیں مال کی ہوس دلا کر ان کی آزادی رائے چھین نہ لے اور ان کا دین و ایمان نہ خرید لے۔

امام ابن تیمیہ نے اس مسئلہ پر پانچ حیثیتوں سے ایک اصولی بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ کوئی چیز اس وقت تک حرام نہیں ہو سکتی۔ تاوقتیکہ اس کی حرمت کتاب وسنت سے ثابت نہ ہو کیونکہ حلال وہی ہے جس کو اللہ نے حلال کیا۔ حرام وہی ہے جس کو اللہ نے حرام قرار دیا۔ محض کسی فقیہ یا صوفی یا زاہد کے یہ یقین یا گمان کر لینے سے کہ فلاں چیز حرام ہے۔ وہ حرام نہیں ہو جاتی۔ اگر کوئی مسلمان کوئی لین دین کا معاملہ جائز سمجھ کر کرتا ہے اور دولت کماتا ہے۔ تو اس

سے ایک ایسا شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جو اس قسم کے لین دین کو جائز نہیں سمجھتا۔ اس سلسلے میں مختلف مثالیں دی ہیں۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ حرمت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک ذاتی ہے اور وصفی جیسے کہ بہتا ہوا خون یا سور یا مردار کا گوشت ہے۔ دوسری عارضی اور کسبی یعنی وہ چیز فی نفسہ حرام نہیں ہے مگر چونکہ حرام ذریعوں سے حاصل ہوئی ہے اس لیے حرام ہے۔ جیسے ظلم سے حاصل کیا ہوا مال۔ اگر کوئی شخص اس حرام مال کو اپنے جائز مال کے ساتھ ملا دیتا ہے تو دوسروں کے لیے اس کا استعمال حرام نہیں ہے۔ اگر کوئی اس قسم کے مال سے اپنی اجرت حاصل کرے تو وہ اجرت کبھی حرام نہیں ہو سکتی۔ نیز کوئی شخص محض ظن و تخمین سے کسی چیز کو حرام قرار نہیں دے سکتا۔ تاوقتیکہ اس کی حرمت نص صریح سے ثابت نہ ہو جائے۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ ملک شام کی بہ نسبت مصر میں زیادہ ظلم ہوتا ہے اور معاملات میں خیانات برتی جاتی ہے اس کے باوجود مسلمانوں کے اموال کا ایک بہت بڑا حصہ حلال کمائی سے حاصل ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ نظریہ عراق کے ایک شیخ کا تھا جو پھیلتے پھیلتے مصر پہنچا۔ لیکن اس شیخ کی نیت اس قسم کے مال کو بالکلیہ بند کرنا نہیں تھا بلکہ ان کا کہنا اتنا ہی تھا کہ آج کل حقیقی معنی میں پرہیز گاری دشوار ہے۔ چنانچہ ابن تیمیہ کے الفاظ یہ ہیں:

فتبين ان ما ذكره هٰذا قائل الذى قال اكل الحلال متعذر ولا يمكن وجوده فى هٰذا الزمان قوله خطاء مخالفا للاجماع بل الحلال هو الغالب علٰى اموال الناس وهو اكثر من الحرام وهذا القول قد يقوله طائفة من المتفقهة المتصوفة واعرف من قاله من كبار المشائخ بالعراق ولعله من اولٰئك انتقل الٰى بعض شيوخ مصر ثم الذى قال ذٰلك لم يرد ان يسد باب الاكل بل قال الورع حينئذٍ لا سبيل اليه۔ [1]

''پس اس سے ظاہر ہو گیا کہ کہنے والے نے جو یہ بات کہی ہے کہ اکل حلال دشوار ہے اور اس زمانہ میں اس کا پایا جانا ممکن نہیں ہے اس کا یہ قول غلط ہے اور

[1] مجموع الرسائل الكبرىٰ: ۲/ ۵۰۔

اجماع کے مخالف ہے بلکہ لوگوں کے اموال پر حلال ہی غالب ہے اور وہ حلال مال حرام سے زیادہ ہے۔ بعض صوفی قسم کے فقیہوں کی ایک جماعت کا یہ قول ہے اور میں اس بات کو جانتا ہوں کہ عراق کے کبار مشائخ میں سے ایک نے یہ بات کہی تھی اور پھر شاید انہیں کے ذریعہ یہ قول مصر کے شیوخ کی طرف منتقل ہوا ہے۔ پھر جس نے بھی یہ بات کہی وہ اکل کا دروازہ بند کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس صورت میں پرہیز گاری کی کوئی صورت نہیں ہے۔''

مصر میں قیام

امام ابن تیمیہ رمضان ۷۰۵ھ میں سلطان کی طرف سے قاہرہ بلائے گئے تھے۔ اس وقت سے لے کر شوال ۷۰۹ھ تک قید و بند کی حالت میں گزرے۔ دمشق میں ان کی والدہ فاطمہ بنت عبدالمنعم الحسانیہ ابھی تک زندہ تھیں۔ وہ اپنے فرزندوں کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ دمشق کے تمام احباب اور خاص کر شیخ عماد الدین واسطی ان کو دیکھنے کے آرزومند تھے۔ مصر کے بعض امیروں نے انہیں روک لیا قاہرہ کے محلہ مشہد حسین کے لوگ ان کے زیادہ معتقد ہو گئے تھے۔ سلطان ناصر کی حسن عقیدت کی وجہ سے ان کا آستانہ عوام و خواص کا مورد و مرجع بن گیا تھا۔ امراء اور درباری علما و قضاۃ بھی ان سے ملنے کے لیے آتے تھے اور ان سے علمی و مذہبی استفادہ کرتے تھے۔ عموماً ہر جمعہ کو وہ جامع حاکمی میں نماز پڑھتے تھے اور نماز کے بعد تقریر کیا کرتے تھے۔ دوسرے اوقات میں مختلف سوالات کے جوابات دیتے تھے۔ ایک طرف ان کے معتقدین کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا تو دوسری طرف اندر اندر ان کی مخالفت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ بعض لوگوں کو ان سے ایک طرح کا عناد پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کسی حیثیت سے بھی ان کے علمی تفوق کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں میں سے ایک تنگ نظر فقیہ نور الدین ابوالحسن علی بن یعقوب بن جبرائیل البکری بھی تھے۔ جن کو مسئلہ استغاثہ میں امام ابن تیمیہ سے سخت ترین اختلاف تھا وہ ان کے خیالات کی تردید میں کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے۔ امام موصوف نے ان کے جواب میں الرد علی البکری کے نام سے ایک مشہور کتاب بھی لکھی ہے جس کے متعلق مزید بحث آئندہ آئے گی۔

اہانت اور ہنگامہ

کہا جاتا ہے کہ ۴ رجب ۷۱۱ھ کو فقیہ بکری مذکور اپنے چند فتنہ پرداز ساتھیوں کے ساتھ جامع حاکمی میں پہنچے اور امام ابن تیمیہ کو اکیلا پا کر مارا پیٹا اور ان کی اہانت کی فقیہ موصوف نے ان کے گلے میں اپنا رومال ڈال کر کھینچا اور کہا عدالت میں چلو مجھ کو تم پر استغاثہ دائر کرنا ہے جب کچھ شور غل ہوا اور لوگ ادھر ادھر سے جمع ہو گئے تو فقیہ صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھاگ نکلے، جب مشہد حسین کے لوگوں کو اس کی اطلاع ملی تو دوڑے چلے آئے۔ اس وقت شیخ شرف الدین ابن تیمیہ بھی موجود نہیں تھے۔ وہ اپنے گھر میں تھے۔ جب انہیں اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی بھاگے چلے آئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ کا پتہ نہیں ہے اور مشہد حسین کے لوگ ان کے متعلق دریافت کرتے چلے جا رہے ہیں۔ آخر معلوم ہوا کہ امام موصوف مسجد فخر میں تشریف رکھتے ہیں اس کو کاتب الممالیک نے تیار کیا تھا۔ بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اور نئے آنے والوں کا ایک تانتا بن گیا، بعض معتقدین نے ان سے کہا آپ حکم دیں تو ہم پورے شہر کو تاراج کر کے رکھ دیں۔ امام موصوف نے پوچھا: کس لیے؟ جواب ملا۔ آپ کے لیے۔ انہوں نے کہا: یہ جائز نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا: پھر ہم کو اجازت دیجئے کہ ان فتنہ پردازوں کے گھروں کو برباد کر دیں۔ کیونکہ انہوں نے فتنہ برپا کیا اور لوگوں کو مصیبت میں ڈالا۔ امام موصوف نے کہا یہ بھی جائز نہیں ہے۔ لوگوں نے غصہ میں آ کر کہا کہ کیا ان فتنہ پردازوں نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ جائز ہے؟ ہم ضرور جائیں گے اور اس اہانت کا بدلہ ضرور لے کر رہیں گے۔ امام موصوف نے انہیں ٹھنڈا کرنا چاہا مگر جب ان کی نصیحت نہیں مانی تو صاف طور پر کہا دیکھو اس کا بدلہ لینا یا تو میرا حق ہے یا تمہارا ہے یا خدا کا ہے۔ اگر یہ میرا حق ہے تو میں ان سے درگزر کرتا ہوں اور اگر تمہارا حق ہے تو جاؤ اور جو چاہے کر لو مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر یہ خدا کا حق ہے تو وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ ہم کو اور تم کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لوگوں نے بگڑ کر کہا کہ ان فتنہ پردازوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا ہے کیا وہ ان کے لیے حلال اور جائز ہے؟ امام ماصوف نے کہا ایسا کرنے میں ان کو اجر اور ثواب ہو سکتا ہے۔ لوگوں نے کہا: تو گویا آپ باطل پر ہیں اور وہ حق پر ہیں، اگر آپ یہ

کہتے ہیں کہ ان کو اجر ملے گا تو پھر آپ ان کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ اور ان کے قول کی موافقت کیوں نہیں کر لیتے۔ امام موصوف نے کہا بات ایسی نہیں ہے جیسا کہ تم سمجھتے ہو۔ یہ لوگ بھی اجتہاد کرتے ہیں اور اس میں غلطی کر جاتے ہیں، شریعت کی رو سے غلط اجتہاد کرنے والے کو بھی اجر ملتا ہے جب انہوں نے اس قسم کا جواب دیا تو لوگوں کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا اور شہر چلنے پر اصرار کیا مگر انہوں نے پوچھا وقت کیا ہے۔ جواب ملا عصر کی نماز کا وقت قریب آ گیا ہے۔ وہ نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جامع حاکمی کی طرف روانہ ہوئے۔ لوگوں نے انہیں منع کیا اور کہا کہ مخالفین آپ کو اکیلا پا کر قتل کر ڈالیں گے۔ آپ نے کسی کی بات نہیں سنی اور آگے روانہ ہوئے۔ سارا مجمع بھی آپ کے ساتھ ہو گیا۔ لوگوں نے کہا قریب کی مسجد میں چل کر کچھ دیر بیٹھ رہیے۔ جب مجمع کم ہو جائے تو آگے جائیے۔ وہ مسجد میں گھس گئے۔ مگر بیٹھے نہیں، کچھ دیر یونہی کھڑے رہے پھر آگے روانہ ہوئے۔ راستہ میں دیکھا کہ چند لوگ ایک دکان پر بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہیں انہوں نے شطرنج کا تختہ ہی الٹ دیا۔ کھیلنے والے اس اچانک مداخلت سے گھبرا گئے مگر وہ ان کے خلاف اپنی زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ امام موصوف نے مسجد پہنچ کر نہایت اطمینان کے ساتھ وضو کیا اور دو رکعت نفل نماز پڑھی۔ پھر فرض نماز کے بعد کھڑے ہو کر سورۂ فاتحہ پڑھی اور مغرب کی نماز تک ایک نہایت ہی مدلل اور دلچسپ تقریر کی اور جن مسائل کی بنا پر اتنا بڑا ہنگامہ ہوا تھا ان کی تشریح کی۔ اس تقریر سے مخالفت کا سارا ابال دل چھٹ گیا۔ خود مخالف گروہ کے بعض اشخاص کہنے لگے۔ خدا کی قسم! یہ شخص جو کچھ کہتا ہے وہی حق ہے۔ اگر یہ شخص ناحق بات کہتا تو ہم اس کو بولنے نہیں دیتے بلکہ اس کو زندہ نہیں چھوڑتے اور اگر یہ دل میں کچھ اور ظاہر میں کچھ کہتا ہے تو یہ بات بھی ہم سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ اس کے بعد مخالفین کے دو گروہ ہو گئے ایک امام موصوف کا طرفدار ہو گیا اور دوسرا ابھی تک ان کی مخالفت پر تلا رہا اس کی وجہ سے خود ان مخالفین کے درمیان بحث و تکرار شروع ہو گئی۔

مغرب کی نماز کے بعد امام موصوف اپنے چچا زاد بھائی کے گھر روانہ ہو گئے جو دریائے نیل کے کنارے واقع تھا۔

فقیہ بکری کی سفارش

اتفاق ایسا ہوا کہ کچھ مدت کے بعد محرم ۷۱۲ھ میں سلطان ناصر فقیہ بکری کی زبان درازی پر خفا ہو گیا اور اس نے ان کی زبان کاٹ لینے کا حکم دے دیا۔ جب امام ابن تیمیہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فوراً ملک ناصر سے جا ملے اور فقیہ بکری کی خطا معاف کروالی اور اتنی سی بات پر معاملہ ٹل گیا کہ آیندہ سے وہ کوئی فتویٰ دینے نہ پائیں۔ [1] سلطان ناصر نے انہیں قاہرہ سے چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ دیروط چلے گئے اور وہاں ۷ ربیع الآخر ۷۲۴ھ کو وفات پائی۔ [2]

ملکی معاملات میں مشورہ

اس کے بعد امام ابن تیمیہ رمضان ۷۱۲ھ کے اوائل تک مصر میں رہے اور مذہبی اور علمی کام کرتے رہے۔ بسا اوقات وہ ملک ناصر سے بھی ملتے تھے اور ملکی معاملات کے متعلق اس سے گفتگو کرتے تھے اور وہ اکثر ان کے صلاح و مشورے کو قبول کیا کرتا تھا، چنانچہ تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں اس قسم کے واقعات مذکور ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ امیر سیف الدین کرامی نے فرمان جاری کیا کہ دمشق کے صاحب حیثیت لوگ ہر سال ڈیڑھ ہزار سوار فراہم کریں اور ہر سوار کے لیے پانچ سو درہم ادا کریں۔ اس نے ذاتی ملکیتوں اور وقف کی جائدادوں پر بھی محصول لگا دیا تھا۔ یہ ایک بالکل ہی نیا قانون تھا۔ لوگ شکایت لے کر خطیب جلال الدین کے پاس پہنچے اور انہوں نے یہ معاملہ قضاۃ کے سامنے پیش کیا۔ قاضیوں اور لوگوں نے مل کر ۱۳ جمادی الاولیٰ ۷۱۱ھ کو پیر کے دن ایک احتجاجی جلوس نکالا۔ جب امیر سیف الدین کرامی کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور قاضی القضاۃ اور خطیب جلال الدین کو بلا کر خوب ڈانٹا اور گالیاں دیں اور شیخ مجد الدین تونسی کو پٹوا دیا اور پھر حوالات میں بند کر دیا۔ لوگ ضمانت دے کر چھڑا لائے۔ جب امام ابن تیمیہ کو اس افسوسناک واقعے کی اطلاع ہوئی تو فوراً سلطان ناصر سے ملے اور اس کی سامنے ساری کیفیت بیان کی اس نے امیر سیف الدین ارغون دوادار کو بھیجا جس نے ۲۳ جمادی الاولیٰ ۷۱۱ھ کو جمعرات کے دن

---

[1] البداية والنهاية: ١٤/ ٧٠۔ [2] ایضًا صفحہ: ١١٥۔

ضیافت کی ایک بھری محفل میں امیر سیف الدین کرامی کو گرفتار کرلیا۔ اور اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈلوا دیں۔ عام لوگوں کو اس سے بہت خوشی ہوئی اور خوشی میں شمعیں روشن کیں۔ [1]

امام ابن تیمیہ ہی کے اشارے سے امیر شمس الدین افرم کو طرابلس کا حاکم بنایا گیا تھا۔ [2]

امام موصوف چاہتے تھے کہ لوگ اپنی ذاتی قابلیت ولیاقت کی بنا پر اونچے عہدوں پر فائز ہوں۔ بعض لوگ رشوت دے کر یہ اونچے عہدے حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ امام موصوف نے سلطان ناصر کو اس کی طرف توجہ دلائی اور اس نے ایک فرمان لکھوا کر دمشق روانہ کیا کہ آیندہ سے مال بطور رشوت لے کر کسی کو کسی جگہ کا والی نہ بنایا جائے کیونکہ اس کی وجہ سے غیر مستحق اور غیر اہل لوگ والی بن جاتے ہیں۔ اس شاہی فرمان کو شیخ کمال الدین ابن الزملکانی نے پڑھ کر سنایا اور ابن حبیب موذن نے اس کو لوگوں کے کانوں تک پہنچایا۔ [3]

اسی طرح امام موصوف نے یہ فرمان بھی لکھوا بھیجا کہ اگر کوئی کسی کو قتل کر دے تو مقتول کے ورثاء قاتل سے براہ راست انتقام نہ لیں بلکہ قاتل کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کریں تاکہ وہ شریعت کے مطابق قاتل کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کرے۔ اس فرمان کو بھی شیخ کمال الدین ابن الزملکانی نے پڑھ کر سنایا تھا۔ [4]

دمشق کو واپسی

انہی دنوں یہ افواہیں گشت کرنے لگی تھیں کہ تاتاری پورے ساز وسامان کے ساتھ ملک شام پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے دمشق والوں پر خوف طاری ہوگیا تھا۔ ادھر ملک ناصر نے بھی مقابلے کی تیاریاں کیں اور فوج لے کر ۸ شوال ۷۱۲ھ کو مصر سے روانہ ہوا۔ امام ابن تیمیہ اور ان کے دونوں بھائی اور دوسرے ساتھی اور شاگرد بھی ساتھ تھے۔ تاتاریوں نے بیس دن تک رحبہ کا محاصرہ کیا اور پھر کچھ مال غنیمت لے کر واپس ہوگئے۔ انہیں اس کی خبر ہوچکی تھی۔ کہ مصری فوج ان کے مقابلہ کے لیے آرہی ہے۔ غلے اور چارے کی قلت کی وجہ سے تاتاریوں کا ٹھہرنا بہت مشکل تھا۔ اس لیے امیر رشید الدولہ اور امیر چوپان نے سلطان خدابندہ کو واپس لوٹنے کا مشورہ دیا۔ جب مصری فوج غزہ پہنچی تو اسے

---

[1] البداية والنهاية: ۱۴/۶۲۔ [2] ایضًا، صفحہ: ۶۱۔ [3] ایضًا صفحہ ۶۶۔

[4] البداية والنهاية ۱۴/۶۶۔

تاتاریوں کے واپس چلے جانے کی اطلاع ملی۔ مگر مختلف انتظامی اور فوجی معاملات کے ٹھیک کرنے کی خاطر سلطان ناصر اپنی فوج لے کر آگے بڑھا اور ۲۳ شوال ۷۱۲ھ کو دمشق پہنچا۔ لیکن امام ابن تیمیہ اپنے دونوں بھائیوں اور شاگردوں کے ساتھ مصری فوج سے الگ ہو کر بیت المقدس پہنچے اور تمام مقامات مقدسہ کی زیارت کی اور پھر یہ مختصر قافلہ پہلی ذوالقعدہ ۷۱۲ھ کو بدھ کے دن دمشق میں داخل ہوا۔ چونکہ امام موصوف سات سال سات ہفتوں کے بعد وطن لوٹ رہے تھے اس لیے دمشق والوں کو ان کی آمد سے بہت بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے باہر نکل کر اس مختصر قافلے کا پر جوش استقبال کیا۔ ان کی آمد سے ان کی والدہ کو خاص طور پر خوشی حاصل ہوئی۔

سلطان ناصر ۲۷ ذوالقعدہ کو اپنے چالیس خصوصی امیروں کے ساتھ حج کے ارادے سے حجاز روانہ ہو گیا۔ دمشق آنے کے بعد امام ابن تیمیہ پھر پڑھنے پڑھانے، وعظ و نصیحت، تصنیف و تالیف اور فتوے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ ان کی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کے علم و فضل میں بھی بڑی ترقی ہو چکی تھی، اب وہ کسی ایک خاص مسلک اور مذہب کے پابند نہیں رہے تھے۔ انہوں نے اپنی علمی بصیرت اور اجتہاد کے مطابق فتویٰ دینا شروع کیا تھا جس کی وجہ سے انہیں پھر قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ اس کی تفصیل ہم ''فقہی اجتہادات'' کے عنوان کے تحت بیان کریں گے۔ مگر اس سے پہلے ہمیں یہ بتانا ہے کہ امام ابن تیمیہ نے یہودیت اور نصرانیت کی کیونکر تردید کی اور اسلام اور مسلمانوں کی فضیلت و برتری کو یہودیوں اور نصرانیوں کے دل پر کسی طرح ذہن نشین کیا۔

یہودیت اور نصرانیت کی تردید

امام ابن تیمیہ کے زمانے میں ملک شام اور ملک مصر دونوں جگہ بہت سے یہودی اور نصرانی بھی بستے تھے جن میں سے اکثر کی مادری زبان عربی ہوگئی تھی۔ ان کے اپنے خاص مدرسے، معبد اور کلیسا تھے جہاں آزادی کے ساتھ تورات اور انجیل کی تعلیم و تلقین ہوتی تھی۔ یہودیوں کی بہ نسبت نصرانیوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ ان دونوں کے ملکوں کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ انطاکیہ، بیت المقدس اور اسکندریہ ان نصرانیوں کے اہم مرکز مانے جاتے تھے۔

یہودیوں کی حالت

یہودی زیادہ تر لین دین اور سود وغیرہ کا کاروبار کرتے تھے اور عام طور پر دولتمند تھے۔ بعض طبابت اور کحالی کا پیشہ کیا کرتے تھے۔ بہت ذہین، چالاک اور ہوشیار تھے۔ جب تک بغداد کی عباسی خلافت قائم رہی بہت سے یہودی اہل علم اور طبیب سرکاری ملازمت کرتے تھے۔ جب اس پر تاتاریوں کا قبضہ ہوگیا تو ان یہودیوں کو بھی وہاں سے نکل جانا پڑا۔ انہوں نے دمشق اور قاہرہ وغیرہ میں سکونت وغیرہ اختیار کر لی تھی۔ اگرچہ ان کے اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی منافرت موجود تھی تاہم وہ اسلامی حکومت کے ماتحت امن و امان اور اطمینان کی زندگی گزار رہے تھے۔

جزیہ معاف کرانے کی کوشش

اسلامی حکومت نے تمام ذمیوں میں جن میں یہودی اور نصرانی شامل تھے۔ بہت سی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ مسلمانوں سے امتیاز قائم رکھنے کے لیے انہیں رنگین عماموں کا باندھنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ ان پر جزیہ بھی لازمی تھا کوئی اس سے بری نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر بعض یہودیوں نے شوال ۷۰۱ھ میں یہ مسئلہ اٹھایا کہ یہودیوں کو جزیہ ادا کرنا ضروری نہیں

ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے خیبر کی فتح کے دن یہودیوں کو جزیہ ادا کرنے سے معاف کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں یہودیوں کا ایک وفد دمشق آیا اور اپنے دعوے کے ثبوت میں آنحضرت ﷺ کا ایک جعلی معافی نامہ پیش کیا۔ نائب السلطنت شام نے اپنی سلطنت کے تمام قاضیوں، فقیہوں اور عالموں کو بلایا۔ امام ابن تیمیہ بھی بلائے گئے۔ ان سب کے سامنے یہ جعلی معافی نامہ رکھا گیا۔ امام ابن تیمیہ نے دیکھتے ہی بتا دیا کہ یہ جعلی ہے۔ کیونکہ اس پر ایسے لوگوں کے دستخط تھے جو خیبر کی فتح کے دن موجود نہیں تھے۔ گواہوں میں حضرت سعد بن معاذ کا نام تھا۔ حالانکہ فتح خیبر سے دو سال پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ لکھنے والے کا نام علی بن طالب تھا۔ علی ابن ابی طالب ہونا چاہیے تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس قسم کی فاش غلطی سرزد نہیں ہو سکتی تھی۔ جب امام موصوف نے اس قسم کی کئی فاش غلطیاں دکھائیں تو یہودیوں کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ نائب السلطنت نے جزیہ ادا کرنا ضروری قرار دیا۔ یہودیوں کا یہ وفد ناکام ہو کر اپنے وطن واپس ہوا۔ اس کے بعد سے پھر کسی کو اس قسم کی جعلی دستاویز بنانے کی جرأت نہ ہو سکی۔

دیان الیہود کا اسلام لانا

امام ابن تیمیہ کی تبلیغ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھی۔ وہ یہودیوں اور نصرانیوں کو بھی اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ چنانچہ ان کی تقریروں اور تحریروں سے متاثر ہو کر بعض یہودی اور نصرانی بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ دمشق میں قاضی الیہود عبدالسید بن اسحٰق بن یحییٰ مہذب رضا اور رغبت سے مسلمان ہوا۔ اس کے ساتھ اس کا سارا خاندان بھی مسلمان ہو گیا۔ یہ شخص تورات کا بہت بڑا عالم تھا اور اپنی قوم میں دیان الیہود کے لقب سے مشہور تھا۔ طبابت اور کحالی کا پیشہ کیا کرتا تھا۔ لوگوں میں اس کو بڑی عزت حاصل تھی۔ جب امام ابن تیمیہ سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تو وہ ان کی گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ انہوں نے اس کے سامنے یہودیت کی گمراہیاں اور اسلام کی خوبیاں پیش کیں۔ اور یہ بتایا کہ یہودی عالموں نے کس طرح تورات میں تحریف کی ہے۔ امام موصوف کی گفتگو اس کے لیے شمع ہدایت ثابت ہوئی۔ وہ اپنے تمام اہل وعیال کو ساتھ لے کر ۴ ذوالحجہ ۷۰۱ھ کو منگل کے دن دارالعدل دمشق میں

حاضر ہوا اور امام موصوف کے ہاتھ پر صدق دل سے اسلام قبول کیا۔ عبدالسید کا اسلامی لقب بہاء الدین رکھا گیا۔ نائب السلطنت شام نے اس کی اور اس کے خاندان کی اس خوشی میں بڑی زبردست دعوت کی جس میں شہر کے قاضی فقیہ عالم اور بہت سے عمائدین شریک تھے۔ عبدالسید کو ایک خلعت فاخرہ عنایت کی گئی اور بڑے اعزاز و اکرام اور تزک و احتشام کے ساتھ گھوڑوں پر سوار کر کے ان سب کو ان کے گھر روانہ کیا گیا۔ سرکاری سپاہی بوق اور باجے بجاتے ہوئے ان کو ان کے گھر تک چھوڑ آئے۔ جب چھ دن بعد عید الاضحیٰ ہوئی تو یہ خاندان بلند آواز سے تکبیر کہتا ہوا عید گاہ پہنچا اور مسلمانوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔ نماز کے بعد مسلمانوں نے ان کو پورے اعزاز و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔

عبدالسید نے قرآن مجید پڑھا اور دوسرے تمام اسلامی علوم کا مطالعہ کیا اور پھر اپنے قبیلہ اور قوم میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ امام ابن تیمیہ کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے ان کو نام نہاد صوفیہ سے بدظنی ہوگئی تھی۔ اس نے تقریباً پندرہ سال اسلام کی خدمت میں صرف کئے اور جب ٦ جمادی الآخرہ ۷۱۵ھ کو اتوار کے دن اس کا انتقال ہوا تو مسلمانوں کو بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے بڑے اعزاز و احترام کے ساتھ قاسیون کے قبرستان میں اس کو دفن کیا۔ [1]

عیسائیوں کی حالت

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ملک شام اور ملک مصر میں یہودیوں کی بہ نسبت عیسائیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہیں ہر طرح کی مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ہر جگہ ان کے گرجے قائم تھے جہاں انجیل اور مذہب عیسویت کی برابر تبلیغ ہوا کرتی تھی۔ انہیں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کی ملازمتیں حاصل تھیں۔ بہت سے لوگ تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ عام طور پر ان کی اقتصادی حالت اچھی تھی چونکہ شام و مصر پر انہیں کی حکومت تھی اور مسلمانوں نے ان ملکوں کو ان کے ہاتھ سے چھینا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے خلاف انہیں ایک طرح کی منافرت تھی۔ جب تک اسلامی سلطنت مضبوط رہی انہیں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کے دوبارہ حاصل کرنے کا کوئی خیال نہیں ہوا۔ جب بغداد کی عباسی خلافت کمزور ہوگئی اور ہر طرف عامل خودمختار ہوتے

---

[1] البداية و النهاية: ١٤/ ١٩ـ٧٥ـ

چلے گئے تو رومی جزل نسیفورس (NICEPHORUS) المقتول ۳۵۹ھ ۹۶۹ء نے مسلمانوں کے ہاتھ سے قبرص کا جزیرہ چھین لیا۔ اور وہاں عیسائیوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے شام و مصر اور آرمینیہ پر حملے شروع کر دیے۔ حلب کو تباہ و تاراج کیا اور بہت سے بے گناہ مسلمانوں کا خون بہایا۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا کر رکھ دے اس نے اپنے کارناموں کی تعریف میں ایک لمبی عربی نظم لکھوائی ہے جو کتاب البدایہ و النہایہ میں منقول ہے۔ اس نے اپنی شاندار فتوحات پر فخر کیا ہے اور آئندہ عراق، ایران اور افغانستان بلکہ عربستان پر قبضہ جما لینے کی دھمکی دی ہے اور آخر میں اپنا مقصد یوں ظاہر کیا ہے۔

سافتح ارض اللّٰه شرقا ومغربا
وانشر دینا للصلیب بصارمی

"میں عنقریب خدا کی زمین کو مشرق سے لے کر مغرب تک فتح کروں گا اور اپنی تلوار کے زور سے صلیبی دین پھیلاؤں گا۔"

فعیسیٰ علا فوق السماوات عرشه
یفوز الذی والاہ یوم التخاصم

"پس عیسیٰ آسمانوں سے اوپر عرش خداوندی سے آگے بلند ہو گئے۔ جھگڑے کے دن وہ شخص کامیاب رہے گا جو ان سے دوستی کا دم بھرتا ہے۔"

وصاحبکم بالترب اودی به الثری
فصار رماتا بین تلك الرمائم

"اور تمہارا ساتھی (یعنی محمد ﷺ) مٹی میں ہو گیا۔ زمین نے اس کو ہلاک کر دیا اور وہ گلی ہوئی ہڈیوں کے درمیان چور چور ہو گیا۔"

تناولتم اصحابه بعد موته
بسب وقذف وانتهاك المحارم

"تم لوگوں نے اس کے ساتھیوں کو اس کی موت کے بعد گالی دینا اور تہمت لگانا اور ان کی بے حرمتی کرنا شروع کر دیا۔"

اس نظم سے مسلمانوں کے دلوں کو بہت رنج پہنچا۔ مشہور ظاہری فقیہ اور عالم ابن حزم نے اس کا جواب لکھا تھا۔ جس کو کتاب البدایہ والنہایہ میں نقل کیا گیا ہے۔ نسیفورس کی اس نظم سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان عیسائیوں کی دلی آرزوئیں کیا تھیں۔ اسی کے بعد سے عالم مسیحیت میں ایک ہلچل پیدا ہوئی جو خوفناک صلیبی جنگوں کی صورت میں نمودار ہوئی۔ جب نور الدین زنگی اور اس کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے انہیں پے در پے شکستیں دیں تو عیسائیوں کی ہمتیں پست ہوگئیں پھر جب تاتاریوں نے اپنے بے پناہ حملے شروع کئے تو عیسائیوں نے ان کا ساتھ دیا اور مصری حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ مگر اس میں عیسائیوں، شیعوں اور تاتاریوں کو پوری ناکامی ہوئی۔ قبرص کی عیسائی سلطنت روز بروز مضبوط ہوتی چلی گئی تھی۔ یہاں کے بادشاہ یروشلم یعنی بیت المقدس کے بھی بادشاہ کہلاتے تھے۔ قبرص پر گئی۔ ڈی لوسگنان (guy-de-lusignan) کے بھائی شناوری (Shnaury) کا خاندان حکومت کر رہا تھا۔ قبرص کی عیسائی فوج ملک شام کے ساحلی شہروں پر حملے کرتی تھی اور بے گناہ مسلمانوں کی گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ چونکہ غالی شیعوں کو سنیوں سے ضد ہوگئی تھی اس لیے وہ بھی سنی مسلمانوں کو گرفتار کر کے قبرص کے عیسائیوں کے ہاتھ بیچ دیتے تھے۔ یہ مسلمان زیادہ تر غریب اور مفلس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جب امام ابن تیمیہ کو ان حالات کا پتہ چلا تو انہوں نے قبرص کے عیسائی بادشاہ کے نام ایک خط لکھا جو الرسالۃ القبرصیہ کے نام سے چھپ گیا ہے۔ اس خط کو انہوں نے شیخ ابو العباس مقدسی [1] کے ذریعہ باشادہ کے پاس روانہ کیا تھا۔

الرسالۃ القبرصیہ کا خلاصہ

امام ابن تیمیہ نے قبرص کے اس بادشاہ کا نام سرجواس یا سرجوان لکھا ہے جو درحقیقت

---

[1] غالباً یہ وہی ابو العباس مقدسی ہیں جن کا نام ونسب تذکروں میں اس طرح مذکور ہے یعنی شیخ شہاب الدین ابو العباس احمد بن شیخ امام تقی الدین محمد بن جبارہ بن عبدالولی بن جبارہ مقدسی مرداوی حنبلی ۶۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۲۸ھ میں قدس میں وفات پائی۔ امام ابن تیمیہ کے خط سے ایسا پتہ چلتا ہے کہ وہ اکثر قبرص جایا کرتے تھے اور وہ وہاں کے بادشاہ کی نیک دلی کے معترف تھے۔ (البداية والنهاية: ١٤/ ١٤٢)

جین اول (Jean1) ہے جس نے ۱۲۸۴ء یا ۱۲۸۵ء تک ایک سال حکومت کی تھی اور چونکہ یہ خط (۱۳۰۲ء/ ۷۰۲ھ) کے بعد کا لکھا ہوا ہے اس لیے یہ جین کے نام نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے بھائی ہینری دوم (Henry2) کے نام ہوگا۔ جس نے ۱۲۸۵ یا ۱۳۲۴ء تک یعنی تقریباً چالیس سال حکومت کی تھی۔ یہ خط چونتیس صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں حمد و نعت کے بعد سب سے پہلے انہوں نے اس پر بحث کی ہے کہ تمام انبیا کی تعلیم ایک ہے۔ سب کے سب توحید کو قائم کرنے کے لیے اس دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ جب یہودیوں نے تورات کے احکام کی خلاف ورزی کی اور انبیاءِ سابقین کی تعلیمات کے خلاف سرکشی اور بغاوت اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ جنہوں نے دنیا والوں کو توحید ہی کا بھولا ہوا سبق پڑھایا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان پر اٹھا لیا تو ان کے پیروؤں نے انجیل کی تفسیر میں تاویلات باطلہ سے کام لینا اور اس کے پیش کئے ہوئے سیدھے سادے عقائد اور احکام کو بدلنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ راہبوں، پادریوں اور پاپاؤں نے مکر وحیلہ اختیار کیا اور وہ عوام کو اپنے تقدس کے ذریعے دھوکہ دینے لگے۔ اس کی وجہ سے مسیحیوں میں ایسی بدعتیں رائج ہو گئیں جن کو نہ تو حضرت مسیح نے اور نہ ان کے حواریوں نے جائز قرار دیا تھا۔ سب سے پہلے رومی مسیحی بادشاہ قسطنطین نے چوتھی صدی عیسوی کی ابتدا میں مسیحی دین کو بدلا۔ اور اسی نے صلیب کی پرستش جاری کرائی اور عیسائیوں کا قبلہ مشرق کی طرف قرار دیا ان اختلافات کی وجہ سے مسیحی امت ملکانیہ، نسطوریہ اور یعقوبیہ جیسے فرقوں میں بٹ گئی۔ جب آنحضرت ﷺ کا ظہور ہوا تو بہت سے اہل کتاب آپ پر ایمان لائے اور آپ کی نبوت کے ثبوت میں بہت سی کتابیں لکھیں، اب تمام امتوں میں مسلمانوں کی امت درمیانی امت ہے۔ اس کو حلال اور حرام کی پوری تمیز ہے۔ اور وہی ہر ایک کے لیے دین اور دنیا کی بھلائی چاہتی ہے۔

اس کے بعد حضرت مسیح اور ان سے پہلے اور بعد کے پیغمبروں کی وصیتوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ تمام پیغمبر اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ اور تمام لوگوں کو دنیاوی زندگی سے منہ موڑ کر اپنی آخرت کی فکر کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ ایک قوم کے

بڑے سردار کا یہ فریضہ ہونا چاہیے کہ علم اور دین کے بارے میں اہل علم سے اس قسم کا مذاکرہ کرے جس سے اس کو اللہ تعالیٰ کی نزدیکی حاصل ہوتی ہو کیونکہ اللہ کا دین کسی کی خواہشات نفسانی یا آباءواجداد کی تقالید پر مبنی نہیں ہوتا۔ایک عاقل یہ دیکھتا ہے کہ رسولوں نے اس کے بارے میں کیا کہا ہے اور سارے لوگ کس بات پر متفق ہو سکے ہیں اور کن باتوں پر ان کا اختلاف رہا ہے۔ ہر ایک کو صحیح اعتقاد رکھنا چاہیے اور نیک اعمال کرنے چاہئیں۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اگر بادشاہ کو اس بارے میں کچھ رغبت ہو تو میں اس سے دینی مسائل کے متعلق خط و کتابت کر سکتا ہوں۔ایک زمانہ میں میرا خیال تھا کہ میں قبرص آؤں اور دین و دنیا کے مصالح پر بادشاہ اور دوسرے زعماء سے گفتگو کروں۔اگر بادشاہ کی جانب سے ان باتوں کی طرف کچھ رغبت نظر آئے تو میں اس کے مطابق عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کیونکہ بادشاہ اور اس کی قوم اچھی طرح جانتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور خاص کر محمد ﷺ کے ذریعے اپنے دین کو ظاہر کیا۔اور کافروں اور منافقوں کو ذلیل کیا۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ جب تاتاریوں نے ملک شام پر حملہ کیا اور مسلمانوں کے ساتھ بہت سے عیسائیوں کو گرفتار کر لیا تو میں نے قازان اور اس کے دونوں امیر قطلو شاہ اور بولائی کے پاس پہنچ کر انہیں چھڑانے کی کوشش کی۔ان لوگوں نے مسلمان قیدیوں کو تو چھوڑ دینے پر آمادگی ظاہر کی مگر عیسائی قیدیوں کے رہا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ان کو بیت المقدس سے گرفتار کر کے لائے تھے۔اس وقت میں نے جواب دیا کہ عیسائی بھی اسلامی حکومت کی رعایا ہیں۔ان کے جان و مال کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ان کو رہا کرانا بھی ہم پر واجب ہے۔چنانچہ اس دلیل سے مجبور ہو کر قازان نے عیسائی قیدیوں کو بھی کر رہا کر دیا۔جب ایسی مشکلات کے وقت عیسائیوں کے ساتھ ہمارا اتنا بہترین سلوک رہا ہے تو پھر قبرص کے عیسائیوں کے لیے کیا یہ جائز ہے کہ چند بے گناہ مسلمانوں کو دھوکہ اور غدر سے گرفتار کر لیں اور ان کے ساتھ برا سلوک کریں۔

اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ تاتاری اسلام کا دعوٰی کرتے تھے اور اس کے باوجود مسلمانوں پر حملے کر رہے تھے۔مگر اسلامی لشکر ان کے ساتھ کوئی منافقت یا دھوکہ نہیں برت

رہا تھا۔ ہم نے تاتاریوں کو صاف طور پر بتایا کہ وہ غلط راستے پر ہیں اور اسلام سے خارج ہیں اور جب وہ لڑنے پر آمادہ ہوئے تو اسلامی فوجوں نے انہیں تہ وبالا کر دیا۔ اور اب وہ سخت مصیبتوں میں مبتلا ہیں ہر طرف ۔ سے انہیں بلا گھیر چکی ہے۔ اسلام کی عزت اور شان وشوکت بڑھتی ہی جا رہی ہے اور دین کا کلمہ بلند ہوتا جا رہا ہے، میں خدائے وحدہ لاشریک کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس نے توارت، انجیل اور قرآن اتارا ہے۔ ہمارا یہ دین عروج پر ہے اور اس کی تجدید ہو رہی ہے۔ بادشاہ اچھی طرح جانتا ہے کہ نجران کے عیسائیوں اور اسی طرح ہرقل اور نجاشی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی نبوت کا اعتراف کر لیا تھا۔ جب نجاشی نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیتیں سنیں تو رو پڑا اور کہا قسم بخدا! حضرت عیسیٰ کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہے جو قرآن میں بیان کی گئی ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق وہ نصرانی جو آپ پر ایمان لاتے ہیں دو اجر کے مستحق ہوتے ہیں اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے خلاف مسلمانوں کا جہاد کرنا لازمی ہے یہاں تک کہ وہ مجبور ہو کر جزیہ دینے پر راضی ہو جائیں۔ اس کے برخلاف نصرانیوں کا عمل یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے بلکہ اس کے لیے بیٹا بنا کر اس پر تہمت لگاتے ہیں وہ حضرت عیسیٰ کو تین خداؤں میں ایک خدا قرار دیتے ہیں اور تورات وانجیل کی نصوص میں تحریف وتاویل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خون، مردار اور سور کا گوشت ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیا ہے۔ یہ چیزیں حضرت آدم کے زمانے سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور تک حرام رہی ہیں کسی پیغمبر نے بھی ان کو جائز نہیں قرار دیا تھا۔ خود علمائے نصاریٰ بھی اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ چیزیں حرام ہیں لیکن قوم کی رغبت یا ان کا خوف یا آبائی تقالید اس بات سے مانع ہیں کہ وہ ان چیزوں حرام ہونے کا اعلان کریں۔ نصرانیوں کو یوم آخرت پر بھی ایمان نہیں ہے۔ بہت سے لوگ فلاسفہ کی طرح حشر اجساد کے منکر ہیں۔ نصاریٰ کے اکثر علما زندیق ہیں پس جس قوم کی یہ حالت ہو شریعت محمدیہ کے اصول کے مطابق ان کے خلاف جہاد کرنا لازمی ہے۔ حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کبھی جہاد کا حکم نہیں دیا اور خاص کر امت حنفیہ کے خلاف۔ آپ کے بعد آپ کے حواریوں نے بھی اس کو جائز نہیں سمجھا تو پھر

اے بادشاہ تم کیونکر خون بہانے، مردوں اور عورتوں کو قید کرنے اور بلا کسی سبب اور حجت کے لوگوں کا مال چھیننے کو جائز سمجھتے ہو؟''

اس کے بعد لکھا کہ بادشاہ یہ جانتا ہے کہ ہمارے ملکوں میں بہت سے ذمی نصرانی بستے ہیں جن کی تعداد کو کوئی گن نہیں سکتا اور خدا کے سوا اس کو کوئی نہیں جانتا۔ ان کے ساتھ ہم مسلمانوں کا سلوک ہمیشہ سے اچھا رہا ہے تو پھر تم لوگ کس طرح مسلمان قیدیوں کے ساتھ وہ سلوک جس کو کوئی صاحب مروت و دین پسند نہیں کرتا۔ میں یہ الزام بادشاہ یا اس کے گھر والے یا اس کے بھائیوں پر نہیں دھرتا۔ کیونکہ شیخ ابوالعباس مقدسی بادشاہ اور اس کے اہل بیت کے حسن سلوک کے معترف ہیں اور تمہارے شکر گزار ہیں میں یہ بات قبرص کی عام عیسائی رعایا کے متعلق کہتا ہوں۔ کیا قیدی بھی بادشاہ کی رعایا نہیں ہیں؟ کیا حضرت مسیح اور دوسرے انبیا نے قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی وصیت نہیں کی؟ پھر یہ ساری وصیتیں کیا ہوگئیں؟ حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ان مسلمانوں کو دھوکہ سے گرفتار کیا گیا ہے اور تمام دینوں اور ملتوں کے نزدیک دھوکہ حرام ہے تم کیونکر ان پر قبضہ کرنے کو جائز سمجھتے ہو۔ کیا تمہیں یہ اطمینان ہوگیا ہے کہ مسلمان تم پر حملہ نہیں کریں گے اور تمہارے ساتھ دھوکہ سے نہیں پیش آئیں گے۔ خدا مسلمانوں کی ضرور امداد اور اعانت کرے گا۔ خاص کر ان دنوں میں جبکہ مسلمان قوم جہاد پر کمر بستہ ہو چکی ہے اور طاقت آزمانے کے لیے تیار ہو چکی ہے۔ تمام اولیاء اللہ اور خدا کے نیک بندے اس کی اطاعت پر آمادہ ہو چکے ہیں۔ ساحلی شہروں کی پورے طور پر ناکہ بندی ہو چکی ہے۔ اور ایسے امیر عامل مقرر ہو چکے ہیں جنہیں سخت لڑائی کا تجربہ ہے۔ ان کا اثر ظاہر ہو چکا ہے اور اب ان کی قوت بڑھتی جا رہی ہے۔

''اس کے علاوہ مسلمانوں میں بہت سے فدائی اور جانباز ہیں جو بادشاہوں کو ان کے بستروں اور ان کے گھوڑوں پر ختم کر دیتے ہیں۔ بادشاہ کو ان کی گزشتہ اور موجودہ تاریخ معلوم ہے۔ مسلمانوں میں بہت سے ایسے نیک لوگ ہیں جن کی دعاؤں کو کبھی اللہ تعالیٰ قبولیت سے محروم نہیں کرتا۔ ان کی دعائیں تیر بہدف ثابت ہوتی ہیں۔ تاتاریوں نے اپنی شان و شوکت اور کثرت کے غرور میں مسلمانوں پر حملہ کیا تو ان بزرگوں کی بددعا کی بدولت مصیبتوں نے ہر

طرف سے تا تاریوں کو گھیر لیا۔ تو اے بادشاہ! اس قوم کا کیا حال ہوگا جو کہ ہر طرف سے مسلمانوں سے گھری ہوئی ہے۔ ایسے مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کیا جا سکتا جس کو کوئی عاقل مسلمان اور ذمی ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

"اے بادشاہ! تم جانتے ہو کہ ہرگز ہرگز مسلمانوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک تھا۔ دنیا بھر کے عقلا مسلمانوں کے دین کی فضیلت پر متفق ہیں۔ یہاں تک کہ فلاسفہ بھی یہی کہتے ہیں کہ دنیا کو دین اسلام سے بہتر اب تک کوئی دین نہیں ملا ہے۔ اس کی پیروی کے لازم اور واجب ہونے پر دلیلیں قائم ہو چکی ہیں۔"

"پھر یہ تمام ساحلی ملک بلکہ قبرص بھی مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہا ہے۔ تین سو سال سے کچھ کم ہوئے کہ قبرص کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھینا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ قیامت تک غالب رہیں گے۔ کیا بادشاہ کو یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ پروردگار ان مظلوم قیدیوں کا بدلہ تم سے نہ لے گا یا تم کو اس سے اطمینان ہے کہ مسلمانوں کی اسلامی حمیت وغیرت جوش میں نہ آئے گی اور وہ تم سے بدلہ لینے کے لیے تیار نہ ہو جائیں گے؟ اگر ہم بادشاہ اور اس کے ساتھیوں سے نیک سلوک دیکھیں گے تو ہم بھی اسی قسم کا نیک سلوک کریں گے اور اگر تم لوگ سرکشی پر آمادہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے خلاف مظلوموں کی امداد کرے گا۔

اے بادشاہ! تم جانتے ہو کہ اس وقت مسلمانوں کو تم سے انتقام لینا آسان ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں تم سے اس مسئلہ پر نرمی کے ساتھ اور بہتر طریقہ پر گفتگو کروں اور علم اور اتباع حق میں تمہاری امداد اور اعانت کروں۔ اگر بادشاہ کے پاس ایسے لوگ ہوں جن کے عقل و دین پر پورا بھروسہ ہو تو اصول علم اور حقائق ادیان کے متعلق بادشاہ کو ان سے بحث کرنی چاہیے۔ اس کو ان نصرانیوں کا طرف دار نہیں ہونا چاہیے جو نرے مقلد ہیں اور عقل و دین کی بات کو سوچنے اور سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ان کی حیثیت چوپایوں کی سی یا ان سے بھی بدتر ہے۔

تم کو چاہیے کہ اللہ ہی سے ہدایت کے طلبگار رہو اور ہمیشہ یہ دعا کرتے رہو، اے اللہ!

مجھ کو حق کا راستہ دکھا اور اس کی اتباع میں میری مدد کرو، باطل کو باطل دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق دے، اس کو مجھ پر مبہم مت کر دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں باطل کی پیروی کر بیٹھوں۔ اے جبریل و میکائیل و اسرافیل کے پروردگار! اور آسمان و زمین کے بنانے والے اور غیبت و حضور کی باتیں جاننے والے تو ہی اپنے بندوں کے درمیان جو آپس میں اختلاف کرتے ہیں ٹھیک فیصلہ کر سکتا ہے مجھے بھی اس اختلاف میں حق کی راہ دکھا بے شک تو ہی جس کو چاہتا ہے، سیدھے راستے کی ہدایت دے سکتا ہے۔"

اس کے بعد لکھا ہے کہ "میرا یہ خط اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں رکھتا اور میں بادشاہ کے لیے وہی چاہتا ہوں جو اسے دین و دنیا میں کام آئے اور یہ دو چیزیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ بادشاہ کو علم اور دین کی معرفت حاصل ہوگی، اس پر حق کا انکشاف ہوگا۔ اس کا شبہ زائل ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کر سکے گا اور یہی چیز اس کو دنیا بھر کی دولت اور سلطنت سے زیادہ بہتر اور مفید ثابت ہوگی۔ اور دوسری یہ کہ مسلمان قیدیوں کے چھڑانے اور رہا کرانے میں خود بادشاہ اور مسلمانوں کا بھلا ہوگا کیونکہ ان کے ساتھ برا رویہ اختیار کرنے سے خود بادشاہ کے دین کا نقصان ہوگا۔ حضرت مسیح کی تو یہ تعلیم تھی کہ جو کوئی تجھے طمانچہ مارے اس کے سامنے اپنا دوسرا گال بھی پھیر دے اور جو تیری چادر لینا چاہے اسے اپنی قمیص اتار کر دیدے، تعجب یہ ہے کہ مسیح اس تعلیم پر کوئی عمل نہیں کر رہے ہیں۔ مسلمان کمزور اور ضعیف تو ضرور ہیں مگر جب ان مسلمان قیدیوں کی تعداد بڑھتی جائے گی تو خدا کا غصہ بھی بڑھتا جائے گا۔ آخر ایک دن آئے گا جبکہ تم پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔ قبرص کے مسلمان قیدیوں پر سکوت کس طرح ممکن ہے، جبکہ ان میں سے اکثر فقیر اور کنگال ہیں۔ ان کی کوئی مدد کرنے والا نہیں ہے۔ اور یہ ابوالعباس ہیں کہ مسلمانوں کے شیخ ہونے کے باوجود فقیر ہیں۔ بڑی مشکلوں کے بعد فدیہ ادا کر کے اپنے آپ کو آزاد کیا ہے۔ دین اسلام ہمیں فقراء و ضعفاء کی امداد و اعانت کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ہم سے زیادہ بادشاہ ان کی مدد کرنے کا حقدار ہے کیونکہ حضرت مسیح نے انجیل میں کمزوروں پر رحم کرنے کی وصیت کی ہے۔ نصرانیوں کی بھلائی دھوپ اور بارش کی طرح ہونی چاہیے جس سے ہر ایک فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس میں دوست اور دشمن کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

اگر بادشاہ اور اس کے ساتھی ان مسلمان قیدیوں کے ساتھ رحم کریں گے تو خدا انہیں دین اور دنیا میں بہت بڑا اجر دے گا۔ خاص کر اس وجہ سے کہ بہت سے مسلمان دھوکہ سے قید کئے گئے ہیں۔ خدا حضرت مسیح اور ان کے حواری بلکہ حضرت مسیح کے پیرو بھی دھوکہ کو کبھی جائز نہیں سمجھتے۔ عام نصرانی جانتے ہیں کہ مسلمان حضرت مسیح کو رسول مانتے ہیں اور ان کی عزت کرتے ہیں پھر انہیں کیونکر یہ جائز ہے کہ ان مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کریں۔''

''اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ ان مسلمانوں نے ہم سے جنگ کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا یہ کہنا ان لوگوں کے بارے میں ٹھیک نہیں ہو سکتا جن کو تم نے دھوکے سے گرفتار کیا ہے۔ اب رہ گئے وہ مسلمان جنہوں نے تم سے جنگ کی ابتدا کی تو اس بارے میں وہ معذور ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول بلکہ حضرت مسیح اور تمام انبیا نے یہ حکم دیا ہے کہ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے لڑائی کی جائے پس جو بھی اس حکم کی اتباع میں جہاد کرے گا وہ خدا کے حکم کا تابع ہوگا۔ اس پر کوئی گرفت نہیں ہو سکتی۔''

''نصرانیوں میں بہت سے بادشاہ، قسیس، رہبان اور دوسرے لوگ گزرے ہیں۔ جو معرفت اور دین کے لحاظ سے دوسروں پر فضیلت رکھتے تھے وہ اسلام اور مسلمانوں کی قدر پہچانتے تھے اور اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے تھے جس سے ان کو دین اور دنیا کا فائدہ حاصل ہوا۔ قیدیوں کا رہا کرنا اور غلاموں کا آزاد کرانا ایک ایسا مستحسن فعل ہے جس کی تعریف میں تمام انبیا وصدیقین کا کلام پایا جاتا ہے جو بھی قیدیوں اور غلاموں کو رہا اور آزاد کرائے گا اس کا ثمرہ دین و دنیا میں اس کو ضرور ملے گا۔''

''اس دنیا میں مسلمان خیر و شر میں دوسروں کا بدلہ دینے میں سب سے زیادہ قادر ہیں۔ جو بھی ان سے لڑائی کرے گا اس کو بے پناہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوگی کہ گزشتہ زمانے میں چند مٹھی بھر مسلمان اپنے سے کئی گنا دشمنوں پر غالب آجاتے تھے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ چالیس ہزار مسلمان چار لاکھ نصرانیوں پر غالب آگئے ہیں۔ حالانکہ اس وقت مسلمانوں کے اندر انتشار اور تفرقہ تھا تو ان کے اندر اتحاد اور اتفاق پیدا ہو چکا ہے۔ ان کی قوت اور شوکت بہت بڑھ چکی ہے۔ ان کے اندر جہاد کی رغبت پیدا ہو چکی ہے اور اس

کے ثواب عظیم پر ان کا پورا اعتقاد ہے ایسی حالت میں وہ کس طرح نصرانیوں پر غالب نہیں آسکتے۔''

''پھر تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمہارے ملکوں میں مسلمانوں کی جو تعداد ہے اس سے کئی گنا بڑھ کر اسلامی ملکوں میں نصرانیوں کی تعداد ہے۔ تمہارے ہاں کے مسلمان تنگ حال مفلس ہیں مسلمانوں کو ان کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی ممالک ہیں اور خاص کر شام کے ساحلی علاقوں پر بڑے بڑے دولت منداور صاحب وجاہت نصرانی بستے ہیں۔ ان کے جیسے نصرانی تمہارے جزیرے پر بھی پائے نہیں جاتے۔ ایسی حالت میں ان کمزور اور ضعیف مسلمانوں کا چھڑانا اور انہیں آزاد کرنا ہمارا فرض ہے۔''

اس خط کے حامل ابوالعباس مقدسی نے تمہاری اور تمہارے بھائیوں کی تعریف کر کے ہمارے دلوں کو تمہاری طرف مائل کرلیا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے بادشاہ سے خط وکتابت کی ہے کیونکہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ بادشاہ کو بھلائی اور علم ودین سے بڑی رغبت ہے۔ میں بھی حضرت مسیح اور دیگر انبیا کا ایک نائب ہوں۔ بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کو اچھا مشورہ دینا اور ان سے بھلائی کی درخواست کرنا میرا فرض ہے۔ امت محمدیہ کا کام یہی ہے کہ وہ لوگوں کے لیے دین اور دنیا کی بھلائی چاہیں اور انہیں نیک کاموں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں اور انہیں اللہ کی طرف بلائیں۔ اور دینی ودنیاوی مصالح کے حاصل کرنے میں ان کی مدد کریں۔ بادشاہ کو ایسی باتوں کی خبر دی گئی ہوگی جن سے ان مسلمانوں کا دین واخلاق برا معلوم ہوتا ہوگا۔ مگر یہ خبر جھوٹی ہوگی۔ اگر ان مسلمانوں میں واقعی بدطینت اور بداخلاق ہوں بھی تو نصرانیوں میں اس قسم کے برے لوگ زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بادشاہ اور ہر ایک عاقل اس بات کو جانتا ہے کہ اکثر نصرانی حضرت مسیح اور ان کے حواریوں کی وصیتوں پر کچھ بھی عمل نہیں کرتے۔ اور پال اور دوسرے قدیسین کی نصیحتوں کو نہیں مانتے۔ ان میں سے بہت سے لوگ شراب پیتے ہیں، سور کا گوشت کھاتے ہیں، صلیب کی تعظیم کرتے ہیں اور ایسی بدعتوں پر عمل کرتے ہیں۔ جن کی اللہ نے اجازت نہیں دی ہے۔ بعض لوگ نصرانی شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''حضرت مسیح عیسیٰ علیہ السلام دمشق کے سفید منارے کے پاس دو فرشتوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے نزول

فرمائیں گے۔'' ❶ ''وہ صلیب توڑیں گے، سوروں کو قتل کریں گے اور جزیہ اٹھا دیں گے۔'' ❷ ''اسلام کے سوا کسی سے کوئی دوسرا دین قبول نہیں کیا جائے گا۔'' ❸ ''آپ کانے دجال کو قتل کریں گے جس کی اتباع یہودی کریں گے۔'' ❹ ''مسلمانوں کو یہودیوں پر غلبہ حاصل ہو گا، یہودی جھاڑا اور پتھر کے پیچھے پناہ لیں گے مگر جھاڑا اور پتھر خود کہہ اٹھیں گے، اے مسلمان! دیکھ میرے پیچھے یہ یہودی چھپا ہوا ہے، اس کو قتل کر۔'' ❺ یہودیوں نے حضرت مسیح پر جو کچھ ظلم و ستم ڈھائے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس دن ان سے پورا بدلہ لے گا۔ ❻

ہمارے نزدیک نصرانیوں کے متعلق جو روایتیں ہیں جن میں مسلمانوں کے غلبہ کی خبر دی گئی ہے اگر ان کو بیان کروں تو یقین ہے کہ بادشاہ کا سینہ تنگ ہو جائے گا۔ اور وہ ان کے سننے کی تاب نہیں لائے گا لیکن مجھے اتنا تو بتا دینا ہے کہ جو بھی مسلمانوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گا اس کا بہتر بدلہ پائے گا۔''

''آخر میں مَیں بادشاہ کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ ابوالعباس مقدسی اور دوسرے مسلمان قیدیوں کے متعلق نرمی اختیار کریں اور ان کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھا جائے۔ ان کے دین کو بدلنے کی کوشش نہ کی جائے، عنقریب بادشاہ اس کا اچھا بدلہ دیکھے گا۔ مسلمان اس سے زیادہ بہتر بدلہ دیں گے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میرا مقصد بادشاہ کو نصیحت کرنے اور ہر ایک کے لیے دین اور دنیا کی بھلائی چاہنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ خدا سے ہماری دعا ہے کہ وہ بادشاہ کے لیے دین اور دنیا کی وہی بھلائی عطا کرے جو اس کے نزدیک سب سے بہتر ہو۔''

عیسائیوں کی ایک مناظرنہ تصنیف

اب یہ نہیں معلوم کہ امام ابن تیمیہ کے اس خط کا بادشاہ قبرص اور اس کے ساتھیوں پر کیا اثر پڑا، بہت ممکن ہے کہ مسلمان قیدیوں کو رہا کر دیا گیا ہو یا ان کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھا گیا ہو مگر وہاں سے عیسائیوں کی ایک مناظرانہ تصنیف آئی جو انطاکیہ اور صیدا کے پادری پال

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب ذکر الدجال و صفته......، ح: ۲۹۳۷ (۷۳۷۳)
❷ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب قتل الخنزیر، ح: ۲۲۲۲۔
❸ سنن ابی داود، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال، ح: ۴۳۲۴۔ ❹ صحیح ابن حبان: ۱۵/ ۲۳۴، رقم: ۶۸۲۲۔ ❺ صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب لا تقوم الساعة......، ح: ۲۹۲۲ (۷۳۳۹) ❻ مجموع الفتاوی: ۲۸/ ۶۲۹۔

(بولص) کی لکھی ہوئی تھی۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ دین اسلام بڑی تیزی کے ساتھ پھیلتا جارہا ہے اور بہت سے یہودی اور عیسائی بھی مسلمان ہوتے چلے جارہے ہیں۔ تو انہیں اسلام سے بچانے کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی ایک نبی تھے۔ مگر وہ صرف عربوں کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ غیر عربی لوگوں کے لیے ان کی نبوت کا ماننا ضروری نہیں ہے چنانچہ مذکورہ بالا پال نے کتاب المنطیقی الدولة خانی المبرھن عن الاعتقاد الصحیح والرأی المستقیم کے نام سے ایک کتاب لکھی جو عیسائیوں میں بہت ہی مقبول ثابت ہوئی۔ عیسائیوں میں اس کتاب کا کافی چرچا تھا۔ اس کی وجہ سے علمائے نصاری کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ اس کتاب کے پڑھ لینے کے بعد کوئی نصرانی یہودی مسلمان نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کے خیال میں اس کتاب میں قرآن مجید سے ثابت کیا گیا تھا کہ آنحضرت ﷺ عمومی پیغمبر نہیں تھے۔

یہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس صدی کی تصنیف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں یعنی چوتھی صدی میں یہ تصنیف وجود میں آئی ہے اسلام کے بین اور روشن دلائل کے مقابلے میں عیسائی اس کتاب کے پیش کردہ دلائل کو دہراتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ کسی مسلمان عالم کی طرف سے اس کتاب کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اسی غرض سے عیسائیوں نے قبرص سے امام ابن تیمیہ کے پاس یہ کتاب روانہ کی تھی۔

اس کتاب کے مضامین

پادری پال نے اپنی اس کتاب کو چھ فصلوں میں منقسم کیا تھا۔

(۱) مسلمانوں کا یہ دعوی کہ آنحضرت ﷺ ساری دنیا کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ وہ صرف عربوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے۔ قرآن مجید سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور ہماری عقل بھی اسی پر گواہی دیتی ہے۔

(۲) محمد ﷺ نے خود قرآن مجید میں دین مسیحیت کی تعریف اور مسیحیوں کی مدح کی ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحیوں کو اپنے دین پر ثابت قدم رہنا چاہیے۔

(۳) تمام سابقہ انبیا کے صحیفے اور آسمانی کتابیں جیسے زبور، تورات اور انجیل موجودہ دین مسیحیت کی تعریف کرتی ہیں اور اقانیم ثلاثہ، تثلیث اور اتحاد کے عقیدوں کی صحت پر گواہی

دیتی ہیں۔ جب پرانی شریعتیں اس کے خلاف نہیں ہیں اور ہماری عقل بھی ان کو غلط ثابت نہیں کرسکتی تو دین مسیحیت پر قائم رہنا کس طرح مذموم ہوسکتا ہے۔

(۴) تثلیث کا مسئلہ عقل اور نقل دونوں سے ثابت ہے۔

(۵) عیسائی بھی مسلمانوں کی طرح توحید پرست ہیں۔ ان کے منہ سے اقانیم اور تعدد خدا کے جو الفاظ نکلتے ہیں بعینہٖ وہی حیثیت رکھتے ہیں جو کہ مسلمانوں کے منہ سے تشبیہ اور تجسیم کے الفاظ کے نکلنے کی ہوتی ہے۔

(۶) حضرت مسیح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد پیغمبر ہو کر آئے۔ انہوں نے ان کی شریعت کی تکمیل کی۔ اس لیے حضرت عیسیٰ کے بعد کسی نبی کامل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب اگر کوئی شخص نئی شریعت پیش کرے تو وہ عیسائیوں کے نزدیک مقبول ثابت نہ ہوگی۔

اس کتاب کا جواب

امام ابن تیمیہ کے پاس جب یہ کتاب بھیجی گئی تو اس کا جواب لکھنا لازمی تھا۔ ان سے بہتر کوئی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا، کیونکہ وہ قرآن و حدیث اور سیرت نبوی پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ فلسفہ و علم کلام اور عقائد فرق اسلامیہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس پر مزید یہ کہ تورات و انجیل اور دیگر صحائف سماوی کو اچھی طرح سے پڑھا تھا۔ انہوں نے مسیحیت کی تاریخ پر مختلف کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کتاب کی تردید میں ''الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح'' کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی جو چار ضخیم جلدوں میں مصر سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے پڑھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہودی اور نصرانی مذاہب پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ انہوں نے خود عیسائی اہل قلم کی تصانیف سے دین مسیحیت کی تبدیلیوں کو ثابت کیا ہے اس سلسلہ میں بطریق اسکندریہ سعید بن البطریق کی کتاب نظم الجوہر کا حوالہ دیا ہے۔ یہ شخص چوتھی صدی ہجری میں اسکندریہ کا بطریق تھا۔ امام موصوف نے حسن بن ایوب کا ایک خط بھی نقل کیا ہے۔ یہ شخص عیسائی تھا۔ اس کو اپنے دین کی متضاد تعلیمات سے نفرت ہو چکی تھی۔ برسوں سرگرداں رہنے کے بعد اپنے آبائی مذہب مسیحیت کو چھوڑ کر مسلمان ہو گیا۔ اور جب اس کے بھائی علی بن ایوب نے اس پر اعتراض کیا تو دین مسیحیت کی برائیوں اور اسلام کے فضائل پر اپنے بھائی کو ایک طویل خط لکھا تھا۔

کتاب المنطیقی کے لکھنے کی وجہ

امام ابن تیمیہ نے اس کتاب کی پہلی فصل کا جو اقتباس نقل کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض نصرانیوں نے اس مصنف کتاب سے درخواست کی تھی کہ ان مسیحیوں کے اعتقادات کے متعلق جو مشرق سے لے کر مغرب تک اور جنوب سے لے کر شمال تک ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں یا سمندری جزیروں کے اندر ساکن ہیں۔ یا شمالی افریقہ کے شمالی ساحلی مقامات پر بستے ہیں، ایک کتاب لکھے۔ اس مصنف نے پہلے بادشاہ روم کے قاضی اور اسقف کا واقعہ نقل کیا ہے۔ اس اسقف نے قبرص میں داخل ہونے سے پہلے بہت سے شہروں کی سیر کی تھی اور ہر جگہ کے بڑے بڑے مسیحی علما سے ملا تھا اور ان سے دین مسیحیت کے متعلق مذاکرے کیے تھے۔ بعض مسیحی علما نے کہا کہ ہم سنتے ہیں کہ عرب میں ایک انسان پیدا ہوا ہے جس کا نام محمد ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور وہ ایک کتاب کو پیش کرتا ہے جس کے متعلق اس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہے۔ ہم نے بڑی کوششوں کے بعد اس کتاب کو حاصل کیا۔ اس وقت اس اسقف نے ان سے پوچھا کہ جب تم لوگوں نے اس کتاب کے بارے میں کچھ سنا اور اس انسان کے متعلق کچھ معلوم کیا اور بڑی کوششوں کے بعد یہ کتاب حاصل کی تو پھر تم لوگوں نے اس کی پیروی کیوں نہیں کی؟ حالانکہ اس انسان نے صاف طور پر اپنی کتاب میں کہا ہے:

﴿ وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۸۵ ﴾ [1]

''اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے تو اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔''

تو ان مسیحی علما نے جواب دیا کہ یہ کتاب عربی میں ہے اور اس رسول کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر اس کو عجمی زبان میں اتارا جاتا تو کوئی اس پر ایمان نہ لاتا، چنانچہ بتایا:

﴿ وَ لَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ۝۱۹۸ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ

[1] ۳/آل عمران: ۸۵۔

مُؤْمِنِيْنَ ﴿١٩٩﴾ [1]

''اور اگر ہم اس کو بعض عجمیوں پر اتارتے اور وہ اس کو ان پر پڑھتا تو وہ ہرگز اس پر ایمان نہیں لاتے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اس شخص کی رسالت صرف عربوں کی طرف تھی وہ عیسائیوں کے لیے پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا اور ان پر اس کی اتباع واجب نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے ان کے پاس دوسرے رسول آئے اور اپنے ہی رسول کے احکام کی پابندی کر رہے ہیں۔خود اس انسان (محمد ﷺ) کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجا مگر اسی کی قوم کی زبان میں اس نے لوگوں کو خطاب کیا۔دوسری جگہ بتایا کہ اس سے پہلے جتنے بھی رسول آئے وہ کھلی نشانیوں اور ہدایتوں کو لے کر آئے اس سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے کے تمام نبی برحق تھے۔اب رہا اس شخص کا یہ کہنا کہ کسی سے اسلام کے سوا کوئی اور دین قبول نہیں کیا جائے گا۔تو یہ حکم صرف عربوں کے لیے ہے۔دوسروں کے لیے یہ حکم نہیں ہے۔

پہلی گرفت

اس اقتباس کو نقل کرنے کے بعد امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اس کتاب میں نہ تو آنحضرت ﷺ کی کھلے الفاظ میں تصدیق کی گئی ہے اور نہ تکذیب ہی کی گئی ہے مگر عیسائیوں نے اتنا تو اعتراف کر لیا ہے کہ آنحضرت ﷺ ان کی طرف نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے۔وہ صرف عربوں کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔اس پر امام موصوف نے یہ گرفت کی ہے کہ جب کسی شخص کو نبی مان لیا گیا تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے تمام دعوؤں کی تصدیق کی جائے۔اگر اس کی بعض باتیں سچی ہوں اور بعض جھوٹی ہوں تو وہ ہرگز نبی نہیں ہو سکتا۔جب عیسائیوں نے یہ اعتراف کر لیا کہ آنحضرت ﷺ نبی تھے تو یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ ان کے تمام دعاوی کو سچ جانیں۔قرآن مجید میں یہودیوں اور نصرانیوں کے عقائد وخیالات پر سخت جرح کی گئی ہے۔اگر وہ صرف عربوں کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے ہوتے تو پھر یہودیوں اور نصرانیوں کے عقائد وخیالات کی تردید کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔اس کے علاوہ تاریخ کا ایک

---

[1] ۲۶/الشعراء: ۱۹۸، ۱۹۹۔

ثابت شدہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عیسائی بادشاہوں کے نام خطوط روانہ کیے تھے جن میں انہیں اسلام کی دعوت تھی۔ ملک شام میں ہرقل کو، مصر میں مقوقس کو اور حبش میں نجاشی وغیرہ کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ اگر آنحضرت ﷺ صرف عربوں کے لیے نبی ہوتے تو پھر انہیں ان عیسائی بادشاہوں اور ان کی قوموں کو دعوت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ ان عیسائیوں نے جس طرح تورات اور انجیل میں تحریف وتبدیل سے کام لیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی آیتوں کے معانی میں غلط تاویلیں کی ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کی کھلی نصوص کو چھوڑ دیا۔ جن میں صراحت کے ساتھ یہ موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ ساری دنیا والوں کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے مثلاً قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [1]

''(قرآن مجید) نہیں ہے وہ مگر نصیحت ساری دنیا والوں کے لیے۔''

خود آنحضرت ﷺ کی زبان سے قرآن مجید میں یہ اعلان کیا گیا:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [2]

''اے پیغمبر کہہ دو، اے لوگو! میں بے شک تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔''

عجیب نظریہ

آنحضرت ﷺ کی عمومی رسالت پر بحث کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ نے ایک عجیب بات لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میرے لیے زمین کے کنارے دکھائے گئے اور میں نے زمین کے مشرقی اور مغربی دونوں علاقوں کو دیکھا اور عنقریب میری امت زمین کے ان کناروں تک پہنچ جائے گی جو کہ مجھے سکھائے گئے ہیں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے مطابق مسلمانوں کی سلطنت مشرق ومغرب میں قائم ہوئی اور زمین کے بیچ کے علاقوں میں اسلام کی دعوت پھیل گئی۔ تیسری، چوتھی اور پانچویں اقلیم میں اسلام کا بول بالا ہوگیا کیونکہ مسلمان عقل اور اخلاق کے لحاظ سے سب سے کامل اور مزاج کے لحاظ سے سب سے زیادہ منصف اور متوسط ہیں بخلاف ان لوگوں کے جو

---

[1] ۳۸/صٓ: ۸۷۔ [2] ۷/الاعراف: ۱۵۸۔

جنوب اور شمال کے علاقوں میں رہتے ہیں ان کی عقلیں اور اخلاق ناقص ہوتے ہیں۔ اور ان کے مزاجوں میں انحراف ہوتا ہے۔ جنوب کے لوگوں میں یہ کیفیت اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ وہاں حرارت اور گرمی زیادہ ہوتی ہے، ان کے اخلاط جل جاتے ہیں اور ان کے چہرے کالے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے بالوں میں پھیر پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن شمال کے لوگوں میں یہ کیفیت ٹھنڈک کی زیادتی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے اخلاط پورے طور پر بالیدہ نہیں ہوتے۔ وہ جم جاتے ہیں۔ ان کے بال سیدھے اور لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ بالکل سفید ہو جاتا ہے جو پسند نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسلام کا ظہور ہوا تو مسلمان وسطِ معمورہ پر غالب آ گئے، بنی آدم میں وہ سب سے زیادہ منصف مزاج اور کامل عقل و اخلاق والے ہوتے ہیں۔ وہ نصرانی جن کی مسلمانوں کے ماتحت تربیت ہوئی ہے۔ دوسرے نصرانیوں سے عقل و اخلاق میں بہتر ہوتے ہیں۔ جنوب و شمال کے وہ نصاریٰ جو مسلمانوں کے ذمی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے خلاف جنگ کر رہے ہیں عقل اور اخلاق کے لحاظ سے بہت ناقص ہوتے ہیں اور عقل و اخلاق کے اسی نقص کی بنا پر ان میں اسلام کی بجائے نصرانیت زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔ [1]

امام ابن تیمیہ نے اپنے اس عجیب و غریب نظریہ ہی کی بنا پر ایک دوسری جگہ مسلمانوں کی نہایت ہی شاندار الفاظ میں تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

والمسلمون فلایشك احد من الامم انهم اعظم الامم عقولا و افهاما واتمهم معرفة و بیانا و احسن قصدا و دیانة و تحریا للصدق والعدل وانهم لم یحصل فی النوع الانسانی امة اكمل منهم ولاناموس اكمل من الناموس الذی جاء به بینهم و حذاق الفلاسفة معترفون لهم بذلك وانه لم یقرع العالم ناموس اكمل من هذا الناموس وقد جمع اللّٰه

---

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح:١/ ٤٩۔

للمسلمين جميع طرق المعارف الانسانية وانواعها۔ [1]

''اور مسلمان پس امتوں میں سے کسی کو بھی اس میں شک نہیں ہے کہ وہ تمام امتوں میں عقل اور سمجھ کے لحاظ سے بہت بڑھ کر ہیں اور معرفت اور بیان میں سب سے پورے اور قصد و دیانت اور صدق و عدل کی تحری میں سب سے بہتر ہیں۔ نوع انسانی میں کسی امت کو وہ کمال حاصل نہیں ہوا جو ان کو حاصل ہوا۔ اور کوئی شریعت اس شریعت سے بڑھ کر کامل نہیں ہے جس کو ان کے نبی لے آئے اور ماہر فلاسفہ کو بھی اس بات کا اعتراف ہے۔ دنیا میں اس شریعت سے بڑھ کر کسی کامل شریعت کا وجود نہیں آیا۔ اور بے شک اللہ نے مسلمانوں کے لیے معارف انسانی کے تمام طریقے اور قسمیں جمع کر دی ہیں۔''

اناجیل اربعہ کی حیثیت

قرآن مجید نے آسمانی کتابوں میں تورات اور انجیل کا کئی جگہ نام لیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے اور ان کو ہدایت اور نور کا سرچشمہ بتایا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ ﴾ [2]

''بے شک ہم نے تورات اتاری اس میں ہدایت اور نور ہے اسی کے مطابق وہ انبیا جو مطیع و فرمانبردار ہوئے اور ربانیین اور احبار یہودیوں کے لیے فیصلہ دیتے ہیں۔''

انجیل کے متعلق فرمایا:

﴿ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ﴾ [3]

''اور ہم نے (عیسیٰ) کو انجیل دی جس میں ہدایت اور نور ہے۔''

قرآن مجید ان دونوں کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو لوگوں کی ہدایت کے لیے اتاری گئی

---

[1] الجواب الصحيح: ٢/ ٣۔ [2] ٥/المائدة: ٤٤۔

[3] ٥/المائدة: ٤٦۔

تھیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۙ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ ❶

''تمہارے اوپر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو اپنے سامنے کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس سے پہلے تورات و انجیل اتاری جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔''

اہل کتاب سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ قرآن مجید پر ایمان لے آئیں جو ان کے ساتھ کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ﴾ ❷

''اے وہ لوگو! جن کو کتاب دی گئی ہے اس چیز پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے اتارا ہے اور جو تمہارے ساتھ کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تورات اور انجیل سے کون سی کتابیں مراد ہیں؟ قرآن مجید کی آیتوں کو ملانے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان سے مراد وہی تورات و انجیل تھی جو آنحضرت ﷺ کے زمانے میں موجود تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ ﴾ ❸

''کہہ دو اے کتاب والو! تم کسی چیز پر نہیں ہو یہاں تک کہ تم تورات اور انجیل کو اور جو تمہاری طرف پروردگار کی جانب سے اتارا گیا ہے اس کو قائم نہ کرو۔''

اس کے علاوہ یہودیوں اور نصرانیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں کے مطابق فیصلہ کریں اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ظالم اور فاسق ہیں۔ یہودیوں کے متعلق فرمایا:

﴿ وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ

---

❶ ۳/آل عمران:۳، ٤۔ ❷ ٤/النساء:٤٧۔

❸ ٥/المائدۃ:٦٨۔

بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۳﴾ ❶

''اور یہ لوگ تم کو کیوں کر حکم بناتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم ہے پھر وہ اس کے بعد پلٹ جاتے ہیں اور وہ ایمان لانے والوں میں سے نہیں ہیں۔''

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ ﴾ ❷

''اور جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے حکموں کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے پس وہی لوگ کافر ہیں۔''

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ ﴾ ❸

''اور جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے حکموں کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے پس وہی لوگ ظالم ہیں۔''

نصرانیوں کے متعلق فرمایا:

﴿ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ ﴾ ❹

''اور انجیل والوں کو چاہیے کہ اس چیز کے مطابق فیصلہ کریں جس کو اللہ نے انجیل میں اتارا ہے اور جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے حکموں کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے پس وہ لوگ فاسق ہیں۔''

قرآن مجید میں ہر جگہ انجیل کو واحد ذکر کیا گیا ہے اور یہ وہ کتاب ہے جو حضرت عیسیٰ پر خدا کی طرف سے اتاری گئی تھی۔ اس سے بظاہر یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انجیل بھی قرآن مجید کی طرح ایک آسمانی کتاب ہوگی جس میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے ہم کلام ہوا تھا اور آپ کے ذریعہ دنیا والوں کو رشد و ہدایت کا پیغام بھیجا تھا۔ مگر اس وقت عیسائیوں کے ہاں جو انجیلیں رائج ہیں ان کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا درجہ قرآن مجید کے برابر نہیں ہے بلکہ

---

❶ ۵/المائدۃ:۴۳۔ ❷ ۵/المائدۃ:۴۴۔ ❸ ۵/المائدۃ:۴۵۔
❹ ۵/المائدۃ:۴۷۔

ان کی حیثیت سیرت اور تاریخ کی کتابوں کی ہے۔ کیونکہ یہ چاروں انجیلیں حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد آپ کے چار حواریوں کی لکھی ہوئی ہیں جن میں سے دو یعنی متی اور یوحنا نے آپ کی صحبت پائی تھی اور باقی دو یعنی مرقس اور لوقا نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ ان چاروں نے اپنے اپنے اسلوب کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض اقوال و افعال و احوال اور معجزات قلمبند کیے ہیں اور ان کے تمام حالات کا استقصاء نہیں کیا ہے۔ ان انجیلوں کے پڑھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے۔ بلکہ وہ حضرت عیسیٰ کے ارشادات ہیں جن کو ان کے حواریوں نے قلمبند کیا ہے۔ ان میں حضرت عیسیٰ کے الفاظ کی بھی کوئی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ دیکھے یا سنے ہوئے واقعات کو اپنی اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے۔ بہت کم فقرے اور جملے ایسے ہوں گے جن کو حضرت عیسیٰ کی طرف نسبت دی جا سکتی ہو۔ ایسی حالت میں عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہ یہ انجیلیں منزل من اللہ یعنی اللہ کی طرف سے اتاری ہوئی ہیں۔ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

امام ابن تیمیہ نے اناجیل اربعہ کی اس حیثیت کو مختلف جگہوں پر نمایاں کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''اب رہ گئی وہ انجیل جو ان عیسائیوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے متعلق خود انہی کو اعتراف ہے کہ اس کو حضرت مسیح علیہ السلام نے نہیں لکھا اور نہ انہوں نے اس کو کسی پر املاء کروایا۔ بلکہ حضرت مسیح کے اٹھائے جانے کے بعد اس کو متی اور یوحنا نے لکھوایا تھا۔ یہ دونوں حضرت مسیح کے ساتھی تھے۔ ان کو بہت سے ایسے لوگوں نے حفظ نہیں کیا تھا جن کی تعداد تواتر کو پہنچ جائے۔ ان کے بعد مرقس اور لوقا نے اپنی اپنی انجیلیں لکھیں۔ ان دونوں نے حضرت مسیح کو نہیں دیکھا تھا۔ ان سب نے حضرت مسیح کی کہی ہوئی صرف چند باتوں اور خبروں کو ذکر کیا ہے۔ انہوں نے آپ کے تمام اقوال و افعال قلمبند نہیں کیے ہیں دو یا تین چار آدمیوں کے نقل کرنے میں غلطی کا امکان ہے۔ خاص کر اس حالت میں جب کہ خود لکھنے والوں کو حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کے متعلق شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ [1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

---

[1] الجواب الصحیح: ۱/ ۳۶۸، ۳۶۹۔

''اب رہ گئیں وہ چار انجیلیں جو اس وقت نصرانیوں کے ہاتھوں میں پائی جاتی ہیں اور جن کو متی و یوحنا اور مرقس و لوقا نے لکھا تھا۔ ان کے متعلق خود ان عیسائیوں کا اتفاق ہے کہ لوقا اور مرقس نے حضرت مسیح کو نہیں دیکھا۔ صرف متی و یوحنا نے انہیں دیکھا تھا اور یہ چاروں مقالات جن کو یہ لوگ انجیل کا نام دیتے ہیں اور بعض وقت ان کو علیحدہ علیحدہ انجیل مانتے ہیں حضرت عیسیٰ کے اٹھائے جانے کے بعد حواریوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور نہ یہ موجود ہے کہ ان کو حضرت مسیح نے خدا کی طرف سے لوگوں تک پہنچایا ہے۔ انہوں نے حضرت مسیح کے صرف چند اقوال و افعال و معجزات بیان کیے ہیں۔ یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے اس میں ہر وہ چیز لکھ دی ہے جو انہوں نے حضرت عیسیٰ سے دیکھی یا سنی تھی تو پھر ان انجیلوں کا درجہ حدیث و سیرت و مغازی کا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے اقوال و افعال قرآن مجید کا درجہ نہیں رکھتے اس سے معلوم ہوا کہ یہ چاروں انجیلیں جو اس وقت ان عیسائیوں کے ہاتھوں میں پائی جاتی ہیں محض سیرت اور حدیث کی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ [1]

کیا حواری معصوم ہیں؟

نصرانیوں کا اعتقاد یہ تھا کہ حواری اللہ کے رسول ہیں۔ ان کی حیثیت بھی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی ہے۔ اس لیے وہ جو کچھ بھی پیغام دنیا والوں کو پہنچاتے ہیں۔ اس کا ماننا دنیا والوں کے لیے ضروری ہے۔ اس پر امام ابن تیمیہ نے تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نصرانی حواریوں کو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی طرح رسول سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ وہ معصوم ہیں اور انہوں نے تورات اور انجیل ہم تک پہنچائی ہے اور انہوں نے بہت سے معجزے دکھائے تھے اور ہم سے کہا تھا کہ یہ تورات اور انجیل ہے، ان کو لو۔ نصاریٰ کو یہ اقرار ہے کہ وہ حواری رسول تھے نبی نہیں تھے۔ جب وہ نبی نہیں ہیں تو پھر معصوم بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بڑے بڑے اولیاء اللہ بھی خوارق عادات دکھانے کے باوجود معصوم نہیں ہوتے۔ مسلمانوں کے نزدیک حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت

---

[1] الجواب الصحیح ۲/ ۱۰۔

علی وغیرہ حواریوں سے بھی افضل ہیں۔ اس کے باوجود ان کو معصوم نہیں مانتے۔ معصوم وہی ہو سکتا ہے جو نبی ہو۔ پھر ان نصرانیوں کا یہ دعویٰ کہ حواری اللہ کے رسول ہیں نبی نہیں ہیں۔ ایک متناقض دعویٰ ہے جس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دعویٰ اس اصل پر مبنی ہے کہ حضرت مسیح خدا ہیں اور حضرت مسیح کے رسول اللہ کے رسول ہیں۔ یہ اصل باطل ہے لیکن مناظرے اور مجادلے میں احسنِ اسلوب کا لحاظ کرتے۔ ہم ان سے دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں وہ ان کو اس وقت تک رسول ثابت نہیں کر سکتے تاوقتیکہ وہ حضرت مسیح کو خدا ثابت نہ کرلیں اور حضرت مسیح کا خدا ہونا صرف عقل یا سمع سے ثابت ہو سکتا ہے۔ ہماری عقل اس پر گواہی نہیں دیتی۔ یہ نصرانی عقل سے حضرت مسیح کے خدا ہونے کا ثبوت نہیں دیتے بلکہ ان کا خدا ہونا ممکن مانتے ہیں اور یہ دلیل بھی باطل ہے۔ اب رہ گیا سمع سے ان کا خدا ہونا ثابت کرنا تو وہ انبیا سے ایسے الفاظ نقل کرتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح خدا تھے۔ یہ دلیل بھی دیگر سمعی دلائل کی طرح باطل ہے کیونکہ حضرت مسیح کا خدا ہونا صرف ان کتابوں ہی سے ثابت کیا جا سکتا ہے اور ان کتابوں کی صحت کا ثبوت اس پر موقوف ہے کہ حواروں کو اللہ کا معصوم رسول ثابت کیا جائے اور یہ اس بات پر موقوف ہے کہ پہلے حضرت مسیح کی الوہیت ثابت کی جائے اس سے دور لازم آتا ہے اور یہ محال ہے کیونکہ حضرت مسیح کی الوہیت صرف ان کتابوں کی صحت کے بعد ثابت ہو سکتی ہے۔ اور کتابوں کی صحت اس بات کے ثابت کرنے پر موقوف ہے کہ حواری اللہ کے معصوم رسول ہیں اور وہ معصوم رسول اس وقت تک نہیں ہو سکتے جب تک کہ حضرت مسیح کی الوہیت ثابت نہیں کی جائے۔ اس سے دور لازم آتا ہے جو محال ہے۔" [1]

اناجیل میں تحریف

قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور خود اس کا اسلوب اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ وہ تمام تر اللہ کا کلام ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو لوگوں تک پہنچایا اور اپنی زندگی میں اس کے بقاء استحکام کی پوری تدبیر کر دی تھی۔ سینکڑوں صحابہ نے اس کو حفظ کر لیا تھا۔ وہ بار بار نمازوں میں اعلانیہ دہرایا جاتا تھا۔ قرآن مجید کے الفاظ متواتر ایک دوسرے سے نقل

---

[1] الجواب الصحیح: ۱/ ۳۶۹۔۳۷۰۔

ہوتے چلے آئے ہیں۔اس میں سے ایک نقطہ تک بدلنے کی گنجائش نہیں ہے مگر اناجیل اربعہ کا یہ حال نہیں ہے۔عیسائیوں کے پاس حواریوں سے اوپر ان کے الفاظ کی کوئی متواتر نقل موجود نہیں ہے۔چنانچہ امام ابن تیمیہ ان دونوں کا فرق دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

عیسائیوں کے پاس ان انجیلوں کے الفاظ کی حضرت مسیح سے کوئی متواتر روایت موجود نہیں ہے اور نہ ان کے احکام وعقائد کی جن پر وہ قائم ہیں کوئی متواتر نقل موجود ہے۔ یہودیوں کے پاس بھی تورات کے الفاظ اور انبیا کی پیشگوئیوں کی کوئی متواتر نقل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف قرآن مجید اور شریعت اسلامیہ کی متواتر نقل موجود ہے جس کو ہر عام وخاص آدمی جانتا ہے۔ [1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

قرآن مجید کے الفاظ اور معانی نبی کریم ﷺ سے متواتر نقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ ان پر ساری امت کا اجماع ہے۔اسی طرح آپ کی سنت بھی متواتر نقل ہوتی آرہی ہے۔نیز آپ کے بہت سے حالات اور واقعات بھی مذکور ہیں۔جن کی صحت مختلف طریقوں سے ثابت ہوتی ہے۔جیسے ساری امت کا اس کی تصدیق پر اتفاق کر لینا اور عادتوں کا دلالت کرنا وغیرہ۔اس کے علاوہ قرآن مجید مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ ہے اور اس کا حفظ کسی لکھی ہوئی کتاب پر موقوف نہیں ہے۔اگر خدانخواستہ سارے مصاحف دنیا سے ناپید ہو جائیں تب بھی اس سے ان کے حفظ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔اس کے برخلاف اگر انجیل کے نسخے معدوم ہو جائیں تو عیسائی اس کو دوبارہ پیش نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے پاس اس کے الفاظ کی کوئی متواتر نقل موجود نہیں ہے۔انجیل کے چند ہی حافظ پائے جاتے ہیں جن کے حفظ پر کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔یہی وجہ ہے کہ عہد نبوت کے بعد سے اس میں تحریف وتبدیل ہوتی آرہی ہے۔کیونکہ ان کے پاس مسلمانوں کی طرح نہ تو روایات میں سند کا سلسلہ ہے اور نہ اسماء الرجال ہی کا فن ہے جس کے ذریعہ روایت کی صحت اور عدم صحت کے سلسلہ میں جرح وتعدیل کی جا سکتی ہو۔ [2]

---

[1] ایضا: ۳۷۲ [2] الجواب الصحیح: ۲/ ۱۲۔۱۳

اناجیل میں تحریف

قرآن مجید میں کئی جگہ یہودیوں اور نصرانیوں کو یہ الزام دیا گیا ہے کہ وہ اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں اور اللہ کے کلام کو بدل دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا:

﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ [1]

''کیا تمہیں یہ حرص ہے کہ وہ تم پر ایمان لائیں گے ان میں سے ایک فریق اللہ کا کلام سنتا تھا پھر اس کو بدل دیتا تھا۔ بعد اس کے کہ اس کو سمجھ لیتا تھا اور وہ جانتے بھی نہیں۔''

یہودیوں کے متعلق فرمایا:

﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ﴾ [2]

''وہ کلموں کو ان کی جگہ سے بدل دیتے ہیں۔''

﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ [3]

''وہ کلموں کو ان کی جگہ سے بدل دیتے ہیں۔''

﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ﴾ [4]

''یہودیوں میں سے بعض کلموں کو ان کی جگہ سے بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی اور تم سنو بے سنے ہوئے اور اپنی زبانوں کو موڑ کر اور دین میں طعن کرتے ہوئے رَاعِنَا کہتے ہیں۔

مگر مذکورہ بالا آیت تحریف کتاب سے تعلق نہیں رکھتی ہے بلکہ آنحضرت ﷺ سے گفتگو کرتے وقت بعض الفاظ کو بدل کر کہنے سے متعلق ہے۔ مثلاً یہودی زبان کو موڑ کر رَاعِنَا (ہمارا لحاظ رکھ) کی بجائے رَاعِیْنَا (ہمارا چرواہا) کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سوء ادب کی

---

[1] ٢/البقرۃ:٧٥۔ [2] ٥/المائدۃ:١٣۔ [3] ٥/المائدۃ:٤١۔
[4] ٤/النساء:٤٦۔

مذمت کی اور کہا ہے اگر یہ لوگ رَاعِنَا کو چھوڑ کر سَمِعْنَا (ہم نے سنا) وَاَطَعْنَا (ہم نے اطاعت کی) وَاسْمَعْ (دیکھ) وَانْظُرْنَا (اور ہم پر نظر ڈال) کہتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

تورات وانجیل کے الفاظ کی تحریف کے متعلق قرآن مجید میں صراحت سے کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ یہودی اور نصرانی اللہ کے کلام کو بدل دیتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تحریف وتبدیل لفظی ہے یا معنوی۔ امام ابن تیمیہ کا خیال ہے کہ ان کتابوں میں لفظی تحریف بہت ہی جزوی ہوئی ہے۔ تحریف زیادہ تر معانی میں ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

یہودیوں نے پہلی کتاب یعنی تورات کے معانی بدلے اور دوسری کتاب یعنی انجیل کی تکذیب کی۔ اسی طرح نصرانیوں نے تورات اور انجیل کے معانی بدلے اور قرآن مجید کی تکذیب کی۔ اس کے باوجود ان نصرانیوں کا دعویٰ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس کی تمام کتابوں کے الفاظ کی تصدیق کی ہے۔ جمہور مسلمین ان کے اس دعوے کو نہیں مانتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ان کے بعض الفاظ بدل دیے گئے ہیں جس طرح ان کے بہت سے معانی بدل دیے گئے ہیں۔ اور مسلمانوں میں سے بعض کا خیال ہے کہ تبدیلی معانی میں ہوئی ہے نہ کہ الفاظ میں۔ اس قول کو عام یہودی اور نصرانی بھی مانتے ہیں۔ ان دونوں اقوال کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق میں ان کے لیے کوئی حجت نہیں ہے کہ ان کا باطل دین ٹھیک ہے۔ کیونکہ ان کے پاس جو کتب الٰہیہ ہیں وہ ان باتوں کی صحت پر دلالت نہیں کرتی ہیں جن کی بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنا ہے۔ اس لیے کہ ان کے پاس کی کتابوں سے نصی یا ظاہری طور پر اس امانت کی تصدیق نہیں ہوتی جو ان کے دین کی اصل قرار دی گئی ہے۔ ان میں تثلیث و اتحاد وحلول کا بھی ثبوت نہیں ہے اور یہ کتابیں ان کی شریعت کی اکثر باتوں پر بھی دلالت نہیں کرتیں جیسے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا۔ سور اور مردار گوشت کی جیسی حرام چیزوں کا حلال کر لینا وغیرہ۔ [1]

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ”عیسائیوں کا یہ خیال کہ مسلمان ان تمام کتابوں کے الفاظ کی

---

[1] الجواب الصحیح: ۱/ ۳۷۳۔۳۷۴۔

مکمل تبدیلی کا دعویٰ کرتے ہیں جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں ٹھیک نہیں ہے۔ میں جہاں تک جانتا ہوں مسلمانوں میں سے کسی کا بھی یہ قول نہیں ہے۔ [1]

پھر اس پر مزید بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دوسری فاسد اصل جس کے اوپر ان عیسائیوں نے مسلمانوں کی جانب سے ایک سوال کی بنیاد رکھی اور پھر اس کا جواب دیا یہ ہے کہ مسلمان کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کی بعثت کے بعد جتنے بھی ان کتابوں کے نسخے پائے جاتے ہیں ان سب کے الفاظ بدل دیے گئے ہیں۔ یہ مسلمانوں کا قول نہیں ہے۔ مگر ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ بعثت محمدی کے بعد بعض نسخوں کے الفاظ بدل دیے گئے ہیں۔ اور جو لوگ اس کے قائل ہیں ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ بعثت محمدی سے پہلے ہی ان میں تحریف ہو چکی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ بعثت کے بعد نسخوں میں تبدیلی ہوئی ہے، بعض دونوں کو ثابت کرتے ہیں اور جائز قرار دیتے ہیں لیکن کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ زمین کے تمام مشرقی اور مغربی حصوں کے تمام نسخوں کے الفاظ بدل دیے گئے ہیں۔ جیسا کہ حکایت کرنے والے نے حکایت کی ہے۔ مگر مسلمانوں اور اہل کتاب کے علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کتابوں کے معانی اور تفاسیر میں تحریف ہوئی ہے۔ اہل کتاب کا ہر ایک فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے فرقے نے تحریف و تبدیل کی ہے۔ اب رہا کتاب کے الفاظ کا معاملہ تو علمائے مسلمین کی ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ ان کتابوں کے الفاظ بدلے نہیں گئے ہیں جیسا کہ اہل کتاب کا دعویٰ ہے۔ علمائے مسلمین اور اہل کتاب میں سے اکثر یہ کہتے ہیں کہ ان کے بعض الفاظ بدلے گئے ہیں اور اکثر علمائے مسلمین کا بھی یہی قول ہے۔ اکثر اہل کتاب کے علما بھی یہی بتاتے ہیں۔ نصاریٰ کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ حضرت مسیح کا مشابہ آدمی سولی پر چڑھایا گیا جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے۔ پس جن لوگوں نے سولی کی روایت کی وہ ظاہری واقعہ کو دیکھ کر بیان کیا یا بعض لوگوں نے عمداً جھوٹ کہا پھر ان لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ان کتابوں میں سے بعض الفاظ جو بدل دیے گئے ہیں اور

---

[1] الجواب الصحیح ١/ ٣٧٤۔

بعض تورات اور انجیل کے اکثر الفاظ کو محرف قرار دیتے ہیں۔ بعض مبدل الفاظ کو غیر مبدل الفاظ کی بہ نسبت زیادہ قرار دیتے ہیں۔ خاص کر انجیل کے بارے میں۔ کیونکہ تورات سے زیادہ انجیل میں تبدیلی ہوئی ہے۔ بعض اس حد تک اسراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کتابوں میں سے کوئی حصہ بھی مقدس نہیں ہے۔ اس سے استنجا کرنا جائز ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ وہ الفاظ جن میں تبدیلی ہوتی ہے بہت ہی کم ہیں یہی قول کھلا ہوا اور ظاہر ہے۔ تورات کی بہ نسبت انجیل میں زیادہ تبدیلی ہوئی ہے۔ بلکہ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان انجیلوں میں اللہ کا کلام ہی نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو بہت تھوڑا ہے۔ اور وہ انجیل جو واقعی اللہ کا کلام ہے یہ انجیلیں نہیں ہیں۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ تورات اور انجیل جو اہل کتاب کے ہاتھوں میں ہے۔ ان میں بعض آیتیں ایسی ہیں جن میں اللہ کا حکم موجود ہے۔ اگر چہ اس کے بعض الفاظ میں تبدیلی ہو چکی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ﴾ [1]

''اور کس طرح یہودی تجھ کو حکم بناتے ہیں حالانکہ ان کے نزدیک تورات ہے جس میں اللہ کا حکم ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ وہ تورات جو بخت نصر کے بیت المقدس کو تباہ کرنے کے بعد ان کے پاس موجود تھی یا حضرت مسیح یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ان کے ہاں پائی جاتی تھی اس میں اللہ کا حکم موجود تھا۔ اور وہ تورات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مدینہ کے یہودیوں کے پاس تھی اگر چہ اس کے بعض الفاظ بدل دیے گئے تاہم ہم یہ کبھی گواہی نہیں دے سکتے کہ دنیا بھر کے تمام نسخوں میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ یہ بات ہم کو معلوم نہیں ہے بلکہ ان کا معلوم کرنا دشوار اور ناممکن ہے۔ [2]

انجیل کے متعلق بھی امام ابن تیمیہ کی یہی رائے ہے کہ اس میں اللہ کا حکم موجود ہے قرآن مجید اور سنت متواترہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ تورات اور انجیل جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی باتیں موجود تھیں اور دنیا بھر کے

---

[1] ۵/المائدة:۴۳۔ [2] الجواب الصحيح:۱/ ۳۷۹۔۳۸۱۔

نسخوں کے متعلق قطعی طور پر تبدیلی کا فتویٰ دینا دشوار ہے۔ ہم کو اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہمیں اس کا علم ہے۔ [1] جمہور مسلمین کا مسلک بھی یہی ہے کہ ان کتابوں کے صرف الفاظ کی تبدیلی ہوئی ہے۔ [2]

نصرانیوں کی گمراہی کا سبب

تورات اور انجیل میں کوئی تعلیم ایسی نہیں ہے جو قابل اعتراض ہو۔ البتہ ان میں بعض الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں جن کے درحقیقت اصلی معنی مراد نہیں لینے چاہیے۔ جیسے کہ باپ، بیٹا اور روح القدس کا لفظ ہے یہ کلمے قرب و محبت کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ ان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں۔ عیسائیوں کی گمراہی کا ایک بہت بڑا سبب یہی ہے کہ انہوں نے ان متشابہ الفاظ کے حقیقی معنی مراد لیے اور ان کے اندر باطل تاویلات سے کام لیا۔ [3] انہوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کے بہت سے الفاظ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا اور ان کے معانی بدل دیے۔ حالانکہ ان آسمانی کتابوں کے سمجھنے کے لیے ان انبیا کی زبان اور اصطلاحات کا سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام نے جس زبان میں ہمیں مخاطب کیا اس کا ٹھیک طور پر سمجھنا اور ان کے کلام کا ان کی زبان کے مطابق معنی اور مطلب لینا ایک ضروری اور متعین چیز ہے۔ اور جو شخص اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرا کوئی راستہ اختیار کرے گا۔ وہ لازمی طور پر ان کے کلام کو ان کی جگہ سے ہٹا دے گا اور ان پر جھوٹ اور تہمت باندھے گا۔ تمام مسلمانوں، یہودیوں اور نصرانیوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان تینوں مذہب کے بہت سے لوگ اس معنیٰ کر کے تحریف و تبدیل کے مرتکب ہوئے ہیں۔ تورات اور انجیل میں اسی قسم کی تبدیلی کی ہے۔ اہل کتاب نے انبیا سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اب (باپ) اور ابن (بیٹا) کے لفظ استعمال کیے ہیں۔ اب سے ان کی مراد رب اور ابن سے مصطفیٰ و مختار و محبوب تھی۔ ان میں سے کسی نے انبیا سے یہ نقل نہیں کیا ہے کہ انہوں نے خدا کی کسی صفت کو ابن قرار دیا ہے اور اس کی صفتوں میں سے یہ نہیں گنایا

---

[1] الجواب الصحیح: ۱/ ۳۹۳۔ [2] ایضًا: ۲/ ٤۔
[3] ایضًا جزء: ۱/ ۳۲۸۔

ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہے یا اس کا کوئی باپ ہے۔ اگر حضرت مسیح کے کلام میں اس قسم کے کوئی الفاظ پائے جائیں تو خدا کی قدیم اور ازلی صفت کو ابن سے تفسیر کرنا درحقیقت حضرت مسیح پر کھلا جھوٹ بولنا ہے۔ کیونکہ ان کی زبان میں ابن سے خدا کی قدیم اور ازلی صفت مراد نہیں ہوتی تھی اسی طرح انبیا علیہم السلام کے کلام میں اللہ تعالیٰ کی صفت حیات کو روح القدس کے لفظ سے کبھی تعبیر نہیں کیا گیا۔ ان کی زبان اور اصطلاح میں روح القدس سے وہ ذات مراد تھی جس کو اللہ تعالیٰ انبیا و صالحین پر اتارتا تھا اور اس کے ذریعہ ان کی تائید کرتا تھا۔ اگر حضرت مسیح کے کلام میں کوئی روح القدس سے خدا کی صفت حیات مراد لے تو یہ حضرت مسیح پر جھوٹ ہوگا۔ [1]

عیسائیوں کی گمراہی کا ایک دوسرا سبب یہ تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کے بعد کے حواریوں اور مسیحی راہبوں اور عالموں کو معصوم سمجھا۔ انہوں نے جو کچھ کہہ دیا یا لکھ دیا اس کو مان لیا۔ اور یہ سمجھ لیا اس میں نقد و تنقید کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ صالحین کے ہاتھوں سے خوارق عادات کے صدور کو دلیل بنا کر ان صالحین کو معصوم قرار دینا ٹھیک نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

حوارین کی طرح بعض صالحین کے ہاتھوں سے خوارق عادات کا صدور ہوسکتا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ انبیا کی طرح معصوم ہوں۔ کیونکہ انبیا اپنی تبلیغ میں معصوم ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق حق کے سوا کوئی اور بات بولیں گے۔ یا ان کے کلام میں عمداً یا سہواً کوئی خطا ہمیشہ کے لیے باقی رہے گی۔ لیکن صالحین کے متعلق یہ بات نہیں ہے۔ خوارق عادات کے ظہور کے باوجود ان سے غلطی ہوسکتی ہے۔ غلطی کا مرتکب ہونا ان کو صالح ہونے سے نہیں روکتا۔ اس کی وجہ سے ان کا معصوم ہونا لازمی نہیں ہے۔ کیونکہ انہوں نے کبھی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ کوئی ایسی نشانیاں پیش کیں جو اس کی عصمت پر دلالت کرتی ہوں۔ اگر ان میں سے کوئی عصمت کا دعویٰ کرے اور وہ نبی نہ ہو تو وہ یقیناً جھوٹا ہے۔ اس کا جھوٹ ظاہر ہو کر رہے گا۔ ایسے جھوٹوں کے ساتھ شیطان ہو جاتے ہیں اور ان کو گمراہ کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔" کیا

---

[1] الجواب الصحیح ۳/ ۱۸۱، ۱۸۲۔

تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں۔ ہر جھوٹے گناہگار پر اترتے ہیں۔'' (۲۶/شعراء:۱۱)

انجیلوں میں منقول ہے کہ وہ شخص جو سولی پر چڑھایا گیا اور دفن کیا گیا۔ اپنی قبر سے دو یا تین مرتبہ باہر نکلا اور لوگوں کو مسامیر کی جگہ بتائی۔ اس کو بعض حواریوں نے دیکھا اور بیان کیا کہ اس شخص نے کہا: مجھ کو شیطان مت سمجھو۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو وہ شخص لازمی طور پر شیطان تھا جس نے مسیح ہونے کا دعوی کیا اور لوگوں کو شک اور شبہ میں ڈال دیا۔ ہمارے زمانہ میں اور اس سے پہلے اس قسم کے بہت سے واقعات پیش آئے ہیں۔ حال میں تدمر کے لوگوں نے ایک شخص کو ہوا میں کئی مرتبہ مختلف لباس میں اڑتا ہوا دیکھا اور اس نے دعویٰ کیا کہ وہ مسیح ہے اور پھر انہیں ایسی باتوں کا حکم دیا جن کا حضرت مسیح کسی کو حکم نہیں دے سکتے تھے۔ ❶

اس سلسلے میں امام ابن تیمیہ نے کئی مثالیں دی ہیں۔ مثلاً ایک شخص اپنی قبر سے اچانک اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور لوگوں سے بات چیت کر کے پھر اپنی قبر کے اندر چلا جاتا ہے۔ کبھی لوگ اس مرے ہوئے آدمی کو پیدل یا سوار کسی راستے سے گزرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ لوگ اس کا پیچھا کرتے ہیں مگر وہ غائب ہو جاتا ہے۔ کبھی مرنے والا وصیت کر جاتا ہے کہ اس کے رشتہ داروں میں سے کوئی اسے غسل نہ دے، کوئی راہ چلتا آئے گا اور اسے غسل دے جائے گا۔ مگر اسی کی صورت کا کوئی شخص آتا ہے اور اس کو غسل دے جاتا ہے۔ لوگ اس مرے ہوئے آدمی کی ولایت و کرامت کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ امام موصوف کہتے ہیں کہ درحقیقت یہ شیطان ہوتا ہے جو مختلف صورتیں اختیار کر کے عوام کو دھوکہ دے جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات زیادہ تر ہندوستان جیسے شرک و بت پرستی کے ممالک میں پیش آتے ہیں۔ انہوں نے خود اپنے متعلق یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ دور دراز ممالک کے رہنے والے لوگوں نے امام موصوف کو ان کے پاس آتے ہوئے دیکھا اور ان سے بات چیت کی حالانکہ وہ مصر میں قیدی تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ شیطان نے ان کی صورت اختیار کی اور لوگوں کو دھوکہ دیا۔ ❷

اسلام اور مسیحیت کا فرق

اسلام کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ شروع سے لے کر اب تک اپنی اصلی صورت

---

❶ الجواب الصحیح ۱/ ۳۲۹، ۳۳۰۔ ❷ ایضاً۔

پر باقی رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی میں قرآن مجید کو اس کی اصلی صورت اور شکل میں صحابہ کے سامنے پیش کیا۔ ان سب نے اس کی پوری حفاظت کی اور پھر جب آنحضرت کا انتقال ہوا تو صحابہ نے اپنی زندگی کے ہر ایک مشکل مسئلہ میں قرآن ہی سے ہدایت لی۔ مسلمان اپنے آپ کو اس کا ہرگز حقدار نہیں سمجھتے تھے کہ شریعت اسلامیہ میں سے کسی چیز کو گھٹا یا بڑھا سکیں، اگر کسی نے سرمو کچھ انحراف بھی کیا تو علمائے حق نے پوری بے باکی اور آزادی کے ساتھ اس کو ٹوکا۔ اس طرح شریعت اسلامیہ کے اوامر ونواہی اور اس کی دیگر ہدایات اپنی اصلی صورت میں محفوظ رہ گئیں۔ مگر مسیحیت اپنی اصلی صورت پر باقی نہیں رہ سکی۔ مسیحی علما واحبار نے اپنی شریعت کی ہر ایک چیز کی بنیاد تورات وانجیل کے کھلے نصوص اور الفاظ پر نہیں رکھی۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا مسیحی شریعت اپنی اصلیت سے دور ہوتی چلی گئی اور جب آپس میں اختلاف ہوا تو نصرانی تورات وانجیل کے کھلے الفاظ کے مطابق فیصلہ کرنے کی بجائے اپنے رسولوں، قسیسوں اور راہبوں کی تعلیمات وارشادات کی پیروی کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تورات وانجیل کی اصلی تعلیمات بہت جلد ختم ہو گئیں۔ اور مسیحی رسولوں، قسیسوں اور راہبوں کے بیانات اور فیصلوں نے ان کی جگہ لے لی۔ عام نصرانیوں نے ہر اس چیز پر آمنا وصدقنا کہہ دیا جس پر ان مسیحی علما واحبار کا متفقہ فیصلہ ہوتا تھا۔ گنتی کے چند مسیحی علما نے ان متفقہ فیصلوں کی سخت مخالفت کی مگر اکثریت کے فیصلہ کے مقابلے میں ان کی کچھ نہیں چل سکی۔ ان کو ملعون ومردود قرار دے کر ان کو قوم کی نظروں سے گرا دیا گیا۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ محمد ﷺ کے بعد آپ کی شریعت میں سے کسی چیز کو بھی بدلیں۔ وہ اس چیز کو بھی حلال نہیں کر سکتے جس کو ان کے پیغمبر نے حرام کیا ہے یا اس چیز کو حرام نہیں کر سکتے جس کو ان کے نبی نے حلال قرار دیا ہے۔ اسی طرح وہ اس چیز کو واجب قرار نہیں دے سکتے جس کو ان کے رسول نے ساقط فرما دیا ہے۔ اور اس چیز کو ساقط نہیں کر سکتے جس کو ان کے شارع نے واجب بتایا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک حلال وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حلال قرار دیا ہے اور حرام وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول

نے حرام قرار دیا اور دین وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے مشروع کیا۔ بخلاف ان نصرانیوں کے جنھوں نے مسیح علیہ السلام کے بعد بہت سی نئی چیزیں جاری کر دی ہیں۔ حضرت مسیح نے ان کی کبھی اجازت نہیں دی ہے موجودہ انجیلیں بھی ان کی صحت پر گواہی نہیں دے رہی ہیں۔ پرانے انبیا کی شریعتوں سے بھی ان کا ثبوت نہیں ہے۔ ان نصرانیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جن چیزوں کو ان کے اکابر دین جائز قرار دے دیتے ہیں حضرت مسیح بھی ان کو جائز قرار دے دیتے ہیں۔ اس بارے میں مسلمانوں یہودیوں اور نصرانیوں کا کھلا ہوا اختلاف ہے۔ یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو خود اپنی جاری کی ہوئی شریعت میں سے کسی کے بدلنے کا حق نہیں ہے۔ اس کے برخلاف نصرانی یہ کہتے ہیں کہ اکابر دین اپنی رائے سے خدا کے دین کو بھی بدل سکتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خلق اور امر اللہ ہی کا حق ہے وہی شریعت، شریعت حقہ متصور ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ نے جاری کیا ہے۔ اس کو اختیار ہے کہ اپنی ہی جاری کی ہوئی شریعت میں سے کسی چیز کو منسوخ کر دے۔ جیسے کہ اس نے حضرت مسیح کے ذریعہ پرانے انبیا کی شریعت کی بعض چیزوں کو منسوخ کر دیا تھا۔ نصرانیوں کے عقائد اور ان کی شریعت تمام تر ان کے اکابر دین کی بنائی ہوئی ہے جو حضرت مسیح کے بعد اس دنیا میں آئے۔ مثلاً رومی شہنشاہ قسطنطین [1] کے زمانے میں تین سو اٹھارہ پادریوں نے مل کر ایک متفقہ محضر [2] تیار کیا تھا جس کی اریوسیوں [3] نے مخالفت کی تھی۔ مگر ان کو ملعون قرار دیا گیا۔ اس محضر میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی تائید خدا کی اتاری ہوئی کتابوں سے نہیں ہوتی۔ تمام آسمانی کتابیں ان باتوں کی مخالف ہیں بلکہ وہ صریحی طور پر عقل کے بھی خلاف ہیں۔ [4]

---

[1] قسطنطین ۲۸۸ء میں پیدا ہوا اور ۳۳۷ء میں وفات پائی۔ [2] قسطنطین نے مسیحی عقائد کے تصفیہ کے لیے ۳۲۵ء میں نیقومیدیہ میں ایک عام مجلس بلائی تھی۔ [3] اریوس (Arius) (المتوفی: ۳۳۶ء) کے پیرو جو حضرت مسیح کے مخلوق ہونے کے قائل تھے۔ اریوس اشلا (Achillas) بطریق اسکندریہ کا ساتھی تھا۔ جب الاکطندروس (Alexander) اس کا جانشین ہوا تو اس نے اریوس کے خیالات کی سخت مخالفت کی اور اس کو اسکندریہ کے کنیسہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا اور اس پر لعنت کی تھی اور لوگوں سے یہ کہتا تھا کہ پطرس (Peters) سابق بطریق اسکندریہ نے شہادت پانے سے پہلے یہ کہا تھا کہ حضرت مسیح نے اریوس پر لعنت کی ہے، اس لیے تم لوگ بھی اس کو قبول نہ کرو اور اس کو کنیسا میں داخل ہونے مت دو (الجواب الصحیح جزء سوم صفحہ ۱۸) [4] ایضاً جزء اول صفحہ ۱۱۸)

مسیحی عقائد کی مجلس

مسیحی عقائد کے تصفیہ کی یہ پہلی مجلس ایشیائے کوچک کے قدیم شہر نیقومیدیہ (Nicomedia) میں ۲۰ مئی سے ۲۵ جولائی تک ۳۲۵ء میں ہوئی تھی۔ اس میں اریوسیوں کے عقائد وخیالات کی سخت ترین مخالفت کی گئی تھی۔ اریوس کو کافر اور مرتد قرار دے کر اس کو مسیحیت کے دائرے سے خارج کیا گیا تھا۔ اور اس پر لعنت کی گئی تھی مگر چند سال کے بعد اریوسیوں نے طاقت اور قوت حاصل کر لی۔ جس کی بنا پر رومی بادشاہ کو مسیحی عقائد کے تصفیہ کے سلسلے میں کئی مجلسیں بلانے کی ضرورت پڑی۔ ظہور اسلام سے پیشتر کئی عام مجلسیں ہوئی تھیں جن میں قسطنطنیہ کی پہلی مجلس (۳۸۱ء) میں اور دوسری مجلس (۵۵۹ء) میں اور افیس (Eph.Sub) کی پہلی مجلس (جون ۴۳۱ء) میں اور دوسری مجلس (اگست ۴۴۹ء) میں اور حلقدونیہ (Calehedon یا Chaleedon) کی مجلس (۱۸ اکتوبر ۴۵۱ء) بہت ہی اہمیت رکھتی ہیں۔ افسیس اور حلقدونیہ ایشیائے کوچک کے قدیم شہر ہیں جہاں یہ مجلسیں ہوئی تھیں۔ امام ابن تیمیہ نے سعید بن البطریق، بطریق اسکندریہ کی کتاب نظم الجوہر کے حوالہ سے ان مجالس کی تفصیلات دی ہیں [1] نیز حافظ ابن قیم نے بھی اپنی کتاب هداية الحيارى من اليهود والنصارى میں ان مجالس کے متعلق بحث کی ہے۔ [2]

اسلام کے آنے کے بعد بھی اس قسم کی مجلسیں امام ابن تیمیہ کے زمانہ تک اور ان کے بعد انیسویں صدی عیسوی تک ہوتی رہیں۔ حضرت معاویہ کے آخری عہد یعنی ۶۸۰ء میں قسطنطنیہ میں ایک مجلس ہوئی تھی اس کے بعد ۷۸۷ء میں نیقومیدیہ میں ایک دوسری مجلس ہوئی جس میں گرجاؤں کی مقدس تصاویر کے جواز اور عدم جواز پر بحث کی گئی تھی۔ ان تمام مجالس کا خاص وصف یہ تھا کہ مسیحی علما نے اپنے تمام دعاوی کی بنیاد تورات وانجیل کے کھلے ہوئے الفاظ ونصوص پر نہیں رکھی بلکہ ہر ایک نے اندھی تقلید سے کام لیا تھا۔ اس طرح سارا مسیح دین مسخ ہو کر رہ گیا۔ ہر فرقہ دوسرے کو کافر مرتد اور ملعون بتا رہا تھا۔ مسیحیوں کے تین مشہور فرقے تھے۔ یعنی ملکیہ، نسطوریہ اور یعقوبیہ۔ ملکیہ وہ لوگ تھے جو رومی بادشاہ قسطنطین کا عقیدہ رکھتے تھے۔

---

[1] الجواب الصحيح ۳/ ٤تا ٧٩۔ [2] هداية الحيارى صفحه: ١٤٧۔ ١٥٨۔

نسطوری وہ تھے جو عقائد میں نسطورس (Nestorious) (المتوفی: ۴۵۱ء) کے پیرو تھے۔ یعقوبیہ، یعقوب برادئی (Jacob Baradaus) (المتوفی: ۵۷۸ء) کے متبع تھے۔ ان میں سے ہر ایک فرقہ اپنے آپ کو برحق اور جنتی تصور کرتا تھا اور دوسرے کو باطل اور جہنمی خیال کررہا تھا۔ مسیحیوں کے اندر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو مسیحی دین کے اصل اور حقیقی اجزاء کو تلاش کررہے تھے۔ مگر انہیں کلیسائی الزام ارتداد کا اتنا خوف غالب تھا کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کو ظاہر نہیں کرسکتے تھے۔ کلیسائی عقائد پر اعتراض کرنا مسیحیت سے خارج ہونے کے مترادف تھا، اسی لیے بعض نصرانیوں نے مجبوراً اپنے دین کے اصلاح کی کوشش کرنے کی بجائے اپنا دین ہی بدل لیا۔

حسن بن ایوب کی مثال

اس سلسلے میں امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب میں حسن بن ایوب کی مثالیں دی ہیں جس نے مسلمان ہوجانے کے بعد اپنے بھائی علی بن ایوب کو ایک خط لکھا تھا۔ علی بن ایوب نے اپنے بھائی سے پوچھا تھا کہ تمہیں اسلام میں وہ کونسی بزرگی اور اپنے دین میں وہ کونسی خامی نظر آئی جس کی بنا پر تم نے اپنے آبائی دین مسیحیت کو چھوڑ کر ایک نئے دین اسلام کو قبول کرلیا۔ حسن بن ایوب نے اپنے اس خط میں اسی سوال کا صاف اور واضح جواب دیا ہے۔ اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح کلیسائی عقائد سے قدرتی طور پر اسے نفرت ہوچکی تھی۔ وہ تقریباً بیس سال سے مسیحی عقائد پر سوچ رہا تھا۔ جتنا بھی وہ سوچتا جارہا تھا اس کو ان مسیحی عقائد پر اطمینان حاصل نہیں ہورہا تھا۔ اس کے دماغ کے اندر ایک بڑی ذہنی کشمکش جاری تھی کہ آیا برسوں کی خاندانی محبت اور قومی اخوت کو چھوڑ کر اپنے گھر سے نکل جائے اور سب سے دور رہ کر خالص توحید کی زندگی بسر کرے یا اپنے ہی گھر پر رہ کر کلیسائی دین پر قانع ہوجائے۔ تورات، زبور، انجیل اور قرآن کو اس نے بار بار پڑھا اور نصرانیت کے متعلق جتنی بھی اس کو کتابیں مل سکتی تھیں ان سب کا مطالعہ کیا مگر اپنے آبائی دین میں اس کو دلی تشفی نہیں ہوسکی۔ آخر ایک دن چپکے سے اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دنیاوی جاہ وعزت اور مال و دولت چھوڑی

اور سچی نیت کے ساتھ اسلام کا دامن تھاما۔ اس کے ذریعہ اس کو وہ ہدایت ملی جو اس کو کسی اور جگہ سے نصیب نہیں ہوسکتی تھی۔ فالحمد لله الذی هدانا لهٰذا وماكن لنهتدى لو لا ان هدانا الله۔ [1]

حسن بن ایوب نے اس خط میں اریوسیہ، ملکیہ، نسطوریہ، یعقوبیہ وغیرہ کے خیالات و عقائد پر سخت تنقید کی ہے اور ان کے آپس کے تناقض کو واضح کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اریوسیہ اگرچہ خدا کی توحید کے قائل ہیں اور حضرت مسیح کے بندہ ہونے کے معترف ہیں تاہم وہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کررہے ہیں جس کی تمام انبیا نے بشارت دی ہے۔ اریوسیہ کا فرقہ حق سے قریب تر ہے۔ کیونکہ وہ دوسرے نصرانیوں کی طرح حضرت عیسیٰ کی ربوبیت (رب ہونے) یا نبوت (بیٹا ہونے) کے قائل نہیں ہیں۔ حضرت مسیح کی انجیل اور ان کے حواریوں کی تعلیمات پر حقیقی معنی میں اریوسی ہی عمل پیرا ہیں۔ ان کے اندر صرف یہی ایک نقص ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کو نہیں مانتے۔ [2] حسن بن ایوب نے موجودہ انجیل ہی سے اپنے زمانہ کے تمام نصرانی فرقوں کے عقائد وخیالات کی ایک ایک کرکے تردید کی ہے۔ [3] جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

اتحاد اور تثلیث کی تردید

حضرت مسیح چونکہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اس لیے نصاریٰ غلط فہمی اور جہالت کی بنا پر ان کو خدا کا لڑکا ماننے لگے جو انہوں نے ایک مرتبہ ان کو خدا کا لڑکا تسلیم کرلیا تو پھر انہیں خدا کی صفات حقیقیہ کا مظہر ماننا پڑا وہ مریم کی طرف سے انسان تھے اور خدا کی طرف سے اللہ تھے۔ ان کے اندر بیک وقت لاہوتی اور ناسوتی قوتیں موجود تھیں۔ گویا حضرت مسیح کے اندر لاہوت اور ناسوت کا اتحاد ہوگیا تھا۔ اتحاد عقلی اور نقلی دونوں حیثیت سے باطل ہے۔ کیونکہ ہماری عقل یہ کہتی ہے کہ لاہوت اور ناسوت کے اتحاد کے بعد نہ تو وہ لاہوت ہی باقی رہتا ہے اور نہ ناسوت ہی ہوتا ہے۔ دو مختلف طبیعتوں کے میل سے ایک تیسری مرکب طبیعت پیدا ہوتی

---

[1] الجواب الصحیح: ۲/ ۳۱۲۔۳۱۴۔

[2] الجواب الصحیح: ۲/ ۳۱۲۔ ۳۱۴۔ [3] ایضًا ۳۱۵۔ ۳۶۳۔

ہے جس کو عیسائی تسلیم نہیں کرتے۔ نقلی حیثیت سے غور کیا جائے تو موجودہ انجیل سے بھی اس عقیدے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے قرآن مجید میں اس نظریہ اتحاد کی تردید کی گئی ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ﴾ [1]

''بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جو یہ کہتے ہیں کہ بے شک اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے۔''

عیسائیوں کا ایک گروہ تثلیث یعنی تین خداؤں کا قائل تھا۔ باب بیٹا اور روح القدس یہ تین اشخاص لاہوتی تھے جن کو اقانیم ثلاثہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عیسائیوں کا یہ کہنا کہ انہوں نے خود اپنی طرف سے باپ، بیٹے اور روح القدس کی یہ نئی اصطلاحات نہیں بنائی ہیں۔ بلکہ تورات اور انجیل میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ نے اپنے حواریوں کو حکم دیا تھا کہ جاؤ اور لوگوں کو باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو۔

امام ابن تیمیہ نے کئی صورتوں سے اس نظریہ تثلیث کی تردید کی ہے۔ ابتدا ہی میں وہ لکھتے ہیں: ''ہمیں سب سے پہلے یہ بات جتانی ہے کہ انبیاعلیہم السلام کا کلام بہر حال حق اور سچ ہی ہوگا۔ ان کے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوسکتی۔ جس کا باطل ہونا صریح عقل سے معلوم ہو۔ اگرچہ عقل انبیا کے خبر دینے کے بغیر اس کو جاننے سے عاجز ہے۔ نبی کے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوسکتی جو دوسری جگہ بیان کی ہوئی چیز کے مناقض ہو۔ یا دوسرے انبیا کے کلام کے مخالف ہو۔ انبیا جو کچھ بھی بیان کریں گے وہ ہر حال میں حق اور سچ ہی ہوگا۔ ان کا بعض کلام بعض کی تصدیق کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ ہم انبیا کی پیش کی ہوئی ہر چیز پر ایمان لائیں۔ جو لوگ بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں وہ درحقیقت کافر ہیں۔ پس صریح عقل سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ انبیا سے صحیح طور پر نقل کی ہوئی بات کے ہرگز مخالف نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح بعض انبیا سے جو صحیح طور پر چیز منقول ہو وہ ہماری صریح عقل کے خلاف نہیں ہوسکتی۔ البتہ شرائع اور مناہج میں کچھ تھوڑا سا اختلاف ہوسکتا

[1] ۵/المائدۃ:۱۷۔

ہے۔ پس اللہ اور اس کے فرشتوں، ان کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کے متعلق انبیا جو کچھ بھی خبر دیں گے تو ان کے اندر تناقض ہرگز نہیں ہوسکتا۔ انبیا سے نقل کی ہوئی وہی باتیں حجت ہوں گی جن کا متن پوری سند کی ساتھ ہمیں معلوم ہے اور ہمیں اس کی اطلاع ہے کہ ان سے صحیح طور پر نقل کیا گیا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عبرانی زبان سے رومی، عربی، سریانی وغیرہ میں صحیح طور پر ترجمہ کیا گیا ہے اور اس پر مزید یہ کہ وہی معنی مراد لیے جارہے ہیں جو ان انبیا کا مقصود تھا۔ لیکن نصاری کے پاس ان تین مقدمات کے ثبوت کے لیے ان انبیا کے کلام سے کوئی دلیل نہیں ہے۔'' [1]

اس کے بعد امام موصوف نے سابقہ کتب آسمانی سے یہ ثابت کیا ہے کہ باپ، بیٹے اور روح القدس کے الفاظ دوسرے انبیا نے بھی استعمال کیے ہیں۔ اور جب خود عیسائیوں کے نظریہ کے مطابق ان دوسری جگہوں پر ان الفاظ کے اصلی معنی مراد نہیں ہیں تو پھر حضرت عیسیٰ کے بارے میں کیونکر لغوی معنی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ عیسائیوں نے محض اپنی نادانی کی بنا پر ان کے لغوی معنی مراد لے کر تین خدا بنا لیے۔

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾ [2]

''بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے یہ کہا کہ بے شک اللہ تین میں تیسرا ہے اور نہیں ہے کوئی معبود سوائے ایک معبود کے۔ اور اگر یہ لوگ اپنے کہے سے نہ رکیں گے تو البتہ ضرور ان میں سے ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا دردناک عذاب ملے گا۔''

تحلیل محرمات

قرآن مجید نے عام محرمات میں سے ان چار چیزوں کو خاص طور پر گنایا ہے۔ ارشاد باری ہوتا ہے۔

---

[1] الجواب الصحیح: ۲/ ۱۱۹، ۱۲۰۔ [2] ۵/المائدۃ: ۷۳۔

﴿حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃُ وَ الدَّمُ وَ لَحۡمُ الۡخِنۡزِیۡرِ وَ مَاۤ اُہِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ بِہٖ﴾ ❶

''تم پر مردار اور خون اور سور کا گوشت اور غیر اللہ کا نام پکارا ہوا حرام کر دیا گیا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطۡعَمُہٗۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّکُوۡنَ مَیۡتَۃً اَوۡ دَمًا مَّسۡفُوۡحًا اَوۡ لَحۡمَ خِنۡزِیۡرٍ فَاِنَّہٗ رِجۡسٌ اَوۡ فِسۡقًا اُہِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ بِہٖ ۚ﴾ ❷

''کہہ دے میری طرف جن چیزوں کے متعلق وحی آئی ہے ان میں سے کسی چیز کو کسی کھانے والے پر حرام نہیں پاتا مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت ہو کیونکہ وہ ناپاک ہے یا گناہ کی چیز ہو جس پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام لیا گیا ہو۔''

تورات میں بھی یہ چیزیں حرام تھیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی ان کو حرام قرار دیا تھا۔ لیکن آگے چل کر قسطنطین بادشاہ روم کے زمانہ میں پادریوں نے ان کو حلال کر لیا تھا۔ اس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ جب بیت المقدس کے یہودی قتل کے ڈر سے نصرانی ہونے لگے تو وہاں کے بطریق پال نے بادشاہ کو یہ رائے دی کہ ان یہودیوں کو سور کا گوشت کھلایا جائے اور جو بھی سور کا گوشت نہیں کھائے اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ ابھی تک یہودیت پر قائم ہے۔ کیونکہ تورات میں سور کا گوشت حرام ہے اور جو بھی اپنے پرانے دین پر قائم ہوگا۔ وہ کبھی سور کا گوشت نہیں کھائے گا۔ بادشاہ نے سوال کیا کہ اگر سور تورات میں حرام ہو تو پھر وہ مسیحیوں پر بھی حرام ہونا چاہیے۔ ہم کیونکر اس کو ذبح کر کے خود کھا سکتے ہیں اور دوسروں کو کھلا سکتے ہیں۔ بطریق پال نے جواب دیا کہ حضرت مسیح نے تورات کی ہر چیز کو باطل اور منسوخ قرار دے دیا ہے اور وہ ایک نئی شریعت اور نئی تورات لے آئے ہیں جس کو انجیل کہا جاتا ہے۔ اور اس مقدس

---

❶ ٥/المائدۃ:٣۔ ❷ ٦/الانعام:١٤٥۔

انجیل میں یہ ہے کہ جو چیز پیٹ میں داخل ہو وہ نجس اور حرام نہیں ہے۔ بلکہ وہی چیز نجس ہے۔ جو انسان اپنے منہ سے اگلتا ہے۔ نیز حواریوں کے متعلق یہ ذکر ہے کہ ایک مرتبہ ان حواریوں کے سردار پطرس شہر یافا کے سیمون نامی ایک دباغ کے گھر میں داخل ہوئے۔ وہ دن کے چھ بجے کی نماز پڑھنا چاہتے تھے کہ ان پر غنودگی طاری ہوگئی۔ انہوں نے دیکھا کہ آسمان کا ایک دروازہ کھل گیا ہے اور وہاں سے ایک تہ بند لٹکتا ہوا زمین پر آرہا ہے۔ اس میں درندوں اور بھیڑیوں اور پرندوں کی قسم کے تمام چوپائے موجود تھے۔ اتنے میں ایک آواز آئی۔ اے پطرس اٹھ اور ان کو ذبح کر کے کھا۔ پطرس نے کہا: پروردگار! میں نے تو اب تک کوئی نجس اور گندی چیز ہرگز نہیں کھائی ہے۔ اتنے میں دوسری آواز آئی کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو پاک کر دیا وہ نجس نہیں ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو پاک بتائے اس کو تو نجس مت سمجھ پھر تیسری آواز بھی آئی۔ اس کے بعد یہ تہ بند آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا۔ پطرس یہ دیکھ کر حیران ہوگئے اور اس کی وجہ سے حیرت میں پڑ گئے۔ پال اور پطرس نے وہی کہا ہے جس کا حضرت مسیح نے حکم دیا تھا۔ اس لیے زمین کا ہر چوپایہ جس میں خنزیر بھی داخل ہے ہمارے لیے حلال ہے۔ جب بادشاہ نے یہ جواب سنا تو تمام کلیساؤں میں سور کا گوشت رکھنے کا حکم دیا۔ عبادت کے بعد جب لوگ کلیسا سے باہر نکلتے تو ہر ایک کو ایک ٹکڑا دیا جاتا۔ جو کوئی نہیں کھاتا اس کو قتل کر دیا جاتا۔ اس طرح بے شمار آدمی قتل کر دیے گئے تھے۔ [1]

دوسری بدعات

قرآن مجید میں ہے کہ رہبانیت مسیحی علما کی ایجاد کی ہوئی ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اس کو واجب اور فرض نہیں قرار دیا تھا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ ﴾ [2]

"اور رہبانیت کو خود انہی نے جاری کیا تھا۔ ہم نے اس کو ان پر فرض نہیں کیا تھا۔"

سعید بن البطریق کی کتاب نظم الجواہر سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ قسطنطین کے زمانہ

---

[1] الجواب الصحیح ۳/ ۲۶،۲۷ بحوالہ کتاب نظم الجواہر از سعید بن البطریق۔

[2] ۵۷/حدید:۲۷۔

تک تمام مسیحی پادری شادی کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد سے پادریوں کو شادی کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ ❶

قدیم زمانے سے یہودی اور نصرانی بیت المقدس قبلہ اول کی زیارت کرتے آرہے تھے۔ مگر قسطنطین کے زمانہ میں اس کی ماں ہیلانہ (Helene) نے اس جگہ ایک زبردست کلیسا بنایا جہاں سے حضرت مسیح علیہ السلام کی تین صلیبیں دفن کی ہوئی ملی تھیں۔ آج اس مقام کو قمامہ مقدسہ کہا جاتا ہے۔ نصرانی بیت المقدس کی زیارت کو چھوڑ کر اس قمامہ مقدسہ کی زیارت کرنے لگے۔ ❷ اور پھر بیت المقدس کی بجائے مشرک کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے۔

شریعتیں دو ہیں یا تین؟

عیسائیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ حضرت موسیٰ کی شریعت شریعت عدل ہے اور حضرت عیسیٰ کی شریعت، شریعت فضل ہے۔ شریعت فضل کامل اور اکمل ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی تیسری شریعت کی ضرورت نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ شریعتیں تین ہیں۔ ایک شریعت عدل دوسری شریعت فضل تیسری وہ جو عدل اور فضل کی جامع ہے اور وہ شریعت اسلام کی ہے۔ تورات شریعت عدل ہے اور انجیل شریعت فضل ہے۔ لیکن اسلام ان دونوں کا جامع ہے۔ امام موصوف نے قرآن مجید سے عدل اور فضل کی مختلف مثالیں دی ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جنتی دو قسم کے ہیں ایک نیک اور میانہ رو ہیں۔ دوسرے مقربین وسابقین ہیں۔ پہلا درجہ عدل سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ لوگ واجبات کو ادا کرتے ہیں اور محرمات سے بچتے ہیں۔ دوسرا درجہ فضل سے حاصل ہوتا ہے اس قسم کے لوگ محرمات ومکروہات کو ترک کر کے نہ صرف واجبات ادا کرتے ہیں بلکہ مستحبات پر بھی عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کردے تو ایک گردن کا آزاد کرانا اور ایک خون بہا ادا کرنا ہے۔ یہ عدل ہے مگر یہ کہ مقتول کے ورثا اس کو معاف کردیں تو یہ فضل ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کسی کو تکلیف پہنچائے تو اس کے بدلے میں تکلیف دینے والے کو اسی حد تک تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے۔ جتنی کہ اس نے تکلیف دی ہے یہ عدل کا درجہ ہے۔ اگر اس تکلیف پر صبر کرے اور انتقام نہ لے تو یہ اس

---

❶ ایضًا: ۲۲۔ ❷ ایضًا: ۲۲۔۲۳۔

شخص کا فضل ہے۔ اسلام ان دونوں درجوں کا حامل ہے اور کامل اور مکمل ہے۔ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

محمد ﷺ کے رسول بنا کر بھیجے جانے میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ سے بھی زیادہ مصلحتیں اور حکمتیں ہیں۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے بھیجے جانے کے بعد بندوں کے معاش و معاد کی جتنی اصلاح ہوئی اس سے زیادہ ان کی اصلاح آنحضرت ﷺ کے ذریعے ہوئی۔ کیونکہ آپ کی شریعت ہدایت اور دین حق پچھلی دونوں شریعتوں سے زیادہ کامل اور مکمل ہے۔ آپ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جتنے لوگوں کو ہدایت پہنچائی اور جس کثرت سے لوگوں نے ان کی پیروی کی وہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو بھی حاصل نہیں ہوسکی۔ آپ کی شریعت کو جو بزرگی حاصل ہوئی وہ خود اس شریعت کی بزرگی کی وجہ سے ہے۔ بخلاف پچھلی شریعتوں کے کہ لوگوں نے ان کو زیادہ قبول نہیں کیا۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے۔ ان کی زندگی میں اور پھر ان کے مرنے کے بعد بنی اسرائیل نے ان کے خلاف جو سرکشی اختیار کی تھی اس کو سارے نصرانی بھی جانتے ہیں۔ کمال کے لحاظ سے تورات کی شریعت قرآن کی شریعت کا مقابلہ نہیں کرسکتی کیونکہ قرآن مجید میں معاد کے متعلق جتنا تفصیلی ذکر موجود ہے اور اس کے متعلق جتنی دلیلیں قائم کی گئی ہیں۔ اور پھر جنت اور دوزخ کا اس میں جتنا ذکر کیا گیا ہے اتنا تورات میں نہیں ہے۔ انبیا کے قصوں میں ہود، صالح اور شعیب وغیرہ کا جتنا ذکر قرآن میں ہے اتنا تورات میں نہیں ہے۔ اسی طرح تورات میں خدا کے اسماء و اوصاف، ملائکہ کی صفات اور ان کی اقسام، انسانوں اور جنوں کی پیدائش اور ان کے احوال کا اتنا تذکرہ نہیں ہے۔ جتنا قرآن میں ہے تورات کی بہ نسبت قرآن مجید میں زیادہ بہتر طریقہ پر توحید کو مختلف دلیلوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں اہل زمین کے ادیان کا جتنا تفصیلی ذکر ہے وہ تورات میں نہیں ہے۔ رسولوں کے مخالفین سے جتنا مناظرہ قرآن میں کیا گیا ہے اور اس میں اصول دین سے جتنی بحث کی گئی ہے وہ تورات میں نہیں ہے حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن اور تورات سے بڑھ کر زیادہ ہدایت دینے والی کوئی کتاب آسمان سے نہیں اتاری گئی۔ قرآن کی شریعت میں اچھی چیزوں کو حلال اور بری چیزوں کو حرام کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف تورات

میں بہت سی ایسی چیزوں کو بھی حرام کر دیا گیا ہے جو درحقیقت حلال تھیں محض یہودیوں کی سرکشی کی بنا پر یہ چیزیں حرام کی گئی تھیں۔ قرآن میں خوں بہا کو قبول کیا گیا ہے۔ حالانکہ تورات میں اس کی اجازت نہیں تھی۔ تورات کی وجہ سے جو بہت سی پابندیاں لگ گئی تھیں۔ قرآن نے ان کو دور کیا۔ اور بہت سی بندھنیں توڑ دیں۔ یہ قرآن مجید کی طرف سے لوگوں پر ایک بڑی نعمت ہے۔ اب رہا انجیل کا معاملہ تو وہ کوئی مستقل شریعت ہی نہیں ہے۔ اس میں توحید، خالق، عالم اور قصص انبیا کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ اکثر امور میں تورات کی طرف لوٹا دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت مسیح نے بعض حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کیا۔ اور لوگوں کو عفوو درگزر اور احسان کرنے کا حکم دیا اور تکلیفوں اور اذیتوں پر صبر کی تعلیم دی۔ اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں استعمال کی ہیں۔ تورات کے مقابلہ میں انجیل اس حیثیت سے امتیاز رکھتی ہے کہ اس میں مکارم اخلاق، زہد مستحب اور بعض محرمات کی تحلیل پر زور دیا گیا ہے۔ مگر قرآن میں یہ باتیں زیادہ کامل اور مکمل طور پر موجود ہیں۔ بلکہ تورات و انجیل میں علوم نافعہ و اعمال صالحہ کا جتنا ذکر بھی پایا جاتا ہے اس سے بدرجہا بہتر طریقہ پر قرآن میں ان کا ذکر موجود ہے۔ قرآن مجید میں بعض ایسے علوم نافعہ اور اعمال صالحہ کا ذکر ہے جس کا تورات و انجیل میں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ان نصرانیوں نے نہ تو تورات ہی کی اتباع کی اور نہ اپنے انجیل ہی کی پیروی کی۔ بلکہ ایک نئی شریعت ایجاد کی جس کی کسی نبی نے ہمیں اجازت نہیں دی ہے۔ مثلاً قسطنطین نے ان کے لیے ایک عام محضر تیار کیا اور ان کے علما نے قسطنطین کے لیے چالیس کتابیں بنائیں جن کو وہ قوانین کا نام دیتے ہیں۔ ان میں بہت تھوڑا حصہ ایسا ہے جس کو انبیا سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اس میں زیادہ حصہ ایسا ہے جس کی تمام انبیا کی شریعتیں مخالف ہیں۔ [1]

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

تمام فلاسفہ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ دنیا میں آپ کی شریعت سے بڑھ کر بہتر کوئی شریعت نہیں آئی۔ ان کو اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ یہ شریعت حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی شریعتوں سے افضل ہے۔ دوسری شریعتوں میں تو ان فلاسفہ نے بہت سے ایسے نقص

[1] الجواب الصحیح ٣/ ٢٢٣، ٢٢٢۔

نکالے ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔ بخلاف شریعت محمدیہ کے کہ کسی نے اس میں کوئی نقص نہیں نکالا ہے مگر وہ جو قانون فلسفہ سے خارج ہو کر گفتگو کرتے ہیں۔ [1]

امام ابن تیمیہ نے اس مسئلہ پر بارہ صورتوں سے بحث کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ بحث بہت ہی نفیس اور مفید ہے۔ اس میں شریعت اسلام کی فضیلت کو اتنا نمایاں کر کے دکھایا ہے کہ اس سے بڑھ کر نمایاں کرنا بہت مشکل ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ دنیا میں تورات اور انجیل کی شریعتیں توحید کو قائم اور عدل و انصاف کو مستحکم نہیں کر سکیں۔ اس کے برخلاف اسلام نے بڑے بڑے ظالموں اور سرکشوں کا سر نیچا کر دیا اور زمین سے جہالت اور نادانی کو دور کیا۔ اگر انجیل کی شریعت کے مطابق ظالموں کے ساتھ رحم کا برتاؤ ہوتا رہتا تو کبھی بھی ظلم و ستم اور شر و فساد کا خاتمہ نہیں ہو سکتا تھا۔ [2]

آنحضرت کے متعلق انبیا کی بشارتیں

قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ نے آنحضرت کے آنے کے متعلق بشارتیں دی ہیں۔ [3] لیکن نصاریٰ کو اس حقیقت سے بالکل انکار تھا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت مسیح کی آمد کے متعلق تو سابقہ انبیا نے بشارتیں دی ہیں مگر آنحضرت ﷺ کے متعلق اس قسم کی کوئی بشارت نہیں ہے اور جس کے متعلق سابقہ انبیا کی بشارت نہ ہو وہ نبی نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر امام ابن تیمیہ نے ایک بہت ہی نفیس بحث کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کسی کے نبی ہونے کے لیے سابقہ انبیا کی بشارت دینا ضروری نہیں ہے۔ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کو بنی اسرائیل بھی نبی مانتے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ سابق انبیا نے ان کے متعلق کوئی بشارت دی ہے اسی طرح حضرت داؤد اور اشعیا نبی تھے لیکن ان کے متعلق کسی نے بھی بشارت نہیں دی ہے۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ اور حضرت مسیح کی نبوت کا علم اس علم پر

---

[1] الجواب الصحیح ۳/ ۲۳۱۔ [2] ایضًا: ۲۳۹۔ [3] دیکھو ۷/الاعراف: ۱۹ ؛ ٦١/صف: ١۔ اس سلسلہ میں بہت سی دوسری آیتیں بھی ہیں جن کا یہاں استقصاء نہیں کیا جا سکتا۔ الجواب الصحیح ۳/ ۲٦١۔

موقوف نہیں ہے کہ ان سے پہلے کہ انبیا نے ان کے آنے کی بشارت دی ہو بلکہ نبوت کا علم متعدد طریقوں سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر کسی ایک طریقہ سے ان کی نبوت ثابت ہوجائے تو پھر اس کے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ [1]

اس کے علاوہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ موجودہ کتابوں میں حضرت مسیح اور حضرت محمد ﷺ کے متعلق بشارتیں موجود نہیں ہیں تو اس سے یہ قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ پچھلے انبیا نے ان کے متعلق بشارتیں نہیں دی ہیں یہود جس طرح حضرت مسیح کے متعلق بشارتوں کا انکار کررہے ہیں۔ اسی طرح نصاریٰ بھی حضرت محمد کے متعلق بشارتوں کا انکار کررہے ہیں۔ ورنہ حضرت مسیح اور حضرت محمد کی نبوت کے دلائل بالکل قطعی اور یقینی ہیں۔ ان میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ [2]

امام موصوف لکھتے ہیں کہ اس بات کا علم کہ پچھلے انبیا نے کسی کے متعلق بشارتیں دی ہیں۔ دو صورتوں سے حاصل ہوسکتا ہے پہلی تو یہ کہ اہل کتاب کے ہاں کی موجودہ کتابیں اس پر گواہی دیں۔ دوسری یہ کہ ان کتابوں سے واقفیت رکھنے والے اہل کتاب چاہے وہ مسلمان ہوگئے ہوں یا مسلمان نہ ہوئے ہوں گواہی دیں۔ دوسری صورت بالکل صاف اور واضح ہے کیونکہ اس بات کو سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آنحضرت کی بعثت سے پہلے اہل کتاب ایک نبی کے آنے کا انتظار کررہے تھے۔ انہوں نے بارہا عربوں کے سامنے اس کا تذکرہ کیا اور جب وہ نبی آ گیا تو مدینہ والے ایمان لے آئے اور یہودیوں اور نصرانیوں نے جاننے کے باوجود آپ کی نبوت کا انکار کیا۔ [3] اگر اس کو نظر انداز کردیا جائے تو بھی موجودہ کتابیں آپ کی نبوت پر گواہی دے رہی ہیں۔ اس کے متعلق علمائے اسلام نے مختلف کتابیں لکھی ہیں۔ یہود بھی ان بشارتوں کے الفاظ کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ان کے معانی اور تفاسیر میں تاویل کرتے ہیں مثلاً تورات میں ہے کہ عنقریب اے موسیٰ! میں بنی اسرائیل کے بھائیوں سے تجھ جیسا ایک نبی کھڑا کروں گا جس پر موسیٰ کی تورات کی طرح ایک تورات اتاروں گا میں اس کے منہ

---

[1] الجواب الصحیح ۳/ ۲۶۲۔ [2] ایضًا: ۲۶۳۔

[3] تفصیل کے لیے دیکھو الجواب الصحیح جزء سوم ۲۶۵ تا ۲۷۵، ایضاً ۲۷۶ تورات باب استثنا ۱۸۔ ۱۶

میں اپنا کلام ڈالوں گا۔

اس میں آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے لیکن یہودی اس کی تاویل کرتے ہیں۔

تورات میں دجال کے ظہور سے ڈرایا گیا ہے۔ اگر بقول ان یہودیوں اور نصرانیوں کے آنحضرت ﷺ سچے نبی نہیں تھے تو تورات اور انجیل میں دنیا والوں کو ان سے ڈرانا بے حد ضروری تھا۔ کیونکہ دنیا والے جانتے ہیں کہ ظہور اسلام کا واقعہ دنیا کا ایک عظیم ترین واقعہ ہے۔ کسی دین کو بھی اتنا فروغ اور اتنا دوام حاصل نہیں ہوسکا۔ جتنا کہ دین اسلام کو حاصل ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ کی شریعت صرف ملک شام کے ایک حصہ میں پھیل کر رہ گئی۔ اس کے آگے اس کا پھیلاؤ نہیں ہوسکا۔ حضرت مسیح کی شریعت تین سو سال بعد قسطنطین کے زمانہ میں پھیلی۔ صرف رومی سلطنت میں اور وہ بھی بڑے بڑے نصرانی بزرگوں کے شہید ہوجانے کے بعد اس کو فروغ حاصل ہوسکا۔ اور جب اس دین کے پھیلنے کا زمانہ آیا تو عیسائی امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ ہر ایک فرقہ دوسرے کو کافر اور مرتد قرار دینے لگا۔ اس کے بعد حضرت محمد کی شریعت کو خود ان کی زندگی میں کامیابی حاصل ہوئی اور پھر ان کے بعد اس دین کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ زمین کے گوشوں گوشوں میں اس کا کلمہ بلند ہوگیا۔ اور مسلمان ہر طرف چھا گئے۔ سابقہ انبیا اس قسم کے عظیم الشان واقعہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ جب انہوں نے جھوٹے دجال تک کی خبر دے دی ہے تو آنحضرت ﷺ سچے ہوں یا جھوٹے ہر حال میں ان کے متعلق خبر دینی چاہیے۔ [1]

اس کے بعد لکھا ہے کہ موجودہ کتب الٰہیہ میں سو سے زیادہ ایسی جگہیں ہیں۔ جہاں سے صاف طور پر آنحضرت ﷺ کی نبوت کی بشارت ثابت ہوتی ہے۔ اہل کتاب کے آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کا ایک بہت بڑا سبب یہی تھا کہ ان کتابوں میں آپ کی بشارتیں موجود تھیں بلکہ بعض لوگوں کا کہنا تو یہ ہے کہ ان کتابوں میں آنحضرت کے بعض ساتھیوں کی بھی تعریف موجود ہے۔ جب سابقہ انبیا نے ان کی مدح و ثنا کی ہے تو وہ ہرگز جھوٹے نبی نہیں ہوسکتے۔ اگر ان کی مذمت موجود ہوتی تو ضرور اہل کتاب آنحضرت کی زندگی

[1] الجواب الصحیح ۳/ ۲۷۷۔

میں اور ان کے بعد ان سے استدلال لیتے۔ انہوں نے ذاتی بغض وعداوت کی بنا پر اسلام میں بہت سے نقائص نکالے ہیں۔ مگر انہیں آنحضرت ﷺ کی ذات پر حرف گیری کی کوئی جرأت نہیں ہوسکی۔ انہوں نے آپ کی ذات پر ایک بڑا حملہ یہی کیا ہے کہ آپ نے تلوار کے زور سے اپنا دین پھیلایا حالانکہ ان کا یہ خیال بھی بالکل غلط ہے۔ [1]

امام موصوف نے تورات اور انجیل کے مختلف مقامات سے آنحضرت کی نبوت کی بشارت ثابت کی ہے۔ مثلاً تورات میں ہے کہ خدا طور سینا سے آیا اور ساعیر سے طلوع ہوا اور فاران کی پہاڑیوں سے چمکا۔ [2] اس جملے میں حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد ﷺ کے ظہور کی بشارت دی گئی ہے کیونکہ حضرت اسمٰعیل کے قصہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے ہاجرہ اور اسمٰعیل کو فاران کی پہاڑیوں میں آباد کیا تھا۔ [3]

نیز اشعیا نبی نے فرمایا کہ قیذار کی اولاد صحرا اور شہروں میں پھیل جائے گی۔ یہ لوگ خدا کی تسبیح بیان کریں گے اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے خدا کی بزرگیوں کا نعرہ لگائیں گے۔ اور خشکی اور سمندر میں خدا کی پاکی بیان کریں گے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ قیذار حضرت اسمٰعیل کے لڑکے کا نام تھا۔ انہی کی نسل سے آنحضرت ﷺ تھے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آنحضرت کی امت پنجوقتہ نمازوں میں اور حج کے موقع پر خدا کا نام پکارے گی۔ وہ خشکی اور سمندر دونوں جگہوں پر نمازیں قائم کریں گے۔ [4]

موجودہ انجیل میں بھی آنحضرت ﷺ کی نبوت کی بشارت موجود ہے۔ حضرت مسیح نے اپنے حواریوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میری وصیتوں کی پابندی کرو اور میں باپ سے گزارش کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا فارقلیط عطا کرے جو تمہارے ساتھ ہمیشہ رہے گا۔ وہ سچائی کی روح ہوگی جس کو دنیا قبول نہیں کر سکے گی کیونکہ وہ اس کو نہیں دیکھتے ہیں اور نہ جانتے ہیں۔ لیکن تم

---

[1] الجواب الصحیح ۳/ ۱۸۰، ۲۷۹۔ [2] دیکھو تورات سفر التثنیہ: ۳۳۔

[3] الجواب الصحیح ۳/ ۲۸۳، دیکھو تورات باب پیدائش: ۲۱۔

[4] ایضًا صفحہ: ۳۰۹۔

اس کو جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے اور تمہارے اندر رہے گا اور میں تم کو یتیم نہیں چھوڑے جا رہا ہوں کیونکہ میں عنقریب تمہارے پاس آؤں گا۔ ❶

پھر آگے چل کر فرمایا:

میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر کہی ہیں لیکن فارقلیط جو سچائی کی روح ہے اس کو میرے نام سے میرا باپ روانہ کرے گا اور وہ تم کو تمام چیزیں سکھائے گا اور تمہیں وہ تمام باتیں یاد دلائے گا جو میں نے تم سے کہی ہیں۔ ❷

پھر فرمایا:

اس کے بعد میں تمہارے ساتھ زیادہ باتیں نہیں کروں گا کیونکہ اس دنیا کا سردار (ارکون العالم) آرہا ہے اور میرا کچھ نہیں ہے۔ ❸

پھر پندرہویں فصل میں فرمایا:

لیکن جب فارقلیط آجائے جس کو میں باپ کی طرف سے بھیجوں گا وہ سچائی کی روح ہوگا۔ اور باپ کی طرف سے آکر میری تصدیق کرے گا۔ ❹

پھر دوسری فصل میں فرماتے ہیں:

تاہم تم سے ایک حق بات کہوں، میرا جانا تمہارے لیے بہتر ہے۔ کیونکہ میں نہیں جاؤں گا تو فارقلیط تمہارے پاس نہیں آئے گا مگر میں جب یہاں سے روانہ ہو جاؤں تو میں اس کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔ اور جب وہ آجائے گا تو دنیا کو گناہ سے، راستی سے، عدالت و انصاف سے قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ سے اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لے آئے۔ راستی سے اس لیے کہ میں اپنے باپ کی طرف چلا گیا۔ اور تم مجھے آئندہ نہیں دیکھو گے۔ اور عدالت و انصاف سے اس لیے کہ اس دنیا کا سردار منصف ہوگا۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں لیکن تم اس کو برداشت نہیں کر سکو گے۔ تاہم جب وہ سچائی کی روح آجائے گی تو وہ تمام سچائیوں کی ہدایت دے گی۔ کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گی بلکہ وہی کہے گی جو وہ اپنے باپ سے سنے گی اور

---

❶ یوحنا فصل ١٤۔ ❷ یوحنا فصل ١٤۔

❸ یوحنا فصل ١٤۔ ❹ یوحنا فصل ١٥۔

وہ تم کو تمام آنے والی چیزوں کی خبر دے گی۔ وہ میری شان کو بڑھائے گی۔ [1]

حضرت مسیح نے اپنی ان تمام پیشین گوئیوں میں فارقلیط کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی بعینہ محمد اور احمد کے ہوتے ہیں۔ اس پر حضرت یوشع علیہ السلام کا قول دلالت کرتا ہے جس میں آپ نے فرمایا: جو بھی نیک کام کرے اس کی بڑی فارقلیط (حمد) ہوگی۔

نصرانی سچائی کی روح سے روح القدس یا حضرت مسیح مراد لیتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ سچائی کی روح سے روح القدس مراد لینا کسی حال میں بھی صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ اہل کتاب کے نظریہ کے مطابق تمام انبیا پر روح القدس پیغام الٰہی لے کر اترتی رہی ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ کے بعد بھی انبیا اور صالحین پر اترتی رہے گی۔ انجیل میں کسی جگہ بھی روح القدس کو فارقلیط کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے مراد کوئی دوسری روح ہے۔ اس کی جتنی صفات پیش کی گئی ہیں وہ آنحضرت ہی پر منطبق ہوتی ہیں۔ روح القدس ایک فرشتہ ہے جس کو انسان نہیں دیکھ سکتے اور وہ ان کو ہر وہ چیز نہیں سکھا سکتا جس کو حضرت مسیح نے بتایا تھا۔ نیز حضرت مسیح نے یہ خبر دی ہے کہ اس دنیا کا سردار آرہا ہے۔ یہ لقب صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ٹھیک بیٹھتا ہے کیونکہ آپ سے بڑھ کر کسی نبی نے دنیا کی سرداری نہیں کی۔ اسی لیے آپ نے فرمایا تھا: ((انا سید ولد آدم ولا فخر)) [2] ''میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں ہے۔''

اس فارقلیط سے مراد حضرت مسیح بھی نہیں ہوسکتے جیسے کہ بعض نصرانیوں کا گمان ہے کہ صلیب پر چڑھائے جانے کے چالیس دن بعد حضرت مسیح زندہ ہوگئے اور اپنی قبر سے اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ انہوں نے اس فارقلیط کی ایسے الفاظ میں تعریف کی ہے جو خود حضرت عیسیٰ کی ذات پر منطبق نہیں ہوتی۔ حضرت مسیح نے صاف طور پر فرمایا کہ اگر وہ نہیں جائیں گے تو وہ فارقلیط نہیں آئے گا۔ اور پھر فرمایا کہ وہ ان کی تصدیق کرے گا اور ان کو ہر وہ چیز بتائے گا جن کو حضرت مسیح نے بتایا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فارقلیط کی شخصیت حضرت مسیح کی شخصیت سے بالکل الگ ہے۔

---

[1] یوحنا فصل ۱۴۔ [2] ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر الشفاعة: ۴۳۰۸۔

معجزات محمدی

قرآن مجید نے کئی جگہ اس کا اعتراف کیا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بہت سے زبردست معجزے عطا کئے گئے تھے۔ حضرت عیسیٰ مردوں کو زندہ کرتے تھے اور کوڑھیوں اور بیماروں کو چنگا اور درست کر دیتے تھے۔ اسی لیے عیسائیوں کا یہ کہنا تھا کہ حضرت مسیح کے مقابلے میں حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کا کوئی غیر معمولی معجزہ عطا نہیں کیا گیا تھا۔ امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب میں اس موضوع پر ایک بہت ہی نفیس بحث کی ہے انہوں نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام دنیا والوں کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس لیے لامحالہ آپ کے معجزات اور دلائل نبوت دوسرے انبیا کے مقابلے میں بہت بڑھ کر ہونے چاہیے۔ آپ کو وہ مستقل اور غیر معمولی معجزے عطا کیے گئے ہیں جو دوسروں کو نصیب نہیں ہو سکے۔

اس سلسلے میں امام موصوف نے معجزات کے لفظ سے بحث کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کتاب وسنت میں معجزے کے لیے آیت، بینۃ اور برہان کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو اپنے مقصود پر بہت عمدہ طریقے سے دلالت کرتے ہیں۔ معجزات کا لفظ اس معنی میں کتاب و سنت میں مذکور نہیں ہے۔ بلکہ معجز کا لفظ صرف خدا کے لیے استعمال کیا گیا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴾ [1]

''پس وہ (خدا) کو عاجز نہیں کر سکتے۔''

﴿ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ ﴾ [2]

''اور تم زمین میں (خدا) کو عاجز نہیں کر سکتے۔''

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ﴾ [3]

''اور خدا ایسا نہیں کہ آسمانوں میں اور زمین میں کوئی چیز اس کو عاجز کر سکے۔''

یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل علم کلام معجزات صرف انبیا کے پیش کیے ہوئے خوارق عادات

---

[1] ١٦/النحل:٤٦۔ [2] ٤٢/الشوریٰ:٣١۔ [3] ٣٥/فاطر:٤٤۔

کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر صالحین کے ہاتھوں پر خوارق عادات کا صدور ہو تو ان کے لیے کرامات کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یوں تو آنحضرت ﷺ کی نبوت کے دلائل بے شمار ہیں جن کا استقصا بہت مشکل ہے مگر ان معجزوں کو دو قسموں پر منقسم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ جو عارضی ہیں۔ اور آنحضرت کے ذریعے ظہور پا چکے اور دوسرے وہ جو مستقل اور ہمیشہ کے لیے باقی رہیں گے۔ اس لحاظ سے قرآن مجید آنحضرت ﷺ کا ایک زندہ جاوید معجزہ ہے۔ قرآن مجید نے بار بار عربوں کے سامنے تحدی پیش کی اور کہا کہ اگر تمام جن وانس متفق ہوجائیں اس صورت میں بھی وہ قرآن کی سی کتاب پیش نہیں کر سکتے۔ دنیا جانتی ہے کہ عرب آنحضرت کی مخالفت پر ہمہ تن آمادہ تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ قرآن کا معارضہ نہیں کر سکے۔ آنحضرت کے بعد بھی یہ تحدی باقی رہی اور آیندہ قیامت تک باقی رہے گی۔ اس قسم کا کلام نہ تو دنیا پیش کر سکی ہے اور نہ آیندہ پیش کر سکے گی۔ قرآن کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ اپنی جگہ پر باقی اور محفوظ رہا۔ ''اگر محمد ﷺ بھی اس کو بدلنا چاہتے تو اس کو بدل نہیں سکتے تھے۔'' (۱۰/ یونس: ۱۵) یہی وجہ ہے کہ آج قرآن مجید کی زبان اور آنحضرت ﷺ کے کلام کے درمیان میں فرق نظر آرہا ہے۔ جو کوئی بھی ذرا سا تدبر سے کام لے وہ اس فرق کو اچھی طرح محسوس کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کا نظم اور اسلوب اپنی آپ مثال ہے۔ تمام انسانوں کے کلام میں اس کی نظیر نہیں ملتی کیونکہ یہ نہ تو رجز ہی ہے اور نہ شعر ہے۔ نہ تو وہ خطابت ہے اور نہ رسائل ہی ہیں۔ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے مقابلہ میں کسی کلام کو مثال کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اس پر مزید یہ کہ قرآن مجید نے توحید الٰہی، اس کے اسماء وصفات، ملائکہ عرش وکرسی، جن وانس، دین وشرائع اور قصص انبیا کے متعلق جس قسم کے مضامین پیش کیے ہیں اس کی نظیر سابقہ کتابوں میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ تورات وزبور اور انجیل کو دنیا میں وہ فروغ اور انتشار حاصل نہیں ہوسکا جو قرآن مجید کو حاصل ہوا ہے۔ قرآن مجید آسانی کے ساتھ حفظ کیا جاسکتا ہے اور لوگوں کے سامنے دلنشینی کے ساتھ سنایا جاسکتا ہے۔ یہ خصوصیت تورات وزبور اور انجیل کو حاصل نہیں ہے۔

امام ابن تیمیہ کے نزدیک نبی کریم ﷺ کی سیرت پاک بھی ایک زبردست معجزہ

ہے۔اس جیسا انسان کامل نہ تو آپ سے پہلے پیدا ہوا اور نہ آیندہ پیدا ہوسکتا ہے۔حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ برسوں لوگوں کو توحید و رسالت وعبودیت کی دعوت دیتے رہے مگر بہت کم لوگ ان پر ایمان لے آئے مگر آنحضرت ﷺ نے صرف تیئس برس تک دعوت دی اور جب آپ کی وفات ہوئی تو سارا عربستان مسلمان ہو چکا تھا اور تمام ملکوں میں اسلام کی آواز پہنچ چکی تھی۔اس قسم کی عظیم ترین شخصیت تاریخ عالم میں دکھائی نہیں دیتی۔اگر اس کے بعد بھی اس کی نبوت میں شک ہوسکتا ہے تو پھر دنیا کے کسی نبی کی نبوت بھی ثابت نہیں کی جاسکتی۔

امام موصوف کے نزدیک نہ صرف آنحضرت ﷺ کی سیرت پاک معجزہ ہے بلکہ امت محمدی کا وجود اور اس کے عظیم الشان کارنامے بھی ایک مستقل معجزہ ہیں۔حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی امت پڑھی لکھی تھی وہ سابقہ شریعتوں کی بہت سی باتیں جانتی تھی۔اس کے مقابلہ میں حضرت محمد ﷺ کی امت ان پڑھ اور جاہل تھی۔اس کو نہ تو معاش کا علم تھا اور نہ معاد کا۔وہ تورات، زبور اور انجیل سے بھی واقف نہیں تھی۔سب سے پہلے آنحضرت ﷺ ہی نے اس کو ان باتوں سے روشناس کرایا اور اس سے نہ صرف اپنی ذات پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا بلکہ تمام انبیا کی نبوت اور رسالت کو بھی ماننا ضروری قرار دیا۔آپ کی تعلیمات و ارشادات سے ان کی زندگیاں بدل گئیں اور وہ دنیا کے صالح ترین افراد بن گئے۔آپ کی تعلیم کی بدولت وہ دنیا کے سب سے بڑے عالم، سب سے بڑے دیندار، سب سے بڑے عابد اور سب سے بڑے فاضل بن گئے۔ملک شام کے عیسائیوں نے جب آپ کے صحابہ کو دیکھا تو کہا سچی بات تو یہ ہے کہ حضرت مسیح کے حواری بھی ان سے افضل نہیں تھے۔اس قسم کا ذہنی و علمی و اخلاقی انقلاب گزشتہ تاریخ میں کہیں نہیں پایا جاتا۔حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی امتیں اپنے نبیوں کی وفات کے بعد گمراہ ہوگئیں مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کے متعلق یہ پیشین گوئی کی تھی۔

((لَا تَزَال طائفة من امتی ظاهرين على الحق لا يضرهم من خالفهم ولا من خذلهم حتى تقوم الساعة)) [1]

---

[1] سنن ترمذی، ابواب الفتن، باب ماجاء فی الشام، ح: ۲۱۹۲؛ ابن ماجہ: ٦۔

''میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غالب رہے گی مخالفت کرنے والوں کی مخالفت اور رسوا کرنے والوں کی رسوائی سے اسے کوئی نقصان نہ ہوگا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔''

اس پیشین گوئی کی صداقت میں کسی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

عیسائیوں کو اپنے نبی کے معجزے پر بڑا فخر تھا۔ امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ مردوں کو زندہ کرنے اور کوڑھیوں کو چنگا کرنے کے معجزے دوسروں کو عطا کیے گئے تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور آج بھی خدا کے نیک بندوں کے ہاتھوں ان کا ظہور ہو رہا ہے۔ یہ سب عارضی معجزے تھے ان انبیا کو دائمی اور مستقل معجزہ نصیب نہیں ہو سکا۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ کو حاصل ہوا تھا۔

اس کے بعد آپ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ہاتھوں کس قسم کے خوارق عادات سرزد ہوئے تھے۔ اس کی تفصیل کے لیے ایک بڑا دفتر چاہیے۔ جن کو دیکھنا ہو وہ الجواب الصحیح کی چوتھی جلد مطالعہ کر سکتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی بعثتِ عامہ

عیسائیوں کا سب سے بڑا دعویٰ یہی تھا کہ آنحضرت ﷺ صرف عربوں کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے۔ دوسروں کو ان کا ماننا ضروری نہیں ہے۔ اسی دعوے کے ثبوت میں بہت سی ضمنی بحثیں کی گئی تھیں۔ درحقیقت عیسائیوں نے آیات و احادیث سے استدلال لیا تھا۔ انہوں نے بعض آیتوں اور حدیثوں کے معانی و مطالب میں تحریف و تاویل کی تھی۔ امام ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح کی پہلی جلد میں اس مسئلہ پر بڑی تفصیلی بحث کی تھی۔ انہوں نے قرآن مجید احادیث اور سیرتِ رسول سے اس غلط خیال کی پوری تردید کی ہے۔ قرآن مجید کی کئی جگہوں سے آپ کی بعثت عامہ کا ثبوت ملتا ہے۔ آپ کی زبان مبارک سے دنیا والوں کے لیے یہ اعلان کیا گیا تھا۔

﴿قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ

وَالْاَرْضِ ﴾ [1]

"کہہ دے اے لوگو! میں بے شک تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جس کی ملکیت میں یہ سب آسمان اور زمینیں ہیں۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ [2]

"اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔"

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [3]

"اور ہم نے ساری دنیا والوں کے لیے تجھے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

قرآن مجید کے متعلق یہ ذکر ہے:

﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [4]

"قرآن مجید نہیں ہے مگر نصیحت تمام دنیا والوں کے لیے۔"

قرآن مجید نے تمام اہل کتاب سے آنحضرت پر ایمان لانے کا بار بار مطالبہ کیا ہے اور جو لوگ آپ پر ایمان نہیں لاتے ان کو کافر قرار دیا ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت صرف عربوں کے لیے ہوتی تو اہلِ کتاب سے ایمان کا مطالبہ نہیں ہوتا۔

حدیثوں میں بھی آنحضرت کی بعثت عامہ کا ذکر موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كان النبي يبعث الىٰ قومه خاصة و بعثت الى الناس عامة)) [5]

"نبی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا مگر میں عام لوگوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زندگی میں ملک شام و مصر و حبش و غسان و بحرین وغیرہ کے

---

[1] ٧/الاعراف:١٥٨۔ [2] ٣٤/سبا:٢٨۔ [3] ٢١/الانبياء:١٠٧۔

[4] ٨١/التكوير:٢٧۔ [5] صحيح بخارى، كتاب التيمم: ٣٣٥۔

بادشاہوں اور قوموں کو اسلام کی دعوت بھیجی تھی۔ اگر آپ عربوں کے لیے نبی ہوتے تو ان غیر عرب بادشاہوں اور قوموں کو اسلام کی دعوت دینے کی کوئی حاجت نہیں ہوتی۔ آپ نے اپنی امت کو ان کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا ہے جو آپ پر ایمان نہیں لاتے۔ آپ کی امت نے یہ فعل خود اپنی طرف سے نہیں کیا تھا بلکہ قرآن وسنت کے ارشادات کے مطابق دوسری قوموں سے جہاد کیا۔ ایسی حالت میں عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت عام نہیں تھی محض ایک دھوکہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

آنحضرت کی نبوت کو ماننے بغیر چارہ نہیں ہے

دوسرے انبیا کی نبوت کے مقابلے میں آنحضرت کی نبوت اتنی نمایاں اور شاندار ہے کہ کسی نبی کی نبوت کو آپ کی نبوت کو تسلیم کیے بغیر ماننا ناممکن ہے۔ کیونکہ کسی نبی کی نبوت کو جن اسباب کی بنا پر صحیح تسلیم کیا جائے گا، وہی اسباب زیادہ بہتر طریقہ پر آنحضرت کی نبوت میں پائے جائیں گے۔ آپ کی لائی ہوئی کتاب اور شریعت دوسری آسمانی کتابوں اور شریعتوں کے مقابلہ میں زیادہ کامل اور مکمل ہے۔ آپ کی شریعت کے احکام وقوانین دوسری شریعتوں کے احکام وقوانین سے زیادہ مرتب اور منظم ہیں اور انسانی مصالح عامہ پر ان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ آپ کے متعلق بہترین اور شاندار الفاظ میں پرانے انبیا نے بشارت دی ہے جس سے آپ کا بلند مرتبہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ آپ کی تعلیمات وارشادات پرانے انبیا کی تعلیمات وارشادات کے مقابلہ میں زیادہ مستند اور واضح ہیں۔ پرانے انبیا کے تمام واقعات کا کوئی تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برخلاف آنحضرت ﷺ کی زندگی کے ہر ایک واقعے کے لیے سند موجود ہے۔ پرانے انبیا سے جتنے معجزے اور خوارق عادات سرزد ہوئے آنحضرت ﷺ کے ذریعے ان سے بہتر معجزے اور خوارق عادات دکھلائے گئے پھر اس پر مزید یہ کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی بالکل کامیاب زندگی رہی۔ دوسرے انبیا کو اپنی زندگی میں اتنی زبردست کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ ایسی حالت میں کسی دوسرے نبی کو ماننا اور آپ کی نبوت کا انکار کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی خاص فن کے عام علما کو تو مانے مگر ماہرین اساتذۂ فن کا انکار کرے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بہت سی دلچسپ مثالیں دی ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو نبی ماننا اور آنحضرت ﷺ کی نبوت کا انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے زفر، ابن القاسم، مزنی اور اثرم تو بہت بڑے فقیہ تھے لیکن امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد فقیہ نہیں تھے۔ یا کوئی یہ کہے کہ اخفش، ابن الانباری اور ابوالعباس مبرد بڑے نحوی تھے لیکن سیبویہ، خلیل یا فراء نحوی نہیں تھے یا کوئی یہ کہے کہ صاحب الملکی والمسیحی جیسے مصنفین طب بہت بڑے طبیب تھے اور بقراط اور جالینوس طبیب نہیں تھے یا کوئی یہ کہے کہ کوشیار اور خرقی وغیرہ تو علم ہیئت کے بڑے جاننے والوں میں سے تھے لیکن بطلیموس وغیرہ علم ہیئت نہیں جانتے تھے جو شخص یہ کہے کہ داؤد، سلیمان، میخا، عاموس اور دانیال نبی تھے اور محمد بن عبداللہ نبی نہیں تھے اس کا تناقض ظاہر اور اس کے قول کا فساد بالکل کھلا ہوا ہے۔ اسی طرح جو شخص یہ کہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ تو نبی تھے اور ان کی کتابیں تورات اور انجیل اللہ کی اتاری ہوئی کتابیں ہیں۔ لیکن محمد بن عبداللہ اللہ کے رسول نہیں ہیں اور ان کی لائی ہوئی کتاب یعنی قرآن مجید خدا کی طرف سے اتاری ہوئی کتاب نہیں ہے تو اس کے قول کا باطل ہونا ہر اس شخص پر بالکل ظاہر ہے جو حضرت محمد ﷺ کی لائی ہوئی شریعت اور ان سے پہلے کی تمام شریعتوں پر ذرا بھی غور وفکر سے کام لے گا۔ [1]

منعم علیہم کون ہیں؟

نصاریٰ کے عجیب وغریب استدلالات میں سے ایک استدلال یہ تھا کہ قرآن مجید کی آیت ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ میں اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اس آیت میں تین جماعتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہود اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے مراد کفار ومشرکین عرب ہیں۔ نصرانی علما اس آیت کی یہ تفسیر بیان کرتے تھے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ سیدھے راستہ کی دعا مانگیں جو نصرانیوں کا راستہ ہے۔ ان یہودیوں کا راستہ نہیں جن پر خدا کا غضب نازل ہوا اور ان کفار ومشرکین عرب کا راستہ بھی نہیں جو سیدھے راستہ کو چھوڑ کر گمراہ

---

[1] الجواب الصحیح: ۱/ ۱۸۰۔ ۱۸۱

ہوئے۔ ان کی یہ تفسیر نہ صرف جمہور مفسرین اسلام کی تفسیر کے خلاف تھی بلکہ خود قرآن مجید کی صریح آیات کے خلاف تھی۔ قرآن مجید خود شہادت دیتا ہے کہ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ سے مراد نبیین، صدیقین، شہدا اور صالحین کی جماعت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَ مَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓـئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ‌ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓـئِكَ رَفِيۡقًا ؕ﴾ [1]

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے پس وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا یعنی نبیوں، صدیقوں، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا اور یہی بہتر ساتھی ہوں گے۔''

اَلۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ سے مراد یہودی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ‌ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ‌ ؕ﴾ [2]

''اور وہ اللہ کے غصہ کو لے کر لوٹے اور ان پر عاجزی ماردی گئی۔ یہ اس لیے کہ وہ خدا کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور بغیر کسی حق کے انبیا کو قتل کرتے تھے۔''

وَلَا الضَّآلِّيۡنَ سے مراد نصاریٰ ہیں جیسا کہ فرمایا:

﴿وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَ اَضَلُّوۡا كَثِيۡرًا وَّ ضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ﴾ [3]

''اور تم اس قوم کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور بہت سوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔''

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ ہر ایک خاص و عام آدمی اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ قرآن مجید نے نصرانیوں کو بار بار کافر اور گمراہ بتایا ہے۔ کیا ایسی حالت میں اس بات کا کوئی امکان باقی رہ جاتا ہے کہ امت محمدیہ کو نماز میں ان کے راستے کی ہدایت مانگنے کی تاکید کرے۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو دنیا بھر کا جھوٹا ہو اور افتراء و بہتان اور جہل و

[1] ٤/النساء: ٦٩۔ [2] ٣/آل عمران: ١١٢۔ [3] ٥/المائدۃ: ٧٧۔

ضلالت میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ اگر بات ایسی ہوتی تو مسلمان نصاریٰ کے دین میں داخل ہو جاتے ان کا مقابلہ کیوں کرتے اور ان سے جزیہ کیوں لیتے۔

نصرانی علما کا کہنا یہ تھا کہ قرآن مجید میں صراط کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ رومی زبان کا ہے جس کو اسطراط یا Street کہتے ہیں۔ امام موصوف نے اس کے غیر عربی ہونے سے انکار کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ عربی لفظ ہے۔ رومی زبان سے ہرگز ماخوذ نہیں ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ تین شکلوں سے استعمال ہوا ہے۔ یعنی (۱) صراط (۲) سراط اور (۳) زراط اس کے معنی واضح راستے یا الطريق المحدود بجانبين الذى لا يخرج عنه (وہ راستہ جو دونوں طرف سے گھرا ہوا ہو اور اس سے باہر نہ جاتا ہو) کے ہیں۔ امثالِ عرب میں کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی اس محدود و معتدل راستے کے ہیں جس کے ذریعہ ایک راہ چلنے والا آدمی منزل مقصود کو پہنچ جاتا ہے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ اس لفظ کا استعمال ہوا ہے مگر وہ خاص خدا ہی کے راستہ کے لیے ہے۔ شیطان یا دوسرے برے راستوں کے لیے صراط کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ اس کے لیے سبیل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ [1]

اعیادِ نصاریٰ میں شرکت

ان مذہبی اختلافات کے باوجود مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان دوستانہ روابط موجود تھے۔ جن کی بنا پر دونوں ایک دوسرے کی خوشی اور رنج کی تقریبات اور مختلف تہواروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ امام ابن تیمیہ کے بعض فتوؤں کے جوابات [2] کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمان نصرانیوں کی عید الخمیس بھی منایا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو دودھ، انڈے وغیرہ بطور تحفے اور ہدیے کے بھیجا کرتے تھے۔ مسلمان عورتیں اس روز قبر پر جایا کرتی تھیں اور بخور جلا کر برکت حاصل کرتی تھیں اور بعض عورتیں زیتون کے پتے پانی میں ڈال کر غسل کیا کرتی تھیں۔ اس دن بڑے چھوٹے تمام لوگ چھوٹے چھوٹے ناقوس ہاتھ میں لے کر گلیوں میں پھونکتے پھرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اگر اس دن بخور جلائے جائیں تو جلانے والوں پر آنکھ، جادو، سانپ، بچھو اور کیڑوں مکوڑوں کا

---

[1] الجواب الصحیح ۲/ ۸۵، ۸٦۔ [2] فتاویٰ ابن تیمیة: ۲/ ۷٤۔ ۷۹۔

کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ درحقیقت نصاریٰ کے عقیدے تھے جو مسلمانوں میں پھیل گئے تھے۔
امام ابن تیمیہ نے اس پر سخت تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ مسلمان عورتوں کی جہالت اس قسم کی بد عقیدگی کا اصلی باعث ہے اور اس کا اثر چھوٹے چھوٹے بچوں پر بھی پڑتا ہے اور وہ دوسروں کی دیکھا دیکھی ناقوس پھونکتے پھرتے ہیں۔ ایسی حالت میں مسلمان مردوں کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو سمجھائیں اور اس قسم کے منکرات سے ان کو روکیں۔ [1] وہ کہتے ہیں اس قسم کے کام وہی مسلمان کر سکتے ہیں جن کے دل مر چکے ہوں اور ایمان کی روشنی سے محروم ہو گئے ہوں۔ [2]

اہل کتاب کا ذبیحہ کھانا جائز ہے

اس زمانہ کے معاشرتی مسائل سے ایک اہم مسئلہ یہ بھی تھا کہ آیا مسلمانوں کو اہل کتاب کا ذبیحہ کھانا جائز ہے یا نہیں؟ قرآن مجید میں صاف حکم موجود ہے:

﴿ اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ [3]

”آج تمہارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور پاک دامن مومن بیویاں اور وہ پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے (تمہارے لیے حلال ہیں)۔“

اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سورۂ مائدہ، سورۂ بقرہ اور سورۂ ممتحنہ کے بعد کی سورت ہے بعض حدیثوں میں ہے کہ المائدة من آخر القرآن نزولا فاحلوا حلالها وحرموا حرامها۔ (نزول کے لحاظ سے سورۂ مائدہ قرآن کی آخری سورت ہے پس تم اس کے حلال کو حلال جانو اور اس کے حرام کو حرام مانو) اسی لیے سورۂ بقرہ کی آیت ﴿ وَ لَا تَنْكِحُوا

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیة: ۷۷/۲۔ [2] ایضًا: ۷٦۔ [3] ٥/المائدة:٥۔

الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ﴾ [1] اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو تاوقتیکہ وہ ایمان نہ لے آئیں)۔اور سورۂ ممتحنہ کی آیت ﴿ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴾ [2] اور تم کافر عورتوں سے شادی نہ کرو) کومعارض قرار دے کر اس آیت کے حکم کو منسوخ نہیں قرار دیا جاسکتا۔

کتاب وسنت اور اجماع صحابہ و امت سے بھی یہی ثابت ہے کہ اہل کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لیے حلال ہے۔ ان کی عورتوں سے شادی کرنا بھی جائز ہے۔ مشہور صحابی حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی عورت سے شادی کی تھی۔ صحابہ میں سے کسی نے بھی اس پر کوئی گرفت نہیں کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا باتفاق صحابہ جائز تھا۔

کھانے کے بارے میں صرف فواکہ اور میوہ جات یا خشک چیزوں ہی کی تخصیص نہیں ہے بلکہ ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا گوشت بھی کھا سکتے ہیں۔ خیبر کی لڑائی کے زمانہ میں ایک یہودی عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھنے ہوئے گوشت کی دعوت دی تھی جس کو آپ نے قبول فرمایا تھا۔ نیز آپ نے ایک یہودی کی دعوت قبول کی تھی جس نے آپ کو جو کی روٹی اور چربی کھلائی۔ جب صحابۂ کرام نے ملک شام ومصر اور عراق کو فتح کیا تو یہود ونصاریٰ کا ذبیحہ کھایا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے کھانے مسلمانوں کے لیے حلال تھے اور اب بھی حلال ہیں۔

اس میں اس بات کی بھی کوئی تخصیص نہیں ہے کہ یہ اہل کتاب تورات وانجیل کی حقیقی اور سچی تعلیمات پر قائم ہوں یا اسلام کے آنے سے پہلے انہوں نے دین یہودی یا دین مسیحی اختیار کیا ہو بلکہ یہ حکم ہر اس یہودی اور نصرانی کے لیے بھی شامل ہے۔ جس نے اسلام کے آنے کے بعد اہل کتاب کا دین اختیار کرلیا۔ عرب قبائل میں سے بہت سوں نے یہودی یا مسیحی دین کو قبول کرلیا تھا۔ بنوتغلب، تنوخ، بہرا، بنوکنانہ وحمیر وغیرہ مسیحی ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود عام صحابہ وتابعین کا عمل یہی تھا کہ وہ ان کا ذبیحہ کھالیا کرتے تھے۔ صرف بنوتغلب کے بارے میں خفیف سا اختلاف ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ بنوتغلب نے شراب

---

[1] ٢/البقرة ٢٢١۔ [2] ٦٠/الممتحنة:١٠۔

خوری کے سوا دین مسیحیت کی کسی اصل یا تعلیم پر عمل نہیں کیا۔ وہ عملاً نہیں صرف عقیدۂ نصرانی تھے۔ اس لیے ان کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال نہیں ہے۔ مگر عام صحابہ کرام اس رائے کے مخالف تھے وہ اور نصرانیوں کی طرح بنوتغلب کے ہاتھ کا ذبیحہ بھی کھایا کرتے تھے۔

امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ ہر زمانہ میں اور ہر شہر میں مسلمانوں کا عمل یہی رہا ہے کہ وہ اہل کتاب کا ذبیحہ کھایا کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

مازال المسلمون فی کل عصر و مصر یاکلون ذبائهم فمن انکر ذلك فقد خالف اجماع المسلمین۔ [1]

''مسلمان ہر زمانہ اور ہر شہر میں ان کا ذبیحہ کھایا کرتے تھے۔ پس جو شخص بھی اس کا انکار کرتا ہے وہ مسلمانوں کے اجماع کا مخالف ہے۔''

شراب خوری اور اس کا اثر

امام ابن تیمیہ کے بعض فتاویٰ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں یہودی اور نصرانی عام طور پر شراب بناتے تھے، خود پیتے تھے اور دوسروں کو بھی پلاتے تھے۔ اس کی تجارت کی بدولت وہ بہت زیادہ مالدار ہو گئے تھے۔ قانون کے برخلاف وہ بعض مسلمانوں کو بھی شراب پلانے لگے تھے۔ جب امام موصوف سے فتویٰ پوچھا گیا تو انہوں نے اس کو نقض عہد کے مترادف قرار دیا اور لکھا کہ ذمی یہودی اور نصرانی اگر اپنے گھر پر رہ کر شراب پیتے ہیں تو ان پر گرفت کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر اس کا اظہار اور اعلان کرتے ہیں جس کی وجہ سے بعض مسلمانوں کو شراب پینے کی ترغیب ہوتی ہے تو پھر ایسے یہودیوں اور نصرانیوں کو سخت سزا دینی چاہیے بلکہ شراب خانوں کو توڑ کر وہاں کی شراب بہا دینی چاہیے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے واقعہ سے استدلال کیا ہے جبکہ ان کے حکم سے رویشد نامی ایک دوکاندار کی دکان توڑ دی گئی تھی اور وہاں کی شراب بہا دی گئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس دکاندار سے کہا تھا کہ تم رویشد نہیں بلکہ فویسق ہو۔

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیة: ۲/ ۱٦۳۔

بیت المقدس کی زیارت میں بدعات کا ارتکاب

بیت المقدس کچھ مدت تک مسلمانوں کا قبلہ اول رہا ہے ان کے نزدیک اس کی اتنی ہی عزت ہے جتنی کہ یہودیوں اور نصرانیوں کے پاس ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ فتح ہوا تھا۔ اس وقت سے اکثر مسلمان وہاں زیارت کے لیے جاتے تھے اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھتے تھے۔ وہاں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی قبر بھی موجود تھی جس پر ایک قبہ بنا ہوا تھا۔ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں لوگ محض زیارت کی غرض سے جایا کرتے تھے اور مسجد اقصیٰ میں عبادت کر کے چلے آتے تھے لیکن جب پانچویں صدی ہجری میں نصرانیوں نے اس کو فتح کر لیا تو نئی نئی بدعات جاری ہونے لگیں۔ انہوں نے ابراہیم خلیل اللہ کی قبر پر ایک گرجا تعمیر کیا۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں قبر کے اوپر کا قبہ کھلا ہوا نہیں تھا بلکہ بند تھا۔ جب نصرانیوں نے اس کو کھول کر کلیسا تعمیر کر لیا تو عام جاہل مسلمانوں کی بھی اس سے عقیدت بڑھ گئی۔ لوگ وہاں پہنچ کر خاص طور پر دال اور روٹی تیار کر کے کھاتے تھے اور اس کو مقدس سمجھ کر اسے اپنے وطن لے آتے تھے۔ اور لوگوں کے درمیان تبرک کے طور پر تقسیم کرتے تھے۔ عوام یہ سمجھتے تھے کہ ایسا کرنے سے بڑی برکت حاصل ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس دال اور روٹی کے لیے ایک وقف بھی کیا تھا۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے زمانہ سے یہ رسم چلی آ رہی ہے۔ جب امام موصوف سے اس کے متعلق فتویٰ پوچھا گیا تو انہوں نے عام لوگوں کے اس طرز عمل پر بڑی سخت تنقید کی اور لکھا کہ قبر خلیل یا کسی اور نبی کی قبر کی زیارت کے مقصد سے سفر کرنا ناجائز ہے۔ گمراہ مسلمان درحقیقت نصاریٰ کے عقائد و خیالات کی پیروی میں اس قسم کے کام کرتے چلے جا رہے تھی۔ نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نہ آپ کے خلفاء نے اس پر کوئی وقف کیا تھا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے دارمیوں کو یہ قریہ دے دیا تھا۔ آپ نے ان کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ قبر خلیل پر دال روٹی پکا کر لوگوں کے درمیان تقسیم کرو۔

دال کے متعلق ایک روایت بھی پیش کی جاتی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كلوا العدس فانه يرق القلب و قد قدس فيه سبعون نبيا))

”دال کھاؤ کیونکہ وہ دل کو نرم کرتی ہے اور اس میں ستر نبیوں نے تقدیس بتائی ہے۔“

امام موصوف لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بنائی ہوئی ہے، کسی اہل علم نے اس کو روایت نہیں کیا ہے۔ یہودیوں نے اچھے کھانوں کو چھوڑ کر چند چیزوں کا مطالبہ کیا تھا جن میں سے ایک دال بھی تھی۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کی ابتداء میں موجود ہے۔ اس پر اللہ نے یہودیوں سے کہا تھا ﴿اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ط﴾ [1] ”کیا تم بہتر چیز کے بدلے کم تر درجہ کی چیز چاہتے ہو۔“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دال کا کھانا کوئی محمود اور قابل تعریف فعل نہیں ہے۔

[1] ۲/البقرۃ:۶۱۔

فقہی اجتہادات

آنحضرت ﷺ جب تک زندہ رہے فروعی مسائل کے متعلق شرعی حکم کے معلوم کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسئلہ دریافت کرتے تھے اور آپ قرآن مجید سے استنباط کر کے یا وحی آنے کے بعد اس کا جواب عنایت فرماتے تھے۔ آپ کے یہ تمام فتوے احادیث کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب اعلام الموقعین کی چوتھی جلد کے آخر میں ان سب کو یکجا کر دیا ہے ان سے ان کی نوعیت معلوم کی جا سکتی ہے۔

آپ کے وصال کے بعد اکابر صحابہ کتاب اللہ اور سنت رسول سے فروعی مسائل کا تصفیہ کرتے تھے اور جب ان دونوں میں کوئی حکم نہیں ملتا تو عام علما و فقہاء اُمت سے رائے لیتے تھے اور مسئلے کی مختلف نظیروں کو سامنے رکھ کر کسی مسئلے کا فیصلہ کرتے تھے۔ یہیں سے شرعی احکام کے چار ماخذ قرار پائے، کتاب، سنت، اجماع اور قیاس۔

آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت عمر نے اور ان کے بعد خلفاء نے اپنے اپنے زمانے میں ہر ہر صوبے کے لیے قاضی، مفتی اور معلم مقرر کیے، تاکہ اُمت مسلمہ کو اسلامی احکام و ارشادات کی تعلیم و تلقین کرتے رہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آنحضرت ﷺ سے جو کچھ سنا اور انہیں جو کچھ کرتے دیکھا اس کو اُمت تک پہنچایا اور مختلف طریقوں سے اس کی تعلیم و تلقین کی، چونکہ ہر ایک کے علم کا دائرہ دوسرے کے دائرہ سے مختلف تھا اس لیے ہر ایک اپنے علم میں ممتاز ہوا۔ حضرت زید بن ثابت فرائض میں زیادہ درک رکھتے تھے، حضرت معاذ بن جبل فقہ میں کمال رکھتے تھے۔ اسی لیے ایک مرتبہ حضرت عمر بن الخطاب نے جابیہ میں خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ جو کوئی فرائض کے متعلق مسئلہ دریافت کرنا چاہے وہ زید بن ثابت کے پاس جائے اور جو کوئی فقہ کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہے وہ معاذ بن جبل کے پاس جائے اور جو کوئی

مال لینا چاہے وہ میرے پاس آئے۔ [1]

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو شخص جس قسم کا علم زیادہ جانتا تھا اسی قسم کا مسئلہ بھی اس سے پوچھا جاتا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جنہوں نے فتوے دیے ان کی تعداد ایک سو تیس سے کچھ زیادہ بتائی جاتی ہے۔ [2]

حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں ان کے نام گنائے ہیں۔ ان سب میں کثرت کے ساتھ جن سے فتوے منقول ہیں وہ سات ہیں یعنی حضرت عمر بن الخطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر، پھر ان میں سے چار بزرگ ایسے تھے جن کے ذریعہ اُمت مسلمہ میں دین وفقہ کا علم پھیلا ہے حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمر کے ذریعہ مدینہ والوں میں، حضرت عبداللہ بن عباس کے ذریعے مکے والوں میں، حضرت عبداللہ بن مسعود کے ذریعہ عراق والوں میں دین اور فقہ کا علم پھیلا اور ان کی اشاعت ہوئی۔ [3]

زمانہ تابعین

جب تابعین کا زمانہ آیا تو مدینہ مکہ، بصرہ، کوفہ، شام، مصر، یمامہ، یمن، خراسان وغیرہ ہر جگہ علما وفقہا کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی جن میں سعید بن المسیّب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، خارجہ بن زید، سلیمان بن یسار، عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، ابان بن عثمان، سالم، نافع، عطاء بن ابی رباح، طاوس بن کیسان، مجاہد بن جبر، عمرو بن دینار، عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج، سفیان بن عیینہ، حسن البصری، محمد بن سیرین، مسلم بن یسار، ابو بردہ بن ابوموسیٰ، علقمہ بن قیس النخعی، عمرو بن شرحبیل، ابراہیم النخعی، سعید بن جبیر، ابو ادریس الخولانی، قبیصہ بن ذؤیب الخزاعی، مکحول الشامی، یزید بن ابی حبیب، لیث بن سعد وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے، عام لوگ جب ان سے کوئی مسئلہ پوچھتے تھے تو وہ کتاب وسنت اور آثار صحابہ کے مطابق جواب دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے سامنے اکابر صحابہ کے فیصلے رکھا کرتے تھے اگر ان کے

---

[1] اعلام الموقعین: ۱/ ۱۷۔ [2] اعلام الموقعین: ۱/ ۹۔ [3] ایضًا: ۱۶۔

درمیان کوئی اختلاف پایا جاتا تو کتاب وسنت ہی سے کسی ایک قول کو ترجیح دیتے تھے۔

حدیث وفقہ کی جمع وتدوین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہی سے حدیث اور فتاویٰ کی جمع وتدوین کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جس کو کوئی حدیث معلوم ہوتی تھی وہ لکھ لیا کرتا تھا اور بڑے بڑے علما کے تمام فتوے مدون کر لیے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے پانچ سو صحابہ سے ملاقات کی تھی۔ بعض علما نے سات ضخیم جلدوں میں ان کے فتوے مدون کیے تھے۔ [1] اس طرح یہ تمام تحریریں ایک سے دوسرے کو ورثہ میں ملتی گئیں یہاں تک کہ حدیث وفقہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ سینوں اور کتابوں میں جمع ہوتا گیا جن سے کام لے کر آئندہ حدیث وفقہ کی باقاعدہ کتابیں مرتب کی گئیں۔

ائمہ اربعہ

یوں تو دوسری اور تیسری صدی ہجری میں علم وفضل اور دین وفقہ کے لحاظ سے بیسیوں اشخاص کو شہرت نصیب ہوئی، مگر چار شخصوں نے بہت بڑا نام کمایا۔ یعنی امام ابوحنیفہ (المتوفی: ۱۵۰ھ)، امام مالک (المتوفی: ۱۷۹ھ)، امام محمد ادریس الشافعی (المتوفی: ۲۰۴ھ) اور امام احمد بن حنبل (المتوفی: ۲۴۱ھ)۔ امام ابوحنیفہ کو امام ابو یوسف (المتوفی: ۱۸۲ھ) اور امام محمد بن الحسن الشیبانی (المتوفی: ۱۸۹ھ) جیسے دو زبردست شاگرد ملے، جنھوں نے ان کی فقہ کو مدون کر دیا۔ امام ابو یوسف خلیفہ عباسی ہارون الرشید کے زمانے میں قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ ان کے ساتھی محمد بن الحسن نے کئی کتابیں لکھیں۔ پھر مدینہ منورہ جا کر امام مالک سے حدیث پڑھی اور فن حدیث پر ایک کتاب ترتیب دی جس میں ہر مسئلہ کے تحت امام مالک کے ساتھ امام ابوحنیفہ کی رائے اور ان کے دلائل بھی پیش کیے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کی وجہ سے امام ابوحنیفہ کے مسلک کو عراق، خراسان، اور ماوراء النہر وغیرہ میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ امام مالک نے مؤطا لکھی اور بہت سے شاگردوں کو پڑھایا جنھوں نے مغربی افریقہ میں ان کے مسلک کو پھیلایا۔ امام شافعی کے شاگردوں نے ملک شام اور مصر اور دوسری جگہوں پر ان کے خیالات کا

---

[1] اعلام الموقعین: ۱/ ۱۹۔

چرچا کیا۔ امام احمد بن حنبل نے بغداد میں رہ کر فتنہ اعتزال کا زبردست مقابلہ کیا۔ اور بے پناہ مصیبتیں جھیلیں۔ آپ لاکھوں حدیثوں کے حافظ تھے۔ آپ پر احادیث نبویہ اتنی غالب تھیں کہ وہ ان کے مقابلہ میں کسی رائے اور قیاس کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔ وہ خود کہا کرتے تھے:

دين النبي محمد آثار
نعم المطية للفتى الاخبار

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دین آپ کے آثار ہیں۔ نوجوانوں کے لیے آپ کے اخبار بہترین ذریعہ علم ہیں۔

لا تخدعن عن الحديث واهله
فالراى ليل والحديث نهار

حدیث اور حدیث والوں سے دھوکہ نہ کھانا کیونکہ رائے رات کے مانند ہے اور حدیث دن کا درجہ رکھتی ہے۔''

ولربما جهل الفتى طريق الهدى
والشمس طالعة لها انوار

بسا اوقات ایک نوجوان ہدایت کا راستہ کھو بیٹھتا ہے جبکہ سورج آسمان پر ہوتا ہے اور اس کی کرنیں چمکتی رہتی ہیں۔

فقہی مسائل میں اختلاف لازمی تھا

اہل علم کی طبیعتوں کے اختلاف کا لازمی نتیجہ فقہی مسائل کا اختلاف تھا۔ مگر یہ اختلاف کسی تعصب یا تقلید کی بنا پر نہیں تھا بلکہ ہر ایک امام یہی سمجھتا تھا کہ فلاں مسئلہ میں وہ جو رائے رکھتا ہے وہی کتاب وسنت اور آثار صحابہ کے دلائل کے مطابق ہے۔ اس کے باوجود ہر ایک دوسروں کو اندھی تقلید سے منع کیا کرتا تھا۔ امام ابوحنیفہ فرماتے تھے کہ یہ میری رائے ہے پس جو بھی اس سے بہتر رائے پیش کرے گا اس کو ہم قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ امام ابو یوسف نے فرمایا کہ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہماری جیسی بات کہے تاوقتیکہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہم نے کہاں سے لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو یوسف نے کئی مسائل میں اپنے اُستاد

ابوحنیفہ سے اختلاف کیا۔ حج کے موقع پر امام ابو یوسف کی امام مالک سے ملاقات ہوئی۔ اور ان سے صاع کی مقدار اور سبزیوں کی زکوٰۃ کے متعلق مسئلہ پوچھا: امام مالک نے مدینہ والوں کا عمل بتایا تو امام ابو یوسف نے مدینہ کے صاع کو تسلیم کر لیا اور کہا: اے ابوعبداللہ! اگر میرے ساتھی (یعنی امام ابوحنیفہ) بھی وہی دیکھتے جو میں نے آج دیکھا ہے تو صاع کے مقدار کے متعلق ان کی بھی یہی رائے ہوتی جو آپ کی رائے ہے۔ [1]

امام مالک فرمایا کرتے تھے میں بھی ایک انسان ہوں میرا قول درست بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی ہوسکتا ہے، اس لیے میری بات کتاب وسنت پر پیش کر کے دیکھو اور جو درست آئے اس کو اختیار کرو۔ امام شافعی کا یہ قول تھا کہ جو کوئی کسی دلیل کے بغیر علم تلاش کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ کوئی رات میں لکڑیوں کا گٹھا اپنے سر پر اُٹھائے جا رہا ہے اور اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اس میں سانپ ہے اور اسے ڈس رہا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جب تمہیں صحیح حدیث مل جائے تو میرے قول کو دیوار پر پھینک مارو۔ امام احمد نے ایک مرتبہ اپنے ایک شاگرد سے کہا تھا کہ تم میری تقلید نہ کرو اور نہ مالک یا ثوری یا اوزاعی کی تقلید کرو۔ تم اسی جگہ سے علم حاصل کرو جہاں سے انہوں نے حاصل کیا ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہر ایک نے لوگوں کو کتاب وسنت ہی کی پیروی کی طرف توجہ دلائی تھی۔

تقلید کی ابتداء اور ترقی

ائمہ اربعہ کے بعد جب ان کے آراء وخیالات کی تدوین ہوئی ان پر شرحیں لکھی جانے لگیں اور مدرسوں میں بحث ومباحثے شروع ہوئے تو فطری طور پر گروہ بندیاں ہونے لگیں جو جس ماحول میں پیدا ہوا اور جہاں تعلیم وتربیت پائی۔ اس نے وہیں کے اثرات قبول کیے۔ امام محمد نے اکثر اپنی کتابوں میں "وبه قال ابو حنيفه و عامة فقهائنا" کا فقرہ استعمال کیا تھا بعد کے فقہا وعلما نے عندنا وعند الشوافع کے الفاظ استعمال کیے۔ اور اس طرح تیسری صدی ہجری کے آخر میں گروہ بندی شروع ہوگئی تھی، مگر کوئی اپنے نام کے ساتھ حنفی یا مالکی یا شافعی یا حنبلی نہیں لکھتا تھا۔ چوتھی صدی ہجری کے بعد سے تقلید کا عام طور پر رواج ہوگیا

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیة: ١/ ٣٨٤۔

تھا۔ ہر گروہ کی کتابیں اور ان کی شروحات الگ الگ لکھی جانے لگیں اور اپنے اپنے مسلک کو کتاب وسنت کے مطابق بنا کر دکھانے کی کوشش کی جانے لگی۔ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ہر ایک عالم اپنے آپ کو کسی ایک مسلک کے ساتھ منسوب کرنا لازمی خیال کرتا تھا اور اپنے نام کے ساتھ حنفی یا مالکی یا شافعی یا حنبلی ضرور لکھتا تھا، پھر ہر گروہ کے علما کے تذکرے الگ الگ مرتب کیے جانے لگے جیسے طبقات الحنفیہ، طبقات المالکیہ، طبقات الشافعیہ، طبقات الحنابلہ، ہر ایک گروہ کی مسجدیں اور مدرسے الگ ہو گئے۔ جہاں خاص اسی مسلک کی کتابیں پڑھائی جانے لگیں۔ آگے چل کر مصر میں ۶۶۳ ھ سے چاروں مذہب کے قاضی الگ الگ مقرر ہونے لگے جنہیں فتوے دینے کے وقت اپنے ہی مسلک کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا اعتماد کتاب وسنت اور آثار صحابہ وتابعین کو چھوڑ کر محض ان مخصوص فقہ کی کتابوں پر ہو گیا۔ اگر ان کے سامنے کوئی سوال پیش ہوتا تو وہ دلائل میں کتاب وسنت کے نصوص کو پیش کرنے کی بجائے فقہی کتابوں کے اقتباسات کو پیش کر دینے پر اکتفا کرتے تھے۔

جامد تقلید کے نقصانات

جب کسی قوم میں جامد تقلید شروع ہو جاتی ہے تو اس قوم کے علما وفقہا سے وسعت نظر اور دقت فہم مفقود ہو جاتی ہے۔ وسیع طور پر کتابوں کا مطالعہ کرنے اور مختلف فیہ آراء واقوال پر غور وفکر کر کے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی ان میں سکت نہیں ہوتی۔ علمی وتحقیقی جدو جہد اور کدوکاوش ختم ہو جاتی ہے۔ متقدمین یا متوسطین علما کی تصنیفات کو چھوڑ کر صرف متاخرین کی کتابوں پر اکتفا کر لیا جاتا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ زمان ومکان کے اختلاف سے مسائل کے احکام کی نوعیت میں بھی کچھ فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی امام کی رائے سے اختلاف اللہ اور اس کے رسول کی رائے سے اختلاف اور کفر کے مترادف ہو جاتا ہے ایک جامد مقلد مفتی بسا اوقات اپنے ہی گروہ کے دو بڑے شیوخ کی اختلافی آراء میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے سے کتراتا ہے۔ تقلید درحقیقت عدم علم اور فہم کا نام ہے۔ تقلید کی وجہ سے قوم کے علما وفقہاء زندگی کے نئے نئے مسائل کے حل کرنے سے قاصر اور عاجز ہو جاتے ہیں۔ اور قوم میں آگے بڑھ کر

ترقی کرنے کا ولولہ اور جوش اور جذبہ باقی نہیں رہتا، اسی لیے امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیم نے جامد تقلید کے خلاف بہت ہی سخت اور کڑی تنقیدیں کی ہیں۔ حافظ ابن قیم نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "یہ (تقلید شخصی) ایک بُری بدعت ہے جو اُمت میں جاری ہوئی ہے۔ ائمہ اسلام میں سے کسی نے بھی اس کی تعلیم نہیں دی ان کا رتبہ اور ان کی قدر اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ وہ تقلید کو لوگوں کے لیے لازم قرار دیں وہ اللہ اور اس کے رسول کو ہم سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ سب سے زیادہ بعید اس شخص کا قول ہے جو یہ کہتا ہے کہ عالموں میں سے کسی ایک عالم کا مذہب اختیار کرنا لازمی ہے۔ اس سے بھی زیادہ بعید اس شخص کا قول ہے جو چار مذاہب میں سے کسی ایک کی پیروی کو لازم قرار دیتا ہے۔ خدا کے لیے ذرا سوچو؟ کہ یہ کتنے ہی تعجب کی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کرام اور تابعین و تبع تابعین اور ائمہ اسلام کے سارے مذاہب باطل ہو جائیں تمام ائمہ اور فقہاء میں سے صرف چار اشخاص کا مذہب برقرار رہے۔ ائمہ میں سے کیا کسی نے یہ بات کہی ہے؟ یا ان کے کلام کا کوئی لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول نے صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین پر وہ چیزیں واجب قرار دی ہیں جو قیامت تک باقی رہیں گے۔ قدرت و عجز، زمان و مکان اور حالات کے بدل جانے سے واجب کی حیثیت اور کیفیت بدل نہیں جاتی۔ اللہ اور اس کے رسول نے جو چیزیں واجب قرار دی ہیں وہ سب کے لیے ضروری ہیں جو شخص ایک عامی کے لیے تقلید کو درست بتاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اعتقاد کے مطابق اس کو صحیح اور حق سمجھتا ہے پس اپنے ہی اعتقاد کے مطابق ایک عامی کو اپنے واجبات ادا کرنے چاہئیں۔ اگر ان لوگوں کا یہ قول صحیح ہو تو پھر اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کے مطابق فتویٰ پوچھنا اور اس پر عمل کرنا لازم حرام ہوگا۔ [1]

شخصی تقلید کے خلاف طبعی میلانات

یہ سب جانتے ہیں کہ امام موصوف کے آباء و اجداد حنبلی تھے آپ کے دادا مجد الدین ابو البرکات عبد السلام ابن تیمیہ حدیث و فقہ کے بڑے ماہر عالم تھے ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔

---

[1] اعلام الموقعین: ٤/ ٢٢٧۔

ان کے اندر اجتہاد کا جذبہ موجود تھا۔ انہوں نے بعض مسائل میں ائمہ سے اختلاف بھی کیا تھا۔ ان کے لڑکے عبدالحلیم ابن تیمیہ میں بھی وہی روح کام کر رہی تھی۔ امام ابن تیمیہ نے اسی آزاد مطالعہ اور غور و فکر کی فضا میں تربیت پائی تھی وہ ابتدا میں ایک حنبلی عالم ہی کہلائے اور ایک حنبلی مدرسہ کے اُستاد مقرر ہوئے جس پر حنابلہ نے وقف کیا تھا۔ مگر جیسے جیسے ان کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا ان کی نظر اور عقل و فہم میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی۔ حدیث و فقہ کی کوئی کتاب بھی ایسی نہیں تھی جو ان کو ملی ہو اور نہ پڑھی ہو، انہوں نے ہر مسلک و مذہب کی فقہی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا اور متاخرین کی تصنیفات کی بجائے متقدمین کی تصنیفات کی طرف رجوع کیا اور پھر تمام ائمہ کبار کے اقوال و آراء کو کتاب و سنت کی روشنی میں جانچا اور پرکھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اتنی محنت کی جو کسی اور سے نہیں ہو سکتی تھی جب کوئی دقیق اور پیچیدہ مسئلہ آن پڑتا اور اس کا فوری حل نظر نہیں آتا تو فوراً یہ مسنون دعا پڑھتے تھے:

اللهم رب جبرائيل و ميكائيل و اسرافيل فاطر السمٰوٰت والارض، عالم الغيب والشهادة، انت تحكم بين عبادك فيما كانوا فيه يختلفون، اهدنى لما اختلف فيه من الحق باذنك انك تهدى من تشاء الى صراط مستقيم۔ [1]

اے اللہ! جبرائیل و میکائیل و اسرافیل کے پروردگار، آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، غیب اور حضور کے جاننے والے، تو اپنے بندوں کے درمیان جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں فیصلہ کرتا ہے، مجھ کو اپنی اجازت سے حق کا وہ راستہ دکھا جس میں اختلاف ہو گیا ہے بیشک تو جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے۔

اور اکثر بارگاہ الٰہی میں گڑگڑا کر یہ دعا مانگتے تھے: يا معلم ابراهيم علمنى، اے ابراہیم کے استاد مجھ کو علم سکھا۔

خود ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیم گواہی دیتے ہیں:

---

[1] صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين و قصرها، باب الدعا فى صلاة الليل و قيامه، ح: ٧٧٠ (١٨١١)

وشهدت شيخ الاسلام قدس اللّٰه روحه اذا اعيته المسائل و استصعبت عليه فر منها الى التوبة والاستغفار والاستعانة باللّٰه واللجاء اليه و استنزال الصواب من عنده والاستفتاح من خزائن رحمته فقلما يلبث المدد الالهى ان يتتابع عليه مدا و تزدلف الفتوحات الالٰهية اليه بايتهن يبدا ولاريب ان من و فق لهذا الافتقار علما و حالاوسار قبله فى ميادينه حقيقة و قصدا فقد اعطى حظه من التوفيق و من حرمه فقد منع الطريق والرفيق فمتى اعين مع هذا الافتقار ببذل الجهد فى درك الحق فقد سلك به الصراط المستقيم ذلك فضل اللّٰه يوتيه من يشاء واللّٰه ذوالفضل العظيم۔ [1]

اور میں نے شیخ الاسلام قدس اللہ روحہ کو دیکھا کہ جب مسائل آپ کے لیے ناقابل حل اور دشوار ہو جاتے تھے تو فوراً خدا سے توبہ اور مغفرت چاہنے لگتے اور اسی سے مدد مانگتے اور اسی کی طرف پناہ لیتے تاکہ اس کے پاس سے سچی بات اُترنے لگے اور اس کی رحمت کے خزانے ان پر کھلیں، تھوڑی دیر نہیں گزرتی تھی کہ الٰہی امداد ان پر پے درپے نزول ہونے لگتی اور الٰہی فتوحات کا ان پر ہجوم ہونے لگتا تھا کہ ان میں سے پہلے کون ان پر اُترے اور ہمیں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جس کسی کو علم اور حال میں خدا کی طرف رجوع کرنے کی توفیق حاصل ہو اور اس کا دل حقیقتاً اور قصداً اس کے میدانوں میں تیز چلنے لگتا ہو تو اس کو خدا سے توفیق کا ایک بہت بڑا حصہ ملتا ہے اور جو اس سے محروم ہو جائے اس کو سیدھا راستہ اور ساتھی میسر نہیں آتا پس اس ذلت و افتقار کے ساتھ ساتھ حق کے پانے کے لیے پوری کوشش ہو تو اس کو سیدھا راستہ مل جاتا ہے اور یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

---

[1] اعلام الموقعين: ٤/ ١٥٠۔

جب صدق دل سے فقہی احکام ومسائل کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے کی کوشش کی تو ان کے سامنے ایک نیا راستہ نکل آیا جس پر اس زمانہ کا کوئی عالم نہیں چل رہا تھا۔

علما و فقہا کی حالت

امام ابن تیمیہ کے زمانہ میں علما وفقہاء زیادہ تر فقہی کتابوں سے استدلال کرتے تھے جیسا کہ آج کل دستور ہے، کتاب وسنت اور آثار صحابہ وتابعین کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے کہ متقدمین علما وفقہا کا طریقہ تھا۔ بلکہ امام موصوف کے زمانے میں کتاب وسنت اور آثار صحابہ وتابعین سے استدلال کرنا ایک عیب سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

عاب بعض الناس ذكر الاستدلال فی الفتوی وهذا العيب اولى بالعيب، بل جمال الفتوی و روحها هو الدليل فكيف يكون ذكر كلام الله و رسوله و اجمع المسلمين و اقوال الصحابة رضوان الله عليهم و القياس الصحيح عيبا وهل ذكر قول الله و رسوله الاطراز الفتوىٰ۔ [1]

بعض لوگوں نے فتوے میں استدلال کرنے کو عیب سمجھا ہے۔ لیکن یہ عیب ایسا ہے جو خود معیوب ہونے کا مستحق ہے بلکہ فتوے کی آرائش اور اس کی روح دلیل ہی کا ذکر کرنا ہے اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے اجماع اور اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم اور صحیح قیاس کا ذکر معیوب کیونکر ہوسکتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے قول کا ذکر کرنا ہی تو فتوے کے حسن کو دوبالا کردیتا ہے۔

اس جگہ اور دوسری جگہ [2] پر صاف لکھا ہے کہ جب صحابہ کرام اور تابعین میں سے کسی کے سامنے کوئی سوال رکھا جاتا تو وہ فوراً خدا اور اس کے رسول کے اقوال بعینہٖ انہی کے الفاظ میں نقل کرتے تھے اور کہتے تھے قال اللہ کذا او قال الرسول کذا او قال فلان کذا۔ یہی سبب ہے کہ اس زمانہ کے لوگ کتاب وسنت کے نصوص کی پابندی کی وجہ سے ہمیشہ خطا وتناقض و تعقید واضطراب سے بچے رہتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے رسول اکرم ﷺ اور صحابہ وتابعین کا

---

[1] اعلام الموقعين: ٤/ ٢٢٥۔ [2] دیکھو، ایضًا: ١٤٨، ١٤٩۔

زمانہ دُور ہوتا گیا نبوت کی روشنی بھی مدھم پڑتی چلی گئی، اب متاخرین کے نزدیک دین کے اصول وفروع میں اللہ اور اس کے رسول کا نام لینا عجیب ہو گیا ہے۔ آج کل کے اصول دین کی کتابوں میں یہ تصریح کی جاتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے اقوال یقین کا سرمایہ بہم نہیں پہنچا سکتے۔ ان کے خیال کے مطابق اللہ اور اس کے رسول کے اقوال سے وہی لوگ استدلال کرتے ہیں۔ جن کو وہ حشویہ، مجسمہ اور مشبہ کا لقب دیتے ہیں اور فروعی مسائل میں تو ہمارے علما وفقہا انہی لوگوں کی تقلید پر قانع ہو گئے ہیں جنہوں نے فقہ پر مختصر کتابیں لکھ ڈالیں ہیں اور جن میں اللہ اور اس کے رسول کے اقوال کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

امام ابن تیمیہ کا طریقہ کار

امام ابن تیمیہ کا طریقۂ کار اپنے زمانے کے علما وفقہا کے بالکل برعکس تھا۔ وہ ہر مسئلے میں چاہے وہ فقہ کا چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ کیوں نہ ہو، سب سے پہلے کتاب اللہ اور سنت رسول سے استدلال لیتے تھے۔ اور پھر بتاتے تھے کہ اس مسئلہ میں اکابر صحابہ وتابعین کا کیا عمل رہا۔ اس کے بعد تمام بڑے بڑے ائمہ کے آراء واقوال نقل کرتے تھے۔ اور ان میں سے جو قول بھی کتاب وسنت سے زیادہ قریب نظر آتا اس کی وہ تائید کرتے تھے۔ چاہے وہ قول امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ کے مشہور عام مسلک کے خلاف کیوں نہ ہو۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ حق کی تائید ہر ایک جلیل القدر امام کا مسلمہ اصول رہا ہے۔ اگر کوئی مفتی اپنے اجتہاد اور اپنی بصیرت کی بنا پر کسی ایک ایسے قول کی تائید کر رہا ہے جو اپنے امام کے مشہور مسلک کے خلاف ہے تو وہ گویا اپنے ہی امام کے حکم کی پیروی کر رہا ہے۔ کیونکہ ہر ایک امام کا یہی قول تھا کہ جب صحیح حدیث مل جائے تو پھر ہمارے قول کو ترک کر دو۔ [1]

اسی لیے انہوں نے ایک حنفی فقیہ کو اپنے زمانہ کے فقہا کی رائے کے برخلاف بالکل صحیح مشورہ دیا، کہا جاتا ہے کہ ایک حنفی فقیہ امام موصوف کے پاس پہنچا اور اس نے کہا میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ جواب میں کہا میں اپنا مذہب بدل لینا چاہتا ہوں انہوں نے پوچھا کیوں؟ فقیہ نے کہا میں بہت سی صحیح حدیثوں کو اپنے مذہب کے

---

[1] اعلام الموقعین: ٤/ ٢٠٧۔

خلاف پاتا ہوں اس نے یہ بھی کہا کہ میں نے اس بارے میں ایک شافعی مسلک کے شیخ سے رائے دریافت کی تو اس نے کہا کہ تم اگر اپنے مذہب کو چھوڑ بھی دو تو مذہب تم سے نہیں چھوٹ سکتا۔ کیونکہ چاروں مذاہب جڑ پکڑ چکے ہیں ایسی حالت میں تمہارا رجوع کرنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی کہا کہ جب میں نے بعض شیوخ صوفیہ سے رائے لی تو انہوں نے خدا کی طرف رجوع کر کے اس سے ہدایت چاہنے کی تاکید کی ہے۔ امام ابن تیمیہ نے فرمایا: دیکھو مذہب تین طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ ہے جس میں حق بالکل ظاہر ہو اور کتاب وسنت کے موافق ہو۔ اس صورت میں تم دل کھول کر انشراح صدر کے ساتھ اس کا فیصلہ اور فتویٰ صادر کر سکتے ہو۔ دوسرا وہ جو مرجوح ہے اور اس کے خلاف کھلی ہوئی دلیل موجود ہے۔ ایسی حالت میں ہرگز ہرگز تم اس کا فتویٰ نہ دو اور اس کا فیصلہ نہ کرو۔ اس کو اپنے سے دور رکھو۔ تیسرا وہ ہے جو اجتہادی مسائل سے تعلق رکھتا ہے اگر دلائل تمہیں کسی ایک طرف لے جا رہے ہیں تو تم اگر چاہو تو اس کا فتویٰ دو ورنہ فتویٰ دینے سے پرہیز کرو۔ فقیہ نے ان کے اس مشورے کو بڑی مسرت کے ساتھ قبول کیا اور دُعا دی۔ [1]

امام ابن تیمیہ کے زمانہ میں ایک مفتی نے وقف کے کسی مسئلہ میں ایک فتویٰ دیا جو حق کے بالکل مطابق تھا۔ دشمنوں نے اس مفتی کا وہ پہلا فتویٰ نکالا جو چند سال پہلے اس کے بالکل برخلاف دیا تھا اور نائب سلطان کے سامنے شکایت پیش کی۔ نائب یہ دیکھ کر بہت برافروختہ ہوگیا اور اس مفتی سے باز پرس کی۔ امام موصوف نے کہا کہ اس وقت اس مفتی نے تقلید کی بنا پر ایک قول کی تائید کی تھی اور اب جبکہ مسئلہ اور زیادہ واضح ہو گیا ہے تو وہ اپنے قدیم قول پر قائم نہیں رہ سکتا تھا اس لیے حق کے ظاہر ہونے کے بعد اس مفتی نے وہ فتویٰ دیا جو کتاب وسنت کے نصوص صحیحہ کے مطابق ہے۔ جلیل القدر ائمہ کا بھی ہمیشہ سے یہی طریقہ رہا ہے۔ یعنی جب حق ظاہر ہو جاتا تھا تو وہ اپنے پرانے قول سے رجوع کر لیا کرتے تھے۔ امام موصوف سے اس کی توضیح سن کر نائب سلطان خوش ہو گیا اور اس مفتی کے خلاف اس کے دل میں جو جذبہ موجزن ہوا تھا وہ کافور ہو گیا۔

---

[1] اعلام الموقعین: ٤/ ٢٠٦۔

تقلید کے متعلق رائے

امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم تقلید شخصی کے سخت مخالف تھے۔ ابن قیم نے اپنی کتاب اعلام الموقعین میں اس کے خلاف مدلل بحث کی ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔ امام ابن تیمیہ نے بھی اپنی کتابوں میں تقلید شخصی کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک جگہ اس کے متعلق بہت ہی بچی تلی رائے دی ہے جس کو انہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے، انہوں نے مذاہب کے متعلق بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

واذا نزلت بالمسلم نازلة فانه يستفتي من اعتقد انه يفتيه بشرع اللّٰه و رسوله من اى مذهب كان ولا يجب على احد من المسلمين تقليد شخص بعينه من العلما فى كل ما يقول۔ ولا يجب على احد من المسلمين التزام مذهب شخص معين غير الرسول ﷺ فى كل ما يوجبه و يخبربه۔ بل كل احد من الناس يوخذ من قوله و يترك الا رسول اللّٰه ﷺ و اتباع الشخص لمذهب معين بعينه لعجزه عن معرفة الشرع من غير جهته۔ انما هو مما يسوغ له۔ ليس هو مما يجب على كل احد اذا امكنه معرفة الشرع بغير ذٰلك الطريق بل كل احد عليه ان يتقى اللّٰه ما استطاع و بطلب علم ما امراللّٰه به و رسوله فيفعل المامور و يترك المحذور۔ [1]

جب کسی مسلمان کے لیے کوئی حادثہ درپیش ہو تو اس کو چاہیے کہ ایسے شخص سے فتویٰ پوچھے جس کے متعلق وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کے مطابق فتویٰ دیتا ہے چاہے وہ شخص کسی مذہب کا کیوں نہ ہو، مسلمانوں میں سے کسی پر یہ واجب نہیں ہے کہ کسی عالم کی ہر بات میں بعینہٖ شخصی

---

[1] فتاویٰ ابن تیمية: ۲/ ۳۸۷۔

تقلید کرے اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی متعین شخص کے مذہب کو اپنے لیے لازم کر لے اور ہر بات میں اس کے قول اور عمل کو اپنے لیے واجب قرار دے۔ بلکہ ہر شخص کا قول لیا جا سکتا ہے اور چھوڑا جا سکتا ہے سوائے رسول اللہ ﷺ کے قول کے۔ کسی مذہب معین کی بعینہ شخصی پیروی ایسے شخص کے لیے جائز قرار دی جا سکتی ہے جو اپنے طریق کو چھوڑ کر کسی دوسرے طریق سے شریعت کی معرفت حاصل کرنے سے عاجز ہو، لیکن یہ حکم ہر اس شخص کے لیے نہیں ہو سکتا جو اس طریقہ کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی شریعت کا علم حاصل کر سکتا ہے بلکہ ہر ایک کے لیے یہ ضروری ہے کہ جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرتا رہے اور اللہ اور اس کے رسول نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان کا علم حاصل کرے اور اوامر کی پیروی کرے اور نواہی کو چھوڑ دے۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں اگر کوئی شخص استدلال اور راجح قول کے معلوم کرنے پر چاہے وہ بعض مسائل ہی میں سہی قادر ہو تو اس کے متعلق اختلاف ہے امام احمد کا مذہب منصوص جس پر ان کے پیرو کار بند ہیں یہ ہے کہ وہ تقلید کرنے سے گنہگار ہوتا ہے۔ یہی امام شافعی اور ان کے ساتھیوں کا مذہب ہے۔ محمد بن الحسن شیبانی وغیرہ سے حکایت کی گئی ہے کہ اس کے لیے تقلید جائز ہے۔ بعض نے مطلق تقلید کو جائز قرار دیا ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اپنے سے زیادہ جاننے والے کی تقلید کرنی چاہیے۔ بعض لوگوں نے امام احمد سے یہ قول نقل کیا ہے جیسا کہ ابو اسحاق نے کتاب اللمع میں اس قول کو امام احمد کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان کا یہ نقل کرنا غلط ہے کیونکہ امام احمد کی یہ رائے صرف صحابہ کے متعلق تھی، امام مالک، امام شافعی، سفیان ثوری، اسحاق بن راہویہ یا ابو عبید وغیرہ کے جیسے علما کے متعلق امام احمد نے کئی جگہ ذکر کیا ہے کہ ایک عالم اور استدلال پر قدرت رکھنے والے شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ان کی تقلید کرے۔ انہوں نے صاف فرمایا تھا کہ میری یا مالک یا شافعی یا ثوری وغیرہ کی تقلید نہ کرو۔ ایک عامی آدمی کو حکم دیتے تھے کہ وہ اسحاق، ابو عبید، ابو ثور یا ابو مصعب وغیرہ سے

مسئلہ پوچھے۔ ابوداؤد یا عثمان بن سعید یا ابراہیم الحربی یا ابوبکر الاثرم یا ابوزرعہ یا ابوحاتم سجستانی یا مسلم وغیرہ جیسے اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے تھے کہ ان مذکورہ بالا علما میں سے کسی کی تقلید نہ کریں بلکہ وہ یہ کہتے تھے کہ تم کتاب وسنت کو لازم پکڑو۔ [1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

و اذا كان الرجل متبعا لابی حنفية او مالك او الشافعی او احمد و رای فی بعض المسائل ان مذهب غيره اقوى فاتبعه كان قد احسن فی ذلك ولم يقدح ذلك فی دينه ولا عدالته بلا نزاع بل هذا اولى بالحق واحب الى اللّٰه ورسوله ﷺ ممن يتعصب لواحد معين غير النبي ﷺ كمن يتعصب لمالك او الشافعی او احمد او ابی حنفيه و يرى ان قول هذا المعين هو الصواب الذی ينبغی اتباعه دون قول الامام الذی خالفه فمن فعل هٰذا كان جاهلا ضالا بل قد يكون كافرا فانه متى اعتقد انه يجب على الناس اتباع واحد بعينه من هولاء الأئمة دون الامام الآخر فانه يجب ان يستتاب فان تاب والا قتل بل غاية ما يقال انه يسوغ اوينبغی اويجب على العامی ان يقلد واحد الا بعينه من غير تعيين زيد ولا عمرو واما ان يقول قائل انه يجب على العامة تقليد فلان او فلان فهذا لا يقوله مسلم۔ ومن كان مواليا للائمة محبا لهم يقلد كل واحد منهم فيما يظهرله انه موافق للسنة فهو محسن فی ذٰلك بل هذا احسن حالا من غيره ولا يقال لمثل هذا مذبذب على وجه الذم۔ [2]

اور اگر کوئی آدمی ابوحنیفہ، مالک، شافعی یا احمد کا پیرو ہو اور یہ دیکھتا ہو کہ بعض

---

[1] فتاویٰ ابن تيمية: ۲/ ۲۰۲، ۲۰۳۔ [2] فتاویٰ ابن تيمية: ۲/ ۳۷٦۔

مسائل میں دوسرے کا مذہب زیادہ قوی ہے پھر اس کی پیروی کرے تو یہ بہتر ہی ہوگا۔ اس کے دین یا اس کی عدالت میں کوئی نقص نہ ہوگا۔ اس میں کسی کا کوئی جھگڑا نہیں ہے بلکہ حق کے لحاظ سے یہی زیادہ بہتر ہے اور اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ محبوب ہے، اس شخص کی بہ نسبت جو نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی ایک معین شخص کے لیے تعصب برتے جیسے کہ کوئی مالک یا شافعی یا احمد یا ابوحنیفہ کے لیے تعصب برتے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس معین امام ہی کا قول ٹھیک ہے اور دوسرے مخالف امام کے قول کو چھوڑ کر صرف اسی کا اتباع کرنا لازم ہے۔ پس جو بھی ایسا سمجھتا ہے وہ جاہل اور گمراہ ہے۔ بلکہ وہ کافر ہو جاتا ہے کیونکہ جب وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ لوگوں کے لیے ان ائمہ میں سے کسی ایک معین شخص کی پیروی واجب ہے دوسرے کی پیروی نہیں کرنی چاہیے تو اس سے توبہ کروانی چاہیے اگر وہ کرے تو خیر ورنہ وہ قتل کر دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ایک عامی آدمی کے لیے زید و عمرو کی تعیین کے بغیر کسی ایک امام کی تقلید واجب ہے۔ اگر کہنے والے کی مراد یہ ہے کہ عام آدمیوں پر فلاں فلاں شخص کی تقلید واجب ہے تو کوئی مسلمان بھی اس کا قائل نہیں ہے۔ پس جو بھی ائمہ کا دوست ہو گا۔ ان میں سے ہر اس شخص کی تقلید کرے گا جس کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ اس کا قول سنت کے موافق ہے۔ ایسا کرنے والا بہت اچھا کام کرنے والا شمار ہوگا بلکہ وہ دوسروں کے لحاظ سے بہت بہتر ہوگا۔ اس کے متعلق مذمت کے طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مذبذب ہے۔

پھر کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ کسی ایک خاص امام کے لیے تعصب ایسا ہی ہے جیسا کہ لوگ خلفائے اربعہ میں سے حضرت علی کے لیے تعصب اختیار کرتے ہیں۔ امام ابو یوسف اور امام محمد امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے اس کے باوجود ان دونوں نے اپنے اُستاد سے کئی مسائل میں اختلاف کیا اور ان دونوں کے دل میں اپنے اُستاد کی بڑی قدر رہی۔ بعض مسائل میں دوسروں کا مسلک اختیار کرنے سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مذبذب تھے۔ بلکہ امام ابوحنفیہ

ایک بات کہتے تھے اور جب اس کے خلاف کوئی حجت قائم ہو جاتی تو اپنے پرانے قول سے رجوع کر لیتے تھے۔ اس بنا پر ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مذبذب تھے۔ انسان ہمیشہ علم اور ایمان کا طلبگار رہتا ہے۔ جب اس کے اوپر کسی نئی بات کا انکشاف ہو جاتا ہے تو وہ اس کو مان لیتا ہے۔ محض اس کی بنا پر اس کو مذبذب نہیں کہا جا سکتا۔ [1] ان کا آخری فیصلہ یہ تھا کہ جب کسی مسئلہ میں اماموں کے درمیان اختلاف ہو جائے تو حجت ہی کے مطابق کسی ایک امام کے قول کو ترجیح دی جا سکتی ہے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ فلاں امام ہی کا قول ٹھیک ہے تاوقتیکہ دلیل بھی اس کی تائید نہ کرے۔ [2] امام موصوف کا یہ خیال تھا کہ بلاد شرق پر تاتاریوں کے تسلط کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے درمیان مذاہب کا افتراق و انتشار پیدا ہو گیا تھا ہر ایک میں مذہبی تعصب بہت زیادہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو شافعی ہوتا تھا وہ اپنے مذہبی تعصب کی شدت کی بنا پر بسا اوقات دین کے دائرے سے خارج ہو جاتا تھا۔ یہی حال امام ابوحنیفہ، امام احمد اور امام مالک کے پیروؤں کا ہے۔ [3]

ائمہ کے درمیان امتیاز نہیں ہے

امام ابن تیمیہ کی نظر میں ائمہ اربعہ اور دوسرے اماموں کے درمیان شخصی حیثیت سے کوئی فرق اور امتیاز نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ایک سوال کے جواب میں کہ کسی مسئلہ میں ائمہ اربعہ کو چھوڑ کر حماد بن ابی سلیمان، سعید بن المبارک، سفیان الثوری اور اوزاعی جیسے اماموں میں سے کسی ایک کی رائے اختیار کی جا سکتی ہے یا نہیں یہ لکھتے ہیں۔

ائمہ مذکور سادات ائمہ اسلام سے تھے۔ امام ثوری اہل عراق کے امام تھے۔ اور اکثر لوگ ان کو ابن ابی لیلیٰ، حسن بن صالح بن حی اور ابوحنیفہ جیسے معاصرین پر فضیلت دیا کرتے تھے۔ ان کا مذہب اب تک خراسان میں باقی ہے۔ اسی طرح اوزاعی اہل شام کے امام تھے۔ چوتھی صدی ہجری تک لوگ ان کے پیرو رہے بلکہ مغربی افریقہ کے لوگ انہی کے پیرو رہے یہاں تک کہ امام مالک کے مذہب کا وہاں رواج ہوا۔ حماد بن ابی سلیمان امام

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیة: ۲/ ۳۷۸۔ [2] ایضًا: ۳۷۵۔
[3] فتاویٰ ابن تیمیة: ۱/ ۴۰۴، ۴۰۵۔

ابوحنیفہ کے شیخ تھے۔اس کے باوجود ان کا یہ قول (کہ امام کے پیچھے صف میں اکیلے کھڑے ہوکر نماز پڑھنا ناجائز ہے) احمد بن حنبل اور اسحٰق بن راھویہ وغیرہ کے قول کے مطابق ہے۔ حماد بن ابی سلیمان کا مذہب اب تک باقی ہے اور یہی مذہب داؤد بن علی اور ان کے ساتھیوں وغیرہ کا تھا۔ان کا مذہب بھی اب تک باقی ہے۔اس قول کے خلاف امت کا ابھی تک اجماع نہیں ہوا ہے۔مشرق ومغرب میں اس کے بہت سے ماننے والے پائے جاتے ہیں کتاب و سنت میں ان ائمہ مجتہدین کے درمیان شخصی حیثیت سے کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔مالک، لیث بن سعد، اوزاعی اور ثوری اپنے زمانے کے بڑے امام تھے ان میں سے ہر ایک کی تقلید دوسرے کی تقلید کے برابر ہے۔کوئی مسلمان بھی یہ نہیں کہتا کہ ایک کی تقلید جائز ہے اور دوسرے کی تقلید درست نہیں ہے۔ [1]

ایک دوسری جگہ ایک سوال کے جواب میں کہ بعض لوگ حضرت عبدالقادر جیلانی کو تمام مشائخ میں اور امام احمد کو تمام ائمہ میں افضل سمجھتے ہیں۔ایسا سمجھنا جائز ہے یا نہیں۔لکھتے ہیں بعض لوگ اس امام کو جسکی فقہ انہوں نے پڑھی ہے اور اس شیخ کو جسکی انہوں نے اقتدار کی ہے دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں جیسے کہ بعض لوگ شیخ عبدالقادر جیلانی یا شیخ ابومدین یا امام احمد کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں اس بارے میں اکثر لوگ محض ظن اور گمان سے کام لیتے ہیں۔ان کو ان ائمہ اور مشائخ کے مرتبوں کی حقیقت معلوم نہیں ہے۔ان کا مقصد مطلق حق کی پیروی نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتے ہوئے۔بغیر کسی دلیل کے اپنے متبوع کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں اس کا نتیجہ آپس کا اختلاف وشقاق ولجاج ہوتا ہے جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے۔اجتہادی مسائل میں جس کا قول بھی حق ہوگا۔اس کو اس مسئلہ میں دوسروں پر ترجیح دی جائے گی۔اس لحاظ سے کوئی امام بھی ایسا نہیں ملے گا۔جس کے کچھ مسائل ایسے نہ ہوں جن میں اس کے قول کو دوسروں پر ترجیح نہ دی گئی ہو۔ان کے آپس کے تفاضل اور برتری کو وہی جان سکتا ہے جو علم کی تفاصیل میں ڈوب کر غور وفکر کرتا ہو۔ [2]

---

[1] فتاوی ابن تیمیة:٢/ ٢٧٤۔ [2] فتاوی ابن تیمیة: ١/ ٤٠٤۔٤٠٥۔

مسلک کے خلاف نصوص پر عمل

امام ابن تیمیہ سے ایک سوال کیا گیا تھا کہ ایک شخص مذاہب اربعہ سے کسی ایک مذہب کی فقہ کا علم حاصل کرتا ہے اوراس میں درک اور مہارت پیدا کرتا ہے اوراس کے بعد علم حدیث کی طرف توجہ کرتا ہے اوراسے ایسی صحیح حدیثیں ملتی ہیں جس کا نہ کوئی ناسخ ہے اور نہ مخصص اور معارض لیکن اس کا مذہب ومسلک اس صحیح حدیث کے مخالف ہے۔ایسی حالت میں اپنے مذہب پر عمل کرنا واجب ہے یا حدیث پر عمل کرنا ضروری ہے؟اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں کہ کتاب وسنت اوراجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق پراپنی اور اپنے رسول کی اطاعت واجب قرار دی ہے۔ان کے علاوہ کسی دوسرے کی اطاعت واجب نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق جو نبی کے بعد سب سے بڑا درجہ رکھتے تھے یہ کہا کرتے تھے کہ تم لوگ میری اطاعت کرو جب تک کہ میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں اور جب میں اللہ کے حکم کی نافرمانی کروں توتم پر میری اطاعت واجب نہیں ہے۔تمام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی دوسرا شخص معصوم نہیں ہے۔تا کہ اس کی ہر ایک بات کی اطاعت کی جاسکے۔ائمہ میں سے ہر ایک نے یہی کہا ہے۔کہ جب تم کو صحیح حدیث مل جائے توتم میرے قول کو چھوڑ دینا۔اور نبی کریم ﷺ سے ایک صحیح حدیث ہے۔آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ دین کی سمجھ (تفقہ فی الدین) عطا نہ کرے اس کے ساتھ کوئی بھلائی کا ارادہ نہیں کرتا۔اس لیے تفقہ فی الدین (دین کی سمجھ) کا حاصل کرنا فرض ہوگیا۔اورتفقہ فی الدین سمعی دلائل کے ساتھ احکام شرعیہ کے جاننے کا نام ہے پس جس کسی کو بھی تفقہ فی الدین حاصل نہ ہو وہ متفقہ فی الدین نہیں ہوسکتا۔لیکن بعض ایسے لوگ بھی ہوسکتے ہیں جو ہر ایک مسئلہ میں تفصیلی دلائل کے معلوم کرنے میں عاجز ہوتے ہیں۔توان پر یہ ضروری نہیں ہے کہ جس چیز کے جاننے سے عاجز ہوں اس کو معلوم کرنے کی کوشش کریں۔مگر جب اس کو جاننے کی قدرت رکھتے ہیں تو اس کا معلوم کرنا ان کیلئے لازمی ہے اور وہ شخص جو استدلال کی قدرت رکھتا ہے اس کے متعلق تین قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اس کیلئے مطلقاً تقلید حرام

ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مطلقاً اس کیلئے تقلید کرنا جائز ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ ضرورت کے وقت تقلید کرنا جائز ہے مثلاً اس کے پاس استدلال کا وقت نہ ہو تو اس صورت میں وہ تقلید کر سکتا ہے۔ اور یہی قول زیادہ منصفانہ ہے۔ اجتہاد کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے حصے نہ ہو سکتے ہوں یا اس کی تقسیم نہ ہو سکتی ہو، ایک شخص کسی ایک خاص فن یا باب یا مسئلہ میں اجتہاد کر سکتا ہے۔ اور دوسروں میں نہیں کر سکتا ہر ایک اپنی وسعت کے مطابق اجتہاد کرتا ہے پس جو کوئی علما کے کسی مسئلہ میں آپس کے اختلاف پر غور و فکر کرے اور کسی ایک عالم کے قول کے ساتھ ایسے نصوص پائے جن کا کوئی معارض نہ ہو تو دو باتوں میں سے کوئی ایک اختیار کر سکتا ہے ایک یہ کہ اپنے امام کے قول کی تابعداری کرے اس صورت میں اسکی تابعداری کسی شرعی حجت پر مبنی نہ ہوگی بلکہ وہ محض ایک عادت متصور ہوگی اس کا یہ فعل اسی طرح کا ہوگا جس طرح دوسرے ائمہ کے پیرو اپنے اپنے امام کی تقلید اور پیروی کرتے ہیں۔ دوسری یہ کہ اس قول کو ترجیح دے جس کی تائید نصوص صریحہ سے ہوتی ہے۔ اس صورت میں وہ اس امام کی تابعداری کرنے والا ہوگا جس کا قول اپنے امام کے قول کے مخالف ہوگا۔ مگر اس صورت میں نصوص کے خلاف عمل کرنے سے وہ محفوظ ہو جائے گا اور یہی اس کیلئے زیادہ بہتر ہوگا ہم نے اس کمتر درجہ کو اس لیے مانا ہے کہ بعض دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ ایسے شخص کی نظر قاصر ہوتی ہے اور اس مسئلہ میں اجتہاد کے آلہ کی کمزوری کی بنا پر اس کا اجتہاد قائم نہیں رہتا لیکن جس شخص کو اجتہاد پر پوری قدرت حاصل ہو اور وہ یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ دوسرے قول کے ساتھ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو بعض کو دفع کر سکتی ہو تو اس پر نصوص کی پیروی واجب ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو گویا ظن و تخمین اور خواہشات نفسانی کی پیروی کرنے والا ہوگا اور وہ خدا اور اس کے رسول کا بہت بڑا گنہگار اور نافرمان ہوگا۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ دوسرے قول کیلئے بھی ایک ایسی دلیل ہے جو نص پر راجح ہے لیکن میں اس کو نہیں جانتا تو اس سے کہا جائے گا کہ خدا کے قول اور رسول کے حکم کے مطابق اس کا جہاں تک ہو سکے بچنا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [1]

---

[1] ٦٤/ التغابن: ١٦۔

"تم اللہ سے ڈرتے رہو جہاں تک کہ تم سے ہو سکے۔"

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ)) [1]

"جب میں تم کو کسی بات کا حکم دوں تو جہاں تک ہو سکے تم اس پر عمل کرو۔"

اس مسئلہ میں جہاں تک علم اور سمجھ کا تعلق ہے تمہیں یہی بتاتا ہے کہ فلاں قول راجح ہے۔ایسی حالت میں تم پر اس کی پیروی ضروری ہے۔پھر جب تم کو بعد میں یہ معلوم ہو کہ اس نص کے خلاف کوئی راجح دلیل ہے تو تمہارا حکم بھی ایک مجتہد مستقل کا حکم ہوگا جو اجتہاد کر کے ایک قول اختیار کرتا ہے اور جب آیندہ حق اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے تو وہ اپنے قول سے رجوع کر لیتا ہے ایسا کرنا تعریف کے قابل ہوگا۔اس کی مذمت نہیں کی جاسکتی۔اس کے برخلاف اس شخص کا علم مذموم ہے جو حجت کے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی اپنے امام کے قول پر اڑا رہتا ہے اور محض عادت کی وجہ سے صحیح قول کی طرف رجوع نہیں کرتا۔نص کے چھوڑنے پر یہ عذر قبول نہیں کیا جاسکتا کہ فلاں امام نے بھی یہ حدیث سنی تھی اور اس کی روایت کی تھی اس کے باوجود اس حدیث کو تسلیم نہیں کیا۔ہم نے اپنی کتاب "رفع الملام عن ائمہ الاعلام" میں بعض حدیثوں پر ائمہ کے عمل نہ کرنے کی تقریباً بیس وجہیں پیش کی ہیں۔ان اسباب کی بنا پر حدیث پر عمل نہ کرنے کیلئے وہ معذور سمجھے جاسکتے ہیں۔لیکن آج حدیث پر عمل نہ کرنے کیلئے ہم معذور نہیں سمجھے جاسکتے۔اس کے برخلاف امام کے قول کو ترک کرنے کیلئے ہم معذور قرار دیے جاسکتے ہیں۔ایک شخص حدیث کو اس بنا پر ترک کرتا ہے کہ قرآن کی آیت کھلے طور پر اس کے خلاف ہے۔اور یہ کہ صحیح حدیث کی نص ظواہر حدیث اور قیاس وعمل پر مقدم ہے۔تو اس کا یہ عذر قابل قبول نہیں ہوسکتا۔کیونکہ شرعی دلائل کے ذرائع انسانی ذہنوں کیلئے بعض وقت ظاہر اور بعض وقت پوشیدہ ہوتے ہیں۔خاص کر حدیث کا چھوڑنے والا اس اعتقاد کی بنا پر چھوڑتا ہے کہ مدینہ منورہ کے مہاجرین وانصار میں سے کسی نے اس پر عمل نہیں کیا کیونکہ وہ اس کو منسوخ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب الاقتداء بسنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ح: ۷۲۸۸۔

سمجھتے تھے یا اس کے خلاف کوئی معارض قرار دیتے تھے۔ لیکن جب بعد میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ مہاجرین وانصار سے ایک جماعت نے اس پر عمل کیا تو ایسی حالت میں حدیث کے نص صحیح کا مخالف اور عارض مذموم قرار پائے گا۔ ایسے وقت پر یہ سوال نہیں اٹھایا جاسکتا کہ تم بہتر جانتے ہو یا فلاں امام بہتر جانتا ہے؟ اس قسم کا موازنہ کرنا غلط ہے۔ کیونکہ فلاں امام نے اپنے ہی جیسے اماموں کی مخالفت کی تھی۔ ان کا آپس کا اختلاف ایسا ہی تھا جیسا کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب اور حضرت معاذ بن جبل وغیرہ کے درمیان تھا۔ نزاع کے موارد میں صحابہ ایک دوسرے کے برابر تھے جب ان کے درمیان اختلاف ہوتا تھا تو اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق ان میں سے کسی ایک کے قول کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اگر چہ یہ کہ ان میں سے بعض صحابی بعض سے زیادہ جانتے تھے۔ حضرت عمر اور حضرت عبداللہ بن مسعود بڑے پائے کے صحابی تھے لیکن جنبی کے تیمم کے مسئلہ میں لوگوں نے ان سے کمتر درجہ کے صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری کا قول اختیار کیا کیونکہ کتاب وسنت سے ان کے قول کی تائید ہوتی تھی۔ اسی طرح انگلیوں کی دیت کے بارے میں لوگوں نے حضرت عمر کے قول کو چھوڑ کر حضرت معاویہ کے قول کو اختیار کیا کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ انگلیاں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ اسی طرح جب متعہ کے بارے میں لوگوں نے ابن عباس سے جھگڑا کیا اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے اقوال کو بار بار دہرایا تو حضرت ابن عباس نے خفا ہو کر کہا۔ قریب ہے کہ تم پر آسمان سے پتھر برسیں میں تو کہتا ہوں کہ اللہ کے رسول نے ایسا کہا اور تم کہتے ہو کہ ابوبکر نے ایسا کہا۔ اسی طرح لوگوں نے ابن عمر سے ایک مسئلہ پوچھا اور آپ نے اس کا جواب دیا تو لوگوں نے حضرت عمر کے قول کو پیش کر کے ان کا معارضہ کرنا چاہا۔ جب لوگوں نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت ابن عمر نے کہا آیا رسول اللہ ﷺ کے قول کی تابعداری زیادہ ضروری ہے یا حضرت عمر کے قول کی۔ حالانکہ حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اگر اس قسم کے غلط موازنے کا دروازہ کھل جائے تو خدا اور رسول کے احکام سے منہ موڑنا لازم آتا ہے۔ اس وقت ہر ایک امام اپنے گروہ میں نبی کا درجہ

اختیار کر لیتا ہے جس کے معنی دین کو بدل دینے کے ہیں جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نصرانیوں کی مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے احبار و رہبان اور مسیح بن مریم کو رب بنالیا ہے حالانکہ انہیں ایک خدائے واحد کی پرستش کا حکم دیا گیا تھا۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس ایک ذات پاک کے۔ پاک ہے وہ ذات جس کے ساتھ وہ کسی اور کو شریک کرتے ہیں۔ [1]

ائمہ کے اختلافات کی وجہ

امام ابن تیمیہ نے ائمہ کے اختلافات کے وجوہ کے متعلق اپنے فتاویٰ و رسائل خاص کر رفع الملام عن ائمة الاعلام ، خلاف الامه فی العبادات اور تنوع العبادات وغیرہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ تمام ائمہ اور علما انبیاء کے وارث ہیں اور اپنی امت میں رسول کے جانشین ہیں۔ ائمہ مقبولین میں سے کوئی امام ایسا نہیں گزرا ہے جس نے قصداً اور عمداً اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی مخالفت کی ہو۔ ہر ایک کا یہی اعتقاد تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اتباع واجب ہے جب کسی امام کا کوئی ایسا قول ہو جس کے خلاف صحیح حدیث پائی جاتی ہو تو اس لیے کسی عذر کا ہونا ضروری ہے۔ امام موصوف نے رفع الملام عن ائمہ الاعلام میں ترک حدیث صحیح کیلئے تقریباً بیس عذر پیش کیے ہیں۔ اگر ان سب کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی تین صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ اس امام کو اس صحیح حدیث کا علم نہیں تھا۔ دوسری یہ کہ اس کو وہ حدیث ملی مگر وہ اس کو اس مسئلہ پر جس کا اس نے فتوی دیا منطبق نہیں سمجھ رہا تھا۔ تیسری یہ کہ وہ اس کو منسوخ سمجھ رہا تھا۔ حدیثوں سے ناواقف ہونا کسی امام کی قدر و منزلت کو گھٹا نہیں سکتا۔ خلفائے راشدین آنحضرت ﷺ کی سیرت کے سب سے زیادہ واقف کار تھے۔ اس کے باوجود جب ان میں سے کسی کے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو وہ صاف اعتراف کر لیتے کہ انہیں اس کے متعلق کچھ علم نہیں ہے۔ پھر وہ دوسرے اصحاب سے دریافت کر کے مسئلہ کا جواب دیتے تھے۔ جب ایک بڑھیا نے جو مرنے والے کی نانی یا دادی ہوتی تھی حضرت ابوبکر سے اپنی وراثت کے متعلق مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا

---

[1] فتاوی ابن تیمیة: ۲ /۳۸۳، ۳۸٦۔

تیرے لیے اللہ کی کتاب میں کوئی حکم موجود نہیں ہے اور سنت نبوی سے بھی اس کا حکم مجھے معلوم نہیں ہے۔ البتہ لوگوں سے دریافت کروں گا اور تجھے اطلاع دوں گا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے صحابہ سے مسئلہ دریافت کیا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت محمد بن مسلمہ نے گواہی دی کہ آنحضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے دادی یا نانی کیلئے چھٹا حصہ دیا ہے۔ حضرت ابوبکر نے ان دونوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ کیا۔

امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ ان تمام ائمہ کا اختلاف دو صورتوں سے ہوگا۔ ایک یہ ہے کہ دونوں اختلافی شکلیں شرعی حیثیت سے جائز ہوں گی۔ دوسری یہ کہ ایک شکل بعض کے نزدیک جائز ہوگی اور بعض کے نزدیک جائز نہ ہوگی۔ اگر دونوں شکلیں جائز ہوں اور ایک گروہ ایک پر عمل کرے اور دوسرا دوسرے پر عمل کرے۔ تو ان میں سے کوئی ایک گروہ بھی ملامت کے قابل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مثلاً رفع یدین اور آمین بالجہر کی شکل ہے ایک گروہ ان کا قائل نہیں ہے لیکن وہ ان کو ناجائز نہیں کہتا۔ اب رہ گئی دوسری شکل یعنی ایک گروہ کسی ایک چیز کو واجب سمجھتا ہے اور دوسرا گروہ اس کو حرام قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر امام ابوحنیفہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کو ناجائز بتاتے ہیں اور امام شافعی اس کا پڑھنا لازمی خیال کرتے ہیں اس کے بغیر نماز درست نہیں ہوسکتی۔ ایسی حالت میں ہر ایک امام کا پیرو یا مجتہد ہوگا یا مقلد، اگر مجتہد اپنے اجتہاد یا عملی بصیرت کی بنا پر کسی ایک مسلک کو صحیح سمجھ کر اس کی پیروی کرتا ہے تو یہ جائز ہے اگر اس کا اجتہاد صحیح ہوگا تو خدا کے نزدیک اس کو دگنا ثواب ملے گا اور اگر غلط نکلا تو اس کو ایک ثواب ملے گا اور اس کی غلطی معاف ہوگی اور اگر مقلد ان میں سے کسی ایک کی پیروی کرتا ہے تو وہ اس کو صحیح تصور کر کے ہی اس کی پیروی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اسکی حیثیت بھی ایک مجتہد ہی کی ہوگی۔

امام موصوف نے ایک فتوے کے جواب میں اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ ایک ہی چیز کے وجوب اور حرمت کے قائلین ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ وہ لکھتے ہیں کہ اس قسم کے اختلافات صحابہ کرام، تابعین اور ائمہ سلف کے درمیان موجود تھے اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ امام شافعی اور

ان کے پیرو نماز میں بسملہ کے پڑھنے کو واجب سمجھتے تھے۔اس کے باوجود وہ امام مالک اور ان کے پیروؤں کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔حالانکہ وہ بسملہ کا پڑھنا ضروری نہیں خیال کرتے تھے۔امام مالک کا فتویٰ تھا کہ پچھنا لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔خلیفہ ہارون الرشید نے ایک مرتبہ پچھنا لگانے کے بعد وضو کے بغیر نماز پڑھی۔اس کے پیچھے امام ابو یوسف نے اقتدا کی حالانکہ وہ وضو ٹوٹنے کے قائل تھے۔اسی طرح لوگوں نے ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص نکسیر پھوٹنے کے بعد وضو نہ کرے اور نماز پڑھے تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے؟امام احمد نے جواب دیا۔میں کیونکر سعید بن المسیب اور امام مالک کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتا۔[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر امام کسی شے کے عدم وجوب کا قائل ہو تو ایسا شخص بھی اس کے پیچھے نماز ادا کر سکتا ہے جو اس کے وجوب کا قائل ہے کیونکہ اس صورت میں امام مجتہد کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کے غلطی کرنے پر بھی نماز درست ہو جائے گی اگر اس اصول کو نہ مانا جائے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانے سے لے کر اس وقت کے ان ان تمام لوگوں کی نمازیں باطل ہیں جو کسی چیز کے وجوب کے قائل تھے۔ظاہر ہے کہ وہ لوگ بھی اس بات کو پورے جزم و یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے جو غیر مسلک کے فقہا کے پیچھے نماز پڑھنے سے پرہیز کرتے ہیں۔فروعی مسائل کے اختلاف کا شائد ہی اس سے بہتر کوئی حل ہو سکتا ہے اگر امام موصوف کی اس رائے کو بطور اصول کے تسلیم کر لیا جائے تو سارے فروعی جھگڑے یک لخت ختم ہو جاتے ہیں۔

فقہی لحاظ سے امام ابن تیمیہ کا مرتبہ

اوپر کی تصریحات سے صاف ظاہر ہے کہ امام ابن تیمیہ شخصی تقلید کے مخالف تھے۔ انہوں نے کتاب وسنت اور آثار صحابہ و تابعین اور ائمہ کبار کے صحیح اقوال کے معلوم کرنے کیلئے بے شمار کتابیں دیکھ ڈالیں۔ان کی تصنیفات میں قدما کی ایسی بہت سی کتابوں کے حوالے ملتے ہیں جن کا ذکر ان کے ہمعصر علما کی تصانیف میں نہیں ملتا،شرعی دلائل کے ذرائع تک پہنچنے کی

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیة: ۲/ ۳۸۰۔۳۸۱۔

ان میں پوری قوت تھی کیونکہ ان کا مطالعہ غیر معمولی طور پر وسیع تھا۔ وہ ہر مسئلہ میں کتاب و سنت سے استدلال کرتے تھے اور پورے اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ جس کسی امام کا قول کتاب وسنت سے قریب نظر آتا تھا اس کی تائید کرتے تھے۔ ان کے مجتہد ہونے میں کسی کو بھی کلام نہیں ہوسکتا۔ البتہ اختلاف اس میں ہوسکتا ہے کہ آیا وہ مستقل اور مطلق مجتہد تھے یا مجتہد مقید ومنتسب تھے۔

حافظ ابن قیم نے مفتیوں کی چار قسمیں قرار دی ہیں۔ پہلی قسم ان مفتیوں کی ہے جو کتاب وسنت اور اقوال صحابہ کے عالم ہیں اور نئے نئے حوادث میں شرعی دلائل کے مطابق اجتہاد کرتے ہیں۔ ان کا اجتہاد اپنے سے زیادہ جاننے والوں کی بعض وقت تقلید کرنے کے منافی نہیں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایک امام اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے شخص کی پیروی کرتا نظر آتا ہے۔ ایسے لوگ دین کی تجدید کرتے ہیں اور اس کو دنیا میں قائم کرتے ہیں۔

دوسری قسم ان مفتیوں کی ہے جو اپنے امام کے مذہب میں ہوکر اجتہاد کرتے ہیں ان کو اپنے امام کے فتاویٰ واقوال و مآخذ واصول کا پورا علم ہوتا ہے اور ایسی چیزوں میں جن کے متعلق اس امام سے کوئی حکم منقول نہیں ہے۔ اسی کے اصول کو سامنے رکھ کر مسائل کی تخریج کرتے ہیں وہ حکم اور دلیل کے لحاظ سے اپنے امام کے مقلد نہیں ہوتے۔ اجتہاد اور فتویٰ دینے میں وہ اس امام کا طریقہ اختیار کرتے ہیں اور اس کے مذہب کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اس کو مضبوط بناتے ہیں۔ حنابلہ میں سے قاضی ابویعلی اور قاضی ابوعلی بن ابی موسیٰ نے اس درجہ اجتہاد کے حاصل ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ شافعیہ میں سے بھی بہت سے اس کے مدعی ہیں۔ ابویوسف، محمد بن الحسن شیبانی اور زفر بن ہذیل کے متعلق حنفیہ کا، اور مزنی ابن شریح، ابن المنذر اور محمد بن نصر المروزی کے متعلق شافعیہ کا، اشہب، ابن عبدالحکم، ابن القاسم اور ابن وہب کے متعلق مالکیہ اور ابوحامد اور قاضی ابویعلیٰ کے متعلق حنابلہ کا اختلاف ہے کہ آیا یہ سب مجتہد مستقل تھے یا مجتہد مقید تھے۔ بعض ان کو مجتہد مستقل اور بعض مجتہد مقید قرار دیتے ہیں لیکن جن لوگوں نے ان کے احوال وفتاوی پر غور کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ سب ہر بات میں اپنے اماموں کے مقلد نہیں تھے۔ ان کا اپنے امام سے اختلاف بالکل کھلا ہوا اور ظاہر

ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کا رتبہ مجتہد مستقل سے کم ہے۔

تیسری قسم ان مفتیوں کی ہے جو اپنے مذہب میں رہ کر اجتہاد کرتے ہیں لیکن اپنے امام کے مسائل سے مخالفت نہیں کرتے جب کسی مسئلہ میں امام کی نص مل جائے تو وہ دوسرے امام کے قول کی ہرگز تائید نہیں کرتے۔ آج کل کے اکثر مصنفین کی یہی حالت ہے۔ ان میں سے اکثر کا گمان یہ ہے کہ کتاب وسنت اور عربی زبان کے جاننے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک امام کے نصوص شارع کے نصوص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ تو اجتہاد ہی کا دعویٰ کرتے ہیں اور نہ تقلید ہی کا۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے مذاہب میں اجتہاد کیا اور اپنے امام کے قول کو کتاب وسنت سے زیادہ قریب پایا۔

چوتھی قسم ان مفتیوں کی ہے جو ہر حیثیت سے تقلید کے قائل ہو کر فتویٰ دیتے ہیں اگر کبھی کتاب وسنت کا کوئی ذکر کرتے ہیں تو وہ محض تبرک اور فضیلت کے طور پر ورنہ فتووں کے جوابات میں کتاب وسنت کے نصوص کے استدلالات کی انہیں کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ [1]

حافظ ابن قیم سے اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی کہ وہ اپنے استاد کو مفتیوں کی کس قسم میں شمار کیا کرتے تھے۔ لیکن امام ابن تیمیہ کے احوال وفتاویٰ کو پڑھنے کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا شمار دوسری قسم کے مفتیوں میں رہا ہوگا۔ کیونکہ امام موصوف زیادہ تر امام احمد بن حنبل ہی کے مذہب کے پابند تھے اور اسی کو کتاب وسنت سے زیادہ قریب سمجھتے تھے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

ومن كان خبيرا باصول احمد ونصوصه عرف الراجح فى مذهبه فى عامة المسائل وان كان له بصر بالادلة الشرعية عرف الراجح فى الشرع واحمد كان اعلم من غيره بالكتاب والسنة واقوال الصّحابة والتابعين لهم باحسان ولهذا لا يكاد يوجد له قول يخالف نصا كما يوجد لغيره ولا يوجد له قول ضعيف فى الغالب الاوفى مذهبه قول

---

[1] اعلام الموقعين: ٤/ ١٨٤_١٨٧_

يوافق القول الاقوى واكثر مفاريده الّتى لم تختلف فيها مذهبه يكون قوله فيها راجحا۔[1]

''اور جو شخص امام احمد کے اصول ونصوص سے واقف ہو عام مسائل میں ان کے راجح مذہب کو معلوم کر سکتا ہے اور اگر اس کو شرعی دلائل کی بصیرت حاصل ہو تو شریعت میں راجح قول کو جان سکتا ہے۔ امام احمد دوسروں سے زیادہ کتاب و سنت اور اقوال صحابہ وتابعین کے عالم تھے۔ اسی لیے ان کا کوئی قول ایسا نہیں ملتا جو کسی نص کے خلاف ہو جیسا کہ دوسرے ائمہ کا قول ملتا ہے اگر ان کا کوئی ضعیف قول ملتا ہے تو ان کے مذہب میں کوئی دوسرا قول ایسا بھی مل جاتا ہے جو قوی قول کے موافق ہوتا ہے اور ان کی اکثر اکیلی رائیں ایسی ہیں جن میں ان سے کوئی اختلاف منقول نہیں ہے۔ تو اس میں انہی کا قول راجح ہوتا ہے۔''

مگر چونکہ وہ تقلید شخصی کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے بعض مسائل میں امام احمد کے مشہور اقوال سے بھی اختلاف کیا ہے۔ اور یہ اختلاف اس اجتہاد کی بنیاد پر ہوتا ہے جو انہیں کتاب و سنت اور اقوال صحابہ وتابعین کی علمی بصیرت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کا شمار دوسری قسم کے مفتیوں میں ہو سکتا ہے جس سے کوئی صاحب نظر انکار نہیں کر سکتا۔

ائمہ و منتسبین کے اقوال کا خلط ملط ہو جانا

ایک مجتہد مفتی کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ فلاں مسئلہ میں فلاں امام کا صحیح قول کیا ہے۔ بسا اوقات اس امام کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والے لوگ بہت سے ایسے اقوال کی نسبت دے دیتے ہیں جو درحقیقت اس امام کے نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس کے پیرو علما کے ہوتے ہیں۔ محض فقہی کتابوں میں اس امام کی طرف منسوب اقوال کو دیکھ کر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ درحقیقت اس کے اقوال ہیں کیونکہ ائمہ کے اقوال وفتاویٰ ان کے منتسبین علما کے اقوال وفتاویٰ کے ساتھ خلط ملط ہو گئے ہیں۔ بہت سے مسائل ایسے ہوتے ہیں جنہیں واقعۃ ان سے کوئی نص نہیں ہوتی ہے بعد کے علما نے ان کے اصول کو سامنے رکھ کر مسائل کی تخریج کی

---

[1] فتاوی ابن تيمية: ٢/ ١٩٩۔

اور پھران کوان کی طرف منسوب کر دیا۔ 1 ایسی حالت میں ایک مجتہد مفتی ہی اپنے وسعت علم ودقت فہم سے ان کوایک دوسرے سے جدا کرسکتا ہے۔

مجتہد کا فرض کیا ہے؟

ایک مجتہد کیلئے دو باتیں بے حد ضروری ہیں۔ایک یہ کہ اجتہادی مسئلہ سے متعلق کتاب وسنت، آثار صحابہ وتابعین اور دیگر ائمہ کبار کے اقوال اوران کے دلائل کا اسے پورا علم حاصل ہو۔دوسری یہ کہ احکام کے حقیقی علل واسباب کوسامنے رکھ کرصحیح طریقہ پر استدلال کرنے کی اس میں طاقت اورقوت ہو۔اگران دونوں میں سے کسی ایک میں بھی کچھ کمی ہوگی تواجتہاد میں غلطی کا امکان ہوگا۔ہر زمانہ میں علما وفقہائے کرام کسی مسئلہ میں اجتہاد کرنے سے اس لیے گھبراتے تھے کہ انہیں اپنی علمی بصیرت وقوت استدلال پر پورا بھروسہ نہیں ہوتا تھا کتاب وسنت کے واضح اورصریح دلائل کی موجودگی میں اجتہاد کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی اس کی ضرورت انہی مسائل میں پیش آتی ہے جن میں کتاب وسنت سے کوئی نص صریح موجودنہیں ہوتی۔اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہرایک مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا ہونا ضروری ہے یانہیں۔اگرحکم کا ہونا ضروری ہے تواس پرکسی دلیل کا پایا جانا ضروری ہے یا نہیں۔اوراگر دلیل مل جائے تو اس سے یقینی علم کا حاصل ہونا ضروری ہے یانہیں،اور جب یقینی یا اعتقادی دلائل حاصل ہوجائیں تو امت مسلمہ کے کم ازکم بعض افراد کا ان پرعمل کرنا ضروری ہے یانہیں۔اوران دلائل کا اپنے مدلول کیلئے مفید ثابت ہونا ضروری ہے یانہیں۔

امام ابن تیمیہ نے اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل میں ان شقوں پر بہت ہی عمدہ بحث کی ہے۔ 2 وہ لکھتے ہیں کہ ہرایک مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کے کسی معین حکم کا ہونا اوراس پرکسی دلیل کا پایا جانا ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ ﴾ 3

---

1 اعلام الموقعين : ٤/ ١٥٤۔ 2 فتاوى ابن تيمية: ٣/ ٧٥۔ ١٨٢۔

3 ٩/التوبة:١١٥۔

"اور خدا کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ نہیں کرتا یہاں تک کہ انہیں یہ بیان نہ کردے کہ کس چیز سے وہ ڈریں۔"

قرآن مجید میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس میں ہر ایک چیز کی تفصیل موجود ہے نیز اسلام ایک مکمل دین ہے اگر کسی مسئلہ میں خدا کا حکم اور دلیل نہ ہوتو پھر یہ ہدایت مکمل نہیں قرار دی جاسکتی۔ امت مسلمہ گمراہ ہوسکتی ہے۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لاتزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق حتی تقوم الساعة)) [1]

"میری امت کی ایک جماعت قیامت کے قائم ہونے تک حق پر غالب رہے گی۔"

اس لحاظ سے لازمی طور پر امت مسلمہ کے چند افراد ایسے ہوں گے جو حق پر عمل پیرا ہوں گے۔ البتہ بعض مسائل میں دلائل واضح نہیں ہوں گے۔ احکام کے علل واسباب پردۂ خفا میں ہوں گے۔ ایک مجتہد کا کام یہ ہے کہ ان کو دریافت کرے اور اپنی علمی بصیرت اور قوت استدلال سے کام لے کر احکام کی نوعیت کو ظاہر کرے۔ اس میں کبھی غلطی بھی ہوسکتی ہے۔ مگر یہ غلطی ہمیشہ کیلئے قائم نہیں رہ سکتی کوئی نہ کوئی اس کی وضاحت کرکے رہے گا۔ کیونکہ امت مسلمہ کسی وقت بھی باطل پر متفق نہیں ہوسکتی۔

شرعی احکام کے ماخذ

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ شرعی احکام کے چار ماخذ ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس۔ کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔ یہ خود ایک مستقل بالذات ماخذ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس میں نہ صرف وہ تمام محاسن موجود ہیں جو اگلی آسمانی کتابوں میں پائے جاتے ہیں بلکہ بہت سی نئی باتیں بھی ہیں جو کسی اور کتاب میں نہیں ملتیں۔ [2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور فعل سے دین کی تشریح کی ہے جس کو ہم سنت سے

---

[1] مستدرك حاكم: ٤/ ٤٩٦، ح: ٨٣٨٩۔

[2] مجموع الرسائل الكبرى: ١/ ٢٠٢۔

تعبیر کرتے ہیں اس پر امت کا عمل کرنا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا صاف حکم ہے:

﴿ وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ ﴾ ❶

''اور رسول جو کچھ تم کو دے لے لو اور جس سے منع کرے رک جاؤ۔''

اسی لیے جو بھی رسول کی مخالفت کرے گا وہ اللہ کا مخالف متصور ہوگا۔

امت مسلمہ کا کسی بات پر اجماع حق ہے۔اس کی اتباع بھی ہمارے لیے ضروری ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى ﴾ ❷

پس جو بھی اجماع کا مخالف ہوگا وہ رسول کا مخالف متصور ہوگا۔

''اور جو شخص کھلی ہدایت کے آجانے کے بعد رسول کی مخالفت اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کسی اور کی پیروی کرے تو ہم اس کو اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھر گیا ہے۔'' ❸

جس طرح کتاب و سنت حق ہے اسی طرح اجماع اور قیاس صحیح بھی حق ہے۔امام موصوف کہتے ہیں۔

ان الكتاب والسنة وافيان بجميع امور الدين واما اجماع الامة فهو فى نفسه حق لاتجتمع الامة على ضلالة وكذلك للقياس الصحيح حق فان اللّٰه بعث رسله بالعدل وانزل الميزان مع الكتاب والميزان يتضمن العدل وما يعرف به العدل و قد فسروا انزل ذلك بان الهم العباد معرفة ذلك واللّٰه ورسوله يسوى بين المتماثلين ويفرق بين المختلفين وهذا هو القياس الصحيح ـ ❹

---

❶ ٥٩/الحشر:٧ـ ❷ ٤/النساء:١١٥ـ ❸ ايضًا:٢٠٨ـ ٢١٠ـ

❹ مجموع الرسائل الكبرى : ١/ ٢١١ـ

"بے شک کتاب وسنت دین کی باتوں کو پورا کرتے ہیں لیکن امت کا اجماع تو یہ فی نفسہٖ حق ہے کیونکہ امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح قیاس صحیح بھی حق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو عدل کے ساتھ روانہ کیا اور کتاب کے ساتھ میزان اُتارا اور میزان عدل اور جو عدل کے ساتھ معروف ہو اس کے لیے متضمن ہے میزان کے اتارنے کی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس کی معرفت کا الہام کیا ہے۔ اللہ اور اس کا رسول دو متماثل چیزوں کو ایک دوسرے کے برابر اور وہ متخالف چیزوں کو ایک دوسرے سے تفریق کرتے ہیں اور اس کا نام قیاس صحیح ہے۔

کوئی اجماعی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں رسول کی طرف سے کوئی بیان یا نص نہ ہو۔ [1] مگر کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مجتہد کو نص کا علم نہیں ہوتا ہے اور وہ اجماع امت کے مطابق فتویٰ دے دیتا ہے۔ جو نص ہی کے مطابق ہوتا ہے مثلاً بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مضاربت (کسی کے سرمایہ سے تجارت کرنا اور سرمایہ دار کو نفع یا نقصان میں شریک کرنا) کے مسئلہ میں امت کا اجماع ہے اور نص نہیں ہے۔ امام موصوف کہتے ہیں کہ مضاربت کے متعلق بھی نص موجود تھی جو لوگوں کو معلوم نہیں تھی۔ جاہلیت کے زمانے میں لوگ مالداروں سے سرمایہ لے کر تجارت کرتے تھے اور اس سے جو نفع یا نقصان ہوتا اس میں مال والے کو بھی شریک کرلیا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہ کے سرمایہ سے تجارت کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے حضرت عمر کے لڑکوں کے ذریعہ کچھ مال بھیجا اور انہوں نے راستہ میں اس سے تجارت کر کے کچھ نفع کمایا اور حضرت عمر نے سارا نفع بیت المال میں داخل کرنا چاہا تو ان کے لڑکوں کے اعتراض کرنے پر بعض صحابہ نے یہ رائے دی کہ اس میں بیت المال کا بھی ایک حصہ لگالیا جائے اور باقی ان کے لڑکوں کو دے دیا جائے تو حضرت عمر نے اس فیصلہ کو مان لیا۔ اسی بنا پر امام موصوف کہتے ہیں۔ ہم یہ شرط نہیں لگاتے کہ تمام لوگ نص کو جان کر رہیں۔ نص کی معنوی نقل ہوجاتی ہے جیسے کہ اخبار اور احادیث کی معنوی نقل ہوجاتی ہے۔ لیکن

---

[1] ایضًا: ۲۱۱۔

ہم نے اجماع کے موارد کا استقرار کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہر ایک اجماع کیلئے نص موجود ہے۔ مگر بہت سے علما کو اس کا علم نہیں تھا۔ اور انہوں نے جماعت کی رائے کے مطابق فیصلہ دیا جو نص ہی کے مطابق تھا۔ اسی طرح کبھی قیاس سے استدلال کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی امت کا اجماع ہوتا ہے جو لوگوں کو معلوم نہیں رہتا۔ مگر وہ قیاس اجماع کے موافق ہو جاتا ہے۔ [1]

امام موصوف لکھتے ہیں کہ سلف کا طریقہ یہ تھا کہ سب سے پہلے کتاب وسنت میں نص کی تلاش کرتے تھے اور اس کے بعد اجماع اور قیاس پر عمل کرتے تھے۔ مگر متاخرین فقہا کی ایک جماعت کا یہ خیال ہو گیا کہ اگر مجتہد کو کسی مسئلہ پر اجماع مل جائے تو دوسرے ماخذوں کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے اجماع کے ساتھ نص کا ہونا ضروری ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ممکن ہے کہ امت نے نص کو کھو دیا ہو۔ کیونکہ امت نص کو ہرگز کھو نہیں سکتی۔ اجماع کا ہونا بسا اوقات ناممکن ہوتا ہے۔ کون ایسا ہے جو مجتہدین کے مختلف اقوال کا پورا احاطہ کر سکتا ہو۔ البتہ نصوص محدود ہوتے ہیں ان کی معرفت ممکن اور آسان ہوتی ہے۔

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی کسی آیت کو کوئی دوسری آیت ہی منسوخ کر سکتی ہے۔ سنت قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اجماع سنت کا ناسخ نہیں ہو سکتا۔ سنت میں تعارض نہیں ہو سکتا۔ نہ تو سنت ہی قرآن کی معارض ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی اجماع قرآن وسنت کے معارض قرار دیا جاسکتا ہے۔ [2]

صحابہ کرام اور تابعین نے ہر مسئلہ میں چاہے وہ اصول دین سے تعلق رکھتا ہو یا فروع شریعت سے متعلق ہو سب سے پہلے کتاب وسنت ہی سے استدلال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانے میں اصول وفروع کے سمجھنے میں کسی سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ بعد کے لوگوں نے کتاب وسنت کو چھوڑ کر عقلی دلائل سے جن کو وہ قطعی سمجھتے ہیں کام لینا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ راستے سے بھٹک گئے اور نئی نئی بدعتیں نمودار ہونے لگیں۔ سلف کا اس پر اتفاق تھا کہ اگر قرآن مجید کے کسی الفاظ کی تشریح آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے ہو جائے تو وہی قابل قبول ہوگی۔ ان کے مقابلہ میں اہل لغت کی تفسیر کو ترجیح نہیں دی جائے گی۔ اپنی رائے یا

---

[1] مجموع الرسائل الکبری: ١/ ٢١٢۔ [2] ایضًا: ٢١٦۔

اپنے ذوق اور عقل اور کشف و وجدان سے قرآن کا معارضہ نہیں کیا جاسکتا۔ [1] اسی طرح سنت کے ہوتے ہوئے کسی کے ذوق و عقل یا کشف و وجدان یا رائے کو کوئی ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ سنت قرآن کی مفسر اور مجمل کی تفصیل کرتی ہے۔ سنت قرآن کے ظاہر کی مخالف تو نہیں ہوتی مگر بعض چیزوں کی ایسی تفصیل پیش کرتی ہے جس کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں ہوتا، مثلاً قرآن مجید میں نمازوں کا حکم دیا گیا ہے مگر تعداد رکعات اور اوقات کی کوئی تفصیل پیش نہیں کی گئی ہے۔ ان کی تعیین سنت سے ہوتی ہے۔ خوارج کے سوا جمہور فقہاء اس اضافے کو مانتے ہیں۔ خوارج کہتے ہیں کہ اگر سنت ظاہر قرآن کی مخالف ہو تو اس سنت کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ خوارج شادی شدہ زانی کے رجم کرنے سے انکار کرتے ہیں جس کی تخصیص سنت سے ہوتی ہے۔ [2]

اجماع کا درجہ سنت کے بعد کا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ علما مسلمین کسی حکم پر مجتمع ہوجائیں اگر کسی حکم پر امت کا اجماع ثابت ہوجائے تو کسی کیلئے اس سے باہر قدم رکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ امت مسلمہ گمراہی پر مجتمع نہیں ہوسکتی۔ بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کے متعلق بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ان میں امت کا اجماع ہوگیا ہے۔ حالانکہ بات ایسی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ کتاب وسنت سے بسا اوقات اس اجماع کے خلاف قول کی تائید ہوتی ہے۔ فقہاء اربعہ یا بعض ائمہ کبار کا کسی مسئلہ پر اتفاق اجماع امت کا مترادف نہیں ہوتا۔ اور وہ ہمارے لیے لازمی حجت نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان ائمہ کبار کے بعض پیروؤں نے کتاب وسنت کے واضح دلائل کی بنا پر اپنے اپنے اماموں سے اختلاف کیا ہے۔ [3] اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ نے بہت سی مثالیں دی ہیں۔

آنحضرت کے بعد صحابہ کا اجماع تھا۔ اس کی دو صورتیں ہوتی تھیں۔ ایک یہ کہ کسی مسئلہ میں مختلف صحابہ کرام سے ایک ہی قول نقل ہو۔ اور اس کے مخالف کوئی دوسرا قول نہ پایا جائے۔ دوسری یہ کہ کسی ایک صحابی سے ایک قول منقول ہو اور اس کے خلاف کسی دوسرے

---

[1] مجموع الرسائل الکبری: ۱/ ۱۹۔۲۰۔ [2] ایضًا: ۳۶۔

[3] فتاوی ابن تیمیة: ۱/ ٤٠٦۔

صحابی کی کوئی رائے نہ پائی جائے۔ شرعی احکام میں سب سے زیادہ معتبر اجماع صحابہ کا ہے۔ اوران کے تابعین کا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اتباع میں صحابہ کرام کے ساتھ تابعین کو شریک کرلیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ [1]

''مہاجرین اور انصار میں سے وہ لوگ جنہوں نے پہلے پہل سبقت کی اور وہ لوگ جنہوں نے نیکی کے ساتھ ان کی اتباع کی۔''

صحابہ کرام کے اجماع کا معلوم کرنا آسان ہے۔ مگر تابعین کے اجماع کا معلوم کرنا بہت دشوار ہے۔ کیونکر تابعین مختلف جگہوں پر منتشر اور پھیل گئے تھے۔ ان سب کے اقوال کا احاطہ کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ [2]

قیاس کے متعلق امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم نے مستقل رسالے لکھے ہیں۔ قیاس کے معنی یہ ہیں کہ دو چیزوں کی علت کے توافق یا تخالف کی بنا پر ان کے متعلق موافق یا مخالف حکم لگایا جائے۔ اگر علت میں توافق ہو تو اس کو قیاس طرد کہا جاتا ہے کیونکہ دو متماثل چیزوں کے درمیان علت کے توافق کی وجہ سے حکم ایک ہی لگایا جاتا ہے۔ دوسرے کا نام قیاس عکس ہے کیونکہ ایک چیز کی علت دوسرے کی علت کے برخلاف ہوتی ہے۔ اس لیے پہلی چیز کے حکم کے بالکل برخلاف اور بالعکس دوسری چیز پر حکم لگایا جاتا ہے۔ مگر امام موصوف نے ان دونوں کے درمیان ربط پیدا کر کے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ قیاس صحیح حدیث صحیح کا ہرگز مخالف نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کئی مثالیں پیش کی ہیں جن کو طوالت کے خوف سے یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے امام موصوف نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ شرعی احکام میں زیادہ تر لوگوں کے مصالح کو پیش نظر رکھا گیا ہے اگر ان کو اپنے سامنے رکھا جائے، تو ہمارا قیاس بھی وہی حکم صادر کرے گا جو صحیح حدیث سے منتج ہوتا ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگر نص قیاس کے خلاف ہو تو ہمارا قیاس صحیح نہیں ہوسکتا بلکہ وہ فاسد ہوگا۔ شرعی عقائد واحکام میں جتنا

---

[1] ٩/التوبة: ١٠٠۔ [2] فتاوی ابن تیمیة: ٢/ ١٣٣۔

بھی فساد پیدا ہوا ہے وہ انہی فاسد قیاسات کا نتیجہ ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

ومن كان له معرفة بكلام الناس فى العقليات راى عامة ضلال من ضل من الفلاسفة والمتكلمين بمثل هذه الاقيسة الفاسدة التى يسوى فيها بين الشيئين لاشتراكهما فى بعض الامور مع ان بينهما من الفرق مايوجب اعظم المخالفة۔ ❶

"جس شخص کو عقلیات کے بارے میں لوگوں کے کلام کی معرفت حاصل ہو وہ دیکھے گا کہ فلاسفہ اور متکلمین کی عام گمراہی انہی قیاسیات فاسدہ کی وجہ سے ہوئی ہے کیونکہ وہ دو چیزوں کو بعض امور میں مشترک دیکھ کر دونوں کو ایک دوسرے کے برابر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کے درمیان اتنا بڑا فرق ہوتا ہے جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان زبردست فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

ان کا دعویٰ یہ ہے کہ شریعت ہمیشہ قیاس فاسد کو باطل قرار دیتی ہے چنانچہ کہتے ہیں:

والشرع دائما يبطل القياس الفاسد كقياس ابليس وقياس المشركين الذين قالوا انما البيع مثل الربا۔ ❷

"اور شریعت ہمیشہ قیاس فاسد کو باطل قرار دیتی ہے جیسے کہ ابلیس یا مشرکین کا قیاس ہے جو یہ کہتے تھے کہ بیشک بیع بھی سود کی مانند ہے۔

ان کا خیال یہ ہے کہ شریعت میں کوئی ایسی چیز ہی نہیں آئی ہے جو قیاس صحیح کی مخالف ہو۔ پس جس کسی چیز کے متعلق بھی یہ کہا گیا ہو کہ وہ قیاس کے خلاف ہے لازمی طور پر اس میں کوئی وصف ہونا چاہیے جو اس کو قیاس کے حکم سے ممیز کر رہا ہو۔ ❸

فتاویٰ کی خصوصیات

امام ابن تیمیہ ابھی کمسن ہی تھے کہ ان کو فتویٰ دینے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس وقت ان کی عمر انیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ انہوں نے تقریباً

---

❶ مجموع الرسائل الكبرى : ٢/ ٢٤٥۔ ❷ ايضًا: ٢٤٤۔
❸ ايضًا: ٢٥٦۔

۶۸۰ھ سے فتوی دینا شروع کیا تھا۔ ابتدائی چند سال ان کا وقت زیادہ تر درس و تدریس میں گزرا۔ وہ مفتی کی حیثیت سے مشہور نہیں ہوئے۔ مگر جب کبھی ان کے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو وہ اس کا جواب لکھ دیا کرتے تھے۔ اس دور کے فتاویٰ غالباً محفوظ نہ رہ سکے۔ ۶۹۸ھ سے عقائد کی جنگ شروع ہوئی۔ بیچ میں دو چار سال تاتاری لڑائیوں میں گزرے۔ جب اس سے فارغ ہوئے تو پھر عقائد اور صوفیہ سے متعلق جھگڑے ہوتے رہے۔ ۷۰۵ھ تک چار سال مصر میں قید و بند کی حالت میں گزرے، جب رہا ہوئے تو لوگوں میں ان کی بہت زیادہ شہرت ہو چکی تھی۔ لوگ ان سے ہر قسم کے سوالات کرتے تھے اور وہ ان کے جوابات دیا کرتے تھے۔ بلکہ تاتاریوں، نصرانیوں، یہودیوں، مجوسیوں، نصیری اور اسماعیلی شیعوں سے بھی متعلق ہوتے تھے۔ ۷۱۲ھ میں مصر سے دمشق آئے۔ بہت سے فقہی مسائل میں اپنے اجتہاد کی بنا پر اپنے دور کے مفتیوں اور قاضیوں سے اختلاف کیا۔ اس وجہ سے انہیں فتوے دینے کی ممانعت کی گئی۔ جس کو انہوں نے نہیں مانا اور برابر فتویٰ دیتے رہے کچھ مہینوں کیلئے ان کو قید کیا گیا۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ جب رہا ہوئے تو اپنی آخری قید ۷۲۶ھ تک وہ فتوے دیتے رہے۔ تو گویا ان کے فتاوی کی حقیقی مدت ۷۰۹ھ سے لے کر ۷۲۶ھ تک کی ہے۔ اس مدت میں انہوں نے بے شمار فتوے دیے ہیں۔ اگر ان سب کو یکجا کیا جاتا تو کئی جلدیں ہو جاتیں۔ اس وقت چھوٹے چھوٹے چند رسائل کے علاوہ ان کے فتاوی کی پانچ ضخیم جلدیں چھپی ہیں۔ آخری جلد تمام تر کلامی مسائل سے تعلق رکھتی ہے۔ باقی چار جلدوں میں ان کا ایک ضخیم رسالہ اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل بھی شامل ہے۔ امام ابن تیمیہ سے پہلے اور ان کے بعد کے بڑے بڑے علما کے فتاوے کے مجموعے چھپے ہوئے ہیں۔ امام موصوف کے فتاوی کے ساتھ ان کا موازنہ کیا جائے تو صاف پتہ چل سکتا ہے کہ ان کے فتاوی کی چند ایسی خصوصیات جو دوسرے علما کے فتاوی میں نہیں پائی جاتیں۔

سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ ہر مسئلہ میں چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا پہلے کتاب و سنت سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کے ضمن میں اکابر صحابہ و تابعین اور پھر تمام ائمہ کبار کے اقوال و آرا نقل کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف دوسرے علما کا دستور یہ تھا کہ وہ صرف

اپنے امام یا زیادہ سے زیادہ ائمہ اربعہ کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا کرتے تھے وہ کبھی کبھی کتاب وسنت سے بھی استشہاد کرتے تھے۔ مگر ان کا یہ استشہاد محض ضمنی ہوتا تھا۔ اکابر صحابہ و تابعین کے اقوال و آراء کو پیش کرنے کا طریقہ ان علما کے نزدیک بالکل متروک ہو گیا تھا۔ ان کی نظر ائمہ اربعہ کے اقوال پر محدود ہو گئی تھی۔ امام موصوف نے اس طریقہ کو ترک کر کے ایک فطری طریقہ اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے پڑھنے والے کے لیے مسئلے کی نوعیت بالکل مدلل اور واضح ہو جاتی ہے اور اس کے سامنے مزید غور و فکر کی راہ کھولتی ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ نے متاخرین کی فقہی تصنیفات کو چھوڑ کر متقدمین کی تصنیفات پر اعتماد اور بھروسہ کیا۔ ان کے فتاویٰ کو پڑھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ شروع سے لے کر ان کے زمانے تک جتنی فقہی کتابیں لکھی گئی تھیں ان میں سے اکثر اہم کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ متاخرین نے بعض ائمہ کی طرف غلط اقوال منسوب کر دیے تھے جن کی تصحیح امام موصوف نے متقدمین کی تصنیفات کی مدد سے کی ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کے فتاوی میں تمام شرعی احکام مسلمانوں کی زندگی سے مربوط نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کسی سوال کا جواب محض فقہی کتابوں کو پیش نظر رکھ کر نہیں کیا ہے بلکہ مسلمانوں کی حقیقی زندگی پر اپنے جواب کو منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک مستفتی بسا اوقات سوال کو اس طرح مرتب کر کے پیش کرتا تھا کہ اس کا جواب اس کے دلی مقصد کے مطابق ہو جائے۔ امام موصوف سوال کو دیکھ کر مستفتی کی غرض و غایت کو بھانپ لیتے تھے۔ اور جواب میں اتنی تفصیل سے کام لیتے تھے کہ مسئلہ کی نوعیت بالکل واضح ہو جائے اور مستفتی اس کو اپنے غلط مقاصد کیلئے استعمال نہ کر سکے۔ ان کے شاگرد حافظ ابن قیم نے اپنے استاد کے اس طریقہ جواب کی بڑی تعریف کی ہے اور مختلف مثالیں بھی دی ہیں۔ [1]

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ تمام اختلافی مسائل کو کچھ اس انداز سے سلجھایا ہے کہ فروعی اختلافات میں شدت باقی نہیں رہتی۔ فقہ میں سب سے زیادہ الجھن انہی اختلافی مسائل کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دوسرے علما اپنی تنگ نظری کی بنا پر ان مسائل میں تعصب برتتے ہیں

---

[1] دیکھو، اعلام الموقعین: ٤/ ٢٢٧۔

اور اپنے ہی مسلک کو کھینچ تان کر کتاب وسنت کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ امام موصوف اس مقلدانہ تعصب سے بالکل بری تھے۔ اس لیے انہوں نے کتاب وسنت کے اصول کو سامنے رکھ کر اختلافی مسائل کا جواب لکھا ہے۔ ان کے جوابات میں جتنی حقیقت بینی اور واقعیت پسندی ملتی ہے اتنی دوسروں کے جوابات میں نظر نہیں آتی۔ ان کے جوابات کو پڑھنے کے بعد فرقہ وارانہ تعصب باقی نہیں رہ سکتا۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا ہر ایک جواب علم وعمل کے صحیح ذوق اور جوش اور جذبہ سے بھرا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم وعمل کا ایک اُبلتا ہوا چشمہ ہیں جس سے انسانی زندگی کی سوتیں نکل کر بہہ رہی ہیں اور ان سے ہر ایک روحانی مریض سیراب ہو کر نہ صرف کلی شفا پا سکتا ہے بلکہ اپنے اندر زندگی کی ایک نئی اُمنگ محسوس کر سکتا ہے۔ سارے گندے تصورات اس کے دل و دماغ سے کافور ہو جاتے ہیں اور اسے ایک نئی علمی بصیرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور وہ حقیقی عمل کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔

قرأت خلف الامام

نماز اسلام کا اہم ترین رکن ہے۔ آنحضرت کے زمانے میں یہ دن میں پانچ مرتبہ جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی تھی۔ جس میں ہر ایک صحابی شریک ہوتا تھا۔ اس کے باوجود تعجب یہ ہے کہ اس میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ نماز سے متعلق بیسوں مسائل ایسے ہیں جن میں ائمہ کے مختلف اقوال منقول ہیں اور لوگ اس کی مختلف صورتوں پر عمل پیرا ہیں کوئی اقامت میں ایک ایک مرتبہ اور کوئی دو دو مرتبہ تکبیر کہتا ہے۔ تکبیر تحریمہ کے وقت کوئی اپنے ہاتھ کندھوں تک اور کوئی اپنے کانوں کی لولکیوں تک اُٹھاتا ہے کوئی سینے پر اور کوئی ناف کے برابر اپنے ہاتھ باندھتا ہے اور کوئی بالکل چھوڑ دیتا ہے، کوئی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کو ضروری قرار دیتا ہے اور کوئی خاموش کھڑے رہنے کی تاکید کرتا ہے، کوئی رکوع سے پہلے اور اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھ کندھوں تک اُٹھاتا ہے۔ کوئی آمین پکار کر کوئی دبی زبان سے کہتا ہے۔ کوئی اپنے بائیں پیر پر بیٹھتا ہے تو کوئی زمین پر اپنی سرین ٹیک دیتا ہے۔ کوئی وتر کی نماز میں قنوت پڑھتا ہے تو کوئی صبح کی نماز میں دُعا کرتا ہے۔ ان اختلافات پر بے تعصبی کے ساتھ غور کیا

جائے تو کوئی اختلاف دکھائی نہیں دیتا۔ دونوں صورتوں پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ تمام صورتیں نماز کے ارکان میں داخل نہیں ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے ان سب کی بہترین تشریح کی ہے۔ ان سب کو یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں صرف قراءت خلف الامام کے مسئلہ کے متعلق امام موصوف کے خیالات کو پیش کیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

اس مسئلہ کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ امام کے پیچھے کچھ بھی نہ پڑھا جائے، دوسری یہ کہ امام کے پیچھے ہر حالت میں کچھ پڑھا جائے۔ چاہے امام پکار کر پڑھے یا آہستہ پڑھے، تیسری یہ کہ امام پکار کر پڑھے تو کچھ نہ پڑھا جائے اور اگر آہستہ پڑھے تو کچھ پڑھا جائے۔ امام موصوف نے اسی تیسری صورت کی تائید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مقتدی کے کچھ پڑھنے سے بہتر امام کی قراءت کا سننا ہے اور اگر امام آہستہ پڑھے تو مقتدی کے خاموش کھڑے رہنے سے بہتر قرآن کا پڑھنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جمہور علما کا یہی مسلک ہے امام مالک، امام احمد بن حنبل اور ان کے عام متبعین اور امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے بعض متبعین کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا قدیم قول بھی اسی کی تائید میں ہے محمد بن الحسن شیبانی کا بھی یہی قول تھا۔

اس قول کے مطابق اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا سری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے یا صرف مستحب ہے۔ امام احمد کے مذہب میں دو قول منقول ہیں جن میں مستحب کا قول ہی زیادہ مشہور ہے۔ امام شافعی کا قدیم قول بھی یہی تھا۔

جب امام پکار کر پڑھے تو اس وقت مقتدی کا سننا واجب ہے یا مستحب ہے؟ اور امام کے پیچھے قراءت کا پڑھنا حرام ہے یا مکروہ؟ آیا اس سے مقتدی کی نماز باطل ہوتی ہے یا نہیں؟ اس بارے میں امام احمد سے دو قول منقول ہیں ایک یہ کہ قراءت حرام ہے اور اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ ابوعبداللہ ابن حامد نے امام احمد بن حنبل سے یہی قول نقل کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ نماز نہیں ہوتی۔ اور یہی قول اکثر لوگوں کا ہے۔ امام احمد سے یہی قول زیادہ مشہور ہے۔ یہ اختلاف اسی قسم کا ہے جیسا کہ رکوع و سجود میں قرآن کے پڑھنے کا ہے۔ کیونکہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے رکوع و سجود میں قرآن مجید کے پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔

وہ لوگ جو سری اور جہری نمازوں میں خاص کر سورۂ فاتحہ پڑھنے کے قائل ہیں اس

بارے میں اختلاف کرتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے یا مستحب ہے۔ امام شافعی کا جدید قول اور ابن حزم کا خیال یہی تھا کہ سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔ لیکن امام اوزاعی اور امام لیث بن سعد کہتے تھے کہ یہ صرف مستحب ہے۔ امام موصوف کے دادا مجد الدین ابو البرکات عبدالسلام ابن تیمیہ کی بھی یہی رائے تھی۔

امام موصوف کی رائے یہ تھی کہ اگر امام پکار کر قرأت پڑھے تو اس صورت میں مقتدی کو خاموش ہو کر سننا چاہیے۔ اگر امام کے دور ہونے کی وجہ سے مقتدی کو قراءت سنائی نہ دے تو امام احمد کا صحیح قول یہی ہے کہ مقتدی اس کے پیچھے پڑھے۔ اگر مقتدی بہرہ ہو یا امام کی قراءت بہرے پن کی وجہ سے صاف سمجھ میں نہیں آتی ہو تو اس میں امام احمد کے دو قول منقول ہیں۔ افضل یہی ہے کہ اس کے پیچھے پڑھ لے۔ کیونکہ مقتدی یا تو سامع ہوگا یا قاری ہوگا۔ بہرا آدمی سامع میں شمار نہ ہوگا اور سننے سے جو مقصد ہے وہ حاصل نہ ہوگا۔ ایسی حالت میں اس کے خاموش رہنے سے بہتر اس کا پڑھ لینا ہے۔

جہری نمازوں میں امام کے پیچھے کچھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ اس کے متعلق کتاب وسنت کے دلائل اور صحابہ کا عمل موجود ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ ﴾ [1]

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور چپ رہو تا کہ تم پر رحمت ہو۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من كان له امام فقراءة الامام له قرأة)) [2]

''جس شخص کا کوئی امام ہو تو امام کی قرأت اس کی قرأت ہے۔''

صحابہ کرام کا بھی یہی عمل تھا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہری نماز سے سلام پھیر کر پوچھا: ''کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ اب کچھ پڑھا ہے؟'' ایک شخص نے جواب دیا: ہاں یا رسول اللہ! میں نے ایسا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''جبھی تو میں کہہ رہا تھا کہ کیوں میری قراءت اتنی ٹکرا رہی ہے۔'' اس کے بعد

---

[1] ٧/الاعراف: ٢٠٤۔ [2] سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب اذا قراء الامام فأنصتوا، ح: ٨٥٠۔

سے لوگوں نے آپ کے پیچھے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ [1]

یہ واقعہ صرف جہری نمازوں سے متعلق تھا۔ ورنہ لوگ سری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ اور قرآن مجید پڑھا کرتے تھے۔ اس کے متعلق بہت سی روایتیں موجود ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے سری نمازوں میں کسی کو قرآن پڑھنے سے منع نہیں کیا ہے۔ نماز کی ان تمام صورتوں میں جن میں امام بغیر آواز کے پڑھتا ہے مقتدی بھی اس کی اطاعت کرتے ہیں جیسے کہ رکوع و سجود میں تسبیحوں کا پڑھنا اور قعدہ اور قنوت میں تشہد اور ادعیہ ماثورہ کا پڑھنا ہے۔ جب ان سب صورتوں میں مقتدی امام کے پیچھے پڑھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ کیونکہ سری قراءت کے موقع پر مقتدی خاموش کھڑے رہیں۔ خاموش کھڑے رہنے سے وسوسے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور مقتدیوں کا خیال بھٹکنے لگ جاتا ہے۔ ان تمام باتوں سے بچنے کے لیے مقتدیوں کو کچھ پڑھتے رہنا افضل ہے۔

اب رہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی اور جو شخص نماز پڑھے اور سورۂ فاتحہ نہ پڑھے تو یہ نماز ناقص ہے تو یہ صرف منفرد نمازیوں کے متعلق ہے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کے لیے یہ حکم نہیں ہے بلکہ ان کے لیے یہ حکم ہے کہ امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہوتی ہے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مقتدی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ لازمی طور پر پڑھیں اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ امام ایک ایک آیت پڑھ کر کچھ دیر کے لیے رُک جائے تاکہ مقتدی اس آیت کو پڑھ لیں۔ دوسری یہ کہ سورۂ فاتحہ کے ختم ہونے کے بعد امام اتنی دیر کے لیے رُک جائے جس میں مقتدی پوری سورۂ فاتحہ پڑھ سکیں۔ چھوٹے اور لمبے وقفوں اور سکتوں کے ساتھ آنحضرت سے نماز منقول نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہمارے لیے تواتر کے ساتھ نقل ہوتا ہوا آتا، حدیث کی کتابوں میں اس قسم کی کوئی روایتیں منقول نہیں ہیں۔ اس سے یہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ جہری نمازوں میں مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کی کوئی

---

[1] سنن ترمذی، ابواب الصلاة، باب ماجاء فی ترك القراءة.....، ح: ۳۱۲؛ ابوداود: ۸۲۶۔

ضرورت نہیں ہے امام کی قراءت سورۂ فاتحہ کو سن لینا ہی کافی ہے۔ [1]

ابطال حیل

شریعت اسلامیہ نے خاص مصالح اور مقاصد کی بنا پر بعض چیزوں کو جائز اور بعض کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اس نے بیوپار کے موقع پر قیمت کی کمی بیشی کو تو جائز قرار دیا ہے مگر قرض لے کر واپس کرنے کی صورت میں زیادہ دینے کو ناجائز ٹھہرایا ہے۔ مگر چونکہ انسان فطرتاً مال اور عورتوں کا حریص واقع ہے۔ اس لیے حیلہ جو طبیعتیں ناجائز چیزوں کو بھی اپنے لیے جائز کر لینے کی کوشش کرتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص دوسرے کو متعینہ رقم قرض دیتا ہے اور اس کے ساتھ ایک کم قیمت کی چیز اسے بیچ دیتا ہے۔ قرض لینے والا اس متعینہ رقم کے ساتھ ساتھ ایک بڑی رقم اس چیز کی قیمت کے طور پر ادا کرتا ہے حالانکہ سب لوگ یہ جانتے ہیں کہ اس چیز کی اتنی بڑی قیمت نہیں ہو سکتی۔ اس چیز کی واجبی قیمت سے بڑھ کر جو بھی رقم ہوگی وہ سود میں شمار ہوگی جس کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ اپنے اوپر سے زکوٰۃ کو ساقط کرنے کے لیے حیلے تراشتے تھے مثلاً ایک سال گزرنے سے پہلے مال کو اپنی بیوی، بیٹے یا کسی قریبی رشتہ دار کے حوالے کر دیتے تھے۔ اور پھر ایک سال گزرنے سے پہلے اپنے نام لکھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح ملکیت کے ردوبدل سے زکوٰۃ کو ساقط کیا جاتا تھا۔ جو کسی حالت میں بھی درست نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ایک شخص کوئی حسین اور طرحدار لونڈی خریدتا تھا اور اس سے فوری طور پر لطف اندوز ہونا چاہتا تھا تو اس کی صورت یہ تھی کہ اس کو آزاد کر کے اس سے شادی کر لے اور پھر اس سے ہمبستری کرے، شریعت استبراء رحم سے پہلے کسی کو ہمبستری کی اجازت نہیں دیتی محض ظاہری شکل کے بدل جانے سے مسئلہ کی اصل حقیقت بدل نہیں جاتی۔ مذکورۂ بالا صورت میں استبراء رحم لازمی ہے۔ اس کے بغیر ہمبستری نہیں ہو سکتی۔

تابعین کے آخری زمانے میں کسی نے کتاب الحیل کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں تین سو بیس یا تین سو تیس حیلے پیش کیے تھے اور جب عبداللہ بن مبارک (المتوفی: ۱۸۱ھ)

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیه: ۲/ ۱٤۱، ۱۵۰۔

سے اس کے متعلق واقعہ بیان کیا گیا تو وہ سخت خفا ہوئے۔ اور کہا کہ اس کتاب کا لکھنے والا، اس کو پسند کرنے والا، اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والا اور اس کے مطابق فتویٰ دینے والا سبھی کافر ہیں۔ وہ اس کے مصنف کو ابلیسوں کا ابلیس قرار دیتے تھے۔ حضرت حفص بن غیاث اور حضرت قاسم بن معن یعنی ابن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود قاضی کوفہ اس کتاب الحیل کو کتاب الفجور کہا کرتے تھے۔ [1]

ٹھیک طور پر یہ نہیں معلوم کہ کس نے یہ کتاب لکھی تھی۔ امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد امام محمد بن الحسن شیبانی (المتوفی: ۱۸۹ھ) کے ساتھ ایک کتاب اس نام سے منسوب ہے جس کے متعلق ابوحفص رحمہ اللہ کی روایت کی بنا پر شمس الائمہ ابوبکر محمد بن احمد بن ابی سہل السرخسی (المتوفی: ۴۹۰ھ) کا اصرار ہے کہ یہ امام محمد ہی کی تصنیف ہے مگر انہوں نے اس بارے میں ائمہ کا اختلاف بھی نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ ابوسلیمان الجوزجانی ان کی تصنیف ہونے سے انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جو کوئی یہ کہے کہ امام محمد نے کتاب الحیل کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے تم اس کو تسلیم نہ کرو بلکہ لوگوں کے ہاتھوں میں جو کتاب پائی جاتی ہے وہ درحقیقت بغداد کے بعض کاتبوں کی لکھی ہوئی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جاہل لوگ ہمارے علما کی طرف محض عار دلانے کے لیے ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں۔ امام محمد کے متعلق ہرگز یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے افتراء پرداز جاہلوں کی معاونت کے لیے اس نام سے ایک کتاب لکھی ہو، مگر ابوحفص رحمہ اللہ کہتے تھے کہ یہ امام محمد ہی کی تصنیف ہے اور وہ ان سے اس کی روایت بھی کیا کرتے تھے۔ سرخسی کہتے ہیں کہ ابوحفص کا قول ہی زیادہ صحیح ہے۔ امام محمد کے تخریج کردہ احکام میں حیلوں کا استعمال ہمارے جمہور علما کے نزدیک جائز ہے۔ کتاب و سنت میں غور و فکر نہ کرنے والے اور متعصب جاہل ہی ان حیلوں کو ناپسند کرتے ہیں اور انہیں ناجائز بتاتے ہیں۔ [2]

یہ کتاب امام محمد کی ہو یا نہ ہو مگر اتنا تو ثابت ہے کہ علمائے احناف میں سے بعض نے حیلوں کے جواز کا فتویٰ دیا اور اس کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں مثلاً امام احمد بن عمر

---

[1] اعلام الموقعین: ۳/ ۱۵۵۔ [2] کتاب المبسوط: ۳۰/ ۲۰۹۔

الخصاف (المتوفی: ۲۶۱ھ) نے کتاب الحیل کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ اسی کے بعد سے حدیث وفقہ کی کتابوں میں حیلوں کے جواز اور عدم جواز پر مستقل بحثیں ہونے لگی تھیں۔ مگر جو لوگ ان کے قائل تھے وہ بھی صرف ممنوعات اور حرام چیزوں سے بچنے کے لیے حیلوں کو جائز بتاتے تھے۔ حرام چیزوں کے حصول کے لیے حیلوں کا استعمال کرنا کسی کے پاس بھی جائز نہیں تھا۔ مگر جب ایک مرتبہ اس کا دروازہ کھل گیا تو عام لوگوں نے جا و بیجا ان سے کام لینا اور ہر ایک مسئلہ میں حیلوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ [1]

امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل میں اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب اعلام الموقعین جلد سوم میں ان حیلوں کے استعمال کی مختلف شکلیں بتائی ہیں جو اس زمانے میں مروج تھیں اور پھر ان پر سخت تنقیدیں کی ہیں۔ امام موصوف نے حضرت ابوحنیفہ اور ان کے دونوں شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد بن الحسن شیبانی کی طرف سے بڑا زوردار دفاع کیا ہے اور لکھا ہے کہ حیلوں کے جواز کو ان اماموں کی طرف منسوب کرنا بالکل غلط ہے بلکہ یہ خلیفہ مامون باللہ کے زمانہ کے ان معتزلی علما کا کام ہے جو فروع میں امام ابوحنیفہ کے مذہب کی پیروی کر رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہی معتزلہ علما میں سے کسی ایک نے ابوغسان کے زمانہ میں مرو کے اندر ابوروح کی لڑکی کو ارتداد کا مشورہ دیا تھا۔ اور یہ واقعہ امام احمد بن حنبل کی آزمائش خلق قرآن سے کچھ پہلے پیش آیا تھا۔ [2] بات یہ ہوئی تھی کہ ابو روح کی لڑکی اپنے شوہر سے طلاق طلب کر رہی تھی۔ مگر اس نے طلاق دینے سے بالکل انکار کر دیا۔ کسی نے کتاب الحیل کو سامنے رکھ کر اس کے مرتد ہو جانے کا مشورہ دیا۔ اور اس لڑکی نے اس پر عمل کیا تھا۔ ارتداد کی وجہ سے اس کا نکاح خود بخود ٹوٹ گیا تھا۔ شوہر کے طلاق دینے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ [3]

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اس قسم کے فتوے کے بعد کے زمانے میں دیئے گئے تھے۔ ان کو جلیل القدر ائمہ میں سے کسی ایک کی طرف منسوب کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے متعلق جتنی

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو اعلام الموقعین جلد سوم۔ [2] اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل: ٦٧۔ [3] ایضًا: ٢٧، ٦٣؛ اعلام الموقعین: ٣/ ١٥٤، ١٥٥۔

بھی روایتیں بیان کی جاتی ہیں وہ درست نہیں ہوسکتیں۔ بعد کے لوگوں نے ان باتوں کو ان کی طرف منسوب کر دیا ہے اور وہ بلا تحقیق وتنقید ایک دوسرے سے نقل ہوتی ہوئی چلی آرہی ہیں۔ یہ بیماری سب سے پہلے مشرق والوں میں پیدا ہوئی تھی۔ جس کا اثر آگے چل کر مختلف جگہ کے علما پر پڑ گیا۔ یہاں تک کہ امام احمد کے بعد پیروؤں نے بھی ان کے جواز کا فتویٰ دیا۔ حالانکہ امام احمد سب سے زیادہ ان حیلوں کے منکر تھے۔ [1]

ابطال التحلیل

منجملہ ان مسائل کے جن کے خلاف امام ابن تیمیہ نے زوردار تحریریں لکھی تحلیل کا مسئلہ بھی ہے میاں بیوی کا آپس کا رشتہ بہت ہی مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور استوار بنانا شریعت اسلامیہ کا مقصد ہے اس لیے اس نے طلاق کو ابغض الحلال عند اللّٰہ (اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض) قرار دیا ہے حد درجہ ناگوار حالات کی صورت ہی میں یہ رشتہ توڑا جاسکتا ہے اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو ہمیشہ کے لیے الگ کرنا چاہے تو وہ حیض کی پاکی کے بعد بیوی کو ایک طلاق دے اور یونہی چھوڑ دے جب عورت کی عدت پوری ہو جائے تو وہ نکاح کے بغیر اس کو اپنی زوجیت میں نہیں لے سکتا اگر عدت کی حالت میں رجوع کرے تو وہ باقی دو طلاق کا مالک ہوسکتا ہے یا ہر ایک طہر کے بعد ایک ایک طلاق دے کر تین طلاقوں کے بعد بیوی کو جدا کرے۔ طلاق ایک ایک کر کے تین مرتبہ محض اس لیے رکھی گئی ہے کہ شوہر کو سوچنے اور سمجھنے کا پورا موقع ملے۔ اور جب تین طلاقیں پوری ہو جاتی ہیں تو بیوی ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جاتی ہے۔ اور شوہر اس سے دوبارہ شادی نہیں کر سکتا تاوقتیکہ کوئی دوسرا مرد اس سے نکاح کر کے خلوت صحیحہ کے بعد طلاق نہ دے دے اور یہ دوسرا مرد شادی کرنے کی نیت سے نکاح کرے اور اگر وہ پہلے شوہر کے لیے حلال کرنے کی غرض سے نکاح کرے گا تو وہ زنا کے مترادف ہوگا کیونکہ وقت معین کے لیے نکاح نکاح نہیں ہوسکتا۔ مذہب اسلام نے متعہ کو اسی لیے حرام قرار دیا ہے کہ اس میں وقت کی تعیین ہوتی ہے۔

---

[1] اقامة الدليل على ابطال التحليل: ٦٧، ٦٨۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سال تک اسی طلاق سنت کا رواج رہا جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اگر کوئی جوش اور جذبے میں آکر ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے بیٹھتا تھا تو وہ ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھی۔ شوہر کو بیوی کی طرف رجوع کرنے کا اختیار ہوتا تھا لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ لوگ آپے سے باہر ہوکر کتاب وسنت کی صریح تعلیم کے برخلاف تین طلاقیں دیے جارہے ہیں تو انہوں نے سزا کے طور پر ان تین طلاقوں کو بائن قرار دے دیا۔ ان کے بعد سے شوہر کو اپنی بیوی کی طرف رجوع کرنے کا اختیار نہیں ہوتا تھا۔ کوئی دوسرا شخص اس عورت کو پہلے شوہر کے لیے حلال کرنے کی نیت سے اس سے شادی نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محلل (حلال کرنے والا) اور محلل لہ (وہ شخص جس کے لیے وہ حلال کررہا ہو) پر لعنت بھیجی ہے۔ آپ نے محلل کو تیس مستعار (مستعار سانڈ) سے بھی تعبیر کیا ہے۔ کسی میں اتنی اخلاقی جراءت نہیں ہوسکتی تھی کہ اس قسم کا کام کرکے خدا کی لعنت کا مستحق بنے یا مستعار سانڈ کہلائے۔ مگر جب آگے چل کر لوگوں کے ضمیر پر کوئی اخلاقی گرفت باقی نہ رہی تو بعض لوگ شوہر سے پیسہ لے کر یا بغیر پیسہ لیے ہوئے مطلقہ عورت سے نکاح کر کے خلوت صحیحہ کے بعد اس کو طلاق دینے لگے۔ امام ابن تیمیہ کے زمانے میں ایک گروہ نے تحلیل کو اپنا پیشہ بنالیا تھا۔ یہ لوگ شوہر سے کچھ رقم لے کر مطلقہ عورت سے شادی کرتے تھے اور رات لطف اُٹھا کر صبح کو طلاق دے دیتے تھے۔ امام موصوف نے اس دستور کے خلاف آواز اُٹھائی اور رصاف لکھا کہ اگر کوئی مطلقہ عورت کو شوہر پر حلال کرنے کی نیت سے شادی کرے اور ایک دن کے بعد اس کو طلاق دے دے تو وہ زانی ہے اور اس کو زنا کی سزا ملنی چاہیے۔ انہوں نے اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل کے نام سے ایک زبردست رسالہ لکھا جن میں تحلیل کی بہت سی شرعی اور اخلاقی برائیاں گنائی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ تحلیل کی وجہ سے اتنے مفاسد پیدا ہوگئے ہیں کہ ان کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ شادی کرنے والے کی غرض چونکہ دائمی رشتہ قائم کرنا نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ یہ تمیز نہیں کرتا کہ اس کی ہونے والی بیوی کون ہے؟ وہ بسا اوقات ماں اور اس کی بیٹی یا خالہ یا پھوپھی اور ان کی بھتیجی یا بھانجی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔ بیک وقت ان سے نکاح کرتا ہے اور صحبت کے بعد طلاق دے بیٹھتا ہے۔ نیز

مطلقہ عورت چونکہ اس کو اپنا دائمی شوہر نہیں خیال کرتی اس لیے اس کے سامنے بے حجاب ہونے سے ہمیشہ کتراتی ہے۔ محلل اس سے صحبت کرنے نہیں پاتا اور پھر بغیر خلوت صحیحہ ہی کے اس کو طلاق دے بیٹھتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اس نے کمرے میں قدم رکھا اور مطلقہ عورت کا صرف بستر روند آیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ خلوت صحیحہ ہوگئی۔ یا محلل بالا خانے پر چڑھا اور وہاں سے مطلقہ عورت کے سر پر تیل گرایا گیا اور سمجھ لیا گیا کہ خلوت صحیحہ ہوگئی۔ اگر محلل کی صحبت سے مطلقہ عورت کو حمل ہو گیا تو وہ عموماً شرم کے مارے نوزائدہ بچے کا گلا گھونٹ دیتی تھی۔ [1]

اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ خود مطلقہ عورت کی طبعی غیرت بھی اس کو گوارہ نہیں کرتی تھی کہ صرف ایک رات کے لیے کسی نئے شوہر سے ہمبستر ہو۔ طبقات اکبری کے مصنف نے ایک واقعہ بیان کیا جس سے پاکدامن عورتوں کی نفسی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ لکھتا ہے کہ سلطان شمس الدین کی لڑکی سلطان غیاث الدین بلبن کے لڑکے سلطان محمد کے حبالہ عقد میں تھی۔ محمد نے مستی کی حالت میں تین طلاقیں دے دیں۔ علمائے وقت نے فتویٰ دیا کہ وہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح کیے بغیر اس کے لیے حلال نہیں ہوسکتی۔ اس نے اپنے پیر بھائی شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ کے صاحبزادے شیخ صدر الدین سے گزارش کی کہ اس عورت سے نکاح کر کے خلوت صحیحہ کے بعد طلاق دے دیں۔ جب وہ حجلہ عروسی میں پہنچے اور خلوت صحیحہ ہوگئی تو اس عورت نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس فاسق کے پنجہ سے چھڑایا ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ دوبارہ مجھے اس کے حوالے کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہرگز اس کو پسند نہیں کر سکتا۔ شیخ نے کہا: اگر تمہاری مرضی نہ ہو تو میں تمہیں طلاق نہیں دیتا۔ دوسرے دن محمد نے طلاق کا مطالبہ کیا مگر شیخ نے طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ سلطان محمد بہت خفا ہوا اور ان سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ لیکن اسی زمانے میں اسے سلطان غیاث الدین بلبن کا حکم ملا کہ سرحد پر پہنچ کر مغلوں کے حملوں کا تدارک کرے مگر وہ وہاں سے واپس نہ آسکا۔ سرحد پر مارا گیا۔ [2]

---

[1] اقامة الدليل على ابطال التحليل: ٢١٦۔ [2] طبقات اکبری مولفہ نظام الدین احمد بن محمد مقیم ہروی مطبوعہ نولکشور پریس: ٤٣۔

محللین عام طور پر اپنے آپ کو احسان کرنے والا سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ محض پہلے شوہر کی خانگی تکلیفوں کو دُور کرنے کے لیے وہ ایسا کرتے ہیں۔ ان کا مقصد پیسہ کمانا نہیں ہے۔ امام موصوف لکھتے ہیں کہ اس قسم کا احسان کرنا شرعاً جائز ہوتا تو خود آنحضرت ﷺ اس کو اختیار کرنے کی دعوت دیتے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں رفاعۃ القرظی ایک صحابی نے اپنی بیوی تمیمہ بنت وہب کو طلاق دی۔ عدت کے بعد اس عورت نے حضرت عبدالرحمٰن بن الزبیر سے شادی کی جن سے اس کی تشفی نہ ہوسکی۔ عبدالرحمٰن نے اس کو طلاق دے دی۔ تمیمہ بنت وہب رفاعۃ القرظی کے حبالہ عقد میں جانا چاہتی تھی۔ اس نے آنحضرت ﷺ سے فتویٰ پوچھا۔ آپ نے فرمایا: ایسا نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ تم دوسرے شوہر کا اور وہ تمہارا مزہ نہ چکھے۔ اس نے دوبارہ سوال کیا۔ آپ نے پھر یہی جواب دیا۔ عبدالرحمٰن کے بعد وہ کسی دوسرے سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ وہ روک لی جائے گی اور رفاعہ کی طرف واپس نہ ہو سکے گی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں اجازت چاہی۔ ان دونوں نے رفاعہ کے ساتھ نکاح کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ اس عورت کے حد درجہ اشتیاق کو دیکھ کر کسی کو حکم دے دیا جاتا کہ اس سے نکاح کر کے خلوت صحیحہ کے بعد طلاق دے دے مگر کسی نے بھی ایسا نہیں کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تحلیل شرعاً ناجائز ہے۔ [1]

ایک مجلس کی تین طلاقیں

تحلیل کی برائی درحقیقت ایک مجلس کی تین طلاقوں کو بائن قرار دینے کا نتیجہ ہے۔ اگر کتاب وسنت کے مطابق تین طلاقیں تین طہر کی حالت میں دی جائیں تو میاں بیوی کو سوچ بچار اور آپس کی صلح وآشتی کا بہت بڑا موقع ملتا ہے ان دونوں کے درمیان اس وقت جدائی ہو گی جبکہ دونوں کی طبیعتوں میں زبردست اختلاف ہو اور ان کے درمیان میل ملاپ اور دائمی رشتہ قائم رہنے کی کوئی ممکن صورت موجود نہ ہو۔ اگر شوہر بیوی کو جدا کرنے پر آمادہ ہو اور بیوی اس سے محبت کرتی ہو تو وہ کسی نہ کسی ذریعہ سے اس کو زوجیت کا رشتہ باقی رکھنے پر آمادہ کر سکتی

---

[1] اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل: ۲۴۸۔ ۲۵۱۔

ہے۔مگر جب ایک مجلس کی تین طلاقوں کو بائن قرار دیا جائے تو پھر دونوں کے درمیان مفاہمت کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔مرد عموماً غصہ میں آ کر تین طلاقیں دے بیٹھتا تھا اور جب غصہ اُترتا تھا تو اس کی عقل ٹھکانے لگتی تھی اور پھر وہ قانون کے ہاتھوں مجبور ہوتا تھا کہ اپنی مطلقہ بیوی کو کسی دوسرے سے نکاح کرا کے اس کی خلوت صحیحہ اور طلاق کے بعد اس کو اپنی زوجیت میں لے۔بسا اوقات اس کی طبعی غیرت اس کو گوارا نہیں کرتی تھی اور اگر خانگی ضروریات سے مجبور ہوکر کسی کے ذریعہ وہ اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے لیے حلال کر بھی لیتا تھا تو ان دونوں کے درمیان وہ پرانی محبت باقی نہیں رہتی۔عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ دلچسپی نہیں ہوتی اور مرد کے دل سے اس کی وقعت اُٹھ جاتی تھی۔میاں بیوی کے ان فطری اور دلی احساسات کو ہر صاحب عقل محسوس کرسکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تین طلاقیں شریعت کی رُو سے کتنی شمار کی جائیں گی؟

آنحضرت ﷺ کے زمانے میں کتاب وسنت کے خلاف ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی۔صرف ایک دو واقعے پیش کیے جاتے ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق قرار دیا تھا۔ان میں سے ایک رکانہ بن عبد یزید کا واقعہ ہے جنہوں نے اپنی بیوی سہیمہ کو تین طلاقیں دی تھیں اور پھر غمگین ہوگئے اور بہت زیادہ رنج محسوس کیا۔آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر فتویٰ پوچھا۔آپ نے دریافت فرمایا: ''تم نے کس طرح طلاق دی؟'' رکانہ نے کہا: میں نے تین طلاقیں دیں،آپ نے پوچھا: ''کیا یہ تین طلاقیں ایک مجلس میں دی تھیں؟'' رکانہ نے کہا: ہاں۔آپ نے فرمایا: ''یہ ایک ہی طلاق ہے۔اگر تم چاہو تو اپنی بیوی کی طرف رجوع کرسکتے ہو۔'' رکانہ نے رجوع کرلیا۔[1]

یہ روایت مسند احمد بن حنبل کی ہے۔ابوداؤد،ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو قطعی طلاق (طلاق بتہ) دی۔آنحضرت ﷺ سے فتویٰ پوچھا اور کہا کہ میں نے اس سے ایک ہی طلاق مراد لی تھی۔آنحضرت نے کہا: ''قسم بخدا کیا تم نے ایک ہی طلاق مراد لی تھی؟'' رکانہ نے کہا: ہاں قسم بخدا میں نے ایک ہی طلاق مراد لی تھی۔آنحضرت

---

[1] مسند احمد: ٤/ ٢١٥،ح: ٢٣٨٣۔

نے انہیں رجوع کرنے کا حکم دیا اور انہوں نے رجوع کر لیا۔ محدثین کا بیان ہے کہ سہیمہ ان کی بیوی رہی یہاں تک کہ حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں اس کو دوسری طلاق دی اور پھر حضرت عثمان کے زمانہ خلافت میں تیسری طلاق دی جس کے بعد وہ بائن ہو گئی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی قطعی طلاق (طلاق بتہ) دے تو اس کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے حضرت عمر بن الخطاب کے نزدیک وہ ایک تھی۔ حضرت علی اس کو تین طلاقیں تصور کرتے تھے مگر بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اگر اس سے طلاق دینے والا ایک مراد لے گا تو ایک ہوگی اور اگر تین مراد لے گا تو تین ہوگی اور اگر دو مراد لے گا تو ایک ہی طلاق ہو گی۔ ثوری اور اہل کوفہ کا یہی قول تھا۔ حضرت امام مالک بن انس کی رائے یہ تھی کہ اگر عورت مدخولہ ہو تو تین ہوگی اور غیر مدخولہ ہو تو ایک شمار ہوگی۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ اگر طلاق دینے والا ایک کی نیت کرے تو ایک ہوگی اور اگر دو کی نیت کرے تو دو ہوں گی اور اگر تین کی نیت کرے تو تین ہوں گی۔ [1]

رکانہ کی حدیث کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل ہی کی روایت زیادہ معتبر اور مستند ہے۔ دوسری روایت میں بعض مجہول راوی ہیں جن کے احوال معلوم نہیں ہیں اور وہ فقیہ نہیں ہیں۔ احمد بن حنبل، ابو عبید اور ابن حزم وغیرہ نے اس دوسری روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ نیز امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ رکانہ کے متعلق طلاق البتہ کی جو حدیث بیان کی جاتی ہے وہ کوئی وزن نہیں رکھتی۔ یہ حدیث ثابت نہیں ہے کیونکہ ابن اسحٰق داؤد بن الحصین سے اور وہ عکرمہ سے اور وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں۔ مدینہ والے تین طلاقوں کو طلاق البتہ کی اصطلاح سے بھی تعبیر کیا کرتے تھے۔ [2]

دوسرا واقعہ حضرت عبادہ بن صامت کے والد یا دادا کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے دادا نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دی تھیں اور عبادہ کے والد صامت نے آنحضرت سے مسئلہ

---

[1] سنن ترمذی، ابواب الطلاق، باب ماجاء فی الرجل یطلق امرأته البتة، تحت الرقم: ١١٧٧؛ ابوداود: ٢٢٠٧؛ ابن ماجة: ٢٠٥١۔ [2] فتاوی ابن تیمیة: ٣/ ١٩۔

پوچھا۔ آپ نے فرمایا: ”تین طلاقیں تو تمہارے باپ کی رہیں باقی نوسوستانوے طلاقیں ظلم و عدوان میں شمار ہونگی اگر خدا چاہے، تو ان کی وجہ سے ان کو عذاب دے گا یا ان کی مغفرت کر دے گا۔“ [1]

یہ روایت مصنف عبدالرزاق میں ہے۔ مگر اس کے راوی مجہول اور کمزور ہیں۔ اس روایت کے متعلق اختلاف ہوگیا ہے۔ بعض اس کو عبادہ کے دادا کی طرف اور بعض عبادہ کے والد کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ جب عبادہ کے والد کے اسلام لانے ہی میں شبہ ہے تو ان کا دادا کا کیا ذکر ہوسکتا ہے حضرت عبادہ بن صامت انصاری تھے اور اولین مسلمانوں میں سے تھے عقبہ اولیٰ و ثانیہ کی بیعت میں موجود تھے اور تمام لڑائیوں میں شرکت کی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ملک شام کا قاضی اور معلم مقرر کیا تھا۔ وہ ایک مدت تک حمص میں رہے اس کے بعد فلسطین چلے گئے اور وہاں رملہ یا بیت المقدس میں ۳۴ھ میں بہتر ۷۲ برس کی عمر میں انتقال کیا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ کہ حضرت عبادہ کے والد یا دادا کے متعلق جو روایت پیش کی جاتی ہے وہ موضوع ہے۔

تیسرا واقعہ ایک نامعلوم شخص کا ہے جس کا بیان سنن النسائی میں ہے۔ محمود بن لبید کی روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شخص کے متعلق خبر دی گئی کہ اس نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں اور جب اس شخص سے پوچھا گیا تو کہا میں تو محض مذاق کر رہا تھا۔ [2] آپ انتہائی غصہ میں آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

((ایلعب بکتاب اللہ عزوجل وانا بین اظھرکم)) [3]

”کیا اللہ عزوجل کی کتاب کے ساتھ کھیلتا ہے حالانکہ میں ابھی تک تمہارے درمیان موجود ہوں۔“

ایک صحابی کھڑے ہو گئے اور کہا: یارسول اللہ کیا میں اس کو قتل نہ کردوں؟

لیکن دوسری روایتوں کو ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت

---

[1] مصنف عبدالرزاق: ٦/ ٣٩٣، ح: ١١٣٣٩۔ [2] کتاب المنتقیٰ فی شرح الموطا للقاضی ابی الولید المالکی الاندلسی: ٤/ ٣۔ [3] سنن نسائی، کتاب الطلاق، باب الثلاث مجموعة و مافیه من تغلیط، ح: ٣٤٠١۔

ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت کے ابتدائی دو یا تین سال تک تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمر کی خلافت کے ابتدائی دو سال تک یہ تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں تاکہ لوگ آپے سے باہر ہو کر کتاب و سنت کے برخلاف ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینے لگے اس پر حضرت عمر نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی امر قد کانت لهم فيه اناة فلو امضيناه عليهم فامضاه عليهم۔ [1]

بیشک لوگ ایسی بات میں جلدی کرنے لگے ہیں جس میں ان کو مہلت دی گئی تھی اگر ہم ان کو ان پر جاری کر دیں تو ٹھیک ہے پس انہوں نے ان کو ان پر جاری کر دیا۔

اس کے بعد صحابہ کرام و تابعین تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرنے لگے تھے۔ موطا میں ہے کہ کسی شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس سے فتویٰ پوچھا۔ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دیں میرے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ آپ نے جواب دیا تیری بیوی پر تین طلاقیں ہو چکیں باقی ستانوے طلاقوں سے تو نے آیات الٰہی کا مذاق اڑایا ہے۔

موطا ہی کی دوسری روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو آٹھ طلاقیں دی ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ لوگوں نے اسے کیا رائے دی ہے۔ جواب دیا لوگوں کی رائے یہی ہے کہ وہ مجھ سے جدا ہو چکی ہے۔ حضرت ابن مسعود نے کہا لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر تم خدا کے حکم کے مطابق طلاق دیتے تو خدا کی کتاب میں تمہارے لیے حکم موجود ہوتا۔ مگر تم نے جب اس مسئلہ کو خود ہی پیچیدہ بنالیا ہے تو اس کا خمیازہ بھی تم ہی کو اٹھانا ہوگا۔ ہم تمہاری طرف سے بوجھ کیوں اُٹھائیں؟ [2]

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عمر نے تین طلاقوں کو نافذ کر دیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اعلان کیا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی کی مطلقہ بیوی کو اس پر حلال کرنے کی نیت سے شادی

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الطلاق، باب طلاق الثلاث، ح: ١٤٧٢ (٣٦٧٣)۔

[2] مؤطا امام مالك، كتاب الطلاق، باب ماجاء فی البتة، ح: ٢٠٢٢۔

کرے گا تو اس کو زنا کی سزا دی جائے گی۔ ہمارے فقہاء نے حضرت عمر کے پہلے فیصلے کو تو اٹل قرار دے دیا مگر دوسرے فیصلہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ وتابعین کے زمانے میں تحلیل کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ رفتہ رفتہ تین طلاقوں کے بائن ہونے کا مسئلہ اجماعی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور چاروں مذاہب کے قاضیوں اور مفتیوں نے اس کو تسلیم کرلیا تھا۔ مگر تحلیل کے دروازے کو بند کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ فقہ کی کتابوں میں اس کو طلاق بدعی کے نام سے ایک بائن طلاق مان لیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے ناجائز اور غیر شرعی ہونے کی صفت اس سے معدوم ہوگئی۔ لوگ عام طور پر یہی سمجھنے لگے کہ اس قسم کی طلاق محض بدعی ہے اور یہ کوئی جرم کی بات بھی نہیں ہے۔ وہ غصے میں آکر تین طلاقیں دے بیٹھتے تھے اور پھر تحلیل کرانے پر مجبور ہوتے تھے امام ابن تیمیہ نے اپنے زمانے میں مسئلہ تحلیل کے خلاف آواز اٹھائی تھی وہ اس کو ہمیشہ کیلئے بند کرادینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ بے علم لوگوں کیلئے تین طلاقوں کو بائن قرار دے کر تحلیل کا دروازہ بند نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت عمر نے مصلحت کی بنا پر تین طلاقوں کو بائن قرار دیا تھا۔ اوران کے زمانہ میں مصلحت اس بات کی مقتضی تھی کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دے کر تحلیل کو بند کیا جائے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

فلما لم يكن على عهد عمر رضي الله عنه تحليل ظاهر ورای فی انفاذ الثلاث زجرا لهم عن المحرم فعل ذلك باجتهاده ـ اما اذا كان الفاعل لا يستحق العقوبة وانفاذ الثلاث يفضى الى وقوع التحليل المحرم بالنص و اجماع الصحابة والاعتقاد وغير ذلك من المفاسد لم يجزان يزال مفسدة حقيقية بمفاسد اغلظ منها بل جعل الثلاث واحدة فی مثل هذا الحال كما كان علىٰ عهد رسول اللّٰه ﷺ وابی بكر اولى۔ ولهذا كان طائفة من العلما مثل ابی البركات يفتون بلزوم الثلاث فی حال دون حال كما نقل عن الصحابة وهذا اما لكونهم راوه من باب التعزير الذی يجوز فعله

بحسب الحاجة كالزيادة على اربعين فى الخمر والنفى فيه وحلق الراس واما لاختلاف اجتهادهم فراوه تارة لازما و تارة غير لازم وبالجملة فما شرعه النبیﷺ لامته شرعا لازما انما لا يمكن تغييره فانه لايمكن نسخ بعد رسول اللّٰہﷺ ولا يجوزان يظن باحد من علما المسلمين ان يقصد هذا لاسيما الصحابه لاسيما الخلفاء الراشدون وانما يظن ذلك فى الصحابة اهل الجهل والضلال كالرافضة و الخوارج الذين يكفرون بعض الخلفاء او يفسقونه ولو قدران احدا فعل ذلك لم يقره المسلمون على ذلك فان هذا قرار على اعظم المنكرات والامة معصومة ان تجتمع على مثل ذلك۔ [1]

''چونکہ تحلیل حضرت عمر کے زمانے میں ظاہر نہیں تھی اور تین طلاقوں کو نافذ کر کے حرام چیز سے لوگوں کو روکنا مقصود تھا تو حضرت عمر نے اپنے اجتہاد کی بنا پر اس کا حکم دیا مگر جب ایسا کرنے والا سزا کا مستحق نہ ہو اور تین طلاقوں کے نافذ کرنے سے تحلیل اور دوسرے مفاسد کا مرتکب ہونا پڑتا ہو جس کو نص کے ذریعہ حرام کیا گیا ہے اور اس پر صحابہ کا اجماع اور ہمارا اعتقاد ہے تو ایک حقیقی برائی کو ایسی برائیوں کے ذریعے روکنا جو اس سے بھی زیادہ گھناؤنی ہیں جائز نہیں ہے۔ بلکہ ایسی حالت میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر کے فیصلہ کو جاری کر کے تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دینا بہتر ہے، اسی لیے ابوالبرکات [2] جیسے علما کی ایک جماعت کبھی تو تین طلاقوں کو تین اور کبھی ایک ہونے کا فتویٰ دیتی تھی جیسا کہ صحابہ سے منقول ہے۔ یہ اختلاف اس وجہ سے تھا کہ وہ یا تو اس کو سزا تصور کرتے تھے جس کا جاری کرنا ضرورت کے وقت جائز تھا جیسا کہ شراب کی سزا

---

[1] فتاوی ابن تیمیه: ۳/ ۲۳۔

[2] ان سے مراد امام موصوف کے دادا شیخ مجدالدین ابولبرکات عبدالسلام ابن تیمیہ ہیں۔

چالیس کوڑوں سے بڑھ کر جلاوطنی اور سرمونڈھنے کی صورت میں دی جاتی تھی۔ یا ان کے اجتہاد کا اختلاف تھا کبھی تو وہ اس کو لازمی سمجھتے تھے۔ اور کبھی لازمی نہیں سمجھتے تھے۔ الغرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کیلئے جو لازمی شریعت قرار دی اس کا بدلنا ناممکن نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نسخ نہیں ہوسکتا کسی عالم کے متعلق اور خاص کر صحابہ اور خلفاء راشدین کے متعلق یہ گمان کرنا جائز نہیں ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نسخ کو جائز سمجھتے تھے۔ صحابہ کے متعلق اس قسم کا گمان جہالت اور ضلالت والے ہی کر سکتے ہیں جیسا کہ رافضیوں اور خارجیوں کا حال ہے جو بعض صحابہ کو کافر یا فاسق سمجھتے ہیں اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ کسی نے ایسا کیا ہے تو مسلمان ہرگز اس کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اس قسم کا اقرار بدترین برائیوں کا اقرار ہے اور امت مسلمہ معصوم ہے وہ اس قسم کی گمراہی پر متفق نہیں ہوسکتی۔"

امام ابن تیمیہ کا دعوی یہ ہے کہ یہ مسئلہ صحابہ کے درمیان اجماعی نہیں تھا اور یہ کہ صحابہ کرام اس کو اسی طرح لازمی نہیں سمجھتے تھے جس طرح تین الگ الگ طلاقوں کے بعد عورت کو لازمی طور پر بائن سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وتبين انه لا اجماع فى المسئلة بل الآثار الثابتة عمن الزم بالثلاث مجموعة عن الصحابة تدل على انهم لم يكونوا يجعلون ذلك مما شرعه النبى صلى الله عليه وسلم لامته شرعا لازما كما شرع تحريم المرأة بعد الطلقة الثالثة بل كانوا مجتهدين فى العقوبة بالزام ذلك اذا كثرو لم ينته الناس عنه وقد ذكرت الالفاظ المنقولة عن الصحابة تدل على انهم الزموا بالثلاث لمن عصى اللّٰه بايقاعها جملة فاما من كان يتق اللّٰه فان اللّٰه يقول ومن يتق اللّٰه يجعل له مخرجا ويرزقه من حيث لا يحتسب۔ فمن لم يعلم التحريم حتى اوقعها ثم

لما علم التحريم تاب والتزم ان لا يعود الى المحرم فهذا لا يستحق ان يعاقب وليس فى الادلة الشرعية الكتاب والسنة و الاجماع والقياس ما يوجب لزوم الثلاثة له و نكاحه ثابت بيقين وامراته محرمة على الغير بيقين وفى الزامه بالثلاث اباحتها للغير مع تحريمها عليه وذريعة الى نكاح التحليل الذى حرمه الله ورسوله ونكاح التحليل لم يكن ظاهرا على عهد النبى ﷺ وخلفائه ولم ينقل قط ان امراة اعيدت بعد الطلقة الثالثة على عهدهم الى زوجها بنكاح تحليل۔[1]

''اور یہ ظاہر ہو گیا کہ اس مسئلہ میں اجماع نہیں ہے۔ بلکہ ان صحابہ کے آثار بھی جو تین طلاقوں کو تین لازم قرار دیتے ہیں اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اس کو نبی کریم ﷺ کی طرف سے اپنی امت کیلئے ایک لازمی شریعت نہیں سمجھتے تھے جس طرح کہ تیسری طلاق کے بعد عورت کو ہمیشہ کیلئے حرام سمجھتے تھے بلکہ وہ جب طلاقیں زیادہ ہو جائیں تو تین طلاقوں کو لازم قرار دے کر سزا دینے کے بارے میں مجتہد تھے، اس کے باوجود لوگ اس سے رک نہ سکے اور میں نے پہلے ہی صحابہ سے منقول الفاظ کو ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین طلاقوں کو اس شخص کیلئے لازمی قرار دیتے تھے جو تینوں کو بیک وقت واقع کر کے اللہ کی نافرمانی کرتا تھا لیکن جو اللہ سے ڈرے پس اس کے متعلق اللہ یہ کہتا ہے کہ یہ جو بھی اللہ سے ڈرے گا اس کیلئے راستہ پیدا کرے گا اور اس کو ایسی جگہ سے روزی پہنچائے گا جس کا اس کو گمان نہیں ہوتا، پس جو بھی تحریم کو نہیں جانتا یہاں تک کہ اس کا مرتکب ہوا پھر جب تحریم کا پتہ چلا تو تائب ہوا اور یہ عہد کیا کہ پھر حرام کی طرف نہیں لوٹے گا تو ایسا شخص سزا کا مستحق نہیں ہوتا۔ شرعی دلائل یعنی

---

[1] فتاوى ابن تيمية: ٣/ ٢٢۔

کتاب وسنت واجماع وقیاس میں کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو اس کیلئے تین طلاقوں کولازم کرے حالانکہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا نکاح ثابت ہے اور غیر مرد پر اس کی عورت حرام ہے اور تین طلاقوں کو لازمی قرار دینے میں اس کی عورت کو دوسرے پر جائز اور اس پر حرام قرار دیتا ہے اور تحلیل کے نکاح کیلئے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے ذریعہ پیدا کرنا ہے۔ تحلیل کا نکاح نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں ظاہر نہیں تھا اور یہ کہیں نقل نہیں ہوا ہے کہ کوئی عورت تیسری طلاق کے بعد تحلیل کے نکاح سے پہلے شوہر کی طرف لوٹائی گئی ہو۔''

امام موصوف کہتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ تین طلاقوں کے ایک طلاق ہونے کا حکم صرف آنحضرت اور ابوبکر کے زمانے کے لیے مخصوص تھا۔ تو یہ باطل ہے اس کی تخصیص کیلئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ تین طلاقوں کے ایک طلاق ہونے کا حکم منسوخ ہوگیا ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد تھا تو بعض صحابہ مثلاً زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن بن عوف وغیرہ نے اس بارے میں ان سے اختلاف کیا اور جب کسی حکم کے بارے میں اختلاف ہو تو قرآن مجید کے حکم کے مطابق اللہ اور رسول کے فیصلے کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ کتاب وسنت کے مطابق اس قسم کی تین طلاقیں ایک ہی طلاق ہوتی ہیں اگر کوئی امام سزا کے طور پر کوئی حکم جاری کرے تو وہ مشروع نہیں ہو جاتا، حالات کے مطابق ایک دوسرا امام اس کو بدل سکتا ہے۔ اور پھر سزا ان لوگوں کیلئے ہے جو اس کے مستحق ہوں مگر وہ لوگ جن کو اس کے جرم ہونے کا علم نہ ہو اور وہ اس کے مرتکب ہوں تو ان کے لیے یہ سزا نہیں دی جاسکتی۔ جب اس کو معلوم کرایا جاتا ہے کہ یہ حرام ہے تو وہ اسی وقت توبہ کرلیتا ہے اور آیندہ سے طلاق کے معاملے میں پوری احتیاط کرتا ہے ایسے شخص کیلئے تین طلاقیں تین نہیں ہوسکتیں بلکہ وہ ایک ہی ہوگی۔ [1]

اس مسئلہ کے متعلق امام موصوف نے دو ضخیم جلدیں لکھی تھیں۔ [2] اور تین طلاقوں کے

---

[1] ایضًا: ۲۵۔ [2] ایضًا۔

ایک طلاق ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ انہوں نے کتاب وسنت سے ہٹ کر تو کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا صرف حضرت عمر کے دوسرے فیصلے کو چھوڑ کر آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے ابتدائی فیصلے کو اختیار کیا تھا اور یہ اتنا بڑا جرم نہیں تھا کہ ان کے خلاف اتنا بڑا ہنگامہ کیا جائے اور طلاق کے مختلف مسائل کی بنا پر انہیں قید کی سزا دی جائے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

حلف بالطلاق

اگر کوئی شخص کسی کام کے کرنے نہ کرنے کی قسم کھالے اور پھر اس کام کا مرتکب ہو تو کتاب وسنت کے حکم کے مطابق اس کو کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ اسی اصول کے مطابق اگر کوئی شخص کسی فعل کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق اپنی بیوی کو طلاق دینے کی قسم کھالے اور پھر اس کا مرتکب ہو تو اس کے متعلق عام علما کا یہ خیال ہے کہ اس فعل کے ارتکاب سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ وہ کفارہ ادا کر کے طلاق سے بچ نہیں سکتا۔ مگر امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیم کا خیال تھا کہ قسم کا کفارہ ادا کر کے طلاق سے بچ سکتا ہے۔ ابن قیم کا بیان ہے کہ امام موصوف نے اس مسئلہ میں مطول ومتوسط ومختصر رسائل لکھے ہیں جن کے کل اوراق کی تعداد تقریباً دو ہزار ہو جاتی ہے۔ ان میں کتاب وسنت، اقوال صحابہ، قیاس اور قواعد امام احمد بن حنبل وقواعد ائمہ دیگر سے تقریباً چالیس دلیلیں قائم کی ہیں وہ اپنی وفات تک اس فتوے پر قائم اور مصر رہے۔ اس مسئلہ کی صحت پر ان کو اتنا یقین تھا کہ وہ دوسروں سے مباہلہ کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے تھے۔ کبھی ایسا ہوا کہ انہوں نے ایک گھنٹے کے اندر چالیس فتوے لکھے ہیں۔ ان کے ان فتووں کی وجہ سے تحلیل کے بازار ٹھنڈے پڑ گئے۔ محللین اور محللین لہم کے سروں سے لعنت کا بادل چھٹ گیا۔ کتاب وسنت اور آثار سلف سے استدلال کا بازار گرم ہو گیا۔ صحابہ وتابعین اور ائمہ اسلام کے مذاہب فروغ پانے لگے۔ جن لوگوں کو کچھ بھی بصیرت ملی وہ تقلید کے دائرے سے باہر نکل پڑے۔ دشمنوں کے حلقوں میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ اور وہ استہزا واستخفاف اور پھر لعن طعن اور طنز وتشنیع پر اتر آئے۔ ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں پر طلاق کا دروازہ بند کر دیا گیا اور اولادِ زنا کی کثرت ہو گئی۔ اور پھر جب ان طعنوں سے کام نہ چلا تو انہوں نے سلطان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور یہ الزام لگایا کہ ابن تیمیہ سلطان کے

ہاتھ پر طلاق کی قسم کھا کر بیعت کرنے والوں کو کفارہ ادا کر کے طلاق سے بچنے کی اجازت دے کر درحقیقت ان کو بیعت کے توڑنے پر آمادہ کر رہے ہیں۔ [1]

یہ جاننا چاہیے کہ اس زمانے میں حلف بالطلاق کے مسئلہ کو سیاسی اہمیت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے سب سے پہلے ایک ایسا بیعت نامہ تیار کیا تھا جس کے مطابق ہر ایک کو خلیفہ وقت کی وفاداری کی قسم کھانے کے ساتھ ساتھ اس بات کی قسم بھی کھانی ہوتی تھی کہ اگر وہ بیعت توڑے گا تو اس کی بیویوں پر طلاق ہے اور اس کے تمام غلام اور اس کی لونڈیاں آزاد ہیں۔ اس کے بعد سے یہ دستور ہو گیا تھا کہ لوگوں سے وفاداری کی قسم کے ساتھ ساتھ بیویوں کے طلاق کی بھی قسم لی جاتی تھی، مگر ائمہ اسلام میں سے کسی نے بھی اس قسم کی قسم کو ہرگز تسلیم نہیں کیا۔ حلف بالطلاق کے مسئلہ کو نہ ماننے ہی کی وجہ سے امام مالک اور امام شافعی کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچائی گئیں تاہم ان لوگوں نے حق بات کے کہنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ [2]

فقہائے وقت کی شورش

جب امام ابن تیمیہ نے حلف بالطلاق کے مسئلہ میں عدم لزوم طلاق کا فتویٰ دینا شروع کیا تو فقہائے وقت بگڑ گئے اور دشمنوں نے سلطان اور دیگر حکام وقت کو ان سے بدظن کرانا شروع کر دیا۔ ان کے ان فتووں سے محللین پر بڑی زد پڑ رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے قاضیوں اور مفتیوں کے پاس پہنچ کر ان کو امام موصوف کے خلاف اکسانا شروع کیا۔ جب بہت زیادہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں تو قاضی القضاۃ شیخ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن مسلم الحنبلی (المتوفی: ۷۲۶ھ) نے ۱۵ ربیع الثانی ۷۱۸ھ کو جمعرات کے دن امام موصوف کو بلا کر نصیحت کی اور مشورہ دیا کہ اس مسئلہ میں وہ اپنا نقطہ خیال پیش نہ کریں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی اور دوسرے مفتیوں کی دلجوئی کی خاطر انہوں نے ان کے مشورے کو قبول کر لیا۔ مگر بعد کے واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے نظریہ پر بڑی مضبوطی کے ساتھ جمے رہے۔ یکم جمادی الاولیٰ ۷۱۸ھ کو ہفتے کے دن مصر سے سلطان کا فرمان آیا کہ آئندہ سے امام ابن

---

[1] أعلام الموقعين: ٤/ ٩٩۔ [2] اعلام الموقعين: ٤/ ١٠٠۔

تیمیہ کوئی فتوی نہ دیں۔ دو دن بعد ۳ جمادی الاولیٰ کو پیر کے دن دارالسعادہ میں ایک مجلس منعقد ہوئی۔ شہر کے قاضی، مفتی، فقیہ اور عالم جمع ہوئے اور انہوں نے امام موصوف سے بحث کی سب نے مل کر یہ فیصلہ دیا کہ آیندہ سے امام موصوف کوئی فتوی نہ دیں۔ دوسرے دن شہر بھر میں اس فیصلے کی تشہیر کرائی گئی تاکہ کوئی ان کے پاس سوال نہ بھیجے۔ اس کے باوجود ان کے پاس سوالات آتے تھے اور وہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر اس تفصیل سے بحث کرتے تھے کہ ان کی رائے خود بخود واضح ہو جاتی تھی۔ اور جب حکومت کی طرف سے گرفت ہوئی تو صاف کہہ دیا کہ وہ علم کو چھپا نہیں سکتے۔

چند مہینوں کے بعد پھر شورش ہونے لگی ۲۹ رمضان ۷۱۹ھ کو منگل کے دن دارالسعادہ میں دوسری مجلس ہوئی اور نائب السلطنت شام کی موجودگی میں امام موصوف سے بحث ہوئی۔ سلطان کا فرمان پڑھ کر سنایا گیا اور اس فرمان کے نہ ماننے پر امام موصوف کو سخت ملامت کی گئی اور تاکید کی گئی کہ آیندہ وہ کوئی فتوی نہ دیں۔

قید کی سزا اور رہائی

قضاۃ و فقہا کی سرزنش اور سلطان کے فرمان کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جب وہ اپنے عقیدے کے مطابق فتووں کے جوابات دینے لگے تو ۲۲ رجب ۷۲۰ھ کو جمعرات کے دن دارالسعادہ میں تیسری مجلس ہوئی۔ نائب السلطنت شام اور قاضیوں نے دو مرتبہ سلطان کے فرمان کی خلاف ورزی کرنے پر امام موصوف کی ملامت کی اور جب انہوں نے ان کی باتوں اور مشوروں کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار کر دیا تو انہیں قید کا حکم سنایا گیا۔ چنانچہ وہ دمشق کے قلعے میں قید کر دیے گئے جہاں پانچ مہینے اٹھارہ دن قید میں رہے۔ آخر مصر سے سلطان کا فرمان آیا کہ انہیں رہا کر دیا جائے اور ۱۰ محرم ۷۲۱ھ کو پیر کے دن ان کو قید سے نکالا گیا۔ وہ بدستور دارالحدیث السکریہ اور دارالحدیث الحنبلیہ میں درس دینے لگے۔

اختیارات علمیہ

امام ابن تیمیہ نے بیسوں فقہی مسائل میں عام علما کے مسلک سے اختلاف کیا ہے ان سب کو یہاں حصر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ قاضی القضاۃ شیخ علاء الدین ابوالحسن علی بن محمد

بن عباس البعلی الحنبلی الدمشقی (المتوفی: ۸۰۳ ھ) نے کتاب الاختیارات العلمیہ فی اختیارات شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو امام موصوف کے فتاوی کی چوتھی جلد کے ساتھ چھپ گئی ہے۔اس کے مطالعہ سے ان تمام مسائل کا استقصا کیا جاسکتا ہے جن میں امام موصوف نے عام مسلک سے اختلاف کیا ہے۔ذیل میں اس قسم کے صرف چند مسائل کی ایک فہرست دی جاتی ہے ان کا خیال تھا کہ (۱) سجدۂ تلاوت کیلئے وضوضروری نہیں ہے (۲) جمعہ اور عیدین کی نماز کے فوت ہو جانے کا خوف ہو تو صرف تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے (۳) اگر کوئی شخص عمداً نماز چھوڑے تو اس کے لیے قضا نہیں ہے۔(۴) ہر بڑے چھوٹے سفر میں قصر کرنا ضروری ہے جیسا کہ ظاہریہ کا مذہب ہے۔(۵) رمضان کے مہینے میں دن کو رات سمجھ کر کھالیا جائے تو روزے کی قضا ضروری نہیں ہے۔(۶) زیور کے بدلے زیادہ سونا یا چاندی دے کر خریدنا جائز ہے (۷) حج اور عمرہ دونوں ملا کر ادا کرنے والے کیلئے صفا اور مروہ کے درمیان ایک ہی سعی کرنا کافی ہے۔(۸) اگر حائضہ عورت کو پاک ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ممکن نہ ہو تو وہ حیض ہی کی حالت میں طواف کرسکتی ہے۔(۹) ایک مسلمان ایک ذمی کافر کا وارث ہوسکتا ہے (۱۰) باکرہ لونڈی کیلئے استبراء رحم ضروری نہیں ہے چاہے وہ عمر والی ہی کیوں نہ ہو۔

ردِ شیعیت

آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد آپ کی جانشینی کے متعلق صحابہ کرام کے درمیان جتنے بھی اختلافات ہوئے وہ طبعی اور قدرتی تھے، آنحضرت ﷺ نے واضح طور پر یہ کچھ نہیں فرمایا تھا کہ آپ کے بعد کون آپ کا جانشین ہوگا۔ یہ مسئلہ امت کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ البتہ آپ نے اپنی جگہ پر نماز کے لیے حضرت ابوبکر کو مقرر فرمایا تھا۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ آپ کی مرضی حضرت ابوبکر کو اپنا جانشین بنانے کی تھی۔ واضح نص نہ ہونے کی صورت میں ہر ایک کو بجا طور پر یہ خیال ہوسکتا تھا کہ وہی جانشین ہونے کا زیادہ مستحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے انصار کو خیال ہوا کہ جانشینی کے وہی زیادہ مستحق ہیں کیونکہ انہوں نے مدنی زندگی میں ہر مرحلہ پر آنحضرت کی امداد و اعانت کی تھی۔ مگر جب حضرت ابوبکر نے مہاجرین کی خدمات پیش کر کے ان کی فضیلت جتائی اور حضرت عمر نے آگے بڑھ کر حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو سب نے اس کو قبول کر لیا۔ کسی کو انکار یا مخالفت کی جرأت نہیں ہوسکی۔ حضرت ابوبکر نے اپنی وفات کے وقت حضرت عمر کو نامزد کیا۔ جنہوں نے ایک مثالی حکومت قائم کر کے اپنی فطری قابلیت اور لیاقت کا بہترین ثبوت بہم پہنچایا۔ حضرت عمر نے اپنی وفات کے وقت خلیفے کے انتخاب کا حق ایک مجلس شوری کے حوالے کیا جو چھ جلیل القدر صحابیوں پر مشتمل تھی۔ حضرت عمر اپنی طرف سے ان میں سے کسی ایک کو خلافت کے لیے مقرر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خلافت کے یہ چھ حقدار صحابی آپس ہی میں کسی فیصلے کو پہنچ جائیں گے۔ ان چھ صحابیوں میں سے ایک حضرت عثمان تھے۔ جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ وہ اپنی ان خدمات کی بنا پر خواص اور عوام میں سب سے زیادہ معروف اور مشہور تھے اور اس لیے انہی کو خلافت کا زیادہ اہل سمجھتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے رائے عامہ کا خیال کر کے حضرت علی پر حضرت عثمان کو ترجیح

دی۔ حضرت عثمان کی خلافت کے اخیر زمانے میں بعض مفسد لوگوں نے ان کے خلاف غلط پروپیگنڈا شروع کیا۔ جس کا بعض عوام پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ ان کے ساتھ بعض ایسے خاص لوگ بھی ہو گئے تھے جنہیں حضرت عثمان یا خاندان بنی امیہ کے بعض سرگردہ افراد سے ذاتی عناد ہو گیا تھا۔ ایسا ہونا محض فطری اور طبعی تھا۔ جب حضرت عثمان شہید ہو گئے تو مدینہ منورہ اور باہر کے اکثر لوگوں نے حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت زبیر اور حضرت طلحہ ان سے متفق نہیں ہو سکے۔ ان دونوں نے حضرت عائشہ کو ساتھ لے کر ان کے خلاف جنگ کی جس میں ان دونوں کو ناکامی ہوئی۔ حضرت علی، حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن العاص اور ان کے ساتھیوں کو ہموار نہیں کر سکے۔ ان دونوں نے حضرت علی کے خلاف محاذ قائم کیا۔ اس کی وجہ سے صفین کی جنگ پیش آئی۔ اگر حضرت علی کے پیروان کے ہر ایک حکم پر پوری طرح عمل کرتے تو یقیناً حضرت معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو شکست ہو جاتی اور میدان سیاست کا نقشہ ہی بالکل بدل جاتا۔ مگر ان نافرمان پیروؤں کی وجہ سے حضرت علی کو اس جنگ میں اور اس کے بعد دومۃ الجندل کی تحکیم میں ناکامی ہوئی۔ اس پر خوارج نے سر اٹھایا جن کو حضرت علی نے بری طرح سرکوبی کی۔ خوارج نے بیک وقت حضرت علی، حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا خاتمہ کرنا چاہا۔ مگر حضرت علی شہید ہو گئے اور باقی دونوں بچ نکلے۔ قدرت نے ان دونوں کو بچا لیا۔ حضرت حسن نے خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مگر اپنے پیروؤں کی نافرمان طبیعتوں کو دیکھ کر خلافت کو حضرت معاویہ کے حوالے کر دیا۔ حضرت معاویہ نے اپنی دلی خواہش کی بنا پر اپنے بیٹے یزید کو نامزد کیا جس کو حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر وغیرہ نے نہیں مانا۔ حضرت حسین نے یزید کے خلاف محاذ قائم کیا مگر کوفہ والوں کی بے وفائی کی وجہ سے کربلا کے میدان میں شہید کر دیے گئے۔ حضرت حسین کے بعد حضرت علی کی اولاد میں محمد بن الحنفیہ کے سوا کوئی ایسا نہیں تھا جو خلافت کو سنبھالے۔ مگر انہوں نے خود اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے خلیفہ بنی امیہ کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا۔ کئی سال کی کشمکش کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر کو شکست ہوئی اور اس طرح عبدالملک بن مروان کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔

حضرت حسین کے لڑکے حضرت زین العابدین علی (المتوفی: ۹۵ھ) نے خلافت کی خواہش نہیں کی۔ البتہ ان کے لڑکے زید نے ان کی وفات کے بعد اپنا جھنڈا بلند کیا۔ اور ہشام کے زمانہ خلافت میں انہیں سخت ناکامی ہوئی۔ چنانچہ وہ ۱۲۱ھ میں مارے گئے۔ ان کی ناکامی خود ان کے پیروؤں کے چھوڑ کر چلے جانے کی وجہ سے تھی۔ جس پر زید نے خفا ہو کر کہا رفضتمونی رفضکم اللّٰہ۔ تم نے مجھے چھوڑ دیا خدا بھی تمہیں چھوڑ دے اسی زمانہ سے ان کا نام رافضہ ہو گیا۔

حضرت زین العابدین کے لڑکے حضرت محمد الباقر (المتوفی: ۱۱۴ھ)، پوتے حضرت جعفر الصادق (المتوفی: ۱۴۸ھ) اور پرپوتے حضرت موسیٰ الکاظم (المتوفی: ۱۸۳ھ) نے پر امن زندگی گزاری البتہ حضرت حسن بن علی بن ابی طالب کی اولاد میں سے عبداللہ بن الحسن بن حسن بن علی بن ابی طالب اور ان کے لڑکے محمد النفس الزکیہ نے عباسی خلیفہ منصور کے زمانہ میں بغاوت کی مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ پھر آگے چل کر مہدی کے زمانہ میں حسین بن علی بن حسن بن علی بن ابی طالب نے خروج کیا۔ وہ بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔

حضرت جعفر الصادق کے ایک لڑکے اسمٰعیل بھی تھے جن کا باپ کی زندگی میں انتقال ہو گیا تھا انہی کے متبعین اسماعیلی شیعہ کہلاتے ہیں۔

حضرت موسی الکاظم کے لڑکے حضرت علی الرضا تھے جنہیں خود خلافت کی کوئی خواہش نہیں تھی مگر مامون باللہ نے انہیں اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ عباسی خاندان کے لوگ اس سے خفا ہو گئے اور اس کو سلطنت ہی سے علیحدہ کر دینا چاہتے تھے۔ ۲۰۳ھ میں حضرت علی الرضا کو زہر دے کر ختم کیا گیا۔

حضرت علی الرضا کے لڑکے محمد الجواد (المتوفی: ۲۱۹ھ) نے مامون باللہ کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ ان کے لڑکے علی الہادی (المتوفی: ۲۵۲ھ) اور پوتے حسن العسکری (المتوفی: ۲۶۰ھ) بغداد ہی میں رہتے تھے انہوں نے خود اپنے لیے خلافت طلب نہیں کی۔ کہا جاتا ہے کہ محمد انہی حسن العسکری کے صاحبزادے تھے جن کو شیعہ اثنا عشریہ صاحب الزمان اور مہدی تصور کرتے ہیں۔ پانچ سال کی عمر تھی کہ سامرا کے غار میں داخل ہوئے اور غائب ہو گئے۔

ان کے متعلق شیعوں کا یہ تصور ہے کہ وہ پھر سے لوٹ آئیں گے اور دنیا میں عدل وانصاف قائم کریں گے۔

خلافت اور امامت

ایک غیر جانبدار مؤرخ یہی فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ جو کچھ حالات پیش آئے بالکل طبعی اور قدرتی تھے۔ خلافت کے دعویداروں کے درمیان سیاسی اختلافات کا پیدا ہونا اور اس کی وجہ سے ایک دوسرے پر ظلم وستم ہونا ایک طبعی اور قدرتی امر تھا۔ مگر عقیدت ہمیشہ اس قسم کے طبعی واقعات کو بھی مذہبی رنگ دے کر پیش کرتی ہے۔ شیعوں نے خلافت کے نظریہ کے مقابلہ میں امامت کا نظریہ قائم کیا۔ اور اس کے لیے دلیلیں قائم کرنی شروع کیں۔ ان اماموں کی حمایت میں وقتاً فوقتاً وہ لوگ کھڑے ہوتے تھے جنہیں طاقت وقوت اور اقتدار کی ہوس ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے ان اماموں کی تائید کی آڑ میں مخالفین کو نیچا دکھانا چاہا اور اپنی مقصد برآری کے لیے جھوٹی روایتیں گھڑیں اور ان کو لوگوں میں مشہور کرنا شروع کیا۔ مختلف فرقے وجود میں آتے گئے۔ کیسانیہ کا فرقہ محمد بن الحنیفہ کا پیرو تھا۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو بہت سے لوگوں کو یہ خیال ہوگیا کہ وہ مرے نہیں ہیں ایک دن واپس آئیں گے۔ اسی طرح زید بن علی کے نافرمان پیرو رافضہ اور ان کے حقیقی پیرو زیدیہ کہلائے۔ جب حضرت جعفر الصادق کا انتقال ہوگیا تو عبداللہ بن میمون القداح نے محمد بن اسماعیل بن جعفر کا نام لے کر جن کا اپنے دادا ہی کی زندگی میں انتقال ہوگیا تھا شیعیت کا پروپیگنڈا شروع کیا۔ ان کا ایک غلام مبارک بھی تھا جس کو ساتھ لے کر عبداللہ بن میمون القداح نے اپنے خیالات کو پھیلانا شروع کیا اور آگے چل کر مصر میں فاطمیوں کی علوی حکومت قائم کی جو ۲۷۹ھ سے لے کر ۵۶۷ھ تک قائم رہی۔ گیارہویں امام حسن بن علی العسکری کے داعیوں میں سے ایک محمد بن نصیر النمیری تھا جس کے پیرو نصیریہ کہلائے۔ یہ لوگ عجیب وغریب تعلیمات کے بانی اور موحد تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ علی رب تھے، محمد حجاب تھے۔ سلیمان فارسی باب تھے۔ آسمان وزمین اور ساری کائنات کو علی نے بنایا وہی آسمانوں میں زمین میں لوگوں کے امام ہیں۔ پانچ نمازوں سے مراد پانچ ناموں یعنی علی، حسن، حسین، محسن اور فاطمہ کا ذکر کرنا ہے اور ان کا ذکر وضو اور غسل سے بھی بے

نیاز کر دیتا ہے۔ تیس روزوں سے مراد تیس مرد اور تیس عورتیں ہیں۔ لیکن شیعوں کا ایک بہت بڑا گروہ مذکورہ بالا بارہ اماموں کی امامت کا قائل ہوا۔ ان کو امامیہ یا اثنا عشریہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح سنیوں کے نظریہ خلافت کے مقابلے میں امامت کا نظریہ قائم کیا گیا اور اس کے متعلق مستقل تصنیفات لکھی جانے لگیں۔

شیعوں کی تصنیفات

شیعوں کے مختلف گروہوں میں سے خاص کر اسماعیلی، نصیری اور باطنی شیعوں نے اپنے مذہبی عقائد و خیالات کے متعلق کتابیں لکھیں مگر ان کو سنی علما کے ڈر سے عوام اور خواص کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا تھا۔ ہر جگہ ان کے داعی پھیلے ہوئے تھے، جو لوگوں کے درمیان خفیہ طور پر اپنے عقائد و خیالات پھیلا رہے تھے۔ ابوالمنذر ہشام بن محمد بن السائب الکلبی (المتوفی: ۲۰۴ھ) نے صحابہ کے مثالب کے متعلق ایک مستقل کتاب لکھی تھی۔ ابوجعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی (المتوفی: ۳۸۱ھ) محمد بن محمد بن النعمان بن عبدالسلام البغدادی المعروف بابن النعمان المفید (المتوفی: ۴۱۳ھ)، ابوالقاسم علی ابن الحسین بن موسیٰ المعروف بالمرتضی (المتوفی: ۴۳۶ھ)، محمد بن علی بن عثمان الکراجکی (المتوفی: ۴۴۹ھ) شیخ الطائفہ محمد بن الحسن بن علی الطوسی (المتوفی: ۴۵۸ھ) وغیرہ ان شیعی مصنفین میں سے چند تھے جن کی تصنیفات شیعی حلقوں میں بڑی قدر اور عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ فاطمی سلطنت کی وجہ سے مصر اسماعیلی تعلیمات کا ایک بڑا مرکز ہو گیا تھا۔ اس کے اثرات ملک شام وغیرہ بھی ہو رہے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے فاطمی سلطنت کا خاتمہ کیا اور مصر میں پھر سے سنی تعلیمات کو جاری کیا۔

شیعہ سنی کشمکش

جب تک عباسی حکومت طاقتور رہی شیعہ سنی کشمکش نمایاں اختلاف کی صورت میں ظاہر نہیں ہو سکی معتصم کے بعد عباسی خلفاء کمزور ہو گئے تھے۔ شیعہ اور سنی بار بار آپس میں جھگڑنے لگے تھے جس کی وجہ سے بسا اوقات بڑی خونریزی ہوتی تھی۔ تاریخ کے صفحات اس قسم کے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں۔ دونوں فرقوں کے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہو

سکی۔ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ اور تمام لوگ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ بغداد کی عباسی خلافت کی تباہی میں شیعوں کا ہاتھ رہا ہے۔ خود جمال الدین ابن المطہر الحلی (المتوفی: ۷۲۶ھ) نے لکھا ہے کہ ہلاکو کے بغداد پر حملہ کرنے سے پہلے ان کے والد اور دوسرے لوگوں نے اس کو اس کی فتح و کامیابی کی خوشخبری دی تھی اور یہ درخواست کی تھی کہ حلہ و کوفہ و کربلائے نجف اور دوسرے مقدس مقامات کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وسبب آں بود که پدر من که مصنف این کتابهم جمال الدین ابن المطهر اعنی شیخ المبرد رسدید الملة والدین وسید کمال الملة والدین بن طاؤس نقیب النقباء والشیخ الفقیه الفاضل ابن ابی العز قدس اللّٰه ارواحهم به هلاکو پیغام نوشتند پیش از گرفتن بغداد و امان خواستند پس چون بغداد رابگرفت ایشان رابطلبید بترسیدند وجز پدرم سدید الدین رحمه اللّٰه نزد هلاکو نرفت پس هلاکو از پدرم پرسید که چون بود مراسلت شمابه من پیش ازیں واقعه و بغداد گرفتن و چگونه برچنیں خبر اعتماد نمودید که مرا بغداد خواهد مسخر شد انگاه پدرم رحمه اللّٰه گفت بدرستی که سلطان اولیاء امیر المومنین علی علیه السلام دربارهٔ شما این خبر فرموده اند که خواهد آمد ترك برآخر ملوك عباسی که پادشاه آں ترك ازیشاں بودو آں از مبدء ملك ترك خواهد بود شخصی بلندی آوازی نگذرد برقلعه الاکه بکشاید و برداشته نشود علم خصمی برابر والا که خصم شکسته شود وائے برآنکه دشمنی کند با اوپس بماند براں حال تا ممالك بسیار مسخر کند و خبرها دراین باب

بیمے شمارند۔ [1]

(ان مقدس مقامات کی حفاظت کا) سبب یہ تھا کہ میرے والد یعنی اس کتاب کے مصنف جمال الدین ابن المطہر کے والد الشیخ المبرر سدید الملۃ والدین و نقیب النقبا سید کمال الملۃ والدین ابن طاؤس اور الشیخ الفقیہ الفاضل ابن ابی العز قدس اللہ ارواحہم نے ہلاکو کو بغداد کے لینے سے پہلے ایک پیغام لکھ بھیجا اور اس سے امان چاہی، پس جب اس نے بغداد پر قبضہ کیا تو ان لوگوں کو بلا بھیجا یہ سب ڈر گئے۔ میرے والد سدید الدین رحمہ اللہ کے سوا کوئی بھی ہلاکو کے پاس نہیں گیا۔ ہلاکو نے میرے باپ سے پوچھا کہ اس واقعہ سے پہلے اور بغداد کے لینے سے قبل تم لوگوں نے کیونکر میرے ساتھ خط و کتابت کی اور تمہیں اس خبر پر کیسے اعتماد ہو گیا کہ بغداد میرا تابع ہو جائے گا۔ اس وقت میرے والد مرحوم نے کہا: بے شک سلطان اولیاء امیر المومنین علیہ السلام نے تمہارے بارے میں یہ خبر دی ہے کہ شاہان عباسیہ کے آخری بادشاہ کے وقت ترک آئیں گے جن سے ان ترکوں کا بادشاہ ہو گا اور وہ سلطنت کی ابتداء سے ترک ہو گا۔ کوئی بلند آواز شخص کسی قلعہ پر نہیں گزرے گا کہ اس قلعے کے دروازے کھل جائیں گے اور کسی دشمن کا جھنڈا اس کے برابر بلند نہیں ہو گا، کہ وہ دشمن خود شکست کھا جائے گا۔ پس ہلاکی ہے اس شخص کے لیے جو اس سے دشمنی کرے گا۔ پس اس کی ایسی ہی حالت رہے گی یہاں تک کہ وہ بہت سے ملکوں پر قبضہ کرے گا۔ اس باب میں امیر المومنین سے بے شمار خبریں موجود ہیں۔

یہ اقتباس خود آپ اپنی شہادت دیتا ہے۔ اس پر مزید تبصرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اسی کے بعد سے تاتاریوں کی ہمتیں اور بڑھ گئیں اور انہوں نے تمام عرب ممالک کو مسخر کرنے کا فیصلہ کر لیا مگر وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ بغداد کی عباسی خلافت کے تباہ ہونے کے بعد مصر میں اس خلافت کی ایک شاخ قائم ہو چکی تھی اور وہاں

---

[1] رسالہ ابن مطہر قلمی۔

کے سلاطین نے ہر جگہ تاتاریوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ امام ابن تیمیہ کے زمانے میں تاتاریوں سے جو لڑائیاں پیش آئیں اس کی پوری تفصیل دی جا چکی ہے۔ تاتاریوں کی حمایت میں سب سے زیادہ شیعہ ہی پیش پیش تھے اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ امام موصوف کے زمانے میں شیعوں کے ساتھ سنیوں کا اختلاف نہ صرف مذہبی تھا بلکہ سیاسی بھی ہوگیا تھا۔ اگر تاتاریوں کے ساتھ شیعوں سے بھی مقابلے کی تیاریاں نہیں کرتے تو مصر و شام پر تاتاریوں کے ساتھ علویوں کی حکومت بھی قائم ہو جاتی۔

تاتاری بادشاہ پر جمال الدین کا رسوخ

تاتاری بادشاہ غازان کی وفات ۷۰۳ھ کے بعد اس کا بھائی اولجا تیو خدا بندہ تخت پر بیٹھا، جس نے ۷۰۳ھ سے لے کر ۷۱۶ھ تک حکومت کی تھی۔ یوں تو پہلے ہی سے تاتاری بادشاہوں پر شیعوں کا بے حد اثر تھا۔ مگر ایک واقعہ کی وجہ سے جمال الدین بن المطہر الحلی الشیعی کا بہت زیادہ رسوخ ہوگیا۔ ۷۰۷ھ میں خدا بندہ نے غصہ میں آ کر اپنی ایک بیوی کو طلاق دے دی۔ اس نے سنی علما سے فتویٰ پوچھا۔ اسے جواب ملا کہ اس کی بیوی اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ کسی دوسرے مرد سے شادی کر کے اس سے ہمبستر نہ ہو۔ خدا بندہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ درباریوں نے اسے رائے دی کہ اس مسئلہ میں شیخ جمال الدین بن المطہر الحلی الشیعی سے رائے لی جائے۔ شیخ نے بادشاہ سے پوچھا کہ آیا اس نے دو گواہوں کے سامنے طلاق دی ہے۔ اس نے کہا: نہیں۔ شیخ نے کہا تو پھر یہ طلاق، طلاق نہیں ہوئی۔ اب تک وہ اس کی بیوی ہے۔ یہ سن کر خدا بندہ ان سے خوش ہوگیا۔ اور پھر ان کو اپنے دربار میں اولین جگہ عطا کی۔

منہاج الکرامہ کی تصنیف

اس ذاتی تقرب سے فائدہ اٹھا کر شیخ موصوف نے بادشاہ اور درباریوں پر شیعیت کے اثرات مضبوط کرنے شروع کیے۔ انہیں ہر طرح سے یہ یقین دلایا کہ شیعیت ہی مذہب حق ہے۔ چنانچہ ہر جمعہ کو مسجدوں کے منبروں پر خلفائے اربعہ وغیرہ کی تعریف کی بجائے صرف آل علی کی تعریف ہونے لگی۔ شیخ نے نظریہ امامت کے ثبوت میں منہاج الکرامہ فی معرفۃ

الامامہ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ تمام لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھائی گئی کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہوسکتی اور بڑے بڑے سنی علما سے بھی اس کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا۔

اس کتاب کا رد

امام ابن تیمیہ نے منہاج السنة النبویة فی نقض کلام الشیعة والقدریة کے نام سے چار جلدوں میں جو معرکتہ الآرا کتاب لکھی ہے۔ وہ اسی کتاب منہاج الکرامہ کا رد ہے۔ یہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ امام موصوف نے کس سنہ میں یہ رد لکھا ہے۔ اندرونی قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ غالباً ۷۱۶ھ سے فوراً بعد ہی کی تصنیف ہے کیونکہ انہوں نے منہاج الکرامہ کے متعلق لکھا ہے۔ وقد صنفه للملك المعروف الذی سماه خدا بنده اس نے اس کو اس معروف بادشاہ کے لیے لکھا ہے۔ جس کا نام خدابندہ رکھا ہے۔ طرز بیان سے ایسا اندازہ ہوتا کہ اس وقت خدابندہ کی وفات ہوچکی تھی۔ [1] اتنا تو یقینی ہے کہ یہ ۷۲۰ھ سے پہلے کی تصنیف کی ہے۔ کیونکہ اس سنہ میں شیخ شمس الدین ذہبی نے ''المنتقی من منها ج الاعتدال فی نقض کلام اهل الرفض والاعتدال'' کے نام سے اس کتاب کی تلخیص کی تھی۔ [2] بہت ممکن ہے کہ اس کا نسخہ عرب کا مشہور امیر محمد بن عیسی بن مہنا یا اس کا کوئی آدمی دمشق لے آیا ہو۔ اس نے ۷۱۲ھ میں مکے کے ایک شیعی امیر خمصیہ بن ابی نمی الحسینی اور اس کے ایک مالدار شیعی ساتھی دلقندی کو سنیوں پر ظلم و ستم کرنے کی وجہ سے قتل کر دیا تھا اور ان دونوں کا سارا مال و اسباب ضبط کر کے دمشق لے آیا تھا۔ نائب دمشق نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اس مال و اسباب کے متعلق امام ابن تیمیہ سے فتوی پوچھا گیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ اس مال کو عام مسلمانوں کی بھلائی کے لیے خرچ کیا جائے۔ کیونکہ اس کو اب تک اہل سنت کے خلاف اہل بدعت کی تائید اور امداد کرنے اور حق کے دبانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ [3]

---

[1] منها ج السنة: ۳/ ۲٤٤۔ [2] محب الدین الخطیب نے اس کو ایڈٹ کر کے ۱۳۷۴ھ میں مصر سے شائع کر دیا ہے۔ [3] البدایة والنهایة: ١٤/ ٧٨۔

سبب تصنیف

امام ابن تیمیہ نے اپنی یہ کتاب اپنی خودی سے یا اپنی خواہش سے نہیں لکھی ہے۔ بلکہ لوگوں کے بے حد اصرار کے بعد منہاج الکرامہ کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ چنانچہ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

اہل سنت والجماعت کے کچھ اشخاص میرے پاس یہ کتاب لے آئے جس کو ہمارے ہی زمانے کے ایک رافضی شیخ نے تصنیف کیا ہے۔ اس میں اپنا پورا زور صرف کر کے مذہب رافضیہ امامیہ کی طرف ان ناواقف ولاۃ امور کو دعوت دی ہے جن کو علم اور دین کی معرفت حاصل نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کے دین کی اصل کو نہیں جانتے اس بارے میں اپنی عادت کے مطابق ان لوگوں نے بھی ان رافضیوں کی امداد واعانت کی ہے جو ظاہر میں تو مسلمان ہیں مگر درحقیقت باطنی ملحدین سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں یہی لوگ باطن میں ان صابی فلسفیوں سے تعلق رکھتے ہیں جو رسولوں کی پیروی اور دین اسلام کی اتباع کو ضروری قرار نہیں دیتے اور اسلام کے سوا دوسرے ادیان کی اتباع کو حرام نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے نزدیک یہ تمام ملتیں مذاہب اور سیاسیات کی حیثیت رکھتی ہیں جن کی پیروی کی جاسکتی ہے۔ ان کے نزدیک نبوت بھی ایک منصف مزاج سیاست کا درجہ رکھتی ہے جو دنیا میں عوام کی بھلائی کے لیے جاری کی جاتی ہے۔ جب جہالت اور جہالت والے زیادہ ہوجاتے ہیں تو اس قسم کے لوگوں کی کثرت ہوجاتی ہے۔ نبوت اور اس کی پیروی پر زور دینے والے علما کے فقدان کی وجہ سے کوئی ایسا شخص نہیں اٹھتا جو گمراہی کی اس تاریکی کو مٹا کر نبوت کی روشنی پھیلائے اور نبوت کے خلاف جو بہتان، شرک اور محال باتیں ہوتی ہیں ان کو ظاہر کر سکے۔ یہ لوگ نبوت کو پوری طرح نہیں جھٹلاتے بلکہ اس کی بعض چیزوں پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے بعض احوال سے انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ایمان اور انکار کے مختلف اوصاف کی بنا پر متفاوت ہیں۔ اس کی وجہ سے ناواقف لوگوں پر نبوت کی تعظیم کے سبب سے ان کا معاملہ مشتبہ ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے ملحدین کے لیے رافضیہ اور جہمیہ ہی دروازہ بنتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ خدا کے ناموں اور نشانیوں میں ہر طرح کا الحاد برتتے ہیں۔ جیسا کہ قرامطہ باطنیہ کے ملحد سرگروہوں نے خود

ہی اس بات کا اعتراف کیا ہے۔''

اس کتاب کے لانے والوں نے مجھے بتایا ہے کہ ان کے مذاہب کی طرف مائل ہونے والے بادشاہوں وغیرہ کو مضبوط بنانے میں یہ کتاب ممدو معاون ثابت ہوئی ہے۔ اور اس شیخ نے اس کتاب کو اس مشہور بادشاہ کے لیے لکھا ہے جس کا نام خدا بندہ ہے۔ ان لوگوں نے مجھ سے مطالبہ کیا ہے۔ کہ میں اس کتاب میں گمراہیاں اور جو باطل استدلالات ہیں ان کو بیان کروں تاکہ خدا کے مومن بندوں کی مدد ہو اور انہیں یہ معلوم ہو کہ افترا پرداز ملحدین نے کیا باطل باتیں لکھی ہیں۔ میں نے انہیں بیان کیا کہ اگرچہ یہ لوگ اس کتاب کو حجت اور دلیل کی حیثیت سے اعلیٰ پایہ کی سمجھتے ہیں مگر پوری قوم سیدھے راستے سے بھٹکی ہوئی ہے کیونکہ دلیلیں یا تو عقلی ہونگی یا نقلی۔ اور یہ قوم مذاہب کے ثبوت کے لیے منقول و معقول دلائل کے پیش کرنے میں سب سے زیادہ گمراہ ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی مثال ایسے لوگوں کی ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم سنتے اور سمجھتے تو دوزخ والوں میں سے نہ ہوتے'' (۶۷/الملک:۱۰) یہ لوگ نقلیات میں سب سے زیادہ جھوٹے اور عقلیات میں سب سے زیادہ جاہل ہوتے ہیں۔ یہ اس قسم کے منقولات کی تصدیق کرتے ہیں جو نسلاً بعد نسل متواتر نقل ہوتی آرہی ہیں۔ یہ لوگ علوم واخبار کے ناقلین اور رواۃ میں تمیز نہیں کر سکتے اور یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ کون نقل کرتے میں جھوٹ سے کام لے رہا تھا یا غلط نقل کرتا ہے یا ناواقفیت سے بول رہا ہے اور کون علم و آثار کا زبردست حافظ ہے۔ ان کا اعتماد درحقیقت تقلید پر ہے جس کو وہ دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہ لوگ کبھی تو معتزلہ اور قدریہ کی پیروی کرتے ہیں اور کبھی مجسمہ جبریہ کی تائید کرتے ہیں۔ نظری باتوں میں بھی یہ لوگ سب سے زیادہ جاہل ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں نے دین میں وہ فساد داخل کیا ہے جس کا خدا ہی کو اندازہ ہوسکتا ہے۔ انہیں کے دروازے سے ملاحدۂ اسماعیلیہ و نصیریہ و باطنیہ داخل ہوئے اور ان ہی کی راہ سے مسلمانوں کے دشمن مشرکین اور اہل کتاب اپنی منزل مقصود کو پہنچے۔ یہ لوگ بلاد اسلام پر قابض ہوئے بہت سی پاک دامن عورتوں کی بے حرمتی کی۔ لوگوں کے مال چھینے اور بے انتہا خون بہایا، ان کی مدد سے امتِ اسلامیہ پر دین اور دنیا کی وہ مصیبتیں ٹوٹ

پڑیں۔ جن کو خدا ہی زیادہ بہتر جانتا ہے۔ ان کے مذہب کے اصل بانی وہ نوجوان زندیق منافقین ہیں جن کی حضرت علی نے سرکوبی کی تھی۔ ان میں سے ایک جماعت کو زندہ آگ میں جلا دیا تھا اور بعض کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ ان کی تیز تلوار کے ڈر سے بہت سے لوگ بھاگ نکلے۔ ان کی ایک جماعت کو کوڑے سے ڈرایا۔ یہ باتیں تاریخ میں مشہور و معروف ہیں۔ حضرت علی سے تواتر کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ آپ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے بلند آواز سے فرمایا کہ اس امت میں سب سے زیادہ بہتر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر ہیں۔ محمد بن الحنفیہ نے بھی یہی کہا تھا جیسا کہ امام بخاری نے اپنی کتاب میں روایت کیا ہے۔ حضرت علی کے ساتھی شیعوں کا حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی فضیلت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ البتہ ان میں سے اکثر حضرت علی کو حضرت عثمان پر فضیلت دیتے تھے۔ اوائل و اواخر کے اکابر علما شیعہ کو بھی اس بات کا پورا اعتراف ہے۔ ابو القاسم البلخی نے لکھا ہے کہ کسی نے شریک بن عبداللہ سے پوچھا: ابوبکر اور علی میں سے کون افضل ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ابوبکر، سوال کرنے والے کو تعجب ہوا اور اس نے پوچھا کیا آپ شیعی ہو کر ایسا کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا: ہاں جو بھی اس کو نہیں مانے گا وہ شیعی نہیں ہے۔ خدا کی قسم! حضرت علی نے انہیں سیڑھیوں پر چڑھ کر خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس امت میں سب سے زیادہ بہتر ابوبکر اور پھر عمر ہیں تو پھر ہم کس طرح آپ کے قول کی تردید کریں اور آپ کو جھٹلائیں۔ خدا کی قسم! حضرت علی جھوٹے نہیں تھے۔ اس روایت کو عبدالجبار الہمدانی نے اپنی کتاب تثبیت النبوۃ میں لکھا ہے اور کہا ہے کہ ابو القاسم البلخی نے ابن الراوندی کے جاحظ پر اعتراضات کا رد لکھتے ہوئے اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ قاضی عبدالجبار نے ابو القاسم البلخی کی کتاب سے اس روایت کو لیا ہے۔

اس کتاب کے لانے والوں نے جب بار بار اس کھلی گمراہی کا رد لکھنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ایسا نہ کرنے سے مومنین کی رسوائی ہوگی اور سرکش لوگوں کا یہ گمان اور پختہ ہو جائے گا کہ سنی اس کا رد لکھنے سے عاجز ہیں تو میں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جو کچھ میسر ہو سکا لکھا۔''

اس کتاب کا نام

یہ کتاب ''منہاج السنة النبویة فی نقض کلام الشیعة والقدریة'' کے

نام سے چار جلدوں میں چھپی ہے۔ مگر شیخ شمس الدین ذہبی نے اس کی تلخیص کا نام المنتقی من منہاج الاعتدال فی نقض کلام اهل الرفض والاعتدال رکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کے زمانہ میں اس نام سے معروف ہو چکی تھی۔ درحقیقت امام ابن تیمیہ نے خود اپنی کتاب کو کوئی نام نہیں دیا تھا۔ لوگوں نے اس کا نام اپنے مذاق کے مطابق رکھ لیا تھا۔ کسی نے پہلا نام دیا تو کسی نے دوسرے نام سے اس کو موسوم کیا۔

منہاج الکرامہ کے مضامین

شیخ جمال الدین ابن مطہر حلی نے اپنی کتاب کو ایک مختصر دیباچہ اور پانچ فصلوں میں منقسم کیا تھا۔ دیباچہ میں یہ لکھا تھا۔

یہ رسالہ احکام دین اور مسائل مسلمین کے اہم مطالب پر مشتمل ہے جن میں امامت کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے حصول سے بزرگی کا درجہ ملتا ہے اور وہ ایمان کا ایک رکن ہے جس کی وجہ سے دائمی جنت حاصل ہوتی ہے اور انسان خدا کے غصہ سے بچا رہتا ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مر جائے اور اپنے زمانہ کے امام کو نہ جانے وہ گویا جاہلیت کی موت مرتا ہے۔'' میں نے اس کتاب کے ذریعہ سلطان اعظم مالك رقاب الامم، ملك ملوك طوائف العرب والعجم، مولى النعم، مسدى الخير والكرم، شاهنشاه المكرم، غياث الملة والحق والدين اولجايتوخدا بندہ کی خدمت کی ہے۔ میں نے اس میں دلائل کا نچوڑ پیش کیا ہے اور اہم مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کا نام منہاج الکرامہ فی معرفۃ الامامہ رکھا ہے اور اس کو چند فصول پر مرتب کیا ہے۔ پہلی فصل اس پر ہے کہ اس مسئلہ میں مختلف مذاہب کا کیا رویہ ہے۔ دوسری فصل میں اس کا بیان ہے کہ امامیہ مذہب کی پیروی واجب ہے۔ تیسری فصل میں آنحضرت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے ثبوت میں دلائل پیش کیے ہیں۔ چوتھی فصل میں بارہ اماموں کی تفصیل ہے۔ پانچویں فصل میں ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت کے باطل ہونے پر دلیلیں دی ہیں۔

تفصیلی تردید

امام ابن تیمیہ نے اس دیباچہ اور پانچوں فصلوں کی چھ فصلوں میں تفصیلی طور پر تردید کی ہے اور آخری فصل میں حضرت ابوبکر کی خلافت پر زوردار دلائل دیئے ہیں۔ ان سب کی تشریح خود ایک مستقل بالذات تصنیف چاہتی ہے۔ مگر ہم جستہ جستہ اس کتاب کے چند اہم مباحث پیش کریں گے جن سے اس کتاب کی نمایاں خصوصیتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

لہجہ کی تلخی

اس کتاب میں شیعوں کے ساتھ بہت ہی تلخ لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ جس کی ایک سنجیدہ علمی کتاب میں کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر یہ اس زمانہ کی مناظرانہ کتابوں کا ایک عام وصف تھا جس سے کسی فرقے کی کتابیں بھی خالی نہیں ہوتی تھیں، یوں بھی حدت اور شدت امام ابن تیمیہ میں بہت زیادہ تھی۔ وہ نہ صرف شیعوں کے متعلق بلکہ بہت سے ایسے سنی علما کے متعلق بھی جن کا مسلمانوں میں بڑا وقار قائم تھا۔ اور اب تک قائم ہے سخت لہجہ برتنے کے عادی ہو گئے تھے۔ لیکن اس کتاب کی ہر سطر سے ان کا علمی تبحر نمایاں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں کی اکثر تصنیفات ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ اور وہ ان کی ہر ایک تحریک کی تاریخ سے پوری طرح واقف تھے۔ اگر کسی کو ان کا علمی تبحر، وسعت نظر، ذہانت وطباعی، نقد وتنقید اور حاضر دماغی کا نمونہ دیکھنا ہو تو وہ اس کتاب کو دیکھے۔ منہاج الکرامہ کی کوئی سطر ایسی نہیں ہے جو ان کے نقد وتبصرہ سے بچی ہو۔ انہوں نے درحقیقت ابن المطہر الحلی کو بالکل بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے۔

یہود و نصاریٰ سے مماثلت

امام ابن تیمیہ نے سب سے پہلے شیعوں کی ابتدائی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں میں اختلافات کی ابتداء عبداللہ بن سبا سے ہوئی تھی جو صنعاء کا ایک منافق یہودی تھا۔ اس نے حضرت علی اور ان کی آل کی فضیلت میں بہت سے نئے نظرئیے پیش کیے تھے اور لوگوں کو بہکانا شروع کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شیعیت پر یہودیت کا

نمایاں اثر پایا جاتا ہے اور شیعہ یہودیوں اور نصرانیوں سے غلو وجہل اور اتباع ہوئی میں بہت سی باتوں میں مماثل نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بہت سی مثالیں دی ہیں جن کو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

حماقتیں

انہوں نے شیعوں کی بہت سی حماقتیں بھی گنائی ہیں کہ وہ کس طرح یزید کی کھودی ہوئی نہر سے پانی نہیں پیتے حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کی کھودی ہوئی باولیوں اور نہروں سے پانی پیا ہے۔ اسی طرح وہ شامی توت (سیاہ پھل) نہیں کھاتے۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کافروں کے ملکوں سے آئی ہوئی پنیر اور دوسری چیزوں کو استعمال کرتے تھے اور ان کے ہاتھوں کا بنا ہوا کپڑا پہنتے تھے۔ وہ بنی امیہ کی بنائی ہوئی جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھتے حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے بنائے ہوئے کعبۃ اللہ میں بار بار نماز پڑھی تھی اسی طرح شیعہ دس کا لفظ اپنی زبان پر نہیں لاتے کیونکہ اس کی وجہ سے عشرہ مبشرہ کا نام ان کی زبان پر آجاتا ہے وہ گھروں کے ستون بھی دس نہیں بناتے وہ دس کی بجائے نو کا عدد استعمال کرتے ہیں۔ اعدد سے اس قسم کی نفرت محض ایک حماقت ہے۔ قرآن مجید میں حضرت صالح کے متعلق ذکر ہے:

﴿وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ﴾ [1]

''اور شہر میں نو قبیلے تھے جو زمین میں فساد مچاتے تھے اور اصلاح کی کوشش نہیں کرتے تھے۔''

کیا محض مفسدین کے ساتھ نو کا عدد آجانے سے یہ عدد استعمال نہیں کیا جائے گا؟ قرآن مجید میں عشر (دس) کا لفظ کئی جگہ پر بطور مدح کے استعمال ہوا ہے جیسے:

﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ﴾ [2]

---

[1] ۲۷/النمل:۴۸۔ [2] ۲/البقرۃ:۱۹۶۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ﴾ ❶

﴿ وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ﴾ ❷

﴿ وَالْفَجْرِ ۙ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۙ ﴾ ❸

حدیثوں میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے عشرۂ اواخر میں اعتکاف کرتے تھے اور فرماتے تھے اللہ تعالیٰ کو ان دس دنوں میں جو نیک اعمال زیادہ پسند ہوتے ہیں وہ دوسرے دنوں میں نہیں ہوتے۔

شیعہ اپنا نام ابوبکر، عمر، عثمان نہیں رکھتے۔ حالانکہ آنحضرت کے زمانہ میں آپ کے ساتھیوں کے ایسے نام رکھے گئے ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں اپنے کفر و شرک اور تشدد کے لیے مشہور تھے۔ جیسے عمرو بن عبد، ابوجہل عمرو بن ہشام، ولید بن الولید بن المغیرہ۔ خالد بن سفیان الہذلی، ہشام بن حکیم، عقبہ بن ابی معیط، علی بن امیہ بن خلف عثمان بن طلحہ۔ تو کیا کافروں کے یہ نام رکھ لینے سے مسلمان اپنا نام نہیں رکھیں گے؟ حضرت علی کی اولاد میں بھی اس قسم کے نام ملتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس قسم کا نام رکھنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔

شیعوں کی ایک حماقت یہ بھی ہے کہ سامرا کے غار کے سامنے گھوڑا یا خچر باندھ کر امام منتظر کے نکلنے کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور ہر وقت پکارتے رہتے ہیں اے ہمارے مولیٰ! باہر تشریف لائیے۔ تلواروں کو فضا میں گھماتے رہتے ہیں گویا وہ کسی ہوائی دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ بہت سے لوگ تو نماز بھی اس ڈر سے ترک کر دیتے ہیں کہ کہیں امام منتظر باہر نکل آئیں اور وہ ان کے استقبال کے لیے موجود نہ ہوں۔ وہ پکاریں یا نہ پکاریں اگر انہیں باہر آنا ہے تو ضرور باہر آئیں گے اور خدا ان کی تائید کرے گا۔ ان کے وہاں انتظار کرنے کی کیا حاجت ہے؟

ان لوگوں کی ایک حماقت یہ بھی ہے کہ ایک سرخ رنگ والی مینڈھی کو خریدتے ہیں اور اس کا نام عائشہ رکھ کر اس کے بال نوچتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو

---

❶ ۲/البقرۃ:۲۳٤۔ ❷ ۷/الاعراف:۱٤۲۔ ❸ ۸۹/الفجر:۱، ۲۔

تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح دو گدھوں کا نام ابوبکر اور عمر رکھ کر انہیں مارنے لگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو تکلیف ہوتی ہے۔ بعض اپنے کتے کا نام بکیر رکھتے ہیں۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ فرعون، ابولہب اور ابوجہل وغیرہ خدا اور دین کے زبردست دشمن تھے۔ اگر کوئی جانوروں کو یہ نام دے کر انہیں مارے پیٹے اور یہ سمجھے کہ ایسا کرنے سے ان کو تکلیف ہوتی ہے تو یہ محض حماقت ہوگی۔ ہم کو تو یہ بھی جائز نہیں ہے کہ اگر ہمارا کوئی شدید ترین کافر دشمن ہمارے مقابلے میں مارا جائے تو اس کا مثلہ کریں، کیونکہ مر جانے کے بعد اس کے اعضاء کاٹنے سے اس کو کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح شیعہ اونٹ کا گوشت حرام سمجھتے ہیں اس لیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اونٹ پر بیٹھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی تھی۔

کیا امامت دین کا اہم مسئلہ ہے؟

شیخ جمال الدین ابن المطہر الحلی کا سب سے پہلا دعویٰ یہ تھا کہ امامت دین کے اہم مطالب اور اشرف مسائل میں سے ہے ہر ایک اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کتاب اللہ میں امامت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر نیکیوں اور بھلائیوں کی تعلیم دی مگر امامت کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اگر امامت دین کا اہم مسئلہ ہوتا تو آپ لازمی طور پر اس کو بیان فرماتے۔ اس کی بجائے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا اور نماز اور زکوٰۃ ادا کرنا دین کے اہم مسائل میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ﴾ [1]

”پس اگر کفر سے وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مجھے لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ لوگ یہ گواہی دیں کہ خدا کے سوائے کوئی معبود نہیں ہے اور میں بے شک اللہ کا رسول ہوں پس جب

---

[1] ۹/التوبۃ: ۱۱۔

یہ ایسا کریں گے تو مجھ سے اپنے خون اور مالوں کی اپنے حق کے ساتھ حفاظت کریں گے۔'' ❶

ہم پر آنحضرت ﷺ کی اطاعت آپ کے امام ہونے کی حیثیت سے واجب نہیں ہے بلکہ رسول ہونے کی حیثیت سے ہے اور آپ کی یہ رسالت قیامت تک کے لیے قائم ہے۔ آپ کا پیغام دنیا میں زندہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور کی حاجت نہیں ہے۔ شیعوں کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ رسالت کا یہ درجہ اماموں کو بھی حاصل نہیں ہے۔ آپ کی وفات کے بعد بھی ہر ایک کو آپ کی رسالت کا قائل ہونا ضروری ہے۔ جب تک کوئی خدا پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ آپ کے رسول ہونے کی گواہی نہیں دے گا وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی کافر اس کی بجائے محض امامت کے مسئلہ پر ایمان لائے تو کسی حالت میں بھی وہ مومن نہیں ہوسکتا۔

امامیہ کے نزدیک دین کے اصول چار ہیں یعنی توحید، عدل، نبوت اور امامت جب امامت دین کی آخری اصل ہے تو پھر یہ کس طرح اہم مطالب و اشرف مسائل میں شمار کی جائے گی؟

امامیہ کے نظریہ کے مطابق امامت بارہویں امام یعنی محمد بن الحسن پر ختم ہوگئی۔ ان کے بعد کوئی امام نہیں ہے ایک ایسے امام پر عقیدہ رکھنے سے کیا فائدہ ہے جو بچپن میں غار میں داخل ہوا اور برسوں سے روپوش ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں کسی کو کوئی تعلیم نہیں دی اور نہ اب جبکہ اس واقعہ پر سالہا سال بیت گئے ہیں کوئی اس سے تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ اسی غلط عقیدے کا نتیجہ ہے کہ امامیہ کی مذہبی زندگی ختم ہو چکی ہے۔ اور عملی تعطل پیدا ہو گیا ہے۔ ان کو نہ تو نماز روزے کی طرف توجہ ہے اور نہ ہی دوسری بھلائیوں کا خیال ہے ہر ایک بات کے لیے وہ امام منتظر پر ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کا رات دن کا وظیفہ خیار امت کو گالیاں دینا ہو گیا ہے، جن کے متعلق ہمیں یہ دعا مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴾ ❷

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ﴾، ح: ۲۵۔

❷ ۵۹/حشر: ۱۰۔

"اے ہمارے پروردگار! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ گزر چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کھوٹ نہ بنا جو ایمان لے آئے ہیں۔ اے ہمارے پرردوگار! تو بے شک مہربان اور رحمت والا ہے۔"

اگر یہ کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں رسول ہونے کے ساتھ ساتھ امام بھی تھے اور آپ کے بعد یہ امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد میں منتقل ہوئی ہے۔ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ امام کی پیروی اسی طرح کی جائے جس طرح رسول کی کی جاتی ہے تو یہ غلط ہے۔ اطاعت رسول میں کوئی دوسرا آپ کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اور اگر اس سے یہ مراد ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی آپ کے احکام کو نافذ کرنے والا امام موجود ہو تو آپ کی زندگی میں بہت سے لوگوں نے یہ فرائض انجام دیئے۔ آپ نے بہت سوں کو عامل اور امیر مقرر کیا۔ جنہوں نے آپ کے احکام کو لوگوں پر نافذ کیا۔ یہ سب علی یا ان کے خاندان سے نہیں تھے۔ آپ کی وفات کے بعد ہر ایک آپ کے احکام کو نافذ کرسکتا ہے۔ یہ سب علی یا ان کے خاندان سے نہیں تھے۔ آپ کی وفات کے بعد ہر ایک آپ کے احکام کو نافذ کرسکتا ہے۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کی اولاد ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اگر بالفرض اس کو مان بھی لیا جائے تو بارہویں امام محمد بن الحسن العسکری کے بعد کون ہے جو آپ کے احکام کو نافذ کررہا ہے؟

شیخ جمال الدین نے اس عقیدے کے ثبوت میں یہ حدیث نقل کی تھیں۔

من مات ولم یعرف امام زمانه مات میتة جاهلیة ۔

جو شخص مرجائے اور اپنے زمانے کے امام کو نہ جانے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے

یہ حدیث موضوع ہے، اس کو کسی محدث یا اہل علم نے بھی روایت نہیں کیا ہے۔ اس کی صحت کے ثبوت کی ذمہ داری ناقل پر ہے۔ اگر اس کو صحیح مان بھی لیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بارہویں امام کے بعد کے زمانوں میں ہر زمانے کا کون امام ہے؟ اگر ہر زمانے کے لیے وہی امام مانے جاتے ہیں تو پھر کیسے ان کی معرفت حاصل ہو؟ اور کون ان کے احوال کو جانتا

ہے؟ کیا احوال کو جاننے کے بغیر شخص کی معرفت معرفت کہی جا سکتی ہے؟ مثلاً کسی کا چچازاد بھائی ہے اور وہ برسوں سے غائب ہے اور اس کے احوال کسی کو معلوم نہیں ہیں تو محض اس شخص کا نام معلوم ہونے سے کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کو اپنے چچازاد بھائی کی معرفت حاصل ہے؟ اس مشہور حدیث کے خلاف اہل علم نے جو روایت کی ہے وہ ان شیعوں کے مقاصد کے خلاف ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں نافع سے روایت کی ہے کہ جب یزید بن معاویہ کے زمانے میں حرہ کا مشہور واقعہ پیش آیا تو حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مطیع بن الاسود کے پاس تشریف لے گئے جو یزید بن معاویہ کا مخالف تھا اور آگے چل کر حضرت عبداللہ بن زبیر کا داعی بنا۔ عبداللہ بن مطیع نے خادموں سے کہا کہ ابوعبدالرحمٰن (یعنی حضرت عبداللہ بن عمر) کے لیے گاؤ تکیہ ڈالو۔ آپ نے فرمایا: میں یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنانے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

((من خلع يدا من طاعة لقى الله يوم القيامة لا حجة له ومن مات وليس فى عنقه بيعة مات ميتة جاهلية)) [1]

''جو شخص فرمانبرداری سے اپنا ہاتھ کھینچ لے قیامت کے دن خدا سے اس حالت میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی اور جو مر جائے اور اس کی گردن میں بیعت نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔''

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ولاۃ امور کی اطاعت ضروری ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جتنی بھی خونریزیاں ہوئی ہیں وہ اس پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔ ولاۃ امور کے مظالم کے خلاف احتجاج کرنا صحیح ہے مگر سرے سے ان کی امارت اور ولایت کے خلاف بغاوت کرنا غلط ہے۔ صحیح مسلم میں عوف بن مالک الاشجعی سے روایت ہے فرمایا۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا آپ نے فرمایا: ''تمہارے بہترین امام وہ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتے ہیں اور تم ان پر رحمت بھیجتے ہو اور وہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں اور تمہارے برے امام وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تم کو ناپسند کرتے ہیں اور تم ان پر

[1] صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب الأمر بلزوم الجماعة: ١٨٥١ (٤٧٩٣)

لعنت بھیجتے ہو اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہیں۔'' ہم نے کہا: یا رسول اللہ! کیا ہم اس وقت ان سے جھگڑا نہ کریں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں! جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں ان سے جھگڑا نہ کرو۔ آگاہ ہو جاؤ کہ اگر کوئی تم پر والی ہو اور اس کو اللہ کی نافرمانی کرتا ہوا دیکھو تو اس کو ناپسند کرو لیکن اطاعت و فرمانبرداری سے اپنا ہاتھ کھینچ نہ لو۔'' [1]

کیا امامت پر نص موجود ہے؟

شیخ جمال الدین نے پہلی فصل میں حضرت علی اور ان کی اولاد کی امامت کے ثبوت میں یہ دلیل دی ہے کہ خدا عادل اور حکیم ہے۔ اس کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہوتا، وہ بندوں کے لیے وہی تجویز کرتا ہے جو ان کے لیے زیادہ صالح اور نافع ہو اس نے لوگوں کو مختار بنایا ہے مجبور نہیں کیا ہے۔ اپنے معصوم انبیاء و رسل کے ذریعہ ثواب کا وعدہ کیا اور عذاب سے ڈرایا ہے۔ ان کے متعلق خطا و نسیان اور معاصی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ورنہ بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اس نے رسالت کے بعد امامت کو قائم کیا ہے۔ اور نص کے ساتھ اولیاء معصومین مقرر کیے تاکہ امت خطا اور غلطی سے بچی رہے۔ اور دنیا والوں پر خدا کی مہربانی اور عنایت جاری رہے۔ اسی لیے جب اللہ نے رسول کو اٹھایا تو ان کی جگہ حضرت علی کو امام مقرر کیا۔ اس کے بعد ہر ایک امام دوسے امام کی جانشینی کی وصیت کرتا رہا۔ انتقال سے پہلے آنحضرت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق وصیت کر دی تھی اس کے برخلاف سنیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عادل اور حکیم نہیں ہے اور اس کا کوئی فعل مصلحت پر مبنی نہیں ہے اور وہ بندوں کے لیے وہ تجویز نہیں کرتا جو ان کے لیے اچھا اور مفید ہو۔ دنیا میں جو بھی ظلم اور فساد ہوتا ہے۔ اس کی نسبت اللہ کی طرف کی جاتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرنے سے پہلے کسی کے لیے وصیت نہیں کی اور ابوبکر کی امامت پر کوئی نص نہیں ہے بلکہ وہ صرف پانچ آدمیوں یعنی عمر، ابو عبیدہ بن الجراح، سالم مولی ابی حذیفہ، اسید بن حضیر اور بشیر بن سعد بن عبادہ کی تائید اور اتفاق سے امام ہوئے۔ پھر ابوبکر نے عمر کو نامزد کیا۔ عمر نے مجلس شوریٰ کے حوالے کیا جس کے ایک رکن عثمان تھے بعض نے ان کو مقرر کیا۔ ان کے بعد ایک انبوہ (خلق) کی بیعت سے علی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الأمارۃ، باب خیار الأئمۃ و شرارھم، ح: ۱۸۵۵ (۴۸۰۴)

امام ہوئے۔ان کے بعد بعض نے حسن کو اور بعض نے معاویہ کو امام مانا۔اس طرح امامت کچھ سال تک بنو امیہ میں رہی۔ اس کے بعد بنی عباس کی طرف منتقل ہوئی۔ یہاں تک کہ یہ مستعصم پر آ کر ختم ہوئی۔

شیخ جمال الدین نے اس مسئلہ کو کلامی مسائل سے غلط ملط کرنے کی کوشش کی ہے اور سنی عقیدوں سے متعلق غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ان کا استدلال نہ تو منطقیانہ ہے اور نہ حقیقی واقعات ہی پر مبنی ہے۔امام ابن تیمیہ نے اس فصل پر بہت ہی تفصیلی بحث کی ہے جو تقریباً ایک سو بیس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے، مختلف مسائل کلامیہ پر طویل بحثیں آ گئی ہیں جن پر یہاں بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ شیخ جمال الدین کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے رسالت کے بعد امامت کو قائم کیا اور نص کے ساتھ اولیاء معصومین مقرر کیے حقیقت سے بالکل بعید ہے۔ حضرت علی کے ولی اور امام ہونے کے متعلق جتنی بھی روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ بالکل من گھڑت ہیں۔اگر اس قسم کی کوئی نص موجود ہوتی تو صحابۂ کرام میں سے کم از کم بعض کا ان کی خلافت و امامت کے لیے لڑنا ضروری تھا۔

خود حضرت علی نے اپنی امامت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی امامت پر کوئی نص موجود نہیں تھی۔ اس کے برخلاف حضرت ابوبکر کی خلافت پر بہت سی نصوص موجود ہیں جن کی تفصیل آخری فصل میں آئے گی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سب سے زیادہ اہمیت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی ہی رہی ہے۔ چنانچہ جب جنگ احد کے موقع پر دوبارہ مسلمانوں کو شکست ہوئی تو ابوسفیان نے پکارا: کیا محمد زندہ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جواب نہ دو۔'' اس نے کہا: کیا ابن ابی قحافہ زندہ ہے؟ آپ نے فرمایا: ''جواب نہ دو۔'' پھر اس نے کہا: کیا عمر زندہ ہے؟ آپ نے فرمایا ''جواب نہ دو۔'' [1] صحیحین میں اس واقعہ کی پوری تفصیل موجود ہے مگر یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ نہ صرف مسلمان بلکہ اسلام کے دشمن بھی آنحضرت کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو سب سے بلند مرتبہ خیال کرتے تھے۔نہ صرف مکی زندگی میں بلکہ مدنی زندگی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ احد، ح: ٤٠٤٣۔

میں بھی آنحضرت کے مشیر اعلیٰ حضرت ابوبکر ہی رہے یہی وجہ ہے کہ اپنی وفات سے پہلے حضرت ابوبکر ہی کو اصرار کے ساتھ امام مقرر کیا۔ اور آپ نے ایک جمعرات سے لے کر دوسری جمعرات تک اور پھر پیر کے دن تک مسلمانوں کی امامت کی۔

اب رہا شیخ جمال الدین کا یہ کہنا کہ حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر صرف پانچ آدمیوں نے بیعت کی بالکل غلط ہے۔ جب ان پانچ آدمیوں نے بیعت کر لی تو تمام مہاجرین اور انصار نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ صرف سعد بن عبادہ نے بیعت نہیں کی تھی مگر جمہور امت کی بیعت کے بعد صرف ایک آدمی کا اختلاف کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اسی طرح حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی خلافت پر ساری امت متفق ہو چکی تھی۔ امت کی جتنی تائید ان تینوں خلیفوں کو حاصل تھی اتنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد بہت سے لوگوں نے محض دلی اضطراب کے ساتھ حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کی، جس کا نتیجہ سخت ترین اختلاف وانشقاق کی صورت میں ظاہر ہوا اور خونریز لڑائیاں پیش آئیں۔ ان تینوں خلیفوں کی قوت وشوکت چند آدمیوں کے بیعت کرنے سے نہیں تھی جیسا کہ شیخ جمال الدین نے دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے بلکہ جمہور امت کی متفقہ تائید کی وجہ سے تھی جب حضرت علی کو جمہور امت کی متفقہ تائید حاصل نہ ہو سکی تو ان کی حکومت اتنی طاقتور اور قوت والی نہ ہو سکی۔

شیخ جمال الدین نے ائمہ معصومین کے تقرر کو عالم پر خدا کے لطف ومہربانی کا مظہر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس سے مراد ان کی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو امت کا سردار مقرر کیا تھا تا کہ ان کی ذات سے لوگوں کو فائدہ پہنچے تو یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ خود امامیہ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ سارے ائمہ مقہور ومظلوم اور عاجز تھے۔ انہیں قوت وطاقت یا شوکت ودبدبہ حاصل نہیں تھا ان کو کوئی ولایت یا سلطنت نہیں مل سکی تھی۔ اس لیے وہ لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اور اگر اس سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے ان ائمہ کو مقرر فرمایا تھا۔ پس جنہوں نے ان کی اطاعت کی ان کو ان سے فائدہ پہنچا اور جنہوں نے نافرمانی کی ان کو نقصان پہنچا۔ چونکہ اکثر لوگوں نے ان کی نافرمانی کی اس

لیے لوگوں کو ان کی ذات سے کوئی فائدہ نہ ہو سکا۔ تو یہ اعتراف خود شیخ کی دی ہوئی دلیل کے خلاف ہوتا ہے۔ اور اگر اس سے یہ مراد ہو کہ ان ائمہ کے علم و دین سے لوگوں کو فائدہ پہنچا تو ظاہر ہے کہ کتاب و سنت اور حدیث و فقہ کی تعلیم و تدریس میں دوسرے لوگ ان ائمہ سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ دوسروں کی ذات سے لوگوں کو جتنا فائدہ پہنچا ان ائمہ کی ذات سے نہیں پہنچ سکا۔ بارہویں امام منتظر کی ذات سے اب تک کسی کو کسی قسم کا بھی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس لحاظ سے شیخ جمال الدین کا دعویٰ بالکل بے بنیاد اور واقعہ کے خلاف ثابت ہو جاتا ہے۔

کیا امامیہ مذہب کی پیروی واجب ہے؟

شیخ جمال الدین نے دوسری نسل میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امامیہ مذہب ہی برحق ہے اور ہر ایک مسلمان پر اس کی پیروی واجب ہے؟ اس سلسلے میں سب سے پہلے ایک تمہید باندھی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خواہشات نفسانی کی بنا پر لوگوں کی رائیں مختلف ہو گئیں، بعض نے اپنے لیے کسی حق کے بغیر حکومت چاہی جن کے ہاتھ پر دنیا داروں نے بیعت کی۔ بعض پر معاملہ مشتبہ ہو گیا۔ اور دنیا داروں کی دیکھا دیکھی ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کے اس قصور نظر کی وجہ سے ان پر حق واضح نہیں ہو سکا اور انہوں نے باطل کی اتباع کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے مواخذہ ہوگا۔ بعض نے قصور فہم کی بنا پر تقلید سے کام لیا۔ اور یہ سمجھا کہ جمہور جو راستہ اختیار کرتے ہیں وہی ٹھیک ہوتا ہے۔ حالانکہ انہیں یہ نہیں معلوم کہ دنیا میں خدا کے شکر گزار بندے زیادہ نہیں بلکہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ ﴿وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ﴾ ﴿وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝﴾ بعض نے حق کی بنا پر اپنے لیے حکومت طلب کی۔ ان کے ہاتھ پر ان چند لوگوں نے بیعت کی جنہیں دنیا اور اس کی زینت سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ اللہ اور اس کے احکام کے بارے میں انہیں کسی ملامت کرنے والے کا ڈر نہیں تھا۔ انہوں نے خلوص کے ساتھ حق کی اتباع کی۔

اس کے بعد شیخ جمال الدین نے پانچ صورتوں سے مذہب امامیہ کے حق ہونے پر بحث کی ہے، پہلی یہ ہے کہ مذہب امامیہ ہی سب سے زیادہ سچا اور برحق مذہب ہے اور وہ باطل کی آمیزشوں سے بالکل پاک ہے۔ خدا اور اس کے رسولوں اور معصوم اماموں کے متعلق اس

کے اعتقادات بالکل صحیح ہیں۔

دوسری یہ کہ حدیث نبوی کی رو سے تمام فرقوں میں صرف فرقہ امامیہ ہی نجات پانے والا ہے۔ کیونکہ اصول عقائد میں وہ تمام فرقوں سے ممتاز ہیں۔ دوسرے فرقوں کے عقیدے باطل فرقوں کے عقیدوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس فرقے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے اہل بیعت کی مثال حضرت نوح کی کشتی کی ہے۔ اس میں جو بھی سوار ہو گا نجات پا جائے گا اور جو پیچھے رہ جائے گا وہ ڈوب جائے گا۔'' [1]

تیسری یہ کہ مذہب امامیہ اپنے تمام پیرؤوں کے لیے نجات کی ضمانت دیتا ہے۔ دوسرے مذاہب میں اپنے پیرؤوں کے لیے نجات کی ضمانت نہیں دی گئی ہے۔

چوتھی یہ کہ تمام ائمہ معصومین خطا و غلطی سے پاک تھے اور وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیز گار اور عابد وزاہد تھے ان کے مقابلے میں کسی اور کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

پانچویں یہ کہ سنیوں کی طرح امامیہ غیر حق کی اتباع میں تعصب نہیں برتتے۔ مثلاً غزالی اور ماوردی کہتے ہیں کہ قبروں کو مسطح کرنا ہی شریعت کے مطابق ہے مگر چونکہ شیعوں نے اس کو اختیار کر لیا تھا۔ اس لیے اس کے خلاف کرنا ضروری قرار دے دیا اور قبروں کو اٹھا کر بنانا شروع کیا۔ اسی طرح زمخشری کہتے ہیں کہ اللہ کی اس آیت ﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ﴾ [2] کے مطابق ہر مسلمان پر صلوٰۃ بھیجی جاسکتی ہے۔ مگر چونکہ شیعوں نے اس کو اپنے اماموں کے لیے مخصوص کر لیا۔ اس لیے اس کا خلاف کرنا ضروری قرار دیا۔ اسی طرح ہدایہ کا مصنف لکھتا ہے کہ سیدھے ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی پہننا سنت ہے۔ مگر چونکہ شیعوں نے اس کو اختیار کر لیا اس لیے اس کے برخلاف بائیں ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی کا پہننا سنت قرار دے دیا۔

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مثالب بیان کیے ہیں اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تمام جلیل القدر صحابہ باطل کی پیروی کرتے جا رہے

---

[1] مستدرك حاكم: ٢/ ٣٧٣، ح: ٣٣١٢؛ مسند البزار: ٩/ ٣٤٣، ح: ٣٩٠٠؛ سلسلة الاحاديث الضعيفة: ٤٥٠٣۔ [2] ٣٣/الاحزاب: ٤٣۔

تھے۔ پھر حضرت معاویہ اور یزید کو حد درجہ مطعون کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سنیوں نے نمازوں وغیرہ میں بہت سے بدعتیں جاری کیں ان میں سے ایک جمعہ کے دوسرے خطبہ میں صحابہ کی تعریف کی بدعت کا جاری کرنا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ بدعت خلیفہ عباسی منصور باللہ کے زمانہ سے جاری ہوئی جو اب تک چلی جا رہی ہے۔

امام ابن تیمیہ نے اس فصل کی تردید میں اپنا پورا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ اس کے ضمن میں بے شمار مسائل زیر بحث آ گئے ہیں جن سے ان کے تبحر علمی اور حاضر جوابی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک ایک چیز کی پندرہ سولہ صورتوں سے تردید کی ہے۔ کتاب کا ایک بہت بڑا حصہ اس فصل کی تردید میں صرف ہوا ہے۔ یہ تردید پہلی جلد کے صفحہ ۱۵۰ سے لے کر تیسری جلد کے صفحہ ۲۴۶ تک چلی گئی ہے۔ یعنی تقریباً ۶۳۴ صفحے اس کی تردید پر خرچ ہوئے ہیں۔ ان تمام مسائل کا یہاں سمیٹنا بہت مشکل ہے۔ البتہ ہم اس کے بعض اہم مباحث کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

صحابۂ کرام خیر الامم تھے

شیعوں کو حضرت علی اور ان کے آل کے ساتھ اتنی غلط عقیدت ہے کہ وہ صحابۂ کرام کے فضائل و مناقب پر کبھی غور و فکر بھی نہیں کر سکتے۔ انہیں ہمیشہ ان کے اندر نقائص ہی دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی زندگیوں پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ نہ صرف امت محمدی میں سب سے بہتر تھے۔ بلکہ دنیا بھر کی قوموں میں بھی سب سے افضل تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

فمن استقر اخبار العالم فی جمیع الفرق تبین له انه لم یکن قط طائفة اعظم اتفاقا علی الهدی والرشد وابعد عن الفتنة والتفرق والاختلاف من اصحاب رسول اللّٰه ﷺ۔ [1]

پس جو بھی تمام فرقوں کے متعلق دنیا کے حالات کا تتبع کرے گا اس کو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں سے بڑھ کر رشد و ہدایت پر متفق اور فتنہ و تفرق و اختلاف سے دور ہرگز کوئی دوسرا فرقہ نہیں رہا۔

---

[1] منهاج السنة: ۳/ ۲٤۱۔

ان کے اندر بشریت کے تقاضے سے کچھ کوتاہیاں بھی تھیں مگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ ہے سیرت اور کردار کے لحاظ سے دنیا کی کوئی قوم بھی ان کا ہم پلہ نہیں ہوسکتی۔ اگر ان کی زندگی میں کہیں کہیں ہلکے سے دھبے اور داغ نظر آتے ہیں تو اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ سفید کپڑے میں سیاہی کی کچھ چھینٹیں پڑی ہوئی ہوں۔ ان عیب چینوں کو یہ چھینٹیں تو نظر آتی ہیں مگر کپڑے کی سفیدی انہیں نظر نہیں آتی۔ اس کے برخلاف دوسری قوموں کا پورا نامۂ اعمال سیاہ ہے اس میں کہیں کہیں نیکیوں کی سفیدی نظر آتی ہے۔ (ایضاً صفحہ: ۲۴۲) یہ شیعہ یہود و نصاریٰ کی تعریف کرتے ہیں اور ان سے دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ لیکن انہیں مومنین سابقین سے دلی عداوت اور نفرت ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں بدترین لوگ کون ہیں تو ان کا متفقہ جواب صحابہ کے متعلق ہوگا۔ اگر ان کے اس نظریہ کو مان لیا جائے تو یہ آنحضرت کی رسالت پر سب سے بڑا داغ ہے۔ کیونکہ اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کامیاب نہیں ہوسکی۔ آپ نے ایک ایسی امت پیدا کی جس کی ایک کثیر تعداد حق کے صحیح راستے کو چھوڑ کر باطل کی پیروی کرتی رہی۔ آپ کو آیندہ ہونے والے بہت سے واقعات کا علم دیا گیا تھا تو کیا آپ کو اتنی سی بات معلوم نہ ہوسکی کہ آپ کے بعد آپ کے بہترین ساتھی آپ کے راستے سے منحرف ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ پہلے ہی سے اس کی خبر کر دیتے تاکہ عام لوگ ان کو خلیفہ یا امام نہ بنائیں۔ جس شخص سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کا دین دنیا کے تمام دینوں پر غالب ہوگا۔ اس کے اولین پیرؤوں کے متعلق یہ کیونکر گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہو جائیں گے۔ [1]

امام ابن تیمیہ نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ آج مسلمانوں میں ایمان و اسلام، قرآن مجید علوم و معارف اور عبادات کی جو بھی دولت موجود ہے وہ ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی برکت سے ہے۔ انہوں نے کفار پر غلبہ حاصل کیا اور اللہ کا کلمہ بلند کیا اور دین کی تبلیغ کی۔ انہوں نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا پس جو کوئی بھی اللہ پر ایمان لائے گا اس پر قیامت تک صحابۂ کرام کا

---

[1] منهاج السنه: ٤/ ١٢٣۔

احسان باقی رہے گا۔شیعوں وغیرہ میں جو کچھ بھی خیر پایا جاتا ہے وہ انہی صحابہ کی برکت سے ہے اور صحابہ کے اندر جو کچھ بھی خیر پایا جاتا ہے وہ خلفائے راشدین ہی کی برکت سے ہے کیونکہ وہی تمام صحابہ کے اندر دین و دنیا کی بھلائی کو قائم کرنے والوں میں سے تھے۔جب حالت یہ ہو تو پھر یہ خلفاء کیونکر شر کے پیرو قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ [1]

منہاج الکرامہ کے مصنف نے اس بات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہشام بن محمد بن السائب الکلبی نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔(ایضاً صفحہ:۱۹) جس میں صحابہ کے مثالب گنائے ہیں۔مگر اہل بیت کے افراد میں سے کسی ایک کے متعلق بھی کسی منقصت کا ذکر نہیں کیا ہے۔کلبی کے متعلق اہل علم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ جھوٹا تھا۔امام احمد، دارقطنی، ابن عدی، زائدہ، لیث، سلیمان التیمی، یحیٰی اور ابن حبان وغیرہ نے اسکو بے سرو پا روایتوں کا بیان کرنے والا قرار دیا ہے۔صحابہ کی بعض لغزشوں کو بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے اور ان کی بنا پر ان کو مطعون کیا ہے۔منہاج الکرامہ کا مصنف صحابہ میں تو ہر قسم کا نقص نکالتا ہے مگر اپنے شیخ خواجہ نصیر الدین طوسی کی تعریف کرتا ہے جس کی اسلام اور مسلمان دشمنی آشکارا تھی۔اسی لیے امام موصوف بہت تیز ہو کر لکھتے ہیں: تعجب تو یہ ہے کہ یہ جھوٹا اور افترا پرداز رافضی مصنف ابوبکر و عمر اور عثمان اور دوسرے مومنین و متبعین اور اہل علم و دین ائمہ مسلمین کے متعلق تو بہت بڑی افترا پردازیوں سے کام لیتا ہے جن کو وہ اور اس کے بھائی مل کر تراشتے ہیں اور اس کی تعریف کرتا ہے جس کی اللہ اور رسول کے ساتھ دشمنی مسلمانوں کے نزدیک مشہور تھی وہ اپنے شیخ کو شیخنا الامام الاعظم اور قدس اللہ روحہ کے الفاظ سے یاد کرتا ہے جس کے متعلق خود اس کی گواہی یہ ہے کہ وہ اور اس کے جیسے لوگ کافر ہیں، مگر خیار مومنین اولین و آخرین پر لعنت بھیجتا ہے۔ [2]

خلیفہ رسول اللہ کون ہیں؟

منہاج الکرامہ کے مصنف نے بڑے ہی طنز کے ساتھ لکھا ہے کہ سنیوں نے ابوبکر کو تو خلیفہ رسول اللہ کا لقب دیا۔لیکن امیر المومنین علی بن ابی طالب کو مختلف مواقع پر آپ کی جانشینی کرنے کے باوجود یہ لقب نہیں دیا۔اس کا کہنا یہ ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت

---

[1] ایضاً: ۳/ ۲۴۵۔ [2] منہاج السنۃ:۲/ ۱۰۰۔

علی نے مدینہ منورہ میں آپ کی جانشینی کی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

((ان المدینة لا تصلح الا بی او بك اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هٰرون من موسٰی الا انه لا نبی بعدی)) [1]

''بے شک مدینہ میرے یا تمہارے سوا کسی اور کے لیے ٹھیک نہیں ہوسکتا۔ کیا تم کو یہ پسند نہیں ہے کہ میرے لیے تمہاری وہی حیثیت ہو جو حیثیت ہارون کو موسیٰ کے نزدیک حاصل تھی۔ مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔''

اس مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ پہلے اسامہ کو لشکر کا امیر مقرر کیا تھا۔ جس میں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ اس کے باوجود اسامہ کو خلیفہ نہیں کہا گیا جب ابوبکر والی بنائے گئے تو اسامہ کو غصہ آ گیا اور انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے امیر بنایا ہے اور مجھے اس عہدے سے معزول نہیں کیا ہے تو پھر تم کون ہوتے ہو مجھ پر خلافت کرتے۔ ابوبکر اور عمر دونوں ان کے ساتھ پیدل چلتے رہے یہاں کہ کہ اسامہ کو راضی کیا اور پھر یہ دونوں مرتے دم تک ان کو امیر کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

امام موصوف اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی کو خلیفہ دو معنی کر کے بولا جاتا ہے ایک یہ کہ کوئی کسی کی موت کے بعد خود ہی جانشین ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ مرنے والا کسی کو اپنے بعد اپنا جانشین کر جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان دونوں معنی کے لحاظ سے خلیفہ تھے۔ پہلی صورت تو بالکل واضح ہے۔ جس سے خود شیعہ کو بھی انکار نہیں ہے۔ کیونکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے امیر اور والی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوئے تھے۔ اب رہی دوسری صورت جس کے متعلق شیعہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین بنایا تھا اور سنی یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تھا۔ سنیوں کے دعویٰ کے ساتھ ایک ثبوت بھی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت نے اپنی وفات سے پہلے اصرار کے ساتھ حضرت ابوبکر کو نمازوں کے لیے امام

---

[1] مذکورہ حدیث کا ابتدائی حصہ ''ان المدینة لا تصلح الا بی او بك'' موضوع اور من گھڑت ہے جیسا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے وضاحت کر دی ہے۔ بقیہ حدیث بخاری و مسلم میں موجود ہے جس کی تخریج آگے آ رہی ہے۔

مقرر کیا تھا اور یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ آیندہ مسلمانوں کے امیر امام اور خلیفہ بھی وہی ہوں۔ مگر شیعوں کے دعوے کے ساتھ کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی معاملے کے لیے اپنا جانشین بنایا ہو۔

اب رہا زندگی میں کسی کو جانشین بنانا تو یہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتوم، عثمان بن عفان، عتاب ابن اسید اور بہت سے اکابر مہاجرین و انصار کو مختلف غزوات میں اپنا جانشین بنایا تھا۔ زندگی میں ضرورت کے لحاظ سے جانشین بنایا جاتا ہے۔ اس کے لیے جانشین کا سب سے افضل ہونا ضروری نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو بار بار حضرت علی ہی کو جانشین بنایا جاتا۔ غزوۂ تبوک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانشینی کوئی مدح و تعریف کی بات نہیں تھی بلکہ عام لوگوں کی نظر میں تنقیص کے قابل تھی۔ کیونکہ اس لڑائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو پیچھے رہ جانے کی اجازت نہیں دی تھی جو بھی پیچھے رہ گیا تھا وہ منافق سمجھا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ پیچھے رہ جانے والے تین پرخلوص صحابیوں پر بھی سخت ترین عتاب ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تمام ساتھیوں نے ان کا مقاطعہ کیا۔ اور جب ان تینوں نے انتہائی ندامت محسوس کی تو ان کی توبہ قبول ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانشینی مجبوری کی بنا پر تھی۔ وہ خود اس لڑائی میں پیچھے رہ جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اہل و عیال اور دوسرے چند معذور مسلمانوں کی نگہبانی کے لیے اپنا جانشین بنایا تو حضرت علی روتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کیا آپ مجھ کو عورتوں اور بچوں کے ساتھ چھوڑے جاتے ہیں۔ اس پر آپ نے تسلی دی اور فرمایا: ''کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے کہ میرے پاس تمہاری وہی حیثیت ہو جو حضرت ہارون علیہ السلام کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس تھی۔''[1] اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کمال استخلاف پر کوئی دلیل نہیں لی جا سکتی۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، ح: ۳۷۰۶، صحیح مسلم: ۲٤۰٤ (٦٢١٧)

اس حدیث کے ساتھ جو ٹکڑا ملایا گیا ہے وہ بالکل موضوع ہے کسی اہلِ علم نے بھی اس کو روایت نہیں کیا ہے۔ اس کا موضوع ہونا صرف اس ایک بات سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کئی مرتبہ مدینہ سے باہر لڑائیوں وغیرہ پر نکلے جن میں حضرت علی بھی آپ کے ساتھ تھے۔ بدر، فتح مکہ، خیبر، حنین اور طائف کی لڑائیوں میں اور پھر حجۃ الوداع کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں مدینہ سے باہر رہے تو پھر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ مدینہ میرے اور تمہارے سوا کسی اور کے لیے ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ٹکڑا رافضیوں کا بنایا ہوا ہے، جن کو جہالت کی بنا پر ٹھیک طور سے بنانا بھی نہیں آیا۔

حضرت اسامہ کی امامت کے متعلق جو روایت پیش کی گئی ہے وہ بھی غلط ہے۔ غزوۂ تبوک کے سوا کسی اور غزوے میں آنحضرت ﷺ نے سب کو لڑائی پر جانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ بلکہ آپ جہاد کے لیے ابھارتے تھے اور جو جانے پر آمادہ ہوتے ان پر کسی ایک کو امیر بنا دیتے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ امیر سب سے افضل ہو۔ بلکہ بعض مصلحتوں کی بنا پر کسی ایک کو امیر بنایا جاتا تھا۔ چونکہ موتہ کی جنگ میں حضرت اسامہ کے والد زید بحیثیت امیر شہید ہوئے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کا انتقام لینے کے لیے حضرت اسامہ کو امیر مقرر کیا تھا۔ اس فوج میں حضرت ابوبکر وغیرہ شامل نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر آنحضرت ابوبکر کو نمازوں کے لیے امام نہیں بناتے۔ ان کو حضرت اسامہ کی فوج کے ساتھ لڑائی پر جانے کا حکم دیتے۔ آنحضرت ﷺ نے اسامہ کو صرف لشکر کا امیر بنایا تھا۔ تمام مسلمانوں کا امیر نہیں بنایا تھا۔ جب آنحضرت ﷺ کا انتقال ہوا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بحیثیت خلیفہ ہونے کے حضرت اسامہ کو لڑائی کے لیے روانہ کیا۔ ان کے متعلق یہ کہنا کہ انہوں نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ اپنا غصہ ظاہر کیا بالکل جھوٹ ہے۔ جب شیعوں کے قول کے مطابق ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق چھین لیا جن کو بنو ہاشم کی ایک بڑی جمعیت کی تائید حاصل تھی تو پھر جمعیت اور قوت و شوکت کے نہ ہونے کے باوجود حضرت اسامہ کے حق کے چھیننے میں کس کا خوف دامنگیر ہو سکتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کچھ دور تک پیدال حضرت اسامہ کی مشایعت کی تو یہ ان کو راضی کرنے کے

لیے نہیں تھا۔ بلکہ ان کو مفید مشورے دینے اور ان کی ہمت کے بڑھانے کے لیے تھا۔ [1]

امام موصوف نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ خلیفہ سے مراد خلیفۃ اللہ نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں کو گمان ہوا ہے خلیفہ مرنے والے کے جانشین کے لیے استعمال ہوا ہے۔ خدا حاضر اور موجود ہے اور حیی و قیوم ہے اس سے کوئی شخص خلیفۃ اللہ کے لقب سے نہیں پکارا جا سکتا۔ جب کسی نے حضرت ابوبکر کو خلیفۃ اللہ کے لقب سے پکارا تو آپ نے فرمایا: مجھ کو خلیفۃ اللہ نہ کہو بلکہ خلیفۃ الرسول اللہ کہو۔

حضرت معاویہ اور یزید

شیعوں کے نزدیک خاندان بنی امیہ میں سب سے زیادہ مطعون حضرت عثمان، حضرت معاویہ، یزید اور مروان بن الحکم ہیں۔ مصنف منہاج الکرامہ نے حضرت معاویہ کے متعلق لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان پر لعنت کی تھی۔ فرمایا تھا کہ اگر تم معاویہ کو میرے منبر پر دیکھو تو قتل کر دینا، ان پر یہ بھی الزام لگایا گیا ہے کہ فتح مکہ کے وقت وہ یمن میں تھے اور وہاں سے اپنے باپ ابوسفیان کو آنحضرت ﷺ کے متعلق طعن و تشنیع سے بھرا ہوا خط لکھا۔ معاویہ کو طلیق بن طلیق (آزد کے بیٹے آزاد) کے بڑے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ انہوں نے یزید جیسے ناخلف بیٹے کو خلافت کے لیے نامزد کیا جس نے حضرت حسین اور ان کی اولاد کا خون بہایا۔

امام موصوف لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کسی وقت بھی حضرت معاویہ پر لعنت نہیں بھیجی۔ آپ کے زمانے میں وہ کبھی بدنام نہیں رہے۔ فتح مکہ کے وقت وہ یمن نہیں تھے بلکہ مکے میں تھے۔ ان کو منبر پر دیکھو تو قتل کر دو کی حدیث محض جھوٹ ہے۔ معاویہ کو طلیق بن طلیق کے لقب سے یاد کرنا کچھ ان کی مذمت پر دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ لقب کچھ انہیں کے لیے خاص نہیں تھا۔ فتح مکہ کے وقت جن کو آزاد کیا گیا تھا اور جن کے متعلق آپ نے فرمایا تھا: ((اذهبوا فانتم الطلقاء)) [2] ''جاؤ تم سب آزاد ہو۔'' ان کی تعداد تقریباً دو ہزار تھی۔ حضرت ابوسفیان اور حضرت معاویہ کے علاوہ اور بہت سے لوگ تھے جن کے اسلام سے دین اسلام اور مسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچا۔ انہی میں حارث بن ہشام، سہل بن عمرو، صفوان بن

---

[1] منهاج السنة: ٢/ ١٧٥، ١٧٩، ٣/ ١٠، ١٢، ١٣١۔

[2] تاريخ الطبری: ٣/ ٦١، سلسلة الاحاديث الضعيفة، ح: ١١٦٣۔

امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، یزید بن ابی سفیان، حکیم بن حزام، ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب، عتاب بن اسید وغیرہ تھے۔ حضرت یزید بن ابی سفیان اور حضرت معاویہ کا بہتر مسلمانوں میں شمار تھا۔ اگر ان کے اندر واقعی قابلیت اور صلاحیت نہ ہوتی تو ہرگز ہرگز حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو ملک شام کا امیر مقرر نہ کرتے۔ یزید بن ابی سفیان کے بعد حضرت معاویہ بیس سال تک امیر رہے۔ مسلمانوں کے نزدیک ان کی بڑی عزت اور وقعت تھی۔

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ نے اپنے لیے خلافت طلب نہیں کی۔ مگر چونکہ قاتلین عثمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں گھسے ہوئے تھے اور وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ ان ظالموں کے ہاتھوں کہیں ان کا بھی وہی حشر نہ ہو جو حضرت عثمان کا ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے گریز کیا اور ایسا کرنا ان کے لیے جائز تھا۔ اس کے علاوہ حضرت معاویہ نے آگے بڑھ کر لڑائی شروع نہیں کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی ابتدا کی۔ ان کی فوج میں ایسے لوگ تھے جو ان کی ہر بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کے برخلاف حضرت معاویہ کی فوج ان پر جان دیتی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ خیال تھا کہ لڑائی کی وجہ سے ان کا اختلاف ختم ہو جائے گا، مگر لڑائی کا الٹا نتیجہ نکلا۔

اب رہا حضرت عمار بن یاسر کی اس مشہور حدیث ''تقتلك الفئة الباغية'' [1] (تجھ کو باغی جماعت قتل کرے گی) سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرت معاویہ کی جماعت باغی تھی کیونکہ اسی نے حضرت عمار کو قتل کیا تھا ٹھیک نہیں ہے۔ قرآن حکیم کے حکم کے مطابق جب دو مسلمان جماعتوں میں لڑائی ہو تو ان کے درمیان صلح کرانی چاہیے اور جب ان میں سے کوئی ایک جماعت صلح کو نہ مانے اور دوسرے پر حملہ کرے تو پھر عام مسلمانوں کو مظلوم جماعت کی حمایت کرنی چاہیے اور باغی جماعت سے مقابلہ کرنا چاہیے (سورۂ حجرات) اس اصول کے لحاظ سے حضرت معاویہ کی جماعت باغی نہیں ہو سکتی کیونکہ عام مسلمانوں نے ان کے درمیان صلح

---

[1] صحيح بخاری، كتاب الصلاة، باب التعاون في بناء الكعبة، ح: ٤٤٧؛ صحيح مسلم، كتاب الفتن وأشراط الساعة، باب لا تقوم الساعة......ح: ٢٩١٦ (٧٣٢٢)۔

کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے علاوہ حضرت معاویہ نے لڑائی کی ابتدا نہیں کی۔ لڑائی کی ابتداء حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی۔ اس لیے ﴿فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى﴾ ''اگر ان میں سے ایک جماعت دوسری پر بغاوت کرے۔'' کی مصداق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک اجتہادی غلطی ہوئی تھی تو مخالف کو بھی یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ حضرت معاویہ بھی ایک اجتہادی غلطی کی تھی جس کی بنا پر ان کی غلطی معاف ہوگی۔

آپس کی لڑائی کی وجہ سے کسی ایک جماعت کو بھی ایمان کے دائرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لڑائی کے باوجود ان دونوں کو بھی مومن جماعت کے لقب سے تعبیر کیا ہے جو بھی جان بوجھ کر بغاوت کرے گا وہ ضرور گنہگار رہو گا لیکن ان کے گناہوں کی بنا پر ان کی تکفیر یا تفسیق نہیں کی جا سکتی۔ آیندہ بہت سے اسباب اور ذرائع ان کے گناہوں کی بخشش کے نکل آسکتے ہیں۔ جیسے کہ وہ توبہ کر لیں یا ان کی نیکیاں اتنی زیادہ ہوں کہ ان کی برائیوں پر غالب آجائیں۔ یا ان پر اتنی مصیبتیں آپڑیں کہ ان کے گناہ دھل جائیں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی شفاعت کر دیں یا مومنین کی دعاؤں سے ان کے گناہوں کی مغفرت ہو جائے۔ [1]

اب رہی یہ بات کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ناخلف بیٹے یزید کو خلافت کے لیے نامزد کیا تو یہ ان کی ذاتی خواہش تھی۔ عام مسلمان اس سے راضی نہیں تھے۔ البتہ حضرت معاویہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر خلافت کے لیے کسی کو نامزد نہ کیا جائے تو آیندہ اس کے لیے بہت سے جھگڑے ہوں گے۔ یزید ایک نوجوان امیر زادہ تھا۔ اس کے فسق و فجور کی جتنی حکایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ سب جھوٹ ہیں۔ اس کے جھنڈے کے نیچے صحابہ نے جہاد کیا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری قسطنطنیہ کی جنگ میں اس کے ساتھ شریک ہوئے اور شہادت پائی۔ یزید امام حسین کے ساتھ نرمی ہی کا سلوک کرنا چاہتا تھا مگر مفسدوں کی فساد پروری نے حالات کا رخ بدل دیا۔ بہت سے مخلص دوستوں او بزرگوں کے مشورے کے برخلاف امام

---

[1] منهاج السنة: ۲/ ۲۰۱ تا ۲۲٦۔

حسین نے کوفہ کا سفر اختیار کیا اور کوفہ والوں کی بے وفائی کی وجہ سے وہ میدان کربلا میں شہید ہوئے ، اس کی ذمہ داری عبید اللہ بن زیاد اور دوسرے حکام عراق پر عائد ہوتی ہے۔ یزید ان الزامات سے بری ہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے دندان مبارک پر چھڑی سے ٹھوکنے کا واقعہ یزید کی طرف منسوب کرنا غلط ہے۔ بلکہ ابن زیاد نے چھڑی سے دندان مبارک کو ٹھوکا تھا، جس پر حضرت انس رضی اللہ عنہ وغیرہ نے ناپسندیدگی ظاہر فرمائی۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی آل واولاد کے ساتھ بدسلوکی کا واقعہ بھی جھوٹ ہے۔ تاریخ کے صفحات سے ظاہر ہے کہ کسی ہاشمی عورت سے کسی وقت بھی کوئی بدسلوکی روا نہیں رکھی گئی۔ اگر ایسا ہوتا تو خود مسلمان ان کے خلاف بپھر جاتے۔ یزید نے آل حسین کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا اور پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ حضرت زین العابدین علی وغیرہ کو مدینہ منورہ روانہ کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے دلائل

مصنف منہاج الکرامہ نے تیسری فصل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے دلائل دیے ہیں۔ اور اس مسئلہ پر چار حیثیتوں سے بحث کی ہے۔ پہلی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے پانچ عقلی دلیلیں پیش کی ہیں۔ ایک یہ کہ امام کو معصوم ہونا چاہیے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ معصوم تھے۔ دوسری یہ کہ امام کی امامت پر نص ہونی چاہیے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بلاشبہ امام منصوص علیہ تھے۔ تیسری یہ کہ امام شریعت کا محافظ ہوتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شریعت کی حفاظت کی تھی۔ چوتھی یہ کہ اللہ تعالیٰ امام معصوم کے نصب کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور اس نے بلاشبہ حضرت علی اور ان کی اولاد کو امام معصوم بنا کر کھڑا کیا تھا۔ پانچویں یہ کہ امام تمام رعایا میں سب سے افضل ہوتا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بلاشبہ تمام میں افضل تھے۔ دوسری حیثیت کے ماتحت قرآن مجید سے چالیس دلیلیں اور تیسری حیثیت کے ماتحت سنت نبوی سے بارہ حدیثیں پیش کی ہیں۔ چوتھی حیثیت کے ماتحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذاتی احوال سے بحث کی ہے کہ وہ سب سے زیادہ زاہد و عابد اور عالم وفقیہ تھے اور چاروں اماموں کے علوم کا ماخذ آل علی رہے ہیں اور یہ کہ فصاحت و بلاغت اور شجاعت وقوت میں حضرت علی کا کوئی مثیل اور نظیر نہیں تھا۔ انہوں نے غیب کی خبریں دی ہیں۔ ان کی دعا ہمیشہ قبول ہوتی رہی ہے۔ ان سے بہت سی

کرامات کا صدور ہوا ہے۔ دو مرتبہ ان کے حکم سے سورج واپس لوٹ آیا تھا۔ جب کوفہ کی نہر میں طغیانی آئی اور قریوں کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پانی پر لاٹھی ماری جس کی وجہ سے سارا پانی زمین کے اندر بہ گیا اور مچھلیاں اوپر نکل آئیں اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سلام کیا۔

اس فصل کی تردید میں تقریباً ۲۴۰ صفحے خرچ ہوئے ہیں۔ اس مصنف کی ہر ایک دلیل کا مختلف صورتوں میں رد کیا ہے جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اس مصنف کی تمام عقلی اور نقلی دلیلیں کسی معیار پر بھی صحیح نہیں اترتیں۔ قرآن مجید کی آیتوں اور احادیث نبوی میں عموماً تأویل باطل سے کام لیا گیا ہے اور ان کے جو معانی پیش کیے گئے ہیں وہ سیاق سباق کے لحاظ سے ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ مصنف منہاج الکرامہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسلی برتری پر بھی تفاخر کیا ہے۔ جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی۔ حضرت نوح بڑے برگزیدہ نبی تھے۔ مگر ان کے باپ کافر تھے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم ایک جلیل القدر پیغمبر تھے اس کے باوجود ان کے باپ کافر تھے۔ اسلام تقویٰ و طہارت اور پاکیزگی پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ ط﴾ (۴۹/الحجرات:۱۳) ''بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہے۔'' امام موصوف لکھتے ہیں کہ اگر نسلی حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو خلفائے ثلاثہ کی فضیلت کچھ کم نہیں ہوتی۔ ان تینوں کا خاندان بہت ہی عزت مند تھا۔ اگر نسبی قرابت کا معاملہ ہو تو چچا زاد بھائی سے زیادہ چچا فضیلت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں آپ کے دونوں چچا حضرت حمزہ اور حضرت عباس افضل ہوتے۔ اگر چچا زاد بھائیوں کا خیال کیا جائے تو اور بہت سے چچا زاد بھائی بھی جو حضرت عباس کی اولاد سے ہیں قابل تعریف ٹھہرتے ہیں۔ اگر قرابتداروں کا ایمان لانا کسی کی فضیلت کا موجب بن سکتا ہے تو اس حیثیت سے حضرت ابوبکر کو بھی فضیلت حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ حضرت ابوبکر کے والد بھی مسلمان ہو گئے تھے اس کے برخلاف حضرت علی کے والد ابوطالب اسلام نہیں لائے۔ حضرت ابوبکر کی ماں اور ان کی ساری اولاد مسلمان ہو گئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کی لڑکی عائشہ سے شادی

کی جو سب بیویوں میں ممتاز اور محبوب تھیں۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت کے داماد ہونے کا رشتہ تھا تو حضرت عثمان کو بھی اس سے زیادہ دامادی کا شرف حاصل تھا کیونکہ انہوں نے آنحضرت کی دو لڑکیوں سے یکے بعد دیگرے شادی کی۔ اس لحاظ سے حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کسی لحاظ سے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کم ثابت نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان سب پر فضیلت دینا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

بارہ اماموں کی امامت

مصنف منہاج الکرامہ نے چوتھی فصل میں تین صورتوں سے بارہ اماموں کی امامت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ پہلی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسین کو مخاطب کر کے فرمایا: ''یہ امام کے لڑکے امام اور ایک امام کے بھائی امام ہیں اور نو ہونے والے اماموں کے باپ ہیں۔ ان میں سے آخری امام کا نام میرے نام پر ہوگا اور اس کی کنیت میری کنیت ہوگی وہ زمین کو جور و ظلم کے بھر جانے کے بعد پھر عدل و انصاف سے بھر دے گا۔'' دوسری یہ کہ ہر زمانے میں ایک امامِ معصوم کا ہونا واجب ہے، اور سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ ان بارہ اماموں کے علاوہ کوئی دوسرا معصوم نہیں ہے۔ تیسری یہ کہ ان بارہ اماموں میں اتنے فضائل ہیں کہ ان کی وجہ سے ان کی امامت ثابت ہو جاتی ہے۔

پہلی صورت کے متعلق جو حدیث پیش کی گئی ہے وہ ان شیعوں کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ حدیث صرف اثناعشریہ کے نزدیک صحیح مانی جا سکتی ہے۔ اسماعیلیہ اور زیدیہ اس کو صحیح نہیں مان سکتے۔ آخری امام کو قائم الزمان مانا جاتا ہے اور اس کا تصور مہدی کے تصور سے ماخوذ ہے جس کے متعلق صحاح ستہ میں حدیثیں موجود ہیں مگر ان حدیثوں میں یہ ہے کہ اس مہدی کا نام آنحضرت کے نام کے مطابق ہوگا اور ان کے والد کا نام بھی آنحضرت کے والد جیسا ہوگا اور وہ شخص آپ کی نسل سے ہوگا۔ شیعہ جس کو قائم الزمان مانتے ہیں وہ محمد بن الحسن ہیں۔ ان کا نام تو آنحضرت کے نام کے مطابق ہے۔ مگر ان کے والد کا نام عبداللہ نہیں ہے۔ اس لیے سنیوں کی اس حدیث سے کوئی استدلال لینا دراصل لوگوں کو دھوکہ دینا ہے۔ ان بارہ اماموں کی

معصومیت کا دعویٰ بھی ایک بلا دلیل دعویٰ ہے۔ کسی کے اندر محض فضائل کے ہونے سے کوئی شخص امام بن نہیں جاتا تاوقتیکہ وہ لوگوں کی جانب سے امام مقرر نہ کیا جائے۔ مثلاً ایک شخص میں قاضی بننے کی اہلیت ہوتی ہے۔ صرف اس اہلیت کے ہونے سے وہ قاضی نہیں بن جاتا تاوقتیکہ حکومت یا کسی اور کی جانب سے قاضی نہ بنایا جائے۔ اسی طرح محض امام بننے کی اہلیت رکھنے کی بنا پر لوگ امام تسلیم نہیں کیے جاسکتے تاوقتیکہ ان کو امام نہ بنایا جائے اور انہیں امامت کے اختیارات حاصل نہ ہوں اور ہر ایک اس بات کو جانتا ہے کہ دنیا میں عدل وانصاف کے قائم کرنے کا انہیں کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ آخری امام محمد بن الحسن سے تو کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور نہ آیندہ فائدہ پہنچنے کی کوئی توقع ہے تو پھر ان کے متعلق یہ کیونکر دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ وہ دنیا میں جور وظلم سے بھر جانے کے بعد عدل وانصاف کو قائم کریں گے؟

حضرت علی سے پہلے کے خلفا امام نہیں تھے

مصنف منہاج الکرامہ نے پانچویں فصل میں اس پر بحث کی ہے کہ حضرت علی سے پہلے کے تینوں خلیفے امام نہیں تھے۔ کیونکہ ان لوگوں نے خود ہی اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا اعتراف کیا ہے حضرت ابوبکر کو خود ہی اپنی خلافت کے حق ہونے کا یقین نہیں تھا۔ اسی لیے وہ اکثر اپنی وفات کے وقت افسوس ظاہر کیا کرتے تھے کہ کیوں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں رائے نہیں لے لی۔ حضرت عمر کو آنحضرت کی وفات پر یقین نہیں آسکا تھا اسی لیے وہ ننگی تلوار لے کر کھڑے ہو گئے تھے۔ نیز انہوں نے رمضان کے مہینے میں تراویح کی بدعت جاری کی۔ حضرت عثمان نے اپنے زمانے میں ایسے کام کیے جن کا کرنا جائز نہیں تھا۔

امام موصوف نے ان میں سے ہر ایک الزام کا شافی جواب دیا ہے۔ اس مصنف نے خلفائے ثلاثہ کے محاسن کو بھی برائیوں میں شمار کیا ہے۔ سچ ہے:

فعين الرضا عن كل عيب كليلة
كما ان عين السخط تبدى المساويا

''پس رضامندی کی آنکھ ہر عیب سے تھکی ہوئی ہوتی ہے اور اس کی پردہ پوشی کرتی ہے جس طرح غصہ کی آنکھ برائیوں کو چن کر بتاتی ہے۔''

غیر معمولی ذمہ داریوں کا دلی احساس انسان کو بہت ہی متواضع اور خاکسار بنا دیتا ہے۔
اس لیے وفات کے وقت اس کی زبان سے ایسے فقرے اور جملے نکلتے ہیں کہ کاش میری ماں مجھے نہ جنی ہوتی! اور کاش میں نے اس ذمہ داری کو اپنے سر نہ لیا ہوتا! ۔ اس قسم کے فقرے اور جملے اس کے شک پر دلالت نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کی ذمہ داری کے غیر معمولی احساس کو ظاہر کرتے ہیں۔ مصنف منہاج الکرامہ نے حضرت ابوبکر کے متعلق بہت سی سنی روایتیں توڑ مروڑ کر پیش کی ہیں۔ اگر یہ صحیح بھی ہوں۔ تب بھی حضرت ابوبکر کی تنقیص پر دلالت نہیں کرتیں۔ بلکہ ان کی فطری خوبیوں کو ظاہر کر رہی ہیں۔

اسی طرح حضرت علی کے سب سے بڑھ کر عالم ہونے کا دعویٰ بھی غلط ہے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر زیادہ حق شناس تھے۔ چند مسائل میں حضرت علی کی رائے کا ٹھیک ہو جانا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ بہت سے مسائل میں حضرت علی سے کم درجہ کے صحابہ کی رائے ٹھیک نہیں تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ حضرت علی سے بڑھ کر جاننے والے تھے۔

حضرت عثمان کے متعلق جس قسم کے الزامات لگائے جاتے ہیں اسی قسم کے الزامات حضرت علی پر بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ اگر حضرت عثمان کے عمال خائن اور نافرمان تھے تو حضرت علی کے عمال بھی کچھ کم خائن اور نافرمان نہیں تھے۔ بعض نے حضرت علی کو چھوڑ کر حضرت معاویہ کی رفاقت اختیار کی۔ حضرت علی نے زیاد ابن ابی سفیان کو عامل بنایا جس کے ناخلف بیٹے عبیداللہ بن زیاد نے حضرت حسین کو قتل کرایا۔ حضرت علی نے اشتر نخعی اور محمد بن ابی بکر کو عامل بنایا حالانکہ حضرت معاویہ ان سے بہتر تھے۔ اگر حضرت عثمان نے اپنے رشتہ داروں کو عامل مقرر کیا تھا تو حضرت علی نے بھی اپنے رشتہ داروں مثلاً حضرت عباس کے دونوں لڑکے عبداللہ اور عبیداللہ اور اپنے ربیب محمد بن ابی بکر کو عامل بنایا۔ [1]

اس کے علاوہ حضرت عثمان نے اپنی ولایت و خلافت کے استحقاق کے بارے میں کسی سے لڑائی نہیں کی بلکہ خود محصور ہو کر شہادت پائی۔ اس کے برخلاف حضرت علی نے جنگ کی

[1] منہاج السنۃ: ۳/ ۱۷۳۔

اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ مارے گئے۔ ان کی خلافت کے زمانے میں نہ تو کافروں کے ساتھ کوئی جہاد ہو سکا اور نہ کوئی ملک فتح کیا گیا۔ ان کے زمانے میں مسلمانوں کی کچھ زیادہ بھلائی نہیں ہو سکی۔ حضرت عثمان کے عمال حضرت علی کے عمال کے بہ نسبت زیادہ مطیع اور فرمانبردار تھے۔ اگر بنی امیہ سے عمال کا تقرر کوئی جرم کی بات ہے تو یہ جرم (نعوذ باللہ) خود آنحضرت سے سرزد ہوا تھا۔ کیونکہ آپ نے بنی امیہ کے بہت سے قابل افراد کو اپنی زندگی میں عامل مقرر کیا تھا۔ مثلاً عتاب ابن اسید بن ابی العاص بن امیہ کو مکے کا، ابوسفیان بن حرب بن امیہ کو نجران کا، خالد بن سعید بن العاص کو صنعاء یمن کا، عثمان بن سعید بن العاص کو تیاء و خیبر کا اور ابان بن سعید بن العاص کو بحرین کا عامل مقرر کیا تھا۔ اس کے برخلاف آنحضرت نے بنو ہاشم سے حضرت علی کے سوائے کسی اور کو عامل مقرر نہیں کیا تھا۔ [1]

حضرت ابو بکر کی امامت

مصنف منہاج الکرامہ نے چھٹی فصل میں ان دلائل کی تردید کی ہے جو سنیوں کی طرف سے حضرت ابوبکر کی خلافت کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں اور واقعی عجیب وغریب گلکاریاں کی ہیں۔ اس سے مصنف کے دل کا کھوٹ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سنیوں کی طرف سے حضرت ابوبکر کی امامت پر اجماع کا دعویٰ غلط ہے۔ کیونکہ بنو ہاشم کی ایک جماعت اور صحابہ کی ایک بڑی تعداد مثلاً سلیمان، ابوذر، مقداد، عمار، حذیفہ، سعد بن عبادہ، زید بن ارقم، اسامہ بن زید، خالد بن سعید بن العاص وغیرہ نے ان کو خلیفہ نہیں مانا، یہاں تک کہ حضرت ابوبکر کے والد نے بھی اس کو تسلیم نہیں کیا۔ جب یہ خلیفہ منتخب ہوئے تو حضرت ابوبکر کے والد نے لوگوں سے پوچھا کہ دونوں کمزور آدمی یعنی حضرت علی اور حضرت عباس کیا کر رہے تھے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ دونوں آنحضرت کی تجہیز و تکفین میں لگے ہوئے تھے اور لوگوں نے تمہارے لڑکے کو بڑی عمر والے ہونے کی بنا پر خلیفہ بنالیا۔ بنو حنیفہ نے بھی ان کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ اسی غصہ میں حضرت ابوبکر نے انہیں مرتد قرار دے کر ان سے جنگ کی۔ ان کو قتل کیا اور ان کے بہت سے لوگ گرفتار کر لیے اور ان کو غلام اور لونڈی

---

[1] منهاج السنة: ٣/ ١٧٦۔

بنایا۔حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کے اس طرز عمل کو سخت ناپسند کیا اور پھر اپنے زمانے میں ان سب کو آزاد کرادیا۔

بنوحنیفہ کو اہل اجماع میں شریک کرنا واقعی غیر معمولی جرأت کی بات ہے۔ یہ قوم وہ ہے جس نے آنحضرت کی زندگی ہی میں مسیلمہ کذاب کا ساتھ دیا۔ جب مصنف ایسی مرتد قوم کو مسلمان شمار کرسکتا ہے تو پھر خود اس مصنف کے ایمان واسلام کے متعلق فیصلہ کرنا بہت آسان ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ لوگ مسلمان تھے تو پھر حضرت علی نے اس قوم کی ایک لونڈی حنیفہ کو جس کے بطن سے محمد بن الحنفیہ تھے کیونکر لونڈی کی حیثیت سے قبول کیا۔تعصب اور جہالت کی وجہ سے قابل اور لائق مصنف کو اتنا محسوس نہیں ہوسکا کہ جو تیر حضرت ابوبکر کے خلاف چلا رہا ہے اس کا نشانہ حضرت علی بن جاتے ہیں۔ باقی رہا بنو ہاشم اور اکابر صحابہ کا تسلیم نہ کرنا تو یہ سفید جھوٹ ہے۔سعد بن عبادہ کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا۔حضرت ابوبکر کے والد کے متعلق جو روایت بیان کی گئی ہے وہ بھی جھوٹی ہے۔حضرت ابوبکر کے بڑی عمر والے ہونے کا ادعا بھی غلط ہے۔کیونکہ صحابہ میں بہت سے لوگ ان سے بھی بڑی عمر کے تھے۔مثلاً حضرت عباس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑے تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر سے بھی بڑے تھے۔

اس مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اجماع کوئی دلیل نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ اس پر عقلی اور نقلی دلیل موجود نہ ہو،حضرت ابوبکر کی امامت پر کوئی عقلی دلیل موجود نہیں ہے۔ اس کے لیے نقلی دلیل بھی موجود نہیں ہے کیونکہ خود سنیوں کو اعتراف ہے کہ آنحضرت نے اپنی رحلت کے وقت کسی کے لیے وصیت نہیں کی اور پھر اجماع اس وقت معتبر ہوسکتا ہے جبکہ پوری امت متفق ہو اور یہ سب کو معلوم ہے کہ پوری امت کبھی متفق نہیں ہوسکی تھی۔اس کے علاوہ سنی اعتراف کرتے ہیں کہ آنحضرت کے سوا کوئی معصوم نہیں ہے تو پھر اجماع کا فیصلہ کس طرح غلطی اور خطا سے خالی ہوسکتا ہے۔

اس مصنف نے قصداً خلط مبحث سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔امام ابن تیمیہ نے ان دلائل کا تفصیلی رد کیا ہے۔اگر مصنف کے ان اصولوں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت جانچی

جائے تو کسی حالت میں بھی ان کی امامت ثابت نہیں ہو سکتی۔

سنی حضرت ابوبکر الصدیق کی معیت اور صحبت کو بطور دلیل خلافت کے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ رہے۔ ہجرت کے وقت آپ کے رفیق سفر رہے، غار میں آپ کے ساتھ تھے جس کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تعریف کی ہے۔ بدر کے موقع پر آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ مدنی زندگی میں آپ بحیثیت وزیر اور مشیر کام کرتے رہے اور جب آنحضرت سخت بیمار ہوئے تو حضرت ابوبکر کو امام مقرر فرمایا۔ یہ ایسے تاریخی واقعات ہیں جن کی صداقت میں دشمنوں تک کو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ مگر مصنف منہاج الکرامہ کو ہر ایک واقعہ میں نقص کا پہلو دکھائی دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آنحضرت نے ان کو اپنے ساتھ اس لیے رکھا کہ وہ ان کی نظر کے سامنے رہیں اور کوئی شر و فتنہ پیدا نہ کر سکیں۔

امام موصوف لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کے بارے میں اس قسم کی تنقیص درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے ہی دشمن کو اپنے ساتھ رکھے۔ جبکہ اس کو اچھی طرح یہ معلوم بھی ہو کہ وہ اس کا دشمن ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ آنحضرت کی طرف اس قسم کی جہالت و غباوت کی نسبت کی۔ [1] اس مصنف کے ممدوح اولجایتو خدابندہ نے بھی اس بات کو تسلیم نہیں کیا اور فوراً اس کی تردید کر دی۔ [2]

مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ جب دشمن غار کے قریب آ پہنچے تو حضرت ابوبکر اپنے ایمان کی کمزوری کی بنا پر گھبرا گئے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسکین دی اور کہا: ''تم غم نہ کرو! بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' [3] امام موصوف لکھتے ہیں کہ حزن اور خوف ایمان کی کمزوری کی علامت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ انبیاء کے لیے بھی استعمال کیے ہیں جو ایمان کے لحاظ سے سب سے زیادہ کامل اور مکمل تھے۔ خدائے تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہتا ہے: ﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝۱۲۷﴾ ''ان پر غم نہ کرو اور اس چیز کی بنا پر جس سے وہ مکر کرتے ہیں تنگی میں مت رہو۔''

---

[1] منھاج السنۃ: ٤/ ٢٥٥۔ [2] ایضًا: ٢٥٦۔ [3] صحیح بخاری، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی بکر، ح: ٢٣٨١۔

اس جگہ امام موصوف نے معیت اور صحبت کے متعلق ایک نفیس بحث کی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ [1] مصنف اور عام شیعوں کی اس قسم کی بے سروپا ہفوات کو دیکھ کر امام موصوف اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ تشیع کفر اور نفاق کی دہلیز ہے۔(۲۷۱)

اس مصنف نے یہ بھی طعنہ دیا ہے کہ حضرت ابوبکر کی مالی امداد و اعانت کے واقعات جھوٹ ہیں۔ کیونکہ وہ کبھی مالدار نہیں رہے۔ ان کے والد ابوقحافہ فقیر تھے اور عبداللہ بن جدعان کی طرف سے ان کی روزی مقرر تھی۔ جاہلیت کے زمانے میں ابوبکر چھوٹے بچوں کو پڑھانے کی خدمات انجام دیتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد کپڑوں کا سینا ان کا پیشہ رہا۔ جب خلیفہ بنائے گئے تو مسلمانوں نے ان کے لیے روزانہ تین درہم مقرر کیے۔

مصنف درحقیقت کھلے تاریخی واقعات پر پانی پھیرنے کی بے سود کوشش کر رہا ہے۔ اگر وہ مالدار نہیں تھے تو انہوں نے بلال اور عامر بن فہیرہ جیسے سات مظلوم مسلمانوں کو بڑے داموں پر خرید کر کس طرح آزاد کرایا اگر وہ فقیر تھے تو کس طرح انہوں نے اتنے بڑے کنبہ کی پرورش کی اور یتیموں اور غلاموں تک کا بوجھ اٹھایا اگر وہ یتیموں اور بیواؤں کے ہمدرد نہ ہوتے تو ابن الدغنہ کیوں ان کو مکہ واپس لے آتا اور یہ کہتا کہ تمہارا جیسا شخص مکہ سے نکالا نہیں جاسکتا۔ حضرت ابوبکر تاجر تھے اور تجارت کے ذریعے مال کماتے تھے اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ کیا کرتے تھے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: ''کسی کا مال مجھے اتنا فائدہ نہیں پہنچا سکا جتنا کہ ابوبکر کے مال سے فائدہ پہنچا ہے۔'' [2] اب رہا حضرت ابوقحافہ کے متعلق روایت تو یہ بالکل جھوٹ ہے۔ کسی کتاب سے بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

مصنف منہاج الکرامہ نے اپنے نغمہ بیجا کی آخری تان اس پر توڑی ہے کہ آنحضرت کی جگہ پر حضرت ابوبکر کو نماز کے لیے بڑھانا ایک جرم تھا وہ لکھتا ہے کہ جب بلال نے اذاں دی تو عائشہ کے حکم سے حضرت ابوبکر کو آگے بڑھا دیا گیا اور جب آنحضرت ﷺ ہوش میں آئے اور تکبیر کی آواز آپ کے گوش مبارک میں پہنچی تو آپ نے دریافت کیا کون نماز پڑھا رہا ہے۔ جب لوگوں نے حضرت ابوبکر کا نام لیا تو آپ فوراً حضرت علی اور حضرت عباس کے سہارے

---

[1] ایضًا: ۲۶۶۔ ۲۷۱۔ [2] مسند احمد: ۱۴/ ۳۹۴، ح: ۸۷۹۰۔

مسجد میں چلے آئے اور حضرت ابو بکر کو قبلہ سے ہٹا کر اور ان کو معزول کر کے خود ہی امامت کی۔

اتنا بڑا سفید جھوٹ وہی کہہ سکتا ہے جو یا تو خود دھوکے میں ہو یا دوسروں کو قصداً دھوکہ دینا چاہتا ہو۔ مصنف کی عبارت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر نے حضرت کی بیماری کے زمانے میں صرف ایک ہی مرتبہ نماز پڑھائی حالانکہ حضرت ابو بکر نے ایک ہفتہ سے زیادہ دنوں تک نماز پڑھائی ہے کیونکہ آپ جمعرات کے دن سے دوسرے ہفتہ کے پیر کے دن تک یعنی بارہ دن بیمار رہے۔ اس مرض الموت میں حضرت ابو بکر کے سوا کسی اور نے نماز نہیں پڑھائی۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ نمازیں آنحضرت کی اجازت اور ان کی اطلاع کے بغیر نہیں ہوسکتیں۔

دوسری جمعرات کو آپ نے دوات قلم اور کاغذ اسی لیے منگوایا تھا کہ حضرت ابو بکر کی خلافت کے لیے پروانہ لکھ دیں۔ مگر جب لوگ آپس میں تکرار کرنے لگے تو آپ نے فرمایا: ''چھوڑ دو میری امت خود اس بات کا فیصلہ کر لے گی۔'' چنانچہ امت نے حضرت ابو بکر کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

امام ابن تیمیہ نے یہ ٹھیک لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی خلافت آنحضرت ﷺ کے کمال نبوت و رسالت کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ اگر آپ کے بعد آپ کے قریبی رشتہ دار خلیفہ ہو گئے ہوتے تو آج دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ آپ نے اپنے خاندانی اقتدار کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ آپ نبی اور رسول تھے بادشاہ یا شہنشاہ نہیں تھے، اس لیے آپ نے انبیا کا اسوہ اختیار کیا۔ چنانچہ امام موصوف لکھتے ہیں۔

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی خلافت محمد ﷺ کے کمال نبوت و رسالت پر دلالت کرتی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ایک برحق رسول تھے۔ ایک بادشاہ نہیں تھے۔ کیونکہ بادشاہوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی ولایات کی نگہبانی کے لیے دوسروں کی بجائے اپنے قریبی رشتہ داروں کو عامل مقرر کرتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے ان کی سلطنت قائم رہے۔ بنو بویہ اور بنو سلجوق اور مشرق و مغرب اور شام و یمن کے بادشاہوں کا بھی دستور ہے۔ اہل کتاب اور مشرکین بادشاہوں کا بھی یہ وطیرہ ہے جیسا کہ فرنگی بادشاہوں اور چنگیز خاں کی اولاد کا حال ہے۔ بادشاہت انہی کے قرابت داروں میں باقی رکھی جاتی ہے اور یہ کہا جاتا

ہے کہ فلاں ہڈی سے ہے اور یہ فلاں ہڈی سے نہیں ہے یعنی فلاں بادشاہ کا قریبی رشتہ دار ہے اور فلاں ایسا نہیں ہے۔ حالت اگر ایسی ہوتو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے چچا حضرت عباس اور چچا زاد بھائی حضرت علی اور حضرت عقیل اور ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب یا ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب اور عبدمناف کی تمام اولاد کو چھوڑ کر جو قریش میں سب سے زیادہ عزت مند اور آنحضرت سے قریبی رشتہ رکھتے تھے جیسے کہ عثمان بن عفان، خالد بن سعید بن العاص، ابان بن سعید بن العاص وغیرہ تھے، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو والی بنایا۔ اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے۔ بادشاہ نہیں تھے کیونکہ انہوں نے خلافت کیلئے ایسے لوگوں کو آگے نہیں بڑھایا جو نسب کے لحاظ سے قریب یا آپ کے خاندان کی نسبت سے شرافت پائے ہوئے تھے بلکہ ایمان اور تقوے کو آگے بڑھایا اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے پیرو اللہ کے پرستار تھے اور اسی کا حکم مانتے تھے وہ دوسروں کی طرح زمین میں سربلندی نہیں چاہتے تھے انہیں اس سلطنت کی بھی خواہش نہیں تھی جو پہلے انبیاء کیلئے مباح کی گئی تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا اختیار دیا تھا کہ وہ بندہ اور رسول بنیں یا بادشاہ اور نبی مانے جائیں۔ آپ نے بندہ اور رسول ہونا پسند کیا حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی ولایت درحقیقت اسی بندگی اور رسالت کا تتمہ تھی۔ اگر وہ اپنے لوگوں میں سے کسی کو والی بناتے تو گمان کرنے والوں کا شبہ پختہ ہو جاتا کہ آپ نے اپنے ورثہ کے لیے مال جمع کیا ہے جب آپ نے اپنے لوگوں میں سے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا اور نہ ان کے لیے مال چھوڑا تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ طلب ریاست و مال سے کوسوں دور تھے۔

اس کتاب کا ردعمل

یہ کتاب خود ابن تیمیہ کی زندگی میں غیر معمولی شہرت حاصل کر چکی تھی۔ شیخ شمس الدین ذہبی نے فوراً ہی اس کا اختصار اور خلاصہ پیش کیا تھا تا کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ اس سے مستفید ہوسکیں مگر شیعیت کی دنیا میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ شیخ جمال الدین بن المطہر الحلی کو اس کتاب کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے طنز کے طور پر حسب ذیل دو شعر لکھے۔

افترا پردازی کی ہے اور غلط بیانی سے کام لیا ہے (۲) حق و باطل کی آمیزش کر دی ہے۔(۳) ابن تیمیہ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں تجسیم کی تبلیغ کرتے ہیں (۴) ابن تیمیہ حوادث کی ابتداء کو نہیں مانتے پہلے دونوں اعتراضات بیجا ہیں۔ انہوں نے کہیں بھی صحابہ کی تنقیص نہیں کی ہے۔ اکثر الزامی جوابات دیے ہیں۔ اس میں ان کے حریفوں کو کوئی تنقیص کا پہلو نظر آتا ہو تو ہو مگر درحقیقت اس میں کوئی تنقیص نہیں ہے۔ حق و باطل کی آمیزش کا اعتراض ایک مجمل اعتراض ہے۔ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ کتاب وسنت سے امام ابن تیمیہ کا استدلال جتنا زوردار ہوتا ہے وہ کسی اور کا نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں حق و باطل کی آمیزش کا اعتراض محض ایک وہم باطل کی حیثیت رکھتا ہے۔ تجسیم کا اعتراض صفات الٰہی کے ماننے کی بنا پر ہے۔ اس کی تردید کافی طور پر فتنہ عقائد کے عنوان کے تحت ہو چکی ہے۔ اس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ اب رہا چوتھا اعتراض تو یہ فلسفہ اور کلام کا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق امام موصوف نے بیسیوں دلیلیں قائم کی ہیں۔ سبکی ایک فقیہ تھے ان کو بحثوں سے کیا تعلق ہے۔ طلاق اور زیارت قبور کے مسئلے میں ان کا قلم چل سکتا ہے مگر وہ فلسفہ وکلام اور منطق کے مرد میدان نہیں تھے۔ جس شخص نے رد المنطق اور درء تعارض العقل کی جیسی بیش بہا اور معرکۃ الآرا کتابیں لکھی ہیں۔ اس کے سامنے سبکی تو کیا بڑے بڑے متکلمین کی بھی کاٹ نہیں چل سکتی تھی۔ شیخ صفی الدین ہندی جیسا زبردست متکلم امام ابن تیمیہ کے مقابلے میں جیت نہیں سکا تو پھر سبکی کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔

افترا پردازی کی ہے اور غلط بیانی سے کام لیا ہے (۲) حق و باطل کی آمیزش کر دی ہے۔ (۳) ابن تیمیہ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں تجسیم کی تبلیغ کرتے ہیں (۴) ابن تیمیہ حوادث کی ابتداء کو نہیں مانتے پہلے دونوں اعتراضات بیجا ہیں۔ انہوں نے کہیں بھی صحابہ کی تنقیص نہیں کی ہے۔ اکثر الزامی جوابات دیے ہیں۔ اس میں ان کے حریفوں کو کوئی تنقیص کا پہلو نظر آتا ہو تو ہو مگر درحقیقت اس میں کوئی تنقیص نہیں ہے۔ حق و باطل کی آمیزش کا اعتراض ایک مجمل اعتراض ہے۔ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ کتاب و سنت سے امام ابن تیمیہ کا استدلال جتنا زوردار ہوتا ہے وہ کسی اور کا نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں حق و باطل کی آمیزش کا اعتراض محض ایک وہم باطل کی حیثیت رکھتا ہے۔ تجسیم کا اعتراض صفات الٰہی کے ماننے کی بنا پر ہے۔ اس کی تردید کافی طور پر فتنہ عقائد کے عنوان کے تحت ہو چکی ہے۔ اس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ اب رہا چوتھا اعتراض تو یہ فلسفہ اور کلام کا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق امام موصوف نے بیسیوں دلیلیں قائم کی ہیں۔ سبکی ایک فقیہ تھے ان کو بحثوں سے کیا تعلق ہے۔ طلاق اور زیارت قبور کے مسئلے میں ان کا قلم چل سکتا ہے مگر وہ فلسفہ و کلام اور منطق کے مرد میدان نہیں تھے۔ جس شخص نے رد المنطق اور درء تعارض العقل کی جیسی بیش بہا اور معرکۃ الآرا کتابیں لکھی ہیں۔ اس کے سامنے سبکی تو کیا بڑے بڑے متکلمین کی بھی کاٹ نہیں چل سکتی تھی۔ شیخ صفی الدین ہندی جیسا زبردست متکلم امام ابن تیمیہ کے مقابلے میں جیت نہیں سکا تو پھر سبکی کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔

علومِ عقلیہ پر نقد

علومِ عقلیہ سے ہماری مراد فلسفہ و منطق اور کلام و عقائد کا علم ہے۔ابتداء میں عرب ان علوم سے نا آشنا تھے۔اسلام کے آنے کے بعد جب کتاب و سنت ،فقہ و اصول ،تاریخ و سیر و رجال اور شعر و ادب کی تدوین اور ان کی اشاعت ہونے لگی اور نئی قومیں اسلام کے حلقے میں داخل ہوتی گئیں۔تو اسلامی عقائد و خیالات اور غیر اسلامی افکار و نظریات کے درمیان ٹکر ہونے لگی۔بنوامیہ کے آخری زمانے میں معبد الجہنی ،غیلان الدمشقی ،یونس الاسواری ،واصل بن عطا ،معمر بن عبید ،ثمامہ بن اشرس ، جعد بن درہم اور جہم بن صفوان کی وجہ سے عقلیت پسندی کا دروازہ کھل گیا تھا اور مذہب اسلام کے مسلمہ مباحث میں عقلی موشگافیاں ہونے لگی تھیں۔بنوامیہ کے بعد جب بنوعباس سریر آرائے خلافت ہوئے تو یونانی و رومی و ہندی علوم کے ترجمہ کیلئے ایک دارالحکمت قائم کیا گیا اور یونانی فلاسفہ و حکما و اطباء و منجمین و ریاضیین کی کتابوں کا ترجمہ کیا جانے لگا۔تقریباً سو برس تک مشہور فلاسفہ و حکما و اطباء کے آراء و نظریات عربی میں منتقل ہوتے رہے۔ترجمہ کرنے والے اگرچہ خود کوئی بڑے فلسفی یا حکیم یا طبیب نہیں تھے۔مگر جب سقراط [1] (۴۶۹۔۳۹۹ ق م) و افلاطون (۴۲۷۔۳۴۷ ق م) وارسطو (۳۸۴۔۳۲۲ ق م) و بقراط (۴۶۰۔۳۵۷ ق م) و جالینوس (۱۳۱۔۲۰۱ م) و فیثاغورس (چھٹی صدی قبل مسیح) و اقلیدس (۳۰۰ ق م) و بطلیموس (دوسری صدی عیسوی) و برقلس (۴۱۲۔۴۸۰ م)و دی مقراطیس (۴۰۰۔۳۵۷ ق م)وغیرہ کے افکار و خیالات تک

---

[1] افلاطون سقراط کا اور ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا۔یہ تینوں فلسفی اور حکیم تھے۔مسلمان فلاسفہ پر انہی تینوں کا بہت زیادہ اثر رہا ہے۔فارابی افلاطون و ارسطو کو فلسفہ کی مبادی و اصول کا بانی اور موجد اور اس کے فروعی مسائل کا متمم سمجھتا تھا۔بقراط و جالینوس طب کے ماہر تھے۔فیثاغورس مشہور یونانی ریاضی دان تھا۔اقلیدس جیومیٹری کا ماہر تھا۔بطلیموس ہیئت ،جغرافیہ کا استاد مانا جاتا تھا۔برقلس اسکندریہ کا فلسفی و ماہر اخلاق و مذہب خیال کیا جاتا تھا۔دی مقراطیس بھی زبردست یونانی فلسفی اور سیاستدان تھا۔

عرب محققین کی رسائی ہوگئی تو فلسفہ و منطق، طب و ہیئت و ریاضیات پر مستقل بالذات تصنیفیں لکھی جانے لگیں۔ ابو یعقوب کندی، ابونصر فارابی، ابن مسکویہ، ابن سینا، ابن الہیثم، ابن ماجہ، ابن طفیل، ابن رشد وغیرہ جیسے مسلمان فلاسفہ وحکما نے یونانیوں کے مردہ علوم کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔ آج یونانی کتابوں کی اصل موجود نہیں ہے۔ مگران کے ترجموں کی بدولت ان کے آراء ونظریات وخیالات ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو گئے۔

فلسفہ و منطق کا اسلامی علوم پر بھی غیر معمولی اثر پڑا۔ عقائد اسلامی کے عقلی مباحث پر مشتمل ایک زبردست علم کلام وجود میں آ گیا۔ مختلف فرقے وجود میں آتے گئے۔ ابوالہذیل العلاف، ابراہیم بن سیار النظام، ابوعبداللہ محمد بن کرام، عبداللہ بن سعید بن کلاب، حسین بن محمد النجار، ضرار بن عمرو، ابوعلی الجبائی، ابوالحسن اشعری، ابوالحسین البصری، ابوبکر بن فورک، محمد بن الطیب الباقلانی، قاضی عبدالجبار بن احمد المعتزلی، ابوالمعالی الجوینی، ابوحامد الغزالی، ابو الفتح محمد بن عبدالکریم الشہرستانی، ابوالبرکات ہبۃ اللہ بن ملکا بغدادی، فخر الدین رازی اور نصیر الدین طوسی وغیرہ کی تصنیفات علم کلام کی مستند کتابیں مانی گئیں اور اب تک مانی جاتی ہیں۔

اس غلط عقلیت پسندی کی باقاعدہ مخالفت امام احمد بن حنبل کی طرف سے ہوئی جنہوں نے جہمیہ کی تردید میں کتاب السنہ کے نام سے ایک مشہور کتاب لکھی تھی۔ ان کے بعد ان کے فرزند ارجمند عبداللہ نے بھی اسی نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ مشہور محدث عثمان بن سعید الدارمی نے بشر بن غیاث المریسی المعتزلی کے عقائد وخیالات کی تردید میں ایک مشہور کتاب لکھی جس کا نام "نقض عثمان بن سعید علی الکاذب العنید فیما افتری علی اللّٰہ فی التوحید" رکھا تھا۔ ان بزرگوں کی اتباع میں ابوبکر الخلال، ابوالشیخ الاصبہانی، طبرانی، ابوذر الہروی وغیرہ نے اپنے اپنے زمانے میں کتاب السنہ کے نام سے کتابیں لکھی تھی۔ ان کے علاوہ ابوعثمان اسماعیل الصابونی نے "اعتقاد اھل السنہ وما وقع علیہ اجماع اھل الحق من الامہ" کے نام سے اور ابوالقاسم التیمی نے کتاب الابانہ کے نام سے، ابوالقاسم اللالکائی نے کتاب السنن کے نام سے بیہقی نے کتاب "الاسماء والصفات" کے نام سے، عبدالعزیز مکی نے "الحمیدہ فی الرد علی الجھمیۃ" کے نام

سے، عبدالرحمٰن بن ابی حاتم نے کتاب "الرد علی الجهمية" کے نام سے، ابن خزیمہ نے "کتاب التوحید" کے نام سے، ابوعمرالطلمنکی نے "کتاب فی الاصول" کے نام سے، ابوبکر عبدالعزیز بن جعفر نے "کتاب المقنع" کے نام سے، ابوعبداللہ بن حامد نے "کتاب فی اصول الدین" کے نام سے ابواسماعیل انصاری نے کتاب "فی ذم الکلام" کے نام سے ابونصر السجزی نے "رسالة الی اهل زبید" کے نام سے اور دوسرے بہت سے حضرات نے مختلف ناموں سے عقلیت پسندی کے خلاف کتابیں لکھی تھیں۔ ہر زمانہ میں ردوتردید، سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے باوجود امام الحرمین ابوالمعالی الجوینی، امام غزالی اور امام رازی کی زوردار تصانیف کی بنا پر علوم عقلیہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا اور عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں ان کو بہت اہم جگہ حاصل ہوگئی۔ امام ابوبکر محمد بن الطیب الباقلانی کی کتاب الدقائق، امام الحرمین کی کتاب الارشاد، امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ، مقاصد الفلاسفہ، المستصفی، محك النظر وغیرہ اور امام رازی کی محصل افکار المتقدمین والمتاخرین، اساس التقدیس، المباحث المشرقیہ، کتاب الاربعین فی اصول الدین اور نهاية العقول وغیرہ فلسفہ و منطق اور علم کلام میں اساسی کتب کی حیثیت اختیار کر گئیں اور یہ تصور قائم ہوگیا کہ آئندہ ان کے خلاف کوئی شخص بھی قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

علوم عقلیہ کا علمی محاسبہ

مسلمانوں کے اس علمی ذخیرے میں رطب و یابس سبھی چیزیں موجود تھیں۔ ان پر صحیح نقد و تبصرے کی سخت ضرورت تھی اور یہ کام ایک ایسا ہی شخص انجام دے سکتا تھا جس نے خود ہی اس علمی ذخیرے کی ہر ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھا ہو اور دقت نظر سے اس کو پرکھا ہو، محدثین اور فقہا اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے۔ کیونکہ وہ صرف قرآن و حدیث کی آیات و روایات کو نقل کر کے ان علوم عقلیہ کے آراء و نظریات کی حرمت کا فتویٰ دے سکتے تھے۔ ان فتووں سے عقلیت پسندی کا سیلاب کبھی رک نہیں سکتا تھا۔ امام ابن تیمیہ جس طرح دینی علوم کے ماہر تھے اسی طرح ان عقلی علوم کے بھی پورے واقف کار تھے۔ انہوں نے ان علوم کی ہر

ایک چھوٹی بڑی کتاب پڑھی تھی۔ جس کا ثبوت ان کی اکثر تصانیف سے مل سکتا ہے۔ استاد ہونے کے بعد ہی سے خاص کر امام رازی کی محصل، افکار المتقدمین والمتاخرین اور اساس التقدیس وغیرہ کی تردید میں کتابیں لکھنی شروع کردی تھیں۔ [1]

چنانچہ وہ درء تعارض العقل والنقل کی ابتداء میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے لکھنے سے تیس سال پہلے انہوں نے محصل کا رد لکھا اگر اس کتاب کو ۷۲۰ھ کے قریب کی تصنیف مان لیا جائے تو گویا انہوں نے ۶۹۰ھ میں یا اس سے پہلے ہی سے امام رازی کے خیالات ونظریات کی تردید کرنا شروع کردی تھی۔ یوں تو ان کی ہر ایک کتاب میں فلسفہ ومنطق اور کلام کے غلط مسائل کی تردید موجود ہے مگر ان کی دو کتابیں یعنی درء تعارض العقل والنقل اور الرد علی المنطقیین بہت بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ الرد علی المنطقیین ۷۲۰ھ کے بعد کی تصنیف ہے۔ اس سے پہلے درء تعارض العقل والنقل لکھی تھی جو منہاج السنہ کے حاشیہ پر چار جلدوں میں چھپی ہے۔ کتاب النبوات بھی اس سلسلہ میں بڑی اہمت رکھتی ہے۔ منہاج السنہ کی پہلی جلد میں بہت سے فلسفیانہ اور کلامی مباحث آ گئے ہیں۔ ان سب کو دیکھنے سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ کہ انہوں نے یونانیوں کی علمی کمزوریوں کا پردہ کس طرح چاک کیا اور کس طرح مسلمانوں کو ان علوم کی اندھی پیروی سے روکا۔ یہ ان کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی اہمیت کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس کو ان علوم عقلیہ کی کمزوریوں سے کافی واقفیت ہو۔

اصول دین کیا ہیں؟

امام رازی کی مشہور تصنیف کتاب الاربعین فی اصول الدین کے بعد سے لوگوں کے ذہنوں پر یہ تصور چھا گیا تھا کہ دین کے اصول توحید، رسالت، نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور اعمال حسنہ نہیں ہیں بلکہ وہ عقلی اور فلسفیانہ ومنطقیانہ مباحث ہیں جن کی تشریح اس کتاب میں کی گئی ہے۔ جب امام ابن تیمیہ مصر میں تھے تو ان کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا

---

[1] امام موصوف نے تلبیس الجھمیه فی تاسیس بدعھم الکلامیه، تخلیص التلبیس من کتاب التاسیس اور الکلام علی المحصل کے نام سے کئی کتابیں لکھی تھیں۔ دیکھو کتاب التسعینیة صفحہ ۷۲ اور ۲۵۵ ورد المنطقیین صفحہ ۱۱۰۔

تھا کہ آیا ان مسائل میں جن کو آج اصول دین سے تعبیر کیا جا رہا ہے غور وخوض کرنا جائز ہے یا نہیں حالانکہ ان کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات منقول نہیں ہے۔ اگر ان میں غور و خوض جائز ہو تو اس کے جواز کی کیا دلیل ہے؟ اور یہ سب جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بعض مسائل کے اندر کلام کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اگر ان میں غور وخوض کرنے کو جائز قرار دیا جائے تو کیا ان میں غور و خوض کرنا واجب ہے اور کیا اس کے وجوب کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم موجود ہے؟ ان مسائل میں ایک مجتہد اپنے ظن غالب سے کسی خاص نتیجہ پر پہنچتا ہے تو کیا اس کو مان لیا جا سکتا ہے؟ یا اس کا قطعی علم حاصل کرنا ضروری ہے؟ جب قطعی علم حاصل کرنا ناممکن ہو تو کیا ایسا شخص معذور سمجھا جا سکتا ہے؟ یا قطعی علم حاصل کرنے کا اس کو مکلف قرار دیا جائے گا۔ اس صورت میں کیا اس کو اپنی طاقت سے زیادہ تکلیف دینے کے مترادف نہیں ہوگا؟ اگر ان مسائل کے اندر قطعی علم کا حاصل کرنا واجب ہو تو پھر شارع سے ان کے حصول کے متعلق ایسی کوئی واضح نص کیوں موجود نہیں ہے؟ جس سے لوگ ہلاکتوں سے بچیں۔ حالانکہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی ہدایت کے بہت ہی حریص واقع ہوئے تھے۔

امام ابن تیمیہ نے اس سوال کا بہت ہی تفصیلی جواب دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک طرف مسائل کو اصول دین سے قرار دینا اور پھر اس کے متعلق یہ کہنا کہ ان کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم منقول نہیں ہے ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس قسم کا دعویٰ ایک متناقض دعویٰ ہوگا۔ اگر کوئی مسائل اصول دین سے ہوں تو یقیناً ان کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نص موجود ہونی چاہیے۔ ورنہ یہ ماننا ہوگا کہ نبی نے ایسے امور کو بیان نہیں کیا جن کی ایک دین میں ضرورت ہوتی ہے یا اس نے بیان کیا تھا مگر اس کی امت نے اس کو بھلا دیا۔ یہ دونوں شقیں باطل ہیں۔ اس قسم کا خیال وہی کر سکتا ہے جو رسول کے لائے ہوئے حقائق سے بالکل ناواقف ہو یا لوگوں کی پیش کی ہوئی عقلیات کی حقیقت کو سمجھتا نہ ہو۔ جن کو عقلیات کا نام دیا جا رہا ہے وہ درحقیقت جہلیات ہیں۔ نبی نے دین کے اصولی مسائل کو جیسے کہ توحید، صفات باری، تقدیر، نبوت، معاد وغیرہ کا علم ہے قولاً اور عملاً کافی ووافی وشافی طور پر بیان کر دیا ہے۔

ان کے معانی وتفسیر کے بیان کرنے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا ہے کسی کو بھی اس کے متعلق کوئی عذر نہیں ہوسکتا۔ان مسائل کو نبی نے جس بہتر طریقے سے بیان کیا ہے۔اس کو دوسرا کوئی بیان نہیں کرسکتا۔قرآن مجید خود دعویٰ کرتا ہے کہ اس میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہے اور اس میں مسلمانوں کیلئے ہدایت ورحمت وبشارت ہے (۱۶/النحل:۱۲) اب رہا ان مسائل کے دلائل تو عام مسلمان فلاسفہ اور متکلمین کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ یہ دلائل صرف نقلی ہیں عقلی نہیں ہیں اور ان کے خیال کے مطابق ان نقلی دلائل کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ نبی کی صداقت پر اعتبار نہ ہو۔اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ان مسائل کے ثبوت کیلئے بے شمار عقلی دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ان دلائل کا اسلوب فلاسفہ اور متکلمین کے بیان کیے ہوئے عقلی دلائل سے زیادہ واضح ،موثر اور قطعی ہے۔قرآن مجید نے مختلف جگہوں پر ضرب الامثال سے کام لیا ہے۔جو عوام اور خواص کے ذہنوں میں زیادہ موثر اور قریب الفہم ہوتے ہیں قرآن زیادہ تر بدیہیات سے کام لیتا ہے۔اس کے برخلاف فلاسفہ ومتکلمین کے دلائل نظری اور ناقابل فہم ہیں۔ان دلائل کی قطعیت ان اصول مسلمہ کے ثابت ہونے پر موقوف ہے جن کو مسلمہ سمجھ کر پیش کیا جارہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ فلاسفہ اور متکلمین خود اپنے دلائل کے متعلق شک واضطراب میں مبتلا ہیں۔ایک ان اصول کی تائید کرتا ہے تو دوسرا ان اصول کو غلط قرار دینے کی کوشش کرتا ہے۔مگر قرآن کا اسلوب استدلال ایسا نہیں ہے۔وہ مخلوق کی صفات ناقصہ سے خالق کی صفات کاملہ پر استدلال لیتا ہے جو ہر ایک کی سمجھ میں آسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ مشاہدات انسانی کو پیش کر کے ان سے انسان کے دوبارہ زندہ ہونے پر استدلال لیتا ہے۔قرآن مجید میں معاد کے مسئلے کو مختلف عقلی دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔جن میں سے ہر ایک دلیل قطعی اور یقینی ہے۔فلاسفہ ومتکلمین حدوث عالم پر حدوث اعراض سے استدلال لیتے ہیں۔اس سلسلہ میں جتنے تمہیدی مقدمات پیش کیے جاتے ہیں وہ خود محل نظر ہیں۔اس لیے ان سے یقین حاصل نہیں ہوسکتا۔یہی وجہ ہے کہ ان دلائل میں بہت زیادہ اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔

اب رہا کہنے والے کا یہ کہنا کہ اگر ان مسائل میں غور وخوض کو جائز قرار دیا جائے تو اس

کی وجہ جواز کیا ہے؟ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے بعض مسائل میں کلام کرنے سے منع کیا ہے۔اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ دین کے اصولی مسائل میں غور وخوض سے اللہ اور اس کے رسول نے کبھی منع نہیں کیا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول نے ایسی باتوں سے منع کیا ہے جس میں انسانوں کی گمراہی ہوتی ہے۔ مثلاً خدا کے متعلق بغیر علم کے کچھ بولنا یا حق بات میں بلا وجہ جھگڑا کرنا، خدا کی نشانیوں کے بارے میں تکرار کرنا، آپس میں تفریق اور اختلاف پیدا کرنا، جماعت بندی کرنا، کتاب اللہ کی بعض آیتوں کو بعض کے خلاف قرار دے کر بحث کرنا، کتاب وسنت ہرگز ان مسائل کے اندر غور وفکر سے منع نہیں کر سکتے جو دین کی اصل میں داخل ہیں۔ البتہ عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آنے والی باتوں پر بیجا بحث کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ رسول کی لائی ہوئی چیزوں کو تفصیلی طور پر جاننا فرض عین نہیں ہے بلکہ فرض کفایہ ہے۔ وہی باتیں ضروری ہوں گی جن کا جاننا اور جن پر عمل کرنا ہر ایک مومن کیلئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ فلاسفہ ومتکلمین جن امور پر بحث کرتے ہیں وہ اصول دین میں داخل نہیں ہے۔ ان کا جاننا ہر ایک کے لیے ضروری نہیں ہے۔ ان کے اکثر دلائل ظنیات ہی نہیں ہیں بلکہ اغلوطات ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مصنف ایک جگہ ایک دلیل استعمال کرتا ہے اور دوسری جگہ اسی دلیل کے خلاف دوسری دلیل لے آتا ہے۔

اب رہا کہنے والے کا یہ کہنا کہ کیوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان اصولی مسائل دین کے متعلق نص موجود نہیں ہے جن کی وجہ سے لوگ ہلاکتوں سے بچ جائیں ٹھیک نہیں ہے۔ اصولی مسائل دین کے متعلق کتاب وسنت کے صریح نصوص موجود ہیں۔ مختلف طریقوں سے ان کی توضیح کی گئی ہے۔ فلاسفہ ومتکلمین کے مسائل چونکہ اصول دین کی حیثیت نہیں رکھتے اس لیے کتاب اللہ اور سنت رسول میں ان کی کوئی تشریح نہیں مل سکتی۔ اس سے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ نبی نے دین کے اصولی امور کو یونہی چھوڑ دیا۔ اور ان پر بحث نہیں کی۔ کتاب وسنت میں ان مسائل پر مختلف عقلی دلیلوں سے بحث کی گئی ہے جو فلاسفہ ومتکلمین کے بیان کیے ہوئے دلائل سے زیادہ واضح اور مؤثر ہیں۔ ان سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] اس بحث کے لیے دیکھو، درء تعارض العقل : ۱/ ۱۲ تا ۱۴۔

حقائق الٰہیات سے ناواقفیت

حقائق الٰہیات سے متعلق یہ خلط مبحث اس لیے پیدا ہوا کہ مسلمان فلاسفہ و متکلمین نے آنکھ بند کر کے یونانی فلاسفہ کے آراء و نظریات اور ان کے اصول کی پیروی کی حالانکہ سب اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ یہ یونانی فلاسفہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے تھے ان کے کانوں تک انبیاء کی آواز نہیں پہنچی تھی۔ یہ سب لوگ ستارہ پرست مشرک تھے۔ ان کے دل و دماغ نبوت و رسالت کی روشنی سے منور نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے تصورات کے مطابق عقلی دلائل کا ایک بہت بڑا گھروندہ بنایا جس کی بنیادیں عقلی تگ و دو کے تار و پور پر رکھی گئی تھیں۔ یونانیوں نے طب و ریاضیات و ہیئت و نجوم کے علوم کی بنیاد ذاتی مشاہدات پر رکھی۔ مگر الٰہیات میں ان کی عقلیں کام نہیں دے سکیں۔ اس لیے وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ چنانچہ امام موصوف لکھتے ہیں:

وہ فلسفہ سے شغل رکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ قرآن خطابی طریقوں اور اقناعی مقدمات کو استعمال کرتا ہے جن سے جمہور کی تشفی ہوتی ہے۔ مگر متکلمین جدلی طریقوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ان دونوں کے برخلاف ان کا دعویٰ ہے کہ فلسفی ہی برہان یقینی کے استعمال کرنے والے ہیں۔ فلسفیوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ یہی لوگ متکلمین سے زیادہ الٰہیات میں یقینی برہان کے پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ متکلمین الٰہیات اور کلیات میں ان سے زیادہ برہانی علم رکھتے ہیں۔ البتہ فلاسفہ کو طبیعیات کے غور و خوض اور اس کی تفصیل میں امتیاز حاصل ہے بخلاف الٰہیات کے کہ وہ اس بارے میں سب سے زیادہ جاہل اور حق کے جاننے سے دور واقع ہوئے ہیں۔ الٰہیات میں ان کے معلم ارسطو کا کلام بہت کم ہے۔ مگر جتنا بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔'' [1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

الٰہیات کے بارے میں جب کوئی پڑھا لکھا آدمی معلم اول ارسطو کے کلام کو غور سے دیکھتا ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ ان فلاسفہ یونان سے بڑھ کر رب العالمین کی معرفت

---

[1] مجموعة الرسائل الكبرى : ١/ ١٨٦۔

سے کوئی نا آشنا اور بے بہرہ نہیں ہے۔وہ دریائے حیرت میں غوطہ کھانے لگتا ہے۔ جب وہ کچھ لوگوں کو یونان کی الٰہیات کا پیغمبروں کی تعلیمات سے مقابلہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے کہ کوئی لوہاروں کا فرشتوں سے اور گاؤں کے زمینداروں کا سلاطین عالم سے مقابلہ کرنے لگے۔ ان دونوں کے درمیان مشابہت دینے میں کچھ علم اور عدل کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ فلاسفہ کا انبیاء سے مقابلہ کرتے ہیں وہ تو سخت ظلم اور جہل سے کام لیتے ہیں اس لیے کہ گاؤں کا زمیندار بہر حال اس کا آقا اور منتظم ہے اور اس صفت میں اس کو بادشاہ کے ساتھ ایک طرح کی مشابہت ہے اور اس کے بعض اوصاف میں اس کی شرکت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف انبیاء کے ساتھ فلاسفہ کی کوئی مشابہت نہیں ہے۔ انبیاء جو کچھ لے کر آتے ہیں۔ اس کی فلاسفہ کو مطلق خبر نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس کے قریب تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کافر یہودی اور نصرانی ان فلاسفہ سے زیادہ امور الہیہ کی خبر رکھتے ہیں۔ اس سے ہماری مراد وحی کا علم نہیں ہے۔ کیونکہ وہ صرف انبیاء کیلئے مخصوص ہے۔ کوئی دوسرا اس کو حاصل نہیں کرسکتا۔ وحی کا یہ علم تو ہماری بحث کے دائرے سے بالکل خارج ہے۔ بلکہ یہاں ہماری مراد ان علوم عقلیہ سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت، نبوت و رسالت، معاد اور ان اعمال حسنہ سے متعلق ہیں۔ جن سے آخرت میں سعادت حاصل ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر کو انبیاء علیہم السلام نے مختلف براہین عقلیہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جہاں تک ان فلاسفہ کی رسائی نہیں ہوسکی ہے۔ ان کے علوم میں ان الٰہی و دینی و شرعی عقلیات کا پتہ بھی نہیں ہے۔ اب رہے وہ علوم و معارف اور حقائق غیبیہ جو انبیاء کیلئے مخصوص ہیں ان کے ذکر کا یہاں کوئی موقع نہیں ہے یہ فلسفہ اور علوم نبویہ کی بحث ہی میں نہیں آتے۔ [1]

ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں انبیاء علیہم السلام جس غیب کی خبر دیتے ہیں اس سے اور ان کلیات عقلیہ سے جو تمام موجودات پر حاوی اور شامل ہیں اور موجودات کی صحیح تقسیم کرتی ہیں ان سے فلاسفہ بالکل نا آشنا ہیں۔ ان پر ایک ایسے شخص کو قدرت ہوسکتی ہے جو موجودات کی

---

[1] الرد علی المنطقیین: ۲۹۴۔۲۹۰۔

تمام انواع کا احاطہ کر سکے۔ یہ فلاسفہ صرف حساب اور اس کے بعض لوازم سے واقف ہیں اور یہ بہت کم موجودات کی واقفیت ہے۔ اس لیے کہ وہ موجودات جن کا انسانوں نے مشاہدہ نہیں کیا ہے ان موجودات کی بہ نسبت جن کا انہوں نے مشاہدہ کیا ہے بہت زیادہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب وہ لوگ جن کا علم فلاسفہ کی معلومات پر مشتمل اور محدود ہے انبیاء و ملائکہ، عرش و کرسی اور جنت و دوزخ وغیرہ کا ذکر سنتے ہیں تو حیران ہو جاتے ہیں اور یہ کہنے لگتے ہیں کہ موجود وہی ہے جس کا علم انہیں حاصل ہوا ہے اور جو ان کی معلومات کے دائرے سے باہر ہو وہ موجود نہیں ہے۔ اس طرح وہ اپنی محدود معلومات کے مطابق انبیاء علیہ السلام کے کلام کی کی تاویل کرنے لگے ہیں ان کی یہ دلیل سرے سے کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ ان کو ان موجودات کے نہ ہونے کا کوئی مثبت علم حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ کسی چیز کے وجود کا علم نہ ہونا ایک الگ بات ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ جو ہمیں معلوم نہ ہو وہ لازمی طور پر معدوم بھی ہو۔ ان غیبی حقائق سے ان کا انکار ایسا ہی ہے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ جو ہمیں معلوم نہ ہو وہ لازمی طور پر معدوم بھی ہو۔ ان غیبی حقائق سے ان کا انکار ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی طبیب جنوں کے وجود کی اس بنا پر نفی کرے کہ فن طب میں جنوں کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ فن طب میں جنوں کے وجود سے کوئی انکار بھی تو نہیں ہے۔ اگر کسی کو کسی فن میں کچھ کمال حاصل ہو جاتا ہے اور وہ علوم کے مقابلہ میں کچھ امتیازی درجہ رکھتا ہے تو محض اپنی ناواقفیت کی وجہ سے ایسی چیزوں کا انکار کرنے لگ جاتا ہے جو اس کے فن کے دائرے سے بالکل خارج ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوگوں نے چیزوں کے ماننے اور اقرار کرنے میں اتنی ٹھوکریں نہیں کھائی ہیں۔ جتنی کہ انہوں نے چیزوں کے نہ ماننے اور اقرار نہ کرنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں ناواقفیت کی بنا پر چیزوں کی حقیقت اور ان کے وجود سے انکار کا رجحان ایک قدیم رجحان ہے۔ بہت زمانہ سے یہ چلا آرہا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ﴾ [1]

''بلکہ ان کافروں نے ایسی چیز کو جھٹلایا جس کا ان کو پورا علم نہیں ہے۔ ابھی تک تو

---

[1] ۱۰/یونس:۳۹۔

ان پر اس کی پوری حقیقت بھی منکشف نہیں ہوئی ہے۔''

ارسطو کی حقائق دینیہ سے ناواقفیت کا سبب

مسلمان فلاسفہ اور متکلمین پر سب سے زیادہ ارسطو ہی کی تصنیفات اور اس کے آراء و نظریات کا اثر رہا ہے وہ اسی کے فلسفہ کو تمام حکماء و فلاسفہ یونان کا فلسفہ سمجھے ہوئے تھے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

ولکن هٰذه الفلسفة التی یسلکها الفارابی وابن سینا وابن رشد والسهروردی المقتول ونحوه فلسفة المشائین وهی المنقولة عن ارسطو الذی یسمونه المعلم الاول۔ [1]

''اور لیکن یہ فلسفہ جس کی پیروی فارابی وابن سینا وابن رشد وسہروردی مقتول وغیرہ کررہے ہیں مشائین کا فلسفہ ہے اور وہ وہی ہے جو ارسطو سے منقول ہے جس کو وہ معلم اول کا نام دیتے ہیں۔''

امام موصوف کہتے ہیں کہ ارسطو نے اپنے پیش رو فلاسفہ کی پیروی نہیں کی۔ اس سے پہلے کے فلاسفہ حدوث عالم کے قائل تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ اس عالم سے اوپر ایک دوسرا عالم ہے چنانچہ وہ اس عالم علوی کی ایسی صفتیں بیان کرتے تھے جو جنت کے متعلق حدیث میں وارد ہوئی ہیں۔ فلاسفہ متقدمین حشر اجساد کے بھی قائل تھے جیسا کہ سقراط و تالیس [2] وغیرہ اساطین فلسفہ کے کلام میں نظر آتا ہے۔ [3]

ارسطو کی حقائق دینیہ سے ناواقفیت کا سبب یہ تھا کہ اس کو اس سرزمین میں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا جہاں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے تھے۔ چنانچہ امام موصوف فرماتے ہیں:

فلاسفہ کی تاریخ اور ان کا تذکرہ لکھنے والوں کا بیان ہے کہ فلسفہ کے قدیم ماہر جیسے کہ فیثاغورث، سقراط و افلاطون وغیرہ تھے ملک شام وغیرہ جیسے ارض انبیاء کی طرف جا چکے تھے۔

---

[1] الرد علی البکری: ۳۰۶۔ [2] تالیس (THALES) یونان کا مشہور قدیم فلسفی جو چھٹی صدی قبل مسیح میں موجود تھا اس کا خیال تھا کہ کائنات کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے۔

[3] سورۃ الاخلاص، ص ٦٧۔

اور لقمان حکیم اور حضرت داؤد و سلیمان اور ان کے ساتھیوں سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا اور ان سے استفادہ کیا تھا۔ مگر ارسطو کو اس کے پیش رؤں کی طرح کبھی اس سرزمین کی طرف جانے کا موقع نہیں ملا۔ جہاں انبیاء مبعوث کیے گئے تھے۔ یا جہاں انبیاء کی تعلیمات کا کوئی حصہ پایا جاتا تھا۔ ارسطو کے وطن میں ستارہ پرستی رائج تھی۔ اس لیے اس نے محض قیاس سے کام لے کر الٰہیات کی تعلیم بنائی اور ایک ایسا قانون بنایا جس کی پیروی اس کے بعد کے لوگ آنکھ بند کر کے کرتے رہے۔ [1]

طبعیات وریاضیات کی حقانیت

امام ابن تیمیہ کو اعتراف ہے کہ اہل یونان نے طبعیات وریاضیات میں نمایاں ترقی کی تھی۔ ان کے متعلق ان کا جو بھی علم تھا وہ مشاہدے پر مبنی تھا۔ چنانچہ علمائے یونان کی ذہانت کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

نعم لهم فی الطبیعیات کلام غالبه جید وهو کلام کثیر واسع ولهم عقول عرفوا بها ذلك وهم قد یقصدون الحق لا یظهر علیهم العناد۔ [2]

ہاں طبعیات میں ان کے کلام کا اکثر حصہ اچھا ہے ان کا یہ کلام بہت زیادہ اور وسیع ہے۔ انہوں نے اپنی عقلوں کے زور سے اس کو جانا پہچانا۔ اس سے ان کا مقصد حق ہی ہوتا ہے ان پر عناد ظاہر نہیں ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں

لکن لهم معرفة جیدة بالامور الطبیعیة وهذا بحر علمهم وله تفرغوا وضیعوا زمانهم۔ [3]

”لیکن انہیں امور طبیعیہ کی بہت اچھی معرفت ہے اور یہ ان کے علم کا سمندر ہے جس کیلئے انہوں نے اپنا وقت دیا اور اس کا بیشتر حصہ صرف کیا۔“

---

[1] نقض المنطق: ۱۱۳۔ [2] الرد علی البکری: ۱۴۳۔

[3] سورة اخلاص، ص: ۵۷۔

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

فهذه الامور وامثالها مما يتكلم فيه اهل الحساب امر معقول مما يشترك فيه ذووا العقول وما من احد من الناس الايعرف منه شيئا فانه ضرورى فى العلم ضروري فى العمل ولهذا يمثلون به فى قولهم الواحد نصف الاثنين ولا ريب ان قضاياه كلية واجبة القبول لا تنتقض البتة۔

پس یہ اور اس جیسی دوسری باتیں جن کے متعلق حساب والے گفتگو کرتے ہیں سمجھ میں آنے والی باتیں ہیں جن کی تائید عقل والے ضرور کریں گے کیونکہ لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اس میں سے کچھ نہ کچھ جانتا ہو۔ یہ علم اور عمل دونوں کیلئے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مثال کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ ایک دو کا آدھا ہے اس میں شک نہیں کہ اس کے تمام قضایا کلی ہیں اور ان کا قبول کرنا واجب ہے۔ ان پر ہرگز کوئی نقض وارد نہیں ہوتا۔

مسلمانوں نے بلاشبہ ان علوم کو اور ترقی دی اور ان سے اپنی زندگی میں مفید کام لیا۔ مگر ان کی توجہ فلسفہ الٰہیات کی طرف زیادہ مبذول ہوگئی تھی جس کی وجہ سے ان یونانی فلاسفہ کے ساتھ مسلمان فلاسفہ کو بھی جہل مرکب میں مبتلا ہونا پڑا۔

یونانی فلسفہ میں خدا کا تصور

یونانی فلاسفہ کے پاس انبیاء کی تعلیمات موجود نہیں تھیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی عقل اور اپنے ذہن کے زور سے خدا کا ایک ایسا تصور قائم کیا جو کسی حیثیت سے بھی انبیاء کے پیش کیے ہوئے تصور کی برابری نہیں کرسکتا۔ اور یہ مانی ہوئی بات ہے کہ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کا جتنا بہترین تصور پیش کیا ہے اتنا کسی دوسری آسمانی کتاب نے پیش نہیں کیا۔ مسلمانوں کے پاس اس قرآنی تصور کامل کے موجود ہوتے ہوئے ان فلاسفہ کے پیش کیے ہوئے ناقص تصور کی فضیلت اور بزرگی کو پیش کرسکتے تھے۔ مگر انہوں نے یونانی فلاسفہ کے اصول کو اپنے اصول پر ترجیح دی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عام لوگ قرآنی تصور خدا کو ان

فلاسفہ کے تصور خدا کے مقابلے میں ناقص سمجھنے لگے اور ہر قسم کی جا و بیجا تاویلات شروع کر دیں۔ اگر یونانی فلاسفہ کے تصور خدا کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ وہ واجب الوجود ہے۔ علت العلل ہے، بسیط اور واحد ہے، وجود مطلق کلی ہے، ایک ایسی ذات ہے جس سے کسی دوسرے کا صدور نہیں ہوسکتا۔ وہ محل حوادث نہیں ہوسکتا۔ وہ صفات سے بالکل عاری ہے۔ خدا کے متعلق اس قسم کا تصور ایک ناقص تصور ہے۔ صفات سے عاری ہو کر کوئی ذات پائی نہیں جاسکتی۔ اس لیے امام موصوف لکھتے ہیں۔

فالواحد الذی یثبتون هو وجود مجرد عن الصفات الثبوتیة عند بعضهم کابن سینا واتباعه اوعن الثبوتیه والسلبیة عند بعضهم وهذا لاحقیقة له فی الخارج بل یمتنع تحققه فی الخارج وانما هو امر یقدر فی الاذهان کما تقدم ولهذا کان ماذکره ابن سینا فی هذا الباب مما نازعه فیه ابن رشد وغیره من الفلاسفة وقالوا ان هذا لیس هو قول ائمة الفلاسفة و انما ابن سینا و امثاله احدثوه و لهذا لم یعتمد علیه ابو البرکات صاحب المعتبر وهو من اقرب هولاء الی اتباع الحجة الصحیحة بجسب نظره والعدول عن تقلید سلفهم مع ان امرهم و حکمتهم ان العقلیات لا تقلید فیما۔ [1]

پس یہ لوگ جس ایک ذات کو ثابت کرتے ہیں ابن سینا اور اس کے پیرؤوں کے خیال کے مطابق ثبوتی صفات سے عاری ہے اور دوسرے بعض لوگوں کے نزدیک ثبوتی اور سلبی دونوں صفتوں سے عاری ہے ایسی ذات کی خارج میں کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ خارج میں اس کا وجود ناممکن ہے البتہ ذہنوں میں اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ اس بارے میں ابن سینا نے جو

[1] منهاج السنة: ۱/ ۱۲۲۔

کچھ ذکر کیا ہے اس کی ابن رشد وغیرہ جیسے فلاسفہ نے مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ ائمہ فلاسفہ کا یہ قول نہیں تھا۔ بلکہ ابن سینا اور اس کے جیسے لوگوں نے اس کو سب سے پہلے پیش کیا ہے، اسی بنا پر کتاب المعتبر کے مصنف ابوالبرکات نے اس قول پر بھروسہ نہیں کیا۔ ان سب میں اپنی نظر کے مطابق صحیح دلیل کی پیروی کرنے میں اور سلف کی تقلید نہ کرنے میں ابوالبرکات زیادہ بہتر ہے، حالانکہ فلاسفہ نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ عقلیات میں تقلید نہیں ہے۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

فاذا تصور العاقل اقوالهم حق التصور تبين له ان هذا الواحد الذى اثبتوه لا يتصور وجوده الافى الاذهان لا فى الاعيان۔[1]

جب کوئی عقلمند ان کے اقوال پر صحیح معنی میں غور کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ جس ایک ذات کو یہ فلاسفہ ثابت کرتے ہیں اس کا وجود صرف ذہنوں میں ہوگا۔ حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔

بعض لوگ اللہ تعالیٰ کو ایک وجود مطلق سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ وجود مطلق کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک جگہ اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الوجود المطلق بشرط الاطلاق او بشرط سلب الامور الثبوتية اولا بشرط مما يعلم بصريح العقل انتفاؤه فى الخارج و انما يوجد فى الذهن وهذا مما قرؤوه فى منطقهم اليونانى و بينوا ان المطلق بشرط الاطلاق كانسان مطلق بشرط الاطلاق و حيوان مطلق بشرط الاطلاق و جسم مطلق بشرط الاطلاق و وجود مطلق بشرط الاطلاق لا يكون الا فى الاذهان دون الاعيان۔[2]

---

[1] سورۂ اخلاص، ص: ۲۷۔ [2] درء تعارض العقل و النقل، ص: ۱۷۲۔

"اطلاق کی شرط کے ساتھ وجود مطلق یا ثبوتی امور کے سلب کی شرط یا بغیر شرط کے وجود مطلق عقل صریح کی رو سے خارج میں موجود نہیں ہوسکتا۔ صرف ذہن میں اس کا وجود ہوسکتا ہے۔ یونانی منطق میں بھی یہ مقررہ اصول ہے کہ اطلاق کی شرط کے ساتھ مطلق جیسے اطلاق کی شرط کے ساتھ مطلق انسان یا اطلاق کی شرط کے ساتھ مطلق حیوان یا اطلاق کی شرط کے ساتھ مطلق جسم یا اطلاق کی شرط کے ساتھ مطلق وجود ذہنوں میں تو پایا جاتا ہے مگر حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہوسکتا اس کے برخلاف قرآن نے خدا کی ذات اور صفات کا ایک کامل ترین تصور پیش کیا ہے جو ان فلاسفہ کے پیش کیے ہوئے تصور سے بدرجہا بلند اور زوردار ہے۔

عقول عشرہ وافلاک تسعہ

فلاسفہ یونان نے محض قیاس سے کام لے کر دس عقلیں اور نو افلاک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ واجب الوجود نے عقل اول کو پیدا کیا، جس نے عقل دوم اور فلک اول کو پیدا کیا، اسی طرح عقل سوم اور فلک دوم کو اور عقل سوم نے عقل چہارم اور فلک سوم کو اور اسی طرح عقل نہم نے عقل دہم اور فلک نہم کو پیدا کیا۔ جب یہ تصور ترجمہ کے ذریعہ عربی میں منتقل ہوا تو مسلمان فلاسفہ نے کھینچ تان کر کتاب وسنت کو یونانی تصورات پر منطبق کرنے کی کوشش کی، چونکہ قرآن مجید میں صرف سات آسمانوں کا ذکر ہے۔ اس لیے عرش اور کرسی کو ملا کر نو آسمان یا افلاک بنا لیے، حالانکہ قرآن مجید میں عرش اور کرسی کا ایک بالکل ہی علیحدہ تصور اور مفہوم ہے۔ یہ دونوں آسمان نہیں ہیں اور نہ ہی افلاک مانے جاسکتے ہیں۔ بعض نے اس تصور کی تائید میں ایک حدیث بنائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اول ما خلق الله العقل فقال له اقبل فاقبل فقال له ادبر فادبر فقال عزتي ما خلقت خلقاً اكرم علي منك فبك آخذ و بك اعطي و بك الثواب و بك العقاب)) [1]

---

[1] الرد علی المنطقیین، ص: ۲۷۶۔

''یعنی اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا پھر اس سے کہا آگے آ تو وہ آگے آ گئی، پھر کہا پیچھے جا تو وہ پیچھے چلی گئی۔ اللہ نے فرمایا: میری عزت کی قسم! میں نے تجھ سے بڑھ کر اپنے لیے عزیز ترین مخلوق نہیں پیدا کی۔ پس تیرے ہی ذریعے میں لونگا اور تیرے ہی ذریعے میں دوں گا اور تجھی سے ثواب ہوگا اور تجھی سے عقاب ہوگا۔''

امام موصوف نے مختلف کتابوں میں اس حدیث پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ موضوع ہے تمام محدثین نے بالاتفاق اس کو موضوع قرار دیا ہے، انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ یہ حدیث تیسری صدی ہجری میں گھڑی گئی ہے اور سب سے پہلے داؤد ابن المحبر نے تیسری صدی میں کتاب العقل لکھی جس میں اس قسم کی موضوع روایتوں کو نقل کیا۔ [1]

نفوس وملائکہ

کتاب وسنت سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ملائکہ کی ایک علیحدہ مخلوق ہے جو انسانوں سے بالکل ممتاز ہے۔ اسی طرح جنات بھی مخلوقات الٰہی کی ایک دوسری نوع ہے، مگر عقلیت پسندی کے زور میں مسلمان فلاسفہ نے ان کا انکار کیا اور ان کو بھی انسان ہی کی باطنی قوتیں قرار دے دیا۔ امام موصوف نے اپنی مختلف تصنیفات میں جستہ جستہ اس کے متعلق بحث کی ہے اور لکھا ہے ان کا انکار درحقیقت ان کے جہل محض کو ظاہر کرتا ہے۔ [2]

نبوت کا عقلی ثبوت

یونانی فلاسفہ نبوت کے مفہوم سے بالکل ناآشنا تھے، انہوں نے عقلی دلائل سے ایک برتر انسان کی ضرورت ثابت کی تاکہ اس کے ذریعہ دوسروں کی اصلاح ہو سکے، مگر نبوت اس سے بھی بلند درجہ رکھتی ہے، نبوت ایک عطیہ الٰہی ہے جو کسب کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا خدا جس کو چاہتا ہے اس سے سرفراز کرتا ہے۔ فلاسفہ یونان کی پیروی میں مسلمانوں نے بھی نبوت پر عقلی دلائل پیش کیے ہیں۔ ارسطو کے فلسفہ کا سب سے بڑا ترجمان اور شارح بوعلی بن سینا ہے۔ اس نے نبی کی تین خصوصیتیں قرار دی ہیں ایک یہ کہ اس کو کسی کے سکھائے بغیر علم حاصل

---

[1] کتاب السبعینیه، ص: ۲۹۔ [2] کتاب الرد علی المنطقیین، ص: ٤٧١۔

ہو۔اس کو وہ قوت قدسیہ سے تعبیر کرتا ہے۔دوسری یہ کہ وہ اپنے نفس میں کسی معلوم چیز کا تخیل قائم کرتا ہے، اس کے متعلق اس کو کچھ نورانی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں اور وہ اپنے کانوں سے کچھ آوازیں سنتا ہے یہ سب قوتیں اس کے نفس کے اندر ہوتی ہیں خارج میں ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔تیسری یہ کہ وہ اپنی غیر معمولی قوت اور طاقت کے زور سے عالم کے ہیولی میں تصرف کرتا ہے اور اس طرح اس سے معجزات اور خوارق عادات کا صدور ہوتا ہے۔مگر انبیاء کی حالت اس طور کی تعریف وتوصیف سے بالکل بالاتر ہے نبوت کا مقام اس سے بھی زیادہ بلند ہے۔

امام ابن تیمیہ نے اپنی مشہور تصنیف کتاب النبوات میں اس پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی ہے اور تفصیلی طور پر فلاسفہ و متکلمین کے دلائل کی کمزوریاں اور خامیاں دکھائی ہیں۔متکلمین اور خاص کر امام رازی نے قدم قدم پر زوردار اعتراضات پیش کیے ہیں اور پھر خود ہی ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے،مگران کے اعتراضات جتنے زوردار ہوتے ہیں ان کے جوابات بھی اتنے زوردار نہیں ہوتے۔اسی لیے امام ابن تیمیہ کو بجا شکایت ہے کہ ''جب یہ متکلمین نبوت کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو اس کے متعلق ایسے سوالات وارد کرتے ہیں جو بڑے زوردار اور عام فہم ہوتے ہیں مگر جب ان کا جواب دینے پر اُتر آتے ہیں تو وہ بہت کمزور ثابت ہوتے ہیں۔اسکی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔پس اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو ان متکلمین کی کتابوں میں علم اور ایمان و ہدایت کے متلاشی ہوتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہی اسلام کے حامی، وکیل اور مناظر بن کر عقلی دلائل سے اس کو ثابت کر سکتے ہیں۔نبوت کے ثبوت میں تشفی بخش دلائل نہ پا کر متذبذب ہو جاتے ہیں۔ان کے لیے ایمان اور علم کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور اس کی بجائے نفاق اور جہل کا راستہ کھل جاتا ہے۔خاص کر ان کے لیے جن کی معلومات ان متکلمین کے پیش کیے ہوئے دلائل تک محدود ہو گئی ہے۔[1]

قرآن مجید کے دلائل

ان متکلمین کی ایک سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے قرآن مجید کے دلائل کو بھی

---

[1] كتاب النبوات، ص: ٢٤٠۔

سمعیات میں سے قرار دے دیا۔ اس لیے آزاد خیال اور عقلیت زدہ لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کر سکے۔ انہوں نے قرآن مجید کو یہ کہہ کر اپنے سے الگ رکھ دیا کہ اس کی صحت کا ثبوت نبی کی صداقت پر موقوف ہے۔ یعنی جب تک نبی کی نبوت ثابت نہ ہو قرآن مجید کو اللہ کا کلام ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہمارے متکلمین قرآن مجید ہی کے پیش کیے ہوئے عقلی دلائل کو اجاگر کرتے تو شکی طبیعتوں کو ان سے بہت زیادہ دلی اطمینان حاصل ہو سکتا تھا۔ قرآن مجید شروع سے لے کر آخر تک انسانی عقل اور شعور سے اپیل کرتا ہے اور ہر قدم پر اس کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ تعقل، تفکر، تدبر اور تذکر وغیرہ کے مختلف صیغوں سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے۔ متکلمین کی لاطائل بحثوں نے مسائل وحقائق غیبیہ کو صاف کرنے کی بجائے اور زیادہ الجھا کر رکھ دیا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب درء تعارض العقل والنقل اور کتاب النبوات میں مختلف حقائق غیبیہ سے متعلق قرآن مجید کی مختلف عقلی دلیلیں پیش کی ہیں۔ قرآن مجید کے طرز استدلال کی افادیت پر تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ماہر ائمہ متکلمین وفلاسفہ نے مطالب الٰہیہ پر جتنے عقلی دلائل دیئے ہیں ان کے مقابلے میں قرآن مجید کے دلائل زیادہ سچے، کامل، بلیغ اور مؤثر ہیں۔ یہ دلائل ان بڑے بڑے مغالطوں سے پاک ہیں جو ان متکلمین وفلاسفہ کے پاس پائے جاتے ہیں۔ ان میں انہوں نے بہت جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ان کی گمراہی ہدایت کے مقابلہ میں اور جہالت ان کے علم کے مقابلے میں غالباً زیادہ ہی ہے۔'' [1]

امام موصوف نے ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ علم وایقان کے حصول کا ایک راستہ نہیں ہے۔ چونکہ عقل وذہن اور سمجھ کے لحاظ سے انسانوں کی طبیعتیں مختلف ہیں اس لیے مخاطب کو سمجھ اور عقل کے مطابق ہی اس سے کسی مسئلہ پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ مثلاً عوام سے جس طرح خطاب کیا جا سکتا ہے اس قسم کا خطاب عاقلوں اور تعلیم یافتہ لوگوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید نے ایک مسئلہ کو سمجھانے کے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ انسانوں کے ہر طبقے کے لیے اس میں کافی وشافی دلیلیں موجود ہیں۔ اس لیے متکلمین اور فلاسفہ کا ایک

---

[1] الرد علی المنطقیین، ص: ٣٢١۔

طریقہ اختیار کرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ صرف اسی ایک راستہ سے مقصود تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے بالکل مہمل دعویٰ ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ہم بیان کر چکے ہیں کہ بہت سے ماہر مطلوب تک پہنچنے کا ایک طریقہ استدلال اختیار کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقے سے مطلوب تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ طریقہ استدلال ٹھیک بھی ہو تو معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اگر لوگوں کو مطلوب تک رسائی کی ضرورت محسوس ہو تو اللہ تعالیٰ لوگوں کی عقلوں پر اس کے دلائل کو واضح کر دیتا ہے۔ صانع کے وجود اور اس کی توحید کے ثبوت اور نبوت کی نشانیوں اور اس کے دلائل کے ثبوت کے لیے بہت سی دلیلیں ہیں اور ان کی معرفت کے بھی بہت سے راستے ہیں۔ ان میں سے بہت سے راستے تو ایسے ہیں جن کی اکثر لوگوں کو حاجت نہیں ہوتی۔ ان کی ضرورت اسی شخص کو ہوتی ہے جس کو ان کے علاوہ دوسرے طریقوں کا علم نہیں ہے یا ان کے جاننے سے اعراض کیے ہوئے ہیں۔ [1]

خدا کی ذات اور صفات پر بحث

امام ابن تیمیہ نے اپنا سارا زورِ قلم ان فلاسفہ و متکلمین کی تردید پر صرف کر دیا ہے جو خدا کی ذات اور صفات میں بیجا تاویلات سے کام لیتے ہیں ان کی کتاب درء تعارض العقل و النقل کی چار جلدوں میں زیادہ تر اسی موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ اس کی حمایت میں وہ عمر بھر لڑتے رہے۔ اسی لیے بہت سی تکلیفیں اور مشقتیں اُٹھائیں۔ اسی کی وجہ سے انہیں قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ یہ سب اس لیے تھا کہ اس موضوع کے متعلق غلط کلامی مباحث کی وجہ سے مسلمانوں کے اعمال و افعال میں ایک طرح کا جو تعطل اور جمود پیدا ہو گیا تھا وہ دور ہو۔ انسان زمین پر خدا کا جانشین ہے۔ اس میں وہ تمام صفات کمالیہ ہونی چاہیے جو خدا کے اندر بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ اگر ان صفات ہی کا انکار ہو تو پھر انسان میں ان کا ظہور کیونکر ہو سکتا ہے۔ سلبی صفات کے ساتھ خدا کا وجود محض ایک ذہنی تصور ہو جاتا ہے۔ انسانوں کے اعمال و افعال اور اخلاق کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا انسانوں کو ان صفات کمالیہ

---

[1] الرد علی المنطقیین، ص: ۴۵۲، ۵۵۲۔

کی طرف متوجہ کرنے اور ان کا پرتو اپنے اندر پیدا کرنے کی ترغیب دینے کی بجائے متکلمین نے ان صفات ہی کا انکار کیا۔ اور ان کے متعلق ردوقدح اور جا و بیجا اعتراضات وارد کر کے لوگوں کے دماغوں کو ان سے پھیرنے کی کوشش کی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ عام مسلمانوں کو اس قسم کی مفلوج فلاسفی کی طرف راغب ہونے سے روکا جائے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اہم کام ابن تیمیہ کے ذریعے ہی انجام پایا ہے۔ ان کی کتابیں اس مفلوج فلاسفی کی تمام بیماریوں کا واحد تریاق ہیں۔

منطق کی تردید

امام ابن تیمیہ کا ایک اہم ترین کارنامہ منطق اور منطقیین کے غلط اصول کی تردید ہے۔ یہ فن بھی یونانیوں سے مسلمانوں کو ملا تھا، مگر انہوں نے اس میں کانٹ چھانٹ کر کے اس کو ایک بہت بڑا ترقی یافتہ فن بنا لیا تھا۔ ابتدا میں مسلمان اس فن سے کچھ دُور ہی رہے۔ لیکن امام غزالی نے اس کی تائید میں اپنا زورِ قلم صرف کیا اور اس کو مسلمانوں میں رواج دیا۔ انہوں نے اپنی کتاب المستصفیٰ میں صاف لکھا:

> ھی مقدمة العلوم کلھا و من لا یحیط بھا فلاثقة بعلومه اصلا
> منطق تمام علوم کا پیش خیمہ ہے جو بھی اس کا احاطہ نہیں کرتا اس کے علوم پر ہرگز کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

نیز مقاصد الفلاسفہ میں لکھا:

> اما المنطقیات فاکثرھا علی منھج الصواب والخطا نادر فیھا و انما یخالفون اصل الحق فیھا بالاصطلاحات والایرادات دون المعانی والمقاصد، اذ غرضھا تھذیب طرق الاستدلالات و ذلك مما یشترك فیه النظار۔
> لیکن منطقیات تو اس کا اکثر حصہ صحیح ہے اس میں شاذ و نادر ہی غلطی ہوتی ہے۔ منطق والے اہل حق سے اصطلاحات اور ایراداتِ میں مخالف ہیں، معانی اور مقاصد میں مخالف نہیں ہیں کیونکہ اس فن کا مقصد استدلالات کے طریقوں کو

صاف کرنا ہے۔اس میں تمام اہل نظر شریک اور متفق ہیں۔

امام غزالی سے پہلے مسلمان علما اس فن کے عیب نکالا کرتے تھے اور اس کی غلطیاں واضح کیا کرتے تھے۔چنانچہ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

وما زال نظار المسلمین یعیبون طریق اهل المنطق و یبینون ما فیها من العی واللکنة و قصور العقل و عجز المنطق و یبینون انها الی فساد المنطق العقلی واللسانی اقرب منها الی تقویم ذلك ولا یرضون ان یسلکوها فی نظرهم و مناظرتهم لا مع من یوالونه ولا مع من یعادونه و انما کثر استعمالها من زمن ابی حامد فانه ادخل مقدمة من المنطق فی اول کتابه المستصفی وزعم انه لا یثق بعلمه الامن عرف هذا المنطق و صنف فیه معیار العلم و محك النظر و صنف کتابا سماه القسطاس المستقیم۔[1]

''مسلمان اہل نظر اہل منطق کے طریقہ میں ہمیشہ سے عیب نکالتے آئے ہیں اور اس میں جو گونگا پن، لکنت، قصور عقل اور گویائی کی عاجزی ہے اس کو بیان کرتے آئے ہیں اور یہ بتاتے آئے ہیں کہ عقلی ولسانی گویائی کو ٹھیک کرنے کی بجائے منطق اس کو فاسد کرتی ہے۔وہ اس پر راضی نہیں تھے کہ اپنے غور وفکر اور مناظرہ کرنے میں منطق کے دوستوں اور دشمنوں کے طریقہ پر چلیں۔منطق کا استعمال ابو حامد کے زمانے سے زیادہ ہوا۔کیونکہ انہوں نے اپنی کتاب مستصفی کی ابتدا میں منطق کو بطور مقدمے کے داخل کرلیا۔ان کا خیال یہ تھا کہ جو بھی منطق نہیں جانے گا اس کے علم پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔انہوں نے اس فن میں معیار العلم، محک النظر اور قسطاس مستقیم جیسی کتابیں لکھیں۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ ابو محمد الحسن بن موسی النوبختی البغدادی (المتوفی: بعد ۳۰۰ھ) نے اپنی تصنیف کتاب الآراء والدیانات میں منطق کی تردید میں قلم اُٹھایا تھا۔[2] اس کے

---

[1] کتاب الرد علی المنطقیین، ص: ۱۹۴، ۱۹۵۔ [2] ایضًا: ۳۳۷۔

بعد قاضی افضل الدین محمد بن ناماور بن عبدالملک الخونجی الشافعی المصری (المتوفی: ۶۴۹ھ) نے کشف اسرار المنطق اور کتاب الموجز کے نام سے منطق کی تردید میں کتابیں لکھی تھیں۔ [1] نوبختی کی کتاب کے دیکھنے سے پہلے امام موصوف منطق کی تردید میں کچھ حصہ لکھ چکے تھے۔ جب نوبختی اور پھر خونجی کی کتابیں ان کی نظر سے گزریں تو منطق کی کمزوریوں کا احساس اور پختہ ہو گیا اور انہوں نے ایک ضخیم کتاب لکھی جو کتاب الرد علی المنطقیین کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ [2]

اصول واصطلاحات منطق کا خلاصہ

منطقیوں نے علم کو تصور اور تصدیق میں تقسیم کیا تھا۔ اور پھر کہا کہ ان دونوں میں سے ہر ایک بدیہی ہوگا یا نظری۔ تصور کو حاصل کرنے کا طریقہ حد ہے اور تصدیق کے حاصل کرنے کا طریقہ قیاس ہے۔ پھر حد کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں جیسے حقیقی یا رسمی یا لفظی۔ اسی طرح قیاس کی بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اگر قیاس کا مادہ یقینی ہو تو وہ برہان کہلاتا ہے۔ اگر مسلمہ ہو تو جدلی، مشہور ہو تو خطابی، مخیلہ ہو تو شعری اور مموھہ ہو تو سوفسطائی کہلاتا ہے۔ پھر ہر ایک حد صفات ذاتیہ یا صفات عرضیہ پر مشتمل ہوتی ہے اگر یہ تمام صفتیں کسی اسم اور دوسرے کے اندر مشترک ہوں تو وہ جنس ہوتی ہیں اور اگر دوسرے سے ممیز ہوں تو فصل کہلاتی ہیں اور اگر ان دونوں سے مرکب ہوں تو اس کا نام نوع ہے۔ مشترک عرضی عرض عام کہلاتا ہے اور ممیز عرضی کو خاصہ کا نام دیا جاتا ہے۔ منطق میں انہی پانچ کلیات یعنی جنس، فصل، نوع، عرض عام اور خاص سے بحث کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ کلی اور جزئی، مفرد اور مرکب سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ ہر ایک قیاس دو مقدموں سے مرکب ہوتا ہے ان میں ہر ایک مقدمہ قضیہ کہلاتا ہے ہر ایک قضیہ موجبہ ہوگا یا سالبہ، کلیہ ہوگا یا جزئیہ۔ پھر ان کی ترکیب سے مختلف قضیے پیدا ہوتے ہیں۔

قیاس میں نقیض اور اس کے عکس اور عکس نقیض سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ اس طرح قضایا کا تناقض ظاہر کیا جاتا ہے۔

پھر قیاس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ہر ایک قضیہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک ہوگا یا تو وہ حملی ہوگا یا شرطیہ متصلہ یا شرطیہ منفصلہ ہوگا، اگر وہ حملی ہو تو اس کو قیاس تداخل کہا جاتا ہے

---

[1] ایضًا: ۱۱٤۔ [2] ایضًا: ۳۳۱، ۱۸٤۔

اور اگر شرطی متصل ہو تو قیاس تلازم اور اگر شرطی منفصل ہو تو اس کو قیاس تعاند کہا جاتا ہے۔

اسی طرح اگر کلی سے جزئی پر استدلال کیا جائے تو اس کو قیاس شمول کہا جاتا ہے اور اگر جزئی سے کلی پر استدلال کیا جائے تو استقراء کا نام دیا جاتا ہے پھر استقراء کی دو قسمیں ہیں، تام اور ناقص اور اگر ایک جزئی سے دوسرے جزئی پر استدلال کیا جائے تو اس کا نام قیاس تمثیل ہے۔

چار حیثیتوں سے بحث

امام ابن تیمیہ نے منطقیوں کے ان چار دعووں کی تردید میں تفصیلی بحث کی ہے۔ پہلا یہ دعویٰ کہ تصورات کا علم حد کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، دوسرا یہ کہ حد تصورات کے علم کے لیے مفید ہے، تیسرا یہ کہ تصدیقات کا علم بغیر قیاس کے حاصل نہیں ہوسکتا، چوتھا یہ کہ قیاس تصدیقات کے علم کے لیے مفید ہے ان میں سے ہر ایک بحث میں کئی مفید ضمنی بحثیں آ گئی ہیں جن کو یہاں سمیٹنا بہت دشوار ہے۔ البتہ ہم جستہ جستہ اس کے بعض اہم مباحث کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

منطق علوم و حقائق کی میزان نہیں ہے

اور گزر چکا ہے کہ امام غزالی کے زمانے سے مسلمانوں میں علم منطق کا رواج ہوا اس کے بعد سے مسلمان مفکرین نے اس فن کو بڑی اہمیت دینی شروع کی تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ علوم و حقائق کی میزان ہے۔ اور انسان کو فکر اور ذہن کی غلطیوں سے بچا لیتا ہے۔ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ یہ خیال غلط ہے۔

''یہ ایک وضعی اور اصطلاحی صنعت ہے جس کو حقیقی اور علمی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ صریح عقل اور وجود کے مخالف ہے۔ اس لیے باطل ہے یہ اوضاع مجردہ میں سے بھی نہیں ہے جیسا کہ اعلام کے نام ہیں۔ کیونکہ ناموں کے رکھنے میں ایک طرح کی منفعت ہے نہ تو وہ عقل کے مخالف ہے اور نہ وجود ہی کے خلاف ہے۔ لیکن منطق کی وضع صریح عقل اور وجود کے مخالف ہے۔ اگر وہ مجرد وضع ہوتی تو وہ علوم و حقائق کی میزان قرار نہیں پاتی۔ کیونکہ امور حقیقیہ علمیہ اوضاع و اصطلاحات کے اختلاف سے مختلف نہیں ہوتیں۔ مثلاً اشیاء

کے صفات وحقائق کا علم ہے اس لیے کہ کسی چیز کے زندہ ہونے یا عالم ہونے یا قادر ہونے یا مرید ہونے یا متحرک ہونے یا ساکن ہونے یا حساس ہونے یا غیر حساس ہونے کا علم وضع صناعات سے نہیں ہے بلکہ وہ امور حقیقیہ فطریہ سے ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پیدا کیا۔ جیسا کہ ان کو صحیح ارادوں اور مستقیم حرکتوں کے کرنے پر مجبور ومجبول بنایا ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ منطق علوم عقلیہ کی بھی میزان ہے۔ اس کی رعایت ذہن کو فکر کی غلطیوں سے اسی طرح بچاتی ہے جس طرح عروض شعر کی میزان ہے۔ نحو وصرف مفرد ومرکب الفاظ عربیہ کی میزان ہے، اوقات کے آلات وقت دکھانے کی میزان ہیں۔ حالانکہ بات ایسی نہیں ہے کیونکہ علوم عقلیہ کا علم ان اسباب ادراک کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جو آدم کی اولاد میں فطری طور پر ودیت کیے گئے ہیں۔ ان کا جاننا کسی ایک معین شخص کے بنائے ہوئے میزان پر موقوف نہیں ہے۔ عقلیات میں کسی ایک کی تقلید نہیں کی جا سکتی۔ بخلاف عربیت کے کہ وہ ایک قوم کی عادت ہے جو سماع کے بغیر معلوم نہیں کی جا سکتی اور اس کے قوانین استقرا کے سوائے معلوم نہیں کیے جا سکتے بخلاف ناپ تول اور مزروعات ومعدودات کے علم کے کہ وہ عادت کے جاننے پر موقوف ہے۔ [1]

اس کے بعد آگے چل کر لکھتے ہیں:

''تمام امتوں کے جمہور عقلا ارسطو کے بنائے ہوئے طریقے کے بغیر بھی حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں اور جب یہ لوگ اپنے آپ غور وفکر کریں تو معلوم ہوگا کہ اس بنائے ہوئے طریقہ کے بغیر بھی چیزوں کی حقیقتوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ [2]

علم کا واحد ذریعہ اصول منطقیہ نہیں ہیں

امام موصوف نے مختلف جگہوں پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ منطق والوں نے علم کے حصول کا جو طریقہ بتایا ہے وہی کافی نہیں ہے۔ چونکہ انسانوں کی عقل میں تفاوت ہے اس لیے ان کی سمجھ کے لیے جو بھی مناسب ذریعہ اختیار کیا جائے گا وہ ٹھیک ہوگا۔ کسی ایک چیز کی صرف تعریف بیان کر دینے سے اس چیز کا علم حاصل نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کے سمجھانے

---

[1] الرد علی المنطقیین، ص: ٢٦، ٢٧۔ [2] ایضًا، ص: ٢٨۔

کے لیے مختلف ذرائع اختیار کرنے ہوں گے اسی طرح یہ دعویٰ کرنا کہ تصدیقات میں کسی چیز کا علم تین قضیوں سے حاصل ہوتا ہے یعنی صغریٰ و کبریٰ و حد اوسط تو یہ بھی ہر حال میں یقینی نہیں ہوتا۔ بعض لوگ ایک قضیے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ بعض کو دو اور اس سے زیادہ قضیوں کے جاننے کی حاجت ہوتی ہے۔

منطق کے متعلق ان کی رائے

امام موصوف نے اپنی کتاب الرد علی المنطقیین کی ابتدا ہی میں منطق کے متعلق اپنی یہ رائے پیش کی ہے۔

انی کنت دائما اعلم ان المنطق الیونانی لا یحتاج الیه الذکی ولا ینتفع به البلید

میں ہمیشہ سے یہ جانتا تھا کہ ذہین آدمی کو یونانی منطق کی حاجت نہیں ہے اور کند ذہن اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

بادی النظر میں امام موصوف کی یہ رائے انتہا پسندی پر مبنی نظر آئے گی۔ مگر یہ درحقیقت منطق کی اہمیت پر غیر معمولی زور دینے کا نتیجہ تھا۔ اس زمانے کے علمائے تفسیر و حدیث وفقہ کا محض اس بنا پر مذاق اُڑایا جاتا تھا کہ انہیں ان علوم عقلیہ سے کچھ زیادہ دلبستگی اور واقفیت نہیں تھی۔ تمام عربی مدارس میں علوم عقلیہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ ہندوستان کے عربی مدارس میں تو ایک زمانے تک علوم عقلیہ ہی کی کتابیں زیادہ پڑھائی جاتی رہی ہیں۔ عقلی علوم کے ساتھ غیر معمولی دلبستگی کی وجہ سے ہمارے علما کتاب وسنت کی بصیرت افروز تعلیمات سے دور ہوتے چلے گئے اور ہر مسئلہ میں عقلی اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے لگے۔ امام رازی کی تفسیر کبیر اس کا واضح نمونہ ہے ہر آیت کی تفسیر میں عقلی شبہات وارد کیے ہیں اور ان کا خود ہی جواب دیا ہے ضرورت اس کی تھی کہ منطق کو اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ امام ابن تیمیہ نے یہ کام انجام دیا ان کی ان تنقیدوں سے بیجا عقلیت پسندی پر ایک کاری ضرب لگی۔ اگر انکی یہ کتابیں زیادہ تعداد میں پھیلتیں تو یقیناً لوگوں کے ذہن میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوتا۔ اور عربی مدارس میں کتاب وسنت کے علوم کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی۔ لیکن علما کا تعصب اور

حکومت کا تشدد ان کے خیالات کے پھیلنے میں ایک بڑی رکاوٹ بنا رہا ہمارے علما لکیر کے فقیر بن گئے۔ ان کی ساری تگ و دو ان عقلی علوم کی ترتیب و تہذیب یا اپنے پہلے کی کتابوں کی شرح و اختصار پر محدود ہو گئی۔ اگر قیاس آرائیوں کو چھوڑ کر استقراء پر زیادہ زور دیا جاتا اور طبعیات کی تحقیق کی طرف توجہ دی جاتی تو بہت سی نئی تحقیقات و ایجادات آج سے کئی سو سال پہلے منصۂ شہود پر آ جاتیں یہ نیا راستہ مغربی علوم کی آمد سے کھلا۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس نئے راستے کے پہلے رہبر امام موصوف قرار پاتے ہیں۔ جنہوں نے فکر و نظر کے اندر ایک عظیم الشان انقلاب کی داغ بیل ڈالی۔ اور لوگوں کو حقیقی طور پر غور و فکر کی دعوت دی، منطق کے اصول اور مسلمات پر خالص عقلی اور فنی حیثیت سے بحث کی۔ اس کی بہت سے تعریفات اور حدود کو مخدوش قرار دیا۔ قضایا کی تعداد اور ان کی ترتیب سے اختلاف کیا۔ قیاس کو چھوڑ کر استقراء کے اصول کی فضیلت جتائی اور اس کو علم و یقین کے حصول کا طبعی، سہل اور محفوظ طریقہ بتلایا۔

فلاسفہ و متکلمین و منطقیین پر کڑی تنقیدیں

امام موصوف نے اپنی کتابوں میں جا بجا مسلمان فلاسفہ و متکلمین و منطقیین پر بڑی سخت تنقیدیں کی ہیں۔ شیخ بو علی بن سینا، امام غزالی، امام رازی، شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول، شیخ محی الدین بن عربی، شیخ عبدالحق بن سبعین وغیرہ کو جا بجا مطعون کیا ہے اور ان کے متعلق بہت بری رائے ظاہر کی ہے۔ انہوں نے کئی جگہ بہت ہی سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ علمی مباحث میں اس قسم کی دل آزار تحریریں نہیں ہونی چاہئیں۔ ہر ایک نے اپنے نظریہ کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کی کچھ نہ کچھ خدمت کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا عربی ادب میں ایک مقام ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم کئی جگہ بیان کر چکے ہیں کہ امام ابن تیمیہ میں غیر معمولی حدت اور شدت تھی۔ وہ جوش میں آ کر ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جو علمی مباحث میں مناسب نہیں ہوتیں۔ اگر ان کی یہ حدت اور شدت نہ ہوتی تو ان کا زبردست سے زبردست مخالف بھی ان کا احترام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ لیکن ان کی ان فطری کمزوریوں کی بنا پر امام موصوف کی غیر معمولی قابلیت اور لیاقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تمام تصنیفات ان کی فطری ذہانت و ذکاوت پر شاہد ہیں۔ اس سے کسی کو کوئی انکار نہیں ہو سکتا۔

شخصیت پرستی سے اِنکار

قید اور وفات

قرآن مجید نے خدا، انسان اور دوسری مخلوقات میں ہر ایک کی حیثیت اور اس کا درجہ متعین کر دیا ہے۔ خدا ساری کائنات کا خالق و مالک اور مطلق العنان حاکم اور فرمانروا ہے۔ اس کے حکم اور فرمان کی کوئی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ انسان اس زمین پر خدا کا نائب اور خلیفہ ہے۔ وہ تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ شریف ہے، ساری کائنات اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ دوسری تمام مخلوقات اس سے فروتر اور اس کے تابع ہیں۔ لیکن انسان بعض اوقات اپنی ناواقفیت اور جہالت کی بنا پر ان دیکھی طاقتوں سے مرعوب ہو جاتا ہے اور کائنات کی مختلف چیزوں اور قوتوں کو خدا کا پرتو سمجھ کر ان کے سامنے سر جھکا دیتا ہے کبھی تو وہ سورج، چاند اور دوسرے ستاروں کو پوجتا ہے اور کبھی اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کے سامنے اپنا سر خم کر دیتا ہے، کتاب و سنت کی اکثر تعلیمات اسی شرک و بت پرستی کے خلاف ہیں۔ اسلام نے کھلی بت پرستی کا تو خاتمہ کر دیا اور مسلمانوں میں شرک جلی باقی نہیں رہا۔ مگر شرک خفی کی بعض صورتیں جیسے کہ شخصیت پرستی، پیر پرستی، توہم پرستی، قبر پرستی وغیرہ ہیں، جو آنحضرت ﷺ اور صحابہ و تابعین کے دور کے بعد مسلمانوں کے جاہل طبقوں میں جاری ہو گئیں۔ کتاب و سنت ان باتوں کے سخت مخالف ہیں اور علمائے حق ہر زمانہ میں اس کی تردید کرتے ہوئے آ رہے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا مرتبہ

خدا کی تمام مخلوقات میں سب سے افضل انسان ہے، ان انسانوں میں سب سے افضل مومنین و مسلمین ہیں اور ان میں سے وہ لوگ افضل ہیں جو کتاب و سنت پر پوری طرح عمل کرتے ہیں پھر ان سب میں آنحضرت ﷺ کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ آپ سے بڑھ کر

کسی اور کی حیثیت نہیں ہے اس کے باوجود آپ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔ اور آپ کو خدا کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لا تطرونی کما اطرت النصاری ابن مریم فانما انا عبدہ فقولوا عبداللہ و رسولہ)) [1]

''تم میری مدح وثنا میں اتنا غلو اور مبالغہ نہ کرو جس طرح نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا۔ میں تو اس کا بندہ ہوں اس لیے تم بھی یہی کہو کہ میں اس کا بندہ اور رسول ہوں۔''

جب کبھی آپ کے ساتھیوں میں سے کسی نے مبالغہ آمیز الفاظ میں آپ کی تعریف و توصیف کی تو آپ نے فوراً ہی ان کو ٹوکا اور کہا کہ ایسا مت کہو۔ چنانچہ سنن ابی داؤد کی روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: انا نستشفع بك على اللّٰه و نستشفع باللّٰه عليك ''ہم آپ کے ذریعہ خدا کے پاس سفارش چاہتے ہیں اور اللہ کے ذریعہ آپ کے پاس سفارش طلب کرتے ہیں۔'' اس پر آپ بہت بگڑے اور کہا: ((ویحك اتدری ما اللہ؟ ان اللہ لا یستشفع بہ علی احد من خلقہ شان اللہ اعظم من ذلك)) ''تف ہے تجھ پر، کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ کیا ہے؟ اللہ کے ذریعے اس کی کسی مخلوق کے پاس سفارس نہیں کی جاسکتی۔ خدا کی شان اس سے بھی بہت بلند ہے۔'' [2]

اسی طرح ایک مرتبہ ایک منافق کی ایذا رسانی اور دل آزاری سے تنگ آ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: چلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کر کے ہم اس منافق سے چھٹکارا حاصل کریں یہ سن کر آپ نے ٹوکا اور کہا: ((انہ لا یستغاث بی و انما یستغاث باللہ)) ''بے شک مجھ سے استغاثہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ خدا ہی سے استغاثہ کیا جاسکتا ہے۔'' [3]

لیکن آگے چل کر جب پیر پرستی کا رواج ہوا تو لوگ بات بات میں مرے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب احادیث الأنبیاء، باب قول اللّٰه تعالی: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ....﴾، ح: ٣٤٤٥۔ [2] ابو داود، کتاب السنة، باب فی الجهمية: ٤٧٢٦۔

[3] مجمع الزوائد: ١٠/ ١٥٩، ح: ١٧٢٧٦ وقال الهيثمی رواه الطبرانی و رجاله رجال الصحيح غير ابن لهيعة وهو حسن الحديث۔

ہوئے بزرگوں سے استغاثہ کرنے لگے۔ جب امام ابن تیمیہ سے اس کے متعلق فتویٰ پوچھا گیا تو انہوں نے غیر اللہ سے استغاثہ کرنے والوں کی سخت مذمت کی اور لکھا کہ غیر اللہ سے استغاثہ درحقیقت ایک طرح کا شرک ہے۔ شریعت محمدی سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے اللہ اور اس کے رسول نے نہ تو کہیں اس کا حکم دیا ہے اور نہ صحابہ و تابعین نے اپنے زمانہ میں ایسا کیا ہے۔ اور نہ ائمہ مسلمین میں سے کسی نے اس کو پسند کیا ہے۔ تاریخ سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آفت اور مصیبت کے وقت کسی صحابی نے آپ کی قبر پر پہنچ کر آپ کی دہائی دی ہو۔ حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان زبردست لڑائیاں ہوئیں اور بعض اوقات بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں اس کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر جاتے تو صرف درود و سلام بھیج کر واپس ہو جاتے امام مالک نے تو اس کو بھی ناپسند کیا ہے کہ کوئی شخص قبر نبوی پر کھڑے ہو کر اپنے لیے خدا سے دعا کرے کیونکہ یہ ایک بدعت ہے جس کا سراغ صحابہ و تابعین کے اعمال و افعال میں نہیں ملتا۔

قرآن مجید نے مطلق استغاثہ کی نسبت صرف خدا کی طرف کی ہے چنانچہ فرمایا:

﴿ إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ ﴾ [1]

"جب تم اپنے پروردگار کو مدد کے لیے پکار رہے تھے اور اس نے تمہاری پکار قبول کی۔"

حدیثوں میں بھی مطلق استغاثہ کی نسبت خدا ہی کی طرف کی گئی ہے چنانچہ ایک دعا میں کہا گیا ہے:

((یا حی یا قیوم برحمتك استغیث اصلح لی شانی کله ولا تکلنی الی نفسی طرفة اعین ولا الی احد من الناس)) [2]

"یا حی یا قیوم، تیری رحمت کے ذریعہ مدد چاہتا ہوں، میری پوری حالت کو بہتر بنا دے اور ایک پل کے لیے بھی مجھ کو اپنے نفس کے حوالے نہ کر اور نہ لوگوں میں سے کسی کا محتاج بنا۔"

---

[1] ۸/الانفال:۹۔ [2] المعجم الصغیر للطبرانی: ۱/ ۲۷۰، ح: ٤٤٤۔

حضرت معروف کرخی اکثر واغوثاہ کا نعرہ لگایا کرتے تھے۔ حضرت ابو یزید بسطامی کا قول ہے "استغاثة المخلوق بالمخلوق كاستغاثة الغريق بالغريق" ایک مخلوق کا دوسری مخلوق سے استغاثہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک ڈوبنے والا آدمی دوسرے ڈوبنے والے کو پکار رہا ہو۔ شیخ ابو عبداللہ القرشی کا قول ہے "استغاثة المخلوق بالمخلوق كاستغاثة المسجون بالمسجون" ایک مخلوق کا دوسری مخلوق سے استغاثہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک قیدی دوسرے قیدی کو پکار رہا ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ جب آنحضرت ﷺ ہی سے استغاثہ نہیں کیا جا سکتا تو پھر حضرت عبدالقادر جیلانی یا کسی اور بزرگ سے کیونکر استغاثہ کیا جا سکتا ہے۔

اب رہا قرآن مجید میں استغاثہ کی نسبت ایک مخلوق کی طرف جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے ﴿فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِىْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِىْ مِنْ عَدُوِّهٖ﴾ پس وہ شخص جو ان کے پیروؤں میں سے تھا اس شخص کے خلاف ان سے مدد چاہی جو ان کے دشمنوں سے تھا۔ اس سے مراد مقید استغاثہ ہے اس لیے یہاں استغاثہ کا صیغہ من اور علی کے صلوں کے ساتھ آیا ہے جس کے معنی جسمانی امداد و اعانت کے ہیں روحانی امداد تو وہ خاص خدا کا حصہ ہے۔

آنحضرت ﷺ کا وسیلہ ڈھونڈنا

حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں لوگ آپ کے پاس آتے تھے اور آپ سے دعا کے طالب ہوتے تھے اور آپ ان کے لیے دعا فرمایا کرتے تھے۔ خدا نے بھی لوگوں کو یہ تعلیم دی۔

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴾ [1]

"اور اگر وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے کے بعد تیرے پاس آتے اور خدا سے مغفرت چاہتے اور رسول ان کے لیے مغفرت طلب کرتا تو وہ البتہ خدا کو توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا پاتے۔"

---

[1] ٤/النساء: ٦٤۔

آپ کی زندگی میں آپ کی دعاؤں سے لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ ایک مرتبہ ایک بدو آیا اور قحط سالی کی شکایت کرتے ہوئے کہا: "یا رسول الله هلكت الاموال وانقطعت السبل فادع الله یغثنا" یارسول اللہ! ہمارے مال برباد ہو گئے اور راستے منقطع ہو گئے، اللہ سے دعا کیجئے تاکہ ہم پر پانی برسائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً یہ دعا فرمائی: ((اللهم اغثنا اللهم اغثنا اللهم اغثنا)) اے اللہ! پانی برسا، اے اللہ! پانی برسا، اے اللہ! پانی برسا۔ اس وقت آسمان میں ابر کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا، سمندر سے ایک گھٹا اٹھی اور آن کی آن میں سارے آسمان پر چھا گئی اور پھر تھوڑی دیر میں موسلا دھار بارش ہونے لگی ایک ہفتہ اتنا پانی برسا کہ سارے بیابان جل تھل ہو گئے اور عمارتیں گرنے لگیں۔ وہی بدو پھر آیا اور کہا: "یا رسول الله انقطعت السبل وتهدم البنیان فادع الله یکشفها عنا" یارسول اللہ! سارے راستے کٹ گئے اور عمارتیں منہدم ہو گئیں، خدا سے دعا فرمایئے کہ اس کو ہم سے ہٹا دے۔ آپ نے دعا فرمائی: ((اللهم حوالینا ولا علینا اللهم علی الآكام والظراب ومنابت الشجر وبطون الاودية)) "اے اللہ! یہ پانی ہم پر نہ برسا بلکہ ہمارے اطراف برسا۔ اے اللہ! یہ پانی ٹیلوں، تودوں، درختوں کی جڑوں اور وادیوں کی پہنائیوں پر برسا۔" آپ کا یہ فرمانا تھا کہ ابر چھٹ گیا اور مطلع صاف ہو گیا۔ [1]

لیکن جب آپ کی رحلت ہو گئی تو صحابہ میں سے کسی نے بھی استسقاء کیلئے آپ کا وسیلہ نہیں ڈھونڈا بلکہ آپ کے بعد جو بزرگ زندہ تھے ان کو وسیلہ بنایا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں انس بن مالک کی روایت ہے کہ جب کبھی حضرت عمر کے زمانے میں قحط سالی ہوتی تھی تو آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب کو وسیلہ بنا کر دعا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے:

اللهم اناكنا اذا اجد بنا نتوسل اليك بنبينا فتسقينا وانا نتوسل اليك بعم نبينا فاسقنا۔ [2]

---

[1] صحیح بخاری، ابواب الاستسقاء باب الاستسقاء فی المسجد الجامع، ح: ۱۰۱۳۔ [2] صحیح بخاری، ابواب الاستسقاء، باب سوال الناس الامام الاستسقاء اذا قحطوا، ح: ۱۰۱۰۔

اے اللہ! جب کبھی ہمیں قحط سالی گھیرتی تھی تو تجھ تک اپنے رسول کو وسیلہ بناتے تھے اور تو ہم کو پانی دیتا تھا اور اب ہم اپنے نبی کے چچا کو تیری طرف وسیلہ بناتے ہیں پس تو ہمیں پانی دے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر وسیلہ مانگنے سے ذات کا وسیلہ مراد ہوتا تو یقیناً حضرت عمر آنحضرت ہی کو آپ کی وفات کے بعد بھی وسیلہ بناتے۔ جب انہوں نے آپ کو چھوڑ کر آپ کے چچا کو وسیلہ بنایا تو معلوم ہوا کہ آنحضرت کی وفات کے بعد توسل بالذات نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے امام موصوف لکھتے ہیں:

فلما عدلوا عن التوسل به الى التوسل بالعباس علم ان مايفعل فى حياته قد تعذر بموته بخلاف التوسل الذى هو الايمان به والطاعة له فانه مشروع دائما۔

پس جب صحابہ نے آپ کو چھوڑ کر حضرت عباس کو وسیلہ بنایا تو معلوم ہوا کہ آنحضرت کی زندگی میں جو ہوسکتا تھا اس کا ہونا آپ کی موت کے بعد ناممکن ہوگیا بخلاف اس توسل کے جو آپ پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت سے ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ کیلئے مشروع ہے۔

یہ اس لیے کہ قرآن مجید میں خود اس کی ہدایت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۳۵ ﴾ [1]

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ چاہو اور اس کے راستے میں جہاد کرو شاید کہ تم کامیاب رہو۔"

یہاں سیاق سباق خود ظاہر کرتا ہے کہ اس وسیلہ سے مراد تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ ہی کا وسیلہ ہے۔

ایک دوسری جگہ بھی جہاں وسیلہ کا ذکر آیا ہے اس سے مراد امید رحمت اور خوف عذاب کا

---

[1] ۵/المائدۃ:۳۵۔

وسیلہ ہے چنانچہ فرمایا:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَ لَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝﴾ [1]

''اے پیغمبر! کہہ دو ان لوگوں کو پکارو جن کو تم خدا سمجھتے ہو۔ وہ تم سے مضرت کے دور کرنے یا بدل دینے کے مالک نہیں ہیں۔ وہ لوگ جن کو وہ پکارتے ہیں اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ ان میں سے کون اس کے قریب ہے۔ اس کی رحمت کی امید کرتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے پروردگار کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔''

حدیثوں میں بھی وسیلہ کا لفظ جہاں آیا ہے اس سے جنت کا ایک درجہ مراد ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((سلوا الله لی الوسیلة فانها درجة فی الجنة لا تنبغی الا لعبد من عباد الله وارجو ان اکون انا ذلك العبد فمن سال الله لی الوسیلة حلت علیه شفاعتی یوم القیامة)) [2]

''تم میرے لیے اللہ سے وسیلہ مانگو کیونکہ وہ جنت میں ایک درجہ ہے جو کسی کے لیے مناسب نہیں ہے سوائے بندوں میں سے ایک بندے کے اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہوں گا۔ پس جس نے بھی میرے لیے اللہ سے وسیلہ چاہا پس قیامت کے دن اس کیلئے میری شفاعت حلال ہو جائے گی۔''

نیز آپ نے اذان سننے کے بعد یہ دعا مانگنے کی ہدایت فرمائی:

((اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوة القائمة آت محمدا

---

[1] ١٧/بنی اسرائیل:٥٦_٥٧_ [2] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب القول مثل قول المؤذن......ح: ٣٨٤ (٨٤٩)؛ سنن الکبریٰ للبیهقی: ١٩٣٠_

الوسیلة والفضیلة وابعثه مقاما محمودا الذی وعدته)) [1]

''اے اللہ! اس دعوت تامہ اور صلاۃ قائمہ کے پروردگار! محمد (ﷺ) کو وسیلہ اور فضیلت عطا کر اور ان کو اس مقام محمود پر اٹھا جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔''

مسند امام احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں مروی ہے کہ ایک نابینا شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: یارسول اللہ! اللہ سے دعا کیجئے کہ میری بینائی واپس آجائے۔ آپ نے فرمایا: ''اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے دعا کروں اور اگر چاہو تو صبر کرو اور صبر کرنا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔'' نابینا نے کہا: بلکہ دعا ہی فرمایئے تاکہ مجھے بینائی مل جائے۔ آپ نے فرمایا: ''جاؤ اور وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھو اور پھر صدق دل سے یہ دعا کرو۔''

((اللهم انی اسالك واتوسل الیك بنبیك محمد نبی الرحمة یا محمد یا رسول الله انی اتوسل بك الی ربي فی حاجتي لیقضیها لی اللهم شفعه فی)) [2]

''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف تیرے نبی محمد نبی رحمت کے ذریعے وسیلہ ڈھونڈتا ہوں یا محمد اور اے اللہ کے رسول بے شک میں تیرے ذریعے اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتا ہوں تاکہ میری یہ ضرورت پوری کرے۔ اے اللہ! تو اس کو میرے بارے میں شفیع بنا۔''

اس روایت کے الفاظ میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی میں اتوسل الیك اور کسی میں اتوجه الیك اور کسی میں ان یکشف بصری ہے۔ مگر ان تمام روایتوں کا معنی و مطلب اور مقصد ایک ہے۔ الغرض جب اس نابینا نے اس طرح دعا کی تو اس کو بصارت مل گئی۔

اس حدیث سے بعض کا استدلال یہ ہے کہ آنحضرت سے زندگی میں اور وفات کے بعد وسیلہ ڈھونڈنا جائز ہے۔ ان کے نزدیک یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وسیلہ ڈھونڈنے والے کے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الدعاء عند النداء، ح: ٦١٤۔

[2] سنن الترمذی، کتاب الدعوات، باب......ح: ٣٥٧٥؛ ابن خزیمة: ١٢١٩؛ ابن ماجه: ١٣٨٥۔

لیے آنحضرت ﷺ دعا بھی فرمائیں اس شخص کا صرف وسیلہ ڈھونڈنا کافی ہے اور خدا وسیلہ ڈھونڈنے کی وجہ سے اس کی دعا کو قبول کر لے گا۔ نابینا نے جس طرح دعا کی اس طرح آج بھی ہم اسی قسم کی دعا مانگ سکتے ہیں۔ اس پر امام موصوف تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قول هولاء باطل شرعا وقدرا فلاهم موافقون لشرع الله ولا مايقولونه مطابق لخلق الله۔[1]

ان لوگوں کا قول شرع وقدر کے لحاظ سے باطل ہے پس وہ نہ تو اپنی باتوں میں اللہ ہی کی شریعت کے مطابق ہیں اور نہ خلق اللہ ہی کے مطابق ہیں۔

امام ابن تیمیہ کا خیال تھا کہ اس قسم کا وسیلہ صرف آپ کی زندگی میں تھا۔ وفات کے بعد کسی نے اس قسم کا وسیلہ نہیں ڈھونڈا کیونکہ کوئی آپ سے مل کر دعا کی درخواست نہیں کر سکتا تھا۔ اگر زندگی اور موت میں اس قسم کا توسل ایک ہی ہوتا اور کسی کے لیے آنحضرت کا کھلے طور پر دعا مانگنا یا دعا نہ مانگنا برابر ہوتا تو صحابہ کرام آپ کی زندگی کے بعد آپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ جب صحابہ میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا تو پھر ہمیں کیا حق ہے۔ کہ اس قسم کا توسل کریں حالانکہ صحابہ کرام و تابعین ہم سے بڑھ کر شریعت کے جاننے والے تھے۔ اس سے امام موصوف یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔

فما زال المسلمون يسئالون رسول الله ﷺ فی حياته ان يدعوا لهم واما بعد موته فلم يكن الصحابة يطلبون منه الدعا لا عند قبره ولاعند غير قبره كما يفعله كثير من الناس عند قبور الصالحين يسال احدهم حاجته اويقسم على الله به ونحو ذلك[2]

پس مسلمان رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں آپ سے دعا کی درخواست کرتے رہتے تھے۔ لیکن آپ کی موت کے بعد صحابہ آپ سے نہ تو قبر کے پاس اور نہ غیر قبر پر دعا کی درخواست کرتے تھے جیسا کہ آج کل کے بہت سے لوگ صالحین

---

[1] قاعده جليلة: ۱۳۶۔ [2] قاعده جليلة: ۱۳۷۔

کی قبروں پر دعا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک اس بزرگ سے اپنی حاجت طلب کرتا ہے یا ان کا نام لے کر اللہ پر قسم کھاتا ہے یا اس طرح کا کوئی کام کرتا ہے۔

حدیثوں میں ہے کہ غائب کی دعا غائب کیلئے حاضر سے زیادہ مفید ہوتی ہے کیونکہ غائب کی دعا میں اخلاص زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس لیے اس میں قبولیت کی کیفیت ہوتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکالا نہیں جاسکتا کہ ایک غائب آدمی دوسرے غائب آدمی کو وسیلہ بنا سکتا ہے۔ ایک مخلوق دوسری مخلوق کو اتنا ہی فائدہ پہنچا سکتی ہے جو اس کی قدرت اور طاقت میں ہو۔ ایک شخص دوسرے کیلئے صرف مخلصانہ دعا کرسکتا ہے اور بس۔ اس کا قبول کرنا اور نہ کرنا خدا کے اختیار میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملائکہ اور انبیاء اور بزرگان وصالحین سے دعا کی درخواست کی جاسکتی ہے لیکن جب وہ موجود نہیں ہیں تو پھر ان سے کیونکر درخواست کی جاسکتی ہے۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ملائکہ انسانوں کیلئے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ اور انبیاء وصالحین کے متعلق حدیثوں میں آیا ہے کہ وہ مرے نہیں ہیں زندہ ہیں۔ امام موصوف لکھتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ انبیاء وصالحین ملائکہ کی طرح اپنی قبروں سے ہمارے لیے دعا کرتے ہوں۔ مگر شریعت کی رو سے ہمیں کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے۔ کہ ہم ان سے اعانت وامداد طلب کریں یا ان سے دعا کی درخواست کریں کیونکہ سلف میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا چنانچہ لکھتے ہیں:

فنهیٰ سبحانه عن دعاء الملائكة والانبياء مع اخباره لنا ان الملائكة يدعون لنا ويستغفرون ومع هذا فليس لنا ان نطلب ذلك منهم وكذلك الانبياء والصالحون وان كانوا احياء فی قبورهم وان قدر انهم يدعون للاحياء وان وردت به آثار فليس لاحد ان يطلب منهم ذلك ولم يفعل ذلك احد من السلف لان ذلك ذريعة الى الشرك بهم وعبادتهم من دون اللّٰه تعالىٰ بخلاف الطلب من احدهم فی حياته فانه لايفضی الى الشرك ولان ماتفعله الملائكة ويفعله

الانبياء والصالحون بعد الموت هو بالامر التكوينى - فلايوثر فيه سوال السائلين بخلاف سوال احدهم فى حياته فانه يشرع اجابة السائل و بعدالموت انقطع التكليف عنهم۔ 1

پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ملائکہ اور انبیاء سے دعا کرنے سے منع فرمایا، باوجود اس خبر دینے کے کہ ملائکہ ہمارے لیے دعا اور مغفرت چاہتے ہیں۔ تاہم ہمیں ان سے طلب کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح انبیاء اور صالحین اپنی قبروں میں زندہ ہونے کے باوجود اور یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ وہ زندوں کیلئے دعا کرتے ہیں اگرچہ اس کے متعلق حدیثیں بھی آئی ہیں کسی کو یہ جائز نہیں ہے کہ ان سے کچھ طلب کرے۔ سلف میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے ان کے ساتھ شرک کا ذریعہ بن جاتا ہے اور خدا کو چھوڑ کر ان کی پوجا ہونے لگتی ہے۔ بخلاف زندگی میں کسی سے کچھ طلب کرنے میں۔ کیونکہ یہ شرک کی طرف نہیں لے جاتا ملائکہ جو کچھ کرتے ہیں وہ ایک امر تکوینی ہے۔ سوال کرنے والوں کا سوال اس پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ بخلاف کسی کی زندگی میں سوال کرنے کے۔ کیونکہ سوال کرنے والے کا جواب دینا مشروع ہے۔ مگر موت کے بعد یہ لوگ جواب دینے کے مکلف نہیں ہوتے۔

امام ابن تیمیہ جب مصر میں تھے تو ۷۱۱ھ میں ان سے توسل بالنبی کے متعلق سوال کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس کا تفصیلی جواب دیا۔ اور پھر جب دمشق آئے تو ان کے سامنے مختلف سوالات وقتاً فوقتاً پیش ہوتے رہے۔ انہوں نے اس مسئلہ کے متعلق قاعدة جليله فى التوسل والوسيلة، الواسطة بين الحق والخلق وغیرہ کے نام سے کچھ رسائل لکھے ہیں۔ ان سب میں وہ وسیلہ کے دو معنی لیتے ہیں۔ ایک یہ کہ آنحضرت سے آپ کی زندگی میں دعا کی درخواست کریں اور ان سے شفاعت طلب کریں۔ دوسرے یہ کہ آپ کی وفات

---

1 قاعده جليله فى التوسل والوسيلة: ۱۳۹۔۱۴۰۔

کے بعد آپ پر ایمان لا کر اور آپ کی اطاعت کر کے خدا سے دعا کریں۔ یہ دونوں معنی ٹھیک ہیں۔اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔مگر آپ کے انتقال کے بعد آپ کی ذات کو وسیلہ بنائیں اس مسئلہ میں ابن تیمیہ نے عام علمائے وقت کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ان کا کہنا یہ ہے کہ حاجت برآری کے واسطے آنحضرت سے وسیلہ لینے میں صحابہ وتابعین کے عمل سے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا۔ جب ہمارے اگلوں نے یہ کام نہیں کیا تو پھر ہم پچھلوں کو کیا حق ہے کہ اس قسم کا وسیلہ اختیار کریں۔اب رہا قیامت کے دن آپ کی شفاعت تو اس سے امام ابن تیمیہ کو بھی انکار نہیں ہے۔ وہ جا بجا لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سید الشفعاء ہیں۔آپ نے اپنی زندگی میں لوگوں کیلئے دعا اور مغفرت مانگی اور قیامت کے دن خدا کی اجازت سے وہ تمام گناہگار مسلمانوں کی شفاعت کریں گے۔آپ کی یہ شفاعت صرف مومنوں اور مسلمانوں کیلئے ہوگی، کافروں کیلئے یہ شفاعت نہیں ہوگی آپ کو اپنی زندگی میں کافروں اور منافقوں کیلئے مغفرت طلب کرنے سے منع کیا گیا تھا۔آپ کے چچا ابو طالب آپ کے بڑے ہمدرد اور معاون تھے۔ اس کے باوجود ابو طالب کو نجات نہیں مل سکی۔آپ نے اپنی والدہ کیلئے مغفرت مانگنے کی اجازت چاہی جو نہ مل سکی۔آپ کو قبر کی زیارت کرنے کی اجازت دی گئی اور جب زیارت کیلئے قبر پر گئے تو آپ رو پڑے اور آپ کے ساتھ دوسرے بھی رو پڑے۔ صحیح مسلم میں یہ روایتیں موجود ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی شفاعت

مذکورہ بالا تحریر سے صاف اندازہ ہوسکتا ہے کہ امام ابن تیمیہ کو آنحضرت ﷺ کے شفیع الامم ہونے سے انکار نہیں تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت کا اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپ ہر ایک گنہگار مومن اور مسلم کی شفاعت کریں گے۔اور ہر اس شخص کو دوزخ سے نکال لیں گے جس کے دل میں رائی برابر کا بھی ایمان ہوگا۔صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ قیامت کے دن آپ کی شفاعت کس کو حاصل ہوگی۔آپ نے فرمایا: ’’میری شفاعت ہر اس شخص کیلئے ہوگی جس نے

صدق دل سے لا الہ الا اللہ کہا۔'' 1 یعنی توحید کا اعتراف کیا نیز صحیح مسلم میں ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ہر ایک نبی کو ایک مقبول دعا دی گئی تھی۔ ہر ایک نے جلدی کر کے اپنی دعا مانگ لی۔ مگر میں نے اپنی دعا کو بچائے رکھا۔ میں قیامت کے دن اپنی امت کے ہر اس شخص کی شفاعت کروں گا جس کی موت شرک پر نہیں ہوئی ہے۔'' 2

جاہ و مرتبہ سے سوال

مسلمانوں میں ایک دستور یہ ہو چلا تھا کہ لوگ نبی اور رسول کے جاہ و مرتبہ کا واسطہ دے کر دعا کرتے تھے مثلاً اللھم بجاہ نبیك المصطفی ورسولك المرتضیٰ ، یا اللھم انا نسئلك بجاہ نبیك یا اللھم انا نقسم علیك ببنیك او بجاہ نبیك۔ اس کے جواز میں عموماً یہ روایت بیان کی جاتی تھی کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((واذا سألتم اللّٰہ فأسالوہ بجاھی فان جاھی عنداللّٰہ عظیم)) 3

''اور جب اللہ سے کچھ مانگو تو میرے جاہ کا واسطہ دے کر سوال کرو کیونکہ اللہ کے نزدیک میری جاہ بہت بڑی ہے۔''

امام موصوف لکھتے ہیں کہ اہل علم میں سے کسی نے اس کو روایت نہیں کیا ہے۔ یہ حدیث موضوع ہے۔ امام موصوف کو اعتراف ہے کہ تمام انبیاء میں آنحضرت ﷺ کا درجہ بہت اونچا تھا۔ اللہ نے حضرت موسیٰ کے متعلق فرمایا: ﴿وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ؕ﴾ 4 ''موسیٰ اللہ کے نزدیک وجیہ تھے۔'' اور حضرت عیسیٰ کے متعلق فرمایا: ﴿وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ 5 ''عیسیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں وجیہ ہیں۔'' ان کے مقابلہ میں قرآن کی بہت سی آیتیں بتاتی ہیں کہ ایک بڑے سے بڑا نبی بھی خدا کے سامنے اپنی بڑائی اور بزرگی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ خالق کے نزدیک کسی مخلوق کا وہ درجہ نہیں ہو سکتا جو ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے نزدیک ہوتا

---

1 صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الحرص علی الحدیث، ح: ۹۹۔

2 صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اختباء النبي ﷺ دعوة......: ۱۹۹ (٤٩١)

3 سلسلة الاحادیث الضعیفة: ۲۲۔

4 ۳۳/الاحزاب: ۶۹۔ 5 ۳/آل عمران: ٤٥۔

ہے۔ایک مخلوق دوسری مخلوق کی رضامندی کے بغیر بھی کسی کی سفارش کرسکتا ہے۔مگر کوئی مخلوق خالق کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش نہیں کرسکتا۔خدا نے صاف بتایا ہے کہ آسمان وزمین میں جو بھی ہیں وہ ایک دن اس کے سامنے بندہ بن کر آنے والے ہیں (مریم۔٦) حضرت عیسیٰ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ وہ خدا کا بندہ ہونے سے انکار نہیں کرسکتے۔اسی طرح مقرب فرشتے بھی اس کی بندگی سے منہ نہیں موڑ سکتے اور جو بندہ بھی انکار یا تکبر کرے گا اس کو قیامت کے دن سخت عذاب ہوگا۔

زیارت قبور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے خطرہ تھا کہ لوگ آگے چل کر اپنے بزرگوں کی قبروں کو پکی بنا کر ان کو پوجنے لگیں گے۔اسی لیے آپ نے قبروں کو پکی کرنے سے منع کیا اور ابتداء میں قبروں کی زیارت سے بھی روکا۔لیکن جب مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح ہوگئی اور ان کے اندر حق و باطل کی تمیز کی قوت پیدا ہوگئی تو انہیں قبروں کی زیارت کی اجازت دے دی۔ آپ نے فرمایا:”میں نے تمہیں پہلے قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔اب تم قبروں کی زیارت کرو کیونکہ یہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں“ اور پھر آپ نے قبروں کی زیارت کا ایک خاص طریقہ بتایا اور فرمایا:”جب تم قبرستان میں داخل ہو تو یہ دعا پڑھو۔“

((السلام علیکم اهل الدیار من المؤمنین والمسلمین انتم سلفتم لنا وانا ان شاء اللّٰه بکم لاحقون یرحم اللّٰه المستقدمین منا ومنکم والمستأخرین نسال الله لنا ولکم العافية اللهم لاتحرمنا اجرهم ولا تفتنا بعدهم))[1]

”تم پر سلامتی ہو اے مومنین و مسلمین قبروں کے رہنے والو! تم ہم سے آگے جا چکے اور ہم خدا چاہے تو تمہارے ساتھ آکر ملنے والے ہیں۔خدا ہم میں سے اور تم میں سے جو آگے جا چکے ہیں اور جو بعد میں آنے والے ہیں ان سب پر رحم

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب ما یقال عند دخول القبور......: ٩٧٤ (٢٢٥٥)؛ ابو داود: ٣٢٣٧۔

کرے، ہم اللہ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت چاہتے ہیں، اے اللہ! ہمیں ان کے اجر سے محروم نہ رکھ اور ان کے بعد ہم کو آزمائش میں مت ڈال۔

یہ دعا بالکل صاف اور سادہ ہے اور ایک زائر کے دل میں موت اور ثواب و عذاب کا حقیقی احساس پیدا کرتی ہے اس میں مُردوں سے کوئی امداد اور اعانت طلب نہیں کی گئی ہے۔ تاہم آپ کو یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ آپ کی امت ان قبروں کی وجہ سے بہت سی آزمائشوں میں پڑ جائے گی اس لیے آپ آخری وقت تک قبر پرستی سے ڈراتے رہے۔ آپ نے بارہا فرمایا: ''خدا یہودیوں اور نصرانیوں پر لعنت کرے اور ان پر خدا کا غصہ نازل ہو کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنالیا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ تم ان کی طرح اپنے نبی کی قبر کو مسجد نہ بنالینا۔'' [1] آپ نے یہ بھی فرمایا: ''تم سے پہلے کے لوگ اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے تم ایسا نہ کرنا۔ میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔'' [2] نیز آپ نے خدا سے یہ دعا فرمائی تھی: ''اللہ میری قبر کو ایک ایسا بت نہ بنانا جو پوجا جاتا ہے۔'' [3]

یہ سب احتیاطیں محض اس لیے کی جارہی تھیں کہ آپ کی امت اگلی امتوں کی طرح شخصیت پرستی اور قبر پرستی میں مبتلا نہ ہو جائے۔ آپ نے لوگوں کے اندھے جذبۂ عقیدت ہی کا اندازہ لگا کر یہ اعلان کیا تھا کہ ((لا تشد الرحال الا الی ثلثة مساجد المسجد الحرام و مسجدی هذا والمسجد الاقصی)) [4] کجاوے باندھے نہیں جاسکتے مگر تین مسجدوں کی طرف یعنی مسجد حرام اور میری یہ مسجد (یعنی مسجد نبوی) اور مسجد الاقصیٰ۔ یہ تینوں جگہیں تقدس کا مرکز تھیں جہاں پہنچ کر انسان روحانی کیفیتیں اپنے اندر پیدا کرسکتا ہے۔ ان تینوں جگہوں کو قبروں یا تصویروں اور بتوں سے بالکل پاک صاف رکھا گیا تھا۔ چھت اور دیواروں کے سوا عمارت کے اندر کوئی چیز باقی نہیں رکھی گئی تھی، لوگ یہاں پہنچ کر پرانے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ما یکره من اتخاذ المساجد، ح: ١٣٣٠، ٣٤٥٣۔ [2] صحیح ابن حبان: ١٤/ ٣٣٤، ح: ٦٤٢٥۔

[3] مؤطا امام مالك، کتاب قصر الصلاة فی السفر، باب جامع الصلاة، ح: ٨٥؛ مسند احمد: ١٢/ ٣١٤، ح: ٧٣٥٨۔ [4] صحیح بخاری، کتاب فضل الصلاة، باب فضل الصلاة، ح: ١١٨٩؛ صحیح مسلم: ١٣٩٧ (٣٣٨٤)

تاریخی واقعات کو یاد کر کے اپنے دل میں اثر پیدا کر سکتے تھے اور ان سیدھی سادی عمارتوں سے کسی گمراہی کے پھیلنے کا اندیشہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے ان تین کے سوا دوسری طرف سواری کا اہتمام کرنے سے بالکل روکا گیا۔ کیونکہ اس سے شرک و بت پرستی کے پھیلنے کا اندیشہ تھا۔

صحابہ کرام و تابعین کے زمانے تک قبریں سادہ رہیں۔ ان پر کوئی عمارت نہیں بنائی گئی مگر جب زمانہ آگے بڑھتا گیا تو اندھی عقیدت کا دور شروع ہوا۔ سب سے پہلے شیعوں نے کوفہ، کربلا، نجف، کاظمین وغیرہ میں مقبرے اور روضے بنائے اور ان کو ہر طرح سے مزین اور آراستہ کرنا شروع کیا اور جب مصر میں فاطمیوں کی سلطنت قائم ہوئی تو انہوں نے سیدنا امام حسین کا سر مبارک قاہرہ لا کر اس جگہ دفن کیا جس پر آج مسجد سیدنا حسین کے نام سے ایک شاندار مسجد قائم ہے۔ ابن النعمان المفید الشیعی نے مناسک الحج کے طریقہ پر مناسک المشاہد کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں ان مزاروں کی زیارت کو حج کا مرتبہ دیا تھا۔ شیعوں کی دیکھا دیکھی سنیوں نے بھی اپنے بزرگوں کی قبریں پکی بنوانی شروع کیں اور ان پر روضے اور قبے قائم کرنے لگے۔ ملک شام و مصر اور تمام عالم اسلامی میں اس قسم کی بے شمار عمارتیں تیار ہوگئیں۔ انبیاء میں سے حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت یونس، حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ علیہم السلام وغیرہ کی قبریں نکل آئیں جن کے متعلق تاریخی طور پر کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا کہ انہی کی قبر ہے۔ اگر واقعی طور پر غور کیا جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے سوا کسی نبی کی مصدقہ قبر موجود نہیں ہے۔ حضرت عمر کے زمانہ میں حضرت دانیال کی قبر نکل آئی تو حضرت عمر نے کئی قبریں کھدوا کر ایک قبر میں اس لاش کو دفن کر دیا اور پھر لوگوں کو اس کا پتہ بھی نہیں چل سکا کہ حضرت دانیال کی قبر کونسی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت سے سچی اور صحیح عقیدت رکھنے سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ مگر لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی کئی حدیثیں بنا ڈالیں۔ مثلاً ایک حدیث یہ بنائی من حج ولم یزرنی فقد جفانی ''جو بھی حج کرے اور میری زیارت نہ کرے اس نے بیشک مجھ پر ظلم کیا۔'' نیز یہ بھی حدیث بنائی من زارنی بعد مماتی فکانما

زارنی فی حیاتی ''جو بھی میری وفات کے بعد میری زیارت کرے گا وہ گویا اس شخص کے مانند ہوگا جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔'' اس حدیث کی رو سے تو صحابہ کرام اور بعد کے لوگ ایک درجہ میں آجاتے ہیں۔ آپ کے بعد ہر وہ شخص جس نے آپ کی قبر کی زیارت کرلی وہ آپ کا صحابی ہوگیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کسی حال میں صحیح نہیں ہوسکتا۔

اولیاءاللہ کی تعداد اتنی ہے کہ گنی نہیں جاسکتی۔ ان میں سے مشہور لوگوں کی قبریں رفتہ رفتہ عوام کی زیارت گاہ بن گئیں۔ معروف کرخی، جنید بغدادی، فندلاوی، ابونصر مقدسی، برہان الدین بلخی، شیخ ابوالفرج، شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ احمد رفاعی، رابعہ عدویہ، سیدہ نفیسہ، شیخ ابوعمر دمشقی وغیرہ کی قبروں پر شاندار مقبرے تعمیر ہوتے چلے گئے اور ان کی بزرگی کے متعلق عجیب و غریب قصے اور کہانیاں مشہور ہوتی چلی گئیں۔ ان کے متعلق یہ حدیث گھڑی گئی کہ اذا عیتکم الامور فعلیکم باصحاب القبور ''جب تم پر امور دشوار اور تنگ ہوجائیں تو تم اصحاب قبور کا دامن تھام لو۔'' سیدہ نفیسہ کے متعلق مشہور تھا کہ یہ مصر کی پاسبان ہیں جو کوئی ان کے پاس پناہ لیتا ہے۔ اس پر کوئی آفت نہیں آتی۔ امام موصوف کے زمانہ میں چار قبریں تھیں جن کے متعلق یہ مشہور ہوگیا تھا کہ ان پر کھڑے ہوکر دعا کرنے سے دعا مقبول ہوجاتی ہے اور وہ مسترد نہیں کی جاتی۔ اور لطف یہ کہ چاروں قبریں چار مذاہب یعنی حنفی، مالکی، شافعی، اور حنبلی مسلک سے مخصوص ہوگئی تھیں گویا ہر مذہب و مسلک کے پیرووں کے لیے ایک علیحدہ زیارت گاہ بنادی گئی تھی تاکہ دوسرے مسلک والے اپنے مسلک کو چھوڑ کر دوسرے مسلک والوں کے محتاج نہ ہوں۔ برہان الدین بلخی حنفیوں کے، فندلاوی مالکیوں کے، ابونصر مقدسی شافعیوں کے اور شیخ ابوالفرج حنبلیوں کے نمایندہ تھے۔ دمشق میں شیخ ابوعمر دمشقی کا مزار مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ یہ ملک شام کے ایک بہت بڑے بزرگ تھے۔ حضرت ذوالنون مصری (المتوفی ۲۴۵ھ) کے مشہور شاگرد ابوعبداللہ احمد بن یحییٰ بن جلا کے مرید اور معتقد تھے نیز حضرت ذوالنون کے شاگردوں کی صحبت پائی تھی۔ ۳۲۰ھ میں انتقال فرمایا تھا۔ امام ابن تیمیہ کے زمانہ میں ان کے متعلق یہ پکا عقیدہ ہوگیا تھا کہ وہ ہر آفت اور مصیبت میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔ چنانچہ تاتاری لڑائیوں کے زمانہ میں ایک شاعر لوگوں کو اطمینان دلاتے

ہوئے کہتا ہے۔

یاخائفین من التتر

اے تاتاریوں سے ڈرنے والو

لوذوا بقبر ابی عمر

ابوعمر کی قبر سے پناہ لو

عوذوا بقبر ابی عمر

ابوعمر کی قبر سے پناہ مانگو

ینجیکموا من الضرر

وہ تم کو ہر مصیبت سے نجات دیں گے

ان قبروں پر ہر سال ایک میلہ لگتا تھا جہاں لوگ اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر جاتے تھے اور ان زیارت گاہوں پر کئی دن قیام کرتے تھے۔ ان قبروں پر پھول اور نذریں چڑھاتے تھے۔ان سے منتیں اور مرادیں مانگتے تھے۔سماع کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔راگ اور ناچ ہوتا تھا اور ہر قسم کی بدعنوانیاں اور بدکاریاں ہوتی تھیں۔

اصلاح کی کوشش

امام ابن تیمیہ ۷۲۱ھ سے ۷۲۶ھ تک آزاد رہے اور درس وتدریس اور خطبات کے ساتھ ساتھ ان برائیوں کی اصلاح کی بھی کوشش کرتے رہے۔شرعی حدود کے قائم کرنے میں وہ پیش پیش تھے۔چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ کتاب البدایہ والنہایہ میں منقول ہے۔[1]

دمشق کے سوق الخیل میں ناصر بن الشرف ابی الفضل بن اسماعیل بن الھیتی ایک شخص رہتا تھا جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ زندیق ہے اور قرآن وحدیث اور شعائر اور احکام الٰہی کا مذاق اُڑاتا رہتا ہے۔وہ عموماً نجم الدین بن خلکان، شمس الدین محمد الباجریقی، اور ابن المعمار البغدادی جیسے زندیقوں کی صحبت میں رہتا ہے۔دمشق کی حکومت نے اس کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا۔اور قاضیوں نے متفقہ طور پر اس کے قتل کا فیصلہ دیا۔چنانچہ ۲۱ ربیع

---

[1] البداية و النهاية: ١٤/ ١٢٢۔

الاول ۷۲۶ھ کو اکابر و اعیان و علمائے دولت کے سامنے جن میں امام موصوف بھی شامل تھے اس شخص کی گردن اڑا دی گئی۔ اس موقعہ پر حافظ ابن کثیر بھی موجود تھے۔

فتنہ کی ابتدا

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ امام ابن تیمیہ کے عقائد و خیالات زیارت قبور اور مسئلہ توسل کے متعلق کیا تھے؟ علمائے وقت سے ان کا اختلاف تھا۔ اس زمانہ میں مصر میں ایک واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے سویا ہوا فتنہ جاگ اُٹھا۔ شہاب بن مری التیمی نے قاہرہ میں ۷۲۵ھ میں فتوی دیا کہ آنحضرت ﷺ یا کسی غیر اللہ سے استغاثہ کرنا ناجائز ہے۔ فقہائے وقت نے ان کی سخت مخالفت کی ابن مری کو پیٹا گیا اور پھر قاضی القضاۃ نے ان کو اس بدعقیدگی کے جرم میں قید کی سزا دی۔ وہ کچھ دن تک قید میں رکھے گئے اور اس کے بعد جلا وطن کر دیے گئے۔ انہوں نے جزیرہ جا کر اپنی باقی زندگی گزاری۔ [1]

ادھر دمشق میں ایک دوسرا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ایک نیا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا، امام ابن تیمیہ نے معمول کے مطابق جامع اموی دمشق میں جمعہ کے دن ایک تقریر کی۔ اس مجلس میں مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی موجود تھا [2]۔ دورانِ تقریر میں جب اس حدیث کا ذکر آیا کہ خدائے تعالیٰ آسمان دنیا پر اُترتا ہے اور پکارتا ہے: کون ہے مجھ سے مغفرت چاہنے والا تاکہ میں اس کو بخشوں۔ کون ہے میری طرف رجوع ہونے والا تاکہ میں اس کی توبہ قبول کروں۔ امام موصوف نے نزول کے مسئلہ پر متکلمانہ بحث کی اور متکلمین کے خیالات کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ خدا آسمان دنیا پر اسی طرح اترتا ہے جس طرح کہ میں منبر کے ایک زینے سے دوسرے زینے پر اتر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ منبر کے ایک زینے سے دوسرے زینے پر اتر آئے۔ حاضرین میں ایک مالکی فقیہ بھی تھے جو ابن الزہرا کے عرف سے مشہور تھے۔ انہوں

---

[1] ذیل العبر للذہبی حالات ۷۲۵ھ بحوالہ اصلاح الاخوان مولفہ سید شیخ داؤد افندی صفحہ ۹۸۔

[2] رحلۃ ابن بطوطہ جلد اول ۸۔ یہ واقعہ مشکوک بتایا جاتا ہے اس لیے کہ حافظ ذہبی، حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن عبدالہادی وغیرہ کی کتابوں میں یہ واقعہ مذکور نہیں ہے۔ ابن بطوطہ نے اس کو اپنے سفر نامے میں بیان کیا ہے۔ وہ رمضان ۷۲۶ھ میں دمشق پہنچا تھا جبکہ امام موصوف شعبان ۷۲۶ھ میں قید ہو چکے تھے۔ اس میں درحقیقت ابن بطوطہ کو کچھ شبہ ہو گیا ہے

نے اس کو پسند نہیں کیا اور جذبے میں آکر امام موصوف کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، اس کی وجہ سے سارا مجمع بگڑ بیٹھا اور تھپڑوں اور دھول دھپول سے ان کی خبر لینی شروع کی۔ اس دھول دھپے میں مالکی فقیہ کا عمامہ نیچے آرہا۔ لوگوں نے دیکھا کہ انہوں نے ریشم کی ٹوپی پہن رکھی ہے بس پھر کیا تھا لوگ انہیں قاضی شمس الدین بن مسلم الحنبلی کے پاس کھینچ لے گئے جنہوں نے ان کو کچھ دیر حوالات میں رکھا اور پھر تنبیہ کر کے انہیں رہا کر دیا۔

یہ واقعہ ۷۲۶ھ میں پیش آیا تھا۔ اس کی وجہ سے مالکی اور شافعی فقیہ بگڑ بیٹھے اور انہوں نے نائب دمشق امیر سیف الدین تنکز کے پاس جا کر امام موصوف کی شکایت کی اور بتایا کہ وہ ایک بدعقیدہ آدمی ہیں۔ رسول کریم ﷺ سے توسل کرنے اور آپ کی قبر انور کی زیارت سے منع کرتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں سترہ سال پہلے زیارت قبور کے متعلق لکھا ہوا ان کا ایک فتوی پیش کیا۔ اس میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ اگر کوئی شخص نبی کریم ﷺ اور دیگر انبیاء و صالحین کی قبروں کی زیارت کی نیت سے سفر کرے تو اس سفر میں نماز کا قصر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور پھر یہ زیارت شرعی ہے یا نہیں؟

اس فتوے میں آنحضرت سے منسوب ان دو حدیثوں کے متعلق بھی پوچھا گیا تھا جن میں آپ نے فرمایا تھا کہ جو کوئی حج کرے اور میری زیارت نہ کرے وہ مجھ پر ظلم کرتا ہے دوسری حدیث یہ ہے کہ جو کوئی میرے مرنے کے بعد میری زیارت کرے وہ اس کی مانند ہے جو میری زندگی میں میری زیارت کرتا ہے۔

امام موصوف نے اس سوال کا تفصیلی جواب دیا تھا جس کا خلاصہ زیارت قبور کی بحث میں پیش کیا جا چکا ہے۔ امام موصوف نے لکھا ہے کہ انبیاء و صالحین کی قبروں کی زیارت کی نیت سے سفر کرنے کے متعلق علما کے دو قول ہیں ایک یہ کہ اس قسم کا سفر سفرِ معصیت ہے، اس میں نماز کا قصر کرنا جائز نہیں ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کا یہی مسلک ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ممنوع سفر میں بھی قصر ہو سکتا ہے۔

یہ قول امام ابو حنیفہ کا ہے۔ زیارت کے متعلق جو دو روایتیں پیش کی گئی ہیں وہ جھوٹی ہیں۔ امام موصوف نے شیخ ابو عبداللہ بن بطہ کی کتاب الابانۃ الصغری کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا

کہ انبیاء وصالحین کی قبروں کی زیارت کی نیت سے سفر کرنا بدعت ہے جس کو صحابہ وتابعین میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔ نہ تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا اور نہ ائمہ مسلمین میں سے کسی نے اس کو مستحب سمجھا جو شخص بھی یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زیارت قبور بھی ایک عبادت ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ وہ سنت اور اجماع اُمت کا مخالف ہے۔

ابو محمد المقدسی کی دلیل اور اس کی تردید

اس کے بعد ابو محمد المقدسی کی دلیل کی تردید کی ہے۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ "لاتشد الرحال الا الی ثلثة مساجد المسجد الحرام و مسجدی ھذا و مسجد الاقصی" "کجاوے باندھے نہیں جا سکتے مگر تین مسجدوں کی طرف یعنی مسجد حرام اور میری یہ مسجد اور مسجد اقصیٰ" کی حدیث میں محض استحباب کی نفی کی گئی ہے۔ مطلق زیارت کی نفی نہیں کی گئی ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ خود اونٹنی پر بیٹھ کر مسجد قباء کی زیارت کیلئے جاتے تھے۔ مدینہ میں رہ کر قبا جانے والوں کیلئے مسافر کا لقب نہیں دیا جا سکتا اور وہاں جانے کیلئے شد رحال کا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ شد رحال اہتمام کے ساتھ اپنے ساتھ کھانا، پانی اور رہنے سہنے کا سامان ساتھ لے کر جانے کا نام ہے۔ قبا مدینہ سے قریب ایک مقام ہے۔ دور کے رہنے والے قربت وعبادت اور اطاعت کے اعتقاد کے ساتھ قبا کا سفر نہیں کر سکتے۔ ابو محمد نے استحباب کی نفی کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اس قسم کا سفر نیک اعمال یا قربت واطاعت اور حسنات میں داخل نہیں ہے۔ اگر کوئی قربت وطاعت کی نیت سے قبور انبیاء وصالحین کی زیارت کیلئے سفر کرے تو وہ سنت اور اجماع امت کا مخالف ہے۔ تمام لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو لوگ بھی اس قسم کا سفر اختیار کرتے ہیں وہ قربت اور اطاعت ہی کے عقیدے سے سفر کرتے ہیں اس کے علاوہ اس مذکورہ بالا حدیث میں نفی کا حرف استعمال کیا گیا ہے اور نفی نہی کی مقتضی ہے اور نہی تحریم کی متقاضی ہے۔

اب رہا حدیثوں کا معاملہ تو اس سلسلے میں جتنی بھی حدیثیں پیش کی جاتی ہیں وہ کل کی کل ضعیف ہیں۔ اہل سنن وصحاح میں سے کسی نے ان کو روایت نہیں کیا ہے۔ مدینہ منورہ کے لوگوں میں امام مالک زبردست عالم تھے وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی یہ کہے کہ میں

نے نبی کی قبر کی زیارت کی، اگر یہ لفظ ان کے نزدیک معروف و مشہور یا مشروع و ماثور رہوتا تو امام مالک اس کو ناپسند نہیں کرتے۔ اسی طرح امام احمد بھی اپنے زمانہ میں سنت کے بڑے عالم تھے۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ زیارت قبور کے بارے میں کوئی معتبر حدیث ہے؟ تو آپ نے فرمایا: میرے پاس ابوہریرہ کی حدیث کے سوا کوئی دوسری معتبر حدیث نہیں ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا: ''کوئی شخص بھی مجھ پر سلام نہیں کرتا مگر خدا اس سلام کو میری روح پر لوٹا دیتا ہے اور میں اس کا جواب دیتا ہوں۔'' [1] ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس حدیث کو نقل کیا ہے اسی طرح امام مالک نے اپنی مؤطا میں یہ روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب کبھی مسجد میں داخل ہوتے تو کہتے: السلام علیك یا رسول الله، السلام علیك یا ابابکر، السلام علیك یا ابت، [2] پھر وہاں سے واپس ہو جاتے۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میری قبر کو عید گاہ نہ بناؤ، تم جہاں کہیں بھی ہو وہاں سے مجھ پر صلوۃ (درود) بھیجو کیونکہ تمہاری صلوٰۃ مجھ تک پہنچا دی جاتی ہے۔'' [3] سنن سعید بن منصور میں ہے کہ عبداللہ بن حسن بن حسین بن علی بن ابی طالب نے ایک آدمی کو دیکھا کہ بار بار آنحضرت کی قبر انور پر آ کر دعا کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ نے کہا: اے میاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''میری قبر کو عید گاہ نہ بناؤ جہاں کہیں بھی تم رہو وہاں سے مجھ پر صلوٰۃ بھیجو کیونکہ تمہاری یہ صلوٰۃ مجھ تک پہنچا دی جاتی ہے۔'' پس اس بارے میں تم اور ایک اندلس میں رہنے والا دونوں برابر ہیں۔

امام موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ولید بن عبدالملک کے زمانے تک حجرۂ نبوی مسجد سے الگ تھا کوئی وہاں نماز کے لیے نہیں جاتا تھا۔ اور نہ دعا کرتا تھا اور نہ آپ کی قبر کو چھوتا تھا۔ لوگ آپ کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر صرف سلام بھیجتے تھے اور پھر مسجد میں پہنچ کر قبلہ کی طرف رُخ کر کے دعا کرتے تھے۔ یہ سب احتیاط اس لیے کی جاتی تھی کہ خالص توحید ہو اور اس میں

---

[1] سنن ابی داود، کتاب المناسك، باب زیارۃ القبور، ح: ۲۰۴۱۔

[2] مصنف عبدالرزاق: ۳/ ۵۷۶، ح: ۶۷۲۴۔

[3] کتاب المناسك، باب زیارۃ القبور، ح: ۲۰۴۲۔

شرک کا ذرا بھی شائبہ نہ ہو۔ [1]

علما کی مخالفت

امام موصوف کے زمانے کے علما و فقہا کا یہ حال تھا کہ عوام کو بدعات سے روکنے کے لیے ان کا قلم مشکل سے اُٹھتا تھا، لیکن اگر کوئی اصلاح حال کے لیے کھڑا ہوتا تو اس کی اصلاح کے راستے میں روڑے ڈالنے کے لیے سب سے پہلے موجود ہوتے۔ ان لوگوں نے یہ مشورہ کرنا شروع کیا کہ ابن تیمیہ قبر نبوی کی زیارت سے روکتے ہیں۔ اور مدینہ منورہ کیلئے سفر کرنا حرام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ مقصد نہیں تھا وہ صرف قبر نبوی کی زیارت سے سفر کرنا حرام سمجھتے تھے۔ علمائے وقت کی تشہیر کی وجہ سے دمشق کے عوام ابن تیمیہ سے بدظن ہو گئے۔ امیر سیف الدین تنکز نے ایک روداد تیار کی جس میں ان علما کے الزامات کی فہرست تھی۔ اور اس کو سلطان ناصر کے پاس مصر بھیجا۔ دمشق میں ہر قسم کی افواہیں اڑنے لگیں اور حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ اب کے ان کی خیریت نہیں ہے۔ امام موصوف کے ساتھی گھبرا گئے تھے اور ان کی ہمتیں جواب دینے لگی تھیں لیکن امام موصوف پر ان فتنہ انگیزیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر مطمئن تھے۔ اپنے عقیدے سے وہ کبھی باز نہیں آ سکتے تھے۔ انہوں نے برابر اپنے خیالات کو پھیلانا شروع کیا۔

کفر کا فتویٰ

جب یہ ساری روداد مصر پہنچی تو مصر کے اٹھارہ فقیہوں نے ان کے کفر کا فتوی دیا ان سب کے سر گروہ قاضی تقی الدین محمد بن ابی بکر اخنائی مالکی تھے۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ انبیاء اور خاص کر نبی کریم ﷺ کی قبر کی زیارت کے سفر سے روکنا درحقیقت آنحضرت ﷺ کی تنقیص کرنا ہے جو صریحی طور پر کفر ہے اور کفر کی سزا قتل ہے۔ [2]

قید کا حکم

سلطان ناصر امام موصوف کے عقائد و خیالات سے خوب واقف تھا وہ اس فتوے پر عمل کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ مگر وہ ان قاضیوں اور فقیہوں کو بھی ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا اس نے

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیة: ٤/ ١١٨، ١٢١۔ [2] طبقات الحنابلة لابن رجب قلمی۔

حکم بھیجا کہ امام موصوف کو دمشق کے قلعہ میں نظر بند کر دیا جائے۔ نائب دمشق امیر سیف الدین تنکز نے مشد الاوقاف ناصر الدین اور حاجب ابن الخطیر ی کے ہاتھ سلطان کا فرمان دکھایا گیا اور ساتھ ہی سواری بھی حاضر کر دی گئی اور کہا گیا قید خانہ تشریف لے چلیے۔ قید کا فرمان دیکھ کر امام موصوف بہت خوش ہوئے اور کہا میں اسی دن کا منتظر تھا۔ اسی میں میری بھلائی ہے۔ یہ کہہ کر وہ سوار ہو گئے اور قلعہ تک آئے اور جب قلعے کے دروازے میں داخل ہوئے تو یہ آیت پڑھی:

﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ؕ﴾ [1]

”پس ان کے درمیان ایک فصل کھڑی کر دی گئی ہے جس کا ایک دروازہ ہے اس کے اندر کی طرف رحمت ہے اور اس کے باہر کی طرف عذاب ہے۔“

قلعہ کے اندر ان کے لیے ایک بہترین ہوادار کمرہ خالی کر دیا گیا تھا، جہاں پانی وغیرہ کی سہولتیں موجود تھیں ان کے بھائی زین الدین عبدالرحمٰن بن تیمیہ نے بھی ان کے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ حکومت نے انہیں ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔

شاہی فرمان کا اعلان

۱۰ شعبان ۷۲۶ھ کو جمعہ کے دن دمشق کی جامع مسجد میں نماز کے بعد شاہی فرمان کا اعلان کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ ابن تیمیہ کو انبیاء کی قبروں کی زیارت سے منع کرنے پر قید کی سزا دی جاتی ہے۔ آیندہ سے وہ کوئی فتوے نہیں دے سکتے۔

حافظ ابن قیم کی قید

امام موصوف کی جگہ پر ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیم موجود تھے جو پوری قوت کے ساتھ مخالفین کے عقائد و خیالات کی تردید کر سکتے تھے۔ انہوں نے استاد ہی کے عقائد و خیالات کے مطابق فتوے دینے شروع کیے۔ جس کی وجہ سے پھر کھلبلی مچنے لگی چنانچہ امیر سیف الدین تنکز نائب دمشق کی اجازت سے قاضی القضاۃ جمال الدین بن جملہ شافعی نے

---

[1] ۵۷/الحدید: ۱۳۔

۱۴ شعبان ۷۲۶ھ کو منگل کے دن حافظ ابن قیم اور ان کے ساتھیوں کو پکڑ وا منگوایا۔ بعض کو سزا دی اور بعض کو گدھوں پر بٹھا کر شہر بھر میں ان کی تشہیر کروائی۔ حافظ ابن قیم کے سوا دوسروں کو رہا کر دیا۔ کیونکہ وہ ایک زبردست اہل قلم تھے اور اگر آزاد رکھے جائیں تو وہ اپنے استاد کی جگہ پُر کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان کو بھی قلعہ میں قید کر دیا گیا۔

مزید توضیح

قاضی القضاۃ ابن جملہ شافعی اور ان کے ہمنوا علما و فقہا کا ارادہ تھا کہ امام موصوف سے زیارت قبور انبیاء و صالحین کے مسئلہ میں ایک تحریری بیان لیا جائے۔ جس کی بنیاد پر ان کے اوپر مزید سختی کی جا سکے۔ چنانچہ ابن جملہ شافعی ۹ ذولقعدہ ۷۲۶ھ کو منگل کے دن امام موصوف کے پاس گئے اور ان سے اس مسئلہ کے متعلق ایک تحریری بیان لیا۔ امام موصوف نے اپنے خیالات کو پیش کیا۔

دوسرے دن یعنی ۱۰ ذوالقعدہ کو بدھ کے دن مصر سے فرمان آیا کہ امام موصوف کی جگہ پر شیخ برہان الدین احمد بن ہلاک الزرعی الحنبلی دارالحدیث الحنبلیہ میں درس دیں ان کے پہلے درس میں دستور کے مطابق امرا و اعیان دولت اور علما و فقہا بھی شریک ہوئے جن میں ابن جملہ شافعی بھی تھے۔ ان کے درس میں امام موصوف کی سی بے پناہ معلومات کہاں ہو سکتی تھیں۔ اس دن امام موصوف کے احباب انہیں یاد کر کے بہت روئے۔

تیسرے دن یعنی ۱۱ ذوالقعدہ ۷۲۶ھ کو جمعرات کے دن قاضی ابن جملہ شافعی اور مشد الاوقاف ناصر الدین امام موصف کے پاس گئے اور اس مسئلہ سے متعلق مزید وضاحت چاہی۔ امام موصوف نے اس کا ایک طویل جواب لکھا جو بعد میں "الجواب الباهر لمن سال عن ولاة الامر عما افتى به في زيارة المقابر" کے نام سے مشہور ہوا۔ قاضی ابن جملہ نے اس جواب کے نیچے اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی "میں نے سوال سے اس جواب کا مقابلہ کیا جو ابن تیمیہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ابن تیمیہ نے نبی کریم ﷺ اور دیگر انبیاء کے قبور کی زیارت کو اجماعی طور پر قطعی معصیت قرار دیا ہے" اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''ذرا شیخ الاسلام پر اس تحریف کو تو دیکھو۔ اس مسئلے کے متعلق ان کے جواب میں زیارت قبور انبیاء و صالحین کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ سواری باندھ کر صرف زیارت قبور کی غرض سے سفر کرنے کے متعلق دو قول کو بیان کیا ہے، سواری کے اہتمام کے بغیر قبروں کی زیارت کرنا اور بات ہے اور سواری کے اہتمام کے ساتھ صرف زیارت کے مقصد سے سفر کرنا اور بات ہے۔ شیخ نے سواری کے اہتمام کے بغیر زیارت قبور سے منع نہیں کیا ہے بلکہ اس کو مستحب قرار دیا ہے اور اس کی رغبت دلائی ہے۔ آپ کی کتابیں اور مناسک حج کے متعلق آپ کے رسالے صاف اس کی گواہی دے رہے ہیں۔ اس فتوے میں اس قسم کی زیارت کے متعلق کوئی اعتراض نہیں کیا ہے اور نہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ معصیت ہے اور نہ اس کی ممانعت پر کسی اجماع کا دعویٰ کیا ہے وہ کیونکر آنحضرت ﷺ کے اس قول سے ناواقف ہو سکتے تھے جس میں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((زوروا القبور فانها تذکرکم الآخرة)) [1] ''قبروں کی زیارت کرو کیونکہ وہ تمہیں آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔'' خدا پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور عنقریب یہ ظالم لوگ جان لیں گے کہ یہ کس طرح پلٹا کھا رہے ہیں۔

﴿ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ﴾ [2]

حافظ ابن کثیر کے اس مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام موصوف مطلق زیارت قبور کے منکر نہیں تھے۔ البتہ خاص زیارت قبر کے مقصد سے سفر کرنے کو حرام سمجھتے تھے۔

اطمینان قلب

مخالفوں نے امام موصوف اور ان کے ساتھیوں کے خلاف اتنی فتنہ انگیزیاں کی تھیں کہ ان کے بعض ساتھی پست ہمت ہونے لگے۔ انہیں خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کفر کے فتوے کو بہانہ بنا کر استاد و شاگرد کو قتل نہ کرا دیں۔ مگر امام موصوف پر مخالفین کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ خوش و خرم رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعات نہیں ہو رہے

---

[1] ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ماجاء في زيارة القبور، ح: ١٥٦٩۔

[2] البدايه والنهايه: ١٤/ ١٢٤۔

ہیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی یا گھبراہٹ کے آثار بالکل نہیں تھے۔ خود حافظ ابن قیم کا بیان ہے:

”خدا کے علم کی قسم! میں نے شیخ الاسلام سے زیادہ کسی کو اتنا ہشاش بشاش نہیں دیکھا قید میں ان کو قتل کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ شاداں وفرحاں رہتے تھے ان کا سینہ ہر مصیبت کے لیے کھلا ہوا تھا۔ ان کا دل مضبوط اور ان کا نفس خوش تھا۔ ان کے چہرے پر جنتیوں کی سی تروتازگی رہتی تھی۔ جب کبھی ہم پر خوف طاری ہوتا اور پریشان خیالی ہر طرف سے ہم کو گھیر لیتی تھی اور ہم پر زمین تنگ معلوم ہونے لگتی تو ہم ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتے تھے وہ اپنی جوشیلی باتوں سے ہمارے دلوں میں وہ گرمی اور ہمت پیدا کر دیتے تھے کہ ہمارا سارا خوف کافور ہو جاتا تھا اور ہمارے دلوں میں یقین واطمینان کی ایک انشراحی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ [1]

صبر کی تلقین

امام موصوف نہ صرف اپنے دوستوں کو صبر واستقامت کی تلقین کرتے تھے بلکہ قید خانہ کے دوسرے قیدیوں کو بھی اطمینان دلانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ اسی زمانے میں عمر بن عمران بن صدقہ نامی ایک صاحب قید ہو کر آئے تھے۔ انہیں ہمیشہ ایک زبردست خوف دامن گیر رہتا تھا، امام موصوف نے انہیں اطمینان دلایا اور یہ دو شعر پڑھے:

لا تكفرن و ثق باللّٰه ان له
الطاف دقت عن الاذهان والفطن

تم ہرگز ہرگز فکر مت کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو کیونکہ خدا کی بہت سی مہربانیاں ایسی ہیں جو ہمارے ذہنوں اور دماغوں میں نہیں آسکتیں۔

یاتيك من لطفه ما ليس تعرفه
حتى تظن الذى قد كان لم يكن

تمہارے پاس اس کی ایسی مہربانی آئے گی جس کو تم پہلے سے نہیں جانتے

---

[1] طبقات الحنابلة قلمی۔

ہو گے۔ یہاں تک کہ تم یہ خیال کرو گے کہ ایسا واقعہ ہوا ہی نہیں تھا۔

حافظ ابن قیم کا بیان

حافظ ابن قیم بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام نے ان سے قید میں کہا: میرے دشمن مجھے کیا تکلیف پہنچا سکتے ہیں، جبکہ میری جنت میرے دل میں ہے اور میرا باغ میرے سینے میں ہے۔ میں جہاں بھی جاؤں گا وہ میرے ساتھ رہیں گے اور مجھ سے الگ نہیں ہوں گے، میری قید میرے لیے گوشہ تنہائی ہے، میرا قتل میری شہادت ہے۔ میری جلاوطنی میری سیاحت ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ دنیا میں بھی ایک جنت ہے۔ جو اس میں داخل نہیں ہوگا وہ آخرت کی جنت میں بھی داخل نہیں ہوسکتا۔ ایک دوسری مرتبہ فرمایا: قیدی وہ ہے جس کا دل اس کے پروردگار سے بند ہو جائے اور مقید وہ ہے جس کو ہر طرف سے خواہشات نفسانی گھیر لیں۔

قید کا فائدہ

امام موصوف نے قید کی حالت میں بھی تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا، قرآن مجید کا بغور مطالعہ شروع کر دیا۔ اس کی تفسیر اور اس کے حقائق و نکات پر بہت کچھ لکھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو یہاں جتنے حقائق و نکات سمجھ میں آئے ہیں اتنے کسی اور وقت سمجھ میں نہیں آئے۔ افسوس ہوتا ہے کہ میں نے قرآن چھوڑ کر دوسرے علوم پر اپنی محنت کیوں صرف کی۔ اگر میں اس قلعے کے برابر بھی سونا لٹا دوں تو بھی خدا کی اس نعمت کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔ میں اپنے حریفوں اور دشمنوں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھ کو قید میں ڈال کر مجھے بہت فائدہ پہنچایا اس کا بدلہ ادا کرنے سے میں قاصر ہوں۔ [1]

امام موصوف نے تفسیر قرآن کے علاوہ ان مسائل کے متعلق بھی رسالے لکھے ہیں جن کی وجہ سے ان کے خلاف ہنگامہ کیا گیا تھا اور ان کو سزا دی گئی تھی۔ کتاب الرد علی القاضی الاخنائی المالکی، کتاب الرد علی بعض القضاۃ الشافعی، معارج الوصول الی معرفۃ ان اصول الدین و فروعہ قد بینھا

---

[1] طبقات الحنابلۃ قلمی۔

الرسول، الفرقان بین الحق والباطل، الاکلیل فی المتشابه والتاویل وغیرہ اسی زمانے کے تصنیف کردہ رسائل ہیں۔

حریفوں کی طرف سے تردید

زیارت قبور کے مسئلے کے متعلق مختلف علما نے امام موصوف کے خیالات کا رد لکھا ہے۔ جن میں قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی الشافعی بہت مشہور ہیں انہوں نے شن الغارہ علی من انکر سفر الزیارۃ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام آگے چل کر شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام سے بدل دیا تھا۔ یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن سے ۱۳۱۵ھ میں چھپ چکی ہے اس میں دس ابواب قائم کر کے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی بحث کی ہے اور شفاعت توسل اور استغاثہ کے متعلق عام علمائے وقت کے خیالات کی پرزور تائید کی ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ آیا یہ کتاب امام موصوف کی زندگی میں لکھی گئی تھی یا ان کے بعد لکھا تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ کتاب ان کی وفات کے بعد لکھی گئی ہے۔ امام موصوف کے شاگرد رشید حافظ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عبدالہادی نے "الصارم المنکی فی الرد علی السبکی" کے نام سے سبکی کی کتاب کا رد لکھا ہے یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملا کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس کے دلائل زیادہ زوردار واضح اور مؤثر ہیں۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ ان دونوں کے متعلق کوئی تفصیلی تبصرہ کیا جائے۔

علمائے بغداد کے فتوے

جب امام موصوف کی قید کی خبر بغداد پہنچی تو مدرسہ مستنصریہ کے عالموں نے امام موصوف ہی کے فتوؤں کی تائید کی۔ جمال الدین یوسف بن عبدالمحمود بن عبدالسلام بن البقی، الحنبلی (المتوفی ۷۲۶ھ)، صفی الدین عبدالمومن بن عبدالحق الحنبلی (المتوفی ۷۳۹ھ)، شیخ ابن الکتبی الشافعی اور محمد بن عبدالرحمٰن المالکی البغدادی وغیرہ نے زیارت قبور کے متعلق اپنے فتوے لکھے اور ان پر مختلف علما کے دستخط لیے اور ان سب کو سلطان ناصر کی خدمت میں مصر روانہ کیا اس فتوے میں شیخ ابن الکتبی الشافعی نے لکھا "یکتائے روزگار اور فرید عصر الشیخ الامام العلامہ شیخ تقی الدین ابوالعباس بن تیمیہ سے جو پوچھا گیا ہے اور انہوں نے اس کا

جو جواب دیا ہے اس سے بندے کو واقفیت حاصل ہوئی۔ ان کا جواب اس باب میں تمام علما کے اقوال کا نچوڑ ہے اور مقتضائے حال کے مطابق ہے۔ اس میں صحیح حدیثیں نقل کی گئی ہیں اور اس الزام اور التزام کی بحث میں تحامل یا تجاہل کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے اور معاذ اللہ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس میں آنحضرت ﷺ کی تنقیص ہوتی ہو۔ علما کے لیے یہ کیونکر جائز ہے کہ وہ عصبیت پر اُتر آئیں اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں عیب جوئی یا تنقیص کا ذریعہ پیدا کریں کیا کوئی شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی قبر کی زیارت سے ان کی قدر اور عزت بڑھ جاتی ہے اور ان کے چھوڑ دینے سے ان کی عزت اور عظمت گھٹ جاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ذات ان باتوں سے بہت برتر اور ارفع و اعلیٰ ہے۔''

آخر میں یہ لکھا ''الغرض شیخ تقی الدین نے جو کچھ لکھا ہے وہ کسی سزا یا عتاب کا موجب نہیں ہے۔ مراحم سلطانیہ کو وسیع تر ہونا چاہیے اور شیخ کے ساتھ مہربانی اور رحمت کا سلوک ہونا چاہیے۔''

مدرسہ مستنصریہ بغداد کے مدرس شیخ محمد بن عبدالرحمٰن المالکی البغدادی نے بھی فتوے پر دستخط کرتے ہوئے یہ لکھا کہ ''اس مسئلہ میں علما سے جو خلاف نقل کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اہل علم نے ان کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اس میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ اس میں آنحضرت ﷺ کی کوئی تنقیص نہیں ہوتی۔ شیخ ابو محمد الجوینی نے اپنی کتابوں میں زیارت قبور کے مقصد سے سفر کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ امام قاضی عیاض بن موسیٰ بن عیاض کا بھی یہی مسلک ہے۔ وہ متاخرین علما میں سب سے افضل ہیں۔''

پھر مختلف علما کے اقوال کو نقل کرنے کے بعد یہ لکھا کہ ''شیخ ابو عمر بن عبدالبر نے اپنی کتاب التمہید میں انبیاء وصالحین کی قبروں کو مسجد بنا لینے کو حرام بتایا ہے۔ اس لحاظ سے جو کوئی بھی اس کو سفر ممنوع بتاتا ہے اس کو کافر قرار دینا ٹھیک نہیں ہے اگر کوئی ان کو کافر بتاتا ہے تو وہ خود کافر ہے۔ اگر وہ کافر نہیں تو کم از کم فاسق ضرور ہے۔ ابو عبداللہ محمد بن علی المازری نے اپنی کتاب المعلم میں لکھا ہے کہ جو کوئی اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر بنائے اور وہ اس کو جائز بھی سمجھے تو وہ خود ہی کافر ہے یا کم از کم فاسق ضرور ہے۔ حاکم کو چاہیے کہ اس قسم کے لوگوں کو سخت سزا

دے۔ اگر کوئی حاکم قدرت رکھنے کے باوجود اس سے غفلت برتتا ہے تو وہ گنہگار ہے۔''

دوسرے علما نے بھی اسی قسم کے زور دار جوابات لکھے تھے۔ مملکت شام کے مختلف مقامات سے بھی امام ابن تیمیہ کے خیالات کی تائید میں فتوے مرتب کر کے بھیجے گئے تھے۔ ابو عمرو بن ابی الولید المالکی نے لکھا کہ تین مسجدوں کے علاوہ دوسرے کی طرف سفر کرنا مشروع نہیں ہے جو شخص مسجدِ نبوی میں نماز اور آنحضرت اور آپ کے ساتھیوں پر سلام بھیجنے کی غرض سے مدینہ کا سفر کرے تو بالاتفاق علما مشروع ہے لیکن جو شخص محض زیارت قبر رسول کی نیت سے سواری کا اہتمام کرتا ہے اور اس کا مقصد مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کا نہ ہو تو اس کے متعلق علما کے دو قول ہیں بعض منع کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مباح ہے مگر دونوں قول کے مطابق محض زیارت قبر نبوی کی غرض سے سفر کرنا قربت و طاعت کا کام نہیں ہے۔ اگر کوئی اس کو قربت و طاعت کا کام بتاتا ہے تو یہ باجماع اُمت حرام ہے۔ اگر کوئی ان دونوں گروہوں کی دلیلیں نقل کرتا ہے اور ان میں سے کسی ایک قول کو ترجیح دیتا ہے تو اس میں آنحضرت ﷺ کی تنقیص لازم نہیں آتی۔ کسی نے امام مالک سے پوچھا کہ کوئی شخص قبر نبوی کی زیارت کی نذر کرے تو اس کا پورا کرنا واجب ہے یا نہیں؟ امام مالک نے فرمایا کہ اگر مسجد نبوی کے اندر نماز پڑھنے کا قصد ہو تو نذر کو پورا کرے اور اگر محض زیارت مقصود ہو تو پھر نذر پوری نہ کرے کیونکہ حدیثوں میں سواری کے اہتمام کرنے سے منع کیا گیا ہے۔''

رہائی کی درخواست

علمائے بغداد نے اپنے فتوؤں کے ساتھ سلطان مصر کے نام ایک محضر بھی تیار کیا تھا جس میں امام موصوف کی رہائی کی درخواست کی گئی تھی۔ حمد و نعت اور سلطان مصر کی تعریف کے بعد اپنا مقصد یوں ظاہر کیا تھا۔

''پھر یہ کہ یہ جلیل القدر باعزت شیخ یکتائے زمانہ اور نادرۂ روزگار ہیں۔ وہ ملکی مملکت کے سرتاج اور دولت سلاطنی کے علَم (جھنڈا) ہیں۔ اگر کوئی شخص خدائے عظیم وقدیر کی قسم کھا کر یہ کہے کہ اس امامِ کبیر کا مثیل و نظیر اس زمانے میں دکھائی نہیں دیتا تو اس کی قسم درست ہو گی اور اس کو کفارہ ادا کرنے کی حاجت نہ ہو گی۔ ساتوں اقلیمیں ان کی جیسی ہستی کے وجود

سے خالی ہے۔ ہر ایک سلیم الطبع اور منصف مزاج شخص ہمارے ان مذکورہ بالا بیانات کی تصدیق و تائید کرے گا۔ ہم اس امام کبیر کی مبالغہ آمیز تعریف کر کے ان کو بڑھا چڑھا کر دکھانے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ اگر کوئی ان کی مدح وثنا میں طوالت سے کام لے تو بھی ان کی بعض فضیلتوں اور بزرگیوں کو جو ان کے اندر پائی جاتی ہیں پورے طور پر بیان نہیں کر سکتا، درحقیقت امام ابن تیمیہ یتیمیہ' (نادر موتی) روزگار ہیں، جس کو ہر شخص اپنے پاس رکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ خریدا جا سکتا ہے، بیچا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اس کے جیسا موتی بادشاہوں کے خزانوں میں بھی نہیں ملتا۔ خواہش مند اور آرزو مند لوگ اس جیسے موتی کے پانے سے اب بالکل نا اُمید ہو چکے ہیں۔

ابو العباس احمد بن تیمیہ کے قلعہ میں بند کیے جانے کی خبر سن کر ہم سب بیتاب ہو گئے ہیں اور ہم سب پیرواں و مقتدایان ملت کی قوتیں کمزور ہو گئیں ہیں۔ اس جیسی بزرگ ہستی سے کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہو سکتی جس پر کوئی گرفت کی جا سکتی ہو۔ الا یہ کہ دشمنوں نے تدلیس سے کام لیا ہو اور ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دی ہوں جو اس جیسی ہستی سے کبھی صادر نہیں ہو سکتیں۔

بارگاہ عالی میں ہمیں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی حاجت نہیں ہے۔ اگر اس دنیا میں کوئی قطب ہو سکتے ہیں تو یہی احمد بن تیمیہ ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سلطان کو یوسف صدیق کا مرتبہ عطا کیا ہے جن کے پاس قحط زدہ شہروں کے لوگ غذا کے محتاج بن کر آئے تھے۔ اب ہمیں جسمانی غذا سے زیادہ روحانی غذا کی حاجت ہے اور یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ روحانی غذا سے یہی شریف علوم اور لطیف معانی ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔

دولت سلطانی کے ماتحت تمام شہر ایمان سے خالی تھے یہ خدائے قادر ذوالجلال کی بڑی عنایت اور مہربانی تھی کہ اس نے ہماری اس مملکت کو ایک ایسی بیش بہا چیز عطا فرمائی جو دوسرے شہروں اور اقلیموں میں نہیں پائی جاتی، مختلف شہروں سے وفود آئے مگر انہوں نے بڑی حسرت کے ساتھ شاہی پیمانہ دار اور سرکاری غلہ کا تقسیم کرنے والا قلعہ میں بند ہو چکا ہے۔ حالانکہ یہ چیزیں کسی دوسرے ملک میں خرید و فروخت کے لیے نہیں ملتی۔ اس کی وجہ سے زمین

میں کال آ گیا ہے اور زمین والے ہلاک ہو رہے ہیں اور غذا کے نہ ملنے کی وجہ سے لوگ لب مرگ ہوتے جا رہے ہیں۔

روحانی غذا کی سخت ترین حاجت ہونے کے باوجود سلطان نے شاہی پیمانہ دار پر اپنی سختی برتی، شاید سلطان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ امام اکابرین اولیاء اور اعیان اہل صلاح میں سے ایک ہے۔ اس قیدی کے ساتھ سلطان کا یہ سلوک درحقیقت شیطان کے ان کچوکوں میں سے ایک کچوکہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے پیغمبر! میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہ کہیں جو بہتر ہو شیطان بلاشبہ ان کے درمیان جھگڑ پواتا ہے اور شیطان بلاشبہ انسان کا کھلا دشمن ہے۔'' (۱۷/ بنی اسرائیل: ۵۳)

اب رہا امام ابن تیمیہ کے فتوے پر علما کا اعتراض اور اس کا جواب تو ان دونوں کو یہاں کے چوٹی کے عالموں نے ملاحظہ کیا اور سب نے یہی فتویٰ دیا ہے کہ حق وہی ہے جس کو امام ابن تیمیہ نے پیش کیا ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس امام کے ساتھ عزت واحترام کے تمام آداب ملحوظ رکھنے چاہیں اس میں مملکت کی مضبوطی، دولت اور سلطنت کی درستگی اور ملت اسلامیہ کی عزت ہے۔ ایسا کرنے ہی سے اُمت مسلمہ کی دعائیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ دشمنوں اور بدعتیوں کو ذلت اور رسوائی ہوگی اور ہماری یہ اُمت نئے سرے سے زندہ ہو سکتی ہے اور ظلمت اور تاریخی کو دور کر کے بہت زیادہ ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے ہی سے سلطان کی وقعت بڑھ سکتی ہے اور عام لوگوں سے خطرات کو روکا جا سکتا ہے اور انہیں فائدہ اور نفع پہنچایا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم تمام مسلمان یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی زبان میں بارگاہِ عالی میں یہ درخواست پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں کہ اے عزیز مصر! ہم کو اور ہمارے اہل وعیال کو تکلیفوں نے گھیر لیا ہے اور ہم تیرے پاس پونجی لے آئے ہیں۔ ہم کو پورا ناپ کر دے اور ہم پر کرم فرما، بے شک خدائے تعالیٰ کرم فرماؤں اور صدقہ دینے والوں کو اچھا بدلہ دیتا ہے۔

ہماری یہ ناقص پونجی ہمارے قلم سے لکھے ہوئے یہ چند اوراق ہیں۔ اور مطلوب سامان شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی رہائی ہے اور جس چیز نے ان اوراق کے لکھنے پر ہمیں جرأت

دلائی ہے وہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ الدین النصیحة "دین نصیحت کا نام ہے۔" والسلام۔ [1]

علمائے عراق کی درخواست

علمائے عراق کی طرف سے ایک دوسری درخواست سلطان ناصر کی خدمت میں بھیجی گئی تھی۔ جس میں حمد ونعت کے بعد یہ لکھا تھا کہ "مشرق اور عراق کے لوگوں نے جب سے شیخ الاسلام تقی الدین ابو العباس احمد بن تیمیہ پر سختی کی خبر سنی ہے بہت ہی پریشان ہو گئے ہیں ان کی گرفتاری عام مسلمانوں اور خاص کر اہل دین وتقویٰ پر بہت ہی گراں اور شاق گزر رہی ہے ملحدوں کا سر اونچا ہو گیا ہے اور بدعتی بہت خوش ہیں۔ جب اس طرف کے لوگوں نے اکابر امت اور ائمہ علما کے ساتھ ان بدعتوں کی شماتت دیکھی تو بارگاہِ سلطانی میں اس امر فظیع کو پہنچانا ضروری سمجھا۔ ہم نے علما کے وہ جوابات بھیجے ہیں جن سے شیخ الاسلام ابو العباس بن تیمیہ کے عقائد وخیالات کی تائید اور تصدیق ہوتی ہے۔ ان میں ان کے علم وفضل کا بھی پورا ذکر ہے۔ ہم نے سلطان کی خدمت میں یہ معاملہ اس لیے پیش کیا ہے کہ ہم میں دین کی غیرت اور اسلام اور مسلمانوں کی نصیحت کا جذبہ موجود ہے۔ [2]

ان سب کو نقل کرنے کے بعد شیخ مرعی اپنی کتاب الکواکب الدریہ میں لکھتے ہیں کہ غالباً یہ فتوے اور محضر سلطان کی نظر سے نہیں گزرے ورنہ ضرور ان کا کوئی نتیجہ نکلتا، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ پہنچانے والوں نے عمداً ان کو سلطان تک نہیں پہنچایا یا ان کے پہنچنے سے پہلے ہی شیخ کا انتقال ہو گیا، مگر اتنا تو ثابت ہے کہ یہ تمام خطوط دمشق پہنچ گئے تھے۔ [3]

احتجاج کی بنا پر معزولی اور قید

جب بغداد کے مشہور عالم شیخ جمال الدین یوسف بن عبد المحمود الحنبلی نے بغداد کے حنبلی علما کی طرف سے امام ابن تیمیہ کی گرفتاری پر احتجاج کیا تو بغداد کی حکومت نے انہیں گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا جہاں انہوں نے ۱۱ شوال ۷۲۶ھ کو وفات پائی۔ [4]

---

[1] العقود الدرية، ص: ۳۵۷، ۳۵۹۔ [2] مجموعة الدرر، ص: ۱۹۸۔

[3] مجموع الدرر، ص: ۱۹۸۔ [4] شذرات الذهب: ٦/ ٧٤۔

سلطان ناصر کی مجبوری

سلطان ناصر اگرچہ امام ابن تیمیہ کا بڑا ہمدرد اور حامی تھا مگر بغداد اور عراق و شام کے علما کے احتجاج اور انکی تائید کے باوجود امام موصوف کو رہا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ مصر و شام کے عام قاضی اور مفتی اور فقیہ ان کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ اگر وہ ان کو رہا کر دیتا تو فتنوں کے بڑھنے کا زیادہ اندیشہ تھا اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ امام موصوف کو نظر بند رکھا جائے۔

شیخ شرف الدین ابن تیمیہ کی وفات

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ امام ابن تیمیہ کے دونوں بھائی زین الدین عبدالرحمٰن اور شرف الدین عبداللہ بھی ان کے ساتھ قید کر دیئے گئے تھے۔ قید ہونے کے ایک سال بعد ۱۴ جمادی الاولیٰ ۷۲۷ھ کو بدھ کے دن شیخ شرف الدین ابن تیمیہ کا انتقال ہو گیا ظہر کی نماز کے بعد جامع اموی دمشق میں جنازے کی نماز پڑھی گئی۔ اس کے بعد ان کا جنازہ قلعہ کے دروازے تک لا کر رکھا گیا۔ ظالموں نے جنازے کی نماز کے لیے بھی امام ابن تیمیہ اور ان کے بھائی زین الدین عبدالرحمٰن اور شاگرد حافظ ابن قیم کو قلعے سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی چونکہ تکبیر کی آواز قلعے کے اندر تک آ رہی تھی اس لیے قلعہ ہی کی دیوار کے پاس کھڑے ہو کر جنازے کی نماز پڑھ لی۔ نماز کے ارکان کی ادائیگی میں تو کوئی فرق نہیں آیا۔ مگر بھائیوں اور ایک دلی دوست کو بھائی اور دوست کے جنازے میں شرکت کی اجازت نہ ملنے پر سب کو دلی رنج پہنچا۔ اور لوگوں پر رقت طاری ہو گئی۔ اور بہت سے آدمی رو پڑے۔ تیسری اور چوتھی مرتبہ بھی جنازے کی نماز پڑھی گئی اور پھر مقابر صوفیہ میں ماں کی قبر کے قریب ان کو دفن کیا گیا۔

ایک حریف کی بے وقت موت

امام ابن تیمیہ کی آخری تحریروں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کمال الدین ابن الزملکانی بھی ان کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ ابن الزملکانی شافعی اور تقی الدین اخنائی مالکی

کے پیرو ہی امام موصوف کے خلاف ہنگامہ آرائی کرنے اور فتنہ مچانے میں پیش پیش تھے۔ اس وقت یہ دونوں عالم مصر میں تھے۔ ابن الزملکانی کی یہ کوشش تھی کہ دمشق کی قضاوت پر ان کا تقرر ہو جائے تا کہ دمشق پہنچ کر امام موصوف اور ان کے پیرؤوں سے اپنے دل کی بھڑاس نکالیں، ان کی یہ کوشش بارآور ہوئی اور اس عہدہ جلیلہ پر ان کا تقرر بھی ہو گیا۔ پروانہ لے کر بخوشی دمشق کے لیے روانہ ہوئے ابھی بلبیس [1] پہنچے تھے کہ ۶ رمضان ۷۲۷ھ کو بدھ کے دن ان کا انتقال ہو گیا۔ لاش قاہرہ واپس لے جائی گئی اور مسجد امام شافعی کے احاطہ میں امام شافعی کے مزار کے قریب انہیں دفن کیا گیا۔ جب یہ خبر دمشق پہنچی تو حافظ ابن قیم نے اس پر خوشی ظاہر کی مگر امام ابن تیمیہ نے انہیں جھڑکا اور کہا کہ دشمن کی موت پر ہمیں خوشی نہیں کرنی چاہیے۔ حافظ ابن کثیر نے ابن الزملکانی کے حالات میں ان کی بے وقت موت کو امام ابن تیمیہ کی مخالفت اور عداوت کا نتیجہ بتایا ہے۔ [2]

کاغذات کی ضبطی

جب قاضی القضاۃ شیخ تقی الدین اخنائی مالکی نے زیارت قبور کے مسئلہ میں امام ابن تیمیہ کے خیالات کی تردید کی اور ان پر تشدد برتنا چاہا تو امام موصوف نے قید ہی کی حالت میں ان کی تحریروں کا سخت جواب لکھا اور انہیں جاہل اور بے علم قرار دیا۔ اس سے قاضی اخنائی کو بڑا رنج ہوا۔ انہوں نے سلطان مصر ملک ناصر سے کہہ کر یہ فرمان بھیجوایا کہ امام موصوف کے پاس سے دوات قلم اور تمام کاغذات ضبط کر لیے جائیں، چنانچہ ۹ جمادی الآخرہ ۷۲۸ھ کو پیر کے دن ان کے تمام کاغذات ضبط کر لیے گئے۔ وہاں سے دوات اور قلم بھی اُٹھا لیا گیا۔ ان کے پاس اس وقت ساٹھ سے زیادہ کتابیں تھیں اور کاغذات کے چودہ بستے تھے۔ یہ سب وہاں سے اُٹھا لیے گئے اور یکم رجب ۷۲۷ھ کو مدرسۂ عادلیہ [3] دمشق کے مدرس قاضی علاء

---

[1] قاہرہ زقازیق کے راستہ میں قاہرہ سے تقریباً پچپن میل پر ایک مشہور جگہ ہے یہ قاہرہ سے سترھواں اور زقازیق سے پانچواں ریلوے اسٹیشن ہے۔ [2] البدایہ والنہایہ: ۱۴/ ۱۳۲۔

[3] مدرسہ عادلیہ اور مدرسہ ظاہریہ کی عمارتیں سڑک کے ایک دوسرے کے مقابل ہیں یہ عجیب بات ہے کہ آجکل مدرسہ عادلیہ کی عمارت میں المجمع العلمی الدمشقی کا دفتر ہے المدرسۃ الظاہریہ میں دمشق کا مشہور کتب خانہ ظاہریہ ہے۔

الدین قونوی کے حوالے کر دیئے گئے۔ کتابیں مدرسہ کے کتب خانہ میں داخل کر دی گئیں۔ دمشق کے قاضیوں اور فقیہوں نے ان کاغذات کی تلاشی لی اور جس کو جو مناسب معلوم ہوا ان کاغذوں کو اُٹھالیا۔ باقی کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ [1]

کوئلے کی تحریریں

ایک علمی آدمی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ اس کے علمی مشغلے پر بھی پابندیاں عائد کر دی جائیں انہوں نے کوئلے سے قید خانے کی دیوار پر لکھا کہ اگر انہیں کوئی حقیقی سزا دی گئی ہے تو وہ یہی ہے۔ امام موصوف نے اپنے دوستوں کے نام کوئلے سے کچھ خطوط بھی لکھتے تھے۔ جن میں سے دو خط العقود الدریہ میں نقل کیے گئے ہیں۔ ذیل میں ان دونوں خطوط کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

پہلا خط

تم پر اللہ کی سلامتی اور رحمت اور برکت نازل ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم پر اس کی روز افزوں نعمتیں جاری ہیں۔ خدا جو کچھ بھی کرتا ہے وہ اسلام ہی کی بھلائی کے لیے کرتا ہے۔ اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک یہ نعمت ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر روانہ کیا تا کہ اس کا دین سب دینوں پر غالب ہو اور اللہ گواہی کے لیے کافی ہے۔ شیطان نے اپنے گروہ کو خدا کے دین میں فساد ڈالنے کے لیے استعمال کیا ہے جبکہ خدا ہی نے رسولوں اور کتابوں کو لوگوں کی ہدایت کی غرض سے بھیجا ہے۔

خدا کی ایک سنت یہ بھی ہے کہ جب کبھی وہ اپنے دین کو ظاہر اور غالب کرنا چاہتا ہے تو اس کے خلاف لوگوں کو کھڑا کر دیتا ہے۔ پس وہ اپنے ہی کلمات کے ذریعے حق کو ثابت اور باطل کو تباہ کرتا ہے اور باطل تباہ ہونے ہی کے لائق ہے۔

شیطان کا گروہ صرف دین محمدی ہی کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ وہ سارے انبیاء کے دین کا مخالف ہے۔ اس کو ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام سے دلی بغض ہے۔ اس گروہ کی کوشش یہ ہے کہ اللہ و رسول کے طرفداروں کی طرف سے کوئی ایسی کتاب یا ایسا خطاب شائع نہ ہو جس

---

[1] البداية والنهاية:١٣/ ١٣٤۔

سے گروہ اخنائیہ کے ظہور اور غلبے پر زد پڑتی ہو۔ خدا نے اس گروہ کو کھڑا کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے رسالے اور بہت سی کتابیں شائع ہوگئیں۔ اس گروہ کے لوگوں نے تلاش اور تفتیش شروع کر دی۔ اس کا مقصد اپنے دشمن کے عیوب کو ظاہر کرنا تھا وہ چاہتا تھا کہ دشمن کی تحریروں میں ایک ایسی چیز ہاتھ آجائے جس سے اس گروہ کی تائید میں کوئی دلیل مل سکتی ہو، مگر اس کی تحریروں میں اس گروہ کو ایسی ہی چیزیں مل رہی تھیں جو اس کے دلائل کی تردید کرتی ہیں اور جن سے اس کا جہل، کذب اور عجز ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ تحریریں ساری زمین میں پھیل گئیں ہیں۔ خدا کے سوائے کسی کو ان کے پھیلانے کی قدرت نہیں ہے اس گروہ کے لیے ہماری شریعت اور ہمارے دین میں کسی عیب کا نکالنا ناممکن ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے بعض مخلوق کے مزعومات و مرسومات کی مخالفت کی اور مخلوق چاہے کوئی بھی ہو اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اس کی اطاعت واجب نہیں ہے بلکہ باتفاق اُمت اس کی پیروی ناجائز ہے۔

اب رہا کہنے والے کا یہ کہنا کہ فلاں شخص بدعت کو ظاہر کرتا ہے تو یہ ایک ایسا کلام ہے جس کا فساد ہر صاحب بصیرت پر واضح ہے۔ ہر عاقل آدمی یہ جانتا ہے کہ معاملہ بالکل اُلٹا ہے۔ کیونکہ جو شخص بھی بدعت کو ظاہر کرتا ہے وہ یا تو سنت رسول کے علم نہ ہونے کی وجہ سے ایسا کرتا ہے یا اس میں اس کی کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس قسم کا غرض والا شخص پہلے قسم کے شخص کی بہ نسبت زیادہ جاہل ہوگا۔ اس لیے کہ وہ اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے بہت بُرے نتائج ہوں گے۔ چند دنوں میں اس کی کیفیت بھی معلوم ہو جائے گی۔

حافظ ابن عبد الہادی لکھتے ہیں کہ اس کے بعد کی تھوڑی عبارت مٹ گئی ہے اور وہ پڑھی نہیں جاتی۔ اس کے بعد کے سطور پڑھے جا سکتے ہیں جن کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"اخنائی گروہ کے مخالفین کے پاس اتنی دلیلیں ہیں کہ اخنائیوں کی ہر ایک دلیل کی تردید ہو جاتی ہے اور ان تمام اغراض و مقاصد پر پانی پھر جاتا ہے۔ ان مخالفین کے پاس پچاس سے زائد ایسے دلائل ہیں جن سے زملکانی گروہ کے دلائل کی تردید ہوتی ہے اور ان سے یہ ثابت

ہوتا ہے کہ زملکانی کا فتویٰ اجماع مسلمین کے خلاف ہے۔ اگر زملکانی کا گروہ رسول کی لائی ہوئی شریعت سے واقف ہو کر عمداً اپنے مخالفین کے خیالات کی مخالفت کرتا تو وہ کافر ہوتا اور اسلام سے برگشتہ قرار دیا جاتا مگر یہ لوگ جاہل ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے ایک ایسی بات میں دخل دیا ہے جس کا انہیں ذرہ بھر علم نہیں ہے۔ انہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ سلطنت ان کی مراد کی مخالف ہے۔ معاملہ اس سے بھی کچھ بڑھا ہوا ہے جو تم کو دکھائی دے رہا ہے۔ ہم لوگ خدا کے فضل و کرم سے اس کے راستے میں جہاد کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ جہاد قازان، جبلیہ، جہمیہ اور اتحادیہ کے خلاف جہاد کرنے کے برابر ہے۔ ہم پر اور لوگوں پر خدا کی یہ ایک بڑی نعمت ہے مگر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔"

دوسرا خط

یہ دوسرا خط امام موصوف نے اپنی وفات سے ایک مہینہ پیشتر شوال ۷۲۸ھ میں لکھا ہے "ہم خدا کے فضل و کرم سے بڑی نعمتوں میں ہیں۔ ہر روز اس کی نعمت بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کتابوں کا یہاں قید سے نکالا جانا بھی ایک بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ میں یہی چاہتا تھا کہ یہ کتابیں باہر آئیں اور اخنائی گروہ کے لوگ اور دوسرے دشمن ان کو پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود انہی لوگوں کو ان کتابوں کے نکلوانے کا ذریعہ بنا لیا اور انہیں ان کتابوں کے مطالب و معانی سے واقف ہونے کا موقع دیا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کا دین برحق ہے یہ تمام مسائل ان لوگوں کی نظروں سے بالکل پوشیدہ تھے۔ اب جب یہ ظاہر ہو گئے تو جو شخص حق کا چاہنے والا ہوگا ان کے ذریعہ ہدایت پائے گا اور جو شخص باطل پسند ہوگا اس پر حجت قائم ہو جائے گی اور وہ خدا کی طرف سے ذلت اور رسوائی کا مستحق ہوگا۔ میں نے ان رسالوں کو اس غرض سے نہیں لکھا تھا کہ یہ لوگوں کی نظروں سے چھپے رہیں۔ چاہے وہ ہم سے بغض ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔"

اس کے بعد مرسل الیہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں نے تمہارے جوابات کے تمام کاغذات دھو ڈالے ہیں میں بہت اچھا ہوں اور میری آنکھیں پہلے سے بھی زیادہ اچھی ہیں۔ ہم پر خدا کی اتنی زیادہ نعمتیں ہو رہی ہیں کہ کوئی

ان کو گن نہیں سکتا اور نہ کوئی ان کو شمار کر سکتا ہے۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

خدا کا جو بھی فیصلہ ہوگا اس میں ہمارے لیے خیر و برکت اور رحمت و حکمت ہی ہوگی۔ بے شک ہمارا پروردگار جس کے ساتھ چاہتا ہے مہربانی کرتا ہے اور وہ قوی و عزیز و علیم و حکیم ہے۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا مگر اسی کے گناہوں کی وجہ سے۔ ﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ط﴾ [1] ''تجھ کو جو کچھ بھلائی پہنچتی ہے وہ صرف اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور تجھ کو جو کچھ برائی پہنچتی ہے وہ اپنے نفس کی وجہ سے ہے۔'' بندے کو ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا واجب ہے اور اس کو ہمیشہ اپنے گناہوں کی مغفرت مانگتے رہنا چاہیے۔ شکر کرنے سے نعمتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مغفرت مانگتے رہنے سے خدا کا غصہ اور جذبۂ انتقام ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن کے حق میں وہی فیصلہ کرتا ہے جو اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ اگر اس کو کوئی خوشی پہنچے تو اس کو شکر کرنا چاہیے اور اگر کوئی تکلیف پہنچے تو اسکو صبر کرنا چاہیے۔ یہی اس کے لیے بہتر ہے۔''

سچ ہے:

ہوئے ہیں وہ خوگر جفا ہم یہ کہتے پھرتے ہیں جا بجا ہم
جو کوئی ہم پر ستم کرے گا ہم اس کے حق میں دعا کریں گے

مشغلہ قراءت قرآن و عبادت

دوات قلم اور کاغذات کے چھین لیے جانے کے بعد امام موصوف تقریباً چار مہینے کچھ دن زندہ رہے۔ اس مدت میں ان کا مشغلہ صرف قراءت قرآن اور عبادت رہ گیا تھا۔ روزانہ قرآن مجید کے تین جز نہایت ہی غور و فکر اور تفکر و تدبر کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس طرح ایک مہینے میں تین دور ہوتے تھے۔ اس میں بھی اتباع سنت کا لحاظ تھا۔ باقی اوقات ذکر و اذکار اور عبادات میں گزارتے تھے۔ حافظ ابن قیم کہتے ہیں کہ وہ اکثر سجدے میں یہ مسنون دعا مانگتے تھے:

---

[1] ٤/النساء:٧٩۔

اللّٰهم اعنى على ذكرك و شكرك و حسن عبادتك ❶

''اے اللہ! مجھے تیرا ذکر و شکر کرنے اور اچھی عبادت کرنے پر میری مدد کر۔''

وہ خود بھی صابر و شاکر تھے اور دوسرے قیدیوں کو بھی صبر و شکر کی تلقین کیا کرتے تھے۔

بیماری اور وفات

ذوالقعدہ ۷۲۸ھ کی ابتدائی تاریخوں میں امام موصوف بیمار پڑے اور تقریباً بیس دن بیمار رہے۔ مگر بہت کم لوگوں کو اس کی اطلاع ہو سکی۔ بیماری کے زمانے میں نائب الشام امیر سیف الدین تنکز دمشق میں نہیں تھا۔ وہ شکار کے لیے گیا ہوا تھا۔ جب ان کی بیماری شدید ہو گئی تو وزیر شمس الدین عبریال کو خبر دی گئی۔ وہ فوراً چلا آیا اور امام موصوف کے بستر کے قریب بیٹھ کر مزاج پرسی کی اور ان سے معافی چاہی۔ امام موصوف نے کہا: میں تم کو اور ان تمام لوگوں کو جنہوں نے میرے ساتھ دشمنی کی صدق دل سے معاف کرتا ہوں۔ یہ لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ میں حق پر ہوں۔ میں سلطان ناصر کو بھی معاف کرتا ہوں کیونکہ اس نے دوسروں کے کہنے پر مجھے قید میں ڈالا۔ اور اس میں اس کی کوئی ذاتی غرض نہیں تھی اس نے اپنے علم کے مطابق جس بات کو حق سمجھا اس پر عمل کیا۔ حالانکہ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس کا یہ فعل حق کے خلاف تھا۔ تاہم میں ہر اس شخص کو معاف کرتا ہوں جس نے میرے ساتھ بدسلوکی کی۔ البتہ اس سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں۔ ❷

امام موصوف دو سال تین مہینے اور کچھ دن قید خانے میں رہے۔ اس مدت میں انہوں نے اسّی مرتبہ قرآن مجید کا دور کیا۔ اکاسی واں مرتبہ قرآن مجید کا دور کر رہے تھے کہ مرض الموت میں گرفتار ہوئے اس مرتبہ وہ سورۂ ساعہ کے ختم تک پہنچے تھے۔ جس کی آخری آیت یہ ہے:

﴿ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّٰتٍ وَنَهَرٍ ۝٥٤ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝٥٥ ﴾ ❸

''پرہیز گار لوگ بلاشبہ باغوں اور نہروں میں ہوں گے اور مقتدر بادشاہ کے نزدیک سچی جگہ حاصل کیے ہوئے ہوں گے۔''

---

❶ سنن ابی داود، باب تفریع ابواب الوتر، باب فی استغفار، ح: ۱۵۲۲؛ صحیح ابن خزیمة: ۷۵۱۔ ❷ مجموع الدرر: ۱۹۹۔ ❸ ۵۴/القمر: ۵۴، ۵۵۔

اس کے بعد بیماری کی شدت کی وجہ سے قرآن مجید کے پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ آخر ۲۸ ذوالقعدہ ۷۲۸ھ کو دوشنبہ کی رات ان پر سکرات طاری ہوئی اور چند گھنٹوں کے اندر انکی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور اس طرح علم و عمل اور تقویٰ وطہارت کا پیکر ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔ ان للہ وانا الیہ راجعون، ان کی موت ان کی دائمی اور حقیقی زندگی کی ابتدا تھی۔ مگر ناعاقبت اندیش قوم اپنی حیات کے سرچشمہ کو ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھی۔

موت التقی[1] حیاۃ لا انقطاع لھا

قد مات قوم وھم فی الناس احیاء

پرہیزگاری کی موت زندگی ہے جس کا سلسلہ کٹنے والا نہیں ہے۔ قوم بلاشبہ مر چکی ہے حالانکہ وہ دیکھنے میں لوگوں کے اندر زندہ ہے۔

شیخ صلاح الدین صفدی لکھتے ہیں کہ امام موصوف اپنی بیماری کی حالت میں اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

تموت النفوس باوصابھا

ولم تدر عوادھا ما بھا

نفوس اپنی تکلیفوں سے مر جاتے ہیں اور ان کی مزاج پرسی کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ ان کو کیا ہو گیا ہے۔

وما انصفت مھجۃ تشتکی

اذا ھا الی غیر اربابھا

اور کوئی جان اگر اپنے پروردگار کو چھوڑ کر دوسرے کے سامنے شکایت کرتی ہے تو وہ انصاف سے کام نہیں لیتی۔

موت کا اعلان اور ہجوم

مردہ قوم کسی بلند مرتبہ ہستی کی اس زندگی میں حقیقی قدر و قیمت کو نہیں پہچانتی مگر جب وہ ہستی مر کر ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کو اپنی غفلت کا احساس ہوتا ہے اور

---

[1] ملحوظ رہے کہ امام موصوف کا لقب بھی تقی الدین تھا۔

پھر اس کو اس سے اتنی عقیدت پیدا ہوتی ہے کہ وہ عقیدت پرستش کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔
امام ابن تیمیہ کے ساتھ بھی یہی پیش آیا۔ امام موصوف کی زندگی میں یوں تو بہت سے لوگ ان کی عزت اور قدر کرتے تھے۔ مگر ان کے مرنے کے بعد ان کی جتنی قدر کی گئی اتنی کبھی ان کو ان کی زندگی میں حاصل نہیں تھی۔ جب صبح سویرے مؤذنین نے مسجد کے مناروں سے ان کی موت کا اعلان کیا اور پولیس والوں نے برجوں سے اس کی منادی کی تو سارے شہر پر ایک سناٹا چھا گیا، اطراف واکناف میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی۔ دمشق بہت سویرے دکانیں کھلا کرتی تھیں مگر اس روز کسی نے بھی اپنی دکان نہیں کھولی۔ دوست احباب، رشتہ دار، عمائدین شہر، امراء و روساء، قضاۃ و علما و فقہا، اہل فوج، درباری اور ارکین دولت وغیرہ سبھی کو امام موصوف کی وفات پر بڑا رنج ہوا۔ عوام کے دلوں میں ان کی غیر معمولی قدر اس وجہ سے بھی تھی کہ انہوں نے دمشق والوں کو خونخوار تاتاریوں کے بے پناہ حملوں سے نجات دلائی تھی۔ بہت سے لوگ اپنا کام دھام چھوڑ کر قلعے کی طرف روانہ ہوئے بعض لوگ دمشق کی جامع مسجد میں جمع ہو گئے۔ اس خیال سے کہیں بعد میں انہیں جنازے کے قریب پہنچنے کیلئے جگہ نہ مل سکے۔ تھوڑی دیر میں قلعے کے سامنے لوگوں کا ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا اور ان کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔ قلعے سے لے کر جامع مسجد تک ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔

تجہیز و تکفین

چونکہ نائب شام امیر سیف الدین تنکز شکار پر گیا ہوا تھا۔ اس لیے حکومت کے ارباب اقتدار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا انتظام کیا جائے۔ وزیر شمس الدین عبداللہ بن ضیعہ غبریال قبطی جو امیر تنکز کی طرف سے نیابت کر رہا تھا، قید خانے آیا۔ سب سے پہلے امام موصوف کے خاص احباب اور ساتھیوں کو اندر آنے کی اجازت دی۔ شیخ جمال الدین یوسف بن عبدالرحمٰن المزی شافعی اور ان کے داماد و حافظ ابوالفدا عماد الدین اسمٰعیل بن عمر بن کثیر تشریف لائے اور ان کے ساتھ محلہ صالحیہ کے بہت سے علما و فقہا اور عمائدین شہر آئے۔ حافظ ابن کثیر امام موصوف کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے امام موصوف کے چہرے سے چادر ہٹائی اور پیشانی کا بوسہ لیا۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ان پر بڑھاپے کی سفیدی غالب ہو چکی

تھی۔ وزیر شمس الدین نے شیخ جمال الدین المزی، حافظ ابن کثیر اور دوسرے احباب کو دلاسا دیا اور امام موصوف کی وفات پر اپنا دلی افسوس ظاہر کیا۔

چونکہ امام موصوف اپنی زندگی میں دو قاریوں کی قرأت کو بہت ہی دلچسپی سے سنا کرتے تھے اس لیے ان کو بلایا گیا۔ یہ دونوں شیخ محب الدین عبداللہ بن احمد مقدسی حنبلی (المتوفی: ۷۳۷ھ) اور شیخ عبداللہ الزرعی الضریر (المتوفی: ۷۴۵ھ) تھے۔ دوسرے بزرگ نابینا تھے۔ نعش کے قریب بیٹھ کر ان دونوں نے سورۂ الرحمٰن سے لے کر سورۂ الناس تک کا حصہ خوش الحانی کے ساتھ ختم کیا۔ دوسرے بہت سے لوگ وہاں بیٹھ کر قرآن پڑھنے لگے۔ لوگ آتے تھے اور ان کی زیارت کر کے واپس ہو جاتے تھے۔

اس کے بعد تمام لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ صرف ان لوگوں کو وہاں رہنے دیا گیا جو امام موصوف کو غسل دے سکتے تھے یا غسل دینے میں مدد دے سکتے تھے۔ شیخ جمال الدین یوسف المزی نے امام موصوف کو غسل دیا اور پھر کفن پہنایا۔ ان کے سر کی گول ٹوپی پانچ سو درہم میں خریدی گئی۔ اور جوؤں کے روکنے کی سیمائی ڈوری ڈیڑھ سو درہم میں فروخت ہوئی۔

نماز جنازہ

جب جنازہ تیار ہو گیا تو سب سے پہلے قلعہ کے باہر جنازے کی نماز ادا کی گئی تاکہ قیدی بھی اس میں شریک ہو سکیں۔ شیخ محمد بن تمام نے جنازے کی نماز پڑھائی۔ اس کے بعد جب جنازہ اٹھایا گیا تو لوگوں کے اژدحام کی وجہ سے جنازے کا آگے بڑھنا بہت مشکل تھا، وزیر شمس الدین نے ہر طرف پولیس اور فوج متعین کر رکھی تھی تاکہ جنازے کے لیے راستہ صاف کریں۔ عورتیں اور بچے گھروں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر یہ دلسوز نظارہ دیکھنے لگے اور تاتاری حملوں کے زمانے کو یاد کر کے ان پر اپنے آنسو بہا رہے تھے۔ یہ جنازہ عمادیہ اور عادلیہ سے ہوتا ہوا جامع دمشق کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں لوگوں کی اتنی کثرت تھی کہ کسی کا جھکنا مشکل تھا۔ اگر کسی کے پیر سے جوتا نکل جاتا تو وہ اسی طرح پیر میں دبائے اور گھسیٹے چلا جا رہا تھا۔ جھک کر اس کا درست کرنا بہت مشکل تھا۔ ظہر کی اذان سے کچھ پہلے یہ جنازہ دمشق کی جامع اموی میں پہنچا۔ یہاں لوگ پہلے ہی سے بھرے ہوئے تھے۔ تل دھرنے کی جگہ

نہیں تھی۔ جب جنازہ مقصورے میں رکھا گیا تو کسی نے چلا کر کہا اہل سنت کا جنازہ ایسا ہوتا ہے اس پر لوگ رو پڑے، اتنے میں ظہر کی اذان ہوئی۔ خلاف عادت وقت سے پہلے ظہر کی نماز ادا کی گئی تا کہ لوگوں کو انتظار کی تکلیف برداشت نہ کرنی پڑے۔ ہجوم ایسا تھا کہ ہر ایک دوسرے کے پیروں پر سجدہ کر رہا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد جامع مسجد کے نائب خطیب شیخ علاء الدین خراط نے جنازے کی نماز پڑھائی کیونکہ جامع مسجد کے خطیب شیخ جلال الدین قزوینی اس وقت دمشق میں موجود نہیں تھے۔ وہ مصر گئے ہوئے تھے۔

نماز کے بعد جب جامع مسجد سے جنازہ اٹھایا گیا تو بڑی کشمکش شروع ہوگئی۔ جنازہ دو چار قدم آگے بڑھتا تھا اور پھر رک جاتا تھا۔ سپاہیوں نے جنازے کے اطراف حلقہ بنالیا اور لوگوں کو کھسکاتا ہوا آگے بڑھانا شروع کیا۔ شہر دمشق کے کل آٹھ دروازے تھے۔ لوگ باب الفرج، باب الفرادیس، باب النصر، باب الجابیہ، باب البرید وغیرہ سے باہر میدان میں پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سے باب الفرج سب سے زیادہ کشادہ دروازہ تھا۔ اس لیے جنازہ اسی دروازے سے باہر لے جایا گیا، راستے میں عورتیں بالا خانوں پر کھڑی ہوئی تھیں اور اپنے دوپٹوں کا ایک کنارہ جنازے پر پھینک کر برکت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ شیخ شہاب الدین ازرعی کا بیان ہے کہ جب جنازہ جامع مسجد سے روانہ ہوا تو وہ بلب البرید سے باہر نکلے۔ کچھ دور ہی گئے تھے کہ ان کے پیروں میں سے ایک پیر کا جوتا نکل گیا۔ ایک کی پیٹھ دوسرے کے سینے سے اس قدر پیوست تھی کہ کسی کا جھکنا دشوار تھا۔ لوگوں کے ریلے سے مجبور ہو کر وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ دفن سے فارغ ہو کر واپس ہوئے اور اپنا جوتا تلاش کیا تو اس کو وہیں پڑا ہوا پایا۔ اس کو وہ امام موصوف کی برکت اور کرامت تصور کیا کرتے تھے۔ [1]

چونکہ پہلے سے کسی کو اتنے بڑے ہجوم کا اندازہ نہیں تھا اس لیے جامع مسجد کے وسیع صحن کو نماز جنازہ کیلئے منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود بعض لوگ نماز میں شامل نہیں ہو سکے تھے۔ جب جنازہ شہر کے باہر سوق الخیل کے میدان میں لا کر رکھا گیا تو امام موصوف کے بھائی شیخ

---

[1] الدرر الکامنة: ۱/ ۱۶۰۔

زین الدین عبدالرحمٰن ابن تیمیہ نے تیسری مرتبہ جنازے کی نماز پڑھائی۔ دمشق کے ایک ثقہ آدمی نے شیخ علم الدین برزالی سے جوان دنوں حج کیلئے گئے ہوئے تھے اور جنہیں تبوک کے قریب امام موصوف کی وفات کی خبر ملی تھی۔ یہ بیان کیا تھا کہ وہ جامع مسجد اور سوق الخیل دونوں جگہوں کی نمازوں میں شریک تھا۔ اتفاقاً وہ ایک اونچی جگہ پر تھا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس وسیع میدان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جو آدمیوں سے خالی رہا ہو۔ جہاں تک نظر جاتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آرہے تھے۔

تدفین

جنازہ امام موصوف کے آبائی قبرستان مقابر صوفیہ میں لا کر رکھا گیا۔ چند مخصوص اراکین دولت نے وہاں جنازے کی نماز ادا کی اور عصر کے قریب ان کو ان کے منجھلے بھائی شیخ شرف الدین عبداللہ ابن تیمیہ کی قبر کی بغل میں دفن کیا گیا۔ [1]

جنازے میں شریک ہونے والوں کی تعداد

حافظ ابن کثیر نے جنازے میں شریک ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بتائی ہے۔ اس بارے میں تذکرہ نگاروں کا اندازہ مختلف ہے۔ صرف عورتوں کی تعداد پندرہ ہزار بتائی جاتی ہے۔ ممکن ہے اس میں مبالغہ ہو۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام احمد ابن حنبل کے جنازے کے بعد کسی کے جنازے میں اتنی کثیر تعداد نہیں تھی۔ حالانکہ امام احمد ابن حنبل کا انتقال ایک ایسے وقت پر ہوا تھا جبکہ بغداد کا شہر اپنے انتہائی عروج اور ترقی پر تھا۔ اور امام موصوف کی وفات ایک ایسے وقت ہوئی جبکہ دمشق صلیبیوں اور پھر تاتاریوں کے پے در پے حملوں کی وجہ سے بہت کچھ اجڑ چکا تھا۔ تاہم بوڑھوں، بیماروں، عورتوں، اور بچوں کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو ان کے جنازے میں شریک نہ ہوا ہو۔ ان کے مخالفین میں سے تین آدمی

---

[1] یہ مشہور معروف قبرستان آج مٹ چکا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کی جگہ پر جامعہ سوریہ کی شاندار عمارتیں کھڑی ہوگئی ہیں تمام قبریں مٹائی جا چکی ہیں۔ صرف امام ابن تیمیہ کی ایک قبر باقی رکھی گئی ہے۔ اور اس کے اطراف لوہے کا ایک کٹہرا گھیر دیا گیا ہے ۱۴ رجب ۱۳۷۷ھ مطابق ۴ فروری ۱۹۵۸ء کو منگل کے دن خاکسار نے اس کی زیارت کی۔

یعنی شیخ جمال الدین بن جملہ شافعی، شیخ صدر الدین اور قفچاری شریک نہیں ہوئے۔ عوام کے ڈر سے وہ اس دن روپوش ہو گئے تھے۔ انہی تینوں نے سب سے زیادہ امام موصوف اور ان کے ساتھیوں کو ستایا تھا اس لیے انہیں یہ ڈر ہو گیا تھا کہ عوام کہیں طیش میں آ کر انہیں قتل نہ کر ڈالیں۔

مکمل ہڑتال

امام موصوف کی وفات پر دمشق کی ساری دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اس لیے جنازے میں شریک ہونے والے صبح سے لے کر عصر کے بعد تک کچھ کھا پی نہیں سکے۔ بعض نے روزہ رکھ لیا تھا۔ تمام سرکاری مدراس بھی بند ہو چکے تھے۔ بعض متعصب شافعی علما اور اساتذہ نے تعصب بھی برتا۔ چنانچہ شیخ بدرالدین ابن غانم لکھتے ہیں کہ امام موصوف کی وفات کے دن وہ شیخ برہان الدین فزاری شافعی سے ملنے گئے جو شیخ تاج الدین فزاری کے لڑکے تھے۔ یہ شیخ تاج الدین وہی ہیں جنہوں نے امام موصوف کا پہلا درس قلمبند کر کے دارالحدیث السکریہ میں رکھوایا تھا۔ شیخ برہان الدین مدرسہ بادرانیہ کے استاد تھے۔ وہ اس مدرسہ کے دروازے کے قریب جبوترے پر دلگیر بیٹھے ہوئے تھے۔ شیخ بدرالدین نے رسم تعزیت ادا کی۔ دونوں امام موصوف کے اوصاف اور فضائل کے متعلق گفتگو کر رہے تھے کہ اتنے میں مدرسہ بادرانیہ کا ایک طالب علم آیا اور خفگی کے لہجہ میں کہا: جب تک آپ کے پاس کوئی نہیں آتا آپ درس دینے کیلئے نہیں آتے۔ شیخ برہان الدین بے حد خفا ہوئے اور طیش میں آ کر گھر کے اندر چلے گئے اور پھر شیخ بدرالدین کو اپنے گھر کے اندر بلایا اور کہا: دیکھتے ہو؟ ایک ادنی فقیہ کی موت پر اسباق بند کر دیے جاتے ہیں۔ مگر اس جیسے بڑے عالم کی موت پر بند نہیں کیے جاتے۔ خدا کی قسم! اس شخص میں اتنی بڑائیاں اور بزرگیاں تھیں کہ امام احمد بن حنبل میں بھی اتنی پائی نہیں جاتیں۔ پھر فرمایا کہ امام موصوف ان کے بچپن کے ساتھی تھے اور ان کے والد سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ان کے والد بھی امام موصوف اور ان کے والد سے ملنے کے لیے ان کے گھر جایا کرتے تھے، جب امام موصوف نے اپنے والد کی وفات کے بعد پہلا درس دیا تو شیخ برہان الدین کے والد نے اس کو قلمبند کیا اور بڑی تعریفوں کے ساتھ اس کو دارالحدیث

السکریہ میں رکھوایا۔ وہ اکثر ان کے غیر معمولی علم و فضل کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ❶

غائبانہ نماز جنازہ

جب ان کی وفات کی خبر مختلف شہروں میں پہنچی تو ہر جگہ غائبانہ نماز پڑھی گئی، شیخ سراج الدین بزاز فرماتے ہیں "ہمیں کوئی ایسا شہر معلوم نہیں ہے۔ جہاں شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کے انتقال کی خبر پہنچی ہو اور نماز جنازہ نہ پڑھی گئی ہو۔" ❷ حافظ ابن کثیر نے مدینہ کی غائبانہ نماز جنازہ کا ذکر کیا ہے۔ ❸ کہا جاتا ہے کہ چین جیسے دور دراز ملک میں بھی جنازے کی نماز ادا کی گئی تھی۔ ❹

عقیدت کی انتہا

امام موصوف کی وفات کے بعد کئی دنوں تک ان کی قبر ایک عام زیارت گاہ بنی رہی ان کے عقیدت مند دور دور سے ان کی قبر پر آتے تھے اور دعا کر کے واپس ہوتے تھے۔ شیخ برہان الدین فزاری جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ تین دن تک امام موصوف کی قبر پر چند شافعی علما کے ساتھ حاضری دیتے تھے اور ان کے لیے دعا کر کے جاتے تھے۔ وہ بہت باوقار اور جاہ و جلال والے آدمی تھے۔ ❺

بعض لوگوں نے انتہائی عقیدت کی وجہ سے ان کی قبر کی مٹی کو سرمہ چشم بنا لیا تھا۔ اس سے آشوب چشم کی شکایت دور ہوتی تھی۔ چنانچہ علی بن عبدالکریم بن شیخ سراج الدین بغدادی کہتے ہیں کہ امام موصوف کی وفات کے وقت وہ نوجوان تھے۔ ان کو امام موصوف کے ساتھ بڑی خوش عقیدگی تھی وہ علی کے والد عبدالکریم کے ساتھی تھے۔ اس لیے امام موصوف اکثر ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔ اتفاق یہ کہ انہی دنوں میں علی کی لڑکی کو آشوب چشم کی شکایت ہو گئی اور کوئی علاج مفید نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دن انہیں خیال ہوا کہ کیوں نہ امام ابن تیمیہ کی قبر کی مٹی اس کی آنکھوں میں لگائی جائے۔ جب وہ قبر پر پہنچے تو انہوں نے اور ایک بغدادی کو قبر کی خاک ایک تھیلی میں بھرتے ہوئے دیکھا۔ اس سے پوچھا کہ تم اس خاک کو کیا کرو گے؟ اس

---

❶ مجموع الدرر، ص: ٤٦۔ ❷ ایضًا: ٢٠٢۔ ❸ البدایة و النهایة: ١٤/١٤٣۔
❹ طبقات الحنابلة لا بن رجب قلمی۔ ❺ البدایة والنهایة: ١٤/ ١٣٩۔

نے کہا اپنی اولاد کی آنکھوں میں لگاؤں گا اس سے آشوب چشم کی شکایت دور ہوتی ہے۔ علی بہت متعجب ہوئے۔ انہوں نے تھوڑی سی خاک لی اور اپنی لڑکی کی آنکھوں میں لگایا۔ چند دن میں آشوب چشم کی شکایت دور ہوگئی۔ اور جب انہوں نے شیخ شرف الدین ابوالعباس احمد بن الحسن بن شیخ الاسلام ابی عمر المقدسی سے یہ واقعہ بیان کیا۔ تو وہ بھی بہت متعجب ہوئے۔ اس کے بعد وہ اکثر لوگوں کے سامنے اس واقعہ کو بیان کرنے کی فرمائش کرتے تھے اور وہ اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے۔ [1]

لیکن یہ ایسے واقعات ہیں جن پر مشکل سے بھروسا اور اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس تعلیم کے بالکل خلاف ہے جو امام موصوف آخر وقت تک لوگوں کو دیتے رہے۔ (نیز یہ بالکل بے اصل ہیں، حقیقت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں)

حافظ ابن قیم کی رہائی

امام موصوف کی وفات کے بعد ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیم اکیس بائیس دن تک قید خانہ ہی میں رہے۔ شاید مصر سے ان کی رہائی کے فرمان کا انتظار تھا اور جب وہاں سے حکم آ گیا تو ۲۰ ذوالحجہ ۷۲۸ھ کو منگل کے دن انہیں رہا کر دیا گیا۔

مرثیے

امام ابن تیمیہ کی وفات پر بہت سے دلدوز مرثیے لکھے گئے جن میں سے ایک مرثیہ چالیس پچاس بلکہ ساٹھ اشعار کا ہے۔ شیخ شمس الدین ذہبی، شیخ شہاب الدین احمد بن فضل اللہ العمری، شیخ زین الدین ابوحفص عمر بن الوردی، شیخ تقی الدین ابوعبداللہ محمد بن سلیمان بن عبداللہ بن سالم الجعبری، شیخ علاء الدین بن غنام، شیخ جمال الدین محمود بن اثیر الحلبی، شیخ زین الدین عمر بن حسام الاشبیلی، شیخ جمال الدین عبدالصمد بن ابراہیم البغدادی الحنبلی المعروف بابن الحصری، شیخ شہاب الدین ابوالعباس احمد بن عبدالکریم بن انوشیروان تبریز حنفی، ان کے صاحبزادے شیخ برہان الدین ابواسحاق ابراہیم، شیخ بدرالدین حسن بن محمود بن عزالدین عبدالعزیز بن کمال الدین عبدالرحیم الماردینی الصفار مغیثی، شیخ تقی الدین ابوالثنا

---

[1] مجموع الدرر، ص: ۹۷۔

محمود بن علی الدقوقی البغدادی، شیخ عماد الدین ابوالفدا اسماعیل بن محمد البعلبکی الحنبلی، شیخ امین الدین عبدالوہاب بن سالار الشافعی، شیخ سعد الدین ابو محمد سعداللہ بن نجیح الحرانی، شیخ قاسم بن عبدالرحمٰن بن نصر المقری، شیخ محی الدین احمد بن الحسن بن محمد الخیاط الجوخی الدمشقی، شیخ عبداللہ بن خضر بن عبدالرحمٰن الرومی الدمشقی الحریری المعروف بالمتیم (المتوفی: ۷۳۱ھ)، شیخ صفی الدین عبدالمومن بن عبدالحق البغدادی الحنبلی (مدرس مدرسہ بشیریہ بغداد) وغیرہ نے بہت زوردار مرثیے لکھے ہیں۔ جو العقود الدریہ اور مجموع الدر میں منقول ہیں۔ بعض نے ایک اور بعض نے دو اور اس سے زیادہ مرثیے لکھے ہیں۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے اور ترجمہ کے ساتھ پیش کیا جائے تو یہ خود ایک مستقل کتاب ہوسکتی ہے۔ مگر ان کو یہاں ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ آراء معاصرین کے تحت جستہ جستہ ایسے اشعار پیش کیے جائیں گے جن سے امام موصوف کے اخلاق و کردار پر روشنی پڑتی ہو۔

ذاتی اوصاف اور اخلاق و عادات

امام ابن تیمیہ کی زندگی اسوۂ رسول کا ایک روشن ترین نمونہ تھی۔ وہ اپنے ہر فعل اور عمل میں کتاب وسنت ہی کو پیش نظر رکھتے تھے۔فرائض اور سنن کے پابند تھے۔انہوں نے عام لوگوں کی طرح زندگی بسر کی۔ وضع قطع،لباس اور تراش خراش میں عام آدمیوں سے کوئی امتیاز نہیں تھا۔ان کو صرف ان کے تبحر علمی ہی کی بنا پر امتیاز کیا جاسکتا تھا۔میانہ روی ان کا شعار تھا۔ ان کے اندر زاہدوں اور صوفیوں یا دنیادار عالموں کا تصنع نہیں تھا۔ان کا قد اوسط درجے کا تھا۔ رنگ گورا اور سینہ چوڑا تھا آواز بہت بلند تھی۔ سر اور داڑھی کے بال کالے مگر سفیدی مائل تھے۔سر کے بال دونوں کانوں کی لولکیوں تک لٹکے ہوئے تھے۔ان کی دونوں آنکھیں دو تیز بولنے والی زبانیں معلوم ہو رہی تھیں۔طبیعت میں حدت اور شدت تھی۔ اس کے باوجود ان کے اندر حلم اور بردباری بھی تھی۔ [1]

وہ نہ تو ریا کار علما کی طرح اتنا شاندار لباس پہنتے تھے کہ لوگوں کی نظریں خواہ مخواہ ان کی طرف اُٹھنے لگیں اور نہ ہی صوفیوں اور زاہدوں کے موٹے جھوٹے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے تا کہ ان کو خدارسیدہ اور ولی اللہ سمجھیں۔ وہ شہرت کے لباس سے ہمیشہ بچتے تھے۔لباس میں بھی کسی خاص وضع قطع کا التزام نہیں تھا۔جو کپڑا بھی میسر ہوتا پہن لیتے تھے اور جو کھانا بھی ملتا کھالیتے تھے۔علم کی چاٹ نے ان کو دنیا کی لذتوں سے بے نیاز کردیا تھا۔ وہ کھانا بھی طلب نہیں کرتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ کھانا ان کے سامنے لاکر رکھا جاتا تھا اور وہ لکھنے پڑھنے میں اتنا مصروف رہتے تھے کہ جب تک انہیں توجہ نہ دلائی جاتی اس کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے ان کی غذا بھی بہت کم ہوگئی تھی۔ شیخ زین الدین علی الواسطی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کو بہت دنوں تک امام موصوف کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تھا۔دن چڑھے

---

[1] الدرر الكامنة: ١/ ١٥١۔

بعد ان کیلئے روٹیاں آتی تھیں۔ ان میں سے ایک آدھی روٹی کھا لیتے تھے اور باقی شیخ واسطی کیلئے چھوڑ دیتے تھے۔ رات میں بھی ان کی اتنی ہی غذا تھی۔ شیخ موصوف کہتے ہیں کہ ان کی کم خوراکی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھیں میں کچھ اور کھانے کیلئے اصرار کرتا تھا۔ مگر وہ معمول سے زیادہ غذا کبھی نہیں کھاتے تھے۔ [1]

روزانہ کا معمول

امام موصوف کا روزانہ کا معمول یہ تھا کہ وہ صبح کی نماز سے لے کر طلوع آفتاب تک ذکر و اذکار اور توبہ و استغفار میں مشغول رہتے تھے۔ اور جب اس کے متعلق پوچھا جاتا تھا تو فرماتے تھے یہ تو میرا ناشتہ ہے اگر میں یہ ناشتہ نہ کروں تو میرے قویٰ بالکل کمزور ہو جائیں گے۔ [2] پھر قرآن مجید کا مطالعہ کرتے اور اس کے بعد مختلف کتابیں دیکھتے یا اگر فتوے ہوں تو ان کا جواب لکھتے۔ پھر مقررہ اوقات میں دارالحدیث السکریہ اور دارالحدیث الحنبلیہ کے طلبہ کو درس دیتے، عصر کی نماز کے بعد ایک عام بیٹھک ہوتی تھی جس میں ہر طبقے کے لوگ شریک ہو سکتے تھے۔ کوئی خاص موضوع نہیں ہوتا تھا۔ علمی اور غیر علمی دونوں طرح کی گفتگو ہوتی تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد بھی طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے اکثر جمعہ کی صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید کی تفسیر ہوتی تھی۔ مگر اس کے ضمن میں فلسفہ و کلام تصوف اور دوسرے علوم و فنون کے مباحث آ جاتے تھے۔ اور ایک بات سے دوسری بات کا سلسلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ ان کی یہ تقریریں ہنگاموں اور فتنوں کا باعث بنتی رہی ہیں۔ تاتاری لڑائیوں کے زمانے میں انہوں نے کئی مرتبہ جہاد کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ مختلف تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں سے بھی ملنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ اور دوسرے لوگ بھی ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ بیماروں کی مزاج پرسی کرتے تھے۔ اور جنازوں میں شریک ہوتے تھے۔ امیروں اور رئیسوں سے مل کر ضرورت مندوں کی ضروریات اور حاجتمندوں کی حاجات پوری کرتے تھے۔

ذوق مطالعہ

امام موصوف کو بچپن ہی سے کتابوں کے مطالعہ کا ذوق تھا۔ وہ صرف درسی کتابوں کے

---

[1] مجموع الدرر، ص: ۱۵۷۔ [2] ایضًا: ۳۶۔

مطالعہ پر اکتفانہیں کرتے تھے۔ بلکہ ہر علم وفن کی کتابوں کو پڑھا کرتے تھے۔ چونکہ بلا کے ذہین تھے اس لیے مشکل سے مشکل کتابوں کو بھی آسانی سے حل کرلیا کرتے تھے۔ سیبویہ کی کتاب کو خود ہی حل کیا تھا۔ [1]

تبحر علمی

ان کا سب سے نمایاں وصف ان کا تبحر علمی تھا۔ ان کا مطالعہ بہت ہی وسیع تھا۔ متقدمین اور متاخرین کی کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو ان کو ملی ہو اور اس کو نہ پڑھا ہو۔ رات دن لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے کے علوم متداولہ پر پورا عبور حاصل کرلیا تھا۔ عربی ادب، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، تاریخ، فلسفہ، کلام، منطق، تصوف، حساب غرض اس زمانے کا کوئی علم وفن ایسا نہیں تھا۔ جس کا انہیں تحقیقی علم حاصل نہ ہوا ہو۔ جب وہ کسی موضوع پر بولنے لگتے تھے تو خیالات کا ایک دریا بہاتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ سننے والا یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ خاص اسی فن کے ماہر استاد ہیں۔ ہر فن اور ہر مسلک کے علما ان کی صحبت میں بیٹھتے تھے اور ان سے نئے نئے نکات اور معلومات سنتے تھے۔ وہ جس مجلس میں ہوتے سب پر چھا جاتے۔ ان کے سامنے کسی کو بولنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ بہت سے لوگوں نے انکے تبحر علمی کی تعریف کی ہے۔ شیخ بہاء الدین قاسم بن محمود بن عسا کرنے امام موصوف ہی کی زندگی میں ۷ رجب ۷۲۰ھ کو بدھ کے دن ان کے متعلق یہ دو شعر لکھے تھے۔

تقی الدین اضحی بحر علم
یجیب السائلین بلا قنوط

شیخ تقی الدین ابن تیمیہ علم کے سمندر ہو گئے ہیں۔ سوال کرنے والوں کا جواب بغیر کسی رکاوٹ کے دیتے ہیں۔

احاط بکل علم فیه نفع
فقل ماشئت فی البحر المحیط

انہوں نے ہر ایک مفید علم کا احاطہ کرلیا۔ پس تم بحر محیط کی تعریف میں جو بھی چاہو

---

[1] ایضًا، ص: ۱۴۰۔

کہہ سکتے ہو۔

خطابت

امام موصوف ایک زبردست عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین خطیب بھی تھے۔ مختلف مسائل کو ایسے دلچسپ انداز میں پیش کرتے تھے کہ سننے والے ان کی لمبی لمبی تقریروں سے کبھی اکتاتے نہیں تھے۔ بہت ہی فصیح وبلیغ تقریر کرنے کے عادی تھے۔ دوسروں کے درس پر شریک ہوتے اور اگر کوئی استاد کسی بحث کو واضح نہیں کرسکتا تھا تو خود اس کی وضاحت کر دیتے تھے۔ چنانچہ جب ۷۲۵ھ میں شیخ کمال الدین ابن الزملکانی کا تبادلہ حلب ہوگیا اور ان کی جگہ پر مدرسہ رواحیہ دمشق میں شیخ شمس الدین ابن الاصبہانی کا تقرر ہوا تو امام موصوف بھی دستور کے مطابق ان کے پہلے درس میں شریک ہوئے جو ۱۲ شوال ۷۲۵ھ کو بدھ کے دن ہوا تھا۔ شہر کے تمام قضاۃ وعلما وفقہا اور عمائدین بھی شریک تھے۔ اس پہلے ہی درس میں عام خاص اور استثناء بعد النفی کی بحث شروع ہوئی۔ طلبہ اور حاضرین نے سوالات کی بوچھاڑ کرنی شروع کی تو ابن الاصبہانی ان کا ٹھیک طور پر جواب نہ دے سکے، امام موصوف نے مداخلت کی اور اس موضوع پر اتنی فصیح وبلیغ تقریر کی کہ حاضرین ششدر اور مبہوت ہوگئے۔ ہر ایک ان کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور اس طرح مجلس کا انتشار ختم ہوگیا۔ [1]

حق گوئی وبیباکی

یہ ان کا ایک ممتاز ترین وصف تھا حق بات کے معاملے میں وہ کسی بادشاہ یا وزیر، امیر یا رئیس کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ تاتاری لڑائیوں میں انہوں نے قازان سے جس دلیری اور بے باکی سے گفتگو کی وہ ان کی جرأت و بے باکی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ انہوں نے درحقیقت ((افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر)) [2] ''بہترین جہاد ظالم سلطان کے سامنے حق بات کہنا ہے۔'' کی حدیث پر پورا عمل کر دکھایا۔

قطلو بک منصوری ملک شام کا ایک ترکی رئیس تھا۔ حکومت میں بھی اس کو بہت بڑا رسوخ

---

[1] البداية و النهاية: ١٤/ ١١٨۔ [2] سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر، ح: ٤٠١٢۔

حاصل تھا۔ تاجروں سے چیزیں خریدتا تھا اور ان کی قیمت فوراً ادا نہیں کرتا تھا۔ پیسہ وصول کرنے کیلئے تاجروں کو بار بار اس کے گھر کا چکر لگانا پڑتا تھا۔ اور کبھی کسی سے ناراض ہوا تو اس کو درے بھی لگوا دیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ایک تاجر کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا۔ اس کو کئی مرتبہ کھمانے پھرانے کے باوجود پیسہ نہیں دیا۔ اس نے امام موصوف سے واقعہ بیان کیا۔ وہ اس کو لے کر سیدھے قطلو بک کے پاس گئے۔ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ تاجر کی دادرسی کیلئے آئے ہیں۔ ملاقات ہوتے ہی طنز کے طور پر کہا جب تم کسی امیر کو کسی فقیر کے دروازے پر دیکھو تو سمجھو کہ امیر اور فقیر دونوں اچھے ہیں اور جب تم کسی فقیر کو کسی امیر کے دروازے پر دیکھو تو سمجھو کہ فقیر اور امیر دونوں برے ہیں۔ امام موصوف نے فوراً ہی جواب دیا۔ فرعون تجھ سے برا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام مجھ سے اچھے تھے۔ اس کے باوجود حضرت موسیٰ ہر روز فرعون کی ڈیوڑھی پر جاتے تھے اور اس کو ایمان کی دعوت دیتے تھے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ فرعون حضرت موسیٰ کے دروازے پر گیا ہو۔ میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ اس تاجر کا حق ادا کر دے۔ امام موصوف کا یہ برمحل جواب سن کر قطلو بک شرمندہ ہو گیا۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑ سکا۔ اس نے فوراً ہی تاجر کا روپیہ ادا کر دیا۔ [1]

امام موصوف بڑے سے بڑے شخص کے سامنے بھی اس زور اور قوت کے ساتھ گفتگو کرتے تھے کہ مخاطب ان سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ اس حق گوئی و بے باکی کی وجہ سے ان کو مختلف مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے علما مصلحت کا خیال کر کے بعض وقت چپ ہو جاتے تھے۔ مگر امام موصوف کسی کی پروا کیے بغیر مسئلہ کی حقیقت کو پیش کر دیتے تھے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ امام موصوف جب اسکندریہ سے رہا ہو کر آئے اور سلطان ناصر اور اس کے وزیر نے اہل کتاب سے ایک بھاری رقم لے کر ان کے ساتھ رعایت کرنی چاہی اور سلطان نے علما سے فتوی پوچھا تو اس کے تیور دیکھ کر علما خاموش ہو گئے۔ مگر امام موصوف نے اس پہلی ہی مجلس میں سلطان کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ اور اس کا ہرگز کوئی خیال نہیں کیا کہ اسی کی مہربانی سے قید سے رہا ہو کر آئے ہیں۔

---

[1] الدرر الکامنۃ: ۳/ ۲۵۳۔

شجاعت اور بہادری

امام موصوف صاحب علم وقلم ہونے کے ساتھ صاحب سیف بھی تھے۔ تاتاری لڑائیوں میں ان کی شجاعت اور بہادری کے جوہر نمایاں ہوئے۔ جسمانی قوت اور طاقت کے لحاظ سے وہ ایک معمولی آدمی تھے۔ مگر جرأت، دلیری، حق گوئی و بیباکی اور جذبہ وجوش ایمانی کی وجہ سے ایک دلیر سپاہی معلوم ہورہے تھے۔ انہیں موت کا بالکل ڈر نہیں تھا۔ تاتاری حملوں کے زمانہ میں بہت سے علما وفقہا مصر فرار ہو گئے تھے۔ امام موصوف ہر ایک کو یہی تلقین کررہے تھے کہ تم کہیں بھی بھاگو اگر تمہاری تقدیر میں موت لکھی ہوئی ہے تو اس سے تم چھٹکارا پا نہیں سکتے۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ دمشق سے فرار ہونے والوں میں بہت سے مر گئے۔ اور جو دمشق میں ٹھہرے رہے ان میں سے اکثر موت کے منہ میں جانے سے بچ گئے۔

شیخ سراج الدین ابوحفص لکھتے ہیں کہ امام موصوف سب سے زیادہ بہادر اور مضبوط آدمی تھے۔ خوف اور خطرے کے موقع پر میں نے ان سے بڑھ کر کسی اور کو مستقل مزاج اور ثابت قدم نہیں پایا، جنگ میں آگے بڑھ بڑھ کر دشمنوں پر حملہ کرتے تھے۔ خدا کی راہ میں وہ اپنی زبان وقلم اور ہاتھ سے جہاد کرتے تھے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے تھے۔ مختلف عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ وہ جب میدان جنگ میں لشکر کے کسی پہلو کو کمزور پڑتے دیکھتے تو فوراً اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے وہاں پہنچتے تھے اور فتح ونصرت اور مال غنیمت کی بشارت دے کر سپاہیوں کے دل بڑھاتے تھے اور لڑائی میں ان کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے تھے۔

امام موصوف کا آبائی پیشہ سپہ گری نہیں تھا۔ انہوں نے کسی سے تلوار چلانے کا فن نہیں سیکھا مگر ان کے ایمانی جوش نے انہیں تلوار چلانا سکھا دیا۔ وہ میدان جنگ میں ایک کارآزمودہ سپاہی سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ اس وصف خاص میں علما کے اندر ان کا کوئی نظیر نہیں دکھائی دیتا کہ کسی مشہور عالم نے ان کی طرح میدان جنگ میں تلوار چلائی ہو۔ تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ عکہ کی جنگ میں بھی رزم آرائی اور بہادری کے حیرت انگیز جوہر دکھائے تھے جس کی تعریف سے زبانیں قاصر اور عاجز ہیں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ انہی کی صائب رائے سے عکہ کی

جنگ لڑی گئی اور اسلامی لشکر کو فتح نصیب ہوئی۔ [1]

حدت اور شدت

امام موصوف کی طبیعت میں تیزی اور حدت وشدت زیادہ تھی۔ جب کوئی کام خلاف شریعت ہوتا ہوا نظر آتا تھا تو بگڑ جاتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر ان کا یہ وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

حلیم کریم مشفق بید انه
اذا لم یطع فی اللّٰه للّٰه یغضب

وہ بردبار تھے، کریم تھے، مہربان تھے، صرف یہی ایک بات تھی کہ جب اللہ کی فرمانبرداری نہ ہوتی تو اللہ کے واسطے بگڑ بیٹھتے تھے۔

اس حدت اور شدت کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے حریفوں کو جاہل، ان پڑھ، اور احمق کہہ بیٹھتے تھے۔ اس کی وجہ سے مخالفوں کے دلوں کو بڑی ٹھیس لگتی تھی اور پھر وہ ان کی ایذا رسانی کے درپے ہو جاتے تھے۔ جب وہ پہلی مرتبہ مصر گئے۔ اور ابوحیان اندلسی نے ان کی باتیں سنیں تو ان کی تعریف میں ایک بہترین قصیدہ لکھ دیا لیکن دوسری مجلس میں ان کی سخت کلامی کی وجہ سے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کے سخت مخالف ہو گئے اگر وہ ذرا نرمی سے کام لیتے تو شائد ان کے خلاف اتنی ہنگامہ آرائیاں نہ ہوتیں۔ ان کی حدت اور شدت شاید اس وجہ سے بھی تھی کہ انہوں نے عمر بھر تجرد کی زندگی گزاری۔

عاجزی اور انکساری

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام موصوف میں حدت اور شدت زیاد تھی مگر اس کا اظہار اسی وقت ہوتا تھا جبکہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ ورنہ وہ شخصی طور پر بہت ہی منکسر المزاج تھے۔ اگر ان کی صحیح تعریف بھی کی جاتی تو فرماتے تھے کہ میں ایک معمولی آدمی ہوں۔ میں ملت اسلامیہ کا ایک ادنیٰ فرد ہوں میں اہل دولت سے نہیں ہوں۔ [2] قسم بخدا میں تو ہر وقت اپنے اسلام کی تجدید کرتا رہتا ہوں۔ میں تو ابھی تک پکا

---

[1] مجموع الدرر: ١٦١۔ [2] ایضًا، ص: ١٤٦۔

مسلمان بھی نہیں ہوا ہوں۔ [1] آخر عمر میں ان کے اندر فروتنی اور عاجزی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ انہوں نے قاعدۂ تفسیر کے عنوان سے ایک چھوٹا سا خط لکھا تھا۔ جس کی پشت پر ذیل کے اشعار تھے۔ قید کی حالت میں اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے جس کے ہر شعر سے عاجزی اور مسکینیت ٹپکتی ہے۔

انا الفقیر الی رب البریات
انا المسکین فی مجموع حالاتی

میں تمام مخلوقات کے پروردگار کا محتاج ہوں۔ میں اپنی تمام حالتوں میں عاجز اور درماندہ ہوں۔

انا الظلوم لنفسی وھی ظالمتی
والخیر ان یاءتنا من عندہ یاتی

میں اپنے نفس پر ظلم کرتا ہوں اور میرا نفس مجھ پر ظلم کرتا ہے۔ اور اگر ہم کو کوئی بھلائی آتی ہے تو اس کے پاس سے آتی ہے۔

لا استطیع لنفسی جلب منفعة
ولا عن النفس فی دفع المضرات

میں اپنے نفس کے لیے کوئی منفعت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اس نفس سے مضرتوں کو دفع کر سکتا ہوں۔

ولیس لی دونه مولی ید برنی
ولا شفیع اذا حاطت خطیئاتی

اور میرے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا آقا نہیں ہے جو میرا انتظام کر سکے اور نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہے جبکہ میرے گناہ مجھ کو گھیر لیں۔

الا باذن من الرحمٰن خالقنا
ربی الشفیع کما قد جاء فی الآیات

---

[1] مدارج السالکین: ۱/ ۲۹۶۔

مگر ہمارے پیدا کرنے والے مہربان خدا کی اجازت سے۔ میرا پروردگار ہی میری شفاعت کرنے والا ہے جیسا کہ آیتوں میں آیا ہے۔

ولست املك شيئا دونه ابدا
ولا شريك له في بعض حاجاتي

میں خدا کو چھوڑ کر ہرگز کسی چیز کا مالک نہیں ہوسکتا اور نہ میری حاجتوں کے پوری کرنے میں خدا کا کوئی شریک ہوسکتا ہے۔

ولا ظهير له كيما اعاونه
كما يكون لارباب الولايات

خدا کا کوئی دوسرا مددگار نہیں ہے جس کو میں مدد دے سکوں۔ جس طرح ارباب ولایات کا کوئی مددگار ہوتا ہے۔

والفقر لي وصف ذات لازم ابدا
كما الغنى ابدا وصف له ذاتي

اور فقر میرے لیے ہمیشہ کا لازمی اور ذاتی وصف ہے جیسا کہ غنا خدا کا ہمیشہ کا ذاتی وصف ہے۔

وهذه الحال الخلق اجمعهم
وكلهم عنده عبد له آتي

اور یہی تمام مخلوق کا حال ہے اور تمام لوگ اس کے بندے ہیں اور اسی کی فرمانبرداری کریں گے۔

فمن بغى مطلبا من دون خالقه
وهو الجهول الظلوم المشرك العاتي

پس جو شخص اپنے خالق کو چھوڑ کر کسی دوسرے سے مطلب برآری چاہتا ہے وہ جاہل ظالم مشرک اور نافرمان ہے۔

والحمد لله مل الكون اجمعه
ما كان منه وما من بعده ياتی

کائنات کے اندر بھری ہوئی تمام تعریفیں، جواب تک ہو چکی ہیں اور جو آیندہ ہونگی تمام کی تمام اللہ ہی کے لیے ہیں۔

ثم الصلوٰة على المختار من مضر
خير البرية من ماضی ومن آتی

پھر درود ہو قبیلہ مضر کے اس شخص (آنحضرت ﷺ) پر جو تمام گزری ہوئی اور آنے والی مخلوق میں سب سے زیادہ بہتر ہے۔

حافظ ابن قیم کہتے ہیں کہ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ قدس اللہ روحہ سے بڑھ کر کسی اور شخص میں مسکینیت اور فقر و فاقے کے مظاہر نہیں دیکھے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ مالی شی ولا منی شی ولا فی شی ۔کوئی چیز میری نہیں ہے۔ مجھ سے کسی چیز کا ظہور نہیں اور نہ مجھ میں کوئی قدرت اور طاقت ہے۔ وہ اپنے متعلق یہ کہا کرتے تھے۔ [1]

انا المكدی وانا المكدی
وهكذا كان ابی وجدی

میں گڑگڑانے والا سائل اور بھکاری ہوں، میں گڑگڑانے والا سائل اور بھکاری میرا باپ اور دادا بھی اسی طرح گڑگڑانے والے سائل اور بھکاری تھے۔

زہد واتقا

امام موصوف کی اُٹھان ہی زہد واتقا پر ہوئی تھی اور انہوں نے اسی کو اپنا شعار بنالیا تھا اور علم اور زہد ان کو وراثت میں ملا تھا چنانچہ شیخ دقوقی کہتے ہیں:

نشات على فعل التقى اطواره
فعنت له التقوى واعطت عن يد

ان کے عادات واطوار کی اُٹھان ہی تقوے پر ہوئی ہے۔ تقوی ان کے لیے

---

[1] مدارج السالکین: ۱/ ۲۹۶۔

جھک گیا اور

ورث الزھادۃ کابرا عن کابر
والعلم ارثا سیدا عن سید

پشتہا پشت کے بزرگوں سے زہد بطور وارثت کے پایا اور اسی طرح علم بھی
پشتہا پشت کے سرداروں سے پایا۔

امام موصوف نے پڑھنے پڑھانے کے سوا کوئی دوسرا پیشہ نہیں اختیار کیا اور دنیاوی دولت وحشمت کی کبھی خواہش نہیں کی۔ اس زمانے کے علما وفقہا سرکاری عہدوں کے ذریعہ خوب روپیہ کمانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ قاضی القضاۃ شیخ تقی الدین ابن بنت الاعز شافعی بیک وقت سترہ سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ وہ مصر کے قاضی القضاۃ تھے، جامع ازہر کے خطیب تھے، خزانے کے ناظر تھے، قید خانوں کی ناظری بھی انہیں کو ملی تھی۔ اوقاف اور املاک کے بھی وہی ناظر تھے مختلف مدراس میں مدرس کی حیثیت سے درس دیتے تھے۔ اس طرح انہوں نے خوب روپیہ کمایا اور بڑی شان کے ساتھ اپنی زندگی گزاری، آخران پر سلطانی عتاب نازل ہوا اور ان کو قید کیا گیا۔ اگر امام موصوف چاہتے تو اسی طرح مختلف سرکاری عہدوں پر فائز ہو سکتے تھے۔ مدرسی کے سوا انہوں نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ جب قضاوت کا عہدہ پیش کیا گیا تو اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ حرام مال کی کمائی سے ہمیشہ بچتے تھے اور دوسروں کو بھی اس سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے سلطان ناصر سے کہہ کر ملازمتوں کیلئے رشوت دینے سے منع کیا۔ اور اس کیلئے سزا تجویز کی۔ جب تاتاری لڑائیوں کے زمانہ میں قازان کے دربار میں علما کیلئے دستر خواں بچھایا گیا تو سب نے کھانا کھالیا۔ مگر انہوں نے کھانے سے بالکل انکار کر دیا۔ اور صاف کہہ دیا کہ وہ اس کو نہیں کھا سکتے کیونکہ یہ لوٹ کے مال سے تیار کیا گیا ہے۔

ایثار وسخاوت

امام موصوف کوئی مالدار آدمی نہیں تھے۔ انہیں دارالحدیث السکریہ اور دارالحدیث الحنبلیہ میں پڑھانے کی معمولی تنخواہ ملتی تھی۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ ان کا کھانا پینا

زیادہ تر ان کے بھائی شیخ شرف الدین عبداللہ ابن تیمیہ کے ہاں تھا۔ اور جب مصر میں تھے تو وہ اپنے چچازاد بھائی کے گھر رہا کرتے تھے۔ تاہم وہ اپنی استطاعت کے مطابق ہر ایک کی امداد و اعانت کرنے کیلئے تیار رہتے تھے۔ درہم و دینار اور کپڑا جو کچھ بھی ان کے پاس موجود ہوتا وہ حاجتمندوں کو دے دیتے تھے جب کبھی کسی کے پاس سے تحفے تحائف آتے تھے۔ تو اس میں سب کو شریک کر لیا کرتے تھے۔ شیخ شہاب الدین احمد بن فضل اللہ العمری کہتے ہیں کہ ہر سال عطیوں کی صورت میں بہت سے دینار اور درہم ان کے پاس آتے تھے جن کو وہ غریبوں کے درمیان تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اور اپنے نفس کیلئے اس میں سے کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک شخص آیا اور اس نے سلام کیا۔ صورت دیکھتے ہی پہچان لیا کہ اس کو عمامہ کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اپنا عمامہ نکالا اور اس کا آدھا حصہ چاک کر کے اس کے حوالے کر دیا۔

ایک دن ایک راہ چلتے آدمی نے ان کو دعا دی۔ اور انہوں نے اپنے لباس کا ایک حصہ اس کے حوالے کر دیا اور کہا جاؤ اس کو اپنے کام میں لے آؤ۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک کتاب مانگی۔ امام موصوف نے کہا: لو تمہارے سامنے ساری کتابیں رکھی ہوئی ہیں، جو چاہو پسند کر کے اُٹھا لو۔ اس نے اپنے لیے وہی قرآن مجید پسند کیا جس کو انہوں نے کئی درہم دے کر خریدا تھا۔ جب وہ لے کر چلا گیا تو ان کے ساتھیوں نے ملامت کی۔ انہوں نے کہا: کیا میرے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ مانگے اور میں اس کو نہ دوں۔ اس سے اس کو کچھ نہ کچھ فائدہ ہو ہی جائے گا۔ پھر کہا کہ اگر کسی سے علم مانگا جائے تو اس کے دینے سے کسی کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ [1]

عبادت

امام موصوف فرائض و سنن اور نوافل کے پورے پابند تھے۔ ان کی نظروں کے سامنے ہمیشہ آنحضرت ﷺ کی عبادات ہوتی تھیں۔ وہ پرخلوص عبادت ہی کو دل و دماغ کے تزکیے

---

[1] مجموع الدرر: ۱۵۸۔

اور تصفیے کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے اور یہ محسوس کرتے تھے کہ عبادت سے دل کے اندر جلا پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک مومن اللہ کے نور سے کائنات کی بہت سی چھپی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس سلسلے میں امام ابن تیمیہ کی مختلف کتابوں کے علاوہ حافظ ابن قیم کی مشہور و معروف کتاب مدارج السالکین دیکھنی چاہیے۔ جس میں انہوں نے تزکیہ نفس کے متعلق امام موصوف کے خیالات کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایک صوفی صافی کی زندگی کس نہج اور طریقہ کی ہونی چاہیے۔

عفو و درگزر

امام موصوف کی زندگی ہمیشہ ہنگاموں سے بھری رہی۔ ہمیشہ مخالفت کے طوفان اُٹھتے تھے اور پھر ختم ہوجاتے تھے۔ قضاۃ علما و فقہا ان کے مخالف رہے اور ان کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے خلاف آوازے کسے۔ بارہا گالیاں دیں، ان کو مارا پیٹا، ان کے قتل کی سازش کی، ان کو قید میں ڈلوایا، مگر انہوں نے کبھی کسی سے انتقام لینے کی کوئی کوشش نہیں کی، سب کو صدق دل سے معاف کردیا۔ اس کی بہت سی مثالیں جستہ جستہ اپنی جگہ پیش کی جاچکی ہیں جن کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

کشف و کرامت اور فراست

امام موصوف کا خیال تھا کہ پرخلوص عبادت کرنے سے مومن کے دل میں جلا پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ آیندہ ہونے والے واقعات کو دیکھ سکتا ہے۔ ان کے شاگردوں کا بیان ہے کہ امام موصوف کے اندر کشف و کرامت اور فراست کی صفت بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ حافظ ابن قیم اپنی کتاب مدارج السالکین (جلد دوم صفحہ ۲۵۰) میں لکھتے ہیں کہ میں نے شیخ الاسلام کی فراست کے عجیب و غریب واقعات کا مشاہدہ کیا ہے جو واقعات میرے مشاہدے میں نہیں آئے۔ بلکہ میں نے ثقہ لوگوں کی زبانی سنے ہیں اس سے بہت زیادہ ہیں جو میرے مشاہدے میں آئے ہیں۔ ان کی فراست کے واقعات کے بیان کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔

ان کی زندگی کے مستند واقعات اس پر شہادت دیتے ہیں کہ ان کے اندر کشف و

فراست کی کیفیت کامل طور پر پائی جاتی تھی۔قازان نے دومرتبہ ملک شام پر حملہ کیا۔امام موصوف نے پہلی مرتبہ مسلمانوں کی شکست کی پیشینگوئی کی تھی جو صحیح ثابت ہوئی دوسری مرتبہ انہوں نے جیت کی خبر دی تھی جو سچ ثابت ہوئی۔

جب ۷۰۵ھ میں امام موصوف عقائد کے متعلق جوابدہی کیلئے مصر طلب کیے گئے تو عقیدت مندوں نے ان کے متعلق قتل کیے جانے کا خوف ظاہر کیا۔انہوں نے کہا: خدا کی قسم! دشمن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔لوگوں نے دریافت کیا پھر کیا ہوگا؟ تو انہوں نے کہا میں قید کیا جاؤں گا اور میری یہ قید لمبی ہوگی میں اس کے بعد برسرعام کتاب وسنت کی حمایت کروں گا۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح بیبرس جاشنگیر کے زمانہ میں انہوں نے ملک ناصر کے کامیاب ہونے کی پیشینگوئی کی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

شیخ ابوحفص عمر کہتے ہیں کہ ایک دن میرے اور میرے ایک دوست کے درمیان ایک مسئلے کے متعلق تکرار ہوگئی۔ہم دونوں امام موصوف کے پاس پہنچے تاکہ اس مسئلہ کے متعلق ان کی رائے دریافت کریں۔ہمارے کہنے سے پیشتر ہی انہوں نے اس مسئلہ پر گفتگو شروع کر دی اور اس طرح بحث کی کہ ہم دونوں کی تشفی ہوگئی۔ان کی اس فراست پر ہمیں بڑا تعجب ہوا۔

شیخ صالح احمد مقری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں دمشق گیا تھا۔وہاں کے لوگوں سے میری جان پہچان نہیں تھی۔جب میرا سرمایہ ختم ہوگیا تو مجھے بڑی پریشانی ہوئی۔دمشق کی ایک گلی میں پریشان گھومتا ہوا جا رہا تھا کہ ایک صاحب میرے پاس آئے اور انہوں نے چند درہم میرے حوالے کیے اور کہا کہ ان کو اپنے کام میں لاؤ۔یقین رکھو کہ خدا تمہیں بے یارومددگار نہیں چھوڑے گا۔یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔میں نے لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہی شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ ہیں۔اور بہت دنوں کے بعد اس طرف دکھائی پڑے ہیں۔میں نے ان سے دوبارہ ملاقات کی اور ان کا شکریہ ادا کیا۔جب تک میں دمشق میں رہا وہ میری مدد کرتے رہے اور مجھے کسی چیز کی تکلیف نہیں ہوئی۔شیخ عمادالدین مقری مطرز کے ساتھ بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا۔

ایک مرتبہ دمشق میں ایک نوجوان بیمار پڑا۔ امام موصوف اس کے پاس گئے اور اس کی کیلئے دعا کی۔ جب تندرست ہو گیا تو کہا: تم عہد کرو کہ فوراً اپنے وطن واپس لوٹ جاؤ گے۔ کیا تمہیں یہ جائز ہے کہ اپنے بیوی بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر یہاں چلے آؤ۔ ان کے اس کشف پر نوجوان کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے فوراً وعدہ کیا کہ وہ اپنے وطن لوٹ جائے گا۔

ایک صاحب قضا کا عہدہ حاصل کرنے کی غرض سے مصر روانہ ہوئے۔ ان کی نیت بری تھی۔ وہ ایک قاضی کو قتل کروا کے اپنا راستہ صاف کروانا چاہتے تھے جب لوگوں نے امام موصوف سے یہ بیان کیا تو کہا کہ وہ ہرگز اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ وہ مصر بھی نہیں پہنچ سکے چنانچہ راستے ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مجموع الدرر اور العقود الدریہ وغیرہ میں اس قسم کے کئی واقعات نقل کیے گئے ہیں ممکن ہے کہ اس قسم کے واقعات کے بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو مگر اتنا تو ثابت ہے کہ وہ فراست میں یگانہ روزگار تھے۔ حافظ ابن قیم کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام نے مجھ سے فرمایا "میرے ساتھی اور دوست میرے پاس آتے ہیں اور میں ان کی آنکھوں اور ان کے چہروں میں بہت سی ایسی باتیں دیکھتا ہوں جن کو میں بیان نہیں کر سکتا۔" حافظ ابن قیم نے کہا: اگر آپ بیان کر دیں تو ان کے حق میں اچھا ہی ہو گا۔ انہوں نے جواب دیا کیا تم چاہتے ہو کہ سرکاری جاسوسوں کی طرح لوگوں کی خفیہ باتوں کے پیچھے لگا رہوں اور ان کو آشکارا کروں، اگر میں ایسا کروں گا تو میرے ساتھی ایک ہفتہ بھی میرے ساتھ رہنا گوارا نہیں کر سکتے۔ حافظ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ الاسلام نے مجھے چند خفیہ باتیں بتائی تھیں اور مستقبل میں ہونے والے چند واقعات کی خبر دی تھی۔ مگر ان کے ہونے کی تاریخ مقرر نہیں کی تھی۔ ان میں سے چند کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ باقی واقعات کے ہونے کا میں منتظر ہوں۔ [1]

---

[1] مدارج السالکین: ۲/ ۲۵۰۔۲۵۱، نیز دیکھو مجموع الدرر، ص: ۱۵۵۔۱۶۰۔

آراء معاصرین

معاصرانہ چشمک بہت ہی بری بلا ہوتی ہے۔ یہ اپنے قابل حریف کے فضائل و کمالات کا اعتراف کرنے نہیں دیتی۔ الا یہ کہ حریف اتنا قابل اور نامور ہو کہ اس کے علمی کمالات پر پردہ ڈالنا ناممکن ہو لیکن اس چشمک کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا کہ اس شخص کے نقائص بھی صاف ظاہر ہو جاتے ہیں امام ابن تیمیہ کے فضائل و کمالات سے نہ تو ان کے دوستوں کو اور نہ ان کے دشمنوں کو انکار ہے۔ ہر ایک ان کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔ البتہ ان کا ایک بڑا نقص ان کی حدت طبع تھی جس کو ان کے حریف کبر و غرور سے تعبیر کر رہے تھے۔

امام موصوف ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے خاندان میں تین پشتوں سے تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری تھا مگر ان سب میں علم و عمل کے لحاظ سے جو جامعیت امام موصوف میں پائی جاتی تھی۔ وہ کسی میں نہیں تھی۔ ان کے ہم عصر علما ان کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس آفتاب علم و عمل کے سامنے دوسرے ستاروں کی روشنی ماند ہو گئی تھی۔

فانك شمس والملوك كواكب
اذا طلعت لم يبد منهن كوكب

تم بے شک سورج ہو اور دوسرے بادشاہ ستارے ہیں جب تم طلوع ہو جاؤ تو کوئی ستارہ ظاہر نہیں ہو سکتا۔

انہوں نے عنفوان شباب ہی میں اپنے زمانے کے بوڑھوں سے خراج تحسین وصول کر لیا تھا۔ جب اپنے والد عبدالحلیم بن تیمیہ کی وفات کے بعد درس دیا تو اس وقت ان کی عمر صرف اکیس سال کی تھی۔ اس پہلے درس میں شہر کے قاضی فقیہ اور عمائدین و اراکین دولت شریک تھے۔ انہوں نے اپنے اس پہلے درس میں معلومات کا ایک دریا بہا دیا تو ہر ایک کی زبان سے

واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

ابن دقیق العید کی تعریف

جب تاتاری لڑائیوں کے سلسلے میں پہلی مرتبہ ۷۰۰ھ میں مصر گئے ہیں اور بہت ہی جوش اور ولولے کے ساتھ ملک ناصر سے گفتگو کی ہے تو ان کو دیکھ کر قاضی القضاۃ تقی الدین بن دقیق العید شافعی نے کہا: میں نہیں سمجھتا تھا کہ خدا تجھ جیسا شخص بھی پیدا کرے گا۔ جب لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اس شخص سے کیوں گفتگو نہیں کی تو جواب دیا: یہ شخص بات کرنا پسند کرتا ہے اور میں خاموش رہنا پسند کرتا ہوں۔

مخالفین کا اعتراف

تاتاری لڑائیوں میں مسلمانوں کی بھلائی کا کام کرنے کی وجہ سے امام موصوف لوگوں کے نزدیک بے حد مقبول اور محبوب ہو چکے تھے۔ بعض لوگ ان کے ساتھ حسد سے پیش آرہے تھے۔ لیکن ہر ایک کو ان کے علمی کمالات کا پورا اعتراف تھا مگر جب ۷۰۵ھ میں فقراء رفاعیہ کے ساتھ مناظرہ پیش آیا اور عقائد کے جھگڑے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے امام غزالی، امام رازی، ابن عربی اور دوسرے فلسفیوں، متکلموں اور صوفیوں پر سخت تنقیدیں شروع کر دیں تو ان کے ہم عصر علما ان کے سخت مخالف ہو گئے اور اسی مخالفت کی وجہ سے ان کو قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ مخالفین میں شیخ صدر الدین ابن الوکیل، شیخ صفی الدین ہندی، قاضی کمال الدین بن الزملکانی، قاضی زین الدین بن مخلوف مالکی، شیخ علاء الدین قونوی، قاضی تقی الدین بن سبکی بہت مشہور ہیں لیکن تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی شدید مخالفت کے باوجود ان میں سے ہر ایک کو شیخ کے علمی کمالات کا پورا اعتراف رہا۔

شیخ صدر الدین کا اعتراف

شیخ صدر الدین ابن الوکیل شیخ تقی الدین کے بڑے زبردست حریف تھے۔ ہر مجلس میں ان کے ساتھ مناظرہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ شافعیوں کی طرف

سے ترجمانی کریں۔ انہوں نے ۷۱۶ھ میں انتقال کیا تھا۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ان کو امام موصوف کے علمی کمالات کا پورا اعتراف تھا اور وہ بھی ان کے علم و فضل کی تعریف کیا کرتے تھے اور ان کو مسلمان مانتے تھے اور جب ان کے افعال و اعمال قبیحہ کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی وہ کہتے تھے کہ ان پر شہوات نفسانی کا غلبہ ہو گیا ہے۔ [1]

شیخ صفی الدین ہندی کا اعتراف

شیخ صفی الدین ہندی نے امام موصوف سے مناظرہ کیا تھا۔ امام موصوف کے دماغ میں خیالات کی اتنی فراوانی ہوتی تھی کہ بیک وقت وہ مختلف مباحث پر بولتے چلے جاتے تھے اور ایک سلسلہ سے دوسرے سلسلہ کی طرف بھٹک جاتے تھے۔ اور بات میں بات پیدا ہوتی چلی جاتی تھی۔ اس لیے شیخ صفی الدین نے کہا۔ تم تو ایک چڑیا کی طرح ہو ادھر سے ادھر پھدکتے پھرتے رہتے ہو۔ [2]

اس مناظرے کے بعد کسی نے شیخ موصوف سے ان کے متعلق رائے پوچھی تو کہا ''اس شخص پر تمہارا کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ ترک تأویل کا حامی ہے اور تم تأویل کے قائل ہو۔ امام ابوالحسن اشعری سے دونوں قول منقول ہیں لیکن میں ترک تاویل ہی کو پسند کرتا ہوں۔ [3]

شیخ موصوف کا انتقال امام موصوف سے تیرہ برس پہلے ۷۱۵ھ میں ہو گیا تھا اگر وہ اور زندہ رہتے تو دوسرے مخالفین کی طرح وہ بھی ان کی تعریف کرتے۔ تاہم ان کی بحث اور گفتگو کا انداز بتاتا ہے کہ وہ امام موصوف کے علم و فضل اور جامعیت کے بے حد معترف تھے۔

قاضی کمال الدین کا اعتراف

قاضی کمال الدین ابن الزملکانی ابتدا میں امام موصوف کے دوست تھے اور ان کے علمی کمالات کا پورا اعتراف کرتے تھے۔

امام موصوف کی عمر ابھی تیس برس کی تھی کہ قاضی ابن الزملکانی ابتدا میں امام موصوف کی

---

[1] البداية والنهاية: ١٤/ ٨٠۔ [2] الدرر الكامنة: ٤/ ١٥؛ البدرا الطالع: ٢/ ١٨٧، ١٨٨۔ [3] المناظرة فی صفات الباری لابن تيمية قلمی۔

ایک کتاب رفع الملام عن ائمة الاعلام پر تقریظ لکھتے ہوئے یہ اشعار لکھے۔

ماذا يقول الواصفون له
وصفاته جلت عن الحصر

ان کی تعریف کرنے والے ان کی کیا تعریف کر سکتے ہیں جبکہ ان کی صفتیں حصرو شمار سے بھی باہر ہیں۔

هو حجة للّٰه قاهرة
هو بيننا اعجوبة الدهر

وہ اللہ کی ایک غالب حجت ہیں اور وہ ہمارے درمیان اعجوبہ روزگار ہیں۔

هو آية للخلق ظاهرة
انوارها اربت على الفجر

وہ مخلوق کے لیے کھلی نشانی ہیں۔اس کے انوار صبح کے انوار سے بھی بڑھ کر ہیں۔

امام موصوف کے دو رسالوں اقامة الدليل على بطلان التحليل اور رفع الملام عن الائمة الاعلام پر تقریظیں لکھیں ان میں ان کے لیے الشيخ الامام العالم العلامة الاوحد الحافظ المجتهد الزاهد العابد القدوة الكامل، العارف البارع، امام الائمة، قدوة الامة، علامة العلما، وارث الانبياء، آخر المجتهدين، اوحد علما الدين ، بركته الانام، حجة الاسلام، برهان المتكلمين، قامع المبتدعين، راد اهل الزيغ و العناد ، محى السنة، من عظمت به للّٰه علينا المنه وقامت به على اعدائه الحجة و استبانت ببركته وهديه المحجة کے الفاظ اور فقروں سے ان کی تعریف کی۔اس سے بڑھ کر کسی عالم کی کیا غیر معمولی تعریف ہوسکتی ہے؟

حافظ ابن رجب نے اپنے طبقات میں لکھا ہے کہ جب شیخ کمال الدین بن الزملکانی سے امام موصوف کے متعلق پوچھا گیا تو کہا چار پانچ سو سال سے ابن تیمیہ سے بڑھ کر کوئی

حافظ نہیں پیدا ہوا ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ ان کے اندر اجتہاد کی تمام شرطیں جمع ہیں اور ایک مرتبہ انہوں نے یہ فرمایا کہ امام موصوف سے کسی فن کی کوئی بات دریافت کی جاتی تھی اور وہ جواب دینے لگتے تھے تو سننے والا یہی سمجھتا تھا کہ اس فن پر ان کو کامل عبور حاصل ہے اور وہ کوئی دوسرا فن نہیں جانتے ہوں گے۔ ہر ایک مسلک کے فقہاء ان کے پاس بیٹھتے تھے۔ اور ان سے اپنے مذہب و مسلک کی باتیں سیکھتے تھے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے کسی سے مناظرہ کیا ہو اور شکست کھائی ہو۔ یا کسی شرعی یا غیر شرعی مسئلے پر بحث کی ہو اور اس میں مہارت رکھنے والے لوگوں پر فوقیت حاصل نہ کی ہو۔

قاضی بن مخلوف مالکی کی رائے

قاضی زین الدین بن مخلوف مالکی نے امام موصوف کو مصر میں سخت تکلیف پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ جب ملک ناصر نے ان سے بدلہ لینا چاہا تو امام موصوف نے اس کو روکا اور ان کی جان بچائی۔ اسی لیے قاضی موصوف نے کہا ہم نے ابن تیمیہ سے بڑھ کر کوئی عفو اور درگزر کرنے والا نہیں پایا۔ ہم نے ان کی جان لینے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ لیکن جب ان کو ہم پر قابو ملا تو انہوں نے فراخدلی کے ساتھ ہمیں معاف کر دیا۔

قاضی زین الدین بھی ان کے علمی کمالات کے معترف تھے۔ انہوں نے ۷۱۸ھ میں انتقال کیا۔ انہی کی جگہ پر قاضی تقی الدین اخنائی مالکی کا تقرر ہوا تھا۔ جنہوں نے ان کو زیارت قبور کے مسئلے میں شدید اختلاف کی بنا پر قید میں ڈلوایا اور ان کو بہت زیادہ پریشان کرنے کی کوشش کی۔

علاء الدین قونوی کا اعتراف

شیخ محی الدین ابن عربی اور دوسرے صوفیہ کے عقائد و خیالات پر امام موصوف نے جتنی شدید نکتہ چینیاں کی تھیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ انہوں نے شیخ صدر الدین قونوی پر بھی سخت تنقیدیں کی تھیں۔ شیخ علاء الدین علی بن اسماعیل بن یوسف قونوی شافعی ان نکتہ چینیوں اور تنقیدوں کی وجہ سے امام موصوف کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ ان کے مداح تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اور اکثر ان کی طرف سے مدافعت

بھی کرتے تھے۔

جب ۷۲۷ھ میں شیخ کمال الدین بن الزملکانی کا انتقال ہوگیا تو شیخ علاء الدین ان کی جگہ دمشق بھیجے گئے۔ جب مصر سے چلنے لگے تو ملک ناصر نے ان سے کہا کہ جب آپ دمشق پہنچیں تو نائب دمشق سے کہہ دیجیے کہ وہ ابن تیمیہ کو چھوڑ دے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ وہ کس وجہ سے قید کیے گئے ہیں۔ ملک ناصر نے جواب دیا کہ ان کے فتوؤں کی وجہ سے ان کو قید کیا گیا ہے۔ علاء الدین قونوی نے کہا اگر وہ اپنے فتووں سے رجوع کرلیں تو ان کو رہا کر دیں گے۔ چونکہ امام ابن تیمیہ نے رجوع نہیں کیا اس لیے ان کو آخر وقت تک رہا نہیں کیا گیا۔

شیخ علاء الدین قونوی اکثر شیخ جمال الدین یوسف المزی کے پاس جایا کرتے تھے جو ابن تیمیہ کے ساتھی اور دوست تھے۔ ایک مرتبہ ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم پر گفتگو ہورہی تھی۔ قونوی نے کہا: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب میں کفر اور گمراہی بہت ہے۔ بعض ساتھیوں نے کہا: کیا آپ اس میں تاویل نہیں کرتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ابن عربی کچھ معصوم نہیں تھے اور معصوم ہی کے کلام کی تاویل کی جاسکتی ہے۔

جب امام موصوف کی وفات کے چند دن بعد حافظ ابن قیم کو رہا کیا گیا تو شیخ علاء الدین قونوی ان کے پاس گئے اور ان کو ان کی رہائی پر مبارکباد دی۔ وہ اکثر ابن قیم کی علمی بحثوں کی بھی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔

قاضی جمال الدین ابن جملہ شافعی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے امام موصوف کو آخری دفتوں میں بہت تکلیف دی تھی۔ اور ان کے متعلق غلط باتیں مشہور کررکھی تھیں۔ ایک دن قاضی ابن جملہ نے علاء الدین قونوی کے سامنے امام موصوف پر سخت تنقید کی اور ان کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ علاء الدین قونوی نے ترکی زبان میں اپنے بعض ساتھیوں سے کہا کہ یہ شخص ابن تیمیہ کے کلام کو سمجھنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔ [1] علاء الدین قونوی نے ایک سال بعد ۷۲۹ھ میں انتقال کیا۔

---

[1] دیکھو الدرر الکامنۃ: ۳/ ۲۶، ۲۷۔

سبکی کی تعریف

قاضی تقی الدین علی بن عبدالکافی سبکی شافعی بھی امام موصوف کے زبردست مخالفین میں سے تھے۔ یہ امام موصوف سے بائیس سال چھوٹے تھے۔ یہ ابوحیان اندلسی کے شاگردوں میں سے تھے انہوں نے ان کے متعلق مختلف رسائل اور نظمیں لکھی تھیں۔ اس کے باوجود وہ ان کی تعریف کرتے تھے۔ چنانچہ جب شیخ شمس الدین ذہبی نے شیخ تقی الدین سبکی کو ان کے غلو اختلاف پر ٹوکا تو سبکی نے لکھا۔

''لیکن شیخ کے بارے میں آپ کا قول تو میں بھی اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ شرعی اور عقلی علوم میں ان کی نظر بہت وسیع اور گہری ہے۔ ان کی ذہانت ان کا اجتہاد اور تمام علوم میں ان کا غیر معمولی کمال ہماری تعریف وتوصیف سے بھی بالاتر ہے۔ میں نے ان کے کمالات کا پورا معترف ہوں اور ہمیشہ ان کا معترف رہوں گا۔ میرے دل میں ان کی عزت اور وقعت اس سے بھی بہت زیادہ ہے جو ظاہر میں دکھائی دیتی رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ورع و تقویٰ، زہدودیانت اور بے غرض نصرت حق کے اوصاف جمع کر دیے ہیں۔ انہوں نے سلف صالحین کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنالیا ہے اور وہ ان کے انوار قدسیہ سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ ان کی اس طرح کی زندگی درحقیقت ایک عجوبۂ روزگار ہے۔ جس کی مثال نہ تو موجودہ زمانے میں اور نہ پرانے زمانے میں ملتی ہے۔ [1]

اسی خاندان کے دوسرے فرد قاضی القضاۃ بہاء الدین ابوالبقا محمد بن عبدالبر بن یحییٰ سبکی شافعی کہتے ہیں کہ ابن تیمیہ سے بغض وکینہ یا تو جاہل رکھ سکتا ہے یا نفسانی خواہشات کا پیرو جاہل اپنے جہل سے یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور نفس پرست اپنی ہوس پرستی کی وجہ سے حق کو جان کر بھی جھٹلاتا ہے۔

دوستوں کی تعریف

امام موصوف کے دوستوں اور شاگردوں نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی ابتدائی سات صدیوں میں ان کے جیسا کوئی عالم پیدا نہیں ہوا۔

---

[1] مجموع الدرر، ص: ۱۰۳۔

دوستوں نے جو کچھ تعریف کی ہے اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے۔ امام موصوف کے دوستوں اور بہی خواہوں میں حافظ جمال الدین یوسف المزی، شیخ علاؤ الدین ابو محمد القاسم بن محمد بن البرزالی اور شیخ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی خاص طور پر ممتاز ہیں۔ حافظ مزی شیخ تقی الدین سے چھ سات سال بڑے تھے۔ اور برزالی اور ذہبی بترتیب چار اور بارہ سال چھوٹے تھے۔ یہ تینوں شخص اپنے زمانے کے بہت بڑے مورخ اور فن رجال کے امام مانے جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے تذکرے اور تراجم کا ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ نقد و جرح کے اندر بھی ان کی رائے کو بہت بڑی وقعت دی جاتی تھی۔ ان تینوں نے امام موصوف کی غیر معمولی تعریفیں کی ہیں۔ شیخ شمس الدین ذہبی نے تعریف کے ساتھ ساتھ ابن تیمیہ کے نقائص کو بھی دکھایا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہوگا کہ ان تینوں نے اپنے معاصر دوست کی مبالغہ آمیز تعریف کی ہے۔ انہوں نے ان کے جو جو اوصاف بیان کیے ہیں وہ پورے کے پورے ان میں پائے جاتے ہیں۔ تو پھر ان کی تعریفوں کو مبالغے پر کیوں محمول کیا جائے؟

مزی کی تعریف

حافظ ابو الحجاج مزی کہتے ہیں کہ میں نے ان کا کوئی ثانی نہیں دیکھا اور نہ انہوں نے اپنا کوئی ہمتا پایا اور میں نے کسی کو بھی ان سے بڑھ کر کتاب وسنت کا عالم اور ان کا پیرو نہیں پایا۔ [1]

حافظ موصوف کے شاگرد ابو الفتح ابن سید الناس الیعمری اپنے استاد کا تذکرہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ انہی نے مجھ کو شیخ الاسلام تقی الدین ابو العباس احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام بن تیمیہ سے ملاقات کرنے کی ترغیب دی۔ میں نے ان کو ایک ایسا شخص پایا جس کو ہر ایک علم سے حصہ ملا ہے۔ اور جس نے قریب قریب تمام سنن و آثار کا حفظ کر لیا ہے۔ اگر وہ تفسیر پر گفتگو کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس فن کے امام ہیں اور اگر فقہی مسائل کا جواب دینے لگتے تو ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس علم کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ اگر حدیث کا ذکر ہوتا تو وہ اس کے زبردست عالم اور راوی ہیں۔ اگر ملل و نحل اور مختلف فرقوں کا بیان ہوتا تو ان فرقوں کا جاننے والا ان سے بڑھ کر نہیں مل سکتا اور نہ ان سے بہتر کوئی ان فرقوں کو پہچان سکتا ہے۔ ہر فن میں وہ

---

[1] العقود الدرية، ص: ۷۔

اپنے زمانے کے لوگوں پر فوقیت لے جا چکے ہیں۔ کسی آنکھ نے ان کا ثانی نہیں دیکھا۔ اور نہ خود ان کی آنکھ نے اپنا نظیر دیکھا ہے۔ [1]

اس کے بعد ابن سید الناس نے مختصر الفاظ میں بتایا ہے کہ کس طرح دمشق اور شام میں ان کے حاسد پیدا ہو گئے تھے جن کی وجہ سے ایک قید و بند سے دوسرے قید و بند کا منہ دیکھنا پڑا اور کس طرح ان کی پوری زندگی مسلسل مصیبت و آفت کا شکار بنی رہی یہاں تک کہ انہوں نے قید ہی میں انتقال کیا۔

برزالی کی تعریف

شیخ علم الدین برزالی لکھتے ہیں کہ شیخ تقی الدین ابو العباس وہ امام ہیں جن کے فضل اور شرافت و دین پر سب کا اتفاق ہے۔ انہوں نے فقہ پڑھی اور اس میں کمال پیدا کیا۔ اور عربی ادب اصول تفسیر اور حدیث میں مہارت پیدا کی۔ وہ ایسے امام تھے کہ جن کی گرد کو بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ اجتہاد کے رتبے کو پہنچ چکے تھے۔ ان میں مجتہد کی تمام شرطیں جمع تھیں۔ جب وہ قرآن مجید کی تفسیر بیان کرنے لگتے تھے تو لوگ ان کی یاد کی کثرت کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتے تھے۔ وہ خیالات کو بہترین طریقے پر ادا کرتے تھے اور ہر ایک قول کو اس کی حیثیت کے مطابق راجح یا ضعیف اور باطل قرار دیتے تھے۔ ہر ایک علم میں ان کو درک تھا جس کی بنا پر لوگوں کو بڑا ہی تعجب ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت بڑے عابد اور زاہد بھی تھے۔ ہمیشہ خدا کی طرف ان کا دھیان لگا رہتا تھا۔ دنیاوی مال و متاع اور اسباب سے بہت دور تھے۔ ہر جمعہ کی صبح کو لوگوں کے سامنے قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتے تھے۔ ان کی اس مجلس سے بہت سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور ان کی دعا سے برکت پائی ان کے انفاس پاک تھے۔ ان کی نیت سچی تھی، ان کا ظاہر و باطن صاف تھا، ان کے قول اور عمل میں یگانگت تھی۔ ان کی وجہ سے بہت سے لوگ خدا کی طرف پلٹے۔ انہوں نے زندگی بھر فقر و فاقہ اختیار کر رکھا تھا اور دنیا کے عیش سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ [2]

امام موصوف کی وفات کے وقت وہ حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ جب پچاس دن کے

---

[1] العقود الدریة، ص: ١٠؛ مجموع الدرر، ص: ١٤١۔ [2] العقود الدریة: ١٢۔

بعد ان کو راستے میں تبوک کے قریب اطلاع ملی تو وہ رو پڑے اور آخری وقت میں موجود نہ ہونے پر بہت افسوس کیا۔ ❶

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے بہت سی کتابوں کا خود ہی مطالعہ کیا تھا اور حدیثوں کی تلاش و تحقیق کی تھی۔ کئی سال تک مختلف اساتذہ سے حدیث سنی اور مختلف علوم کا مطالعہ جاری رکھا، بہت ہوشیار اور ذہین تھے۔ ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ تفسیر اور اس سے متعلق تمام علوم میں وہ امام تھے۔ فقہ کے عارف تھے اور علما کے اختلاف سے بخوبی واقف تھے۔ اصول، نحو اور لغت میں کمال تھا۔ نقلی اور عقلی علوم کے ماہر تھے۔ ان سے کوئی عالم گفتگو کرتا تھا تو وہ یہی سمجھتا تھا کہ یہی ان کا خاص فن ہے اور اس میں وہ بہت کامل اور مضبوط ہوتے تھے۔ حدیث کے زبردست حافظ تھے۔ اس کے اچھے برے میں تمیز کر سکتے تھے۔ اسماء رجال کے فن سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ ❷

میرے اور ان کے درمیان بچپن ہی سے دوستی اور محبت تھی۔ قریب قریب پچاس سال تک ان کا ساتھ رہا۔ ❸

ذہبی کی تعریف

شیخ شمس الدین ذہبی نے اپنی مختلف کتابوں میں امام موصوف کے حالات لکھے ہیں اور ہر جگہ ان پر ایک وارفتگی کا عالم طاری معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کی نشو و نما ہی کامل نیکی، پاکدامنی، عبادت و ریاضت اور کھانے پینے میں میانہ روی پر ہوئی ہے۔ بچپن ہی میں مدرسوں اور محفلوں میں شریک ہوتے تھے اور بڑے بڑے عالموں سے مناظرہ کرتے تھے اور بحث میں ان کو چپ کرا دیتے تھے۔ علم کے ایسے ایسے جواہر ریزے بکھیرتے تھے کہ شہر کے بڑے بڑے لوگ اُن کو سن کر متحیر ہو جاتے تھے۔ انیس برس کی عمر میں فتویٰ دیا تھا۔ بلکہ ان کی عمر اس وقت اس سے بھی کم تھی اور اسی زمانے سے جمع اور تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور پڑھنے پڑھانے

---

❶ ایضًا: ٣٤٧؛ البداية والنهاية: ١٤/ ١٣٧۔

❷ العقود الدرية: ٣٧٢۔ ❸ ایضًا: ٣٧٣۔

میں مشغول ہو گئے تھے۔

ان کے والد حنابلہ کے زبردست امام تھے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو انہی کو ان کی جگہ پر مقرر کیا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر اکیس سال کی تھی۔ ان کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی، ہر جمعہ کے دن کرسی پر بیٹھ کر صرف اپنی یاد سے قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتے تھے اور پوری روانی اور سلاست کے ساتھ تقریر کرتے تھے۔ ان کی زبان میں ذرا بھی لکنت نہیں تھی ان کی آواز بہت بلند تھی۔ پڑھاتے وقت ان کی آواز بہت بلند ہو جاتی تھی۔" (العقود الدریہ، صفحہ: ۴)

دوسری جگہ لکھتے ہیں: "جب وہ اختلافی مسائل میں کسی مسئلے کو چھیڑتے تھے اور اس پر دلیلیں دیتے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے لگتے تھے تو لوگوں کو ان کی معلومات کی وسعت پر بڑا ہی تعجب ہوتا تھا۔ وہ مجتہد ہونے کے سزاوار تھے۔ کیونکہ ان میں اجتہاد کی تمام شرطیں پائی جاتی تھیں۔ میں نے کسی کو اس قدر جلد آیتوں کو نکالتے نہیں دیکھا جو کسی مسئلہ پر دلیل بن سکتی ہوں اور نہ میں نے کسی کے دماغ میں حدیثوں کو اتنا مستحضر پایا، سنت ان کی آنکھوں کے سامنے تھی اور زبان کے دونوں کناروں پر رہتی تھی۔ ان کی عبارت بہت شستہ اور صاف ہوتی تھی۔ فن تفسیر اور اس کی معلومات کی وسعت میں وہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔ اصول دین اور مخالفین کے اقوال کے جاننے میں تو کوئی شخص بھی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ان تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ وہ سخاوت اور شجاعت میں بھی بے نظیر تھے۔ نفسانی خواہشات کے چھوڑنے میں یگانہ روزگار تھے۔

مختلف فنون میں ان کے فتوے شاید تین سو یا اس سے بھی زیادہ جلدوں میں ہیں۔ وہ بڑے ہی حق گو تھے۔ خدا کی راہ میں وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے تھے۔ جو لوگ ان کے مقام اور مرتبے سے واقف ہیں وہ مجھ پر یہی الزام دھریں گے کہ میں نے ان کی کماحقہٗ مدح اور تعریف نہیں کی اور جو لوگ ناواقف ہیں اور ان کے سخت مخالف ہیں۔ میرے اس بیان کو غلو اور مبالغہ قرار دیں گے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ میں نے ان کے موافقین اور مخالفین دونوں سے ایذا پائی ہے۔"

پھر شیخ کا حلیہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں: ''میں نے دعا اور استغفار اور خدا سے رجوع کرنے میں ان سے بڑھ کر کسی اور کو نہیں پایا۔ میں ان کو معصوم نہیں سمجھتا بلکہ بعض اصولی اور فروعی مسائل میں ان کا سخت مخالف ہوں۔ وہ اپنے وسعت علم، فرط شجاعت، سیلان ذہن اور عظمت دین کے باوجود ایک انسان تھے۔ ان کی بحث وتکرار میں بتقاضائے بشریت غیظ و غضب، حدت اور تیزی پیدا ہو جاتی تھی۔ ان کے الفاظ مخالف کے سینے میں تیر اور نشتر کی طرح چبھتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگوں کے دل میں عداوت گھر کر گئی تھی، اگر وہ مخالفین کے ساتھ ذرا نرمی سے کام لیتے تو کوئی جھگڑا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ بڑے بڑے مخالفین بھی ان کے سلطان علم کے سامنے سرنگوں تھے۔ اور ان کے فضل وکمال کے معترف تھے۔ سب کو اس بات کا اقرار ہے کہ وہ ایک سمندر تھے جس کا کنارہ نہیں ملتا اور وہ خزانہ تھے جس کی نظیر نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کے اقوال وافعال کی سختی کی وجہ سے لوگ ان پر بری طرح نکتہ چینی کرتے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ ہر شخص کی عزت اس کے اقوال اور افعال ہی کے مطابق کی جاتی ہے۔

وہ نماز اور روزے کے بڑے پابند تھے۔ ظاہر اور باطن دونوں حالتوں میں احکام شریعت کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کی سمجھ اور بوجھ میں کسی قسم کی خرابی نہیں تھی۔ وہ غیر معمولی ذہین تھے۔ ان کے اندر علم کی بھی کمی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ اس بارے میں ایک جوش مارنے والے سمندر کی طرح تھے۔ وہ دین کے ساتھ ٹھٹھا نہیں کر رہے تھے۔ وہ محض اپنی خواہشات نفسانی سے بعض مسائل میں جمہور سے اختلاف نہیں کر رہے تھے۔ وہ اپنی زبان کو بے لگام نہیں ہانکتے تھے۔ بلکہ قرآن و حدیث سے دلیلیں دیتے تھے۔ وہ ائمہ متقدمین کے طرز پر مناظرہ کرتے تھے اور اپنے دعوے کو ثابت کرتے تھے غلطی کی صورت میں ان کو ایک اجر ملے گا اور صحت اجتہاد پر ان کو دو اجر ملیں گے۔'' [1]

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں ''ان کو صحابہ اور تابعین کے مذاہب کی معرفت میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں وہ چاروں اماموں کے قول کو بیان نہ کریں مشہور مسائل میں انہوں نے ان چاروں اماموں سے اختلاف کیا اور ان پر کتابیں لکھی

[1] الدرر الكامنة: ١/ ١٥٠، ١٥١؛ البدر الطالع: ١/ ٦٤، ٦٥۔

ہیں اور کتاب وسنت سے اپنے دعوؤں پر دلیلیں دی ہیں۔

جب وہ اسکندریہ میں نظر بند تھے تو سبتہ کے حاکم نے ان سے ان کی تصنیفات کے روایت کرنے کی اجازت چاہی انہوں نے دس ورق میں اس کے لیے اجازت نامہ لکھا اور اپنی کتابوں کی فہرست دی۔ اس میں محض اپنی یاد سے حدیثوں کی سندیں دی ہیں جن کو ایک بڑے سے بڑا محدث اپنی یاد سے کبھی نہیں لکھ سکتا تھا۔

وہ کسی خاص مسلک اور مذہب کے پابند نہیں تھے۔ جو قول بھی ان کو حق معلوم ہوتا تھا اسی کے مطابق وہ فتویٰ دیتے تھے۔ انہوں نے خالص سنت اور سلف صالح کے طریقے کی حمایت کی اور اس پر ایسے دلائل اور مقامات قائم کیے کہ کسی کا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا اور ایسے رسائل لکھے کہ اگلے اور پچھلے اس قسم کے رسائل کے لکھنے میں ناکام ہو گئے اور ان سے ڈرنے اور خوف کھانے لگے۔ یہاں تک کہ مصر اور شام کے بعض علما نے ان کے خلاف اتنی شورش کی کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں ہوسکتی تھی۔ ان کو بدعتی قرار دیا۔ ان کے ساتھ بارہا مناظرے کیے اور ان کے خلاف رسائل لکھے مگر وہ اپنی جگہ پر مضبوط تھے۔ نہ وہ نرم پڑتے تھے اور نہ کسی کے سامنے جھکتے تھے بلکہ حق بات کہتے تھے جو سب کو کڑوی لگتی تھی۔ وہ وہی بات سناتے تھے جو ان کے اجتہاد، حدت ذہن اور وسعت علم کے مطابق صحیح معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت پرہیز گار آدمی تھے۔ ان کا فکر کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ وہ فوراً ہر ایک چیز کی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ انہیں ہمیشہ خدا کا خوف لگا رہتا تھا۔ وہ شعائر دینی کی بڑی تعظیم وتکریم کرتے تھے۔

ان کے اور ان کے مخالفین کے درمیان بارہا لڑائیاں ہوئیں، مصر اور شام میں کئی واقعات پیش آئے۔ کتنی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ مخالفین نے ایک ہی کمان سے ان پر تیر چلایا مگر اللہ نے ہمیشہ ان کو بچالیا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ خدا ہی سے مدد کے طلب گار رہتے تھے اور اسی پر بھروسہ کرتے تھے۔ ان کا دل بہت مضبوط تھا۔ وہ مخصوص اوراد اور وظائف پڑھتے تھے۔ جن میں ایک خاص کیفیت ہوتی تھی۔ اور ان کا دل مطمئن ہوتا تھا۔

ان کے مخالفین کو چھوڑ کر باقی دوسرے عالم، صالح، سپاہی، امیر، تاجر، رئیس اور عامی

سب ان سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ شب وروز اپنی زبان اور اپنے قلم سے ان کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔

ان کی شجاعت مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ بعض بڑے بڑے بہادر بھی ان کی بعض خصوصیات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ قازان کی جنگ میں اللہ نے انہی کو کھڑا کیا اور ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ چنانچہ وہ اٹھے اور آگے بڑھے۔ قازان سے دو مرتبہ ملاقات کی۔ قتلغشاہ اور بولائی سے مل کر زور دار گفتگو کی۔ مغلوں پر ان کی پیش قدمی اور جرأت کی بنا پر قبچاق منصوری امام موصوف پر بڑے ہی تعجب کا اظہار کیا کرتا تھا۔

بحث میں ان کی گفتگو بہت تیز ہو جاتی تھی۔ وہ اس وقت میدان جنگ کے شیر معلوم ہوتے تھے۔ ان کا رتبہ اس سے بھی بڑا ہے کہ مجھ جیسا شخص ان کی تعریف وتوصیف کر کے ان کی طرف توجہ دلائے۔ قسم بخدا! اگر میں رکن اور مقامِ ابراہیم کے درمیان کھڑے ہو کر قسم کھاؤں کہ میں نے اپنی آنکھ سے ان کا مثیل اور نظیر نہیں دیکھا اور نہ انہوں نے علم میں کسی کو اپنا ہمتا پایا تو میری یہ قسم سچی ہوگی اور مجھے کفارہ ادا نہیں کرنا ہوگا۔ [1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''وہ ذکاوت اور سرعت ادراک میں ایک نشانی تھے اور کتاب وسنت اور اختلافی مسائل اور نقلیات کے جاننے میں ماہر اور بے پناہ سمندر تھے۔ علم و زہد، شجاعت وسخاوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور کثرت تصانیف کے لحاظ سے وہ یگانۂ روزگار تھے انہوں نے خود ہی پڑھ کر علم حاصل کیا۔ حدیث اور فقہ میں کمال پیدا کیا اور سترہ برس کی عمر میں فتویٰ دینے کی قابلیت پیدا کر لی۔

تفسیر، اصول اور تمام اسلامی علوم میں چاہے وہ اصولی ہوں یا فروعی، آسان ہوں یا مشکل اپنے زمانے کے لوگوں سے بہت آگے تھے۔ اگر تفسیر کا ذکر ہو تو وہی اس کے علمبر دار تھے۔ اور اگر فقہ کا نام لیا جائے تو وہ مجتہد مطلق کا درجہ رکھتے تھے۔ اگر وہ حافظین حدیث کی مجلس میں آبیٹھتے اور حدیث بیان کرنا شروع کر دیتے تو سب لوگ گونگے ہو جاتے تھے اور

---

[1] مجموع الدرر، ص: ۱۸، ۱۷۔

اگر کلام کا نام لیا جائے تو وہ متکلمین کے سردار قرار پائیں، ابن سینا بھی ان کا امام بن کر آئے تو وہ اس کی تمام غلطیوں کو دکھا دیں، وہ عربی ادب، نحو و صرف اور لغت کے بھی بہت بڑے ماہر تھے۔

ان کی ذات اس سے بھی بہت بلند ہے کہ میرے الفاظ ان کی صحیح تعریف کر سکیں میرا قلم ان کے پورے محاسن بیان کرنے سے عاجز ہے۔ ان کی سیرت، ان کے علوم اور معارف، ان کی پے در پے آزمائشیں دو جلدوں سے کسی طرح کم میں نہیں سما سکتیں۔ خدا ان کو بخشے اور ان کو اپنی جنت میں بلند جگہ عطا کرے۔ وہ درحقیقت اس امت کے ربانی عالم تھے۔ ان کے زمانے میں ان کا کوئی نظیر نہیں تھا۔ وہ شریعت کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ وہ مسلمانوں کی مشکلات کو حل کرتے تھے۔ علوم میں ماہر تھے۔ حق کے اظہار، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض ادا کرنے میں وہ سب سے آگے تھے۔ میں نے یہ خصوصیت کسی عالم اور فقیہ میں نہیں دیکھی۔ [1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: علوم سنت کے استحضار اور دلائل و براہین کے استنباط میں ان کا گہرا مطالعہ اور احاطہ بہت ہی عجیب و غریب تھا۔ ان پر یہ بات صادق آتی تھی کہ جس حدیث کو ابن تیمیہ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ احاطہ تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ ان کے اور دوسرے ائمہ کے درمیان فرق اتنا ہے کہ ابن تیمیہ کے علوم کا سرچشمہ ایک وسیع سمندر تھا اور دوسرے اماموں کے علوم کا منبع چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں۔ [2]

شیخ شمس الدین ذہبی نے اس دور کے علما کی دنیاداری اور کج بحثی کو دیکھ کر زغل العلم کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں شافعی علما کی خوب خبر لی ہے۔ اس سلسلے میں وہ امام موصوف کی زندگی کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قسم بخدا میری آنکھ نے ابن تیمیہ سے زیادہ کسی کو وسیع النظر عالم اور بلا کا ذہین نہیں دیکھا۔ کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے اور عورتوں سے کنارہ کش ہونے اور ہر ممکن طریقے سے جہاد کرنے اور حق کے اظہار کرنے میں ان کا کوئی مقابل نہیں تھا۔ میں نے کئی سال تک

---

[1] مجموع الدرر: ١٤٤۔ [2] ایضاً: ١٤٥۔

لگاتار ہر طرح سے ان کو جانچا اور پرکھا ہے۔ مگر خودسری وخودنمائی، بڑا بننے اور بڑوں کو گرانے کی خواہش کے سوا ان میں کوئی دوسرا عیب نہیں پایا۔ یہی چیز مصر اور شام والوں کی نظروں میں کھٹکتی تھی اس کی وجہ سے وہ ان کے سخت دشمن ہو گئے تھے۔ اور ان پر سخت نکتہ چینی کرنے لگے تھے اور ان کو جھوٹا اور کافر تک بنانے میں جھجکتے نہیں تھے۔

دیکھو کہ بلند بانگ دعوؤں کا شوق اور خودنمائی کا سودا کس طرح وبال جان بن جاتا ہے۔ خدا ہم سب کے گناہوں پر پردہ ڈالے۔ شیخ تقی الدین کے خلاف ایسے لوگوں نے شوزش کی جو ان سے زیادہ عالم اور پرہیز گار نہیں تھے۔ یہ لوگ تو اپنے ساتھیوں اور دوستوں کے گناہوں اور لغزشوں سے تو چشم پوشی کر لیتے تھے۔ لیکن شیخ کی کوئی بھلائی بھی ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اللہ نے انہی دشمنوں کو ان پر مسلط کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ تقویٰ اور علم میں ان سے کچھ بڑھ کر تھے۔ بلکہ یہ ان کے کبروغرور ہی کا نتیجہ تھا۔'' [1]

یہاں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ امام موصوف حق بات کے ظاہر کرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ شیخ محی الدین ابن عربی، امام غزالی اور امام رازی سے ان کو سخت اختلاف تھا۔ وحدۃ الوجود کے مسئلے میں وہ اس شدت سے ابن عربی کے مخالف تھے کہ وہ ان کو ''اس امت کا شیطان'' [2] لکھتے تھے۔ اور یہی سختی اس زمانے کے شخصیت پرست لوگوں کو بے حد ناگوار گزرتی تھی۔ شیخ شمس الدین ذہبی کا یہ فقرہ ''خودسری وخودنمائی بڑا بننے اور بڑوں کو گرانے کی خواہش'' اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن اس شدت میں بھی نفسانیت کو کوئی دخل نہیں تھا۔ بلکہ یہ اظہار حق میں غلو کا ایک نتیجہ تھا۔

شیخ شمس الدین ذہبی اور دوسرے محدثین کی طرح علوم عقلیہ کو ضلالت اور گمراہی کا ایک بڑا ذریعہ سمجھے تھے اور ان علوم کے پڑھنے پڑھانے اور ان میں غور وخوض کرنے والوں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ اس رسالے میں ان لغو علوم سے بچنے کی تاکید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اگر تم اصول اور اسکے توابع یعنی منطق، حکمت اور فلسفہ اور اگلے لوگوں کی رایوں اور

---

[1] زغل العلم للذهبي: ١٨۔ [2] تفسير سورة الاخلاص۔

عقلی چیستانوں میں کمال پیدا کر بھی لو اور اس کے ساتھ ساتھ کتاب و سنت اور اصول سلف کے پورے پابند بھی ہو جاؤ اور عقل اور نقل میں سب پر فوقیت حاصل بھی کر لو۔ تب بھی میں نہیں سمجھتا کہ تم ابن تیمیہ کے رتبے کو پہنچ سکو گے۔ قسم بخدا! تم ان کے قریب کا رتبہ بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔ اس کے باوجود ہم نے دیکھ لیا کہ ان کے ان علوم میں غور و خوض کا نتیجہ محض تنقیص و تہجیر اور تضلیل و تکفیر اور حق و باطل کی تکذیب نکلا۔''

ان علوم کے حاصل کرنے سے پہلے ان کا چہرہ منور اور روشن تھا۔ ان کی پیشانی سے سلف کے آثار ہویدا تھے۔ مگر اب ان کی زندگی تاریک ہوگئی ہے۔ بہت سے لوگوں کے دل ان کی طرف سے مکدر ہو چکے ہیں۔ ان کے دشمن ان کو دجال، جھوٹا اور کافر کہتے ہیں۔ عقلمندوں کی جماعت ان کو محقق، فاضل اور مبتدع قرار دیتی ہے اور ان کے دوست اور احباب ان کو اسلام کے علمبردار، دین کے حامی اور سنت کے محی بتاتے ہیں۔ [1]

النصیحۃ الذہبیہ اور اس پر تبصرہ

بعض مخالفین کا یہ خیال ہے کہ شیخ شمس الدین ذہبی کی یہ تمام تعریفیں اس وقت کی ہیں جبکہ ان پر ہنوز امام موصوف کی اندرونی خواہشوں اور بدعتوں کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں شیخ شمس الدین کی وہ تحریر پیش کرتے ہیں جو انہوں نے سرزنش کے طور پر امام موصوف کو لکھ بھیجی تھی اور جو ان کے رسالہ زغل العلم کے ساتھ النصیحۃ الذہبیہ لابن تیمیہ کے نام سے چھپ گئی ہے۔ ہم پہلے اس تحریر کا ترجمہ درج کرتے ہیں اور اس کے بعد واقعات کی روشنی میں اس پر تنقید کرتے ہیں۔ جس سے اس کی حقیقت پورے طور پر آشکارا ہو جائے گی۔ اس تحریر کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

تحریر کا ترجمہ

سب تعریفیں خدا ہی کے لیے سزاوار ہیں۔ اے میرے پروردگار! مجھ پر رحم کر، میری خطاؤں کو معاف کر، میری لغزشوں کو کم کر اور میرے ایمان کو محفوظ رکھ۔ وائے رنج و غم! میری غم کی کمی پر اور وائے افسوس! چراغ سنت کے بجھ جانے پر اور اہل سنت کے فقدان پر اور

[1] زغل العلم للذهبي ٢٣۔

وائے شوق! میرے ان مومن بھائیوں کی طرف جو میری طرح اہل سنت کے فقدان پر اشک فشاں ہیں۔ وائے رنج وغم! ان بزرگوں کے فقدان پر جو علم وفن کے روشن چراغ تھے، زہد و اتقا اور بھلائیوں اور نیکیوں کا خزانہ تھے۔ ہائے افسوس! کہ آج ایک حلال درہم بھی نصیب نہیں ہوتا اور کوئی مونس اور غمخوار دوست نہیں ملتا۔ بھلا ہے وہ شخص جو اپنی کمزوریوں پر نظر رکھتا ہے اور برا ہے وہ جو دوسروں کی کمزوریوں کو اچھالتا ہے۔ تم کب تک اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو دیکھو گے اور اپنی آنکھ کے شہتیر کو بھول جاؤ گے۔ کب تک آپ اپنی تعریف کرتے رہو گے اور اپنی عبارتوں اور تحریروں کو سراہتے رہو گے اور علما کی مذمت کرتے رہو گے اور خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو جان کر کہ اپنے مردوں کا ذکر نہ کرو مگر بھلائی کے ساتھ، کیونکہ وہ اپنا کیا پا چکے۔ تم کہاں تک مرے ہوئے لوگوں کی ہڈیاں اکھیڑتے رہو گے۔

ہاں میں یہ جانتا ہوں کہ تم اپنی حمایت میں یہ کہو گے کہ ہماری لڑائی ان لوگوں سے ہے جنہوں نے اسلام کی بو نہیں سونگھی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کو نہیں پہچانا اور یہ جہاد ہے۔ خدا کی قسم! انہوں نے بہت کچھ جانا اور پہچانا، اگر کوئی صرف ان کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرے تب بھی وہ کامیاب رہے گا۔ وہ بہت سی باتوں سے ناواقف تھے کیونکہ ان کو ان باتوں کے جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور آدمی کے حسن اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ایسی باتوں کو چھوڑ دے جو اس کے لیے کسی طرح مفید نہیں ہیں۔

اے آدمی! اب تو خدا کے لیے ہم سے ہاتھ اٹھا لے۔ تم بڑے ہی کٹ حجت اور چرب زبان ہو، نہ تمہیں قرار ہے اور نہ تمہیں نیند ہے۔ دین میں غلطیاں کرنے سے بچو، تمہارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ کریدنے اور جواب دینے کو مکروہ سمجھا ہے اور اس کو عیب قرار دے کر اس کی ممانعت کی ہے۔ آپ نے فرمایا ہے: ''میری امت پر مجھے بہت زیادہ ڈر اس شخص سے ہے جو دورخا اور چرب زبان ہو۔

بغیر دلیل کے زیادہ بولتے رہنا دل کو سخت بنا دیتا ہے۔ جب حلال اور حرام کی باتوں میں یہ خصوصیت ہو تو یونس اور فلسفیانہ عبارتوں کے متعلق زیادہ بولتے رہنے کا کیا نتیجہ ہو گا۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ یہ کفریات دلوں کو اندھا کر دیتی ہیں۔ خدا کی قسم! ہم لوگ تو

دوسروں کے لیے مضحکہ بن گئے ہیں۔ پس تم کب تک ان فلسفیانہ دقیق باتوں کو اکھیڑتے رہو گے۔ ہم اپنی عقل سے ان کی تردید کرتے رہیں۔

اے آدمی! تم نے فلسفیوں کی کتابوں کا دہرا دہرا کر اور بار بار مطالعہ کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا زہر تمہارے جسم میں پوری طرح سرایت کر گیا ہے۔ زہر کے استعمال کی کثرت سے جسم اس کا عادی ہو جاتا ہے اور بدن میں اس کا کچھ بھی اثر دکھائی نہیں دیتا۔

اے شوق! ایسی مجلس کی طرف جس میں قرآن مجید کی تلاوت و تفکر اور تدبر کے ساتھ ہوتی ہو اور خاموشی اور خوف اور خشیت کے ساتھ خدا کو یاد کیا جاتا ہو۔ ہائے اب ایسی مجلسیں نہ رہیں جن میں نیکوں کا ذکر ہوتا تھا۔ نیکوں کے ذکر پر خدا کی رحمت اترتی ہے۔ ان کے ذکر پر لعنت ملامت نہیں کی جاتی۔

حجاج کی تلوار اور ابن حزم کی زبان دونوں بہنیں تھیں۔ تم نے ان دونوں کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے۔ خدا کی قسم! ہماری مجلسیں جمعرات اور دانوں کے کھانوں کی بدعت سے خالی ہو گئیں لیکن ہم میں ایسی بدعتیں آ گئی ہیں جن کو ہم ضلالت اور گمراہی کی جڑ سمجھتے تھے۔ اب وہ خالص توحید اور سنت کی اصل بن گئی ہیں جو ان کو نہ جانے وہ کافر ہے یا گدھا ہے بلکہ جو دوسروں کی تکفیر نہ کرے وہ فرعون سے زیادہ کافر ہے۔

تم نصرانیوں کو ہماری طرح شمار کرتے ہو۔ خدا کی قسم! دلوں میں شکوک ہوتے ہیں اگر شہادت کے دونوں کلموں کے ساتھ تمہارا ایمان بھی صحیح اور سالم رہ جائے تو تم یقیناً نیک بخت ہو۔

وائے ناکامی اور بیہودگی تمہارے پیرؤوں کی، وہ زندقہ اور انحلال کا شکار ہو گئے ہیں۔ خاص کر جب کہ وہ علم اور دین میں کچے اور خواہشات نفسانی کے پیرو ہوتے ہیں۔ گو وہ ظاہر میں تمہارے لیے سود مند دکھائی دیتے ہیں اور اپنی زبان و قلم سے تمہاری طرف سے لڑتے ہیں لیکن درحقیقت وہ تمہارے چھپے دشمن ہیں۔ تمہارے بڑے سے بڑا پیرو بھی یا تو کم عقل اور جی حضوری ہے یا جھوٹا اور کند ذہن عامی ہے۔ یا بنا ہوا مکار ہے یا بے سمجھ اور نادانِ نیک ہے۔ اگر تم میرے اس بیان کو سچ نہیں سمجھتے ہو تو انصاف کے ساتھ اپنے پیرؤوں کو ٹٹول

کراور تول کر دیکھو۔

اے مسلمان آدمی! تم کب تک اپنے نفس کی تعریفیں کرتے رہو گے اور اس کی خوشنودی حاصل کرتے رہو گے اور نیک لوگوں سے لڑتے رہو گے۔ تم اپنے نفس کی باتوں کو سچ مان کر کب تک بزرگوں کی تنقیص کرتے رہو گے۔ اور اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر کب تک دوسروں کی توہین کرتے رہو گے اور اپنے نفس کو دوست بنا کر کب تک پاک باطن لوگوں کی دشمنی مول لیتے رہو گے۔ اپنے کلام کی تم کب تک ایسی تعریف کرتے رہو گے جو اس کے شایان شان نہیں ہے۔ خدا کی قسم! صحیحین کی حدیثیں، اے کاش، صحیحین کی حدیثیں تم سے بچی رہتی تم تو ہر وقت تضعیف واہدار یا تاویل وانکار سے ان پر حملہ کرتے رہتے ہو۔

کیا تمہارے لیے اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ اپنے انجام سے ڈرو۔ کیا اب بھی تمہیں توفیق نہیں ہوئی کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور خدا کی طرف رجوع کرو، حالانکہ تم اب عشرۂ ستر میں ہو اور تمہارے کوچ کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ خدا کی قسم! میں نہیں سمجھتا کہ تم موت کو یاد کرتے ہو گے۔ تم تو ان لوگوں کی بھی تنقیص کرتے ہو جو موت کو یاد دلاتے ہیں۔

مجھے امید نہیں کہ تم میری باتوں کو قبول کرو گے اور میری نصیحتوں کی طرف دھیان دو گے بلکہ تم میں اتنی ہمت ہے کہ کئی جلدوں میں ان اوراق کی دھجیاں اڑا دو۔ اور میرے کلام کے پرزے کر ڈلو اور اپنی حمایت کرنے لگو۔ یہاں تک کہ میں کہہ اٹھوں۔ بس بس اب میں چپ ہو گیا۔

جب میرے نزدیک تمہاری یہ حالت ہو حالانکہ میں تمہارا مہربان اور شفیق دوست ہوں تو تمہارے دشمنوں کے نزدیک تمہاری کیا حالت نہ ہو گی۔ خدا کی قسم! تمہارے دشمنوں میں صلحاء بھی ہیں، عقلاء بھی ہیں اور فضلاء بھی ہیں۔ اس طرح جس طرح تمہارے دوستوں میں فاجر، جھوٹے، جاہل اور بے حس انسان ہیں۔

میں اس پر راضی ہوں کہ تم مجھ کو اعلانیہ برا کہو۔ مگر اندرون طور پر میری ان نصیحتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس شخص پر خدا کی رحمت ہو جو میری کمزوریوں پر مجھے ٹوکتا رہتا ہے۔ کیونکہ میں بہت زیادہ گناہگار ہوں اور مجھ میں بہت سے عیب ہیں۔ میری بدبختی ہو گی اگر میں اپنے

گناہوں سے توبہ نہ کروں۔ وائے میری شرمساری غیبوں کے جاننے والے کے نزدیک۔ میری دوا صرف خدا کا عفو و کرم اور اس کی توفیق و ہدایت ہے اور سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔

اس تحریر پر جرح

پہلا سوال جو اس تحریر کے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آیا یہ تحریر شیخ شمس الدین ذہبی کی ہے یا نہیں؟ مصحح کے بیان کے مطابق یہ موجودہ مطبوعہ نسخہ برہان بن جماعۃ (المتوفی: ۷۹۰ھ) کے اس نسخے سے منقول ہے جس کو انہوں نے حافظ صلاح علائی (المتوفی: ۷۶۱ھ) کے نسخے سے نقل کیا تھا اور حافظ موصوف نے شیخ شمس الدین ذہبی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے کی نقل لی تھی۔ مزید شہادت کے طور پر مصحح نے حافظ سخاوی (المتوفی: ۹۰۲ھ) کی کتاب الاعلان بالتوبیخ کا حوالہ دیا ہے جس میں حافظ موصوف نے شیخ شمس الدین ذہبی کے بے تعصبی کے ثبوت میں ان کے ایک رسالے کا تذکرہ کیا ہے اور رسالے کا نام لیے بغیر اس کا صرف اقتباس نقل کیا ہے۔

یہاں مصحح کو درحقیقت کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ حافظ سخاوی نے اس رسالے سے رسالۂ زغل العلم ہی مراد لیا ہے کیونکہ انہوں نے جو اقتباس نقل کیا ہے وہ وہی ہے جو زغل العلم کے صفحہ ۱۷ اور ۱۸ پر موجود ہے۔ اس سے مراد ہرگز النصیحۃ الذہبیہ نہیں ہے جیسا کہ مصحح نے سمجھا ہے۔

مصحح کے مذکورہ بالا بیان کے سوا کوئی شہادت ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ تحریر درحقیقت شیخ شمس الدین ذہبی کی ہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست میں کہیں اس کا نام نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ کے موافقین اور مخالفین کی تحریروں میں کہیں اس کا حوالہ نہیں پایا جاتا۔ یہاں تک کہ تاج الدین سبکی نے بھی طبقات الشافعیہ میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ انہوں نے جہت خداوندی کے مسئلہ میں شیخ کلابی کا پورا تردیدی رسالہ نقل کر دیا ہے۔ تو کیا اپنے جلیل القدر استاد کی اتنی سخت تحریر پا کر بھی وہ خاموش ہو جاتے اور اس کا نام تک نہ لیتے۔

سب سے بڑے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ شیخ شمس الدین ذہبی نے امام ابن تیمیہ کی زندگی میں ان کی کتابوں پر تقریظیں لکھیں۔ ان کے مرنے کے بعد مرثیہ کہا اور تذکرے لکھے۔ ان میں ان کی اچھائیاں بھی دکھائی اور برائیاں بھی۔ لیکن کسی جگہ بھی انہوں نے یہ انداز بیان اختیار نہیں کیا۔ ان کا مرثیہ بہت ہی مختصر ہے۔ مگر دیکھیے کہ ان کی کس قدر صحیح تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں:

یا موت خذ من اردت او فدع
محوت رسم العلوم والورع

اے موت! تو جس کو چاہے لے لے اور جس کو چاہے چھوڑ دے مگر تو نے علوم اور تقویٰ کی نشانیوں کو مٹا دیا۔

اخذت شیخ الاسلام و انقصمت
عری التقی واشتفی اولو البدع

تو نے شیخ الاسلام کو لے لیا اور تقویٰ کی رسی ٹوٹ گئی اور بدعتیوں کا دل خوش ہو گیا۔

غیبت بحرا مفسرا جبلا
حبرا تقیا مجانب الشبع

تو نے سمندر، مفسر، پہاڑ، زبردست عالم، پرہیزگار اور سیری سے بچنے والے کو گم کر دیا۔

فان یحدث فمسلم ثقة
وان یناظر فصاحب اللمع

پس اگر وہ حدیث بیان کرنے لگے تو وہ ثقہ مسلم دکھائی دیتا ہے اور اگر مناظرہ کرے تو صاحب لمع نظر آتا ہے۔

وان یخض نحو سیبویه یفه
بو کل معنی فی الفن مخترع

اور اگر سیبویہ کی نحو میں غور و خوض کرنے لگے تو فن کے ہر ایک نئے معنی کو پورا کر

دکھاتا ہے۔

وصار عالی الاسناد حافظه
کشعبة او سعیدن الضبعی

وہ اسناد حدیث میں بلند مرتبہ حافظ ہو گئے تھے جیسے کہ شعبہ اور سید ضبعی کا حال تھا۔

والفقه فکان مجتهدا
وذا جهاد عار من الجزع

اور فقہ میں وہ مجتہد تھے اور بڑے جہاد کرنے والے تھے ان کو ذرا بھی خوف نہیں ہوتا تھا۔

وجوده الحاتمی مشتهر
وزهده القادری فی الطبع

ان کی حاتمی سخاوت بہت مشہور تھی۔ اور ان کا قادری زہد طبعی تھا۔

اسکندر الله فی الجنان ولا
ذال علیا فی اجمل الخلع

خدا ان کو باغوں میں جگہ دے اور ان کو ہمیشہ اچھی خلعت میں رکھے۔

مع مالك والامام احمد
والنعمان والشافعی والنخعی

امام مالک، امام احمد اور امام ابوحنیفہ اور امام شافعی اور امام نخعی کے ساتھ ہوں۔

مضی ابن تیمیة وموعده
مع خصمه یوم نفخة الفزع

ابن تیمیہ گزر گئے اور ان حریفوں کے ساتھ صور کے پھونکنے کے دن ان کی میعاد ہے۔

اس کے علاوہ اس تحریر میں بعض باتیں ایسی ہیں جو امام موصوف اور ان کے پیرؤوں پر ٹھیک نہیں اترتیں۔ اس تحریر میں ان کے پیرؤوں کو زندقہ اور انحلال کا شکار بتایا گیا ہے اور ان کو دشمن اور کم عقل جی حضوری وغیرہ کہا گیا ہے۔ یہ الزام تاریخ کی روشنی میں بے بنیاد ہے۔

امام موصوف کی ابتدائی زندگی میں ان کے بھائی شیخ شرف الدین عبداللہ وغیرہ اور آخری زندگی میں حافظ ابن قیم ان کی طرف سے قلمی مدافعت کر رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی زندقہ اور انحلال کا شکار نہیں تھا۔ اور نہ وہ کم عقل جی حضوری تھے۔ پھر صحیحین کی حدیثوں پر بھی جرح کرنے کا الزام لگایا گیا ہے جو کسی حالت میں صحیح نہیں ہے۔ انہی باتوں سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ تحریر امام موصوف کے دشمنوں کی بنائی ہوئی نہ ہو۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ یہ شیخ شمس الدین ذہبی کی تحریر ہے تو تب بھی اس کو امام موصوف کے علم وفضل کے خلاف بطور دستاویز پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ اس تحریر کا یہ جملہ ''بلکہ تم میں اتنی ہمت ہے کہ کئی جلدوں میں ان اوراق کی دھجیاں اڑا دو اور میرے کلام کے پرزے پرزے کر ڈالو۔'' اس بات کو بتاتا ہے کہ شیخ شمس الدین کے علمی کمالات کے غیر معمولی معترف تھے۔

اس تحریر کو صحیح مان لینے کی صورت میں ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ کس سن کی تحریر ہے۔ اس تحریر کے ایک فقرے ''حالانکہ تم ب عشرۂ ستر میں ہو'' سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تحریر اس وقت کی ہے جبکہ شیخ کی عمر ستر اور ساٹھ سال کے درمیان تھی۔ چونکہ ان کی وفات بعمر اڑسٹھ سال ۷۲۸ھ میں ہوئی ہے اور شعبان ۷۲۶ھ سے لے کر آخر وقت تک وہ قید رہے اور اس مدت میں کوئی غیر معمولی ہنگامہ پیش نہیں آیا اس لیے یہ تحریر ۷۲۶ھ سے پہلے ہی کی ہونی چاہیے۔ ممکن ہے کہ ابن الزہرا مالکی کے واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی ہو جو اسی سال ۷۲۶ھ میں پیش آیا تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ شیخ نے دمشق کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن تقریر کی۔ نزول باری پر بحث تھی۔ انہوں نے کہا: خدا عرش سے آسمان دنیا پر اسی طرح اترتا ہے جس طرح میں منبر کی ایک سیڑھی سے دوسری سیڑھی پر اترتا ہوں۔ ابن الزہرا مالکی نے فوراً کھڑے ہو کر انہیں سخت سست کہا جس کی وجہ سے سارا مجمع مشتعل ہو گیا اور ان کو بری طرح پیٹا۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ واقعہ فی نفسہٖ بہت افسوسناک تھا مگر اس میں امام موصوف کا کچھ دخل نہیں تھا۔ جو شخص نجم الدین کی مار برداشت کر لے اور حسینی قبیلے کے بار بار اصرار کرنے کے باوجود اس کا بدلہ لینے کی اجازت نہ دے کیا وہ ابن الزہرا مالکی کی ادنیٰ سی گستاخی

کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ صرف ابن الزہراء کی ناعاقبت اندیشی تھی کہ انہوں نے بھرے مجمع میں ان کے ساتھ گستاخی کی اور مجمع کو مشتعل کر دیا۔ مجمع ان کے اختیار سے بالکل باہر تھا اور وہ بالکل مجبور تھے۔

تحریر کے اعتراضات کا تجزیہ

اگر اس تحریر کا تجزیہ کیا جائے تو اس سے صرف تین بڑے بڑے اعتراضات امام موصوف پر عائد ہوتے ہیں:

(۱) ان کو فلسفہ، کلام اور منطق کتابوں میں انہماک تھا۔

(۲) وہ اپنی تعریف اور توصیف کرتے تھے اور بزرگوں کی تذلیل اور تحقیر کرتے تھے۔

(۳) ان کے پیرو زندیق، منافق اور جاہل تھے۔

ان اعتراضات پر الگ الگ بحث کرنے سے پہلے ہم کو چاہیے کہ شیخ شمس الدین ذہبی کے کردار اور ان کے مزاج اور اخلاق و عادات کو بھی پیش نظر رکھیں۔ شیخ موصوف ایک بلند پایہ محدث اور فن رجال کے امام تھے۔ محدثین کی طرح فلسفہ، کلام، منطق اور دیگر علوم عقلیہ کے پڑھنے پڑھانے کو گمراہی اور ضلالت کا ایک بہت بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ طبعی طور پر نیک اور نرم دل تھے۔

مناظروں اور مجادلوں سے ہمیشہ بچتے رہتے تھے۔ ابوعلی ابن سینا، ابن رشد، غزالی، رازی، ابن عربی اور دوسرے فلسفیوں اور صوفیوں کے نظریات و خیالات سے متفق نہیں تھے۔ تاہم گزرے ہوئے لوگوں کے خلاف جا یا بیجا تنقید کرنا انہیں پسند نہیں تھا۔ وہ گزرے ہوئے لوگوں کے خلاف امام موصوف کی شدید نکتہ چینیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر ایک فرقے کے ساتھ رواداری اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے جب کبھی امام موصوف اور ان کے حریفوں کے درمیان کشمکش شروع ہو جاتی تھی تو وہ طرفین کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

پہلا اعتراض

پہلا اعتراض اس حیثیت سے صحیح ہے کہ صرف انہی علوم معقولہ میں انہماک گمراہی اور

ضلالت کا موجب ہوتا ہے کیونکہ ان کی بنیاد یونانی اصول پر رکھی گئی تھی۔ جن میں سے اکثر کو بطور مسلم اور بدیہی دلائل کے تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اب ان کے تسلیم کر لینے کے بعد مجبوراً شرعی تعلیمات کو کھینچ تان کر ان اصول کے مطابق لانا پڑتا تھا۔ اور جب ان کے اندر مطابقت نہیں ہوتی تو وہ شرعی تعلیمات کی بیجا تاویلات پر اتر آتے تھے۔ ہمارے فلاسفہ متقدین و متاخرین نے عقائد وغیرہ میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں وہ انہیں اصول کے مان لینے کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین کا طبقہ ان علوم کی مخالفت کرتا ہوا چلا آتا تھا۔ مگر محض مخالفت سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا تھا تاوقتیکہ ان کو پڑھ کر ان کے غلط اصولِ مسلمہ کی تردید نہ کی جائے۔ مسلمان فلاسفہ نے اسی غرض سے ان کو پڑھا مگر وہ ان اصول کی تردید نہیں کر سکے بلکہ جہاں تک ہوسکا شریعت اور فلسفے میں تطبیق دینے لگے اور بیجا تاویلات سے کام لینے لگے۔

امام ابن تیمیہ بھی ان علوم کی گمراہیوں سے پورے طور پر واقف تھے۔ امام موصوف نے برسوں تک صرف حدیث ورجال اور تفسیر کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے بعد جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا۔ انہوں نے دوسرے علوم کی طرف بھی توجہ کی۔ ان کی حالت یہ تھی کہ جو کتاب بھی ان کو مل جاتی اس کو ایک مرتبہ ضرور پڑھ لیتے تھے۔ چاہے وہ کسی فن ہی کی کیوں نہ ہو۔ ان کو ارسطو کے مقالۃ اللام کا نادر اور نایاب نسخہ ملا تو اس کو بھی پڑھا۔ وہ ہر ایک کتاب کو اس دلچسپی سے پڑھتے تھے کہ گویا وہ خاص ذوق کی چیز ہے۔ اس لیے صرف فلسفہ کلام اور منطق کی کتابوں میں انہماک کا الزام صحیح نہیں ہے اگر ان علوم میں انہماک ہو تو دوسرے بھی اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ آخر غزالی اور رازی بھی تو اسی جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ شیخ شمس الدین نے ان کے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اگر امام موصوف نے ان عقلی علوم میں دخل دیا تو کہاں تک ان کی گمراہیوں کی تردید کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ ان کی ہر کتاب یونانی فلسفہ کے زہر کی تریاق بنی ہوئی ہے۔ درء تعارض العقل و النقل اور کتاب الرد علی المنطقیین میں تو یونانی فلسفہ وکلام اور منطق کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ اہل یونان کے بارے میں امام موصوف نے جو رائے دی تھی قریب قریب وہی باتیں آج یورپ کے فلاسفہ اور منطقیین دہرا رہے ہیں اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ امام موصوف نے تمام علما سے بڑھ کر ان علوم کی

گمراہیوں کا مقابلہ کیا اور بہت سی غلط باتوں کی تردید میں کامیابی حاصل کی۔

دوسرا اعتراض

جہاں تک امام موصوف کی موجودہ مطبوعہ و قلمی تصانیف کا تعلق ہے۔ان میں کہیں بھی اپنی تعریف وتوصیف نظر نہیں آتی۔البتہ مخالفین کے دلائل کو بہت سختی کے ساتھ توڑا ہے اور اکثر سخت لہجہ استعمال کیا ہے۔اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنی تعریف وتوصیف کرتے تھے۔ یہ سخت لہجہ بھی کسی کبر و غرور کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ حق کی حمایت کے جوش میں وہ ایسا کر بیٹھتے تھے۔ اور یہی درشتگی اور سختی سب لوگوں کو ناگوار گزرتی تھی۔ورنہ وہ طبعاً خاکسار اور متواضع تھے۔

پڑھانے کے وقت بھی اکثر ان کا لہجہ بہت سخت ہو جایا کرتا تھا۔چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ فلسفہ اور علم کلام کے بعض مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔اس وقت ان کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔انہوں نے جوش میں آکر کہا کہ اگر رازی اس وقت موجود ہوتا تو اسی چھڑی سے اس کی خبر لیتا۔اس نے اسلام کے مسائل کو صحیح طور پر نہیں سمجھا۔اور کتابیں لکھ کر لوگوں کو گمراہ کر دیا۔

تیسرا اعتراض

شیخ شمس الدین کا تیسرا اعتراض اس لحاظ سے صحیح نہیں ہے کہ ہر ایک بڑے آدمیوں کے پیروؤں میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔عقیدت مندی خاص عالموں اور واقف کاروں یا مخلص خدمتگاروں ہی کا حصہ نہیں ہوتی۔ بہت سے جاہل بھی ایک بڑے آدمی کے عقیدت مند بن جاتے ہیں۔اور اس کی حمایت میں قتل وخون کر بیٹھتے ہیں۔اگر ان سے یہ افعال اس بڑے آدمی کے اشارے سے سرزد ہوں تو یقیناً اس بڑے آدمی کی مذمت کرنی چاہیے۔شیخ تقی الدین کے ساتھیوں اور دوستوں کی ایک بڑی لمبی فہرست ہماری نظر میں ہے۔ جن کے ناموں کے گنانے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ان کے ساتھیوں اور شاگردوں میں خود شمس الدین ذہبی کے علاوہ حافظ جمال الدین مزی، شیخ علم الدین برزالی، شیخ کمال الدین ابن الزملکانی، شیخ ابوبکر ابن قوام، شیخ جلال الدین قزوینی، تاج الدین فزاری، برہان الدین فزاری، حافظ ابن قیم، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن عبدالہادی وغیرہ ہیں۔ان میں سے ہر ایک کی

خود شیخ شمس الدین ذہبی نے تعریف کی ہے۔ عوام میں حسینی قبیلے کے لوگ تھے، جب یہ لوگ جوش میں آ کر قتل و خون پر آمادہ ہوئے تو امام موصوف نے ان کو پورے اصرار اور تہدید کے ساتھ روکا۔ اب رہے ان کے دوسرے دوست احباب تو وہ بھی اپنے کردار کے لحاظ سے برے نہیں تھے۔ انہوں نے کوئی ہنگامہ نہیں کیا۔ صرف ایک ناگوار واقعہ پیش آیا اور وہ ابن الزہرا مالکی کا تھا۔ صرف اس ایک واقعہ کی وجہ سے امام موصوف کے پیرؤوں کو زندیق، منافق اور جاہل کہنا ایک صریح ظلم ہے اور خاص اس وقت جب کہ ان کے اکثر و بیشتر پیرؤوں کے نام اور ان کے کردار تذکروں میں موجود ہیں اور آج بھی ہم ان کو اچھی طرح سے پرکھ سکتے ہیں۔ ہمارا دل ہرگز گواہی نہیں دیتا کہ یہ الفاظ شیخ شمس الدین ذہبی جیسے دیانت دار شخص کے قلم سے نکلے ہیں۔ ہماری رائے تو یہی ہے کہ یہ تحریر کسی دشمن کی ہے جو ان کے نام سے منسوب کر دی گئی ہے۔

شیخ عماد الدین واسطی کی تعریف

امام موصوف کے دوستوں میں شیخ عماد الدین واسطی (المتوفی: ۷۱۱ھ) بھی تھے۔ جن کی رائے ہم نے صوفیہ پر تنقید کے تحت بیان کر دی ہے۔ شیخ واسطی امام موصوف کے تمام تجدیدی اور تبلیغی کاموں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ وہ عمر میں امام ابن تیمیہ سے چار سال بڑے تھے۔ یہ شیخ تقی الدین ابو اسحاق ابراہیم بن علی بن احمد بن فضل الواسطی کے فرزند ارجمند تھے۔ شیخ تقی الدین واسطی ایک صالح اور عابد آدمی تھے۔ بغداد میں فقہ پڑھی تھی۔ پھر ملک شام آئے تھے اور دمشق کے مدرسۂ صالحیہ میں بیس سال تک درس و تدریس کی خدمات انجام دیں اور مدرسہ ابی عمر میں بھی کچھ مدت تک پڑھایا۔ آخر عمر میں مدرسۂ ظاہریہ کے شیخ الحدیث قرار پائے۔ ۶۹۲ھ میں انتقال کیا تھا۔

شیخ عماد الدین واسطی کی اٹھان ہی زہد و عبادت پر ہوئی تھی۔ ان پر صوفیوں کا گہرا رنگ چھا گیا تھا۔ چونکہ وہ نام نہاد صوفیوں کی بدعتوں اور گمراہیوں سے واقف تھے اس لیے وہ صوفیوں کے زمرے سے نکل گئے۔ اور کچھ دن تک فقہ اور کلام اور فلسفے کا مطالعہ کیا۔ یہاں بھی ان کو ایمان اور یقین کا مزہ نہیں آیا۔ جب امام موصوف کی درسگاہ میں پہنچے تو ان کے

وفور علم اور جوش بیان سے بے حد متاثر ہوئے۔ امام موصوف نے ان کو سیرت نبوی کے مطالعے کی ترغیب دی۔

شیخ عمادالدین حزامی قبیلے کے شیخ تھے۔امام موصوف کی صحبت میں بیٹھنے کے بعد انہوں نے اتحادیوں کے خلاف سخت لکھنا شروع کیا۔ چونکہ وہ گھر کے بھیدی تھے اس لیے ان کی تحریریں صوفیوں اور اتحادیوں کے دلوں میں تیر ونشتر بن کر چبھتی تھیں۔

جب امام موصوف مصر میں تھے تو انہوں نے ان کے ساتھیوں کو ایک بہت ہی لمبا خط لکھا جس کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں۔اس میں انہوں نے قسمیں کھا کر یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ آسمان کے گنبد کے نیچے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا نظیر دکھائی نہیں دیتا۔اور ان کے چہرے سے سنت کی روشنی ہویدا ہو رہی ہے۔

ابن الوردی کی تعریف

امام موصوف کی وفات کے بعد شیخ ابوحفص عمر بن الوردی الشافعی نے ایک مرثیہ لکھا ہے۔جس میں امام موصوف کے مختلف ذاتی اوصاف کو پیش کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

توفی وهو مسجون فريد
وليس له الى الدنيا انبساط

انہوں نے قید کی حالت میں وفات پائی اور وہ یگانۂ روزگار تھے۔انہیں دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ولو حضروه حين قضى لالفوا
ملائكة النعيم بد احاطوا

اور اگر لوگ ان کی وفات کے وقت حاضر ہوتے تو دیکھتے کہ جنت کے فرشتے ان کو گھیرے کھڑے ہیں۔

امام لا ولاية كان يرجوا
ولا وقف عليه ولا رباط

وہ ایسے امام تھے جن کو ولایت و امارت کی کوئی خواہش نہیں تھی اور نہ اوقاف یا

رباط کے ناظر تھے۔

ولاجارا کم فی کسب مال
ولم یعهد له بکم اختلاط

اور نہ مال کے کمانے میں انہوں نے تمہارا ساتھ دیا اور نہ اپنے لیے تمہارے ذریعے کوئی میل جول کا عہد کیا گیا۔

ففیم سجنتموه وغظتموه
اما لجزا اذیته اشتراط

پس کس وجہ سے تم نے ان کو قید کیا اور ان پر غیظ و غضب ظاہر کیا۔ کیا ان کی اذیت کے بدلے کے لیے کوئی شرط ہے۔

وسجن الشیخ لا یرضاه مثلی
ففیه لقدر مثلکم انحطاط

اور شیخ کے قید کرنے کو مجھ جیسا آدمی پسند نہیں کرسکتا کیونکہ اس میں تم جیسے لوگوں ہی کی توہین ہوتی ہے۔

ابن فضل اللہ العمری کی تعریف

شیخ شہاب الدین ابوالعباس احمد بن فضل اللہ العمری نے اپنی کتابوں میں کئی جگہ ان کی تعریف کی ہے اور پھر وفات کے بعد ایک مرثیہ لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امام موصوف مذاہب اربعہ کے جاننے میں یگانۂ روزگار تھے۔ اگر ان کی پیدائش کسی اور ملک میں ہوئی ہوتی تو ملک شام والے ان کے در پر جبہ سائی کرتے۔

واللّٰه لو انه فی غیر ارضکم
لکان منکم علی ابوابه زمر

خدا کی قسم! اگر وہ تمہاری سرزمین کے علاوہ کسی اور سرزمین میں ہوتے تو تمہاری جماعتیں ان کے دروازے پر پڑی رہتیں۔

قالوا قبرناه قلنا ان ذا عجب
حقا الكوكب الدرى قد قبروا

لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ان کو دفن کر دیا۔ہم کہتے ہیں یہ بڑے ہی تعجب کی بات ہے۔کیا واقعی انہوں نے چمکدار ستارے کو دفن کر دیا ہے۔

شیخ امین الدین کی تعریف

شیخ امین الدین عبدالوہاب بن سالار الشافعی نے بھی ایک مرثیہ لکھا ہے جس کا ایک شعر یہاں پیش کیا جاتا ہے

كان فى العلم والشجاعة فذا
وهو فى الزهد والعفاف يسود

وہ علم اور شجاعت میں یگانہ تھے۔زہد اور پاکدامنی میں وہ دوسروں کی سرداری کرتے تھے۔

شیخ دقوتی کی تعریف

شیخ تقی الدین ابوالثنا محمود بن علی الدقوتی (المتوفی: ۷۳۳ھ) نے کئی مرثیے لکھے ہیں۔ ان کے دو شعر پیش کیے جا چکے ہیں۔ایک مرثیہ میں وہ لکھتے ہیں:

مات الامام العالم الحبر الذى
بهداه عالم كل قوم يهتدى

ایک ایسے امام، عالم اور حبر کی موت ہوئی ہے جن سے ہر ایک قوم کا عالم ہدایت حاصل کرتا تھا۔

مات الذى جمع العلوم الى التقى
والفضل والورع الصحيح الجيد

وہ شخص مر گیا جس نے علوم اور تقویٰ و بزرگی و پرہیزگاری کو اپنے اندر جمع کر لیا تھا۔

ایک دوسرے مرثیہ میں لکھتے ہیں:

ملأت فضائله البلاد ففضله

كالشمس نور ضياء ها لا يكتم

ان کی بزرگیوں سے تمام شہر پر ہو گئے۔ ان کی بزرگی سورج کے مانند ہے جس کی روشنی چھپائی نہیں جا سکتی۔

ولقد دعوت الشعر يوم نعيه

فابى على فلم اطق اتكلم

اور میں نے ان کی وفات کے دن شعر کو بلایا مگر اس نے آنے سے انکار کیا جس کی وجہ سے میں کچھ نہیں بول سکا۔

اور ایک مرثیہ میں لکھتے ہیں:

مضى الزاهد الندب ابن تيمية الذى

اقرله بالعلم والفضل ضده

زاہد اور پرہیز گار ابن تیمیہ کا انتقال ہو گیا جس کے علم و فضل کا ان کے مخالف کو بھی اعتراض ہے۔

پھر امام موصوف کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وكنت تقى الدين معنى و صورة

قوولا وخير القول عندك جده

آپ معناً و صورتاً تقی الدین (دین کے بچانے والے) تھے آپ کہتے تھے مگر آپ کے نزدیک بہتر قول وہ تھا جس پر عمل بھی ہو۔

رحلت و خلفت القلوب جريحة

تذوب و جيش الصبر قد قل جنده

آپ رحلت کر چکے مگر ہمارے دلوں کو مجروح چھوڑ گئے ہمارے دل پگھل رہے ہیں اور صبر کی فوج کم ہو چکی ہے۔

وکنت البحر فوق الارض تمشی
فعاد البحر من تحت التراب

آپ ایک سمندر تھے جو زمین پر رواں تھے لیکن اب یہ سمندر زمین کے اندر چلا گیا ہے۔

شیخ تقی الدین الجعبری کی تعریف

شیخ تقی الدین ابو عبداللہ محمد بن سلیمان بن عبداللہ بن سالم الجعبری اپنے مرثیہ میں کہتے ہیں:

لست ابغی الحیاة بعد ولکن
بغیتی ان اموت فی الابرار

آپ کے بعد میں اپنی زندگی نہیں چاہتا لیکن میری خواہش یہ ہے کہ میری موت نیکوں کے اندر ہو۔

شیخ مقری کی تعریف

شیخ قاسم بن عبدالرحمٰن بن نصر المقری کہتے ہیں:

حبر لبیب اوحد فی عصرنا
سل ما تشاء له به اخبار

وہ عالم اور عقل مند تھے اور ہمارے زمانے میں یگانہ تھے۔ ان سے جو چاہو پوچھ لو۔ ان کو ہر ایک چیز کی خبر تھی۔

غلب الملوك مهاربة و شجاعة
ليث يهاب القاءه الكفار

ہیبت اور شجاعت کی وجہ سے وہ بادشاہوں پر غالب ہو گئے تھے۔ وہ ایسے شیر تھے جن کا مقابلہ کرنے سے کفار بھی ڈرتے تھے۔

حاز العلوم اصولها و فروعها
وبكل ما يروى له آثار

انہوں نے اصول وفروع تمام علوم پر عبور حاصل کرلیا تھا۔ ان کی ہر ایک بات کے لیے آثار موجود ہیں۔

شیخ احمد بن الحسن کی تعریف

شیخ شرف الدین ابوالعباس احمد بن الحسن بن القاضی الجبل کہتے ہیں:

نبیي احمد و کذا امامی
وشیخی احمد کالبحر طامی

میرا نبی احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور اسی طرح میرا امام بھی (بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ) ہے اور میرا شیخ احمد (ابن تیمیہ) سمندر کی طرح جوش مارنے والا ہے۔

و اسمی احمد ارجو بھٰذا
شفاعة سید الرسل الکرام

اور میرا نام احمد ہے اس کی وجہ سے مجھے سید الرسل الکرام (حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کی شفاعت کی امید ہے۔

شیخ مجیر الدین جوخی کی تعریف

شیخ مجیر الدین احمد بن الحسن بن محمد الخیاط الجوخی الدمشقی ان کے مختلف اوصاف کو گناتے ہوئے کہتے ہیں:

ماکنت احسب ان یوم وفاته
یبدو المصون وتهتك الاستار

میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ ان کی وفات کے دن گھروں کے اندر کی رہنے والیاں باہر نکل آئیں گی اور پردے چاک ہوجائیں گے۔

بکر النساء من الستور ثواکلا
ومن الخدور النهد الابکار

عورتیں ان کی وفات پر آہ وبکا کرتی ہوئی پردوں سے باہر نکل پڑیں اور نوجوان

اور باکرہ لڑکیاں پردوں سے باہر آگئیں۔

والناس امثال الجراد لهم علی
التابوت منه تهافت و دوار

اور لوگ ان کے جنازے پر ٹڈیوں کی طرح ٹوٹ پڑ رہے تھے اور اس کے اطراف چکر کاٹ رہے تھے۔

شیخ تبریزی کی تعریف

شیخ برہان الدین ابواسحاق ابراہیم بن الشیخ شہاب الدین احمد بن عبدالکریم التبریزی نے تین مرثیے لکھے ہیں۔ اور ہر ایک میں والہانہ طریقہ پر ان کے مختلف اوصاف حمیدہ کی تعریف کی ہے۔ ایک مرثیہ میں کہتے ہیں:

علوم واخلاق کرام و سود و
وجود و مجد باذخ و تواضع
وزهد و ایثار و تقوی و عفة
وتلك سجایا حازها وهو یافع

علوم و بزرگانہ اخلاق و سرداری و سخاوت و شرافت و تواضع و زہد و ایثار و تقویٰ و پاکدامنی یہ سب ایسی صفتیں ہیں جن کو انہوں نے نوجوانی ہی کے زمانے میں اپنے اندر پیدا کر لیا تھا۔

امام عظیم عالم و معلم
صبور شکور للمهیمن طائع
وأتاه ذوالعرش المجید مواهبا
ولیس لما یعطیه ذوالعرش مانع

وہ زبردست امام، عالم و معلم اور صبور و شکور تھے اور خدا کے فرمانبردار بندے تھے۔ خدائے ذوالعرش المجید نے ان کو بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں اور ذوالعرش جس کو دے اس سے منع کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔

كما فاق في الآفاق بالعلم والتقى
وشاع له في الناس ماهو شائع
كذالك لم يسمع بمثل جنازة الـ
امام تقي الدين احمد سامع
مشيعها ضاق الفضا بازدحامهم
ورصت بمن صلى عليه الجوامع

جس طرح آفاق میں ان کے علم اور تقویٰ کی شہرت ہو چکی تھی اور لوگوں میں ان کی سی بہت سی چیزیں شائع ہو چکی تھیں اسی طرح امام تقی الدین احمد کے جنازے کے جیسا کوئی دوسرا جنازہ کبھی نہیں سنا گیا۔ مشایعت کرنے والوں کے ہجوم سے ساری فضا تنگ ہو چکی تھی اور جامع مسجدیں نماز پڑھنے والوں سے کھچا کھچ بھر چکی تھیں۔

شیخ بدر الدین ماردینی کی تعریف

امام موصوف کی وفات پر شیخ بدر الدین محمد بن عزالدین ماردینی نے ایک بہت ہی زور دار مرثیہ لکھا تھا جس کے دو شعر ہم امام ابن تیمیہ کے حالات کی ابتدا میں نقل کر چکے ہیں۔ انہوں نے یہ مرثیہ بڑے دلی سوز کے ساتھ لکھا ہے اور امام موصوف کی وفات کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک زبردست سانحہ قرار دیا ہے۔ ان کے مختلف اوصاف کمال کا ذکر کرتے ہوئے وہ لوگوں سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کس نے دمشق اور ملک شام ومصر کو تاتاریوں کے حملے سے بچایا؟ کس نے کسروان کی سرکش قوم کو مطیع وفرمانبردار بنایا؟ کس نے بدعات کی بیخ کنی کی؟ کس نے سنتِ رسول کو زندہ کیا؟ کس نے نصرانیوں کے اعتراضات کا منہ توڑ جواب دیا؟ کس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکمِ الٰہی پر پوری طرح عمل کیا؟ ایسے شخص کو قید میں ڈال کر سخت سزائیں دینا اسلام کا ایک المناک حادثہ ہے۔ اس کی عظمت صرف اس ایک چیز سے ظاہر ہے کہ اس کے جنازے میں لوگوں کے کثرت اژدہام سے تمام راستے بند ہو گئے تھے۔ ملک شام کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا اکیلا جنازہ ہے، جس کی مثال

کہیں اور نہیں ملتی۔ اور کوئی شخص جنازے کے اندر شرکت کرنے والوں کی تعداد کو گن نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ان الاولی شهد و الصلوٰة و شیعوا
واللّٰه لا تحصیهم الاقلام

وہ لوگ جو جنازے کی نماز میں شریک ہوئے اور ان کی مشایعت کی۔ خدا کی قسم! ہمارے قلم ان کو شمار نہیں کر سکتے۔

طوالت کے خوف سے صرف چند مرثیوں کے جستہ جستہ اقتباسات دیئے ہیں۔ باقی کو ان پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

سلسلہ مدح وذم

امام ابن تیمیہ کی وفات کے بعد بھی ان کے متعلق مدح وذم کا سلسلہ جاری رہا، ہر زمانے میں متعصب علما وفقہاء بے جانے بوجھے ان کے متعلق بڑی افترا پردازیوں سے کام لے رہے تھے اور انہیں کافر اور زندیق کہنے سے بھی احتراز نہیں کرتے تھے۔ عقائد کے اختلاف کی بنا پر اشاعرہ کا گروہ ہمیشہ ان کی تصنیفات کو اپنے تیروں کا نشانہ بنا رہا تھا۔ چنانچہ ۸۳۵ھ میں دمشق کے اندر حنبلیوں اور اشعریوں کے درمیان عقائد کا جھگڑا ہوا۔ شیخ علاء الدین بخاری نے لکھا کہ جو شخص امام ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام لکھتا ہے وہ کافر ہے۔ شیخ ناصر الدین ابوعبداللہ شمس الدین محمد بن ابی بکر بن ناصر الدین الشافعی (المتوفی: ۸۴۲ھ) نے ان کی تردید میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام ”الرد الوافر علی من زعم ان من سمی ابن تیمیة شیخ الاسلام کافر“ رکھا جس میں امام ابن تیمیہ کے متعلق ان کے معاصر پچاسی علما کی رائیں اور تعریفیں نقل کیں۔ ان میں سے اکثر علما شافعی مسلک کے ہیں۔ اس رسالے میں شیخ الاسلام احمد بن علی بن محمد بن حجر الشافعی، قاضی القضاۃ شیخ الاسلام صالح بن عمر البلقینی الشافعی، قاضی القضاۃ عبدالرحمٰن التفہنی الحنفی، قاضی القضاۃ شمس الدین محمد بن احمد البساطی المالکی، قاضی القضاۃ نور الدین محمود بن احمد العینی الحنفی، قاضی القضاۃ ابو العباس احمد بن قاضی القضاۃ نصر اللہ بن احمد البغدادی المصری الحنبلی الحافظ المحدث ابو الوفاء ابراہیم

بن محمد بن خلیل الحلبی ، زین الدین ابوالنعیم رضوان بن محمد بن یوسف العقبی المصری الشافعی نے تقریظیں لکھی۔ ہر ایک نے امام ابن تیمیہ کی تعریف کی ہے اور ان کے مخالفین پر سخت تنقید کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اگر امام موصوف کے کوئی مناقب نہ بھی ہوتے تب بھی صرف ابن قیم جیسے ایک شاگرد کا ہونا ان کی بزرگی کے لیے کافی ہے۔ صالح بن عمر بلقینی نے لکھا ہے کہ دشمن محض حسد کی بنا پر ابن تیمیہ کو زندیق اور کافر کہتے ہیں۔ ان کی کتابوں سے اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ عبدالرحمٰن تھہنی حنفی نے لکھا ہے کہ ابن تیمیہ کو ابن قیم جیسا قابل اور لائق شاگرد ملا جس نے ان کے علم و فضل کی بڑی تعریف کی ہے۔ ابن تیمیہ مرگی والے کے کان میں کچھ پڑھ کر پھونک دیتے تھے تو وہ اچھا ہو کر اٹھ بیٹھتا تھا۔ خبیث روحیں انہیں دیکھ کر بھاگ جاتی تھیں۔ ایسے شخص کے متعلق شیخ علاؤ الدین بخاری کا یہ کہنا کہ ابن تیمیہ کافر اور مجوسی تھا۔ یہود و نصاریٰ اس سے بہتر تھے کیونکہ یہود و نصاریٰ کی ایک مخصوص کتاب ہے اور ابن تیمیہ کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ محض شیطانیت ہے۔ شیخ شمس الدین محمد بن احمد البساطی نے لکھا کہ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کی امامت کے ثبوت کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے متعلق جو متواتر خبریں نقل کی گئی ہیں وہی کافی ہیں۔ شیخ محمود بن احمد العینی الحنفی نے لکھا ہے کہ جو شخص ابن تیمیہ کو کافر یا زندیق کہتا ہے وہ خود کافر اور زندیق ہے۔ بڑے بڑے علما کی شہادتوں کے باوجود ان کو کافر کہنے والا شخص یا تو جاہل ہے یا پاگل ہے۔ پہلے کی سزا روسیاہی اور قید ہے تا آنکہ وہ توبہ نہ کرے اور دوسرے کی سزا پٹائی کر کے اس کے دماغ کو درست کرنا ہے۔ قاضی القضاۃ ابوالعباس احمد بن نصر اللہ البغدادی الحنبلی نے لکھا کہ ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام کہنے والوں کو کافر قرار دینے والے نے ایک ایسی بات کہی ہے جس سے رجوع کر کے توبہ کرنا بے حد دشوار ہے۔ اس کی توبہ اس وقت تک قبول نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ تمام علما اس کو معاف نہ کر دیں جن کو اس نے کافر گردانا ہے اور یہ قیامت تک کے لیے ناممکن ہے۔ حکام وقت کو چاہیے کہ ایسے شخص کو خوب تنبیہ کریں تاکہ آیندہ اس کی طرف سے اس قسم کا برا اقدام نہ ہو۔ حافظ و محدث ابوالوفاء ابراہیم الحلبی اور زین الدین ابوالنعیم رضوان الشافعی نے بھی امام ابن تیمیہ کی تعریفیں کی ہیں اور ان کے مخالف پر سخت تنقیدیں کی ہیں۔

اسی زمانے میں یعنی رجب ۸۳۵ھ میں کسی نے آٹھ شعر میں سید العارفین شیخ سراج الدین ابوحفص عمر بن ابی البرکات موسیٰ الحمصی المخزومی الشافعی سے امام ابن تیمیہ کو کافر گردانے والے کے متعلق فتویٰ پوچھا۔ تو انہوں نے ایک رات اور دن کے ایک حصے میں ۹۷ شعر میں اس کا جواب دیا۔ اور لکھا کہ ابن تیمیہ کے زمانے میں ستر سے زیادہ چنے ہوئے مجتہد موجود تھے، ان میں سے کسی نے بھی ان پر کفر کا فتویٰ جاری نہیں کیا اور نہ انہیں جھوٹا کہا۔ سب کا اس بات پر اجماع تھا کہ وہ علوم کے سمندر تھے۔ ان کی تصانیف ہر جگہ پھیل چکی ہیں ایسے شخص کے متعلق کفر کا فتویٰ جاری کرنا کافر بنانے والے کی بے علمی اور جہالت کا پتہ دیتا ہے۔ کیا ہم لوگوں میں اتنی غیرت اور حمیت بھی باقی نہیں رہی ہے کہ اس قسم کے کافر گردانے والے کی ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دیں۔ ایسے لوگوں کو درحقیقت تحقیقی علم کی بو باس بھی نصیب نہیں ہوئی۔ انہوں نے محض غصہ میں آ کر ایک زبردست عالم اسلام کو کافر قرار دیا ہے۔ [1]

اس کے بعد جب ابن حجر مکی (المتوفی: ۹۷۴ھ) نے ابن عربی وغیرہ پر سخت تنقیدیں کرنے کی بنا پر ابن تیمیہ کے متعلق بہت ہی سخت اور نازیبا الفاظ استعمال کیے اور ان کو عبد خذله الله واضله و اعماه واصمه واذله ''وہ بندہ جس کو خدا نے رسوا اور گمراہ کر دیا تھا اور اس کو اندھا اور بہرا اور ذلیل بنا دیا تھا'' سے تعبیر کیا۔ [2] تو ان کے اس فتوے کی وجہ سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی بنا پر بغداد کے مشہور عالم خیر الدین نعمان آلوسی زادہ (المتوفی: ۱۳۱۷ھ) نے ''جلاء العینین فی محاکمة الاحمدین'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اور ابن حجر کی بے اصل اور بے بنیاد افترا پردازیوں کا ایک ایک کر کے جواب دیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ ابن حجر مکی کے شاگرد رشید ملا علی قاری (المتوفی: ۱۰۱۴ھ) نے اپنے استاد کی رائے کے بالکل مخالف رائے دی ہے۔ انہوں نے مشکوٰۃ کی شرح میں ابن تیمیہ اور ابن قیم کو اس اُمت کے اولیاء میں قرار دیا ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:

ومن طالع شرح منازل السائرين تبين له انهما كانا من

---

[1] مجموع الدرر: ۹۰، ۹۵۔ [2] الفتاویٰ الحدیثیه، ص: ۸۶۔

اکابر اهل السنة والجماعة ومن اولیاء هذا الامة۔ [1]

”جو بھی منازل السائرین کی شرح کا مطالعہ کرے گا اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وہ دونوں (یعنی ابن تیمیہ اور ابن قیم) اہل سنت والجماعت کے اکابرین سے تھے اور اس امت کے اولیاء میں سے تھے۔“

ایسے بزرگوں کی پرجوش تحریروں کے باوجود امام ابن تیمیہ کے متعلق غلط فہمیاں پھیلتی رہی ہیں۔ اور محض سنی سنائی باتیں نقل ہوتی رہی ہیں۔ کسی کو اتنی زحمت اُٹھانے کی توفیق نہیں ہو سکی کہ خود امام موصوف کی تصنیفات کا براہ راست مطالعہ کر کے جواب لکھیں۔ اور لطف یہ ہے کہ بعض کو حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ ابن حجر مکی کے درمیان تمیز نہیں ہو سکی۔ ایک صاحب نے کسی کتاب میں لکھا ہوا دیکھا کہ ابن حجر نے ابن تیمیہ کی خوب خبر لی ہے اور یہ سمجھا کہ اس سے مراد ابن حجر عسقلانی ہیں جو بخاری کے مشہور شارح اور فتح الباری کے مصنف ہیں۔ چونکہ ان کی کتاب الدرر الکامنہ آٹھویں صدی ہجری کے علما کے تذکرے پر مشتمل ہے اور یہ خیال کیا کہ غالباً ابن حجر نے اس کتاب میں ابن تیمیہ کی خوب خبر لی ہو گی۔ اس لیے صاف لکھ دیا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب الدرر الکامنہ میں ابن تیمیہ کی خوب خبر لی ہے۔ اس شخص نے اتنی زحمت گوارا نہیں کی کہ وہ کسی جگہ سے الدرر الکامنہ کو حاصل کر کے دیکھ لیتا کہ حقیقت کیا ہے۔ ابن حجر عسقلانی نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں امام موصوف کی بڑی تعریف کی ہے۔ ابن حجر مکی نے اپنی کتاب الفتاویٰ الحدیثیہ میں ابن تیمیہ کے خلاف لکھا تھا۔ اس الزام کو حافظ ابن حجر عسقلانی کے سر نادانستہ تھوپا گیا ہے۔ جن سے وہ بالکل بری ہیں۔

ہندوستان میں بھی ان کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی جاتی رہی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (المتوفی: ۱۱۷۶ھ) نے ان کو دور کرنے کی بڑی حد تک کوشش کی۔ چنانچہ جب شیخ مخدوم معین الدین ٹھٹھالی نے امام ابن تیمیہ کے معتقدات وخیالات کے متعلق شاہ صاحب کی رائے پوچھی تو صاف لکھا:

فانا قد تحققنا من حاله انه عالم بكتاب الله و معانيه

---

[1] مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، تحت الرقم: ۴۳۴۰۔

اللغوية والشرعية وحافظ لسنة رسول اللّٰہ ﷺ و آثار السلف عارف لمعانيهما اللغوية والشرعية استاد فى النحو واللغة و محرر لمذهب الحنابلة فروعه و اصوله فائق فى الذكاء ذولسان و بلاغة فى الذب عن عقيدة اهل السنة لم يؤثر عنه فسق ولا بدعة۔ اللهم الاهذه الامور التى ضيق عليه لا جلها و ليس شى منها الا ومعه دليله من الكتاب والسنة وآثار السلف فمثل هذا الشيخ عزيز الوجود فى العلم و من يطيق ان يلحق شاوه فى تحريره و تقريره والذين ضيقوا عليه ما بلغوا معشار ما آتاه اللّٰه تعالٰى و ان كانه تضئقه ذلك ناشئا من اجتهاد و مشاجرة العلما فى مثل ذلك ما هى الا كمشاجرة الصحابة رضى اللّٰه تعالٰى عنهم فيما بينهم والواجب فى ذلك كف اللسان الا بخير۔

ہم نے ان کے حالات سے تحقیق کی ہے کہ وہ کتاب اللہ اور اس کے لغوی اور شرعی معانی کے عالم تھے۔ سنت رسول اللہ ﷺ وآثار سلف کے حافظ اور ان کے لغوی وشرعی معانی کے عارف تھے۔ نحو اور لغت کے اُستاد تھے۔ مذہب حنابلہ کے اصول وفروع کے مضبوط کرنے والوں میں سے تھے۔ ذکاوت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ بڑے چرب زبان اور بلیغ تھے۔ انہوں نے اہل سنت کے عقائد کی طرف مدافعت کی ہے۔ ان سے فسق و بدعت کی کوئی بات منقول نہیں ہے۔ ہاں البتہ یہ باتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے ان پر سختی کی گئی تھی۔ لیکن ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ کتاب وسنت اور آثار سلف کی کوئی دلیل موجود نہ ہو۔ علم میں ان کے جیسا شیخ کہیں پایا نہیں جاتا۔ اور کون ایسا ہے جو تقریر وتحریر میں ان سے لگا کھا سکے، جن لوگوں نے ان پر سختی کی تھی ان کو اس علم کا عشر عشیر بھی نہیں ملا تھا جو ان کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا۔

ان پر سختی ان کے اجتہاد کی بنا پر ہوئی تھی۔ اس جیسی باتوں میں علما کا آپس میں جھگڑا ایسا ہی ہے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان پیش آیا تھا۔ ایسی باتوں میں زبان کو روکنا واجب ہے۔ وہی کہنا چاہیے جو بہتر ہو۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کی شہادت کے بعد کسی مزید شہادت کی ضرورت نہیں ہے۔

مدراس کو بھی امام ابن تیمیہ کے معتقدات وخیالات کی تردید کا شرف حاصل ہے۔ اس لیے کہ جب نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے امام موصوف کے عقائد وخیالات کی تائید میں کتابیں اور رسالے لکھنے شروع کیے تو محکمہ عالیہ حیدر آباد دکن کے مفتی الحاج محمد سعید مدراسی نے التنبیہ بالتنزیہ کے نام سے ۴۳۶ صفحوں کی ایک کتاب لکھی جو ۱۳۰۹ھ میں مطبع محبوب شاہیہ حیدر آباد سے شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی کتاب کو ایک مقدمہ، سات ابواب اور ایک خاتمے پر تقسیم کیا تھا۔ ان کا استدلال زیادہ تر احمد بن یحییٰ الحلبی الکلابی جیسے مصنفین کی کتابوں سے تھا جس کی کافی تردید اس کتاب میں ہو چکی ہے تاہم نجدی عالم احمد بن ابراہیم بن عیسیٰ نے بھی تنبیہ النبیہ والغبی فی الرد علی المدراسی والحلبی کے نام سے ۱۳۲۰ھ میں ایک کتاب لکھی تھی جس میں الحاج محمد سعید مدراسی کے پیش کیے ہوئے دلائل کی ایک ایک کر کے تردید کی ہے جس کسی کو تفصیل جاننے کی خواہش ہو وہ اس کتاب کو دیکھ سکتا ہے جو مجموع الدرر کے چوتھے رسالے کی حیثیت سے مطبع کردستان العلمیہ مصر سے ۱۳۲۹ھ میں شائع کی گئی ہے۔

تصنیفات

امام ابن تیمیہ کی زندگی کے آخری تین سال مختلف ہنگاموں سے پر رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ ان کی زبان اور انکا قلم رات دن چلتا تھا اور تھکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ انہوں نے کسی وقت بھی محض تصنیف کی غرض سے کوئی کتاب یا کوئی رسالہ نہیں لکھا بلکہ وہ وقتی حالات سے مجبور ہو کر لکھتے تھے۔ انہوں نے یا تو ہنگامہ خیز اختلافی مسائل کے متعلق اپنے خیالات کی ترجمانی کی ہے یا لوگوں کے سوالات کا جواب دیا ہے۔ یا کسی کی تحریک پر شیعوں، نصرانیوں، اتحادیوں، فلسفیوں اور منطقیوں وغیرہ کی تردید لکھی ہے، یا بتقضائے وقت دوسرے لوگوں کے نام خطوط لکھے ہیں۔ چونکہ وہ کسی ایک جگہ پر مقیم نہیں رہے اس لیے ان کی تحریروں کو ایک جگہ جمع کر کے نہیں رکھا گیا۔ کسی کو بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے کتنا لکھا اور ان کی تصنیفات کی کیا تعداد ہے۔ بعض نے تین سو بعض نے پانچ سو اور بعض نے ایک ہزار سے زیادہ تصنیفات کا اندازہ لگایا ہے۔ مگر یہ سب اپنا اپنا اندازہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام موصوف بہت تیز لکھا کرتے تھے۔ ان کے سامنے حوالے کی کتابیں نہیں ہوتی تھیں۔ ان کا دماغ خود ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جس کی بنا پر ان کو حوالوں کے تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کوئی ان کے پاس سوال لے کر آتا اور وہ وہیں بیٹھے بیٹھے تھوڑی دیر میں اس کا جواب لکھ کر دے دیتے تھے۔ العقیدۃ الحمویۃ الکبری چھپن صفحوں کا ایک رسالہ ہے جس کو انہوں نے ظہر اور عصر کی نماز کے درمیان لکھا تھا۔ اسی طرح ایک شخص حروف قرآن کے قدیم یا حادث ہونے کے متعلق ایک سوال لے کر آیا اور چاہتا تھا کہ اسی وقت اس کا جواب مل جائے تو انہوں نے ایک ہی نشست میں چون صفحوں کا جواب لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔ [1]

---

[1] مجموع الرسائل والمسائل: ۳/ ۸۸۔

جو شخص اتنا تیز لکھ سکتا ہو تو ظاہر ہے کہ اس کی تصنیفات بھی بہت زیادہ ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن عبدالہادی لکھتے ہیں کہ میں نے ائمہ متقدمین ومتاخرین میں سے امام موصوف سے زیادہ یا ان کے قریب قریب اتنی زیادہ تصنیفات کرنے والا کسی کو نہیں پایا۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے محض اپنی یاد سے بہت سی کتابیں اور رسالے املا کروائے تھے۔ ان کی بہت سی کتابیں قید خانے کے اندر لکھی ہوئی ہیں جبکہ ان کے پاس حوالہ جات کی ضروری کتابیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ [1]

بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص ان کے پاس ایک سوال لے کر پہنچتا تھا۔ اگر اس مسئلہ پر پہلے سے کوئی جواب لکھا ہوا موجود ہوتا تو اسے نقل کروا کے دے دیتے یا نئے سرے سے ان کو جواب لکھنا ہوتا تھا۔ وہ کبھی مختصر جواب دے دیتے اور کبھی تفصیل سے کام لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسئلہ پر ان کے بڑے چھوٹے مختلف رسالے پائے جاتے ہیں، کبھی تو ایسا ہوتا کہ ایک شخص ان کے پاس سوال لے کر آتا وہ کہتے کہ میں نے اس مسئلہ پر پہلے بھی لکھا ہے۔ اپنے ساتھیوں سے کہتے کہ اس کی نقل اتار کر سائل کے حوالے کر دیں اور اگر کوئی اس معاملے میں سستی کرتا تو اصل نسخہ ہی اس کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ بعض وقت ان کے ساتھی اور شاگرد اصل نسخے کے دینے سے کتراتے تھے اس خیال سے کہ کہیں اصل نسخہ ہی سائل کے حوالے نہ کر دیں۔

امام موصوف کے شاگردوں میں سے ایک ابوعبداللہ بن رشیق مغربی بھی تھے جنہوں نے ۷۴۹ھ میں وفات پائی۔ وہ امام موصوف کے خط کے عادی تھے۔ اور ان کی طرح بہت تیز لکھتے تھے۔ جب کبھی امام موصوف کو کسی تحریر یا رسالے کی تلاش کرنی ہوتی تھی تو وہ انہی سے مدد لیتے تھے۔ [2]

آخر زمانے میں امام موصوف کو قرآن مجید کی تفسیر وتشریح کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی تھی تو انہوں نے لکھا کہ قرآن مجید کے بعض مقامات صاف اور واضح ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ ان کو مفسرین نے اپنی کتابوں میں حل کر دیا ہے۔ بعض وہ ہیں جن کی تفسیر اب بھی سمجھ

---

[1] العقود الدریہ:٢٦۔ [2] البداية والنهاية: ١٤/ ٢٢٩۔

میں نہیں آتی۔ ان کے حل کرنے کیلئے ایک شخص کئی تفسیریں پڑھ جاتا ہے اس کے باوجود ان کا حل سمجھ میں نہیں آتا۔ بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ مفسرین کے اسلوب کے اختلاف کی وجہ سے ان کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک اس کو اپنے نہج پر پیش کرتا ہے اور دوسرا اپنے انداز سے اس کی تشریح کرتا ہے۔ میں اسی قسم کی مشکل آیتوں کی تفسیر کرنا چاہتا ہوں اور ان پر دلائل قائم کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ دوسری آیتوں کی بہ نسبت ان مشکل آیات کی تفسیر کرنی ضروری ہے۔ جب کسی ایک مشکل آیت کے معانی صاف اور واضح ہو جائیں تو پھر ان کے نظائر کی تفسیر بہت آسان ہو جاتی ہے۔ اس مرتبہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر قرآن مجید کے معانی اور اصول علم کی بعض ایسی باتیں کھول دی ہیں جن کے سمجھنے کی علما آرزو کیا کرتے تھے۔ اب مجھے افسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو چھوڑ کر دوسرے علوم پر میں نے اپنا وقت کیوں برباد کیا۔ [1]

جب آخری مرتبہ قید میں ڈالے گئے تو امام موصوف کے ساتھیوں اور دوستوں کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں حکومت کی طرف سے ان کی تلاشی نہ لی جائے۔ اور ان کے پاس کی تمام کتابیں ضبط نہ کر لی جائیں۔ اس لیے جس کے پاس جو چیز بھی اس کو چھپا دیا اور کسی پر یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ اس کے پاس بھی امام موصوف کی کوئی تحریر ہے۔ اگر ان کی کوئی کتاب یا رسالہ چوری ہو جاتا تو بھی وہ کسی سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں حکومت کی طرف سے ان پر گرفت نہ ہو اور وہ سزا پا جائیں۔

امام موصوف نے آخری قید میں بہت کچھ لکھا جس پر حریفوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ کل چودہ بستے تھے۔ انہی میں سے ایک قرآن مجید کی مشکل آیتوں کی تفسیر بھی تھی۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ اس کی چالیس جلدیں تھیں۔ بعض نے پچاس کا اندازہ لگایا ہے۔

زیارت قبور سے متعلق بھی امام موصوف نے کئی رسالے لکھے تھے۔ اور قاضی تقی الدین اخنائی کی تردید کی تھی۔ یہ سب ضبط کر لیے گئے تھے۔ تقریباً چودہ سال حکومت کے قبضے میں رہے۔ جب امیر سیف الدین قطلو بغا الفخری دمشق کا نائب ہو کر آیا تو اس نے کتابوں کے واپس لینے کی کوشش کی وہ امام موصوف اور ان کی جماعت کے چاہنے والوں میں سے تھا۔ اس

---

[1] العقود الدریۃ: ۲۷۔۲۸۔

نے ۱۳ رجب ۷۲۶ھ کو ہفتے کے دن قاضی القضاۃ شیخ تقی الدین ابوالحسن علی بن عبدالکافی سبکی کو بلا بھیجا اور کہا کہ امام موصوف کی تمام ضبط شدہ کتابیں لے آیئے۔ قاضی موصوف امام موصوف کے سخت مخالفین میں سے تھے۔ اور طلاق اور زیارت قبور کے متعلق امام موصوف کے خلاف رسالے لکھ چکے تھے۔ انہوں نے امام موصوف کی کتابوں کی مذمت کرنی شروع کی اور کہا کہ ان میں زیارت قبر نبوی سے متعلق غلط مسائل سمجھائے گئے ہیں۔ امیر فخری نے جواب دیا کہ امام موصوف اللہ اور اس کے رسول کو تم سے بہتر جانتے تھے۔ جب اس پر قاضی موصوف نے کتابوں کے دینے سے کترانا شروع کیا تو امیر موصوف نے انہیں معزول کر دینے کی دھمکی دی۔ وہ بادل ناخواستہ کتابیں اٹھا لائے اور امیر موصوف کے حوالے کر دیں۔ امیر موصوف نے امام موصوف کے بھائی شیخ زین الدین عبدالرحمٰن ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کو بلا بھیجا اور یہ تمام کتابیں ان دونوں کے حوالے کر دیں۔ جن کو پا کر یہ دونوں بے حد خوش ہو گئے اور امیر موصوف کا دلی شکریہ ادا کیا۔ [1]

امام موصوف کی تحریروں کا موضوع فقہ و فلسفہ و کلام و منطق اور تصوف کے خاص خاص مسائل تھے چونکہ ایک ایک مسئلے پر انہیں کئی مرتبہ لکھنا پڑا تھا اس لیے ان تمام کتابوں میں ان مسائل ہی کی بار بار تکرار نظر آتی ہے۔ مگر ان مخصوص مباحث کے سلسلے میں وہ بہت سے ضمنی مباحث پر بحث کرنے کے کچھ اس طرح عادی ہو گئے تھے کہ وہ اپنے خاص موضوع سے ہٹ کر بلا قصد و ارادہ تفسیر و حدیث اصول کے بہت سے لطیف نکات بیان کرتے چلے جاتے تھے۔ ہر ایک مسئلہ پر قرآن و حدیث سے دلیلیں قائم کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں غیر معمولی زور پیدا ہو جاتا تھا۔ ان کی تمام تحریروں پر خطابت کا رنگ غالب تھا۔ ایک خطیب جس طرح ایک خاص موضوع کو شروع کر کے بات میں بات پیدا کرتا چلا جاتا ہے اسی طرح وہ اپنی تحریروں میں بھی ایک بات سے دوسری بات پیدا کرتے چلے جاتے تھے۔ ان کا انداز بیان اتنا صاف اور واضح ہوتا ہے کہ ان کے خیالات کے سمجھنے میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

---

[1] البدایہ و النہایة: ١٤/ ١٩٧۔

حافظ ابن عبدالہادی نے امام موصوف کی تصنیفات کی ایک فہرست العقود الدریہ میں دی ہے۔اس میں زبانی ترتیب کا کوئی خیال نہیں رکھا ہے۔ بلکہ یہ لکھا ہے اگر خدا نے چاہا تو ایک مکمل فہرست تیار کروں گا۔اور یہ بتاؤں گا کہ ان میں سے کون سی کتابیں مصر میں اور کونسی کتابیں دمشق میں لکھی گئی ہیں اور کون سی کتابیں قید کی حالت میں اور کونسی کتابیں آزادرہ کر لکھی ہیں۔اوران کو ایک اچھی ترتیب پر مرتب کروں گا۔ [1] اب پتہ نہیں کہ وہ اپنے اس ارادے پر عمل کر سکے یا نہیں۔

امام موصوف کی بعض تصنیفات چھپ گئی ہیں بعض قلمی ہیں اور اکثر کتابوں اور رسالوں کا نام تذکروں میں ملتا ہے مگر کہیں ان کا پتہ نہیں چلتا۔اس لحاظ سے ہم ان کی تصنیفات کو تین قسموں پر منقسم کرتے ہیں۔(۱) مطبوعہ (۲) قلمی اور (۳) نایاب لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ قلمی اور نایاب کتابوں میں بعض کے نام بدلے ہوئے ہیں۔ممکن ہے کہ ان میں سے بعض وہی ہوں جو دوسرے نام سے چھپ چکی ہیں یا قلمی موجود ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض قواعد فتاوی کے مجموعے میں داخل کیے جا چکے ہوں۔ہم ذیل میں ان کی اجمالی فہرست پیش کرتے ہیں۔

مطبوعہ تصانیف

ذیل میں ان تصنیفات کی ایک مختصر فہرست دی جاتی ہے جو چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

(۱) فتاوی ابن تیمیہ

یہ امام موصوف کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو پانچ جلدوں میں قاہرہ سے شائع ہوا ہے۔ بعض نے ان کو فقہی ترتیب پر مرتب کیا تھا اور اس کا نام الدرر المضیئہ من فتاوی ابن تیمیہ رکھا تھا۔پہلی اور دوسری جلد ۱۳۲۶ھ میں، تیسری ۱۳۲۸ھ میں اور چوتھی اور پانچویں ۱۳۲۹ھ میں شائع ہوئی ہے۔فتاوی کی پانچویں جلد تین ضخیم رسالوں پر مشتمل ہے (۱)کتاب التسعینیہ (۲)کتاب السبعینیہ (۳)شرح عقیدة الاصفہانیہ

[1] العقود الدرية، ص: ١٦٤۔

(۲) اقامة الدليل على بطلان التحليل

یہ ۳۹۰ صفحات کا ایک ضخیم رسالہ ہے جو فتاویٰ ابن تیمیہ کی تیسری جلد میں چھپا ہے۔ اس میں حلالہ کے مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس کے باطل ہونے پر دلیلیں قائم کی ہیں۔

(۳) كتاب الاختيارات العلميه

شیخ علاء الدین ابوالحسن علی بن محمد بن عباس البعلی الحنبلی نے فقہی ترتیب پر ان تمام مسائل کو یکجا کر دیا تھا جن کو امام موصوف نے جمہور سے الگ ہو کر اپنی انفرادی رائے کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کی ہے۔ یہ فتاویٰ ابن تیمیہ کی چوتھی جلد میں چھپی ہے اس کے کل صفحات ۳۲۰ ہیں۔

(۴) الصارم المسلول على شاتم الرسول

رجب ۶۳۹ھ میں امیر عساف کے نصرانی کاتب نے آنحضرت ﷺ کی شان میں بعض گستاخیاں کی تھیں جس پر ایک ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ اس کی تفصیل پہلے دی جا چکی ہے۔ امام موصوف نے اس کتاب میں قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں گالی دینے والے کے متعلق تفصیلی بحث کی ہے جو چھ سو صفحوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ۱۳۲۲ھ میں دائرہ المعارف حیدر آباد سے شائع ہوئی ہے۔

(۵) الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح

یہ مطبع نیل مصر سے چار ضخیم جلدوں میں چھپی ہے۔ اس میں صیدا اور انطاکیہ کے پادری پال کی ایک کتاب کا تفصیلی جواب ہے۔ پہلی جلد ۱۳۲۲ھ میں دوسری، تیسری اور چوتھی ۱۳۲۳ھ میں شائع ہوئی ہے۔ پہلی جلد کی ضخامت ۴۰۰ دوسری کی ۳۶۸ھ میں تیسری کی ۳۲۰ اور چوتھی کی ۳۳۶ ہے۔

(۶) منهاج السنة النبوية فى نقض كلام الشيعة والقدرية

اس میں شیخ جمال الدین ابن مطہر الحلی الشیعی (المتوفی: ۷۲۶ھ) کی ایک کتاب منہاج الکرامہ فی معرفۃ الامامہ کا تفصیلی جواب ہے یہ اپنے موضوع پر ایک بے نظیر کتاب

ہے۔ان کے بعد جتنی بھی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں ان سب میں یہ ممتاز ہے۔پہلی دو جلدیں ۱۳۲۱ھ میں اور دوسری دو جلدیں ۱۳۲۲ھ میں مطبع کبریٰ امیریہ بولاق مصر سے شائع ہوئی ہیں، پہلی جلد کی ضخامت ۲۷۶، دوسری کی ۲۶۲، تیسری کی ۲۷۸ اور چوتھی کی ۲۹۸ ہے۔

(۷) درء تعارض العقل والنقل

اس کتاب میں عقل اور نقل کے اندر مطابقت دی ہے اور بتایا ہے کہ اسلامی عقائد و تعلیمات عقل کے مطابق ہیں۔ یہ کتاب منہاج السنہ کے حاشیہ پر چھپی ہے۔اس کا دوسرا نام بیان موافقۃ المعقول والمنقول بھی ہے۔

(۸) مجموعۃ الرسائل الکبریٰ

یہ ان رسائل کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔دو ضخیم جلدوں میں مطبع عامرہ شرفیہ مصر سے ۱۳۲۳ھ میں شائع ہوا ہے۔پہلی جلد کی ضخامت ۴۷۵ صفحے اور دوسری کی ۴۰۰ صفحے ہے۔پہلی جلد میں کل بارہ چھوٹے بڑے رسالے ہیں اور دوسری میں سترہ رسالے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

پہلی جلد

(۱) الفرقان بین الحق و الباطل (۲) معارج الوصول (۳) التبیان فی نزول القرآن (٤) الوصیة الصغری (٥) النیة فی العبادات (٦) الرسالة العرشیه (۷) الوصیة الکبری (۸) الارادة والامر (۹) العقیدة الواسطیه (۱۰) المناظره فی العقیدة الواسطیه (۱۱) العقیدة الحمویة الکبری (۱۲) الاستغاثه۔

دوسری جلد

(۱) الاکلیل فی المتشابه والتاویل (۲) رسالة فی ان الحلال متعذر (۳) فی زیارة بیت المقدس (٤) مراتب الإراده (٥) القضاء والقدر

(٦) الاحتجاج بالقدر (٧) درجات اليقين (٨) بيان الهدى من الضلال (٩) فی سنته الجمعة (١٠) تفسير المعوذتين (١١) بيان العقود المحرمة (١٢) معنى القياس (١٣) حكم السماع والرقص (١٤) الكلام على الفطرة (١٥) الكلام علىٰ القصاص (١٦) الكلام على رفع الامام الحنفى يديه فى الصلوة (١٧) فى مناسك الحج۔

پہلی جلد کے ابتدائی دونوں رسالے آخری قید کی حالت میں لکھے گئے تھے۔ الوصیۃ الصغری کا رسالہ شیخ ابوالقاسم قاسم بن یوسف بن محمد التجیبی السبتی کی درخواست پر لکھا گیا تھا۔ الوصیۃ الکبری درحقیقت شیخ عارف ابوالبرکات عدی بن مسافر الاموی کے پیروؤں کے نام ایک کھلا خط ہے جس میں ان کی بعض بدعتوں پر تنقید کی ہے اور ان کو صحیح اسلام پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے۔ الارادۃ والامر کا رسالہ شوال ۷۱۴ھ میں لکھا گیا ہے۔ یہ درحقیقت ایک سوال کا جواب ہے۔ جو مصر سے ان کے پاس دمشق بھیجا گیا تھا۔ المناظرہ فی العقیدۃ الواسطیہ نائب دمشق امیر افرم کی مجلس مناظرہ کی روداد ہے۔

(٩) مجموع الرسائل

یہ دو جلدیں نو رسائل کا مجموعہ ہیں پہلی جلد کی ضخامت ۱۲۲ صفحے ہے۔ اس میں چھ رسالے ہیں۔ دوسری کی ضخامت ۹۲ صفحے ہے۔ اس میں تین رسالے ہیں۔ یہ دونوں جلدیں ۱۳۲۳ھ میں مصر سے شائع ہوئی ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

پہلی جلد

(۱) العبودیۃ (۲) الواسطۃ بین الخلق والحق (۳) رفع الملام عن الائمۃ الاعلام (۴) تنوع العبادات (۵) الرد علی النصیریۃ (۶) زیارۃ القبور والاستنجاد بالقبور۔

دوسری جلد

(۱) معارج الوصول الی معرفۃ ان اصول الدین وفروعہ قد بینھا الرسول (۲) المظالم المشترکہ (۳) الحجۃ فی الاسلام

العبودیة بندگی کے متعلق ایک سوال کا تفصیلی جواب ہے۔ بندگی اور عبادت کے علاوہ اس میں محبت الٰہی اور فنافی اللہ پر بھی نفیس بحث کی ہے۔ دوسری جلد کا پہلا رسالہ وہی ہے جو مجموعۃ الرسائل الکبری کی پہلی جلد کا دوسرا رسالہ ہے۔ الحسبة فی الاسلام میں ایک محتسب کے شرعی فرائض سے بحث کی ہے۔

(۱۰) مجموعۃ الرسائل والمسائل

پانچ جلدوں میں مطبع منار مصر سے شائع ہوا ہے۔ پہلی جلد ۱۳۴۱ھ میں اور باقی جلدیں ۱۳۴۹ھ میں چھپی ہیں۔ پہلی کی ضخامت ۲۳۲ صفحے، دوسری کی ۱۰۰ صفحے، تیسری کی ۱۶۶ صفحے، چوتھی کی ۱۳۸ صفحے اور پانچویں کی ۲۳۲ صفحے ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

پہلی جلد

(۱) الهجر الجميل والصفح الجميل الصبر الجميل (۲) الشفاعة الشرعيه والتوسل الى اللّٰه (۳) اهل الصفة (٤) ابطال وحدة الوجود والرد على القائلين بها (٥) مناظرة ابن تيميه مع الرفاعية (٦) لباس الفتوة والخرقة عند الصوفية (٧) كتاب ابن تيميه الى نصر بن سليمان المنبجى(٨) مسئلة صفات اللّٰه تعالىٰ وعلوه على خلقه (٩)فتاوى فقهيه۔

دوسری جلد

فی احكام السفر والا قامه

تیسری جلد

(۱) كتاب مذهب السلف القويم فى تحقيق مسئلة كلام اللّٰه الكريم

(۲) فتاوى فقهية۔

چوتھی جلد

(۱) حقيقة مذهب الاتحاديين او وحدة الوجود و بيان بطلانه

بالبراهين النقليه والعقليه (٢) عرش الرحمٰن۔

پانچویں جلد

(١) قاعدة فی المعجزات والکرامات (٢) تفصیل الاجمال فیما یجب للّٰه من صفات الکمال (٣) العبادات الشرعیه والفرق بینها وبین البدعیه (٤) فتیا فی الغیبة (٥) اقوم ماقیل فی المشئیة والحکمة والقضاء والقدر و التعلیل و بطلان الجبر و التعطیل (٦) شرح حدیث عمران بن حصین کان اللّٰه ولم یکن شی قبله (٧) قاعدة فی جمع کلمة المسلمین ووجوب اعتصامهم بحبل اللّٰه المتین (٨)المذهب الصحیح الواضح فی مسئلة الجوائح۔

مناظرہ ابن تیمیہ مع الرفاعیہ: ۷۰۵ھ کے مشہور مناظرے کی روداد ہے جو رفاعیوں کے ساتھ پیش آیا تھا اس کی تفصیل اس کتاب میں آچکی ہے۔ کتاب ابن تیمیہ الی نصر بن سلیمان المنبجی: وہ مشہور خط ہے جو انہوں نے ۷۰۴ھ میں مصر کے صوفی شیخ نصر بن سلیمان المنبجی کو لکھا تھا اور جو آیندہ ہنگاموں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

(۱۱) (١) الرسالة التسعینیة (٢) الرسالة السبعینیه (٣) شرح العقیدة الاصبهانیه

یہ تین مختلف ضخیم رسالے ہیں جو فتاوی ابن تیمیہ کی پانچویں جلد میں شائع ہوئے ہیں۔ ابتدائی دونوں رسائل میں کلامی مسائل کی تفصیلی بحث ہے۔ تیسرا رسالہ شیخ شمس الدین محمد بن محمود بن محمد بن عبدالکافی الاصبہانی (ولادت ٦١٦ھ۔ وفات ٦٨٨ھ) کے عقیدے کی شرح ہے۔ ۷۱۲ھ میں جبکہ امام موصوف مصر میں تھے بعض حضرات نے العقیدۃ الاصبہانیہ کی شرح لکھنے کی درخواست کی۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اس کی بعض تعبیرات سے ان کو اختلاف ہے۔ اگر وہ اس کی شرح لکھیں گے۔ تو اس اختلاف کو بھی ظاہر کرنا پڑے گا۔ جب لوگوں نے زیادہ مجبور کیا تو اس کی شرح لکھی اور جا بجا اس پر تنقید بھی کی ہے۔

(۱۲) کتاب الرد علی المنطقیین

امام موصوف ابتدا ہی سے علم منطق کی اہمیت کے قائل نہیں تھے۔ ۷۰۷ھ اور ۷۰۹ھ کے درمیان جبکہ وہ اسکندریہ میں قید تھے بعض منطقی ماہرین سے اس فن کے متعلق بحث ہوئی۔ انہوں نے اس فن کی کمزوریاں دکھائیں۔ اور جب ۷۱۲ھ میں مصر سے دمشق آئے اور منطقیوں کی لاف زنی دیکھی تو انہیں اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس میں نہ صرف منطق کے بنیادی اصول و مسلمات پر کاری ضرب لگائی ہے بلکہ مدت سے اس کی جو دھاک لوگوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی اس کو کافور کر دیا ہے۔ امام موصوف نے بتایا ہے کہ یونانی اور اسلامی طرز فکر میں کتنا بنیادی فرق ہے۔ اور اسلامی طرز فکر کو کیا فضیلت حاصل ہے۔ یہ کتاب شرف الدین کتبی نے شائع کر دی ہے۔ اس پر حضرۃ الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کا ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی ہے۔

(۱۳) کتاب الایمان

ایمان اور اسلام کے معنی اور مطلب پر قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک متکلمانہ بحث کی ہے۔ پہلے ایمان اور اسلام کا فرق بتایا ہے۔ اور اس سلسلے میں حقیقت اور مجاز پر بحث کی ہے پھر یہ بتایا ہے کہ اس میں امام ابوالحسن اشعری کا کیا مسلک تھا۔ پھر ایمان کے متعلق جہمیہ کے خیالات کی تردید کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں۔ پھر اس پر بحث کی ہے کہ قرآن اور سنت میں مطلق ایمان کے کیا معنی ہیں ایمان کے گھٹنے اور بڑھنے کے متعلق اہل اسلام کا کیا اختلاف ہے؟ اور یہ بتایا ہے کہ اس سلسلے میں مختلف فرقوں نے عقائد کے متعلق کیا کیا غلطیاں کی ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۲۵ھ میں مطبع معادہ مصر سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے کل صفحات ۱۹۰ ہیں۔

(۱۴) جواب اھل العلم والایمان فی ان سورۃ الاخلاص تعدل ثلث القرآن

اس کتاب میں اس حدیث کے معنی اور مطلب پر ایک لطیف بحث کی ہے کہ سورۂ

اخلاص قرآن مجید کے ایک تہائی حصہ کے برابر ہے۔ یہ درحقیقت سورۂ اخلاص کے متعلق کہ آیا وہ قرآن مجید کے ایک تہائی حصے کے برابر ہے ایک سوال کا تفصیلی جواب ہے۔ امام موصوف سے دریافت کیا گیا تھا کہ اگر خدا کا کلام ایک دوسرے کے ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے تو پھر بعض کو بعض پر فضیلت اور ترجیح کیوں دی جاتی ہے۔ کیا اس تفاضل سے خدا کے اسماء وصفات میں تفاضل لازم نہیں آئے گا؟ کیا خدا کے اسماء وصفات میں تفاضل جائز ہے؟ اگر کسی نے تفاضل ثابت کیا ہے تو اس کے وجوہ کیا ہیں؟ امام موصوف نے قرآن وحدیث اور عقلی دلائل کی روشنی میں ان تمام سوالات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ یہ کتاب مطبع تقدم مصر سے ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوئی ہے اس کی ضخامت ۱۳۲ صفحے ہے۔

(۱۵) کتاب اقتضاء الصراط المستقیم فی مخالفة اصحاب الجحیم

امام موصوف نے اس کتاب میں اہل کتاب اور کفار و مشرکین کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے اور ان کے رسوم و بدعات میں شرکت کرنے کی ممانعت پر کتاب وسنت اور اجماع سلف سے ایک مدلل تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی طرف سے یا کسی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کفار کی عیدوں میں شرکت کرنے اور ان سے مشابہت پیدا کرنے سے منع کیا تھا۔ اور اس پر شرعی دلائل پیش کیے تھے اور یہ بیان کیا تھا کہ اہل کتاب اور جاہل کفار کی اتباع سے احتراز کرنے میں کیا شرعی دلائل پیش کیے تھے اور یہ بیان کیا تھا کہ اہل کتاب اور جاہل کفار کی اتباع سے احتراز کرنے میں کیا شرعی حکمت ہے اور اہل کتاب اور عجمیوں کی مخالفت کرنے کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے۔ یہ شریعت کے قواعد میں سے ایک عظیم الشان قاعدہ ہے اور شریعت کے کثیر الفروع اصول میں سے ایک جامع اصل ہے۔ میں نے جہاں تک ہو سکا اس قاعدے اور اصل کی طرف توجہ دلائی اور سوال کا جواب لکھا جس کی نقل اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہے۔ اس سے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچا مگر اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض لوگ ان باتوں پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں اور اس کو بعید از عقل سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کو زمانہ دراز سے ان رسوم کی کچھ

ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ وہ جلدی سے ان کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ بعض لوگوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اس بارے میں کچھ اور لکھوں تا کہ اس مسئلے میں یہ اصل بن جائے۔ اور اس سے لوگوں کو فائدہ ہو۔ اس لیے میں نے یہ کتاب لکھی۔"

اس کتاب سے امام موصوف کے زمانے کے مسلمانوں کی طرز معاشرت پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں کیا کیا بدعتیں مسلمانوں میں رائج ہو گئی تھیں۔ یہ کتاب ۱۳۲۵ھ میں مطبع شرفیہ مصر سے شائع ہوئی۔ اس کی ضخامت ۲۲۲ صفحے ہے۔

(۱۶) کتاب النبوات

نبوت وسحر اور معجزات وکرامات پر ایک تفصیلی بحث کی ہے۔ ۱۳۴۶ھ میں مطبع منیریہ مصر سے شائع ہوئی۔ اس کی ضخامت ۳۰۰ صفحے ہے۔

(۱۷) السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ

یہ اسی صفحوں کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں حاکم ومحکوم اور راعی ورعایا کے فرائض بیان کیے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ اداء امارات و احوال اور فے وزکوٰۃ کیونکر ہونی چاہیے اور لوگوں کے درمیان کیونکر فیصلے کرنے چاہیے اور ان پر کس طرح حدود جاری کرنے چاہیے۔ یہ رسالہ ۱۳۲۲ھ میں مطبع منیریہ مصر سے شائع ہوا۔

(۱۸) تفسیر سورۃ الاخلاص

اس میں سورۂ اخلاص کی تفسیر کی گئی ہے۔ ۱۳۲۳ھ میں مطبع حسینیہ مصر سے شائع ہوئی۔ اس کی ضخامت ۱۴۰ صفحے ہے۔

(۱۹) تفسیر سورۃ النور

اس میں سورۂ نور کی تفسیر کی گئی ہے ۱۳۴۳ھ میں مطبع منیریہ مصر سے شائع ہوئی۔ اس کی ضخامت ۱۳۲ صفحے ہے۔

(۲۰) مجموعہ تفسیر شیخ الاسلام ابن تیمیہ

اس میں چھ سورتوں یعنی الاعلیٰ، الشمس، اللیل، العلق، البینۃ،

الکافرون کی تفسیر ہے۔ عبدالصمد شرف الدین نے ایک مقدمے کے ساتھ ۱۳۷۴ھ بمطابق ۱۹۵۴ء میں بمبئی سے شائع کیا۔ اس کی ضخامت تقریباً پانچ سو صفحے ہے۔

(۲۱) الکلم الطیب من اذکار النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روزانہ وظائف اور اذکار کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۴۹ھ میں مطبع قیمہ بمبئی سے شائع ہوئی۔ اس کی ضخامت ۱۰۴ صفحے ہے۔

(۲۲) قاعدة جلیلة فی التوسل والوسیلة

اس کتاب میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء وصالحین سے وسیلہ پکڑنا جائز ہے یا نہیں۔ ۱۳۲۷ھ میں مطبع منار مصر سے شائع ہوئی۔ اس کی ضخامت ۲۰۰ صفحے ہے۔

(۲۳) الرسالة القبرصیة

یہ تیئیس صفحوں کا ایک چھوٹا سا خط ہے، جس کو امام موصوف نے قبرص کے عیسائی بادشاہ کے نام لکھا تھا اور اس سے درخواست کی تھی کہ دھوکے سے قید کیے ہوئے عاجز مسلمانوں کو رہا کر دیا جائے۔ ۱۳۱۹ھ میں مطبع موید مصر سے شائع ہوا۔

(۲۴) الفرقان بین اولیاء الرحمٰن واولیاء الشیطان

یہ اٹھاسی صفحوں کا ایک رسالہ ہے جس میں خدا اور شیطان کے دوستوں کی صفتیں بیان کی ہیں اور ان کے درمیان تمیز کرنے کا طریقہ بیان کیا ہے۔ ۱۳۱۰ھ میں مطبع عالیہ مصر سے شائع ہوا۔

(۲۵) رسالة الاجتماع والافتراق فی الحلف بالطلاق

یہ چوبیس صفحوں کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں یہ بحث کی گئی ہے کہ اگر کوئی طلاق کی قسم کھالے تو وہ اس کا کفارہ ادا کر سکتا ہے یا نہیں۔ ۱۳۴۲ھ میں مطبع منار مصر سے شائع ہوا۔

(۲۶) اربعون حدیثا

شیخ امین الدین محمد بن ابراہیم الوانی نے امام موصوف سے چالیس حدیثوں کی تخریج کی

تھی۔ جس میں امام موصوف نے ہر ایک حدیث کے اندر اپنے استاد کا نام و نسب دیا ہے اور اس حدیث کی سماعت کی تاریخ بھی دی ہے۔ ۱۳۴۱ھ میں مطبع سلفیہ مصر سے شائع ہوا۔ اس کی ضخامت ۵۰ صفحے ہے۔

(۲۷) مجموعة الرسائل المنيرية

مطبع منیریہ مصر نے ۱۳۴۳ھ اور ۱۳۴۶ھ میں تین جلدیں شائع کی ہیں۔ جن میں دوسرے مصنفین کے رسائل کے ساتھ امام ابن تیمیہ کے حسب ذیل آٹھ رسالے پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض رسالے الگ طور پر بھی چھپے ہیں۔ (۱) تفسیر سورۃ الکوثر، پانچ صفحے۔ (۲) علم الظاہر والباطن، چوبیس صفحے (۳) العقل والروح، تیس صفحے (۴) صفۃ الکلام، باون صفحے (۵) ایضاح الدلالہ فی عموم الرسالہ، چھپن صفحے (۶) خلاف الامہ فی العبادات، تیس صفحے۔ (۷) توحد الملۃ وتعدد الشرائع وتنوعہا (۸) شرح حدیث ابی ذر۔

(۲۸) التحفة العراقية فى اعمال القلبية

یہ اڑسٹھ صفحوں کا ایک رسالہ ہے جو مطبع منیریہ مصر سے شائع ہوا ہے۔ اس میں اصول ایمان، قواعدِ دین، محبت الٰہی، حب رسول، توکل علی اللہ، اخلاص فی الدین، شکر اور صبر جیسے اعمال قلوب پر ایک لطیف بحث کی ہے۔

(۲۹) الصوفية والفقراء

یہ بتیس صفحوں کا ایک رسالہ ہے جو مطبع منار مصر سے ۱۹۲۸ھ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں صوفیہ اور فقرا کے احوال سے بحث کی ہے۔

(۳۰) الرسالة المدنية فى تحقيق المجاز والحقيقة

یہ دس صفحوں کا ایک رسالہ ہے جو حافظ ابن قیم کی مشہور کتاب اجتماع جیوش الاسلامية على غزو المعطلة والجهمية کے آخر میں از صفحہ ۱۳۵ تا ۱۴۴ بطور تتمے کے چھپا ہے۔

(۳۱) شرح حديث انما الاعمال بالنيات

یہ تیس صفحوں کا ایک رسالہ ہے جو مطبع منیریہ مصر سے شائع ہوا ہے۔ اس میں حدیث انما الاعمال بالنیات پر بحث کی ہے۔

(۳۲) الرسالة التدمریه

یہ ۱۲۹ صفحوں کا ایک ضخیم رسالہ ہے جو ۱۳۲۵ھ میں مطبع حسینیہ مصر میں چھپا ہے۔ اس میں اسماء و صفات الٰہی پر متکلمانہ بحث کی گئی ہے۔ اس کا دوسرا نام تحقیق الاثبات للاسماء والصفات و بیان حقیقة الجمع بین القدر و الشرع بھی ہے۔

(۳۳) تلخیص کتاب الاستغاثة المعروف بالرد علی البکری

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کرنے کے متعلق فقیہ نور الدین بکری کے خیالات کی تردید کی ہے۔ ۱۳۴۶ھ میں مطبع سلفیہ مصر سے شائع ہوئی ہے۔ اس کی ضخامت ۴۰۰ صفحے ہے۔

(۳۴) کتاب الرد علی الاخنائی

یہ رسالہ کتاب الاستغاثہ کے حاشیہ پر چھپا ہے۔ اس میں قاضی تقی الدین اخنائی مالکی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

(۳۵) برہان کلام موسیٰ

یہ بتیس صفحوں کا رسالہ ہے، جو مطبع محمدی لاہور سے ۱۸۷۹ء میں چھپا ہے۔

(۳۶) شرح حدیث النزول

انما انزل القرآن علی سبعة احرف کی حدیث کے متعلق ایک استفتا کا تفصیلی جواب ہے۔ مطبع قرآن وسنت امرتسر سے ۱۱۶ صفحوں میں شائع ہوا ہے۔

(۳۷) الرسالة البعلبکیة

یہ اڑتالیس ۴۸ صفحوں کا ایک رسالہ ہے جو ۱۳۲۸ھ میں ابن سینا، غزالی، رازی اور ابن عربی وغیرہ کے رسائل کے ساتھ مطبع کردستان العلمیہ مصر سے شائع ہوا ہے۔ اس میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ جبرئیل یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ کا کلام نہیں

ہے۔

(۳۸) الرد علی فلسفة ابن رشد

یہ چودہ صفحوں کا ایک مختصر رسالہ ہے جس کو مطبع رحمانیہ مصر نے شائع کیا ہے۔ اس میں ان مناقشات کو جمع کر دیا گیا ہے جو امام موصوف نے اپنی کتاب درء تعارض العقل والنقل میں ابن رشد پر کیے تھے۔

(۳۹) قاعدة فی القرآن (۴۰) رسالة فی القرآن هل هو کلام الله او کلام جبرئیل (۴۱) رسالة فی القرآن هل کان القرآن حرفا وصوتا (۴۲) رسالة فی القرآن ان الکلام غیر المتکلم (۴۳) رسالة فی الکلام

ان پانچوں رسالوں میں کلامی مباحث ہیں۔ یہ جامع البیان کے حاشیہ پر چھپی ہیں جو نامی پریس دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

(۴۴) بحث حرف لو

یہ ایک نحوی بحث ہے جس کو شیخ جلال الدین سیوطی (المتوفی: ۹۱۱ھ) نے اپنی کتاب الاشباہ والنظائر میں نقل کیا ہے۔

(۴۵) رساله جهاد

اس میں تاتاریوں کے ساتھ لڑنے کی مسلمانوں کو ترغیب دی ہے۔ حافظ ابن عبدالہادی نے اس کو اپنی کتاب العقود الدریہ میں نقل کر دیا ہے۔

(۴۶) منظومة فی القدر

کہا جاتا ہے کہ شیعہ عالم شیخ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر بن ابی القاسم الہمدانی المعروف بالسکاکینی (المتوفی: ۷۲۱ھ) نے مسئلہ تقدیر کے متعلق ایک سوال ذمی کی زبان سے نقل کیا تھا اور اس کو امام موصوف کے پاس بھیجا تھا۔ لیکن شعرانی نے اپنی کتاب الیواقیت والجواہر (صفحہ ۱۶۰) میں لکھا ہے کہ یہ سوال شیخ صدرالدین قونوی سے کیا گیا تھا۔ اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ اس سوال کا ناظم کوئی اور شخص ہے بہت ممکن ہے کہ جبر کے متعلق ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں جو رسالہ پایا جاتا ہے اس کا سوال سکاکینی ہی کا لکھا ہوا ہو۔ یہ سوال بھی نظم میں ہے۔ مطبوعہ رسالہ میں جو سوال پیش کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

یا علماء الدین ذمی دینکم
تحیر دلوه باوضح حجة
اذا ماقضی ربی بکفری بزعمکم
لم یرضه منی فما وجه حلیتی
دعانی و سد الباب عنی فهل الی
دخولی سبیل بینوا لی قضیتی
قضی بضلالی ثم قال ارض بالقضا
فها انا راض بالذی فیه شقوتی
فان کنت بالمقضی یا قوم راضیا
فربی لا یرضی بشوم بلیتی
فهل لی رضا ما لیس یرضاه سیدی
فقد حرت دلونی علی کشف حیرتی
اذا شاء ربی الکفر منی مشیئة
فهل انا عاص في اتباع المشیئة
وهل لی اختیار ان اخالف حکمه
فباللّٰه فاشفوا بالبراهین غلتی

”اے دین کے عالمو! تمہارے دین کا ایک ذمی شخص متحیر اور پریشان ہو گیا ہے۔ تم کھلی دلیل سے اس کی رہبری کرو۔ جب تمہارے خیال کے مطابق میرے پروردگار نے میرے کفر کا فیصلہ کر دیا ہے اور وہ میرے کفر سے بھی راضی نہیں ہے تو پھر میرے بچ نکلنے کی کیا تدبیر ہے؟ مجھے بلایا اور پھر مجھ پر

دروازہ بند کر دیا۔تو کیا میرے لیے اندر داخل ہونے کی کوئی سبیل ہے؟ میرا قضیہ بیان کر دو۔اس نے میری گمراہی کا فیصلہ کیا اور پھر یہ کہا کہ تقدیر کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ۔لیکن میں اس چیز سے راضی نہیں ہوں جس میں میری بدبختی ہے۔اے لوگو! اگر میں تقدیر کے فیصلے پر راضی بھی ہو جاؤں تو میری بدنصیبی پر میرا پروردگار مجھ سے راضی نہیں ہوتا۔تو پھر کیا میں ایسی چیز سے راضی ہو سکتا ہوں جس سے میرا آقا راضی نہیں ہے؟ اسی لیے میں حیران ہو گیا ہوں۔تم لوگ میری حیرت کے دُور کرنے میں میری رہبری کرو۔جب میرا پرودگار ہی مجھ سے کفر چاہتا ہے تو پھر کیا اس کی مشیت کی پیروی کر کے میں گنہگار ہو سکتا ہوں؟ اور کیا مجھے اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کا اختیار حاصل ہے۔پس خدا کے واسطے دلائل کے ذریعہ میری پیاس بجھاؤ۔''

تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ جب یہ سوال استفتاء کی شکل میں امام موصوف کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے اسی وقت جواب لکھنا شروع کیا۔حاضرین یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ نثر میں اس کا جواب لکھ رہے ہیں۔مگر ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب انہوں نے دیکھا کہ وہ نظم ہی میں اس کا جواب لکھ رہے تھے۔اور انہوں نے اسی قافیہ اور ردیف میں ایک سو چوراسی شعر میں اس کا جواب دیا۔یہ سوال و جواب دونوں العقود الدریہ میں منقول ہیں۔یہ رسالہ الگ طور پر بھی چھپا ہے۔ذیل میں ان کے جواب کے کچھ اشعار بھی دیے جاتے ہیں جس سے ان کے جواب کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے وہ لکھتے ہیں:

سوالك یا هذا سوال معاند
تخاصم رب العرش باری البریته
وهذا سوال خاصم الملأ لعلی
قدیما به ابلیس اصل البلیة

اے شخص! ترا سوال ایک معاند کا سوال ہے تو عرش کے مالک اور مخلوق کے پروردگار سے جھگڑا کر رہا ہے۔اور یہ وہ سوال ہے جس کو پرانے زمانہ میں ابلیس

نے جو تمام مصیبتوں کی جڑ ہے ملاء اعلیٰ کے سامنے پیش کیا تھا۔

واصل ضلال الخلق من کل فرقه
هو الخوض فی فعل الا له بعلة
وذاك سوال يبطل العقل وجهه
وتحريمه قدجاء فی کل شرعة

اور ہر فرقے کے لوگوں کی گمراہی کی جڑ خدا کے فعل میں غور و خوض کرنا اور علت اور سبب کا تلاش کرنا ہے اور یہ ایسا سوال ہے جس کی صورت کو عقل باطل قرار دیتی ہے اور ہر ایک شریعت میں اس کی حرمت کی ممانعت آئی ہے۔

اس کے بعد مختلف اشعار میں بتایا ہے کہ مجوسی اور قدیم ملحد فلاسفہ کیونکر گمراہ ہوئے اور ان کے سیدھے راستے سے بھٹکنے کی کیا وجہ تھی۔ پھر یہ کہا ہے کہ رضا بالقضا ان مصیبتوں کے ساتھ ہے جو ہم پر اپنے جرم کے بغیر آتی ہیں۔ لیکن مکروہ افعال تو ان سے خدا بھی ہرگز راضی نہیں ہے چنانچہ کہتے ہیں:

واما رضانا بالقضاء فانما
امرنا بان نرضی بمثل المصيبة
کسقم و فقر ثم ذل و غربة
وما کان من سوء بدن و جريمة
فاما الافاعيل التی کرهت لنا
فلا ترتضی مسخوطة لمشيئة

اب رہا ہمارا تقدیر سے راضی ہونا تو بے شک ہم کو یہ حکم ملا ہے کہ ہم مصیبتوں پر راضی ہوں جیسے بیماری، محتاجی، ذلت اور غربت اور وہ برائی جو ہمارے جرم کے بغیر سرزد ہوئی ہو لیکن وہ افعال جو ہمارے لیے مکروہ قرار دیئے گئے ہیں تو خدا ان سے راضی نہیں ہوتا۔ خدا کی مشیت میں بھی یہ افعال مبغوض ہیں۔

اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ جو لوگ نیک بخت ہوتے ہیں وہ خدا کی طرف رجوع کرتے

ہیں اور اسی سے ہدایت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اور جو بدبخت ہوتے ہیں ان میں ہدایت پانے کی طرف کوئی میلان نہیں ہوتا۔ ان کے دلوں پر کفر والحاد کے جوں کے توں پردے پڑتے جاتے ہیں۔ ایسوں کو توبہ بھی نصیب نہیں ہوتی اور اسی کفر اور انکار پر ان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں خدا کی طرف میلان نہ ہونے کی وجہ سے خدا بھی ان کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت نہیں دیتا۔

قلمی تصانیف

امام موصوف کی کچھ قلمی تصانیف کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ مگر وہ دھیرے دھیرے چھپ کر منظر عام پر آتی جارہی ہیں۔ ذیل میں ان کی بعض اہم تصنیفات کو گنایا جاتا ہے:

(۱) مناظرات ابن تیمیه مع المصریین والشامیین

یہ پانچ سو آٹھ صفحوں کی ایک ضخیم کتاب ہے جس کا قلمی نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں ہے۔ یہ محمد بن حسن بن عبداللہ بن موسیٰ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے علی بن محمد بن عبدالوہاب کے لیے اس نسخہ کو نقل کیا تھا۔ اس کی کتابت ۱۲۱۴ھ میں ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ان مناظرات کی تفصیل ہے جو عقائد سے متعلق امام ابن تیمیہ نے مصر و شام کے علما سے کیے تھے۔ اس کی تفصیل فتنہ عقائد کے عنوان کے تحت دی جا چکی ہے۔

(۲) رساله ابن تیمیه فی الرد علی من ادعی الجبر

یہ نوے صفحوں کا ایک رسالہ ہے۔ کسی نے جبر و قدر کے متعلق امام ابن تیمیہ سے حسب ذیل سوال کیا تھا۔

یا ایها الحبر الذی علمهٔ و فضله فی الناس مذکور
کیف اختیار العبد افعالهٔ والعبد فی الافعال مجبور
لانهم قدر صرحوا انهٔ علی الارادات لمقصور
ولم یکن فاعل افعالهٔ حقیقة والحکم مشهور
ومن هنالم یك للفعل فی، ما یلحق الفاعل تاثیر

وما تساوت دليل لهٗ فى صحة المحكى تقدير
وكل شى ثم سلمت، لم يك للخالق تقدير
اوكان فاللازم من كونهٗ حدوثه والقول مهجهور

''اے وہ عالم! جس کے علم وفضل کا لوگوں کے درمیان چرچا ہے۔ بندے کو اپنے افعال کا کیونکر اختیار حاصل ہے جبکہ وہ اپنے افعال میں مجبور ہے۔ کیونکہ ان لوگوں نے اس بات کی صراحت کردی ہے کہ بندے کے تمام افعال خدا کے ارادوں پر منحصر ہیں اور کوئی شخص حقیقت میں اپنے افعال کا فاعل نہیں ہے۔ اور یہ حکم مشہور ہے۔ یہیں سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ افعال کے کرنے والے کو جو کچھ لاحق ہوتا ہے اس میں اس کے افعال کی کوئی تاثیر نہیں ہے۔ اس بیان کی ہوئی چیز کی صحت میں کوئی دلیل ٹھیک نہیں ہوتی پھر تو یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خالق کی طرف سے تقدیر ہو یا نہ ہو۔ اس کے ہونے سے اس کا حادث ہونا لازم آتا ہے۔ اور یہ قول چھوڑ دینے کے قابل ہے۔''

اس رسالے میں امام ابن تیمیہ نے اسی سوال کا تفصیلی جواب دیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بھی ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں ہے۔

(۳) بيان مجمل اهل الجنة والنار

یہ بھی ایک مختصر رسالہ ہے جس کا قلمی نسخہ ندوۃ العلما کے کتب خانے میں ہے غالباً یہ وہی رسالہ ہے جس کے متعلق حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ ایک دن میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے دوزخ کے ختم ہوجانے کے متعلق مسئلہ دریافت کیا انہوں نے فرمایا کہ یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ اس سے آگے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ ایک دن میں عبد بن حمید الکشی کی تفسیر دیکھ رہا تھا۔ اس میں اس مسئلہ سے متعلق سلف کے بعض آثار منقول تھے۔ میں نے ان پر نشان لگا کر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ ان کو دیکھنے کے بعد انہوں نے اپنا مشہور رسالہ لکھا۔ [1]

---

[1] شفاء العليل لا بن قيم، ص: ٢٦٤۔

ان مذکورۂ بالا رسائل کے علاوہ ندوۃ کے کتب خانے میں بہت سے چھوٹے بڑے قلمی رسائل موجود ہیں جن میں سے اکثر چھپ گئے ہیں ذیل کے رسائل مختلف کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

(۴) تخجیل اہل الانجیل (بوڈلین لائبیریری) (۵) کتاب الرد علی النصاری (برٹش میوزیم لندن) (۶) فوائد شریفۃ فی الافعال الاختیاریۃ للہ (〃) (۷) رسالۃ فی القرآن (〃) (۸) قاعدہ فی القرآن (〃) ۔(۹) سوال و جواب (〃) (۱۰) مسئلۃ الکنائس (پیرس) (۱۱) القاعدۃ المراکشیہ (برلن) (۱۲) المناظرہ فی الاعتقاد (〃) (۱۳) مسئلۃ العلو (〃) (۱۴) فی سجود القرآن (〃) (۱۵) قاعدۃ فی عدد رکعات الصلوات واوقاتہا (〃) (۱۶) سجود السہو (〃) (۱۷) فی اوقاتِ النہی والنزاع فی ذوات الاسباب وغیرھا (〃) (۱۸) رسالۃ فی صفات الکمال (انڈیا آفس لائبریری لندن) (۱۹) مسئلہ فی قرب العبد الی الرب وقرب الرب فی العبد (〃) (۲۰) نقد تاسیس الجہمیہ، غالباً یہ وہی کتاب ہے جس کے متعلق حافظ ابن عبدالہادی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب بہت قیمتی ہے۔اس کی کہیں نظیر نہیں مل سکتی۔ شیخ نے اس کتاب میں جہمیہ کے تمام اسرار کو فاش کیا ہے۔اگر کوئی اس کتاب کو حاصل کرنے کے لیے چین تک کا سفر اختیار کرے تو اس کا یہ سفر بیکار نہیں کہا جا سکتا (العقود الدریہ صفحہ:۲۸) مگر حافظ موصوف نے اس کا نام بیان تلبیس الجهمیه فی تأسیس بدعهم الكلاميه دیا ہے۔امام ابن تیمیہ کی کتاب التسعینیہ میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔اس کا دوسرا نام تخليص التلبيس من كتاب التاسيس ہے۔اس میں درحقیقت امام موصوف نے امام فخر دین رازی کی مشہور کتاب اساس التقدیس پر سخت تنقید کی ہے (دیکھو کتاب التسعینیہ صفحہ: ۷۲) لکڈونو بٹاویہ اور لیڈن میں اس کتاب کے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔

(۲۱) تبصرة اهل المدينة

یہ بانوے صفحوں کا ایک مختصر رسالہ ہے جس کا قلمی نسخہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں پایا جاتا ہے۔اس میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے کہ مدینہ والوں کا عمل حجت

ہے یا نہیں۔

(۲۲) تعلیق علی کتاب المحرر فی الفقه

امام موصوف کے دادا نے فقہ میں کتاب المحرر کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی تھی۔ جس پر امام موصوف کے والد اور پھر خود انہوں نے اپنے زمانہ میں تعلیق لکھی تھی۔ یہ دونوں تعلیقیں ایک ہی جلد میں دار الکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہیں۔

نایاب تصانیف

حافظ ابن عبد الہادی نے اپنی کتاب العقود الدریہ میں ان کی بہت سی کتابوں اور رسالوں کا نام لیا ہے۔ جن میں سے بعض چھپ چکے ہیں لیکن اکثر کا پتہ نہیں چلتا۔ ان میں یا تو فقہی مسائل پر چھوٹے چھوٹے قاعدے اور رسالے ہیں۔ یا امام رازی اور امام غزالی اور دوسرے فلاسفہ و متکلمین کے خیالات کی تردید میں چھوٹے بڑے رسالے ہیں۔ یا دوسرے کے نام خطوط ہیں جو مختلف کلامی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سب کا اس جگہ احاطہ کرنا مشکل ہے جن کی خواہش ہو وہ حافظ ابن عبدالہادی کی کتاب العقود الدریہ کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

تلامذہ

امام ابن تیمیہ نے اپنے والد ماجد عبدالحلیم کی وفات کے بعد یعنی ۶۸۲ھ سے لے کر باضابطہ درس دینا شروع کیا تھا۔ اس وقت سے لے کر ان کی وفات ۷۲۸ھ تک درس و تدریس کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ انہوں نے دمشق، قاہرہ اور اسکندریہ کے اندر قید کی حالت میں بھی بہت سے لوگوں کو پڑھایا۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ان کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ ایسے بھی تھے جو ان کے ساتھیوں میں شمار کیے جاتے تھے مگر تبرکا امام موصوف سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا اور بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے شاگردی کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیے ان کی تصنیفات کو روایت کرنے کی ان سے اجازت چاہی تھی۔ چنانچہ سبت کا حاکم اور صفہان، غرناطہ اور تبریز کے کچھ لوگ اسی تیسرے طبقے میں شامل ہیں۔ دوسرے طبقے میں شیخ برزالی، شیخ ابوالحجاج مزی، شیخ شمس الدین ذہبی اور شیخ ابوالعباس واسطی جیسے لوگ شامل ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایک مستقل بالذات امام کی حیثیت رکھتا تھا۔ امام موصوف کے ساتھ ان لوگوں کا اپنی شاگردی کا رشتہ جوڑنا درحقیقت ان کے مرتبہ علم کی بلندی پر دلالت کرتا ہے۔ اگر یہاں ان کے متعلق تفصیل لکھی جائے تو اس کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہوگی۔ تذکروں سے ان کے حالات معلوم کیے جاسکتے ہیں۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ

اب رہا طبقہ اول کے شاگرد تو ان سب کے حالات کو یہاں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ صرف انہی شاگردوں کو پیش کیا جائے گا جنہوں نے اپنے استاد کے نام کو روشن کیا اور اپنی زبان اور قلم سے ان کے خاص خاص اصلاحی خیالات کا پرچار کیا۔ ان میں حافظ ابن قیم کی ذات سب سے ممتاز ہے۔ عمر میں ابن قیم شاگردوں سے بہت چھوٹے تھے اور شاگردی کا زمانہ بھی بہت کم پایا تھا۔ امام ابن تیمیہ کے ۷۱۲ھ میں مصر سے دمشق لوٹنے کے بعد ابن قیم نے ان کے

سامنے زانوے شاگردی تہہ کیا تھا اور تقریباً سولہ سال ان کے ساتھ رہے اس مدت میں انہوں نے جس تیزی کے ساتھ علوم متداولہ پر عبور حاصل کیا وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ ان کی ذات امام موصوف کے علمی اور عملی کمالات کا بہترین مظہر تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دونوں ایک روح اور دو قالب تھے۔ حافظ ابن قیم کو تصنیف و تالیف کا بہترین سلیقہ تھا۔ انہوں نے اپنے استاد کے محققانہ خیالات کو مرتب طور پر اپنی تصنیفات میں پیش کر دیا۔ امام ابن تیمیہ میں حدت بہت زیادہ تھی۔ وہ اپنے دل و دماغ اور قلم کی روانی میں کسی ایک موضوع پر ٹھہر کر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اور ضمنی مباحث کو بیک وقت سمیٹنے کے عادی تھے۔ حافظ ابن قیم میں سنجیدگی اور متانت تھی۔ وہ ہر ایک بحث کو مدلل اور مرتب طور پر لکھنے کے عادی تھے۔

حافظ بن قیم کے علمی کمالات ایک مستقل تذکرے کے مقتضی ہیں۔ مگر ہم یہاں ان کے مختصر حالات پیش کرتے ہیں۔

حافظ موصوف کا نام محمد کنیت ابوعبداللہ لقب شمس الدین اور عرف ابن قیم تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد الزرعی الحنبلی تھا، ان کے والد ابوبکر مدرسہ جوزیہ کے قیم تھے۔ اس لیے ان کا عرف ابن قیم ہو گیا تھا۔

حافظ موصوف ۶۹۱ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے اور قرآن مجید کے حفظ کرنے کے بعد اپنے والد اور دیگر اساتذہ دمشق سے مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ اور جب امام موصوف ۷۱۲ھ میں مصر سے دمشق آئے تو ان کی شاگردی اختیار کی۔ اور آخر وقت تک ان کے ساتھ رہے جب ۱۹ ذوالحجہ ۷۲۳ھ میں والد کا انتقال ہو گیا تو مدرسہ جوزیہ کی ملازمت بھی ان کو مل گئی۔

حافظ موصوف کے اساتذہ میں سے ایک شیخ صفی الدین ہندی بھی تھے جو امام ابن تیمیہ کے حریف تھے۔ اور ان سے مناظرہ بھی کیا تھا۔ حافظ موصوف نے فن اصول کی تعلیم انہی سے حاصل کی تھی۔ جب ۷۱۵ھ میں شیخ صفی الدین کا انتقال ہو گیا تو وہ امام ابن تیمیہ ہی کی صحبت میں رہنے لگے۔

جب ۷۲۶ھ میں زیارتِ قبور اور توسل، وسیلہ اور استغاثہ کے مسئلہ کی وجہ سے ہنگامہ ہوا تو حافظ ابن قیم نے اپنے استاد کے خیالات ہی کی پرزور حمایت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق

کی حکومت نے انہیں بھی گرفتار کر کے قید خانے میں ڈلوا دیا۔ استاد کی وفات کے بعد ۲۰ ذوالحجہ ۷۲۸ھ کو قید سے رہائی ملی۔

حافظ موصوف مدرسہ صدریہ میں درس دیتے تھے اور مدرسہ جوزیہ کی مسجد میں امامت کرتے تھے۔ درس وتدریس اور امامت کے بعد جو وقت بچتا تھا اس کو تصنیف وتالیف میں صرف کرتے تھے۔ طلاق، زیارت قبور اور وحدۃ الوجود اور صفات باری کے مسئلوں میں ان کا نقطۂ نظر وہی تھا جو ان کے استاد کا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کو بسا اوقات تکلیفیں اُٹھانی پڑی تھیں۔ جب قاضی القضاۃ تقی الدین سبکی شافعی قاضی ہوکر دمشق آئے تو مسئلہ طلاق میں اُستاد کی حمایت کرنے کی بنا پر ان سے ناراض ہوگئے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اور حافظ بن قیم کو قید خانہ جانا پڑا تھا۔ ۷۵۰ھ میں سبکی اور ابن قیم میں بڑی سخت عداوت ہوگئی تھی۔ عرب کے بادشاہ امیر سیف الدین بن فضل نے ان دونوں کی آپس کی ناچاقیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی اور اسی سال ۱۶ جمادی الآخرہ کو منگل کے دن قاضی القضاۃ کے باغ میں دونوں کے درمیان صلح کرائی۔ [1]

حافظ موصوف نے ۱۳ رجب ۷۵۱ھ کو جمعرات کی شب میں وفات پائی۔ جامع اموی میں جمعرات کی ظہر کے بعد جنازے کی نماز پڑھی گئی۔ اور مقابر باب صغیر میں ان کی والدہ کے پہلو میں ان کو دفن کیا گیا۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ میں سب سے زیادہ ان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اور وہ لوگوں میں سب سے زیادہ مجھے محبوب تھے۔ ہمارے زمانے میں ان سے بڑھ کر کسی کو عبادت گزار نہیں پایا۔ وہ نماز بہت لمبی پڑھا کرتے تھے۔ ان کے رکوع اور سجدے بھی بہت طویل ہوتے تھے ان کے بعض ساتھی ان کو اس پر ملامت بھی کرتے تھے۔ مگر وہ اس سے باز نہیں آتے تھے۔ رات دن ان کو علم ہی کی طلب رہتی تھی۔ ان کی قراءت بہت عمدہ ہوتی تھی۔ ان کا اخلاق بھی بہت اچھا تھا کسی پر حسد نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کو ایذا پہنچانے کی کوشش کرتے تھے اور کوئی بھی ان کی عیب جوئی نہیں کرتا تھا اور نہ ان سے کینہ رکھتا تھا۔ [2]

---

[1] البداية والنهاية: ١٤/ ٢٣٢۔ [2] البداية والنهاية: ١٤/ ٢٣٥۔

حافظ موصوف کی جگہ پر ان کے لڑکے شرف الدین عبداللہ کو مدرسہ صدریہ کا مدرس مقرر کیا گیا۔ اور انہوں نے ۱۲ شعبان ۷۵۱ھ کو پیر کے دن پہلا درس دیا۔

حافظ ابن قیم کو اپنے استاد کی طرح ہر فن سے شغف تھا۔ اور ہر قسم کی کتابیں ان کے مطالعے میں رہتی تھیں۔ ان کو کتابوں کے جمع کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ حافظ ابن حجر نے الدرر الکامنہ میں لکھا ہے کہ ان کی زندگی میں ان کے پاس اتنی کتابیں جمع ہو گئیں تھی کہ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد ایک زمانہ تک ان کتابوں کو بیچتی رہی۔

حافظ موصوف اپنی مذہبی شدت کے باوجود نہایت خلیق اور متواضع تھے۔ ان میں اپنے اُستاد کی سی حدت اور شدت نہیں تھی۔ مخالفین کے ساتھ وہ اچھی طرح سے پیش آتے تھے۔ اس وصف میں وہ اپنے استاد سے بالکل ممتاز تھے۔ اسی لیے مخالفین بھی ان کی قدر اور عزت کرتے تھے۔

حافظ موصوف کی تقریر اور تحریر دونوں مرتب، مربوط اور حشو و زواید سے پاک ہوتی تھی۔ اور ان کی اور امام ابن تیمیہ کی تصنیفات میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ حافظ ابن قیم کی تصنیفات میں تکرار نہیں ہوتی تھی۔ امام موصوف کی تصنیفات کا یہ حال نہیں ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ امام موصوف کو حافظ ابن قیم کی طرح سکون اور اطمینان کے ساتھ لکھنا نصیب نہیں ہوا۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ وہ تھوڑے سے وقت میں مضامین اور خیالات کا ایک دریا بہا دیتے تھے اور اس میں وہ اکثر ضمنی باتوں کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کر دیتے تھے۔

امام موصوف کی صحبت کی وجہ سے حافظ ابن قیم کو قرآن مجید کے خاص مطالعے اور تفکر و تدبیر کی طرف توجہ ہوئی۔ اس میں انہیں جو شبہات پیدا ہوتے تھے ان کو وہ امام موصوف سے پوچھتے تھے اور ان کو حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس مصنف کی تصنیفات زیادہ ہوں اس میں تحقیق و تدقیق کی باتیں بہت کم ہوتی ہے۔ مگر امام موصوف اور حافظ ابن قیم کی تصنیفات اس سے مستثنی ہیں۔ ان دونوں کی تصنیفات کو پڑھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ان کا علم بہت وسیع اور

گہرا تھا۔ان کی قوت آخذہ بہت زبردست تھی۔

حافظ ابن قیم بہت صابر اور قانع تھے فرماتے تھے کہ دین کی امامت صبر اور قناعت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ایک سالک کیلئے صبر اور قناعت کے علاوہ ہمت اور علم کی بھی ضرورت ہے۔ ہمت اس لیے کہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی اس کے قدم حق کے راستے میں ڈگمگانہ جائیں۔علم اس لیے کہ معرفت کی کٹھن منزلوں میں مشعل راہ کا کام دے۔

حافظ موصوف کی تصنیفات اتنی ہیں کہ ان تفصیلی طور پر یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔اس زمانے کے علوم متداولہ میں سے اکثر پر ان کی کوئی نہ کوئی تصنیف پائی جاتی ہے۔ پھر ہر ایک کتاب کئی جلدوں میں ہے۔ہم مختصر طور پر ان کی فہرست ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

(۱) زاد المعاد، (۲) مدارج السالکین فی شرح منازل السائرین (۳) اعلام الموقعین (۴) اغاثۃ اللہفان من مصاید الشیطان (۵) اخبار النساء (۶) بدائع الفوائد، دو جلد (۷) الجواب الکافی عن الدواء الشافی (۸) روضۃ المحبین و نزہۃ المشتاقین (۹) شفاء العلیل فی القضاء والقدر (۱۰) الطب النبوی (۱۱) عدۃ الصابرین وذخیرۃ الشاکرین (۱۲) الفوائد (۱۳) الفوائد المشوقہ الی علوم القرآن (۱۴) کتاب الروح (۱۵) کتاب الصلوۃ (۱۶) مختصر الصواعق المرسلہ، دو جلد (۱۷) مفتاح دار السعادہ (۱۸) ہدایۃ الحیاری من الیہود والنصاریٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ

ان کا نام اسماعیل تھا کنیت ابو الفدا اور لقب عماد الدین تھا۔ وہ ابن کثیر کے نام سے مشہور تھے۔ان کا سلسلہ نسب یہ تھا۔عماد الدین ابو الفدا اسماعیل بن شہاب الدین ابوحفص عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر بن ضوء بن درع القرشی تھا۔ ان کے والد شہاب الدین ابوحفص عمر بصری کے ایک قریہ مجیدل کے خطیب تھے۔ان کی والدہ بھی اسی قریے کی تھیں۔ابوحفص عمر نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے اسماعیل۔ یونس اور ادریس پیدا ہوئے اور دوسری بیوی سے عبد الوہاب، عبد العزیز، محمد اور بہنیں اور اسماعیل پیدا ہوئے۔حافظ ابن کثیر ہی سب سے چھوٹے تھے۔ چونکہ سب سے بڑے فرزند اسماعیل کا انتقال ہوگیا تھا اس لیے جب یہ ۷۰۰ھ میں پیدا ہوئے تو ان کا نام بھی اسماعیل رکھا۔ابھی تین سال ہی کے تھے کہ ان کے

والد ابوحفص عمر کا انتقال ہوگیا، تو ان کے بڑے بھائی کمال الدین عبدالوہاب سب کو ساتھ لے کر ۷۰۷ھ میں دمشق چلے آئے۔ یہیں حافظ ابن کثیر کی تعلیم شروع ہوئی۔ انہوں نے اپنے بھائی عبدالوہاب سے کچھ پڑھا اور پھر شیخ علم الدین برزالی اور شیخ ابوالحجاج مزی سے بھی تعلیم حاصل کی اور جب ۷۱۲ھ میں امام ابن تیمیہ مصر سے آئے تو ان کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا۔ اور علوم متداولہ میں کمال حاصل کیا۔

حافظ ابن کثیر نے ابوالحجاج مزی شافعی کی لڑکی سے شادی کی۔ اس حیثیت سے بھی امام موصوف سے انہیں بہت محبت ہوگئی کیونکہ ان کے خسر مزی ابن تیمیہ کی بڑی قدر اور عزت کرتے تھے۔

جب امام موصوف کا انتقال ہوا تو ابن کثیر اپنے خسر کے ساتھ قید خانے میں داخل ہوئے اور ان کے چہرے سے چادر ہٹا کر ان کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ باوجود اس کے کہ وہ شافعی مذہب کے پیرو تھے اور فقہ میں شیخ کمال الدین ابن الزملکانی کے شاگرد تھے۔ طلاق اور دیگر مسائل میں اپنے استاد ہی کے خیالات کی تائید کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کو بہت تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ ۷۷۴ھ میں وفات پائی۔ اور امام موصوف ہی کی قبر کے پہلو میں دفن ہوئے۔ تفسیر ابن کثیر اور تاریخ ابن کثیر ان کی مشہور تصنیفات میں سے ہیں۔ پہلی کتاب دس جلدوں میں ہے اور دوسری کتاب البدایۃ والنہایۃ کے نام سے چودہ جلدوں میں چھپی ہے۔

حافظ ابن عبدالہادی رحمہ اللہ

یہ ابن قدامہ مقدسی کے مشہور علمی خاندان سے تھے۔ اس خاندان میں جتنے علما پیدا ہوئے اتنے شائد ہی کسی اور خاندان میں ہوئے ہوں۔ یہ ۷۰۴ھ یا باختلاف روایت ۷۰۵ھ یا ۷۰۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا نام محمد، کنیت ابوعبداللہ اور لقب شمس الدین تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے محمد بن احمد بن عبدالہادی بن عبدالحمید بن عبدالہادی بن یوسف بن محمد بن قدامہ مقدسی حنبلی جماعیلی۔

ابن عبدالہادی کا خاندان جماعیل کا رہنے والا تھا۔ ابن عبدالہادی نے اپنے زمانے کے مختلف شیوخ سے تعلیم حاصل کی۔ جب مصر سے واپس آ کر امام ابن تیمیہ مدرسہ حنبلیہ اور

مدرسۃ القصاعین میں درس دینے لگے تو حافظ موصوف بھی ان کے درس میں شریک ہونے لگے۔ اور ان سے امام رازی کی کتاب الاربعین کا ایک ٹکڑا پڑھا۔ امام موصوف نے ان کے لیے اس کی شرح بھی کی اور بعض جگہ تعلیقات بھی لکھیں۔ اس زمانے میں خود انہی کی تصنیفات ان کے سامنے پڑھی جاتی تھیں جن کو وہ کبھی کبھی درست بھی کیا کرتے تھے۔ اور اس میں کہیں کانٹ چھانٹ اور گھٹا بڑھایا کرتے تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک دن ان کے ساتھ امیر فخر الدین بن الشمس لولو کی دعوت ولیمہ میں شریک ہوئے۔ اس دن حافظ ابن عبدالہادی نے امام موصوف سے چالیس حدیثیں پڑھیں۔ بعض نے اس وقت کے لوگوں کے چند نام بھی لکھے ہیں۔ اس کے بعد مختلف علوم پر گفتگو ہونے لگی۔ جس کو سن کر حاضرین مبہوت ہو گئے۔ اور کھانا چھوڑ کر ان کی باتیں سننے لگے۔ انہوں نے اس صحبت میں کہا کہ خدا اپنی بعض کتابوں میں فرماتا ہے کہ جو لوگ میرا ذکر کرتے ہیں وہ میرا مشاہدہ کرتے ہیں اور جو لوگ میرا شکر ادا کرتے ہیں وہ میری زیارت کرتے ہیں اور جو میری فرمانبرداری کرتے ہیں وہ مجھ سے عزت پاتے ہیں اور جو میری نافرمانی کرتے ہیں وہ میری رحمت سے مایوس نہیں ہوتے ہیں۔ اگر وہ توبہ کر لیں تو میں ان کا دوست ہو جاتا ہوں۔ اور اگر توبہ نہ کریں تو میں ان کا طبیب بن جاتا ہوں۔ ان کو مصیبتوں میں مبتلا کر کے ان کو مصائب سے پاک کرتا ہوں۔ [1]

امام موصوف کے بعد شیخ ابوالحجاج مزی شافعی کی صحبت علم اختیار کی اور ان کے ذریعے تراجم اور اسماء رجال پر پورا عبور حاصل کیا۔ اور فن حدیث پر گہری نظر پیدا کی۔ حافظ ابن عبدالہادی امام موصوف کے پرجوش شاگردوں میں سے تھے۔ جب شیخ تقی الدین سبکی نے "شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام" کے نام سے ایک رسالہ امام موصوف کے خیالات کی تردید میں لکھا تو حافظ موصوف نے "الصارم المنکی فی الرد علی السبکی" کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ اس میں سبکی کے ہر ایک اعتراض پر جس قابلیت کے ساتھ نقد و جرح کی ہے۔ اس سے ان کی وسعت نظر اور عمق علم کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی بزرگی کے لیے یہی کیا کم ہے کہ شیخ شمس الدین ذہبی جیسا شخص ان سے حدیث کی روایت کرے۔

---

[1] دیکھو العقود الدریۃ، ص: ۳۲۷۔

حافظ موصوف نے گو بہت چھوٹی عمر میں ۷۴۴ھ میں وفات پائی تاہم ان کی تصنیفات کسی معمر آدمی سے کم نہیں تھیں۔ بقول ابن رجب ان کی تصنیفات ستر کے قریب تھیں۔ ان کی تصنیفات کی فہرست تذکروں میں موجود ہے۔ ان میں سے چند تصنیفات شائع ہو چکی ہیں جیسے المحرر فی الحدیث۔ الصارم المنکی فی الرد علی السبکی اور العقود الدریہ وغیرہ۔ العقود الدریہ میں امام موصوف کے حالات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ابن الوردی رحمہ اللہ

ان کا نام عمر اور لقب زین الدین تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ تھا، زین الدین عمر بن مظفر بن عمر بن محمد بن ابی الفوارس بن الوردی المصری الحلبی شافعی۔ امام ابن تیمیہ کی درسگاہ میں شریک ہوا کرتے تھے۔ لغت، فقہ اور ادب کے بڑے ماہر تھے۔ ان کو بھی ابن الوردی کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ ایک دن امام موصوف کی درسگاہ میں حاضر ہوئے۔ اور ان کی ذہانت سے بہت خوش ہوئے تو ان کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ ابن الوردی نے فوراً یہ شعر پڑھے:

ان ابن تیمیة فی کل العلوم اوحد
اجییت دین احمد و شرعه یا احمد

بیشک ابن تیمیہ ہر ایک علم میں یگانہ ہیں، اے احمد! تم نے احمد کے دین اور ان کی شریعت کو زندہ کر دیا ہے۔

ابن الوردی نے امام موصوف کی وفات کے بعد ایک بہت زوردار مرثیہ کہا۔ اور نیز اپنی کتابوں میں ان سے والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ابن الوردی نے ۷۴۹ھ میں طاعون میں وفات پائی۔ احوال القیامه، الفیة ابن الوردی فی تعبیر المنامات، بهجة الحاوی۔ تتمة المختصر فی اخبار البشر۔ التحفة الوردیه خریدة العجائب و فریدة الغرائب لامیة ابن الوردی و نصیحة الاخوان۔ ان کی چند تصانیف ہیں۔

شیخ شمس الدین الدباھی رحمہ اللہ

ان کا نام محمد، ابوعبداللہ کنیت اور شمس الدین لقب تھا، والد کا نام احمد اور دادا کا نام ابونصر تھا۔ ٦٦٦ھ میں بمقام بغداد پیدا ہوئے تھے۔ امام ابن تیمیہ سے عمر میں صرف پانچ سال چھوٹے تھے۔ شروع میں تجارت کرتے تھے اور جب علم کا شوق ہوا تو گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ دس سال مکے میں رہے۔ پھر مختلف جگہوں کی خاک چھانتے ہوئے دمشق پہنچے۔ یہاں اس وقت امام موصوف کی بڑی شہرت ہو چکی تھی۔ وہ اگرچہ نوجوان تھے۔ مگر ان کے علم و فضل کا شہرہ ہر طرف ہو گیا تھا۔ شیخ دباہی نے قریب قریب اپنی ہی عمر کے اُستاد کی شاگردی اختیار کی۔ جب ٣ ربیع الاول ٦٩٧ھ کی رات کو امام موصوف کا رسالہ وصیت صغریٰ ان کے سامنے پڑھا گیا۔ تو اس وقت یہ بھی اس میں شریک تھے۔ وہ وعظ و نصیحت اور زہد و عبادت میں لگے رہتے تھے۔ مواعظ حسنہ پر ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ شیخ عماد الدین واسطی سے دو روز پہلے ٧١١ھ میں دمشق میں انتقال کیا۔ اس وقت امام موصوف مصر میں تھے۔

شیخ بدر الدین ابن الصائغ رحمہ اللہ

یہ بھی امام ابن تیمیہ کی ابتدائی زندگی کے شاگردوں میں سے تھے۔ وصیت صغریٰ کی سماعت میں یہ بھی شریک تھے۔ ان کا نام محمد کنیت ابوالیسر اور لقب بدر الدین تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے، محمد بن عزالدین ابی المفاخر محمد بن محمد بن عبدالقادر بن عبدالخالق بن خلیل بن سعادہ المعروف بابن الصائغ شافعی ٦٧٢ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ امام موصوف اور دوسرے اساتذہ سے علوم متداولہ حاصل کیا۔ جب قاضی جلال الدین قزوینی اپنے عہدے سے معزول کیے گئے تو انہی کو ان کی جگہ پر مقرر کیا گیا مگر انہوں نے اس عہدے کو قبول نہیں کیا۔ ان کی بے نیازی کو دیکھ کر امیر سیف الدین تنکز کے دل میں ان کی وقعت بہت بڑھ گئی۔ اس نے انہیں جامع بیت المقدس کی خطابت کا عہدہ قبول کرنے پر اصرار کیا۔ مگر جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ دشمنوں نے ان کے خلاف امیر موصوف کے پاس چغلی کھائی ہے تو فوراً خطابت سے استعفا پیش کر دیا۔ ٧٣٩ھ میں دمشق میں وفات پائی۔

شیخ نور الدین ابن الصائغ رحمہ اللہ

یہ بدر الدین ابن الصائغ کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے۔ ان کے والد کا نام بھی محمد تھا۔ ۶۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔ امام موصوف سے پڑھا تھا۔ مصر میں بھی ان کے ساتھ رہے تھے۔ مصری حکومت کے جبر وتشدد کے باوجود اپنے اُستاد کے نظریات وخیالات کی بے باکانہ تائید کرتے تھے۔ اخیر زمانے میں دمشق کے قاضی لشکر مقرر ہوئے تھے۔ ۷۴۴ھ میں حلب کے قاضی مقرر ہوئے۔ اپنی حسن سیرت کی وجہ سے وہ لوگوں میں بہت مقبول تھے۔ ۷۴۹ھ میں حلب میں انتقال کیا۔

شیخ احمد بن فضل اللہ العمری رحمہ اللہ

ان کا نام احمد کنیت ابو العباس اور لقب شہاب الدین تھا۔ ۷۰۰ھ میں بمقام دمشق پیدا ہوئے۔ امام موصوف جب پہلی مرتبہ مصر گئے تو انہی کے چچا کے ہاں قیام کیا تھا۔ ان کے چچا اور والد کاتب السر کے عہدے پر مقرر کیے گئے تھے۔ والد کی وفات کے بعد یہ عہدہ شیخ احمد بن فضل اللہ العمری کو ملا تھا۔ سارا خاندان ان کا گرویدہ تھا۔ شیخ احمد نے ان سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اوران سے احکام صغریٰ پڑھا تھا۔ جب امام موصوف کی وفات ہوئی تو انہوں نے ایک زور دار مرثیہ کہا تھا۔ ۷۴۹ھ میں وفات پائی۔ التعریف بالمصطلح الشریف اور مسالك الابصار فی ممالك الامصار ان کی مشہور تصنیفات میں سے ہیں۔

شیخ ابن مری حنبلی رحمہ اللہ

ان کا نام احمد تھا۔ وہ ابن مری کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ احمد بن محمد بن مری البعلی الحنبلی۔ ابتدا میں یہ امام ابن تیمیہ کے سخت مخالفین میں سے تھے۔ لیکن جب ایک دو مرتبہ مصر میں ان کی تقریریں سنیں تو ان کے بے حد گرویدہ ہو گئے اور ان کی شاگردی اختیار کی۔ وہ ان کے نظریات وخیالات کے پرجوش حامیوں میں سے تھے۔ اخیر عمر میں وہ اکثر جامع عمرو بن العاص اور جامع امیر حسین میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ ۷۲۵ھ میں جبکہ دمشق کے اندر امام موصوف کے خلاف ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ابن مری نے قاہرہ میں ایک دن تقریر کی۔ اس میں توسل بالنبی اور مسئلہ زیارت کے متعلق ان کے خیالات کی

وضاحت کی اور ان کی حمایت کی۔ اور نام نہاد صوفیوں کے خلاف سخت نکتہ چینی کی۔ اس کی وجہ سے سامعین میں بڑی برہمی پھیلی۔ ایک جماعت ان پر ٹوٹ پڑی۔ مگر وہ وہاں سے بچ کر نکل گئے۔ لوگوں نے قاضی تقی الدین اخنائی مالکی سے شکایت کی۔ انہوں نے ان کو پکڑا بلایا۔ سلطان کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ اس میں بدرالدین بن جنکلی اور بدرالدین جماعہ نے ابن مری کی حمایت کی۔ امیر ایدمر خطیری نے ابن مری اور امام موصوف کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے اس پر بدرالدین بن جنکلی کو بہت غصہ آ گیا اور اس نے بھی امیر ایدمر کو بہت سخت سست کہا۔ اسکی وجہ سے دونوں لڑ پڑے اور قریب تھا کہ میان سے تلوار نکل جائے۔ سلطان نے ان دونوں کو خاموش کیا اور مقدمہ نائب سلطنت امیر ارغون کے سپرد کر دیا۔

اس درمیان میں قاضی مالکی نے ابن مری کو اپنے سامنے پٹوا دیا اور پھر گدھے پر اُلٹے بٹھا کر شہر بھر میں ان کی تشہیر کرا دی۔ اور یہ اعلان کیا کہ یہ اس شخص کی جزا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بدگوئی کرتا ہے۔ اس کے بعد ان کو قید میں ڈال دیا۔ آخر کسی امیر کی سفارش پر رہا ہوئے اور اپنے اہل وعیال کو لے کر مصر سے دمشق چلے آئے اور وہیں وفات پائی۔

عجیب اتفاق کہ چند دن بعد ابن شاس فقیہ نے اپنی درسگاہ میں اسی مسئلہ توسل بالنبی پر بحث کی اور بعینہ انہی خیالات کا اظہار کیا جن کی بنا پر ابن مری کو سزا دی گئی تھی۔ لیکن جب یہ معاملہ قاضی مالکی تک پہنچا تو انہوں نے مستند شہادتوں کے باوجود ابن شاس کو چھوڑ دیا۔ اس پر برہان الدین رشیدی نے چند اشعار میں قاضی مالکی کی ہجو کی اور لکھا

"اے حاکم تم نے اپنے احکام کو خدا کے تقوے اور ایک مضبوط بنیاد پر قائم کیا ہے۔ ابن مری کے قول کو تم نے توڑ مروڑ کر ان کو سزا دی اور اس معاملے میں قیاس کی حد سے بھی آگے نکل گئے۔ مگر ابن شاس کو اس سزا سے بچا دیا تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ شریعت نے ابن شاس کہ کفر کو حلال کر دیا ہے۔"

احمد بن قدامہ مقدسی رحمہ اللہ

ان کا نام احمد کنیت ابو العباس اور لقب شرف الدین تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ احمد بن الحسن بن عبداللہ بن ابی عمر محمد بن احمد بن قدامہ مقدسی حنبلی۔ ۶۹۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔

جب امام موصوف مصر سے دمشق آئے تو ان سے حدیث اور فقہ کی بہت سی کتابیں پڑھیں ان کو امام موصوف کے شاگرد ہونے پر فخر تھا وہ اکثر کہا کرتے تھے۔

نبی احمد وکذا امامی

وشیخی احمد کالبحر طامی

میرا نبی احمد ہے اور اسی طرح میرا امام بھی احمد ہے اور میرا شیخ احمد سمندر کی طرح موج مارتا ہے۔

واسمی احمد وبذاك ارجو

شفاعة سید الرسل الکرام

اور میرا نام بھی احمد ہے اور اسی وجہ سے مجھے امید ہے کہ رسولوں کے سردار میری شفاعت کریں گے۔

ان کی قابلیت کو دیکھ کر امام موصوف نے ان کو فتوی دینے کی اجازت دے دی تھی۔ ۷۶۱ھ میں وفات پائی۔

امین الدین ابن الوانی رحمہ اللہ

امین الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی اسحاق ابراہیم بن محمد بن احمد بن محمد بن احمد ابن الوانی الموذن۔ ۶۸۴ھ میں پیدا ہوئے ان کے والد رئیس المؤذنین تھے اور بہت خوش گلو تھے۔ امین الدین نے امام موصوف سے حسن بن عرفہ عبدی کی حدیث کا ایک ٹکڑا سنا تھا۔ تین مرتبہ اربعین ابن تیمیہ پڑھا تھا۔ اس کی پہلی سماعت مشہد عثمان میں محب الدین مقدسی کی قرأت سے ۱۸ ربیع الاول ۷۱۷ھ کو ہوئی تھی۔ دوسری سماعت دارالحدیث السکریہ میں ابن النحاس کی قرأت سے ۱۲ جمادی الآخرہ ۷۲۱ھ کو ہوئی اور تیسری سماعت شیخ شمس الدین ذہبی کی قرأت سے ۱۸ جمادی الآخرہ ۷۴۱ھ کو ہوئی تھی۔ اپنے والد کی وفات کے ڈیڑھ مہینہ بعد ربیع الاول ۷۳۵ھ میں انتقال کیا۔

ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں نے امام ابن تیمیہ سے تعلیم حاصل کی۔ ان کے حالات کے لکھنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے انہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

تجدید دین وملت

یوں تو ہر ایک انسان میں غیر معمولی قویٰ موجود ہیں۔جن کے ذریعے وہ ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج طے کر سکتا ہے۔دنیا میں ناموری اور شہرت حاصل کر سکتا ہے۔اور ایسے کارنامے انجام دے سکتا ہے جن کو دیکھ کر لوگ حیران و ششدر ہو جاتے ہیں۔لیکن ان تمام خوبیوں اور غیر معمولی قوتوں کے ساتھ ساتھ اس میں جسمانی کمزوری، سستی، کاہلی، غفلت، بے پروائی، بے توجہی، کینہ، بغض اور عداوت وغیرہ بھی موجود ہوتی ہے، جن کی وجہ سے وہ ایک ادنیٰ قسم کی زندگی اختیار کر لیتا ہے۔ ہر دو میں ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کو بار بار اعلیٰ ترین زندگی کے اختیار کرنے کی طرف توجہ دلائے اور ان کو رذائل خسیسہ سے پاک کرے اور ان کو ایک بہترین اور کامل انسان بنانے کی کوشش کرے۔

تمام پیغمبر اسی فرض کو انجام دیتے رہے۔آنحضرت ﷺ نے اپنی بے مثال زندگی کا نمونہ پیش کر کے آپ پر ایمان لانے والوں کو خیر امت بنا دیا تھا۔آپ کے بعد آپ کے صحابیوں نے مسلمانوں کو رذائل خسیسہ سے پاک کیا ان کے بعد زمانے میں دین اور ملت کی تجدید ہوتی رہی۔

امام ابن تیمیہ سے پہلے بڑے نامور حکیم، فلسفی اور عالم گزرے جن کے خیالات نے مسلمانوں کی زندگی پر بہت دیرپا اثر ڈالا۔ان کے الگ الگ اسکول آف تھاٹ قائم ہو گئے تھے۔اور ہر ایک نے اپنی استطاعت اور استعداد کے مطابق کسی ایک یا ایک سے زیادہ شعبہ ہائے زندگی میں انقلاب برپا کیا۔اور اپنے اپنے دور کی خاص خاص برائیاں دور کرنے کی کوشش کی۔اس کیلئے جانی اور مالی قربانیاں کیں اور قول و عمل کے لحاظ سے مسلمانوں کو اونچا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔اس حیثیت سے ہر ایک بڑا شخص خاص خاص شعبۂ زندگی میں مجدد تصور کیا جا سکتا ہے۔لیکن جب انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی جاتی ہے۔

توہمیں امام ابن تیمیہ کے سوا کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس نے زندگی کی ہر جہت اور اس کے ہر ایک پہلو میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا ہو۔ جب ہم ان سے پہلے کے تمام علمائے اسلام کی زندگی کے ساتھ ان کی زندگی کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں انکی زندگی بالکل ہی ممتاز نظر آنے لگتی ہے۔ ان کا زمانہ علما وحکماء سے بھرا ہوا تھا۔ قاضی ابوالبرکات مخزومی کے قول کے مطابق صرف ملک شام میں ستر چنے ہوئے مجتہد تھے۔ مگر جب ان کا مقابلہ امام ابن تیمیہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تو ان کے اجتہاد کے سامنے ان مجتہدین کی کوئی وقعت قائم نہیں رہتی۔ اور ہمیں بھی صاف یہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس وقت ان کا کوئی نظیر اور مثیل نہیں تھا۔

امام ابن تیمیہ صاحب قلم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب سیف بھی تھے۔ انہوں نے ایسے وقت مسلمانوں کو تباہی سے بچایا جب کہ خود حکومت ان کو بچانے پر آمادہ نظر نہیں آرہی تھی۔ انہوں نے تاتاریوں اور غالی شیعوں اور نصرانیوں کے خلاف زبردست جہاد کیا۔ ان کے اس وصف میں کوئی مسلمان عالم شریک نظر نہیں آتا۔ ان کی یہی خدمت تھی جس نے ان کو دمشق والوں کی نظر میں محبوب اور مقبول بنادیا تھا۔

اسلامی علوم وفنون یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، تصوف اور علوم معقولات مثلاً کلام، فلسفہ، منطق، مناظرہ، وغیرہ میں ایک طرح کا جمود پیدا ہوگیا تھا۔ لوگ ان علوم کو مقلدانہ نظر سے بڑھتے تھے۔ اور ان میں تحقیق اور تدقیق سے کام لینے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اگلوں نے جو کچھ لکھ دیا اس پر آمنا اور صدقنا کہنا ضروری ہوگیا تھا۔ امام موصوف نے ان علوم و فنون کو ایک نئے نقطہ نظر سے جانچا اور ان کے اندر نہ صرف بالیدگی پیدا کی۔ بلکہ مدت سے باطل کی جو عظمت دلوں پر چھائی ہوئی تھی ان کو کافور کردیا۔

اسلامی علوم وفنون میں یونانی فلسفہ وکلام اور منطق کی آمیزش ہوگئی تھی۔ بعض مسلمان فلاسفہ اور متکلمین نے ان خیالات کی تردید کرنے کی کوشش کی۔ مگر چونکہ وہ یونانیوں کے بعض بنیادی اصول مان چکے تھے۔ اس لیے وہ خاطر خواہ ان کی تردید نہیں کرسکتے تھے۔ وہ بقول ابن تیمیہ ایک دلدل میں پھنس گئے تھے۔ جس سے نکلنا ان کیلئے بہت دشوار تھا۔ امام موصوف نے ان کے اصول ہی پر سب سے پہلے کلہاڑی ماری اور ان کی بنیاد ہی کو اکھاڑ پھینک دیا۔

مصری، حضرت جنید بغدادی، حضرت شبلی اور دوسرے اولیاء کرام کی زندگی اور ان کے اقوال کو بطور مثال کے پیش کیا ہے۔ اور لوگوں کو ان کے سے طرز زندگی کے اختیار کرنے کی دعوت دی ہے کیونکہ یہ بزرگ آنحضرت ﷺ کی زندگی کو اپنی زندگی کیلئے نمونہ بنائے ہوئے تھے۔ اگر حقیقی تصوف کے متعلق امام موصوف کے خیالات کو معلوم کرنا ہو تو ان کی مختلف تصانیف کے دیکھنے کے ساتھ ساتھ حافظ ابن قیم کی کتاب مدارج السالکین فی شرح منازل السائرین بھی پڑھنی چاہیے۔ اس کتاب میں ابن قیم نے اپنے استاد ہی کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ اس کتاب سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں نفس تصوف اور اس کی اخلاقی اور روحانی تعلیمات کے کبھی مخالف نہیں تھے۔ بلکہ وہ فلسفیانہ تصوف کے مخالف تھے۔ جس میں عمل پر زور دینے کے بجائے مختلف الٰہی مسائل کی فلسفیانہ تعبیر پر زور دیا جا رہا تھا۔

مخالفین جب امام ابن تیمیہ کی تحریروں کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے تو یہ کہنے لگتے تھے کہ تم اس علم تصوف کو کیا خاک سمجھو گے تم کو اس کا ذوق ہی نہیں ہے۔ ایک صوفی نے امام موصوف سے یہ مطالبہ کیا کہ اگر تم تصوف کی حقیقت کو سمجھتے ہو تو فن تصوف کی کسی مشہور کتاب کی شرح کر کے اس کی تردید کر دو۔ امام موصوف نے کہا کہ تم ہی کسی کتاب کو منتخب کرو۔ اس صوفی نے فن تصوف کی سب سے مشکل اور دقیق کتاب لوح الاصالہ کا نام پیش کیا۔ امام نے اس کی شرح کر کے خلاف شریعت عقائد و افعال کی تردید کی۔ یہ دیکھ کر تمام نام نہاد صوفی دنگ ہو گئے اور پھر ان سے کسی طرح کا کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ [1]

امام موصوف کے زمانے میں تقلید شخصی رائج ہو گئی تھی۔ ہر بات کا جواب اپنے مذہب اور مسلک کی کتابوں سے دیا جاتا تھا۔ فقہی امور میں تو یہ تقلید جامد ہو گئی تھی۔ کوئی اپنے مذہب اور مسلک سے ہٹ کر فتویٰ نہیں دے سکتا تھا۔ ہر ایک مفتی کو اپنے اپنے مسلک کی فقہی کتابوں کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ ان کے زمانے میں لوگ قرآن مجید اور حدیث پڑھتے تھے۔ لیکن ان میں معدودے چند کے سوائے کوئی ان پر غور و فکر نہیں کرتا تھا۔ اور ہر ایک مسئلے میں قرآن و

---

[1] كتاب النبوات لابن تيمية، ص:۸۳۔

حدیث سے استدلال لینے کی کوئی کوشش نہیں کرتا تھا۔ امام موصوف نے سب سے پہلے یہ طریقہ بدلا۔ مختلف علوم وفنون کا کوئی جزئی سے جزئی مسئلہ کیوں نہ ہو۔ سب سے پہلے وہ قرآن مجید میں اس کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اس کے اشارات و کنایات سے بھی لطیف استدلال کرتے تھے۔ اس کے بعد بہ ترتیب حدیث اور فقہ کے حوالے دیتے تھے۔ ان کے اس نئے طرز تحریر نے علما کے اندر قرآن مجید اور حدیث نبوی میں تدبر و تفکر کرنے کا ایک خاص ذوق پیدا کر دیا۔ ان کی تصنیفات سے نہ صرف ان کے زمانے کے علما کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ بلکہ ان کے بعد سے ہر ایک دور کے علما کے خیالات اور ان کی تحریروں پر ان کا اثر پڑنے لگا۔

امام ابن تیمیہ نے ملک ناصر کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان کے پڑھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے عام مسلمانوں کی غیر شرعی زندگی قرآن وحدیث کی صحیح تعلیمات سے ناواقفیت کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے بجا طور پر شام اور مصر کے تمام شہروں اور دیہاتوں میں قرآن وحدیث کے مدرسوں کے قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ انہوں نے لکھا کہ صرف اسی ایک ذریعے سے جہالت کی عام تاریکی دور کی جاسکتی ہے۔ شہروں میں تو بڑے بڑے سرکاری مدرسے قائم تھے۔ دیہات میں ان کا کافی انتظام نہیں تھا۔ جو کچھ بھی مکتب اور مدرسے قائم تھے وہاں قرآن وحدیث کی تعلیم کا پورا بندوبست نہیں تھا۔ امام ابن تیمیہ نے خود بھی قرآن وحدیث کا خوب چرچا کیا اور عام لوگوں کو بھی اس کی طرف توجہ دلائی۔ جس سے عام مسلمانوں میں شریعت اسلامیہ پر عمل پیرا ہونے کا ایک خاص احساس پیدا ہو گیا۔ ہمیں تاریخ اسلام میں کوئی ایسی ہستی نظر نہیں آتی جس کا اتنا زبردست اثر عام مسلمانوں پر پڑا ہو۔ اور جس نے ہر ایک علم وفن میں ایک نمایاں انقلاب کیا ہو۔